بسم اللہ الرحمن الرحیم

محسنِ اردو نمبر

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسؤل

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

اس شمارے کے اہم مضامین

تعارف
خراجِ عقیدت (منثور، منظوم)
قطعاتِ تاریخ
تاثرات
نوادرات
مضامینِ سید
انتخاب خطباتِ سید
تعارف و تبصرہ

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

ماہنامہ
اخبار اُردو
اسلام آباد

جنوری ۱۹۸۷ء

جلد ۴ شمارہ ۱

فہرست

تعارف ——— صفحہ ۱ تا ۸
ڈاکٹر سید عبداللہ ——— ادارہ
سید صاحب کی کہانی خود ان کی زبانی - ڈاکٹر سید عبداللہ
پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ (کتابیات) سید جمیل احمد رضوی

خراجِ عقیدت (منثور) — صفحہ ۹ تا ۳۰
روشنی کا مینار ——— مرزا ادیب
بابائے اردو ثانی ——— پروفیسر سید حسین شاد
ڈاکٹر سید عبداللہ ——— ڈاکٹر انور سدید
ڈاکٹر سید عبداللہ ——— پروفیسر وارث میر
ایک انسان دوست مفکر ——— طاہر مسعود
استادِ مکرم ——— پروفیسر اسلم انصاری
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر ——— عطاء الحق قاسمی
اُردو زبان کا عاشقِ بے مثال ——— نسیم شاہد

خراجِ عقیدت (منظوم) — صفحہ ۳۷
ہرگز نمیرد ——— شریف کنجاہی
ڈاکٹر سید عبداللہ ——— عطا حسین کلیم
بیادِ ڈاکٹر سید عبداللہ ——— عبدالعزیز خالد

قطعاتِ تاریخ ——— صفحہ ۳۸
قطعہ ——— ڈاکٹر گوہر نوشاہی
قطعہ ——— سید عارف محمود مہجور

تاثرات ——— صفحہ ۳۹ تا ۴۲
ڈاکٹر شفیق الرحمان، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احمد ندیم قاسمی
اشفاق احمد خان، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، انتظار حسین
ڈاکٹر صفدر محمود، بانو قدسیہ، العارجبدالعلی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر حسن اختر، حسن رضوی
عطاء الحق قاسمی، منصور قیصر، پروفیسر حمید رضا صدیقی، خالد شریف
پروفیسر حفیظ الرحمان، مہر گل محمد، عبداللطیف اختر، پروفیسر محمد امین
پروفیسر جیلانی کامران، ابرار حسین۔

نوادرات ——— صفحہ ۴۳ تا ۴۶
سید صاحب کا خط ——— سید احمد فارانی کے نام
جواباتِ سیّد ——— بیماری کے دوران
——— اپنے معالج سے

مضامینِ سیّد ——— صفحہ ۴۷ تا ۵۶
تعلیم کے متعلق ہماری غلط سوچ - پاکستانی ثقافت کے خدوخال۔
قائد اعظم اور نیا پاکستانی فلسفہ۔

انتخاب خطباتِ سیّد ——— صفحہ ۵۷۔۵۸
بسلسلہ نفاذِ اُردو

تعارف و تبصرہ — نظیر صدیقی — صفحہ ۵۹۔۶۰

قیمت: ۱ روپیہ سالانہ: ۱۰ روپے

موجودہ شمارہ نفاذ اُردو کے علم بردار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (مرحوم) کی یاد سے مخصوص ہے۔ یاد کی اور بہت سی صورتوں کے علاوہ ایک صورت یہ ہے کہ ہم اس علم کو اسی طرح سربلند رکھنے کی مقدور بھر سعی کریں جسے انھوں نے جوانی میں اٹھایا اور بڑھاپے میں بھی جب قویٰ جواب دے جاتے ہیں اسی طرح اٹھائے رکھا۔ یہ علم نفاذِ اردو کا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے ارشادات کا ماحصل یہ ہے۔

۱۔ اُردو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنا جائز اور پُر وقار مقام حاصل کرلے۔

۲۔ لازمی دفتری زبان کے طور پر ملک بھر میں نافذ ہو جائے۔

۳۔ نفاذِ اردو کے لیے جو سال (۱۹۸۸ء) حتمی ٹھہرایا گیا ہے اسے حتمی ہی رہنے دیا جائے۔

۴۔ نفاذِ اردو کے معاملے میں تاخیر بلا جواز اور نامناسب ہے۔

ہم ان کو یاد کرنے کے ان لمحات میں اربابِ اختیار سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قومی زبان کے بارے میں ان کے مطالبات کو جن میں سے کوئی بھی قومی نقطۂ نظر سے متصادم نہیں عملی جامہ پہنا کر ان کی روح کے لیے سامانِ جمعیت فراہم کریں گے۔ انھوں نے ۱۹۸۱ء میں کہا تھا کہ "میری زندگی میں اُردو قومی زبان نہ بن سکی تو مر کر بھی چین نہ پاؤں گا۔"

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مذہب کے بعد قوم و ملک کو متحد اور مستحکم رکھنے والی چیز قومی زبان ہی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے نفاذِ اردو بلاشبہ زہرِ انتشار کا تریاق ثابت ہوگا۔ اسلاف کی خواہشات وصیت کا درجہ رکھتی ہیں جن کو پورا کرنا اخلاف کا اخلاقی فرض ہے۔

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد۔ مقتدرہ قومی زبان۔ شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۲- ڈی (ع ل) بلیو ایریا، الف ۱/۶، اسلام آباد — طابع: برق سنز پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

ڈاکٹر سید عبداللہ

پیدائش

منگلور، تحصیل مانسہرہ، ضلع ہزارہ، ۱۵ اپریل ۱۹۰۶ء

ڈگریاں

۱۔ ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ)
۲۔ ایم۔اے عربی
۳۔ ایم۔اے فارسی
۴۔ سرٹیفکیٹ جرمن
۵۔ سرٹیفکیٹ لائبریرین
۶۔ منشی فاضل

پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت

(۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۵ء تک)

(الف) ۱ — پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔
۲ — صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی
۳ — صدر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی
۴ — استاد ایم۔اے فارسی
۵ — ایڈیٹر اورینٹل کالج ریسرچ میگزین
۶ — عارضی صدر شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی
۷ — عارضی صدر شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی
۸ — آنریری لائبریرین پنجاب یونیورسٹی (پانچ سال)
۹ — مدیر شعبہ عربی، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند پنجاب یونیورسٹی
۱۰ — کیٹلاگر، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء
۱۱ — ریسرچ اسکالر (فارسی) ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء
۱۲ — عربک اسسٹنٹ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۴ء

(ب) ناظم (اعزازی) شعبہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی۔
چیئرمین اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

دوسرے اعزازی عہدے

(الف) پنجاب یونیورسٹی

۱ — رکن اورینٹل فیکلٹی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۶ء
۲ — رکن سنڈیکیٹ ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء
۳ — رکن سینیٹ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک
۴ — رکن اکیڈمک کونسل پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۶ء
۵ — رکن بورڈ آف گورنرز انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اردو پنجاب یونیورسٹی

(ب) یونیورسٹی سے باہر

۱ — رکن انٹر یونیورسٹی بورڈ، ۱۹۶۴ء — ۱۹۶۵ء

۲ — جنرل سیکرٹری مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
۳ — رکن ترقی اردو بورڈ کراچی
۴ — رکن مرکزی اردو بورڈ لاہور
۵ — ٹرسٹی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۶ — رکن مجلس ترقی ادب، لاہور
۷ — رکن مرکزی رائٹرز گلڈ
۸ — رکن بزم اقبال، لاہور
۹ — رکن مجلس زبان دفتری، حکومت پنجاب
۱۰ — ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو، لاہور
۱۱ — اعزازی پرنسپل و بانی، اردو کالج، لاہور
۱۲ — رکن ہیئت حاکمہ مقتدرہ قومی زبان

تعلیمی اور تنظیمی سرگرمیاں

۱ — جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم تاریخ کانفرنس پشاور ۱۹۴۵ء
۲ — جنرل سیکرٹری اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۴۸ء
۳ — جنرل سیکرٹری کل پاکستان بین الاقوامی اورینٹل کانفرنس ۱۹۵۵
۴ — جنرل سیکرٹری اردو ذریعہ تعلیم کانفرنس لاہور ۱۹۶۰ء
۵ — صدر استقبالیہ اردو تدریس کانفرنس لاہور، ۱۹۶۱ء
۶ — رکن قومی زبان سائنس کانفرنس، لاہور ۱۹۶۳ء
۷ — جنرل سیکرٹری عربی کانفرنس، لاہور ۱۹۶۴ء
۸ — صدر مجلس تجاویز اردو۔ تدریس کانفرنس کراچی ۱۹۶۴ء
۹ — صدر استقبالیہ دفتری زبان کانفرنس لاہور ۱۹۶۵ء
۱۰ — جنرل سیکرٹری عربی فارسی کانفرنس، لاہور ۱۹۶۶ء

میرا اپنا تصور تو یہ ہے کہ اگر اُردو پاکستان کی کسی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور لوگ اس سے کام لینے پر کسی سطح پر مجبور ہیں تو اسے پاکستان سے نکالا نہیں جا سکتا نہ اس کی حیثیت گھٹائی جا سکتی ہے۔

موجودہ صورت حال کے مطابق سابقہ محبت نہ سہی، عملاً اردو سے پاکستان کی کئی ضرورتیں وابستہ ہیں اور جب تک پاکستان پاکستان ہے یہ ضرورتیں وابستہ رہیں گی اور اس معاملے میں مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

اگر ہمارے دوست اس حقیقت سے متفق یا باخبر ہیں تو شکوہ کرنے کے بجائے انہیں چاہیے کہ وہ اردو کے سلسلے میں ضروری اور بنیادی کام جو کرنے کے ہیں انہیں ہاتھ میں لیں اور کرتے جائیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اردو بے اصول اور ناقص زبان ہے۔ اس کی کمزوریوں، اندرونی بے ضابطگیوں اور بے قاعدگیوں کو دور کر کے زبان کو طاقتور اور مضبوط بنائیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، اخبار اردو دسمبر ۸۵

سیّد صاحب کی کہانی
خود ان کی زبانی

نام : سید محمد عبداللہ

والد کا نام : حکیم سید نور احمد شاہ

جائے ولادت : موضع منگلور، تحصیل و ضلع مانسہرہ۔ ہزارہ، صوبہ سرحد

تعلیم و تربیت : ابتدا میں اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی۔ کچھ مدت کے بعد اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخلہ لے کر براہِ راست چوتھی جماعت کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی۔ عمر اس وقت قیاساً سات سال ہوگی۔ پھر مانسہرہ کے (اس وقت) ڈی۔ بی سکول میں جماعت پنجم میں داخلہ لیا۔ یاد پڑتا ہے کہ یہ ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ آٹھویں جماعت میں بوجہ ناسازیٔ طبیعت ناکام رہا اور دوسرا سال بھی لگانا پڑا۔ ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد میں جماعت نہم میں داخلہ لیا اور ایک سال یہاں پڑھنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں لاہور کے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی دروازہ میں جماعت دہم میں داخلہ لیا لیکن انٹرنس کے لیے داخلہ نہ جا سکا۔ راستہ مسدود ہو جانے کی وجہ سے میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل میں داخلہ لیا۔ لیکن کورس کی مشکلات کے باعث تین چار ماہ کے بعد مولوی عالم کلاس میں اسی کالج میں داخل ہو گیا لیکن اس کی ابھی تکمیل نہ ہو سکی تھی کہ لاہور میں جمعیت العلمائے ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو میں نے جوش میں آ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں مجھے مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمد سورتی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ سے ملنے کا موقع ملا لیکن محمد علی جلد قید ہو گئے تو عبدالمجید خواجہ صاحب جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے۔ یہاں آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں اس زمانے کی چند عظمتوں سے روشناس ہو گیا اور آنے والی زندگی میں یہ حضرات میرے لیے ایک روشن مثال کا کام دیتے رہے۔ مارچ ۱۹۲۲ء کے اواخر میں میں واپس وطن (منگلور) آ گیا۔ جہاں چند روز رہ کر پھر لاہور پہنچ کر منشی فاضل کے پرائیویٹ امتحان کے لیے فیس جمع کرا دی جس میں خدا نے مجھے کامیابی عطا کی۔ اس امتحان کے لیے میری حوصلہ افزائی مولانا عبدالعزیز میمن نے کی جو مولوی عالم کے زمانے میں میرے قدر دان استاد تھے اور بعد میں بھی ان کی نظرِ کرم مجھ پر رہی۔

منشی فاضل میں کامیاب ہونے کے بعد میں نے ایک سال میں تین امتحان (صرف انگریزی) کے دیے۔ میٹرک۔ ایف۔ اے اور ۱۹۲۵ء کے اپریل میں بی۔ اے (صرف انگریزی) اور ۱۹۲۵ء کے ستمبر۔ اکتوبر میں اسلامیہ کالج لاہور میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لے کر ۱۹۲۶ء یہ امتحان پاس کر لیا اور فوراً پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مخطوطات کا فہرست ساز بن گیا۔ اس زمانے میں پروفیسر حافظ محمد اقبال اور پروفیسر محمود خاں شیرانی نے میری سرپرستی کی اور میں ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہونے لگا۔ پروفیسر محمد شفیع کو جو بعد میں آخر تک میرے سرپرست رہے۔ میں نے اسی زمانے میں قریب سے دیکھا اور ان کی عنایات کا مستحق ٹھہرا۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک میں یونیورسٹی میں فارسی کا ریسرچ سکالر رہا۔ پھر لائبریرین شپ کا امتحان دیا۔ جرمن ڈپلوما حاصل کیا۔ پھر ایم۔ اے عربی۔ پھر فارسی کا ڈی لٹ، پھر یونیورسٹی میں شعبہ عربی میں لائبریرین، ۳۶ - ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج پشاور میں لیکچرار فارسی و اردو، ۱۹۳۸ء میں اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل کا استاد، ۱۹۴۰ء میں اسی کالج میں اردو کا لیکچرار، ۱۹۴۵ء میں اردو کا ریڈر، پاکستان بننے کے بعد صدر شعبہ اردو۔ پھر ۱۹۵۳ء میں پروفیسر اردو اور بعد میں پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور۔ ۱۹۶۶ء میں سبکدوش ہو کر اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کا چیئرمین اور اب تک بفضلہ تعالیٰ اسی منصب پر فائز ہوں۔

خاص اساتذہ: پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر محمود خاں شیرانی، پروفیسر ایم۔ اے غنی، مولانا عبدالعزیز میمن اور نجی تعلیم و تربیت میں خواجہ محمد سلیم پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ لاہور۔

خاص شاگرد: میں انھیں کا خاص شاگرد تھا۔ میرے شاگرد بے شمار ہیں۔ میں کس کس کا نام لوں

مشاغل: تعلیمی مشاغل کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

اُردو زبان اور علوم مشرقی کی خدمت میں عمر گزری ہے۔ لائبریرین بھی رہا ہوں۔ اُردو کے لیے کم از کم بیس کانفرنسیں کیں۔ جلوس نکالے اردو کے لیے دستخطی مہم، سائن بورڈ بدلوانے کی تحریک، ہوٹلوں کی زبان بدلوانے کی تحریک، دفتری زبان بدلوانے کی تحریک، خیر سگالی سفر کی تحریک ... ۔ اردو ذریعہ تعلیم کو تبدیل کرانے کی مہم میں اب بھی منہمک ہوں۔ فی الوقت "۱۹۸۸ء کومت بھول جایئے" کی تحریک کو منظم کر رہا ہوں۔ تعلیمی کانفرنسیں بھی کیں، نصابات کی درستی کی سرکاری مہم کا بھی سربراہ رہا۔

تصانیف و تالیفات: فہرست قدرے طویل ہے۔ سوانحی خاکہ (جو ارسال ہے) ملاحظہ ہو۔

اعزاز و انعام: اعزاز۔ تمغا صدارتی (البلدحسن کارکردگی) ۱۹۶۰ء۔ ہلال امتیاز ۱۹۸۳ء۔ نشان سپاس حکومت ایران ۱۹۷۱ء (پبلک کی طرف سے بہت سے اعزاز ملتے رہے جن کا ذکر ترک کرتا ہوں)

انعام۔ کتابوں پر انعامات ملتے رہے ان کی تفصیل بھی نظر انداز کرتا ہوں

کانفرنسیں: ملک سے باہر کسی کانفرنس میں شریک نہیں ہوا البتہ خود بائیس تیئیس کانفرنسیں منعقد کروائیں۔

☆

اگر میرے بس میں ہو تو میں انگریزوں کے زمانے کی اس دوعملی کے خلاف جو ذہنوں کو سست کر کے کج مج زبان کو فروغ دے رہی ہے سخت احتجاج کر کے اس کو بند کرا دوں لیکن اے وائے! طاقت نہیں رکھتا۔ انگریز ہم بن نہیں سکے اور اردو والا ہم بننا نہیں چاہتے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ (دفتری زبان کا نصاب تعلیم سے تعلق "اخبار اردو" اکتوبر ۱۹۸۱ء)

سید جمیل احمد رضوی

پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم

منتخب کتابیات

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم (۵ اپریل ۱۹۰۶ء - ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) کی وفات سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پر ہونا آسان نہیں۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے علم و فضل کی دنیا میں نمایاں خدمات سرانجام دیں ان کی کتابوں اور مقالات کی فہرست بہت طویل ہے اس کا ذکر انھوں نے اپنے شخصی کوائف نامہ (شائع کردہ ادارہ خیابان ادب چیمبرلین روڈ لاہور - ۱۹۸۲ء) میں کیا ہے۔ اس کے مطابق اردو میں لکھے گئے مقالات کی تعداد تین سو سے زیادہ بنتی ہے۔ انگریزی مضامین اور مقالات کی تعداد ایک سو دو ہے۔

زیر نظر منتخب کتابیات میں ان کی مطبوعہ کتب (بشمول پمفلٹ) کی تعداد ۴۶ ہے۔ ان کا عظیم کارنامہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی اشاعت ہے۔ جس کی بیس جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں مزید دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ اس کا اشاریہ بھی طباعت کے مراحل میں ہے۔ انھوں نے تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان کی تدوین و تصنیف میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ سید مرحوم نے اپنے شخصی کوائف نامے میں غیر مطبوعہ مسودات کا اندراج بھی کیا ہے۔ مقالات اور مضامین کی موضوع وار تقسیم کر کے کتاب کا نام درج کیا ہے۔ مسودات کے نام ذیل میں لکھے جاتے ہیں

۱۔ عزیز و محترم (بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے متعلق شخصی تاثرات ان کی تعداد ۵۰ ہے)۔

۲۔ تعلیم کے نئے زاویے (۱۹ مقالات کا مجموعہ ہے)

۳۔ نظریات دینی و تہذیبی بشمول سیرت (۱۸ مقالات)

۴۔ فکر و نظریات۔ (فکری و تہذیبی مسائل) ۴۳ مقالات پر مشتمل ہے۔

۵۔ مطالعۂ اقبال – نئی پیش رفت (اس میں ۱۶ مضامین شامل ہیں)

۶۔ ادب و فن – نئی بحث نئی نظر (اس میں ۴۳ مقالات ہیں)

۷۔ جدیدیت کے چند رخ (مغرب کے حوالے سے) ۱۵ مقالات پر مشتمل ہے

۸۔ پاکستانیات (فکری اور تہذیبی منظر) ۱۰ مقالات۔

۹۔ اقبالیات۔ تازہ تر (نقد و نظر) ۱۳ مقالات۔

۱۰۔ اسلام اور سوشلزم اس میں وہ مقالات شامل ہیں جو "نوائے وقت" میں عارف عزان اور "چٹان" میں احمد کبیر کے نام سے لکھے گئے۔

۱۱۔ تبصرے۔ دیباچے، شذرے (ان کی تعداد ۵۸ ہے)

۱۲۔ شخصی خود نوشت اور انٹرویو۔

۱۳۔ متفرق (ان کی تعداد ۲۲ ہے)۔

ان کے علاوہ سید صاحب نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ۴۸ کے قریب مقالات لکھے یا ان میں شریک مصنف کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کتابیات میں ان کی مطبوعہ کتب کے علاوہ مقالات درج کیے ہیں اس بنا پر اس کو منتخب کتابیات کا نام دیا گیا ہے۔ ایک جامع کتابیات سیّد کی ضرورت ہے اس پر کام کیا جا رہا ہے۔ اس کتابیات کی تیاری میں مختلف کتب حوالہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں فہارس اورینٹل کالج میگزین (ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم)، فکر و نظر کے پندرہ سال (جولائی ۱۹۶۳ء - جون ۱۹۷۸ء) ایک تفصیلی اشاریہ (مرتبہ احمد خاں)، اشاریہ ماہنامہ "ہمایوں" لاہور از ۱۹۲۲ء تا ۱۹۵۸ء (مرتبہ ڈاکٹر نسرین اختر) مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ چند ادبی رسائل کی وضاحتی فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں غیر مطبوعہ مقالات (Thesis) کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ان میں ادبی دنیا، صحیفہ اور فنون کی فہارس کے نام زیادہ معروف ہیں۔ اس کتابیات کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ کتب اور مقالات ان دونوں حصوں کے اندراجات کی ترتیب الفبائی ہے۔

کتب (بشمول پمفلٹ)

۱۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ

۲۔ اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء

۳۔ اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔
۴۔ اردو ذریعہ تعلیم اور نفاذ اردو ۔
۵۔ ارمغان علمی بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع۔
۶۔ اشارات تنقید ۔
۷۔ اطراف غالب ۔
۸۔ اعلیٰ تعلیم میں اردو کی حیثیت ۔
۹۔ اقبال اور قومیت ۔
۱۰۔ بحث ونظر ۔
۱۱۔ پاکستان ۔ تعبیر وتعمیر
۱۲۔ پاکستان میں اردو کا مسئلہ ۔
۱۳۔ تعلیم کے مقاصد (ترجمہ)
۱۴۔ خطبہ استقبال جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ ۱۰ رمئی ۱۹۶۹ء کو پڑھا گیا ۔
۱۵۔ دفتری زبان اور نصاب تعلیم ۔
۱۶۔ سہل اقبال ۔
۱۷۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ۔
۱۸۔ منتخبات نثر اردو (برائے بی اے و بی ایس سی)۔
۱۹۔ تعلیمی خطبات اور دوسرے مضامین ۔
۲۰۔ چند نئے اور پرانے نقاد ۔
۲۱۔ درخت اور دریچے ۔
۲۲۔ سخن ور (نئے اور پرانے)
۲۳۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ ۔
۲۴۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ۔
۲۵۔ طیف غزل (میر، درد، مصحفی اور آتش کی شاعری اور فن)۔
۲۶۔ طیف نثر (وجہی سے دور جدید تک اسالیب نثر اردو کے ارتقا کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ)۔
۲۷۔ فارسی زبان و ادب (مجموعہ مقالات)۔
۲۸۔ متعلقات خطبات اقبال ۔
۲۹۔ مسائل اقبال ۔
۳۰۔ کلچر کا مسئلہ ۔
۳۱۔ کیا اقبال اشتراکی تھے ؟
۳۲۔ مباحث ۔
۳۳۔ مثنوی مل دمن (احمد سرادی)
۳۴۔ مقاصد اقبال (طبع ثانی)
۳۵۔ مقامات اقبال ۔
۳۶۔ میر امن سے عبدالحق تک ۔
۳۷۔ نقد میر ۔
۳۸۔ نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات (عبدالواسع ہانسوی) بہ تصحیح وتحشیہ و مقدمہ ۔
۳۹۔ وجہی سے عبدالحق تک ۔
۴۰۔ وضع و استناد اصطلاحات ۔
۴۱۔ ولی سے اقبال تک ۔
۴۲۔ ولی سے اقبال تک ۔ (طبع ثانی)
۴۳۔ Descriptive catalogue of the Persian, Urdu and Arabic Manuscripts in the Punjab University Library, Lahore, University of the Punjab, 1942-48 (V.I, Fasc. I History, Fasc II Persian Poetry)
۴۴۔ تذکرہ مردم دیدہ (عبدالحکیم حاکم لاہوری) تصحیح و ترتیب ۔
۴۵۔ معجم مصادر اسلامی ۔

مقالات

۱۔ آپ بیتی ۔ "نقوش" لاہور ۔
۲۔ اندراج مختص ۔ اورینٹل کالج میگزین ۔
۳۔ ادارہ معارف اسلامیہ کے افتتاحی اجلاس کے سلسلے میں قلمیات و مسکوکات کی ایک شاندار نمائش ۔" اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۴ ۔ ادب، اخلاق اور آزادی ۔ "ہمایوں" لاہور ۔

۵ ۔ اُردو اپنے نئے ماحول میں ۔ "ہمایوں" لاہور ۔

۶ ۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (سلیم اختر) تبصرہ "نقوش" لاہور ۔

۷ ۔ اُردو ادب میں پاکستانیت کا مسئلہ "سرسیدین" راولپنڈی ۔ پاکستانی ادب ۔

۸ ۔ اُردو خطوط نگاری ۔ "نقوش" ۔ لاہور ۔

۹ ۔ اردو کو رائج کرنے کے لیے آرڈیننس جاری کیا جائے ۔ "چٹان" لاہور ۔

۱۰ ۔ اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں "قومی زبان" کراچی ۔

۱۱ ۔ اردو کا ایک جرمن شاعر فرانسو "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۱۲ ۔ اردو کی تعمیر میں خان آرزو کا حصہ ۔ "اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۱۳ ۔ اردو کے موجودہ اہم مسائل ۔ "قومی زبان" ۔ کراچی ۔

۱۴ ۔ اردو میں سائنسی ادب ۔ "فنون" لاہور ۔

۱۵ ۔ ارمغان علمی بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع (دیباچہ)

۱۶ ۔ اسلام اور ماڈرنزم ۔ "فکر و نظر" ۔ اسلام آباد ۔

۱۷ ۔ اقبال اور ابن خلدون ۔ "اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۱۸ ۔ اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے ۔ "صحیفہ" لاہور ۔

۱۹ ۔ اقبال اور سیاسیات ۔ "ہمایوں" ۔ لاہور "معارف" اعظم گڑھ ۔

۲۰ ۔ اقبال اور معراج النبی ۔ "فکر و نظر" اسلام آباد ۔

۲۱ ۔ اقبال اور وجودیت ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۲۲ ۔ اقبال کا تصور پیکار ۔ "ضیا بار" سرگودھا ۔

۲۳ ۔ اقبال کی زبان ۔ "ماہ نو" کراچی ۔

۲۴ ۔ اقبال صاحب ۔ "مجلہ تحقیق" لاہور ۔

۲۵ ۔ انگرودو ۔ پاکستان کی نئی زبان ۔ "چٹان" ۔ لاہور ۔

۲۶ ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت فارسی زبان کی حالت ۔
"اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۲۷ ۔ ایک خرد افروز کتاب (تاریخ اور کائنات ۔ میرا نظریہ) ۔ تبصرہ
"فنون" لاہور ۔

۲۸ ۔ پاکستان میں اردو کا مستقبل ۔ "ہمایوں" ۔ لاہور

۲۹ ۔ پاکستان میں اردو کی بقا ۔ "چٹان" ۔ لاہور

۳۰ ۔ پاکستان میں ایک نئی جناتی زبان ۔ "اخبار اردو" کراچی ۔

۳۱ ۔ پاکستان میں عربی فارسی کی تعلیم کا مستقبل ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۳۲ ۔ بیرونی سوسائٹی میں شاعر کا مجلسی مقام ۔ "ہمایوں" ۔ لاہور ۔

۳۳ ۔ پروفیسر محمود شیرانی ۔ "نقوش" لاہور ۔

۳۴ ۔ پنجاب کا ایک اور ریختہ گو پیر قلندر شاہ ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۳۵ ۔ تاریخ لاہور پر مزید دھندلی سی روشنی ۔ "مجلہ تحقیق" ۔ لاہور

۳۶ ۔ تحریک پاکستان کے ثقافتی محرکات ۔ "سرسیدین" راولپنڈی ۔ پاکستانی ادب ۔

۳۷ ۔ ترک عالم طاش کبری زادہ کے تعلیمی تصورات "مجلہ تحقیق" لاہور ۔

۳۸ ۔ تزکات تیموری ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۳۹ ۔ تنقیدی دبستان ۔ (سلیم اختر) تبصرہ ۔ "نقوش" لاہور

۴۰ ۔ تنقید کیا ہے ۔ "سرسیدین" راولپنڈی ۔ پاکستانی ادب ۔ تنقید ۔ پانچویں جلد ۔

۴۱ ۔ ثنائے خواجہ (نعتیہ کلام) تبصرہ "فنون" لاہور ۔

۴۲ ۔ چندر بھان برہمن ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۴۳ ۔ حافظ لدھیانوی کے قطعات ۔ تبصرہ "نقوش" لاہور ۔

۴۴ ۔ حالی کی قطعہ نگاری ۔ "نقوش" ۔ لاہور ۔

۴۵ ۔ خزائن مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۴۶ ۔ خط کی کہانی مخطوطات کی زبانی ۔ نذر رحمٰن لاہور ۔

۴۷ ۔ دنیا میں اردو جنگ عظیم کے بعد ۔ "اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۴۸ ۔ راجہ نرنیدر ناتھ کا ایک اور مکتوب ۔ "ادبی دنیا" ۔ لاہور ۔

۴۹ ۔ رحمٰن صاحب ۔ ایک تاثر ۔ نذر رحمٰن لاہور ۔

۵۰ ۔ سرسید کے زیر اثر ادبی تنقید کی ابتدا ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۵۱ ۔ سرسید کے ہم خیال علما کے دینی نظریے ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۔

۵۲ ۔ سیرت طیبہ حضورؐ کے اسما و القاب کے آئینہ میں ۔ "نقوش" لاہور ۔ رسول نمبر ۔

۵۳ ۔ سیرت النبیؐ (شبلی) ۔ "اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۵۴ ۔ سیرت نبوی کا پیغام ۔ عصر حاضر کے نام ۔ "نقوش" ۔ لاہور ۔

۵۵ ۔ شبلی فکر جدید سے کیونکر روشناس ہوئے ۔ "اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور ۔

۵۶ ۔ شعرائے اُردو کے جلسے "ہمایوں" لاہور ۔

۵۷۔ صنائع و بدائع کی تعلیم جمالیاتی نقطۂ نظر سے۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۵۸۔ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کے چند موقعے۔ "ادبی دنیا" لاہور۔

۵۹۔ عہد اکبری۔ ہندوؤں میں فارسی دانی کا آغاز۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۰۔ عہد محمد تغلق کے مصنفین۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۱۔ غالب کا نارسیدہ کلام۔ "نقوش" لاہور۔

۶۲۔ غالب کے چند تذکروں پر ایک نظر۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۳۔ غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۴۔ غزل، غزلیت اور تغزل۔ "صحیفہ" لاہور۔

۶۵۔ فارسی شاعری اور مسائل حیات۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۶۔ فارسی شاعری میں گل و گلزار کی حقیقت۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۶۷۔ فن سیرت نگاری پر ایک نظر۔ "فکر و نظر" اسلام آباد۔

۶۸۔ قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ۔ "اورینٹل کالج میگزین"۔ لاہور

۶۹۔ کتاب خانہ شیرانی کے نوادر۔ "اورینٹل کالج میگزین"۔ لاہور

۷۰۔ کلام اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت۔ "معارف" اعظم گڑھ۔

۷۱۔ کلام اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت۔ "پیام حق" لاہور۔

۷۲۔ گرو نانک کی فارسی تعلیم کہاں تک تھی۔ اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۳۔ لطائف نامہ فخری۔ "اورینٹل کالج میگزین"۔ لاہور۔

۷۴۔ مثنوی بے غم بیراگی۔ "اورینٹل کالج میگزین"۔ لاہور۔

۷۵۔ محاکمات الشعراء محمد حسن۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۷۶۔ محسن الملک۔ "نقوش"۔ لاہور۔

۷۷۔ مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات۔ "نقوش"۔ لاہور۔

۷۸۔ مشکل اور آسان زبان کا مسئلہ۔ "اخبار اردو" اسلام آباد۔

۷۹۔ معجم مصادر اسلامی۔ ایک علمی منصوبہ۔ "فکر و نظر" اسلام آباد۔

۸۰۔ مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام۔ "ماہ نو" کراچی۔

۸۱۔ مغرب کا اثر ادب اردو پر (عبدالقادر)۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۲۔ میر اور ذہن جدید۔ "صحیفہ" لاہور۔

۸۳۔ میر علی شیر کی بزم شعر و سخن۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۸۴۔ میر کا رنگ طبیعت۔ "نقوش" لاہور۔

۸۵۔ نذیر احمد کی انفرادیت۔ "نقوش" لاہور۔

۸۶۔ نذیر احمد کے قصے۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۸۷۔ نظام الملک ثانی یعنی میر علی شیر نوائی۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۸۸۔ نل دمن احمد سراوی اور اس کی زبان۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۸۹۔ نور خان کی تعلیمی تجاویز۔ "اخبار اردو" اسلام آباد

۹۰۔ واردات سرمد۔ "نقوش" لاہور۔

۹۱۔ ہماری درسیات میں اقبال کی نمائندگی۔ "سیارہ" لاہور۔

۹۲۔ ہمارے پرانے شاعروں کی علمی استعداد۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۹۳۔ ہندوؤں کا فارسی لٹریچر۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۹۴۔ ہندوؤں کے فارسی لٹریچر پر ایک نظر بازگشت۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔

۹۵۔ یک چمن گل (گلدستۂ انتخاب) "نذر رحمن"۔ لاہور۔

"انگریزی کا بے جا غلبہ ہماری ملی حمیت کی توہین ہے اور عملی لحاظ سے تضیع اوقات اور قومی مصلحتوں کے لیے بے حد خطرناک اور افسوسناک ہے": (ڈاکٹر سید عبداللہ)

خراجِ عقیدت

روشنی کا مینار

ڈاکٹر سید عبداللہ فوت ہو گئے !

یہ ایک خبر صرف چند الفاظ پر مشتمل مگر اس خبر کو سن کر پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر ہزاروں آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئی ہیں۔ یہ اشک بار آنکھیں سید صاحب کے شاگردوں کی ہیں، ان کے مداحوں کی ہیں ۔

سید صاحب صحیح معنوں میں روشنی کا ایک مینار تھے جس کی روشنی یہاں وہاں، جہاں، تہاں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایوانِ ادب کے ایک بہت اہم ستون تھے انہیں استاد الاساتذہ کہنا کسی صورت بھی خلافِ حقیقت نہیں ہے ۔

سید صاحب نے بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ یہ زندگی مسلسل جدوجہد کی زندگی ہے۔ شبانہ روز سعی و عمل کی زندگی ہے۔ تجزیہ کیا جائے تو شاید ان کی اسی سالہ طویل زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملے گا جو گوناگوں مصروفیات سے خالی ہو۔ قدرت نے ان کے نحیف و نزار پیکر میں جوشِ عمل اس طور سے بھر دیا تھا کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ فراغت کس چیز کا نام ہے کیونکہ فراغت تو ان کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ کام کام اور صرف کام، ان کا ماٹو تھا، ان کا حقیقی مشن تھا۔ ان کی غیر مختتم جدوجہد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس جدوجہد کے بعض پہلوؤں کی صرف نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۰۶ء میں ہزارہ ڈویژن صوبہ سرحد کی تحصیل اور ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگ سے حاصل کی۔ ان کے والد گرامی اپنے دور کے ایک نامور عالمِ دین، ماہرِ علومِ دینیہ اور حکیم تھے۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ اپنے بچے کو ایسی تربیت دیں کہ یہ بچہ جب بڑا ہو تو ایسا ہو کہ ملک و ملت اس کی ذات پر فخر کرے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور آج ملک اور قوم کو احساس ہو رہا ہے کہ وہ اپنے ایک قابلِ فخر فرزند سے محروم ہو گئی ہے۔ مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید عبداللہ عازمِ لاہور ہوئے۔ یہاں جس شخصیت نے ان کے دل و دماغ پر اثرات مرتب کیے وہ مولانا احمد علی تھے۔ مولانا ہر روز بعد از نمازِ عشاء مسجد شیرانوالہ میں درس دیتے تھے اور سید عبداللہ اس درس میں التزاماً شامل ہوتے تھے۔

کچھ مدت بعد سید عبداللہ لاہور سے نکل کر علی گڑھ میں چلے گئے۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ ہی میں تھا۔ یہاں سید عبداللہ کو بطل حریت مولانا محمد علی جوہر کی صحبت میسر آئی۔ ان کے علاوہ انہیں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سورتی، اور مولانا سراج پوری سے اخذ فیض کا موقع ملا۔ مولانا سورتی عربی زبان و ادب کے جید عالم تھے، درویشانہ شان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ سید عبداللہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنے جو حالات زندگی تحریر کیے ہیں ان میں مولانا سورتی کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ مولانا نے ان کا نظریہ حیات تشکیل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا تھا۔

جامعہ ملیہ سے وہ پھر مراجعت فرما کر لاہور آ گئے اور اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۶ء میں فارسی ایم اے کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بطور فہرست ساز ملازم ہو گئے۔ اس دور میں انہوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے عربی فارسی مخطوطات کی ایک جامع فہرست مرتب کی۔ منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کر کے کئی نہایت قیمتی مسودات کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ یونیورسٹی لائبریری میں وہ فہرست سازی کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام بھی کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ، جو کسی علمی تدریسی سطح پر سب سے بڑی ڈگری ہے۔

اورینٹل کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی کوششوں سے اس کالج میں ایم اے اردو کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔ ان کے تدریسی حلقے سے ہر سال ایم اے کے ڈگری یافتہ افراد کالج سے نکلنے لگے۔ ان ڈگری یافتہ لوگوں میں وہ افراد نظر آتے ہیں جنہیں آج ہم مشاہیر ادب کی فہرست میں جگہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مرزا محمد منور، امجد الطاف، قیوم نظر، یوسف ظفر، ریاض احمد، ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور نوجوانوں میں امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی یہ صرف چند نام ہیں ان کے کئی ممتاز شاگرد پاکستان میں اور پاکستان کے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جنہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے زیر سایہ اکتساب علم کیا ہے اور خود سید عبداللہ بھی بڑے خوش قسمت تھے کہ انہیں مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر اقبال اور پروفیسر حافظ شیرانی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا۔

یہ تینوں بزرگ طبعاً محقق تھے۔ تحقیق سے انہیں فطری لگاؤ تھا اور ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ اپنے کام میں "کاملیت" کے آرزو مند ہوتے تھے جو کام بھی کرتے تھے اس کے تمام اجزا، تمام عناصر کو پیش نظر رکھتے تھے اور جب تک اپنی تحقیقی کاوش کو آخری حد تک پہنچا نہیں دیتے تھے، مطلقاً مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ ان بزرگوں کی صحبت میں رہ کر سید عبداللہ نے جگر کاوی، محنت شاقہ اور جانفشانی کا فن سیکھا۔ ان کے مدنظر یہ اصول بھی رہتا تھا کہ اورینٹل کالج کا کام فقط یہ ہے کہ کام کرنے والوں کے لیے بنیادی مواد مہیا کر دے کسی انعام اور صلے کی توقع کے بغیر یہ سبق سید عبداللہ نے اپنے استادوں سے سیکھا اور ساری عمر اس پر عمل پیرا رہے۔ ۱۹۶۴ء میں سید عبداللہ نے اورینٹل کالج کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اگرچہ ابھی ان کی ملازمت ختم ہونے کا وقت نہیں آیا تھا وہ اس کالج سے بطور پرنسپل کے ریٹائر ہوئے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ سے بطور صدر کے وابستہ ہو گئے۔ انسائیکلوپیڈیا کا سارا کام کیا۔ فقط دو تین جلدوں میں کچھ کام کرنا باقی رہ گیا تھا کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ علالت کے دوران میں اپنے ملاقاتیوں سے کہا کرتے تھے میری آرزو ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی آخری جلد مکمل کر کے دنیا سے جاؤں ایسا نہ ہو سکا قدرت کو یہی منظور تھا انسان کیا کر سکتا ہے؟

سید صاحب کے اعزازات کی فہرست خاصی طویل ہے وہ پروفیسر ایمریطس تھے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے بنیادی رکن تھے۔ مجلس ترقی ادب کے رکن اور انجمن ترقی اردو لاہور کے خصوصی ناظم تھے۔ ۱۹۵۹ء میں حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ ملا تھا اور اسی سال ایران کی حکومت نے انہیں "نشان سپاس" بھی دیا تھا۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ مقتدرہ قومی زبان شاخ لاہور کے مشیر تھے۔ سید صاحب نے مختلف جہتوں میں کام کیا تھا اور ان کا جذبہ فعالیت ابھی سرد نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ چلے گئے ہیں مگر یہ شعر ان کی ذات پر منطبق ہوتا ہے

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے اہل نظر شد مزار ما

پروفیسر سید حسین شاہ فدا

بابائے اُردو ثانی

کئی ماہ تک فالج کا مریض رہنے کے بعد ۱۴ / اگست ۱۹۸۷ء کو عین یوم آزادی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کی بیتاب روح نے قفسِ عنصری سے بھی آزادی حاصل کر لی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ومغفور ڈاکٹر سید عبداللہ منگلور، ضلع مانسہرہ، ہزارہ ڈویژن میں ایک صاحبِ علم و صاحبِ شریعت وطریقت نور احمد شاہ مرحوم کے گھر ۵ اپریل ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے۔ والدہ قرآن خوان، دیندار خاتون تھیں۔ بچپن کی تربیت عمدہ تھی۔ پرائمری کی تعلیم اپنے گاؤں میں مکمل کی، اس کے بعد مانسہرہ کے مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ چھٹی جماعت میں تھے کہ والد فوت ہوگئے۔ بحالتِ یتیمی مڈل کا امتحان بمشکل پاس کیا اور ایبٹ آباد کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے نویں جماعت میں تھے کہ گردشِ روزگار انہیں لاہور لے گئی۔ لاہور کی مساجد خصوصاً نیلا گنبد کی مسجد میں بارِیشِ دراز رہ کر کچھ عرصہ عربی پڑھتے رہے، مولانا احمد علی کے حلقہ درس میں شامل رہے پھر تحصیلِ علم کا شوق اور تحریکِ خلافت کا جوش انہیں علی گڑھ لے گیا۔ کچھ زمانہ جامعہ ملیہ دہلی میں بھی داخل رہے۔ وہاں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے علمی استفادہ کیا۔ مولانا سورتی سے عربی پڑھی پھر لاہور چلے آئے اور ۱۹۲۴ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوکر مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔ اس سے دو سال پہلے ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔

اب ان کی مزید تعلیم کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ لہٰذا میٹرک تا بی اے انگریزی کے مضمون میں سلسلہ وار امتحانات پاس کرتے ہوئے ۱۹۲۶ء میں ایم اے فارسی بھی کر لیا۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کیٹیلاگر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ایم او ایل کی اعزازی ڈگری ملی۔

۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء فارسی ریسرچ سکالر کی حیثیت سے "ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے موضوع پر تحقیقات جاری رکھی اور کتاب شائع کرائی۔ اس کی بدولت ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ملی۔ لائبریری سائنس کا امتحان بھی اسی دوران پاس کر چکے تھے، جرمنی زبان کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا اورینٹل کالج میں پروفیسر ڈاکٹر اقبال اور پروفیسر شیرانی اور پروفیسر محمد شفیع سے استفادہ کیا۔ یونیورسٹی میں ہی معلم کے طور پر تقرر ہوگیا، پھر عربیک اسسٹنٹ صیغۂ فارسی کے صدر مدرس، پھر شعبہ اردو میں لیکچرار اور بعد میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اردو کے ریڈر بھی رہے اور صدر شعبہ اردو بھی رہے۔

۱۹۵۴ء میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل اور شعبۂ عربی کے اعزازی صدر بھی رہے۔ اردو ادب میں چوٹی کے نقاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اردو دائرہ انسائیکلوپیڈیا میں بہت کام کیا اس کی کئی جلدیں مرتب ہوئیں، معلوم ہوا کہ آخری جلد اب بھی زیرِ ترتیب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں تیس سال تک خدمات سرانجام دیں آپ اورینٹل کالج کو اورینٹل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد اس بات کے خلاف ہوگئے۔ کچھ مزید اختلافات بھی سامنے آنا شروع ہوگئے تھے چنانچہ اس عظیم شخصیت نے ان صدمات سے متاثر ہوکر بادلِ نخواستہ یونیورسٹی سے قبل از وقت ہی ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کی اس بے وقت سبکدوشی کو تمام علمی و ادبی حلقوں نے محسوس کیا۔ اربابِ یونیورسٹی نے ان کے ساتھ یہ مہربانی ضرور کی کہ باقی ماندہ مدتِ ملازمت کے لیے یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق رخصت با تنخواہ منظور کر لی، ان کی یہ ریٹائرمنٹ ایک عظیم قومی سانحہ تھا۔

۵ اپریل ۷۷ ۱۹ء کو ان کے اپنے ہی گاؤں کے ایک عزیز شاگرد ممتاز منگلوری کی مساعی سے جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنی عمر کے ساٹھ سال پورے کر چکے تھے۔ پاکستان بھر میں ان کے ارادت مندوں کے تعاون سے "یوم تجدید عزم" کے عنوان سے سالگرہ منائی گئی تمام مقامات کی جامع رپورٹوں سے ایک ضخیم کتاب "سوغات" کے نام سے (جو ٹائپ کے ۲۷۰ طولانی صفحات پر مشتمل ہے) منگلوری نے شائع کرائی جو ان دنوں پشاور کے محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں اور پی ایچ ڈی کر کے اب ڈاکٹر ہیں۔

سید صاحب نے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر بھی ادب کی خدمت جاری رکھی، انجمن ترقی اردو پنجاب کے ناظم اعلیٰ رہے، مختلف ادبی کانفرنسوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہے۔ ان کی تقریر ہمیشہ بکثرت عربی الفاظ پر مشتمل تحریر کی صورت میں ہوتی تھیں۔ زبانی تقریر کے کم عادی تھے۔ یونیورسٹی اردو دائرۃ المعارف، اسلامیہ کمیٹی، رسم الخط کمیٹی اور اردو کمیٹی کے کنوینر رہے، اردو کالج لاہور بھی جاری کیا تھا، جو بعد میں نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ حکومت ایران کی جانب سے آپ کو نشانِ سپاس اور حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغہ اور پانچ ہزار کا نقد انعام بھی ملا۔ یہ اُس وقت کا بہت بڑا اعزاز تھا۔ قوم نے بابائے اردو ثانی کا خطاب دیا۔

گردشِ روزگار نے سید صاحب کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ پوری زندگی مسلسل کشمکش اور جد و جہد میں گزری۔ ریاضت اور جگر کاوی نے آخری عمر میں ان کی صحت کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا وہ خود کہتے تھے سیہ بختم، پریشان روزگارم خانہ بر دوشم، ذاتی ذوق، مسلک اور مشرب کے متعلق سوالات کو وہ "جنگ کا آغاز" قرار دیتے تھے، فرقہ بندی کے خلاف تھے، اتحاد بین المسلمین کے حامی تھے۔ ان مسائل پر زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ السنۂ شرقیہ کے مستند فاضل تسلیم کیے جاتے تھے۔ علوم مشرقی کو انگریزی دور میں کمتر حیثیت دینے کے وہ ہمیشہ ہی خلاف رہے۔ ان کی گفتار سنجیدگی اور مزاح کا ایک تیکھا انداز لیے ہوتی تھی' الفاظ میں محبت کی کھلاوٹ اور صبح کی شبنم کا ٹھہراؤ تھا، بالعموم سفید قمیض اور شلوار میں ملبوس رہتے۔ انگریزی لباس بعض مواقع پر پہن بھی لیتے تھے لیکن شاذ و نادر۔ اب وہ کلین شیو کے عادی ہو چکے تھے۔

ہندوستان اور پاکستان کے گوشہ گوشہ میں ان کی خدمات جلیلہ کا شہرہ تھا۔ ان کے ہزاروں شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے جب بھی کوئی تکلیف پہنچی تو کہتے

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

علم عروض جانتے تھے اعلیٰ درجے کے شعر فہم تھے لیکن شاعری کو شغل کے طور پر نہیں اپنایا۔ نثر میں خوب نام پیدا کیا غم پسند انسان تھے آخری عمر میں وہ کچھ تنہائی پسند ہو گئے تھے اپنے وطن ہزارہ کے ملاقاتیوں سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کرنے لگے تھے ممکن ہے اُن کا یہ رویہ پیرانہ سالی یا بعض ذاتی تلخ تجربات کا نتیجہ ہو۔ ان کے ایک قریبی دوست اور نقاد سید بخاری پشاوری ہیں۔ جنہوں نے میری منظوم تصنیف "ساقی نامہ" پر بھی تقریظ لکھی ہے انہوں نے اپنی ایک تصنیف ادبیاتِ سرحد جلد سوم، میں ڈاکٹر صاحب کی تنقیدوں کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں طبعاً تسکین دوست ہو چکے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ تھکن اور اضمحلال کی علامت ہے جس کا پیرانہ سالی اور غیر صحت مند قویٰ سے گہرا تعلق ہے" یہ فارغ بخاری صاحب کا ذاتی تجزیہ تھا۔

میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اور ایران کے سفر سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ لاہور مقیم رہا چند ادبی رسالوں میں کام کرتا تھا اس دوران میں اُن کی کوٹھی کے نزدیک ہی ایک کرایے کے مکان میں رہائش پذیر تھا اُن کے انجمن ترقی اردو دفتر واقع اردو نگر ملتان روڈ میں ہر شام کو باقاعدگی سے ان سے ملاقاتیں ہوتیں وہاں ان کے دیگر احباب بھی آ جاتے اور دیر تک پر لطف علمی مباحث جاری رہتے ہیں اُن دنوں اپنی منظوم اردو تصنیف "خطاب بہ اُمت مسلمہ" بطرز ساقی نامہ مرتب کر رہا تھا جسے وہ بھی کبھی کبھی مطالعہ کر لیتے اور بلا استحقاق میری شاعری کو دریائے رواں اور قدرتی شاعری کا نام دینے لگتے حالانکہ مجھے اپنی بے علمی بے بضاعتی کا پورا پورا احساس تھا۔ میں اُسے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آخری عمر میں اُن کا

حافظہ کمزور پڑ گیا تھا یہ ایک قدرتی بات ہے ؎

اب نہ آئے گا کوئی آبلہ پا ان کے بعد

سید صاحب کی بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔

التنبیہات علی الکامل، لطائف نامہ فخری قلمی، اردو داد سباحہ کلمۂ عظیم کے بعد شعرائے اردو کے تذکرے، تذکرہ نگاری کا فن، نوادر الالفاظ خان آرزو، تذکرہ مردم دیدہ، تعلیم کے مقاصد، بحث و نظر، دلی سے اقبال تک، نقد میر، مقامات اقبال، مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری، سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کا فکری و فنی جائزہ، ارمغان علمی وغیرہ، علی ہذا ان کے مختلف مطبوعہ مقالات و مضامین کا تو شمار ہی نہیں۔ بسیار نویس تھے، کتابوں کے کیڑے اور تحقیقاتی امور میں مانے ہوئے مجاہد تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:

؎ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

میں نے اپنے مقالے میں کچھ تحریر کیا ہے بڑے وثوق اور حقیقاتی ثبوت ساتھ لکھا ہے۔ میرے پاس ان کے خطوط اور ایسے شواہد موجود ہیں لاریب فیہ

؎ یہ تیرے نغموں کی لڑیاں ٹوٹ کر رہ جائیں گی
ذرہ ذرہ کروٹیں بدلے گا تیری یاد میں

زمانے کی گردش بڑی عبرت آموز شے ہے۔ کل تک ہم جس زبان کو قومی تشخص کا نشان اعظم سمجھتے تھے اس کے حال زبوں کو کوئی اب آ کر دیکھے، جو سلوک اس کے ساتھ ہو رہا ہے، اس پر کیا لکھیے اور کیا کہیے۔ ناطقہ سر بگریباں ہی نہیں خود گریبان کی جستجو میں ہے کہ کہیں سراغ ملے تو اس کے چاک میں سر کو چھپا سکے اور خامہ انگشت بدنداں ہونا بھی چاہے تو اب وہ دنداں ہیں کہاں کہ کوئی انگلی رکھے تو کہاں رکھے، کوئی الطاف حسین حالی ہوتا تو شکوۂ اردو لکھتا، کوئی اقبال ہوتا تو جواب شکوہ کے پردے میں اپنے درس خودی کی اس توہین پہ ماتم کرتا۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان کی ایک نئی جناتی زبان" اخبار اردو اکتوبر ۱۹)

ڈ انور سدید

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات پر یوں لگا جیسے ادب کا ایک بڑا چھتنار سا ہوا در مختلف بولیاں بولنے والے پرندوں کو آشیانے سے محروم کر گیا ہو۔ سید صاحب زندہ تھے تو وہ ہر قسم کے ادیب کی پناہ گاہ تھے۔ ادارہ معارف اسلامیہ ہو یا انجمن ترقی اردو کا دفتر یا ان کے گھر کا "المکان" سید صاحب کی جگہ ہر وقت ہر قسم کے ادیب کے لیے کشادہ تھیں۔ وہ محمد حسین آزاد کے سلسلے کے آخری آدمی تھے جو ادب کو کوزوں میں بند نہیں کرتے بلکہ اسے سیل رواں کی صورت میں اگلے زمانوں اور اگلے لوگوں کو منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوتے فقیر آزاد کے تکیے کی طرح نظر آتے جہاں درخت کی خنک چھاؤں اور ٹھنڈے پانی کا مٹکا ہوتا تشنہ کامان ادب آتے پیاس بجھاتے تھکن اتارتے پھر تازہ دم ہو کر اگلی منزلوں کو روانہ ہو جاتے۔ لاہور میں سید صاحب کا فیضان عام عرصے سے جاری تھا۔ ادب کے پیاسوں نے ان کے سانحہ ارتحال تک اپنی جھولیاں بھریں اور پیاس بجھائی لیکن جب انہیں چار پائی پر کفن میں ڈوبا ہوا دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا ؎

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سید صاحب بنیادی طور پر استاد تھے اور انہوں نے تادم وفات اسی مقام ومنزلت پر متعین رہنا ہی پسند کیا۔ انہوں نے زندگی کی ابتدا بہت معمولی درجے کی ملازمت سے کی لیکن ان کا دل پیاسا تھا۔ وہ اس صدی کے اوائل میں ہزارہ سے لاہور آئے تو یہ شہر بے مثل علمی اور ادبی سرگرمیوں سے جگمگا رہا تھا۔ سید صاحب ان سرگرمیوں کے تماشائی نہیں بنے بلکہ اپنی روح کی پیاس بجھانے لگے۔ وہ مسلسل محنت کی لازوال مثال تھے اور محنت بھی وہ جو ایک علمی انسان کی ادبی پیاس کو مطالعے کی افراط سے کم نہیں کرتی بلکہ اسے مزید بڑھا دیتی ہے۔ وہ جتنا پڑھتے مزید مطالعے کی تمنا اتنی ہی اور بیدار ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے لائبریرین ان کے سامنے الماریوں کی کنجیاں رکھ دیتے اور وہ جس کتاب تک چاہتے رسائی حاصل کر لیتے پھر وہ وقت بھی آگیا جب پوری لائبریری ان کی تحویل میں آگئی اور سید صاحب استفادہ عام کے لیے لوگوں کی رہنمائی کرنے لگے۔ وہ اپنے ذوق ادب اور آرزو کے مطابق پنجاب یونیورسٹی میں لائبریرین مقرر ہو گئے تھے۔ ان کی اس دور کی ایک تصویر مرزا ادیب نے یوں پیش کی ہے۔

کتابوں کی ایک الماری کے پیچھے مجھے ایک بے آب و رنگ نحیف و خشک سا چہرہ دکھائی دیا اور معاً میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ فراعنہ کے زمانے کی کوئی ممی ہے۔ جسے عجائب گھر سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے کام آئے جو آثار مصر پر ریسرچ کر رہے تھے۔"

اور سید صاحب واقعی ان لوگوں کے زیادہ کام آئے جنہیں ادب کے آثار قدیمہ کی تلاش میں دلچسپی تھی اور جو ادب کی موجودہ بستی کو کتب قدیمہ کے نور سے مالا مال کرنے کے آرزومند تھے۔ میں نے کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" میں انجمن پنجاب کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ

"انجمن پنجاب نے تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کی جو طرح ڈالی تھی وہ مرور ایام کے ساتھ مردہ نہیں ہوئی بلکہ صداقت یہ ہے کہ اورینٹل کالج لاہور نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں نہ صرف قابل قدر خدمات سرانجام دیں بلکہ تحقیق کی صداقت، تنقید کی دیانت اور تصنیف کی ندرت کی نئی نظیر قائم کردی۔"

اورینٹل کالج لاہور نے ادب کے مشعل برداروں کا جو قافلہ مرتب کیا اس میں ڈاکٹر لائٹنر، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال، محمود شیرانی اور شاداں بلگرامی کے ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ کا اسم گرامی بھی بے حد نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے جو مشعل پکڑی تھی اسے وفات تک جلائے رکھا اور اب یہ روشنی کتابوں سے ابھر رہی ہے جن کی تعداد گنی نہیں جا سکتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

کا طلوع اس وقت ہوا جب حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی روایت پروان چڑھ چکی تھی اور ان کے اس نظریے کو قبولِ عام مل چکا تھا کہ اردو کی آبیاری پنجاب کی سرزمین میں اور مسلمانوں نے کی ہے اور یہ کہ اردو زبان پنجابی زبان سے پیدا ہوئی ہے۔ سید صاحب نے حافظ محمود شیرانی سے کتب میں گہرا جھانکنے اور مسلسل محنت کا فن حاصل کیا۔

اس زمانے کی ایک تصویر مجھے ایک ادیب ہی نے دکھائی ہے۔ اور وہ یوں ہے۔ "پہلی مرتبہ جب میں نے سید عبداللہ صاحب کو دیکھا تو وہ حافظ محمود شیرانی کے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور میں اندر جا رہا تھا یوں لگا کہ جس قد و قامت کے یہ خود تھے۔ اسی قد و قامت کی کتاب ان کی بغل میں تھی میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر رہ گیا کتاب انہوں نے اٹھا رکھی ہے یا کتاب نے ان کا وزن اٹھا رکھا ہے؟"

ڈاکٹر سید عبداللہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو کتاب کا وزن اٹھاتے ہیں۔ وہ تو کتاب کو خوشبو بنا کر اپنے دل میں بسا لیتے تھے پھر یہ خوشبو آہستہ آہستہ ان کے مضامین، مقالات، خطبات، تقاریر اور کتابوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا طالب علموں میں تقسیم ہو جاتی۔ چنانچہ انہوں نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی روایت کو بھی اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اورینٹل کالج کے طلبہ میں ذوقِ تحقیق و تنقید پیدا کرنے میں صرف کر دیا اور یہ بات بے حد خوش آئند ہے کہ اردو ادب میں تحقیق کی جو صحت مند روایت پیدا ہوئی وہ سید صاحب کے اس دور سے متعلق ہے جب وہ اورینٹل کالج میں پرنسپل تھے اور ان کے سلسلہ تحقیق و تنقید میں ڈاکٹر وحید قریشی، محمد منور مرزا، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر ملک حسن اختر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، صابر لودھی اور ڈاکٹر پرویز پروازی چند ایسے نام ہیں جو مجھے ارتجالاً یاد آ رہے ہیں۔ ادب کی یہ کہکشاں سید عبداللہ صاحب نے ہی مرتب کی تھی۔ سید صاحب زندگی میں مثبت عمل کے حامی تھے۔ وہ صحت مند اختلاف کو ادب اور زندگی کے لیے نعمت تصور کرتے تھے۔ لیکن بے حاصل محاذ آرائی کو جس سے امنِ عامہ خطرے میں پڑ جائے پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی منفی قوتیں ان پر حملہ آور ہو جاتیں وہ انہیں کھل کر کھیلنے کا موقع دیتے اور خود بلطائف الحیل طرح دے جاتے۔ ان

ہوتا ہے جو انسان کے پیش نظر ہوتی ہے اور نفسِ ذات اپنا اندر [illegible] کرنے کے بعد خود ہی دم توڑ دیتی ہے۔ سید صاحب کے پاس تو پیغامِ محبت تھا اور وہ اسے دور دور تک پہنچانے کے لیے صرف محبت کی زبان استعمال کرتے تھے۔
ان کی زندگی بامقصد تھی اور وہ کہا کرتے تھے کہ

"زندگی بغیر کسی نصب العین کے بیکار ہے۔ زندگی جس قدر وسیع اور بلند ہوگی نصب العین اسی قدر ارفع اور اعلیٰ ہوگا۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بغیر کسی آئیڈیل کے زندگی بسر کر کے مر جاتے ہیں۔ جب کوئی اعلیٰ نصب العین پیش نظر نہ ہو تو انسان کے سینے میں وہ حرارت پیدا نہیں ہو سکتی جو اسے مسلسل مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ علم حاصل کرنا اور اس میں وسیع درجہ حاصل کرنا بھی ایک بہت بڑا نصب العین ہے۔"

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ صرف ایک آئیڈیل ان کی زندگی کا مطمحِ نظر کبھی نہیں بنا۔ آئیڈیل سامنے آتے ہی وہ اس کے حصول کے لیے محنت شروع کر دیتے اور اسے حاصل کر لیتے لیکن اسی لمحے ایک اور نیا آئیڈیل ان کے سامنے آ جاتا۔ وہ غالب کی مثال تھے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

سید صاحب نے اردو کے لیے سپاہی کی زندگی گزاری۔ وہ اس کے لیے اگلے مورچوں پر لڑائی لڑتے رہے۔ ان پر جس روز فالج کا حملہ ہوا اس روز بھی اردو کا ہی کام کر رہے تھے۔

> اردو کی بدنصیبی ہے کہ اسے اپنے ارتقاء کے دوران سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ عوام نے اس کی سرپرستی کی ہے۔
>
> ڈاکٹر سید عبداللہ (پاکستان کا مسئلہ ص۱)

پروفیسر راشد میر

ڈاکٹر سید عبداللہ کا تحریکی مزاج رکاوٹ بن گیا

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا شمار پاکستان کی علمی و ادبی دنیا کے ان اکابر میں ہوتا ہے جن کا عالم شباب جوشیلی اور احتجاجی سیاست کی گود میں پروان چڑھا مختصر سے عرصے کے لیے جامعہ علی دعلی گڑھ) میں طالب علم رہے، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کی انگریز دشمن سوچ کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ماحول کا قریب سے مطالعہ کیا اور تحریک خلافت میں حصہ بھی لیا غربت کا مزا بھی چکھا تھا۔ لہٰذا ابتدا میں مجلس احرار اور اس کے رہنماؤں کی اسلامی اور کفن بردوش سیاست کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین کی اسامی کے لیے بھرتی ہونے کے لیے آئے تو ان کے ایک پاؤں کا جوتا ٹوٹا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ایک جوتا پاؤں سے نکل گیا تو نوجوان امیدوار کی پریشانی دیکھ کر مولوی محمد شفیع ہنس پڑے۔ بعد میں یہی مولوی محمد شفیع سید صاحب کے شفیق رہنما ثابت ہوئے اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ادارے میں مولوی محمد شفیع جیسے وسیع المطالعہ محقق کی جانشینی آپ ہی کے حصے میں آئی۔ سید صاحب یونیورسٹی کی ملازمت میں آئے تو انہوں نے مشرقی زبانوں کے ابتدائی امتحان پاس کر رکھے تھے وفات ہوئے تو تمام بڑے بڑے علمی اعزازات سے ان کا سینہ سجا تھا۔ پاکستان میں السنہ شرقیہ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے اورینٹل کالج کے پرنسپل بنے، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کی نگرانی کا کام ان کے سپرد ہوا اور مولوی عبدالحق کے بعد اردو زبان کی حق رسی کی تحریک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی۔ اس تحریک کی عنان گیری آپ کا سب سے بڑا افتخار تھا اور اسی تحریک سے وابستگی نے آپ کے راستوں کو روکے بھی رکھا۔ پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کے لیے کئی دفعہ آپ کا نام زیر غور آیا۔ تھوڑا عرصہ پیشتر مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی کے لیے" اوپر" تک جن افراد کے ناموں پر مشتمل فہرست پہنچائی گئی۔ ان میں آپ کا نام سب سے پہلے تھا اور علمی و سیاسی نظریات کے حوالے سے آپ موجودہ حکومت کے لیے قابل قبول بھی تھے۔ اس کے باوجود آپ کی نامزدگی نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر صاحب کا ماضی گواہ تھا کہ یہ شخص ایک نیم سرکاری ادارے کا ملازم ہونے کے باوجود سیاست پر سوچتا ہے اور اردو کی محبت میں جلسے جلوس کا عادی رہا ہے، اس نے بعض وائس چانسلروں (میاں افضل حسین، یو کرامت، حمید احمد خان) کی پالیسیوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ افضل حسین اور یو کرامت کی السنہ شرقیہ سے اظہار بیزاری کو کھل کر ہدف تنقید بنایا تھا اور پروفیسر حمید احمد خان سے کسی انتظامی مسئلے میں اختلاف کی بنیاد پر پرنسپل شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد السنہ شرقیہ کے مستند علماء عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات کے بعد اردو، فارسی اور عربی کی تحصیل اور تدریس کو "مشن" سمجھنے والے کسی عالم کی تلاش ایک امر محال ہو جائے گا۔ انہوں نے ادب کے استاد محقق اور نقاد تینوں حیثیتوں میں اپنا مقام صنف اول میں پیدا کیا۔ مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی کی لسانی اور فنی روایات کا امین ہونے کے باوجود آپ نے تحقیق اور تنقید کو نئے اسلوب اور دلچسپ فکر انگیز موضوعات اور مباحث سے روشناس کرایا۔ جس شاعر یا نثر نگار کو پڑھاتے اس کے ذہن فن اور شخصیت کی نئی جہتوں کو تلاش کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رکھتے۔ ان کے ایک شاگرد ممتاز منگلوری نے ان کے لیکچروں کو کتابی

صورت میں شائع بھی کر دیا تھا جو آج تک اردو ادب کے طالب علموں کی
نصابی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں۔ نثر میں ملا وجہی سے لے کر
عبدالحق تک .... پھر سرسید احمد خان اور ان کے رفقا اور
نظم میں ولی، میر، غالب اور اقبال ان کے خاص موضوعات تھے۔ آپ
ابوالکلام آزاد اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی عظمت کے بھی قائل تھے اور
سرسید احمد خان کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند کے ایثار و قربانی
اور اکبر الہ آبادی کی شاعری میں پوشیدہ گہرے طنز سے بھی متاثر تھے۔
سید صاحب نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا
جو دو تین کتابوں کی صورت میں مدون ہو چکا ہے۔ مختلف اخبارات اور
رسائل و جرائد میں اہم قومی موضوعات میں سے اردو زبان کے علاوہ
تعلیم کے مقاصد اور مسائل پر بھی قلم اٹھاتے رہتے تھے۔

ادب کے نقاد کے طور پر ان کی دوسری تصانیف کے علاوہ ان کی
معرکہ آرا تصنیف "نقدِ میر" ہے جو میر تقی میر کے فن اور فلسفے پر ان کے
مضامین کا مجموعہ ہے، یہ حقیقت ہے کہ میر کے قلبِ حزیں کی کیفیات
کا تجزیہ، جن گہرائیوں میں اتر کر سید عبداللہ نے کیا ہے وہ اردو کے
تنقیدی ادب میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ "ذرا حافظ اور اقبال
کا میر کی شاعری سے معازنہ ملاحظہ ہو...... " یہ صحیح ہے کہ حافظ کی امید
کی طرح اقبال کا یقین بھی مشکلاتِ حیات میں نہایت کار آمد شے ہے اور
اجتماعی لحاظ سے تو اقبال کی شاعری ایک ایسا دستور العمل ہے جس کی ہدایت
اور رہنمائی قومی فلاح و بہبود کی ضامن ہے مگر جو الم کی حس ان کے یہاں
دب سی گئی ہے اس کے سبب بعض بنیادی مسائل نفسی میں دل ان سے
مانوس نہیں ہوتا ...... ذاتی تجربے کی رو سے میں نے اقبال کو پچھتر فیصد کی
حد تک نفسیاتی اور ذہنی مورال کے استوار کرنے میں اطمینان بخش رفیق پایا
ہے۔ مگر پچیس فیصد ایسا بھی ہے جس میں اقبال میرے لیے اطمینان بخش
ثابت نہیں ہوتے ..... بس یہ خاص مقام میر ہی کا ہے انہوں
نے مقدر اور زندگی کے اس جبر کے خلاف جو راہ عمل تجویز کی ہے وہ
ہے صبوری اور ضبط و برداشت۔ انھوں نے زندگی کے بنیادی الم کا
اعلان تو کیا ہے مگر اس جبر کو گوارا نہیں کیا اس کے لیے "انہیں" لہو میں
بھی نہانا پڑا مگر انہوں نے اس اذیت کو برداشت کیا ہے اور مصالحت
قبول نہیں کی۔ الم کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکے اپنے احتجاج کو ترک نہیں کیا"

وسیع النظری اور مرنجاں مرنج تو ڈاکٹر صاحب کے مزاج کا شروع سے
امتیازِ خاص تھا ان کا حلقۂ احباب شورش کاشمیری سے لے کر عبداللہ ملک
تک پھیلا ہوا تھا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں ایک نئی عالمانہ اور
وسعت اور تنوع اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے اپنے آپ کو انسائیکلو
پیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین سے وابستہ کر لیا۔ ادب کے علاوہ تاریخ
جغرافیا، فلسفہ، مذہب اور علوم و فنون کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے
محققانہ مقالوں کے مطالعے نے ان کے قلم کو نیا رنگ روپ عطا کر دیا تھا اب
وہ انگریزی میں شائع ہونے والی نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے
تھے۔ دو سال پیشتر اجتہاد کے موضوع پر سید صاحب کے اقبال لیکچرز
کا مطالعہ کریں۔ معلوم ہوتا تھا آخری عمر میں آپ نے مغرب میں پروان
چڑھنے والی سائینٹفک تحقیق کے جدید ترین اصولوں کو جیب کی گھڑی
اور ہاتھ کی چھڑی بنا لیا تھا۔

سید صاحب کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت
وسیع تھا۔ وہ یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی سے باہر اپنے خاص حلقے
سے غیر وابستہ لوگوں سے بھی تعلقات استوار کرنے اور پھر ان تعلقات
کو قائم رکھنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ انسانی تعلقات کی نفسیات پر ان کی
چہار گوشہ گرفت کا احساس اس وقت ہوتا جب آپ کسی کانفرنس یا انتہائی
خشک اور علمی موضوع پر اپنے یا کسی دوسرے سکالر کے لیکچر کا اہتمام کرتے
اور ذاتی طور پر تحریری رابطہ پیدا کر کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد
میں سامعین جمع کر لیتے۔ میں اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کے نیاز مندوں
میں شمار کرتا تھا لیکن اپنی افتادِ طبع کی کمزوریوں کی بدولت ان کے
بہت قریبی معتقدین میں سے نہیں تھا اور ڈاکٹر صاحب کی وضع دار
شخصیت کی ایک ادا یہ تھی کہ وہ فاصلے سے تعلق رکھنے والے احباب
کو قریب تر لانے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے اور گاہے گاہے انہیں
خط بھی لکھتے تھے مجھے اکثر تنبیہہ کرتے "شخصیتوں کو نہ چھیڑا کرو انسان بڑا
کم ظرف ہوتا ہے قلم کی زد میں آنے والے شخص کے دل میں گانٹھ پڑ جاتی

ہے اور موقع ملنے پر وہ زہر چکانی کر سکتا ہے۔ سیانے لوگ۔ نام لے کر شخصیتوں پر تنقید نہیں کرتے تم تو اشاروں کنایوں میں بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے سید صاحب "بالا اچھال دیتے ہو" اس قسم کے بزرگانہ مشورے زبانی بھی دیتے اور تحریری طور پر بھی حالانکہ میرا ان کے ساتھ زیادہ میل ملاپ نہیں تھا میرے نام ان کے لکھے ہوئے بہت سے خطوط کی مجھ سے حفاظت نہیں ہو سکی جس کا مجھے افسوس رہے گا۔ ان کے رواداری میں لکھے گئے خطوط بھی جمع کیے جائیں تو حکمت اور علم و عرفان کا خزینہ ثابت ہوں گے۔ میرے پاس ان کے تین تین قیمتی خطوط ابھی تک محفوظ ہیں اور میں انہیں اس نیت سے نذر قارئین کر رہا ہوں کہ سید صاحب کی طبیعت کے انکسار اور نرمی کے ساتھ ان کا دوسروں کو اپنانے کا مسلک بھی، اپنے تمام تر حسن اور بانکپن کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن جائے۔ ان خطوط میں کہیں کہیں خاکسار کی تعریف ہے جس کا میں قطعی مستحق نہیں ہوں۔ ان تعریفی کلمات کو ایک بزرگ کے دعائیہ کلمات سمجھ کر برداشت کر لیجئے گا۔ پہلا خط ۱۹۸۳ء کا ہے، دوسرا ۱۹۷۵ء کا اور تیسرا ۱۹۸۲ء کا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۳ء کو لکھا گیا خط یوں ہے:

"محبی وارث میر صاحب السلام علیکم، مزاج شریف۔

آپ کی عنایات کا سلسلہ اس درجہ بڑھ رہا ہے کہ میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ سعدی (مرشد شیراز) نے کہا گیا ہے

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق
تحسیں کنند واو خجل از پائے زشت خویش

(ترجمہ... لوگ طاؤس کی اس کے نقش و نگار کی وجہ سے تعریف کرتے ہیں مگر وہ اپنے بدنما پاؤں کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا ہے)

یہ تو نہیں کہ میں قدر افزائی سے خوش نہیں ہوتا یہ بھی نہیں کہ میں دوستوں کے خلوص پر شبہ کرتا ہوں مگر یہ ضرور ہے کہ میں خود کو ان تعریفوں کا مستحق نہیں سمجھتا، میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ میں زندگی میں کوئی خاص قابلِ ذکر کام (آرزو کے باوجود) انجام نہ دے سکا۔ کاش میں کچھ کر سکتا پھر تعریفیں ہوتیں تو خوش، بہت خوش ہوتا بہر حال شکریہ ادا کرنے میں بخل سے کام نہیں لوں گا، دوستوں کی محبت خدا کا بڑا احسان و انعام ہے جسے خدا یہ دولت دیتا ہے اس کے بہت سے غم کم ہو جاتے ہیں۔ آپ کی میری ملاقات زیادہ نہیں ہوئی آپ نے میرے مسلکِ درد و الم کی جو بات اس دن میری زبان سے سنی، شاید پہلی مرتبہ آپ نے یہ لفظ غم میری زبان سے سنا، برادرم، عزیزم، مشفقم "یہ کمایا ہوا" ریاضت سے حاصل کیا ہوا مسلک ہے۔ زیست کے تجربوں سے دکھ کا یہ فلسفہ ابھرا ہے یہ دانش تعمیر ہوئی ہے!

ع — تمام مثلِ صنوبر میں دل ہی ہار لایا ہوں

(میر)

غم کے اس مشرب میں محبت کل لازمی امر ہے۔ دردمندی ....جس کی طلبہ و طالبات کے علاوہ اس دورِ کشمکش میں ہر شخص کو ضرورت ہے، وقت کا سب سے بڑا مطالبہ ہے مگر انسان ہجوم و سیاست کی جنگ زرگری میں پس کر برباد ہو رہا ہے اور خود غرضی کے زہر خند ابھار کر بظاہر خوش ہے مگر اندر سے ہر شخص دوسرے شخص کا دشمن ہے۔ ایسے میں محبت اور درد کے تریاق کی سخت ضرورت ہے۔ مگر اس تجربے میں "خود" کو خاصا قربان کرنا پڑتا ہے۔ ہاں صاحب آپ کی محبت کی تاثیر اب پھیل کر نوائے وقت کے صفحات تک جا پہنچی ہے۔ ایک محفل رسوائی بپا کی بھائی! اب بس کرو اگر میری دوستی پر جو کارِ بار رسوائی سے کم نہیں، آپ کو اصرار ہے تو میرے مسلکِ دردمندی میں میرے شریکِ غم ہو جاؤ۔ سیاست کو لات مار کر کوچۂ درد میں آ جاؤ۔ فقط والسلام نیازمند

سید عبداللہ

دوسرا خط ۳ جنوری ۱۹۸۵ء کو لکھا گیا۔

محبی مشفقی میر صاحب، السلام علیکم مزاج شریف

ابھی جلسہ یادگار خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے فارغ ہو کر پہنچا ہوں اور پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ آپ کو آپ کی تقریر پر تحسین کا خط لکھتا ہوں، بھائی میر صاحب! اپنے قلم کی حفاظت کرو اس کے جوہر ابھی اور بھی کھلنے والے ہیں۔ صریرِ خامہ سے

گونج پیدا ہونے والی ہے اب کتنے لوگ اس ملک میں ہیں جو درد سے
لکھتے ہوں۔ اپنے سینے کے درد کو بچائے رکھو:

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی چشمِ خوں فشاں کے لیے

کم سے کم ایک دو قلم والے تو ایسے موجود ہیں جو اس ملک میں اسلام
کا مرثیہ لکھ سکیں۔ ان کو یونہی کالی زدہ دل کے عمق میں شناوری
کر کے نتیجہ نکالو مغرب میں مذہب نہیں چل سکا، کلچر چل رہا ہے۔ اب
وہ کلچر سے بھی "اینٹی کلچر" تک پہنچ رہے ہیں ہماری ریل گاڑی بھی
ادھر ہی جا رہی ہے اور جس دن ہم صرف "کلچر" پر آ گئے، جیسا کہ آ چکے
ہیں تو وہ دن مرثیے کا ہوگا۔ دل کی خانقاہیں مسمار ہو چکی ہیں اب
کچھ چرچا کبھی کبھی عید میلاد کے انداز کا، ہندوؤں کے خلاف ردِعمل
کی وجہ سے باقی ہے اس کے سوا یہاں کیا رکھا ہے ہم ہر دوار پہنچنے
والے ہیں لیکن براہِ راست نہیں۔ ماسکو اور واشنگٹن سے ہو کر خیر یہ جملہ
معترضہ تھا کہہ میں یہ رہا تھا کہ آپ کے قلم میں جو توانائی ہے (اور آپ
کی تحریر میں جو برنائی ہے اور آپ کی آواز میں جو گونج ہے) اسے
اور توانا کرو اور برنا کرو۔ اس میں رعد و برق کی جو کیفیت ہے اسے
اور درخشاں کرو اور گونج دار بناؤ تاکہ رن پڑنے پر اہلِ ایمان کو جمع کر
سکے۔ کیونکہ اہلِ نظر جو خدنگ خوردہ صیدِ فرنگ ہیں تازہ بستیاں آباد
کرنے والے ہیں جو واشنگٹن کے راستے ہر دوار پہنچیں گے۔ اب خاکِ پاک
نجف کہاں اور نعرۂ لاتخف کیسا۔ یہاں وہ ہونے والا ہے جسے دیکھ
کر ابن بدرون کی آنکھ اشک بار ہو گئی تھی۔ میں تو اب ایک ابن بدرون
کی تمنا پر جی رہا ہوں بھائی خلاصہ یہ ہے کہ بڑی اعلیٰ تقریر تھی آپ کی
اس سے خوش ہو کر جذبات میں تلاطم آ گیا ہے اس لیے اس لہجے میں
یہ تحریر لکھی، والسلام مخلص سید عبداللہ"

تیسرا خط ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء کو لکھا گیا۔

"السلام علیکم امیرِ محترم امیر القلم۔ آپ کا طویل مگر جمیل و جلیل
مقالہ "تصوف کی حقیقت" غور سے پڑھا اور مستفید ہوتا رہا۔ میں بسا اوقات
کا باشندہ ہوں، اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بہت سے ندی نالے کچھ
تند، کچھ نرم رو مگر لطیف ہر طرف سے بہہ کر قدرے میدانی ہموار گزرگاہ
سے گزرتے ہوئے چشمِ تماشا کے لیے نیرنگِ عجائب سجاتے رہتے ہیں۔
بہت کم لوگ غور کرتے ہیں کہ ان کے اس لطفِ خرام میں پہاڑوں میں
چھپے ہوئے چشموں اور برفانی چوٹیوں نے کتنا حصہ لیا ہے۔ آپ نے علم و
معلومات کا جو دریا بہایا ہے اس کے عقب میں شدید محنت اور برسوں کا
وسیع الاطراف مطالعہ، برفانی چوٹیوں کی مانند صاف روشن ہے موضوع
دقیق تھا اور ہمیشہ نزاعی، مگر آپ کے خیالات کی رو ہموار رہی ہے۔ وہی
جوئے نرم رو کے پانی کی سیدھی لکیر، ماشاءاللہ ثم ماشاءاللہ علامہ اقبالؒ
پر یہ الزام کہ ان کے خیالات میں تضادات ہیں بہت پرانا ہے ایسے
الزامات میں بدنیتی بھی شامل ہے مگر سہل انگاری اور کم ہمتی کا بھی بڑا
حصہ ہے۔ علامہ کے فہم و ابہام کے لیے سات دریا سے فراہم کیے
ہوئے موتی درکار ہیں وہ اپنے موضوع پر لکھتے ہوئے مخاطب
کے حوالے سے، اشاروں میں باتیں کر جاتے ہیں اب ظاہر ہے
کہ ان اشاروں کی تفصیل جمع کرنا پھر ماخذ پر نقد و نظر اور آخر میں محاکمہ
و فیصلہ۔ ان سب مراحل سے کوئی گزرے تب فکرِ اقبال کے ساتھ انصاف
ممکن ہوگا۔ مگر آج کل ایسی کوہ کنی یا کان کنی کون کرتا ہے۔ میری رائے
میں علامہ کے افکار مشکل ترین موضوع ہیں لہٰذا سخت محنت کے طلبگار ہیں
اسی وجہ سے اقبالؒ ابھی منتظر شارحین کے منتظر ہیں۔ ڈیڑھ ماہ قبل میں
نے بھی سول سروس اکیڈمی میں "اقبال و صوفی ...... اختلاف
و اتفاق کی کہانی" کے عنوان پر ایک شذرہ پڑھا تھا لیکن مجھے اعتراف
ہے کہ میں بھی حق ادا نہ کر سکا تھا۔ بہرحال ایسی کوششیں محنت اور نیک نیتی سے
ہوتی رہیں اور "مغرب زدگی" سے پاک ہوں تو کسی نہ کسی وقت ہم فکرِ
اقبال کے چہرۂ روشن کو غلط فہمیوں سے پاک کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔
یہ چند سطور بطور اعتراف لکھ رہا ہوں قبول کر لیں، والسلام نیاز مند،
سید عبداللہ

کام کرنے کے جنون نے سید صاحب کو عمر بھر ایک لمحے کے لیے فارغ
نہیں بیٹھنے دیا۔ ہمارے بزرگ دوست اور سید صاحب کے بعد،
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے کام کے نگران سید امجد الطاف فرماتے ہیں
کہ "سید صاحب عالمِ بالا میں بھی فارغ نہیں بیٹھیں گے۔ وہ فرشتوں کو
اردو پڑھا رہے ہوں گے۔"

ماہر مسعود

ایک انسان دوست مفکر

ایسا لگتا ہے یہ زمانہ اہلِ کمال سے ہماری جدائی کا زمانہ ہے۔ جو تہذیب کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ متبرک شخصیات ایک ایک کر کے درمیان سے اٹھتی جا رہی ہیں اور یہ دور ان کا متبادل پیش کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی موت نے اس احساس کو دوچند کر دیا ہے۔ آپ نہ صرف بلند پایہ محقق، نقاد اور ماہرِ تعلیم تھے بلکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سچے جانشین تھے۔ اردو زبان کے سلسلے میں آپ کی خدمات اور احسانات اتنے زیادہ ہیں کہ اس کا اندازہ آنے والے وقتوں ہی میں کیا جا سکے گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مسلمان اور پاکستانی مفکر کی حیثیت سے اپنی ساری زندگی ایک بلند آدرش کے ماتحت گزاری۔ انہوں نے عمر بھر خود کو اعلیٰ ترین اصولوں کا تابع رکھا اور ان کی یہی ذاتی صفات ہیں جو انہیں دوسروں سے منفرد و ممتاز بنا دیتی ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے دیباچے میں لکھا تھا "زندگی کے معنی کھانا، پینا اور چلنا، سو رہنا اور بولے جانا نہیں۔ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفاتِ خاص کے ساتھ نام کو شہرتِ عام اور اسے بقائے دوام ہو۔" ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ علم و ادب سے شغف رکھنے والے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا ذریعہ تشہیرِ ذات کو جانتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ شہرت اور ناموری ذریعہ نہیں نتیجہ ہے اور یہ نتیجہ کسی مشن، مقصد اور تحریک کو خود سے وابستہ رکھنے اور کارہائے نمایاں انجام دینے کی صورت میں ہاتھ آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو زبان کو استحکام بخشنے اور اس کی ترویج کی تحریک سے وابستہ ہی نہیں بلکہ اس بلند تر مقصد کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تحریک بن گئے تھے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ زندگی کس طرح گزاری جائے کہ دوسروں کے لیے تقلید کا نمونہ بن جائے۔ انہیں سستی شہرت تو دور کی بات ہے خود شہرت ہی سے چڑ تھی۔ کتنے صحافیوں اور ادیبوں نے ان کا انٹرویو لینے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ اس سے دور بھاگے اور اگر انہوں نے ایک آدھ انٹرویو دیا بھی تو اس کے مقصدی اور افادی پہلو کے پیشِ نظر۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں جب ان کے شاگردوں اور قدردانوں نے ان کی ساٹھویں سالگرہ تزک و احتشام کے ساتھ منانا چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور جب اصرار بہت بڑھا تو انہوں نے اس تقریب کو "یوم تجدیدِ عہدِ اردو" کا نام دے کر اس شخصی تقریب کو بھی اردو زبان کے استحکام و نفاذ جیسے اہم ترین مقصد سے منسلک کر دیا۔

یوں تو شہرت و ناموری سے بھاگتے ہوئے اور بھی بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے لیکن ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس عمل سے اپنی بڑائی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں یا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں اس کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس رویے میں انانیت کو کہیں دخل نہیں تھا۔ ان میں ایک عالمانہ انکسار تھا۔ اس شاخِ ثمردار کی طرح جو جھک جاتی ہے۔ اس تقریب میں جہاں ڈاکٹر صاحب کی علمی و تحقیقی خدمات پر شاندار مقالات پڑھے گئے انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"میرے نام سے جو کارنامے منسوب کیے جا رہے ہیں ان میں سے کسی میں بھی میں شائستہ خدمات انجام نہیں دے سکا۔" یہ انکسار اس بیدار مغز عالم کا تھا۔ جس نے زبان و ادب اور تعلیم و تہذیب جیسے نازک اور اہم موضوعات پر دس ہزار سے زائد صفحات تحریر کیے۔ جس نے سیکڑوں طالب علم پیدا کیے اور اپنی تربیت اور فیض سے انہیں اس مقام تک پہنچایا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے فرائض ذمہ داری اور دیانتداری سے انجام دے رہے ہیں اور یہ اس اسکالر کی عاجزی و فروتنی کا اظہار تھا جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جیسے گراں مایہ علمی و تحقیقی کام کا ایک بڑا حصہ اپنی زیرِ نگرانی تکمیل تک پہنچایا جس کی نظیر اس موضوع پر کسی اور زبان میں نہیں

ملتی اور جسے ہم دنیا کے سامنے پاکستان اور اردو زبان کے ایک وقیع اور
شاندار علمی و تحقیقی کارنامے کے طور پر فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی علمی خدمات اور تحقیقی کارنامے تو اہل علم پر ایک قرض
کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ ان کا مطالعہ و تجزیہ کر کے ان کا اعتراف کریں کہ اہل کمال
کے کمال کا اعتراف بھی قومی فریضے میں داخل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت
کے جس پہلو کی طرف میں اس مختصر سے مضمون میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ
ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا مسلک ہے جس پر وہ عمر بھر کاربند رہے۔

ہمارے دور کے بہت سے المیوں میں ایک المیہ یہ بھی ہے صاحب دل
افراد معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے افراد جنہیں انسانوں سے بے پناہ محبت ہے اور
ان کے دکھ درد کا احساس جنہیں بے چین کیے رکھتا ہو۔ غالب نے کہا تھا:

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

دل کی گداختگی ایک ایسی نعمت تھی جو قدرت نے ڈاکٹر سید عبداللہ
کو فراخدلی کے ساتھ عطا کی تھی۔ وہ انتہائی دردمند دل کے مالک تھے اور
آپ جانیں کہ دل کے اندر دردمندی انسانی تقدیر کی حقیقت اور انسانی
مجبوریوں اور بے بضاعتیوں کے حقیقی احساس و اعتراف کے بغیر پیدا ہی
نہیں ہو سکتی۔ دوسروں کو معاف کر دینے کا وصف اسی صورت میں شخصیت
کا حصہ بنتا ہے جب انسان کے خطا و نسیان کا پتلا ہونے پر صدق دل سے
یقین ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ذاتی تجربے اور فطرت انسانی کے گہرے
مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ زندگی کے زخموں پر نیکی اور دردمندی
کا مرہم رکھنے کی کیا اہمیت ہے؟ انہیں اس کا بھی رنج تھا کہ سوسائٹی نوع
دکھ اور انسانیت کے معاملے میں بے حس ہوتی جا رہی اور آج انسان سے
بڑھ کر انسان کا دشمن کوئی نہیں۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ مغرب کی مادہ
پرستانہ تہذیب کے زیر اثر ایک ایسا عالمی سماج وجود میں آ چکا ہے
جس میں انسان دشمنی کا عنصر غالب ہے اور اس لیے انہوں نے اپنے ہی
ایک قول کو مشعل راہ بنا لیا تھا۔

"اس کے باوجود خدمت کیے جاؤ، اس کے باوجود محبت کیے جاؤ،
اس کے باوجود مسکراتے رہو" ان کی شدید ترین خواہش تھی کہ کاش
میں زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی
دکھ درد میں کسی مرد ناتواں کے لیے سفینۂ برگ گل بن سکیں۔ میں سیاہی کے
ایک قطرے کا آرزومند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مرہم بن سکے ان کی یہ
آرزو بھی اسی دردمندی اور انسان دوستی کا بدیہی نتیجہ تھی۔ انہیں یقین
تھا کہ انسانوں کے دکھ درد کا علاج صرف اور صرف "محبت" میں مضمر ہے۔
کیونکہ بنا محبت کے ہم دوسروں کے غم کو اپنا غم اور دوسروں کی خوشی کو
ہی نہیں سکتے۔ انہوں نے اپنے شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں سے
ہمیشہ محبت کی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے دوسروں کو وہ متاع عزیز
دی جو ان سے بچپن میں ماں کے روپ میں چھن چکی تھی اور جس کی وجہ
سے ان کی روح محبت کے لیے ہمیشہ ترستی رہی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی دانش صرف محض کتابی نہیں انسانی اہمیت کی حامل
بھی اور انہوں نے اپنے مسلک کے مطابق ایک ایسی عمر بسر کی جس میں
تدبر، وقار اور عالمانہ شان تھی۔ وہ اپنے قول کی زندہ تفسیر بن چکے تھے
ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں اور ان گنت خنجر در آستیں دوست ملے
لیکن اس کے باوجود وہ خدمت کرتے رہے، اس کے باوجود وہ محبت کرتے
رہے، اس کے باوجود مسکراتے رہے۔

تعلیم کے مسئلے میں، میں نے دفتروں، عدالتوں اور کاروباری ادارے
کے معاملات کو اس لیے شامل کر لیا ہے کہ تعلیم کا مسئلہ اجتماعی زندگی کے ان
شعبوں سے منقطع نہیں۔ تعلیم جہاں ایک نظری سلسلہ ہے وہاں اس کے عملی پہلو
اور افادی مقاصد بھی ہیں۔ ذریعہ تعلیم تبدیل ہو بھی جائے تو بھی اس وقت تک
بے نتیجہ و بے اثر ہوگا جب تک وہ زندگی کے اہم کاموں کے لیے مفید نہ ہوگا۔
تعلیم محض دماغی ورزش اور تفریحی مشغلہ نہیں وہ تو ایک نافع اور فائدہ مند
استعمال کی مشق ہے۔ . . . ذریعہ تعلیم کا مسئلہ دفتری زبان کی تبدیلی اور کاروباری
زبان کی ترویج کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے میں علم مفتین
کے ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ، پبلک سروس کمیشن، فنی تعلیم و دفتری اور
کاروباری زبان کی تبدیلی پر بھی زور دے رہا ہوں۔ . . . اور جب میرے دل
کی دنیا پہ بے کسی اور تنہائی کا احساس غالب آ جاتا ہے تو ایک آدھ مرتبہ یہ
پیکر تصویر، کاغذی پیراہن پہن کر مال روڈ پر اردو کا فریادی بھی بن جاتا ہے

ع این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

پروفیسر اسلم انصاری

استاذ الاساتذہ استاذی المکرم ڈاکٹر سید عبداللہ کی رحلت سے ہماری علمی ادبی اور تعلیمی تاریخ کا ایک روشن باب اختتام کو پہنچا۔ سید صاحب جس علمی قافلے کے آخری مسافر تھے اس کے پیش رووں میں علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، علامہ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے اکابر کے نام آتے ہیں اگر علمی نقطۂ نظر سے توسیع اختیار کیا جائے تو اس فہرست میں ڈاکٹر براؤن پروفیسر آربری اور پروفیسر نکلسن جیسے محققین کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے علمی کمالات کو الفاظ میں محصور نہیں کیا جا سکتا ہے وہ ایک بے مثال محقق باکمال نقاد اور عظیم استاد تھے ان کے تمام علمی اور تحقیقی کاموں پر ان کی معلمی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ جن لوگوں کو ان کے سامنے شاگرد کی حیثیت سے بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ سید صاحب بطور استاد کے کیا کچھ تھے ان کی شخصیت ان کے شاگردوں کے لیے کیا مفہوم رکھتی تھی یا یہ کہ ان سے پڑھنے کے کیا معنی ہو سکتے تھے اپنے استادوں پر سب کو ناز ہوتا ہے لیکن یہ بات سید صاحب کے تلامذہ ہی جانتے ہیں کہ قدرت نے انہیں (سید صاحب کے شاگردوں کو) سید صاحب سے استفادے کے مواقع عطا کر کے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ شفقت ہر اچھے استاد کی سیرت کا نمایاں پہلو ہوتا ہے سید صاحب بھی ایک اچھے اور شفیق استاد تھے لیکن ان کی شفقت اپنے کسی طالب علم کو راہ راست سے بھٹکتے وقت ضائع کرنے اپنی صلاحیتوں کا بے جا استعمال کرنے اور اساتذہ کی موجودگی میں شوخی یا شوخ چشمی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی وہ جتنے شفیق استاد تھے اتنے ہی سخت گیر نگران بھی تھے۔ وہ اپنی نرمی اور ملائمت کے باوجود ایک ضابطہ پسند انسان تھے ان کے ضابطوں میں اردو سے محبت اور مشرقی اقدار کی پاسداری کو اولیت حاصل تھی، میر اردو اور مشرقیت ان کی تین بڑی کمزوریاں تھیں۔ اس میں اقبال پسندی کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی ان کی کمزوریوں کو ایکسپلائٹ نہیں کر سکتا تھا وہ اردو زبان و ادب کے ان استادوں میں سے تھے جنہوں نے یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان و ادب کی تدریس کے لیے علمی اور فنی بنیادیں فراہم کیں وہ اردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے اردو ادب کی تعیین و تنقید کے معیار خود اردو ادب کے باطن سے برآمد کیے اور یہ آسان کام نہیں تھا وہ عمر بھر تحقیق کے کوہِ بے ستون سے علم و آگہی کی جوئے شیریں بہا کر لاتے رہے، تاکہ تشنگانِ علم سیر ہو سکیں۔ انہیں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے ادب پر پوری دسترس حاصل تھی، وہ جرمن زبان بھی جانتے تھے، انہیں علوم اسلامیہ کے کم و بیش تمام شعبوں سے گہری دلچسپی اور وابستگی تھی، وہ مغربی علوم و افکار سے بھی کماحقہ آگاہ رہتے تھے اقبال کا فکر و فن بھی ان کا موضوع خاص تھا۔ فی الحقیقت وہ ایک جامع العلوم انسان تھے اگر انہیں علوم مشرق کا بحرِ ذخار کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا اگرچہ اس بحر علوم کی امواج پے در پے اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کی ہر موج سالہا سال کی ریاضت فکر اور طویل تدقیق کے بعد بلند ہوتی تھی اور اپنے ساتھ علوم و فنون اور نادر علمی نکات کے لاتعداد گوہر ہائے آبدار فکر و نظر کے ساحلوں پر ڈالتی تھی اگر اس تشبیہ کو آگے بڑھانے کی اجازت دی جائے تو میں عرض کروں گا کہ سید صاحب علوم مشرقی کا ایسا سمندر تھے جس کے کناروں کے خزف ریزے سنگریزے بلکہ ریت اور مٹی بھی جواہر پاروں اور کیمیا کا سا اثر رکھتی تھی۔ ان کی کسی تصنیف کا کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر ایک سے زیادہ علوم کی چھوٹ نہ پڑتی ہو، انہیں

فلسفے سے بھی گہرا لگاؤ تھا لیکن اس لگاؤ کو وہ صرف اسلامی فکر کی تفہیم، تشریح اور تعبیر کے لیے کام میں لاتے انہیں علامہ اقبال سے بھی والہانہ لگاؤ تھا لیکن اس میں رسمی اقبال پسندی کی بجائے ٹھوس علمی تفہیم کو دخل تھا انہوں نے جس علمی وسعت اور بصیرت کے ساتھ مطالعہ اقبال کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا اس سے وہ اقبال شناسوں کی صف اول میں جگہ پاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ بڑے بڑے ماہر اقبالیات سے کہیں بڑے اقبال شناس تھے۔

سید صاحب نے اپنے ایک استاد علامہ محمود شیرانی کے مجموعہ مقالات کے فلیپ پر لکھا تھا کہ علامہ محمود شیرانی نے علمی تحقیق کو اتنا مشکل کام بنا دیا ہے کہ اب کوئی عالم مشکل ہی سے اپنے آپ کو محقق کے لقب کا مستحق پائے گا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی بات بغیر کسی تصرف کے سید صاحب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے علمی تحقیق کو جو بلندی عطا کی ہے اس تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ سید صاحب نے تحقیق و تنقید کو جس طرح ہم آہنگ کیا ہے اس کی مثالیں بھی آسانی سے نہیں مل سکتیں

سید صاحب کے علمی کارنامے علمی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ بن چکے ہیں لیکن جن لوگوں کو سید صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے ان کے لیے سید صاحب کی سیرت و شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا استاد یا معلم ہونا ہے وہ اپنے معلم ہونے پر ہمیشہ نازاں رہے، دست قدرت نے انہیں بنایا ہی تدریس کے منصب جلیلہ کے لیے تھا انہیں کو دیکھ کر لفظ استاد کا حقیقی مفہوم ذہن میں مرتب ہوتا تھا اپنے تئیں وہ اول و آخر ایک معلم ہی تھے۔ انہوں نے اپنی کم و بیش تمام تصانیف کے بارے میں یہی کہا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ تدریسی ضرورتوں کے لیے لکھا ہے کہ وہ اپنی طرز کے ایک بہت ہی منفرد استاد تھے ان کے اسلوب و تدریس میں قدیم و جدید طرز تدریس کا خوبصورت امتزاج تھا تاہم مجموعی طور پر وہ ایک قدیم طرز کے استاد تھے انہیں اپنے ہر موضوع پر عبور حاصل ہوتا تھا وہ اپنے ہر سبق میں کچھ ایسی باتیں بھی بتاتے تھے جو کتابوں میں نہیں ہوتی تھیں ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ ان کا لیکچر ذہین سے ذہین طالب علم کے لیے بھی ہوتا تھا اور غبی سے غبی طالب علم کے لیے بھی۔ ان کا لیکچر ہر ذہنی سطح کے طالب علم کے لیے مفید ہوتا تھا۔

وہ بے شک ذہانت کے قدردان تھے لیکن ان کے ہاں محض ذہانت کے مقابلے میں محنت اور کام کی لگن زیادہ بار پاتی تو وہ ذہین طالب علموں کی قدر بھی کرتے اور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے لیکن سخت محنت کی کٹھائی سے گزارے بغیر وہ بڑے سے بڑے چہیتے شاگرد کو بھی آخری خوشنودی کا پروانہ عطا نہیں کرتے تھے اسی لیے بہت سے لوگ راستے ہی میں رہ جاتے تھے بہت کم لوگ تھے جو ان کے معیار نظر کے آخری امتحان میں پورے اترتے تھے۔

میں بعض اوقات حیران ہوتا ہوں کہ ہمیں (مجھے اور میرے کلاس فیلوز کو) کس طرح ایک وقت میں ایک سیکشن میں اپنے عہد کے نادرۂ روزگار استادوں سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر وقار عظیم ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر محمد صادق محی الدین اثر، خواجہ محمد سعید یہ سب ہی ایسے اساتذہ تھے اور ہم نے کسی نہ کسی رنگ میں ان سب اکابر علم و تعلیم سے استفادہ کیا ہم اپنے اساتذہ کا دل سے احترام کرتے تھے لیکن دو اساتذہ ہمارے دلوں پر حکمران تھے ان میں پہلا نام یقیناً ڈاکٹر سید عبداللہ کا تھا۔ دوسرے نام کے بارے میں بھی میرے یاران قدیم متفق ہوں گے کہ وہ سید وقار عظیم کا محترم اور پیارا نام تھا (زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا) یہ سبھی نام آج بھی زندگی کی اندھیری راہوں میں چمک چمک کر راستہ دکھاتے ہیں اپنے لائق اساتذہ میں ہمیں جس استاد سے سب سے زیادہ ذاتی تعلق محسوس ہوتا تھا اس وقت استادوں اور شاگردوں کی گروہ بندی کا ایسا رواج نہ تھا، وہ ڈاکٹر سید عبداللہ تھے ان سے ہمارے تعلقات گوناگوں تھے، وہ ہمارے محترم اور محبوب استاد تھے، صدر شعبہ تھے اور کالج کے پرنسپل تھے علمی اور ادبی دنیا میں ان کی عظمت مسلم تھی، لیکن اس کے باوجود کہ ان کی علمی فضیلت کی ہیبت ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی تھی، ہم ان سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھے ہمیں ان کے غیر محسوس رویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں یعنی اپنے شاگردوں کو اپنی متاع عزیز سمجھتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے کبھی الفاظ میں نہیں کہی لیکن جس محنت اور جان کاہی سے جس معلمانہ بصیرت

ادر تن دہی سے اور جس عالمانہ وسعت نظر اور ژرف نگاہی سے انہوں نے آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ اسباق کے ذریعے سیمیناروں کے ذریعے خطبات کے ذریعے اور روزمرہ کی بول چال کے ذریعے ہم میں سچی طالب علمانہ لگن پیدا کی اور زبان و ادب اور ان سے متعلقہ علوم کے بارے میں [illegible] بنیادی رویہ پیدا کر دیا اس کی مثال [illegible] یقیناً انہوں نے یہ کام اپنے نامور رفقائے کار، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی وغیرہ کے بھرپور تعاون کے ذریعے سرانجام دیا، لیکن شعبے کی پالیسیاں مرتب کرنے، طالب علموں کی ذہنی اور امتحانی ضروریات کو محسوس کرنے اور ان کے مطابق تعلیمی سرگرمیوں کو قائم کرنے کا سارا کام ڈاکٹر سید عبداللہ ہی کی ذات سے وابستہ تھا۔ ہفتہ وار شعبہ جاتی سیمیناروں کے ذریعے انہوں نے اپنے طالب علموں میں قوت اظہار، اعتماد، جستجو، جرات سوال اور نظم و ضبط کے ایسے اوصاف پیدا کر دیے کہ باید و شاید۔!

چونکہ سید صاحب نے ہمیں باور کرا دیا تھا کہ وہ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں اور انہیں علم و ادب کے حوالے سے ہم سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس لیے ہم کبھی کبھی ناز بے جا کا شکار بھی ہو جاتے تھے لیکن اس ناز بے جا کا علاج وہ ایک ہی نگاہ خشمگیں، ایک لمبی ہوں یا ایک لمبی "چپ" کے ذریعے فوراً کر دیا کرتے تھے۔ اصل میں ان کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی ہمارے لیے ناقابل برداشت تھی اس لیے ہمیں ہر کام اور بات میں ان کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی ایک ادائے خاص اور بھی تھی اور وہ تھی روٹھ جانے کی عادت۔ کبھی کبھی وہ پوری کلاس سے ناراض ہو جاتے تھے اور اس کا اظہار وہ یوں کرتے تھے کہ ہمارا پیریڈ لینا چھوڑ دیتے تھے۔ ہم سارا سارا پیریڈ اور پورا ایک گھنٹہ انتظار کرتے لیکن سید صاحب ہم سے روٹھ کر اپنے دفتر میں بیٹھے اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے۔ ہم میں سے کوئی ہمت کر کے ان کے پاس چلا جاتا۔ تو الفاظ کو لمبا کرنے والے اپنے مخصوص لہجے میں فرماتے۔ "جائیے۔ ہم آپ سے ناراض ہیں" یہ الفاظ جو بھی سن کر آتا کلاس میں آ کر سب کو بتاتا اور یہ سن کر سب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ اب کیا ہوگا اتنا تو کورس باقی ہے، ہم سوچتے اور کورس بھی چھوڑ دیتے اگر سید صاحب ہمیں نہیں پڑھائیں گے تو دنیا میں ہماری کیا قدر و قیمت رہ جائے گی اور ہم اپنے آپ کو سخت نکمے اور بیکار نظر آنے لگتے اور جب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے تو اس طرح چلتے تھے جیسے بلندی سے ڈھلان کی طرف جا رہے ہوں۔ جونیئر کلاس کو پڑھانے جا رہے ہوتے تو ہم انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ ان کی بے رخی اور بے نیازی سے ہم سب کی جان پر بن جاتی۔ ہمیں کہتے کہ سید صاحب کو منانا چاہیے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑتی۔ بعض لوگ کہتے کہ وہ بعض ناگزیر مصروفیات پر ناراضگی کا پردہ ڈال دیتے ہیں اور اس پردے میں اپنے لیے اپنے طلبا کی عقیدت اور نیازمندی کو بھی آزماتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی ناراضگی میں یہ سب باتیں بھی شامل ہوتی ہوں، لیکن یہ ہوتی ان کی ناراضگی ہی تھی، جو زیادہ طول نہ کھینچتی تھی معلوم نہیں کون بالآخر انہیں مناتا تھا یا وہ کس کے کہنے پر کلاس لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ بہر حال ہوتا یہ تھا کہ ایک دن اچانک ان کا چپڑاسی حوالے کی کتابوں کا بنڈل کمرۂ جماعت میں لا کر استاد کی میز پر رکھ دیتا، جھاڑن سے تختۂ سیاہ کو صاف کرتا اور کچھ چاک قرینے سے کتابوں کے ساتھ میز پر رکھ دیتا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ سید صاحب ہمیں پڑھانے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ غرض جہاں سید صاحب ہوتے وہیں ہم ہوتے اور پڑھنے پڑھانے کا عمل جاری ہو جاتا (خیال رہے کہ ایسا ایک سیشن میں صرف ایک آدھی مرتبہ ہی ہوتا تھا، اکثر و بیشتر نہیں، عام حالات میں وہ پیریڈ بہت کم چھوڑتے تھے)

استادِ مکرم اپنے بعض شاگردوں سے کام بھی لیتے تھے اور وہ شاگرد تو بہت ہی اہم سمجھا جاتا تھا جسے وہ کوئی اپنا مسودہ صاف کرنے کے لیے دیتے تھے (ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے بالخصوص خوش خط ہونے کی شرط لازمی تھی) جن لوگوں نے سید صاحب کے مسودات دیکھے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سید صاحب کا مسودہ ہمیشہ بنا کرتا تھا ان کی عادت قدیمہ تھی کہ وہ فل اسکیپ کاغذ کے ایک طرف موٹے قط کے قلم یا موٹی سرخ پنسل سے اس طرح لکھتے تھے کہ ایک صفحے پر بمشکل دس بارہ یا اس سے بھی کم سطریں ہوتی تھیں۔ سطروں کے درمیان خاصا فاصلہ ہوتا تھا اور

حاشیہ بھی اچھا خاصہ چھوڑا جاتا تھا۔ یہ ان کے مضمون کی تسوید کی اولین شکل ہوتی تھی۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ اس بنیادی متن کے ارد گرد سطروں کے اوپر نیچے، الفاظ کے دائیں بائیں اوپر نیچے کے حواشی اور دائیں طرف کے حاشیے پہ ورق کی دوسری طرف بے شمار اضافے ہوتے چلے جاتے تھے گویا بنیادی متن پر ایک اس سے بھی دگنے مواد کے متن کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ اضافہ بے شمار ARROWS خطوط واحدانیوں اور دائروں کے ذریعے بنیادی متن سے مربوط ہوتا تھا لیکن اس اضافی مواد کو بنیادی متن کے ساتھ مربوط کر کے پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس خدمت سے اکثر ساتھی گھبراتے تھے لیکن سید صاحب یہ کام ہر ایک کے سپرد نہیں کرتے تھے بلکہ خاصی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بعد ہی اپنے مسودات کا پلندا اپنے کسی شاگرد کے ہاتھ تھماتے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ استادِ محترم مجھے اس خدمت کے لائق سمجھتے تھے، بلکہ مجھے ان کے مسودات پڑھنے میں ایک طرح کی مہارت حاصل ہوئی تھی، ایک بار بہت ہی الجھے ہوئے مسودے کے مبیضے کو دیکھ کر وہ دیر تک حیرت آمیز تحسین سے مجھے دیکھتے رہے مجھے یاد رہے کہ میں نے جو مسودات صاف کیے، ان میں ایک مضمون "مصحفی اور انشاء کے ادبی معرکے" کے عنوان سے بھی تھا۔

میں نے اوپر کی سطور میں سید صاحب کی کلاس میں آمد کے موقع پر ڈسٹر (جھاڑن)، چاک اور حوالے کی کتابوں کا ذکر کیا تھا یہ اجمال تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔ اصل میں سید صاحب پورے اہتمام سے کلاس میں آتے تھے وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے (حالانکہ انہیں کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی (وہ کلاس میں ایک "پڑھانے والے استاد" کی حیثیت سے آتے تھے، اس لیے وہ چاک ڈسٹر اور حوالے کی کتابوں کے بغیر کبھی کلاس میں نہیں آئے یہ اور بات ہے کہ حوالے کی کتاب شاذونادر ہی کھلتی تھی۔ اس لیے کہ تمام حوالے نہایت قدرتی طور پر ان کے لیکچر میں موجود ہوتے تھے کلاس میں آتے ہوئے اور پڑھاتے وقت ان کے ہاتھ میں چھوٹے بڑے متفرق کاغذوں کا ایک "چھوٹا یا بڑا" پلندا ضرور ہوتا تھا۔ ان کاغذوں پر سبق کے لیے اشارے ہوتے تھے، ان اشاروں کو وہ خود ہی سمجھ سکتے تھے۔

کہیں الفاظ و تراکیب ہوتی تھیں کہیں اردو اور فارسی کے اشعار ہوتے تھے کسی ایک آدھ جگہ پر یوں بھی لکھا ہوتا تھا "لطیفہ نمبر ۱ ۔ سیتو ہے ہیے"

وہ کچھ لطیفے بھی سوچ کر آتے تھے اور یہ پہلے سے طے ہوتا تھا کہ انہیں لیکچر کے کسی خاص موڑ پر طالب علموں کو لطیفہ سنانا ہے۔ معلوم نہیں وہ اپنے لطیفے کہاں سے اخذ کرتے ۔ بعض اوقات وہ اپنے پرانے طالب علموں کے واقعات کو لطائف بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض لطائف ہم نے بار بار سنے اور بقدرِ استطاعت محظوظ بھی ہوئے۔ ہم ان کے ذہنی رویوں کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ بعض اوقات پیش بینی کر سکتے تھے کہ اب کون سا لطیفہ سنایا جائے گا۔ یا یہ کہ حافظ شیرازی کا یہ شعر کب پڑھا جائے گا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

یہ شعر وہ مستجانس اصوات (ALLETRATON) کی مثال کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اس میں وہ "آسماں" ۔ "بار امان" ۔ "نت نتوان" ۔ "نست کش ی ی ی د" کو بہت لمبا کر کے پڑھتے تھے۔ بعض متشککین کا خیال تھا کہ سید صاحب جدید ایرانی لہجے کو (کم از کم اس شعر کی حد تک) نہیں اپنا سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ صرف فارسی زبان و ادب کے بے بدل عالم اور استاد تھے بلکہ جدید ایرانی لہجے کی تمام نزاکتوں سے آگاہ اور عملی طور پر اس کی تمام اداؤں سے باخبر تھے۔

ان کے ہر طالب علم کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ مجھے ہمیشہ ان کی توجہات حاصل رہی ہیں میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ میں نے ان کے سامنے والے ڈیسک کی پہلی سیٹ پر بیٹھ کر ان سے کسبِ فیض کیا ہے، لیکچر کے دوران بعض علمی نکات کی تشریح کرتے ہوئے ان کی نظریں جن طالب علموں پر رکتی تھیں۔ ان میں خاکسار راقم الحروف بھی تھا۔ میرے ساتھ خواجہ صاحب (ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) اور عابد صاحب (پروفیسر عابد صدیقی) بھی اس امتیاز میں شامل تھے۔ کبھی کبھی وہ سبق کے دوران کسی خاص بات پر زور دینے کے لیے میرا پورا نام لے کر مجھے پکارتے تھے۔ ان کا SYLLABLE کو STRESS کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ مثلاً میرے نام کے دو لفظوں اجزاء کے اولیں حصوں پر زور دیتے تھے۔

"اسلم انصاری صاحب، بلکہ صاحب ۔ میر فرماتے ہیں. . . . ." ان کی آواز متین، لہجہ گمبھیر، اندازِ بیان میں ملائمت مگر قطعیت ہوتی تھی، ان کے لہجے

عطاء الحق قاسمی

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال کی خبر میں نے جلوال میں سنی اور یہ خبر غیر متوقع نہ تھی کہ سید صاحب فالج کے حملے کے باعث گزشتہ کئی ماہ سے صاحب فراش تھے۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ خبر بڑے صدمے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بڑے لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں قریب سے نہیں دیکھنا چاہیے مگر سید صاحب کے اصلی بڑے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں قریب سے دیکھنے کے باوجود میری نظروں میں نہ صرف یہ کہ وہ بڑے رہے بلکہ مزید بڑے ہوتے گئے۔

میں نے سید صاحب کو پہلی بار آج سے بائیس برس قبل دیکھا تھا۔ میں نے اورینٹل کالج میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخلہ لیا۔ سید صاحب تنقید پڑھاتے تھے اور ان کا لہجہ کچھ اتنا دلنشین تھا کہ اتنا خشک مضمون تر و تازہ محسوس ہونے لگتا تھا۔ سید صاحب کان میں آلہ سماعت لگانے اپنے لیکچر کے دوران پھلجھڑیاں چھوڑتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے لیکچر کے دوران ان سے کوئی سوال کیا جو ابہام کی وجہ سے سید صاحب کو سمجھ نہ آیا مگر انہوں نے مجھے شرمندگی میں مبتلا کرنے کی بجائے اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا:

بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات، مکرر کہے بغیر

ڈاکٹر سید عبداللہ میر کے عاشق تھے اور انہیں میر کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ چنانچہ لیکچر کے دوران وہ میر کے اشعار اتنے برموقع استعمال کرتے کہ ایک طرف کوئی دقیق سا مسئلہ بالکل آسان سا نظر آنے لگتا اور دوسری طرف طلبہ میں "سخن فہمی" کا جوہر پیدا کرنے میں مدد ملتی۔ بسا اوقات سید صاحب کا لیکچر ایک گھنٹے سے بھی تجاوز کر جاتا، مگر نہ کسی کو جمائی آتی اور نہ کوئی اپنی سیٹ پر کروٹ بدل کر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا۔ میں نے اپنی زندگی میں سید صاحب سے بہتر استاد نہیں دیکھا۔

اورینٹل کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد سید صاحب دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا کام جتنی عرق ریزی سے کیا اور اس ضمن میں جس معیار کو مدنظر رکھا اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ سید صاحب کے رفقاء ان کی محنت کے حوالے سے جو باتیں سناتے ہیں وہ ناواقف حضرات کو انہونی سی لگتی ہیں۔ لیکن جو لوگ اس عظیم شخصیت سے واقف ہیں، اس میں انہیں کوئی بات انہونی محسوس نہیں ہوتی۔ جب چند ماہ پیشتر ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس وقت وہ اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اس حملے کی زد میں ان کی زبان بھی آئی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے بلکہ اس کی اس ہدایت کے بعد بھی کہ انہیں فوراً ہسپتال میں داخل کر دیا جائے، سید صاحب دفتری کاموں میں مشغول رہے اور اپنے رفقاء سے ضروری امور پر گفتگو لکھ کر کرتے رہے۔ ہسپتال جانے کے بعد بھی میں نے انہیں اس حالت میں دیکھا کہ آدھا دھڑ مفلوج ہے، خوراک ایک نالی کے ذریعے ناک کے رستے معدے میں پہنچائی جا رہی ہے۔ زبان کام نہیں کر رہی، مگر ان کی شگفتہ طبعی اسی طرح برقرار ہے۔ جب میں ان کی عیادت کو گیا انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پوری قوت سے دبایا اور پھر مسکراتے ہوئے "وکٹری" کے نشان کے طور پر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ میں نے ایک کاغذ پر چند جملے لکھے، جن میں اپنی محبت کا اظہار تھا اور ان کی خیریت دریافت کی تھی، اس کے جواب میں سید صاحب نے بستر پر لیٹے لیٹے قلم ہاتھ میں لیا اور ایک پورا پیرا اس کے جواب

، لکھ دیا۔ اس کے علاوہ وہ زبان سے بھی کچھ کہنے کی کوشش کرتے
ے، مگر ان کی بات سمجھ میں نہ آئی! اکیڈمی آف لیٹرز کے ڈائریکٹر جنرل
سندھی کے ممتاز افسانہ نگار و محقق غلام ربانی آگرو ان کی عیادت کو آئے
۔ اس پیکرِ عزم و استقلال کو دیکھ کر انتہائی متاثر ہوئے اور انہوں
، فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم لیے!

ڈاکٹر سید عبداللہ بزرگ نقادوں میں اگر واحد نہیں تو ان گنے
نے لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو عصری ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے
ریوں اسے سمجھنے اور سراہنے کی مکمل صلاحیت سے بہرہ ور تھے، سید صاحب
نے ایک اصول بنایا تھا کہ وہ کسی کتاب کی تقریب رونمائی کی نہ صدارت
یں گے اور نہ مضمون پڑھیں گے کیونکہ یہی وقت اس سے بہتر
ام میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ مگر میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جو
ئ کتاب ان کی نظروں سے گزرتی تھی مصنف کے علم میں لائے بغیر
س پر اپنی تحریری رائے کا اظہار اپنے کسی مضمون میں ضرور کرتے حالانکہ
یسا پنجابی محاورے کے مطابق ان کا یہ فعل "سوئے ہوئے بچے کا منہ چومنے"
کے مترادف تھا۔

سید صاحب کسی ادبی گروپ سے تعلق نہیں رکھتے تھے نہ انہوں
نے کبھی اپنا گروپ بنانے کی کوشش کی، بس انہوں نے اپنی ساری
ندگی ادب اور اردو کی بے لوث خدمت میں گزار دی۔ اردو سے ان
عشق سب پر آشکار ہے، وہ ساری عمر اردو کے لیے انشا ہی
سے لڑتے رہے۔ وہ عام گفتگو بھی پنجابی کی بجائے اردو میں کرتے
تھے، جس پر مجھے الجھن سی ہونے لگتی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ گفتگو صرف
ادری زبان ہی میں ہو سکتی ہے، چنانچہ میں سید صاحب سے مسلسل
نجابی میں گفتگو کرتا رہتا اور وہ جواب میں اردو بولتے رہتے۔
یک دن میں نے ادب سے کہا "سید صاحب! آپ کہیں پنجابی
بھول تو نہیں گئے؟" یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے "پنجابی وی کوئی
بھلن والی زبان اے، چل فیر اج پنجابی بول کے وی دیکھ لے۔؟
پنجابی بھی کوئی بھولنے والی زبان ہے، چلو پھر آج تم میرے ساتھ
پنجابی بول کر بھی دیکھ لو!) اور پھر اپنے ہزارے کے لہجے میں بہت
دیر تک پنجابی میں گفتگو کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں اپنے بیگانے
علم و فضل کی بنا پر زندگی میں بھی بہت محبت ملی اور جب وہ علیل ہوئے
تو اگرچہ "نوائے وقت" کے توجہ دلانے پر ہی سہی، مگر ارباب حکومت
نے بھی ان کے عزت و احترام کو ملحوظ رکھا، صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق
نے اپنے معالج خصوصی کو ان کی خدمت میں بھیجا اور ہدایت کی کہ اگر
سید صاحب کو بیرون ملک علاج کی ضرورت ہے تو فوری طور پر انہیں
باہر بھجوا دیا جائے۔ گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی دو دفعہ سید صاحب
کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئے اور ان کی خدمات کے اعتراف کے
طور پر ایک لاکھ کا چیک ان کی خدمت میں پیش کیا۔ ایک نرس ان کی
خدمت کے لیے ان کے گھر پر متعین کی گئی۔ اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد
نے سید صاحب کے علاج اور دوسرے امور میں ہر طرح کی ذمہ داری
اٹھانے کی پیشکش کی اور اس ضمن میں عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا ان کی
وفات پر صدر، وزیر اعظم اور گورنر پنجاب نے تعزیتی پیغامات ارسال
کیے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے اس ضمن میں اپنے فرائض کو محسوس
کیا۔ یہ تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے امور میں ارباب حکومت
کی سرد مہری پر اگر نکتہ چینی کی جاتی ہے تو ان کی طرف سے بہتر رویے
کو سراہنا بھی ضروری ہے، سو خدا کا شکر ہے کہ جب ہمارا یہ عظیم سکالر
اور بے پناہ خوبصورت انسان اس دنیا سے رخصت ہوا تو سبھی
لوگوں کو ان کی خدمات یاد تھیں، جس قوم کا حافظہ ان معاملات میں اچھا ہو
اس قوم کے مستقبل سے زیادہ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

سید صاحب اپنی ذات کی نمود بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ
انہیں شاید ہی کسی نے ٹیلی ویژن یا ریڈیو کے پروگراموں میں دیکھا یا سنا
ہو۔ اسی طرح اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں بھی ان کے بڑے
بڑے انٹرویو نظر نہیں آتے تھے، کیونکہ ان کاموں کے لیے وقت نہیں
تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جس روز ان کا انتقال ہوا، اس روز کسی اخبار
میں ان کی وفات اور نماز جنازہ کی خبر شائع نہ ہوئی کہ اس روز اخبارات کی
چھٹی تھی۔ یہ بات بہت دہرائی گئی ہے کہ ایسے لوگ مر کر بھی زندہ رہتے
ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ بات کہی جانی چاہیے، کیونکہ یہ بات سید صاحب
جیسے لوگوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں
لیکن آج نہیں آنے والا کل بھی انہی کا ہے۔

نسیم شاہد

اُردو زبان کا عاشقِ بے مثال

پچھلے دو ماہ کے عرصے میں اردو ادب کو کچھ ایسے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں جن کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آتی۔ پہلے محمد طفیل نے اچانک رختِ سفر باندھا پھر قدرت اللہ شہاب رخصت ہوئے اور اب ڈاکٹر سید عبداللہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ ادھر نوجوان شاعر اور کالم نگار طارق جامی کی اچانک وفات بھی کسی بڑے سانحے سے کم نہیں ہے طارق جامی کی شخصیت ایک علیحدہ کالم کی مستحق ہے اس لیے اس کا قرض کسی آئندہ نشست پر اٹھائے رکھتا ہوں۔ اس وقت میرا موضوع ڈاکٹر سید عبداللہ کی نابغہ روزگار شخصیت ہے جو ایک مجتہد کی زندگی گزار کر ۱۴ اگست یعنی آزادی کے دن اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ مثالی استاد صاحب طرز نقاد، انتھک محقق، صاف گو صحافی، ماہر لسانیات اور نظر بنیاد رکھنے والے مفکر کی صفات کو اگر ایک جگہ مجتمع کر دیا جائے تو نتیجے کے طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت ہی ابھرتی ہے۔ مثالی استاد کی حیثیت سے انہوں نے معاشرے کو ہزاروں ایسے شاگرد دیے جو فکری روشنی کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کے دلوں میں اردو سے محبت کا شدید جذبہ پیدا کیا۔ جو قومی یکجہتی کے ضمن میں ایک ایسی خدمت ہے جسے کسی صورت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نقاد کی حیثیت سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے نظری اور فکری تنقید کو ہم آہنگ کر کے تنقید کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ محقق کی حیثیت سے انہوں نے ادبی تاریخ کے کئی اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی۔ ایک بڑا تحقیقی کام اردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین تھا جن کاموں کے لیے اداروں کی ضرورت ہوتی تھی ڈاکٹر صاحب انہیں تن تنہا پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی دھن میں مگن رہتے تھے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انہوں نے معاشرتی و سیاسی موضوعات پر لگی لپٹی رکھے بغیر فکر انگیز کالم لکھے اور صاحبِ فکر انسان ہونے کے ناتے اپنا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ماہر لسانیات کی حیثیت سے انہوں نے اردو کی وسعتِ بیان کو قابل فخر بنانے کے لیے لفظوں اور تراکیب کی تراش خراش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا سب سے بڑا حوالہ ایک ایسے عاشق کا ہے جو اردو زبان سے والہانہ محبت رکھتا ہے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یوں کہنا چاہیے کہ مولوی عبدالحق کے بعد جس شخص نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اپنی زندگی کا حرف اول و آخر بنایا وہ ڈاکٹر سید عبداللہ ہے۔ جب تک ان کے قویٰ میں سکت رہی وہ اردو کو اس کا حقیقی مقام دلانے کے لیے کوشاں رہے۔ وفات سے صرف دو ڈھائی ماہ پہلے تک بھی نفاذ اردو کے سلسلے میں ان کے فکر انگیز مضامین اخبارات میں شائع ہوئے جن میں انتہائی مدلل انداز میں ان عوامل کی نشاندہی کی گئی تھی جو اردو کو ایک باوقار قومی زبان بنانے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک اردو کو وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ حقدار ہے تاہم سید عبداللہ جیسے دیوانوں کی کوششوں نے اردو کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں سے منزل تک کا فاصلہ صرف ایک گام کا رہ گیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ اردو کی ترقی کے لیے کی گئی کوششوں میں ان کا حصہ نکال لیجیے۔ معلوم ہو جائے گا کہ باقی کیا بچا ہے۔ اس محاذ پر انہوں نے ایک بہت لمبی اننگ کھیلی ہے۔ جس طرح ایک لمبی اننگ کھیلنے والا کرکٹ کا کھلاڑی اپنی ٹیم کو فتح سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی قومی تشخص کی جنگ کا پانسہ بڑی حد تک اپنی قوم کے حق میں پلٹ دیا ہے۔ اردو زبان کی خدمت دراصل پاکستان کی خدمت ہے کیونکہ اردو پاکستان کے اتحاد کی علامت ہے۔ ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جہاں پر آ کر پاکستانی قومیت کے تمام ضمنی عناصر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

ایک ایسی فضا میں جب ملکی و قومی وحدت کو پارہ پارہ
نے کے لیے بہت سی قوتیں سرگرم عمل ہوں، اگر کوئی اللہ کا بندہ قوی
ن کا نعرہ لگاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ایک جائز راستہ بھی اختیا
ہے تو میرے نزدیک وہ آدمی خدا کی ایک ایسی رحمت و نعمت ہے
پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسی ہستیوں کا
یسی ہی نعمتوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کھوکھلی نعرہ بازی کی
ہ خاموشی کے ساتھ قومی وحدت کو مستحکم کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی ہے
ب اور زبان دو ایسی قوتیں ہیں جو قومی وحدت کی عمارت کو مضبوط
دن مہیا کرتی ہیں زبان کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ
کے ذریعے مختلف مذاہب کے لوگ بھی ایک ہی لڑی میں پروئے
ہیں اور پھر بعض اوقات لوگ اس بات کا پروپیگنڈہ بھی کرتے ہیں
ہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے (حالانکہ یہ بات دین کے معاملے
رست نہیں ہے) ایسے میں لسانی وحدت ہی ایک ایسا راستہ مہیا
ہے جس پر چل کر قومی وحدت کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر
سید عبداللہ نے اپنے اس محاذ کو منتخب کیا اور آج اردو زبان ہی خیبر سے کراچی
تک شناسائی، رابطے اور وحدت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ ضرورت اس
بات کی ہے کہ اردو کو فی الفور سرکاری زبان کا درجہ دے کر دفتروں اور
اعلیٰ درجے کے امتحانات میں رائج کیا جائے تاکہ قومی وحدت کے اس سرچشمے
سے زیادہ سچائی اور یقین کے ساتھ فیضیاب ہوا جا سکے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۸۰ سال کی عمر
میں وفات پائی۔ بعض لوگوں کے نزدیک اسی سال ایک طویل عمر ہوتی ہے۔
تاہم ڈاکٹر سید عبداللہ جیسی ہستیوں کے لیے یہ عمر بھی بہت کم ہے۔ ایسے
لوگوں کو عمر خضر عطا ہونی چاہیے تاکہ فیض کے چشمے ایک تسلسل کے ساتھ
جاری رہیں۔ بہرحال یہ کام ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے شاگردوں کے
ذریعے انجام دیا ہے، جو جہاں بھی موجود ہیں اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے
ہوئے ہیں۔ علاقائی تعصبات کے اس دور میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ فوج
قومی وحدت کا مؤثر دفاع کر رہی ہے اور قوم کو صرف اسی ایک بات کے لیے ڈاکٹر
سید عبداللہ کا تاحیات شکر گزار رہنا چاہیے۔

●

انگلش پرستی کی بیماری پورے معاشرے
پر محیط ہو گئی ہے۔ ہم اب تک دفتر شاہی
کا رونا روتے رہے کہ ان کا وجود میکالے
ازم کا پیکر محسوس ہے، ہم نے (اپنی بے حسی
کے باوجود) حلقۂ ارباب اقتدار کی گریباں گیری
کی اور بہت برا بھلا کہا مگر اب آگے بڑھے تو
معلوم ہوا کہ یہاں باسامان اور بے سامان
کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو انگریزی
کی اے بی سی سے نابلد ہیں (ہر چند کہ انگلش
میڈیم کی برکت سے اب یہ خواندہ طبقہ بھی
"بابا بلیک شیپ" کی حد تک انگریزی خواندہ ہو
گیا ہے۔ تاہم یہ لوگ انگریزی ابجد سے ہنوز ناواقف
ہی ہیں مگر دکانوں، کارخانوں، فرموں، گھروں
اور گلیوں کے نام انگریزی میں رکھنے لگے ہیں۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ اخبار اردو اکتوبر ۸۲)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

زبان اُردو کے محسن ممتاز محقق اور اسکالر جناب سید محمد عبداللہ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اُن کی تدفین میں ملک کے مشہور ادیب اور دیگر حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے ان میں لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد، جناب مجید نظامی وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ممتاز ماہر تعلیم، نامور ادیب اور محقق تھے انھوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب منگلور ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مختلف تعلیمی اداروں میں خصوصاً پنجاب یونیورسٹی میں طویل عرصے تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ وہ شعبہ اُردو کے صدر اور اکادمی ادبیات پاکستان کے بانی رکن تھے، انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بحیثیت ریسرچ اسکالر کام کیا۔ ۱۹۲۵ء اردو کالج برائے علوم شرقیہ میں ریڈر کی حیثیت سے شامل رہے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ کے پہلے مسلمان رکن تھے ان کو ایرانی حکومت نے نشانِ سپاس عطا کیا تھا حکومتِ پاکستان نے انھیں تمغۂ حسن کارکردگی اور تمغۂ ہلال قائداعظم کے اعزازات سے نوازا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُردو، فارسی، عربی اور جرمن زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے وہ پہلے ڈی لٹ تھے اور اپنی آخری زندگی تک وہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا پر کام کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اُردو سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اپنے اردگرد کے سیاسی اور دوسرے تمام ہنگاموں سے بے نیاز وہ علم و ادب کی خدمت میں معروف رہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

روزنامہ جسارت کراچی ۱۷-۸-۸۶ء

میری زندگی میں اُردو قومی زبان نہ بن سکی تو مر کر بھی چین نہ پاؤں گا

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم

ڈاکٹر سید عبداللہ بھی ہم سے رخصت ہو گئے ہماری ان سے آخری ملاقات اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۱ء میں ہالہ ۔ ے ان کے ہال میں ہوئی ۔ ہ سید تاجش الوری سے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بننے میں ان رکاوٹوں کا ذکر کر رہے تھے جن کی وجہ سے اردو اب تک سرکاری زبان نہ بن سکی تھی اور ۱۹۸۱ء میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں ہم ۔ لے ان کی باتوں میں خلوص اور محبت کی جو خوشبو، بلکی اس کی مہک اب تک محسوس ہو رہی ہے انہیں غلطی تھا ان کا کہنا تھا اب میرا چل چلاؤ ہے لیکن اگر میری زندگی میں اردو قومی زبان نہ بن سکی تو میں اطمینان سے مر بھی نہ سکوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں غریق رحمت کرے اور ان ارباب حکومت ملک کا نام اردو کو اپنی زبان نہیں بنا سکیں ۔ ہ اور آخر کب تک انگریزی کی حکومت ہمارے ۔ اوپر رہے گی۔

روزنامہ جنگ لاہور ۱۱-۹-۱۹۸۶ء

ڈاکٹر عبداللہ کی یاد میں ادبی ریفرنس

گزشتہ دنوں مقامی مدار الحکومت اسلام آباد کے ایک مقامی ہوٹل میں برصغیر کے نامور اسکالر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یاد میں ادبی تنظیم "دائرہ" کے زیر اہتمام اور مقتدرہ قومی زبان اردو کے تعاون سے ایک ادبی ریفرنس منعقد ہوا۔ جس میں ان کی گراں بہا خدمات کو سراہا گیا جو کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اردو کی ترویج و ترقی اور فروغ کے لئے انجام دیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی صاحبزادی پروفیسر ڈاکٹر عطیہ سید نے ملک بھر سے شرکت کرنے والے تمام دانشوروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تقاریب جب منعقد ہوتی تھیں تو ان تقاریب کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک خاص اور دلنشیں انداز میں تمام مہمانان گرامی اور سامعین حاضرین کا شکریہ ادا کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں طور اتنے بہت سے دانشوروں کا ان کی تعزیتی تقریب میں اکٹھے ہو جانا جس میں ان کی شخصیت قابلیت اور اردو کی ترویج و ترقی اور قابلیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی اس بات کی مظہر ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم پاکستان کے عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

مقتدرہ قومی زبان اردو کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت ادبی خدمات، فروغ اردو کے حوالے سے محبت ادب اور ان کی دیگر خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک بلند پایہ کے ایک ماہر ہی تھے اور نیل کالج لاہور کے پرنسپل ہونے کے ناطے ایک اعلیٰ منتظم کی حیثیت سے حالات و واقعات کا جائزہ لیتے اور اس کے بعد ہی کوئی حکمت عملی وضع کرتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مزید کہا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تعلق سیاست سے بھی رہا اور ان کے سیاسی مضامین دس سال تک مختلف اخبارات میں کوہستانی کے فرضی نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر عطیہ سید اور ڈاکٹر وحید قریشی کے علاوہ عنایت کبریا صدر ادبی تنظیم "دائرہ" ممتاز شاعرہ اختر امان، پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر امین اللہ، پروفیسر صابر آفاقی، بریگیڈیئر گلزار احمد، پروفیسر کرم حیدری، پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بھی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی اردو ادب کے لئے گراں قدر خدمات کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا جبکہ آغا کے محمد حسین نے فارسی میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

تقریب کے آخر میں مہمان خصوصی وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات سلیم سیف اللہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایک عظیم اسکالر تھے۔ برصغیر کے لوگوں کو ان کی قومی زبان کے لئے کی گئی خدمات کو ہمیشہ سراہنا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے۔ حالانکہ ان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا مگر انہوں نے اردو کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ ہمارے لئے ایک اثاثۂ عظیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اردو کے فروغ کے لئے اور اس کو قومی سطح پر اپنانے کے لئے بہت کام کیا۔ اور اگر ہم ان کی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اردو کو ہر سطح پر اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک اور تمام دفاتر میں اس کو پھیلانا ہوگا۔ اس کی ترویج و اشاعت کے لئے مزید کام کرنا ہوگا کیونکہ یہ ہمارا اولین فرض ہے اور قومی زبان کی حیثیت سے ہمیں اردو کو فروغ دینا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تاثر دینا غلط ہے کہ وہ لوگ جو انگریزی کو نہیں اپناتے کبھی نہیں ترقی کرتے۔ انہوں نے کوریا کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کے لوگوں نے مختلف شعبوں میں اپنی ہی قومی زبان کو استعمال میں لاکے بے انتہا ترقی کی ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل غلام ربانی اگرو نے لاہور کے مقامی دوستوں کے ہمراہ اردو زبان کے ممتاز عالم و ادیب مرحوم سید عبداللہ کی آخری آرام گاہ پر حاضری دی۔ اور اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے پھولوں کی چادر چڑھائی۔ اس موقع پر مقامی دانشوروں میں معروف ادیب، پروفیسر عارف عبدالمتین، ڈاکٹر بشیر گورایہ، عطاءالحق قاسمی، سراج منیر، علی اکبر عباس، بیدار سرمدی، آغا بیدل اور دیگر اہل علم موجود تھے۔

اہل قلم نے اس موقع پر سید صاحب کی علمی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور آخر میں فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد جناب غلام ربانی اگرو سید صاحب کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے سید صاحب کی زوجہ اور صاحبزادی سے تعزیت کی اور سید صاحب کے مسودات کی اشاعت کے لئے ان کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ سید صاحب کی صاحبزادی مس عطیہ خان کا شکریہ ادا کیا

روزنامہ حریت کراچی ۵-۹-۸۶ء

اردو زبان میں اپنائے جانے کیلئے تمام صفات موجود ہیں: سلیم اللہ

اسلام آباد ۲۹ اگست (اے پی پی) ہاؤسنگ اور ورکس کے وفاقی وزیر جناب سلیم اللہ نے آج یہاں کہا ہے کہ اردو زبان میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو اسے ہر تعلیمی شعبے اور دوسرے شعبوں میں اپنانے کے لئے ضروری ہیں وہ ادبی سوسائٹی "دائرہ" اور مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ممتاز اسکالر اور محقق کرنے والے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی یاد میں منعقد ہونے والی ایک تقریب سے صدارتی خطاب کر رہے تھے۔

روزنامہ نوائے وقت کراچی ۳۰-۸-۸۶

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ

سرگودھا (نمائندہ پکار) انجمن ترقی اردو سرگودھا نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو اور معارف اسلامیہ کے صدر گرامی قدر ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات پر اپنے گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے تجویز کیا ہے کہ عالمی اردو کانفرنس پاکستان میں ایک اجلاس ان کی یاد میں منعقد کیا جائے جس میں ڈاکٹر مرحوم کی علمی ادبی اسلامی و تعلیمی خدمات کے بارے میں ملک کے نامور ارباب علم و ادب مقالے پڑھیں اور ان کی خدمات کو سپاس پیش کریں نیز تحریک ترویج اردو کے سلسلے میں ان کے مشن کو جاری رکھنے کا اہتمام کریں۔ انجمن ترقی اردو سرگودھا نے یہ بھی طے کیا کہ وہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یاد میں اردو زبان کی ترقی و نفاذ کے لئے نوجوانوں کو تحریک کرنے کے لئے بہت جلد ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کانفرنس کا اہتمام کرے گی۔ جس کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ملک کے ممتاز اہل علم و ادب کو دعوت دی جائے گی۔

روزنامہ پکار اسلام آباد ۹-۹-۸۶

بادِ شمال
ظفر اکبر آبادی

ہمارے قومی تشخص کی پہچان اردو ہے۔ یہ تاثر دینا غلط ہے کہ ہم اردو کو اپنائیں گے تو ہماری ترقی متاثر ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ اسلام آباد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ رہائش پذیر ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ شہر پڑھے لکھے لوگوں کا مرکز ہے لہٰذا اس قسم کی ادبی محفلیں یہاں باقاعدگی سے منعقد ہونی چاہئیں۔ اور اس سلسلے میں دائرہ کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ آخر میں سلیم سیف اللہ نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی دختر اور بیگم عبداللہ کا بھی شکریہ ادا کیا کہ وہ خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کے لئے لاہور سے تشریف لائیں۔

تقریب کے آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ اورینٹل کالج میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یادگار قائم کی جائے۔ مانسہرہ کے قریب ان کے گاؤں منگلور میں ان کے مکان کو آثار قدیمہ کے تحت میوزیم کا درجہ دیا جائے۔ اور اسلام آباد میں ان کے نام سے کوئی شاہراہ منسوب کی جائے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ رحلت فرما گئے

کچھ نہ کرنا مگر اتنا تو کم از کم کرنا ——— ہم جو مر جائیں ذرا دھوم سے ماتم کرنا

مرحوم کو سینکڑوں مداحوں اور شاگردوں کی موجودگی میں مسلم ٹاؤن کی مسجد حکیم کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا

روزنامہ مشرق لاہور ۱۶-۸-۸۶ء

صدر ضیاء الحق، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اہلیہ اور بیٹی سے سید صاحب کے انتقال پر اظہار تعزیت کر رہے ہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات سے اچھے اور سچے پاکستانیوں کے حلقے میں خلا پیدا ہو گیا ہے

صدر جنرل ضیاء الحق سید مرحوم کے گھر گئے اور خاندان سے اظہار تعزیت کیا

لاہور ۲۰ ستمبر (وقائع نگار خصوصی) صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق آج صبح ماہر تعلیم صاحب طرز انشاپرداز اور اردو کے زبردست علمبردار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کی اہلیہ محترمہ سے ملنے ان کی قیام گاہ واقع اردو گلستان روڈ گئے اور بیگم سید عبداللہ سے ان کے عظیم خاوند کی وفات پر اظہار تعزیت کیا۔ گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی اور صوبائی وزیر اعلیٰ جی ان کے ہمراہ تھے۔ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے بیگم سید عبداللہ اور ان کی بیٹی عطیہ سید سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی وفات ایک قومی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی وفات سے علم و ادب اور اچھے اور سچے پاکستانیوں کے حلقے میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی نہ پر ہو سکے گا۔ انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی اہلیہ اور بیٹی عطیہ سید کو صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیٹی عطیہ سید نے اظہار تعزیت پر صدر مملکت اور ان کے رفقاء کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۱-۹-۸۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات پر صدر ضیاء الحق کا اظہار تعزیت

راولپنڈی ۱۵ اگست (پ پ ا) صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے معروف دانشور اور ادیب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی وفات پر اظہار تعزیت کیا ہے مرحوم کی اہلیہ کے نام تعزیتی پیغام میں صدر نے کہا کہ مجھے آپ کے خاوند کی وفات پر گہرا دکھ ہوا ہے براہ کرم اس موقع پر میری دلی تعزیت قبول کریں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لئے مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اس کے علاوہ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین بھی ان کا یادگار کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی وفات پر
چوہدری شجاعت حسین کا اظہار تعزیت

اسلام آباد (اسٹاف رپورٹر) وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات چوہدری شجاعت حسین نے اردو کے ممتاز دانشور محقق اور ادیب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے مرحوم کی بیوہ کے نام اپنے ایک تعزیتی پیغام میں وزیر اطلاعات و نشریات نے کہا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ نے اردو کے حوالے سے ملک و قوم کی جو خدمت کی اور نظریاتی محاذ پر جو خدمات انجام دیں وہ آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی کا کام دیتی رہیں گی وزیر اطلاعات نے مرحوم کی اردو ادب کے لئے خدمات کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا چوہدری شجاعت نے سابق والئ سوات کے صاحب زادے نیاز گل اور محمد حبیب کی وفات پر بھی تعزیت کا اظہار کیا ہے قومی اسمبلی کے رکن میاں گل اور محمد حبیب کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے مرحوم کی وفات پر لواحقین کے لئے صبر جمیل اور مرحوم کے لئے بلندی درجات کی دعا کی ہے

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۶-۸-۸۶ء

اردو زبان میں تعلیم کے ہر شعبہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت ہے — سلیم سیف اللہ

اسلام آباد ۲۹ اگست (اے پی پی) ہاؤسنگ اور تعمیرات کے وفاقی وزیر سلیم سیف اللہ نے کہا ہے کہ اردو زبان تعلیم کے ہر شعبہ اور علوم کو اختیار کرنے کی مکمل صلاحیت کی حامل ہے وہ آج یہاں ممتاز اسکالر اور محقق سید محمد عبداللہ کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے جس کا اہتمام ادبی انجمن دائرہ اور مقتدرہ قومی زبان نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ وفاقی وزیر نے ہر شعبہ میں اردو کو اپنانے کی ضرورت پر زور دیا اور اس تاثر کو غلط قرار دیا کہ جدید سائنس کے فروغ کے لئے انگریزی لازمی ہے۔ انہوں نے اردو کے فروغ میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی خدمات کا شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

روزنامہ حریت ۳۰-۸-۸۶

ڈاکٹر سید عبداللہ مسلم دنیا میں بھی عظیم اسکالر کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے : سلیم سیف اللہ

اسلام آباد ۲۹ اگست (اے پی پی) وفاقی وزیر برائے ہاؤسنگ و تعمیرات سلیم سیف اللہ خان نے کہا ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نہ صرف اردو زبان کے عظیم اسکالر تھے بلکہ اسلامی دنیا میں بھی عظیم اسکالر کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے وہ آج یہاں مقتدرہ قومی زبان کے تعاون سے دائرہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید عبداللہ ایک ادبی ریفرنس سے خطاب کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ اگر ہم ان کے مشن کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر شعبہ زندگی میں اردو کو رائج کرنا ہوگا ریفرنس سے مقتدرہ کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی، عنایت کمریا، پروفیسر نذر صدیقی، اختر امان، پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر امین اللہ، پروفیسر صابر آفاقی بریگیڈیئر گلزار احمد، پروفیسر کرم حیدری، پروفیسر ڈاکٹر عطیہ سید اور ڈاکٹر عبداللہ کی بیٹی نے بھی خطاب کیا

روزنامہ حریت کراچی ۵-۹-۸۶ء

ڈاکٹر عبداللہ کو خراج عقیدت

ملتان ۲۰ اگست (پ ر) بزم فروغ اردو ملتان کا تعزیتی اجلاس ہوا جس میں بزم کے معتمد اعزازی ایم ایچ بصرا باز نے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کو پنجاب کا "بابائے اردو" اور برصغیر کا پاسبان اردو کے خطابات کا حقدار قرار دیا اور اردو کی ترویج و ترقی میں ان کی گرانقدر خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج اردو اپنے اعلیٰ ترین محسن و معاون سے محروم ہو گئی اور آج سے اردو سرا پا سوگوار ہے۔

روزنامہ حریت کراچی ۲۱-۸-۸۶

مقتدرہ قومی زبان کا تعزیتی اجلاس

راولپنڈی ۲۱ اگست (نیوز ڈیسک) ملک کے نامور محقق، دانشور، ماہر تعلیم استاد اور محسن اردو ڈاکٹر سید عبداللہ کی رحلت پر مقتدرہ قومی زبان کے افسروں و کارکنوں کا ایک تعزیتی اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر وحید قریشی منعقد ہوا۔ اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ مرحوم نے اردو زبان کے لئے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ کے ایک زریں باب کی حیثیت سے تابندہ رہیں گی۔ اجلاس میں قرارداد منظور کی گئی کہ مقتدرہ کے کتب خانے کا نام ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام پر رکھا جائے گا۔ ایک اور قرارداد میں سفارش کی گئی کہ پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام سے مخصوص چیئر قائم کی جائے۔ اسی طرح قومی لائبریری میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصانیف کے ساتھ اردو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کتب بھی علیحدہ دی جائیں جس میں مقتدرہ کی کتب بھی بھیجی جائیں گی تعزیتی اجلاس کے آخر میں مرحوم کی روح کی بلندی کے ایصال ثواب کے لئے دعا کی گئی۔ ادارہ ادب و ثقافت اسلام آباد کے ایک تعزیتی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ادارے کے صدر اور نوجوان شاعر و ادیب طارق شاہد نے کہا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو ادب کے قافلہ سالار تھے اور اپنی تصنیف اور قومی زبان کے حوالے سے جدوجہد کے سلسلے میں عالمگیر شہرت رکھتے تھے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۲-۸-۸۶ء

اُردو، قومی ترقی و خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ نہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ ممتاز سکالر تھے، اردو کیلئے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی : سلیم سیف اللہ

اسلام آباد ۲۹ اگست (نامہ نگار) ہاؤسنگ اینڈ ورکس کے وفاقی وزیر سلیم سیف اللہ نے کہا ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو زبان کے سکالر تھے اور اس وطن عزیز میں اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ وہ یہاں مقامی ہوٹل میں دائرہ اور مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید عبداللہ کی یاد میں منعقدہ ایک تعزیتی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ سیف اللہ نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کو اپنائے بغیر ترقی و خوشحالی کے زینے طے نہیں کئے جا سکتے یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے اردو میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ مختلف شعبوں میں ترقی و خوشحالی کا سبب بن سکتی ہے انہوں نے اس سلسلے میں کوریا کی مثال دی اور کہا کہ انہوں نے اپنی قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ترقی کی ہے اس کا اعتراف پوری دنیا میں کیا جاتا ہے ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا ڈاکٹر سید عبداللہ ایک اچھے منتظم بھی تھے انہوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا اور کوہستانی کے نام سے ان کے سیاسی تجزیے کافی دیر تک اخبارات میں چھپتے رہے تقریب میں عنایت کبریا، پروفیسر نذیر صدیقی، پروفیسر خورشید رضوی، ڈاکٹر امین اللہ، پروفیسر صابر آفاقی، بریگیڈیئر گلزار احمد، پروفیسر کرم حیدری، پروفیسر شعیب صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ کی دختر پروفیسر عطیہ سید نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۳۰-۸-۸۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ، وداع ہوئے

گذشتہ چند ماہ میں اردو ادب کو سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے آخری ناقابل تلافی نقصان ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی وفات کی صورت میں ہوا ہے۔ قمیت اللہ شہاب، محمد طفیل، ابراہیم جلیس روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیں چھوٹے تھے مگر سب کے سب اردو ادب کے نامور لوگ تھے اور تخلیقی شخصیات ہونے کے سبب پوری قوم کا سرمایہ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ایک عرصے سے علیل چلے آرہے تھے گزشتہ روز گورنر پنجاب نے ان کی مزاج پرسی کی تھی۔ اور اس موقع پر ایک ڈاکٹر، ایک نرس اور دوسرے طبی سامان کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا تھا مگر اسی برس کے عالم اور ادیب کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ڈاکٹر صاحب ان قابل فخر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مسلسل جدوجہد اور محنت سے زندگی میں ایک بلند مقام حاصل کیا تھا۔ ضلع ایبٹ آباد کے ایک قصبے سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب تعلیم اور ادب کے افق پر درخشندہ ستارہ بن کر چمکے۔ اورینٹل کالج سے عربی اور فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۰ء میں لٹریچر میں ڈاکٹریٹ کی ان سے پہلے پنجاب سے صرف ڈاکٹر محمد شفیع فیروز دین نے ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا تھا ڈاکٹر سید عبداللہ کی کوششوں سے ۱۹۴۳ء میں اورینٹل کالج میں اُردو کا شعبہ قائم ہوا جس کے وہ بعد میں چیئرمین مقرر کر دیئے گئے وہ آٹھ برس ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۸ء تک اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے اس کے بعد انہیں اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب، تدوین اور ترجمہ کے شعبہ کا سربراہ بنا دیا گیا یہ انسائیکلوپیڈیا جو ۲۳ جلدوں میں چھپنا ہے جن میں سے ۲۲ جلدیں ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ہی تیار ہو گئیں، ہر سال ایک جلد کا تیار کرنا ایک معرکے سے کم نہ تھا ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو تنقید میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے متعدد مجموعے چھپے۔ کاروان ادب میں ہر وقت شریک رہے اور رسالوں کے مدیروں کے تقاضوں پر تقریباً آخری دم تک تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ کرتے رہے ڈاکٹر صاحب شعبہ تدریس سے تعلق رکھنے والے خاص قسم کے نقاد نہ تھے۔ بلکہ وہ ہر عہد میں ادبی زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتے رہے۔ آزادی سے پہلے غیر ملکیوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وہ کوہستانی کے نام سے مضامین اور شعر کہتے رہے اور قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اردو کے تخلیقی ادب کے آخری نمونے بھی پڑھے ہوتے اس لئے ان کی تنقید صرف کلاسیکل ادب تک محدود نہیں رہی انہوں نے ہر عہد میں نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی تخلیقات پر اپنی رائے کا اظہار کیا اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اپنے حقیقی اور معنوی شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی ہے۔ اردو ادب اور پاکستان کی علمی ادبی تاریخ میں ڈاکٹر صاحب کا نام ہمیشہ ہمیشہ روشن رہے گا اور یہ تاریخ ان کے نام سے معتبر گنی جائے گی۔

ہرگز نمیرد

تا عمر در تگاپوی پیہم بجستجو
در دشتِ شوق زندہ از او بود ہای و ہو
آں سیدِ یگانہ سخندانِ نغز گو
آخر بہ بست رخت ز دنیای رنگ و بو

" اردو دلش بود لیلیٰ و خود قیس بُد بعشق
ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق"

شریف کنجاہی

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ

اہلِ وطن کے سر پہ تھی دستار چھن گئی
اردو سے اس کی تیغِ جگر دار چھن گئی
نقد و نظر کا لٹ گیا سرمایہ دہر میں
علم و ادب کی دولتِ بیدار، چھن گئی

اردو کے گلستاں کی ابد آشنا بہار
سید، وہ عبدِ حق، وہ پیمبر کا جاں نثار
مر مر شکارِ دشنۂ محرومِ التفات
نخلِ گلاب تھا کہ رہا وقفِ خارزار

عبداللہ گو ضعیف تھا، میداں میں ڈٹ گیا
وہ رن پڑا کہ کشتوں سے میدان پٹ گیا
اُردو زباں تو مُلک میں رائج نہ ہو سکی
لیکن سپاہ اُردو کا جرنیل کٹ گیا

عطا حسین کلیم

بیادِ ڈاکٹر سیّد عبداللہ

جس کا جستہ جستہ جہاں میں حرف تھا سازِ براق
وہ حوالِ سالخوردہ دے گیا داغِ فراق
نکتہ پردازِ معانی، محرمِ حسنِ بیاں
پختہ کارِ منصبِ نقد و نظر بالاتفاق

عشق پیشہ، جس کا نصب العین اُردو کا فروغ
نت کشادہ نطق اس کے واسطے بستہ نطاق
جس کی شخصیت میں پرتو فقر و درویشی کا تھا
دے چکا تھا جو ہوائے نفس کو کب سے طلاق

خوبردیانِ طرازِ فکر و فن جس کے ندیم
جس کے ہم کاسہ سخن کے ساقیانِ سیم ساق
حیرت و ادراک نے سانچے میں ڈھالا تھا اسے
مسلک و منہاج اس کا صفوت و صلح و وفاق

اہلِ دل پر اثر از خود رفتگی طاری رہے
پر علی الرغم ان کے چست و چاق ہوں اہلِ نفاق
دردمندی سے نُبت اس کی قبائے ذات کی
کلفتِ خاطر اسے آسائشِ طاق و رواق

کھیلتا تھا اک تبسم اس کے چہرے پر مدام
باوجود پیری و دیرینہ سالی خوش مذاق
تھا وہ اک دیوانہ عاقل، ایک مستِ ہوشیار
ایک بھی اپنے نوشتے کو کیا جس نے نہ عاق

دستِ اربابِ ہنر ہے دستِ دامن گیرِ شوق
تازہ کار و تازہ دم رکھے فسونِ اشتیاق
تا حدِ توفیق و ہمت ہے مکلف ہر کوئی
کم ہی دے قدرت کسی کو زحمتِ مالایطاق

ہاتھ سے رکھا قلم اس نے نہیں آخر تک
آ چکا تھا گو وہ ماہِ کاستہ، زیرِ محاق
اس قتیلِ علم کو اپنے خیامِ خلد میں
دے جگہ اے خالقِ سبع سماوات طباق

عبدالعزیز خالد

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

قطعہ تاریخِ وفات

استادِ گرامی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم و مغفور
(وفات: ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء مطابق ۱۴۰۶ھ)

سید عبداللہ مردِ نیک نام
صاحبِ علم و حقیقت خوش کلام

"اخترِ برجِ شرف" تاریخِ فوت
نیز شد سیّد "ولی ذی احترام"

۱۹۸۶ء — ۱۴۰۶ھ

قطعہ تاریخ وفات

محسنِ اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اعلی اللہ مقامہٗ

اٹھ گیا دنیائے فانی سے وہ مردِ باخدا
اہلِ پاکستان کو صدمہ ہوا ہے جانکاہ

رونقِ بزمِ ادب تھا نازشِ عزم و عمل
تھا جہانِ علم کا وہ درِ حقیقت کجکلاہ

اس کی ہر تحریر تھی آئینہ دارِ علم و فضل
اس کی ہر تنقید تھی فکر و نظر کی درس گاہ

ایک ہی دھن تھی اُسے جو زندگانی بھر رہی
ارضِ پاکستان میں اُردو نہ ہو جائے تباہ

تھا زباں دانی پہ اس کو پورا پورا اعتماد
تھی سخن فہمی میں حاصل اس کو کامل دستگاہ

جامعہ پنجاب اس کے نام سے شاداب تھی
اور تھا اس میں فروزاں وہ مثالِ مہر و ماہ

ذکر اس کے کارناموں کا کوئی کیوں کر کرے
تاب اس کی خوبیوں کی لا نہیں سکتی نگاہ

برملا مہجورؔ کہہ دے "ہائے داغِ مہرِ علم"
سالِ تاریخ وفات سیدِ عبد الٰہ

نتیجۂ فکر
سید عارف محمود مہجورؔ رضوی

تاثرات

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

سید صاحب جیسے عظیم دانشور اور اہل قلم صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ جتنے بڑے ادیب تھے اتنے ہی بڑے انسان اور اہل دل بھی تھے۔ انھوں نے زندگی بھر علم اور ادب کی آبیاری کی پاکستان کے ہر علاقے اور ہر خطے میں ان کا ایک عالم اور محقق کی حیثیت سے بہت احترام کیا جاتا تھا۔ مرحوم یوں تو کئی ایک انجمنوں کے بانی اور سرپرست تھے لیکن اکادمی ادبیات پاکستان کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے ان کو اس ادارے سے بہت محبت تھی اور وہ اکثر و بیشتر علمی و ادبی معاملات میں اکادمی کو اپنے نیک مشورے سے نوازتے تھے۔ اکادمی ان کی وفات سے ایک عظیم محسن سے محروم ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر سید عبداللہ میرے رفیق کار تھے تقریباً ۲۸ سال ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا اور انہیں بہت قریب سے دیکھا وہ ایک شفیق استاد ایک بلند پایہ محقق اور ایک اعلیٰ درجے کے نقاد تھے، انہوں نے اپنی تحریروں سے اردو ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ وہ اردو کے محسن تھے اور ساری زندگی انہوں نے اس کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے جد و جہد کی۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر بھی قابل قدر کام کیا کیونکہ وہ عربی کے بھی پروفیسر تھے۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی انہوں نے خاصا وقت گزارا اور اس کی تکمیل میں بھی بڑی محنت کی۔ سید صاحب دوستوں کے دوست تھے اور بڑے مہذب اور شائستہ انسان تھے ہر ایک سے اچھی طرح ملتے تھے اور ادب میں ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہ ہوسکے گا۔

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر سید عبداللہ کی سی جامع الحیثیات شخصیت کسی بھی ملک کے علم و فن کے لیے باعث افتخار ہوسکتی ہے۔ وہ نہ صرف ایک بے بدل ماہر تعلیم تھے بلکہ بڑے پائے ... پر تبحر کی حد تک حاوی تھے۔ میرے خیال میں پنجاب یونیورسٹی میں واحد مثال انہی کی ہے کہ ایک وقت میں انہوں نے اردو اور عربی اور فارسی تینوں زبانوں کے استاد کا منصب ادا کیا۔

بحیثیت نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقام ان کے معاصرین کے مقابلے میں اس لیے بہت بلند تھا کہ وہ صرف کلاسیکی شعر و ادب کے بارے میں ایک حتمی رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ جدید ادب اور جدید تر ادب کو بھی انہوں نے بالاستیعاب پڑھا تھا اور اس ادب کے بارے میں ان کی ایک منفرد اور مثبت رائے تھی۔ وہ ان نقادوں میں شامل نہیں تھے جو غالب یا حالی یا اقبال تک پہنچنے کے بعد اپنے مطالعے اور معلومات کی کتاب بند کر دیتے ہیں۔ اردو کے ایک غیر مشروط بہی خواہ کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بلند ہے مگر اپنی تنقید و تحقیق کے علاوہ ان کی جو کارکردگی انہیں صدیوں زندہ رکھے گی وہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تالیف و اشاعت کا کام تھا۔ اتنے بلند معیار سے اردو والے ابھی تک متعارف نہیں تھے اللہ تعالیٰ اس صدی کے علم و فن کی بڑی شخصیت کی مغفرت فرمائے۔

اشفاق احمد خان

ڈاکٹر سید عبداللہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جو اپنے اردگرد کے لوگوں اور اپنے عہد کے ماحول کو وسعت پذیر علم عطا کرتے ہیں اور ان کے بند رستوں اور تاریک راہوں کو اجالتے۔ سید صاحب جیسا تجزیاتی محقق آپ کو اردو کی قلمرو میں کم ہی نظر آئے گا۔ اگر ان کی مصروفیات اس قدر خیلر د ہوتیں تو اکیلے اردو میں انتقاد کے فن کو دنیا کی بڑی زبانوں کی سطح پر لے آتے اور پھر اس سے تخلیقی تنقید کا ایک جاں بخش سوتا پھوٹ نکلتا۔ اس وقت مجھے ایک ایک کر کے ان کے میر کی شاعری پر بالخصوص اور اردو شاعری کے حواس اور محسوسات پر لکھے ہوئے وہ مضمون یاد آ رہے ہیں جن سے ہم سب کے لیے سوچ کی نئی راہیں کھلی تھیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رحلت ایک بہت [illegible] سے

[illegible]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

چکوال سے راولپنڈی آتے ہوئے میں نے استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال کی خبر سنی اگرچہ ان کی علالت کے پیش نظر میں ایک عرصے سے یہ خبر سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا لیکن جب اطلاع پہنچی مجھ تک پہنچی تو گویا مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور میرے سامنے چالیس برس پر پھیلے ہوئے ماضی کی تصویریں آ گئیں۔

مجھے ۴۴ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ سے پہلے پہل ملاقات کا اور ایک طالب علم کے طور پر ان کے قدموں میں بیٹھنے کا موقع ملا مجھے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے ایم اے کا امتحان ایک سال میں دینے کی اجازت ملی تھی، اس لیے یہ مدت بہت جلد ختم ہو گئی، لیکن اس شاگردی کا یہ رشتہ آج بھی قائم ہے اور جب تک میں زندہ ہوں قائم رہے گا۔ ان چند سطروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے تاریخ ساز کارناموں کا ذکر تو ممکن نہیں ہے اور ان کے کارنامے اس بات کے محتاج بھی نہیں ہیں کہ مجھ ایسا ناچیز ان کا ذکر کرے۔ اس وقت تک میرا دل درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے اور اس غم کی شدت کا احساس اور زیادہ ہو جاتا ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ آسمان علم و ادب کے تابناک ستاروں کے جس جھرمٹ کی روشنی سے یہ خاکسار فیض حاصل کرتا رہا اس جھرمٹ کا آخری ستارا بھی آج بجھ گیا۔ میرے اساتذۂ کرام میں میرے والد محترم مرحوم صاحب، مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور)، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور مولانا علم الدین سالک تو پہلے ہی اس دنیا سے جا چکے تھے اب نگاہیں ڈاکٹر سید عبداللہ کو بھی ترسیں گی۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سے میری آخری ملاقات چند ماہ قبل لاہور میں ہوئی۔ جنوری ۸۶ء میں جب میں ہندوستان سے اردو ادیبوں کے ایک وفد کے ایک رکن کے طور پر پاکستان آیا، ڈاکٹر صاحب مرحوم مجھ سے مل کے ہمیشہ خوش ہوتے تھے اس وقت بھی وہ ہال سے باہر میرے انتظار میں رکے رہے اور نمائش کتب کے افتتاح سے لے کر جب تک جلسہ جاری رہا وہ اور میں ساتھ ساتھ رہے بہت تفصیل سے پوچھتے رہے کہ میں ان دنوں کیا لکھ رہا ہوں اور مجھے یہ جان کر جو خوشی ہوئی اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں کہ میری اکثر کتابیں ان کی نظر سے گزر جاتی ہیں۔ شاگرد کے لیے ان سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا استاد بھی ڈاکٹر سید عبداللہ کے معیار کا اس کی کتابوں سے ذکر کرے۔

آج ان باتوں کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ خداوند کریم انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ جہاں تک دنیائے علم و ادب کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ہمیشہ زندہ ہیں۔ (۱۵ اگست اسلام آباد)

انتظار حسین

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو ادب کے بزرگوں میں شاید آخری بزرگ تھے جن کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا ہے۔ اب تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے انتقال سے جیسے اردو ختم ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے قومی سطح پر جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ تاریخ ادبِ اردو کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے اپنی قومی زبان اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے عملی جدوجہد کی۔ آج اس زبان کی شادابیاں اور کامیابیاں ان ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ ان کی وفات سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اردو کے سر سے شفقت اور محبت کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں رخصت ہو گئی ہے۔

بانو قدسیہ

بہت شفیق انسان اور عالم تھے، ان کے وجود کو دیکھ کر احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے بڑے عالم ہیں وہ ہمیشہ سادہ باتیں کرتے تھے اور اپنی علمیت کا رعب نہیں جماتے تھے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

ابصار عبدالعلی

ڈاکٹر سید عبداللہ محسن اردو کے ساتھ ساتھ محافظ اردو بھی تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس کی خدمت میں بسر کیا۔ آج جو اردو کو مقام ملا ہے وہ ان ہی کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ سید صاحب کی وفات سے ہم ایک بہت بڑے رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سید صاحب کی وفات سے ہم ایک بہت بڑے محقق، نقاد، ماہر تعلیم اور علوم و فنون اسلامیہ کے ایک عظیم ماہر سے محروم ہو گئے ہیں۔ مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی کی روایت

ہیں یہ آخری بڑے محقق تھے ان کے بعد یہ دبستان اختتام پذیر ہوگیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل

ڈاکٹر سید عبداللہ ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے اپنا الگ مقام رکھتے تھے اور اردو کی ترویج و اشاعت میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد انہوں نے بہت سی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ایسے محب اردو اور محسن ادب کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سید عبداللہ کی ذات میں تحقیق اور تنقید کا بہت خوشگوار امتزاج تھا۔ ڈاکٹر صاحب استاد الاساتذہ تھے اور اس وقت ملک میں اردو کے پروفیسروں میں کم از کم چار نسلیں ان سے فیض یاب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر محنت میں بسر کی اور یہی سبق ان کی زندگی سے بھی ملتا ہے کہ اگر انسان اپنے شعبے میں محنت کرے تو وہ بڑی عزت حاصل کر سکتا ہے۔ بابائے اردو کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو کا پرچم بلند کیا انھوں نے شہر بہ شہر اردو کانفرنسوں کا انعقاد کیا انہوں نے اس لاہور شہر میں کئی جلوس نکالے اور ایک مرتبہ تو انہوں نے مال روڈ پر انگریزی کے بورڈ اردو میں تبدیل کرنے کی مہم شروع کی اور خود بورڈ لکھوا کر دکانداروں کو پیش کیے۔ ان کی زندگی امن اور جد وجہد اور عزم مسلسل کی زندگی تھی ان کا آخری بڑا کام اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین ہے، یہ اتنا بڑا کام ہے کہ ان ہی کی محنت کی وجہ سے مکمل ہوگیا۔

ڈاکٹر حسن اختر

ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال سے اردو ادب کو عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے تحقیق اور تنقید میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے انتھک محنت کی۔ بابائے اردو کے بعد انہوں نے ہی اردو زبان و ادب کی باگ ڈور سنبھالی۔

حسن رضوی

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد اردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے کے لیے جو کاوشیں کیں اور خدمات سرانجام دیں وہ ہماری قومی تاریخ اور تاریخ ادب کا ایک روشن باب ہے۔ انہوں نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے لاہور میں جلوس نکالے اور سائن بورڈ اردو میں لکھوانے کی تحریک شروع کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے لگائے ہوئے بے شمار اردو کے پودے اب تناور درخت بن چکے ہیں اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے اور اسے دفتری زبان بنانے کے لیے انہوں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بہت جلد ہمیں ملنے والی ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنی قومی زبان کا تشخص قائم رکھتی ہیں اور اپنی زبان کو دوسری زبانوں پر فوقیت دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا پیغام بھی یہی ہے گو اب وہ ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا نام قومی زبان اردو کے ساتھ ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عطاء الحق قاسمی

سید صاحب جیسا مشفق، حلیم اور محنتی استاد میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے اور بہت سوں کی طرح ان کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے میں نے ان کی شخصیت میں بے شمار خوبیوں کی مہک محسوس کی لیکن ان کی لازوال خوشبو ان کی اردو سے بے پناہ محبت تھی۔ اس محبت ہی کے سبب سید صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس زبان کو قومی درجہ دلانے کے لیے ان کی آواز سب سے بلند تھی۔

منصور قیصر

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات ایک ایسے مرد مجاہد کی وفات ہے جس نے اپنے آپ کو اردو ادب کے لیے وقف کر رکھا تھا میں نے زندگی میں ایسے باہمت لوگ بہت کم دیکھے ہیں وہ نہ صرف ہمیشہ اپنے نظریات کے تقدس کے لیے سینہ سپر رہے بلکہ "ادبی فتنہ وفساد" کی حوصلہ شکنی کرتے رہے۔

پروفیسر حمید رضا صدیقی

ڈاکٹر سید عبداللہ نابغۂ روزگار شخصیت تھے جنہیں قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ علم و ادب کا ایک بحر بیکراں تھے جس سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے۔ ان کی علمی و ادبی حیثیت مسلم تھی انہوں نے اس حیثیت سے جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا وہ ان کی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے جاوداں رکھنے کے لیے کافی ہے دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین سے وہ مدتوں منسلک رہے یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

خالد شریف

ڈاکٹر سید عبداللہ جیسی عظیم شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی تمام زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزری اردو اور وہ لازم و ملزوم تھے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

پروفیسر حفیظ الرحمن

ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال کی خبر سن کر چند لمحوں کے لیے دل و دماغ کی قوتیں اور صلاحیتیں منتشر ہوگئیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نہایت قیمتی چیز کھو گئی ہو کچھ دیر بعد جب ادراک

و احساس اپنے معمول پر آئے تو احساسِ زیاں کے ساتھ ساتھ دل میں خیال آیا کہ سید صاحب نے اس دنیا سے صرف اپنا جسمانی تعلق منقطع کیا ہے وہ اپنے معنوی تعلق کی بے شمار صورتیں چھوڑ گئے ہیں جن کی بنا پر وہ علم و ادب کی محفلوں میں، درس و تدریس کے حلقوں میں اور عرفان و آگہی کی مجلسوں میں رکنِ رکین کی حیثیت سے تادیر موجود رہیں گے۔

مہر گل محمد

بلاشبہ موت ایک امرِ ربی ہے اس کا ذائقہ سب نے چکھنا ہے جس نے جنم لیا وہ فانی ہے لیکن سچی بات ہے کہ بعض لوگوں کی زندگی اور موت دونوں انفرادی نہیں ہوتیں، ان کی زندگی بلکہ ان کا ایک ایک سانس قومی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ان کی زندگی قومی سرمایہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جب ہم سے بچھڑتے ہیں تو ہماری نجی زندگی کے علاوہ قومی زندگی میں بھی بڑے وسیع خلا پیدا کر جاتے ہیں جو بعض اوقات صدیوں پر نہیں ہوتے۔ سید عبداللہ ایک ایسی ہستی تھی جس کا بدل اور ہمسر شاید صدیوں پیدا نہ ہو سکے۔

آپ نے بحیثیت معلم، محقق، نقاد، مترجم، مصلح، مضمون نگار اور دیگر کئی حیثیات میں اپنے ہمعصروں سے لوہا منوایا۔ آپ نے اپنے پیچھے گراں بہا علمی ادبی سرمایا چھوڑا ہے آپ نے اپنے تعلیمی اور ادبی کارناموں سے اپنے عہد کو واضح طور پر متاثر کیا ہے اور ایک منفرد مقام قائم کیا ہے۔

عبداللطیف اختر

ڈاکٹر عبداللہ کی عظمت، ان کے علمی ادبی قد کاٹھ کے بارے میں تو وہ محققین اور نسلیں فیصلہ کریں گی جو ان کے کام کا جائزہ لیں گی۔ ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ سید صاحب بڑی بھرپور اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے وہ جہاں ایک عظیم نقاد تھے وہاں وہ ایک مثالی استاد بھی تھے۔ ان سے ہزاروں افراد نے کسبِ فیض کیا۔ ہمارا شمار بھی ان خوش نصیب لوگوں میں ہے جنہوں نے برگد کے اس گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے علم کی پیاس بجھائی۔

پروفیسر محمد امین

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ ایک صاحبِ علم ادیب اس دنیا سے اٹھ گیا۔ انہوں نے ساری زندگی تحصیلِ علم اور ترسیلِ علم میں بسر کی۔ وہ مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی ورثے سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی سوچ ایک سچے مسلمان کی سوچ تھی۔

انہیں عربی فارسی، اردو اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل تھا انہوں نے اردو کی ترویج کے لیے بہت بہت کوشش کی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد یہ ڈاکٹر سید عبداللہ ہی تھے جنہوں نے اردو کو بحیثیت ایک قومی زبان کے زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کرانے کی کوشش کی آج اردو کو جو حیثیت حاصل ہے یہ انہیں کی خدمات کا حاصل ہے دنیا کی تمام زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہے۔ مگر اردو میں نہیں تھا اور اس کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام دائرہ معارف اسلامیہ کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا بندوبست کیا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس سلسلے میں خدمات ناقابل فراموش ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ان کی زندگی ہی میں یہ کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

پروفیسر جیلانی کامران

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وفات سے ادبیات اردو کی تدریس و تحقیق کی وہ مقتدر شخصیت رخصت ہوئی ہے جس نے پچاس برس سے زائد عرصے تک اردو ادب کی مسلسل خدمت کی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی ساری زندگی کو ہر اعتبار سے ادب کے ساتھ وابستہ رکھا تھا۔ ان کی بے شمار تصانیف کا مقام اپنی جگہ منفرد ہے لیکن جو بات ان کے بارے میں یقیناً قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ ادب کے بارے میں ان کے مشورے بے حد مفید ہوتے تھے۔ ان کی طبیعت میں کئی رنگ تھے۔ لیکن استاد ہونے کی نسبت سے یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ وہ گھنٹوں ایک موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے اور موضوع کی دلکشی میں کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شگفتہ مزاجی ان کی تدریس کو کتابی تھکن سے آلودہ نہیں ہونے دیتی تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت اردو زبان اور اردو ادبیات کی ایسی علامت بن چکی تھی۔ جو نامساعد حالات میں اردو زبان کے حق میں آواز بلند کرتی رہی اور اسلامیانِ برصغیر کی شناخت کے اس لسانی مظہر (اردو زبان) کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہی۔

ابرار حسین

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جن کو مرحوم لکھتے دل کانپتا ہے ان ہی ادبا اور علما شخصیات میں شامل تھے جو معاشرے میں انقلاب برپا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور ارتقا میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔ اردو زبان کو زندگی کے ہر دائرے میں جاری و ساری کرنے میں انہوں نے جہدِ مسلسل سے کام لیا۔ وہ اپنے پیش روؤں کی طرح صرف تصوراتی انسان نہیں تھے۔

نوادرات

خط ۔ سعید احمد فارانی کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فون : ۳۱۴۸۷۱

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ○ لاہور

ڈائریکٹر : ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
معتمد عمومی : ڈاکٹر سید عبداللہ
خازن : پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی

۱۷ ۔ اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور
حوالہ نمبر ...... ۱۸ ......
بتاریخ ...... ۱۳ ۔ جنوری ۔ ۱۹۸۲ء

مکرمی و محترمی ۔ السلام علیکم

آپ کا مراسلہ مورخہ ۹ ۔ دسمبر ۱۹۸۱ء مل گیا تھا ۔ بوجہ مصروفیت جواب تاخیر سے دے رہا ہوں اس کے لیے معذرت کرتا ہوں آپ اردو زبان کے فروغ کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں ہم اس کے لیے آپ کے شکرگزار ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر کی خدمت کی مزید توفیق دے ۔ والسلام ۔

مخلص

(سید عبداللہ)

بخدمت شریف
جناب سعید احمد فارانی صاحب
پاکستان ایسپرانتو ایسوسی ایشن
الفارانسٹروا ۔ ایم ایم مکتب
نزد بابا کرم شاہ ۔ جہلم

اپنے معالج سے

گھر میں ہم ہیں اور دیوار

کوئی پوچھے کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا

ڈاکٹر انصاری صاحب پڑھ لیں یہ مرے
طبیعت کا حال ہے

ٹھیک ہے

میری دکان سے اٹھ کر تم جو چلے گئے

ہر روز رخ بدلتی ہوا بھی ہے

کیا معلوم کل کیا کیفیت ہو

اس وقت آپ نے تو دیکھ کر دیا

کم ہو گئی ہے آپ کے حوالے

کر کے میں نے

[illegible]

ڈاکٹر سید عبداللہ

تعلیم کے متعلق ہماری غلط سوچ

زندگی کے بعض دوسرے بنیادی معاملات کی طرح تعلیم کے شعبے میں بھی ہمارے سوچ کے بعض زاویے بے حد غلط ہیں۔

ان زاویوں میں ایک زاویہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے اربابِ تعلیم ایک بات اکثر دہراتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ قومی تعلیم کا مرکزی محور سائنس اور ٹیکنالوجی ہے:

اصولاً صرف ایک گوشے میں سائنس اور ٹیکنالوجی واقعی ہماری ایک بڑی ضرورت ہے، کل تعلیم نہیں۔ ہماری قومی تعلیم بہت سی دوسری ضرورتوں پر بھی محیط ہے، مثلاً انسانیاتی علوم اور دینی علوم بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر صرف سائنسی اور تکنیکل تعلیم ناقص اور محدود رہ جاتی ہے اور صرف اس تعلیم سے بہرہ یاب حضرات ہرگز مکمل نہیں ہو سکتے، میں اسے دُم بریدہ تعلیم کہوں گا۔

اسی وجہ سے وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب مقاصدِ تعلیم میں اس بات کی تاکید کی تھی کہ ہماری تعلیم کو دائرے کے مانند مدور ہونا چاہیے، یعنی یہ وہ دائرہ ہو جس کے دور میں سائنسی تعلیم تکنیکل تعلیم اور انسانیاتی علوم تینوں سے گزرنا پڑے۔ وائٹ ہیڈ تو خاصا دور چلا گیا وہ تو ہر طالب علم کے لیے ان تینوں شعبہ ہائے تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ مثالی ہدف حاصل نہ ہو سکے (جیسا کہ اکثر صورتوں میں یہ خاصا دشوار ہے) تو معقول صورت یہ ہے کہ ایک خاص حد تک وائٹ ہیڈ کے نظریے کو اپنا کر آگے دوسرے شعبوں میں سے کسی ایک میں تخصیص حاصل کی جائے یعنی سائنس، ٹکنیکل اور انسانیاتی علوم میں سے کسی ایک مضمون کو خاص خاص طور سے اپنا لیا جائے۔ اس طریقے سے ہر طالب علم وائٹ ہیڈ کی منشا کے مطابق تعلیم کے اول مراحل میں مکمل تعلیم سے اور اگلے مرحلوں میں کسی ایک میں متخصص ہو سکے گا مگر باقی سلسلوں سے بھی اس کی واقفیت اور ہمدردی موجود رہے گی اور اس سے متوازن شخصیت کی تخلیق کا مقصد حاصل ہو گا۔

ہمارے ملک میں انگریزوں کے زمانے تک یہی دستور تھا، جس کی وجہ سے تینوں سلسلوں سے سب کی ہمدردی موجود رہتی تھی یہ طریقہ جزواً اب بھی جاری ہے لیکن آہستہ آہستہ ہم اس سے ہٹتے گئے اور اب ہمارے اربابِ تعلیم تعلیمی دنیا کو بالکل الگ الگ جزیروں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر صرف سائنسی تعلیم کو واحد سلسلۂ تعلیم بنا دینا چاہتے ہیں اور انسانیاتی علوم کو یکسر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

یہ طریق کار کئی وجہ سے غلط ہے، مگر پہلے اس ممکن غلط فہمی کو دور کر دینا مناسب ہو گا کہ ہم سائنسی تعلیم کو کسی طرح روکنا چاہتے ہیں یا اسے کوئی گزند پہنچانا چاہتے ہیں۔ حاشا ہمارا یہ ارادہ نہیں، ہم تمام سائنس پرستوں سے زیادہ سائنس کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ ہم اگر چاہتے ہیں تو یہ کہ سائنس کو محیط کل بنا کر باقی سلسلوں کو یکسر ختم کرنے کا طریقہ، قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کے لیے بے اندازہ مہلک ہے۔ اربابِ تعلیم سائنس کو محیطِ کل بنانے کی جو تلقین کرتے ہیں۔ اس سے بہت سے نقصانات ہیں، پہلا نقصان وہ ہے جس کا ہم ہر سال مشاہدہ کرتے ہیں، ہر سال یوں ہوتا ہے کہ ایف ایس سی میں فیل شدگان کا تناسب اسی فیصد کے قریب ہوتا ہے۔

یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اربابِ تعلیم کی روزمرہ کی تلقین کے باعث ہر کوئی سائنس کی طرف بھاگتا ہے، ایسے لوگ بھی سائنس میں داخلہ لے لیتے ہیں جن کا میلانِ طبع اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن سائنسی تعلیم کے

ممکن فوائد کے لالچ میں ماں باپ بچوں کو ایف ایس سی میں دھکیل دیتے ہیں اور میلانِ طبع کا کوئی امتحان داخلہ دینے والوں کے پاس نہیں ہوتا اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایف ایس سی میں طلبہ کا بڑا ضیاع ہوتا ہے اور بعض اوقات دل شکستگی کے باعث طالب علموں کا دل تعلیم ہی سے اٹھ جاتا ہے اور قومی سطح پر بڑی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

یہ نقصان تو وہ ہے جو مادی اور خارجی نقطۂ نظر سے ہوتا ہے لیکن روحانی اور داخلی طور پر یہ ضرور ہوتا ہے کہ انسانیاتی علوم ناکارہ اور حقیر خیال کیے جاتے ہیں اور سائنس سے مایوس ہو کر جو طلبہ انسانیاتی علوم کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ عمر بھر بددلی کا شکار رہتے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ اربابِ تعلیم اس معاملے میں معقول رویہ اختیار نہیں کرتے۔

معقول رویہ یہ ہے کہ تینوں سلسلہ ہائے تعلیم کو یکساں موقع دینا چاہیے اور قومی ضرورتوں کے تحت اور میلانِ طبع کے اصول پر انتخاب کا ایک پلان تیار ہونا چاہیے۔ سب کو سائنس کا چکر دے کر روحانی اور جذباتی مضامین کو بالکل ختم کر دینے کا طریقہ یا رویہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔

قابلِ غور مقام یہ ہے کہ اس ملک کے لوگ از خود ہی سائنس کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ جب ایک شے از خود ہی موجود ہے تو پھر بار بار اس کی طرف بلانا افلاسِ تخیل کا ثبوت ہے۔

اسی طرح کا ایک غلط رویہ خود تعلیم کے سلسلے میں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ سرسید احمد خان کے زمانے میں تعلیم کا ضرورتاً اور صحیح طور سے جو چرچا ہوا تھا اس کے نتیجے میں قوم تعلیم کی جانب پوری طرح متوجہ ہو گئی ہے۔ اب بجائے اس کے کہ تعلیم کے نظامات درست کیے جائیں اور انتظام بہتر اور مؤثر بنائے جائیں، ہو یہ رہا ہے کہ داخلہ ملے یا نہ ملے سکول ہوں یا نہ ہوں محض تعلیم تعلیم کی تلقین ہو رہی ہے۔

بھائی! لوگ از خود تعلیم کی ضرورت کا احساس کر رہے ہیں۔ ناظمانِ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ جتنے لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے سکولوں اور داخلوں کا انتظام کریں تاکہ جو بھی تعلیم کی طرف آئے محروم و مایوس واپس نہ جائے۔

اب صورت کیا ہے، تعلیم کے خواہش مند موجود ہیں مگر سکول نہیں اور داخلے نہیں ملتے۔ ایسے حالات میں تعلیم تعلیم کا ارزاں نعرہ بلند کرنے کے بجائے معقول اور مؤثر انتظامِ تعلیم کی صورت سوچنی چاہیے۔

اس کے علاوہ تعلیم میں مساوات کا اصول رائج کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تعلیم تعلیم کے نعرے سے اکثر اربابِ تعلیم کی مراد مفاد یافتہ طبقوں کی تعلیم کا زیادہ محفوظ انتظام چاہتے ہیں۔ نچلے طبقوں کی تعلیم ان کے مدنظر نہیں۔

غرض تعلیم کے متعلق قومی سوچ کے اس قسم کے زاویے ہر شخص کو کھٹک رہے ہیں اور اربابِ تعلیم کی باتیں ادھوری اور ان کی تلقین خلوص سے عاری نظر آتی ہے اور ہر کوئی اس سے آگاہ ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ہاں نقالی زیادہ ہے اور حسن استفادہ کم ہے اور بعض جگہ تو نری حماقت معلوم ہوتی ہے، مثلاً دیسی زبان میں اچھے بھلے الفاظ موجود ہوتے ہوئے بعض مائیں اپنے بچوں کو باپ کا انگریزی تصور دلاتی ہیں۔ چنانچہ وہ معصوم ناکردہ گناہ ڈیڈی ڈیڈی اور انکل انکل کرتے پھرتے ہیں، مگر ماؤں اور ان کی پیروی میں باپوں کا دل باغ باغ ہو رہا ہوتا ہے کہ چلو اور کچھ نہیں تو ہمارے بچے انگریزی کے دو جملے تو بول لیتے ہیں۔ حضرات معاف فرمایئے یہ نقالی قابلِ نفرت نقالی ہے اور دورِ منحوس غلامی کی یادگار مذموم ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پاکستان کا انگریزی خواں اب بالکل گرتا جا رہا ہے وہ اپنی زبان سے نفرت کرتا ہے اور سلسلہ شاہ ولی اللہؒ اور غزالیؒ سے ملانے کے بجائے بیکن اور سپنسر سے ملاتا ہے۔ آپ ذرا گھوم پھر کر دیکھ لیجیے، آپ کو سائن بورڈ بے ضرورت انگریزی میں ملیں گے، کارڈ انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اشتہار کا رِ قضا اردو میں چھپ جاتا ہے، تو دستخط انگریزی میں کر کے تسکین حاصل کر لی جاتی ہے۔ یہ سب نقالی اور ذہنی مغالطہ ہے، فریبِ نفس ہے، فکری افلاس ہے، بربادی ہے اور بربادی ہی بربادی ہے۔ (ڈاکٹر سید عبداللہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ

پاکستانی ثقافت کے خد و خال

میں سب سے پہلے کلچر سے متعلقہ اصطلاحات کی تشریح کروں گا اس کے بعد چند دوسری بحثیں اٹھاؤں گا جن سے یہ سمجھ آجائے کہ یہ کلچر کا جھگڑا ہے؟

اب ابتدا میں قوم کی تعریف اس لیے کرتا ہوں کہ کلچر کے لیے قوم کا ہونا لازمی ہے۔ قوم سے مراد کوئی اجتماعِ انسانی جو بعض مشترک عقائد یا احساسات سے بشدت متاثر ہو کر سلطنت کی بنیاد ڈالتا ہے تاکہ اس میں وہ اپنے عقائد کی حفاظت کر سکے۔ یہ تعریف GINSBERG نے اپنی کتاب "سوشیالوجی" میں کی ہے۔

اس سلسلے میں ایک لفظ تمدن بھی سننے میں آتا ہے۔ تمدن کسی قوم کی پوری منظم زندگی کو کہتے ہیں، جس میں وہ سب چیزیں شامل ہوتی ہیں جن میں ضابطہ یا قانون چلتا ہے۔ مثلاً مذہب، سلطنت، بین الاقوامی قوانین، ضابطے، نیز رسوم و رواج وغیرہ قوموں کا تمدن جب ترقی کرتا ہے تو اس کے اندر ایک خاص طرزِ زندگی ابھرتا ہے جس میں حُسن اور خوبصورتی کے انداز موجود ہوتے ہیں اور قوم کے افراد بہ حیثیت مجموعی اور بے ساختہ طور پر ایک یک رنگ قسم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں، اسی کو کلچر کہتے ہیں۔ کلچر رہنے سہنے کی عادتوں اور طریقوں کا نام ہی نہیں بلکہ کلچر کسی قوم یا اجتماع کی حسین اور تربیت یافتہ عادتوں کو کہتے ہیں جن کی تشکیل اول داخل میں ہوتی ہے۔ ان عادتوں میں جن میں قانون کا جبر شامل نہیں ہوتا، بلکہ خاص افکار و عقائد بعض مخصوص سماجی احوال اور مذہب یا سلطنت کے خاص اثرات کے تحت بے ساختہ طور پر سب افراد میں وہ عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ گویا جبریہ طور پر منظم اور باضابطہ زندگی کو چھوڑ کر کلچر میں زندگی کے جملہ آزاد مشاغل، تقریبات تفریحات، طریقے اور عادات و ذوقیات شامل ہیں۔ رہن سہن کے طریقے، کھانے پینے اور ملنے جلنے کے آداب، باہمی برتاؤ اور نباہ، تفریح کے ان ذوق و ذہن کے اظہار کے ڈھنگ، علم سے نباہ کرنے کے طریقے، ادب اور فنون سبھی کلچر کا حصہ ہیں۔ ان کی جزئیات کی تفصیل ILL DURAND کی کتاب STORY OF CIVILIZATION میں مل سکتی ہے۔ بہت سے دوسرے الفاظ کی طرح کلچر کا لفظ بھی یورپ سے ہمیں ملا ہے۔ آج کل مصر و شام میں اس کے لیے "ثقافت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں کبھی کبھی لفظ "تہذیب" اس کی جگہ لایا جاتا ہے اور میں اس کا ترجمہ "آزاد اجتماعی رویۂ حیات اور اجتماعی ذوقیات" کیا کرتا ہوں۔ ہمارے پرانے ادب میں اس قسم کی کوئی اصطلاح اس لیے نہیں کہ مسلمان دین ہی کو کل زندگی مانتے تھے اور انہوں نے داخلی اور خارجی زندگی یا دینی اور دنیوی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا؟ چنانچہ اسلامی تصورِ زندگی کے مطابق کلچر یا دائرۂ زندگی مذہب ہی کا حصہ ہے اس سے الگ کر کے اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔

یہ تو تمہیں تعریفات —

اب میں پاکستانی ثقافت کے موضوع پر گفتگو کرتا ہوں۔ اس مسئلے اگر قطعی نظر ڈالی جائے تو پاکستانی ثقافت کی ابھی تک کوئی واضح تشکیل نہیں ہوئی۔ یہ مسئلہ دراصل آئندہ کا ہے۔ ہمارا یہ دور تغیرات کا دور ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ پچاس برس میں ہماری معاشرت کا کیا نقشہ ہوگا۔ البتہ بعض بنیادی اور مرکزی رنگ ابھی تک موجود ہیں جو مذہب اور تاریخ کے بخشے ہوئے ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں ہمارے کلچر کے مرکزی رنگ بہت کچھ پھیکے پڑ چکے ہیں اور پاکستان کے قیام کے بعد تو بگاڑ بہت بڑھ گیا ہے

موجودہ حالت میں پاکستانی قوم کا کوئی ایک رد یڈ زندگی نہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے کلچرل فرنٹ پر ایسی ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ پرانی ثقافت کے بہت سے آثار مدھم یا مسخ ہو گئے ہیں۔ یہی حال اس نئی ثقافت کا ہے جو ہمارے با اقتدار اور تعلیم یافتہ طبقے کی زندگیوں میں رواج پا رہی ہے، مگر ہے وہ بھی ادھوری، اس لیے کہ اس کے پیچھے نقالی کے سوا کچھ نہیں۔ قوم کا تہذیبی شعور اور اصلی مزاج اس میں بہت کم حصہ لے رہا ہے۔

بنا بریں پاکستانی ثقافت کا موضوع قابل بحث تو ہے مگر اس کی قطعی تصویر کھینچنا، جو قومیت کے چوکھٹے میں جڑی ہو۔ میرے خیال میں بہت مشکل بلکہ شاید ناممکن ہے۔ انہی وجوہ سے میں نے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ پاکستانی طرزِ زندگی کے رجحانات کا کڑی نظر سے جائزہ لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں اس کی قومی بنیادوں سے منسلک رکھا جائے۔ آئندہ کی سطروں میں اسی زاویہ نگاہ سے کچھ سفارشات پیش کرتا ہوں:

موجودہ حالات میں پاکستانی زندگی کے تین اجزائے ترکیبی ہیں:
اول: اسلام کے آدابِ معاشرت جو مسلمانوں کے پرسنل لاء، اعتقادات اور قرآنی اخلاق اور سنتِ نبوی ﷺ سے پیدا ہوئے: دوم: لوکل اور مقامی طریقے، جو کچھ تورانیوں، مغلوں اور ایرانیوں کے طرزِ زندگی سے بچ بچا کر ہم تک پہنچے ہیں، سوم: مغربی ثقافت کے اثرات۔

ہمارا موجودہ کلچر انہی عناصر کا ملغوبہ ہے۔ جمہور کا مذاق مذہبی ہے۔ وہ عملاً یا ذہناً ہر چیز کو مذہب سے ملانا اور اسی سے سند لانا چاہتا ہے، اس کے برعکس انگریزی دان جماعت کی اکثریت نئی اقدار کا نام لے کر زندگی کو مغرب کے طور طریقوں سے وابستہ کرنا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان ایک تیسرا گروہ وہ بھی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بہا چلا جاتا ہے۔ ؎

بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں

غرض انتشار کا عالم ہے اور انتشار کے باعث تنقید کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے، تاکہ قومی وحدت اور یک رنگی کا راستہ نمودار ہو سکے۔ قومی وحدت ملک کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ قومیں وحدت اور یک رنگی سے پہچانی جاتی ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو قوم قوم نہیں بھیڑ رہ جاتی ہے۔ دوم تحریر ضرورت سے بڑھی ہوئی علاقہ پرستی بھی مانع وحدت ہے، کوشش یہ چاہیے کہ علاقوں کے مختلف رنگ اپنی نمود دکھا کر آہستہ آہستہ مشترکہ قومی پاکستانی ثقافت میں جذب ہو جائیں۔ ورنہ ڈر ہے کہ پاکستان کوئی کلچر باقی نہ رہے گا اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کا کوئی مشترک یک رنگ کلچر بھی ہے غلط ثابت ہو گا۔

مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ زندگی کی رَو کو بے قید چلنا چاہیے۔ بے قیدی تو انارکی کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا آئیے طرزِ زندگی کے متعلق جو مختلف خیالات ہیں، تنقید کے ذریعے ان میں تطبیق اور مفاہمت کی کوئی راہ نکالی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے ملکی زندگی کے خوبصورت اور صالح حصوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ یہ زندگی وہ ہے جو عوام اور جمہور کی زندگیوں میں ابھی پیوست ہے۔ اگرچہ مغربی زندگی کی چمک کے مقابلے میں اس طرزِ معاشرت کا رنگ پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ زندگی سادہ بھی ہے اور کم خرچ بھی مقامی میلے، تہوار، مشاغل اور وہ تقریبات جن میں عوام کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ شہری اور مغربی قسم کی تفریحات کے مقابلے میں سہل الحصول اور بے ضرر ہیں۔ سجاوٹ کی وہ ملکی چیزیں جو پہلے عام ہوا کرتی تھیں، ان کی دوبارہ ترویج کی جائے اور اہلِ ملک ان کو دوسری چیزوں کے مقابلے میں ترجیح دیں۔ غرض اس ملکی عنصر کو بنیادی چیز مان کر اختراع و ایجاد کی قوت سے ان کو حسین سے حسین تر شکلوں میں تبدیل کیا جائے تاکہ ملکی طبائع کا جوہر کھلے اور زندگی کی سلیقہ مندی میں اضافہ ہو۔ موجودہ حالات میں انگریز دان طبقے کی غلط تقلید و تنقید کی وجہ سے دیہات کے لوگ بھی ایسی زندگی بسر کرنے لگے ہیں، جو بڑی خرچیلی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان میں خوبصورتی پیدا نہیں کر سکتے، اور بعض اوقات تو غسل خانے کے برتن کھانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور عجب تماشا ہوتا ہے۔ بسا اوقات میں نے بعض نو دولت نوجوانوں کی زبان سے یہ ہفوات بھی سُنیں "ہاف بیل انڈہ لاؤ" — "ہاف بیل" — یہ سب اس لیے کہ ہمارے اصحابِ مدرسہ اور معلم حضرات نے عوامی معیشت یا جمہور کی معاشرت کی کبھی تقلید نہیں کی

اور ان سے ہم آہنگ رہنے سے گریز کیا۔

اب میں گفتگو کے اختلافی حصے پر آ پہنچا ہوں اس معاملے میں سب سے بڑا جھگڑا اسلامی تہذیبی یا اخلاقی نظریوں کا ہے۔ اس کے بعد مغربی اثرات کا کہ ان عناصر میں سے ہمیں کیا لینا ہے اور کیا نہیں لینا ہے۔

پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے اور اس کی قومیت کی بنیاد متفقہ طور پر اسلامی ہے۔ لہذا ہماری معاشرت میں اسلامی اخلاق و آداب زندگی کا حصہ مسلم ہے، مگر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ اسلامی آداب زندگی کے تصور سے خوفزدہ ہیں۔ اس کا باعث دو مغالطے ہیں: ایک مغالطہ تو یہ ہے کہ اسلامی زندگی میں فرحت اور تفریح کی کوئی گنجائش نہیں، دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا دور چلا گیا۔ اب ایک اور تہذیب موجود ہے جس کو کاملاً اپنا لینے کے باوجود ایک مسلمان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میرے خیال میں یہ دونوں مغالطے بے حد خطرناک ہیں، لہذا ان کی وضاحت کی ضرورت ہے

میں دوسرے مغالطے کو نظرانداز کرتا ہوں کہ اس وسوسے کو پھیلانے والے لوگ ابھی کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی "درکمیں" under ground ہیں۔ اگرچہ ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ عقل اور بین الاقوامیت کی دلیلوں سے بات کرتے ہیں اور خام کار نوجوان طبقے کو مسخر کر لیتے ہیں۔ پھر بھی اس وقت میں اس بحث کو نہیں چھیڑتا۔ البتہ پہلے مغالطے میں میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی گزشتہ تہذیب میں فرحت و دلکشائی کی صورتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی تعریفات، ان کی تقریبات، ان کے مجلسی، ادبی اور فنی مشاغل اور ان سلیقہ مندیوں میں ملتا ہے، جن کے ذکر سے ان کی پوری تاریخ لبریز ہے۔ معلوم نہیں کس نے یہ بے پر کی اڑا دی ہے۔ یہ ہوائی یقیناً کسی دشمن یا کسی بے خبر نے اڑائی ہو گی۔ میں مسلمان ادیبوں کا طالب علم ہوں، مجھے تو ہر گام یہ محسوس ہوتا ہے کہ پرانے مسلمان ہم سے زیادہ زندگی کی نعمتوں سے متمتع ہوتے تھے، ہم تو محض ہیرا پھیری سے بدنام ہوئے، ورنہ وہ تو کلوا واشربوا حیث شئتم اور کلوا واشربوا رغداً پر پورا عمل کر دکھاتے تھے۔ خدا جانے کس کانے نے ان اندھوں کو یہ بتا دیا کہ ہاتھی کی شکل ایک چھاج کے مانند ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس قوم نے مسجد قرطبہ، الحمرا اور تاج محل تعمیر کیے۔ کیا وہ قوم بے ذوق یا کج نظر ہو گی۔ یہ مغالطے دراصل انگریزوں اور دوسرے مصنفوں کے پھیلائے ہوئے ہیں اور چونکہ یہ انگریزی کے رومن حرفوں میں لکھے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم لوگ فوراً ان پر ایمان لے آتے ہیں اور بات اصل میں کیا ہے کہ ہر دوسری تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب کا ایک اہم اصل الاصول اس کی کلیت ہے کہ وہ خدا اور انسان اور دین اور دنیا کو ہم رشتہ بنا کر چلتی ہے، یعنی زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا اور قیامت کے دن کو فراموش نہیں کرتی۔ دنیا کی جو بھی خوشی غریب اور غلام اقوام کے استحصال سے تعمیر ہوتی ہو وہ خوشی، خوشی نہیں جان کا روگ ہے۔ اسلامی تہذیب کا دوسرا بڑا عنصر اس کا RESTRAINT ہے جس کے لیے مناسب لفظ میرے پاس موجود نہیں۔ تقویٰ ہو سکتا تھا مگر خوف کے مارے میں یہ لفظ نہیں لاتا، بہرحال RESTRAINT ایک بڑا اصول ہے، زندگی جو ایک نعمت ہے اس کے ساتھ ہی ایک بڑا مشن بھی ہے، اس کے لیے اسلامی تہذیب کی روح اصلی فرحت کو ثواب جانتی ہے مگر کھل کھیلنے اور بے قید تعیش کے سارے رجحانات کے خلاف ہے۔ کیونکہ تعیش زندگی اور تسخیر کے اہم مشن کے تکمیل سے روکتی ہے۔ یہیں سے موسیقی اور مصوری کے متعلق مناظرے شروع ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے صوفیوں کے نزدیک موسیقی ایک مقدس فن ہے اور علم کی شاخ کی حیثیت سے موسیقی مسلمانوں کے نصاب تعلیم میں ہمیشہ شامل رہی ہے۔ مگر داتا گنج بخشؒ نے اس پاکیزہ فن کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ جب اس کا رشتہ شہوت انگیزی اور تعیش سے جا ملے اور شراب و شاہد کی ہم رکابی کا شرف اس کو حاصل ہونے لگے تو یہ صوفی کے لیے ہرگز روا نہیں۔ غرض یہ کہ موسیقی اور مصوری دونوں کا مسلمانوں کے زمانے میں عروج رہا۔ نہ رضا عباسی مارا گیا نہ بہزاد کے کان کاٹے۔ نہ زیارب الموصلی سنگسار ہوا۔ پھر یہ کیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلمان ان چیزوں کے دشمن رہے ہیں۔ البتہ وہ دشمن

ضرور رہے ہیں کھُل کھیلنے والوں اور فنونِ پاک کو عیاشی کا ذریعہ بنانے والوں کے۔ ان کی تہذیب نے انہیں یہ سکھایا تھا کہ زندگی فرصت و نعمت بھی ہے مگر فریضہ بھی۔ جو شے بھی قویٰ میں ضعف پیدا کرنے کا موجب ہے اس پر مارشل لاء لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں خصوصاً جبکہ وقارِ زیست اور مقامِ انسانیت کو اس سے صدمہ پہنچتا ہو۔

اسلامی تصورِ زندگی کی بات لمبی ہے۔ مختصراً یوں ادا کر لیجیے کہ مسلمانوں کے ذوقِ حیات میں جہاں ذوقِ جمال و فرحت ہے، وہاں ذوقِ علم، ذوقِ جہاد اور ذوقِ عبادت بھی شامل ہے اور ان سب کے مجموعے کا نام اسلامی رویۂ زندگی ہے۔ اس رویۂ زندگی کی پوری تصویر کھینچنا ممکن نہیں، مگر اس سے متعلق چند الفاظ کی فہرست شاید کچھ نہ کچھ تصور دلا سکے گی۔ مثلاً ادب۔ حیاداری، پاکیزگی۔ طہارت۔ تقویٰ۔ تحدیث بالنعمت۔ عدل، شفقت۔ فرقِ مراتب۔ طہارتِ نسل۔ کسبِ حلال۔ کتاب اور کاغذ کی عزت۔ مسجد کی مرکزیت، علمی سفر و سیاحت کی فضیلت، بلا معاوضہ کارِ ثواب وغیرہ! ان الفاظ سے اگر کوئی گزشتہ تہذیب کا پورا نقشہ کھینچنا چاہے تو کھینچ سکتا ہے! یوں ہمارے یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں جو چرخ کی آواز سن کر کان بند کرا دیتے تھے کہ اس کا انداز تارِ ساز کی موسیقی سے مشابہ ہے، مگر ایسے PUN TA NS کہاں نہیں ہوتے۔ یہ تو ہر دور اور ہر ملک کے لوازم و ثبات میں سے ہیں، بلکہ خود مذاقِ زندگی میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کے لیے بھی جو آدمی صرف مے و مینا یا محض خانقاہ کا ہو کر رہ جائے اسے مکمل انسان کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جب ہم فوراً پلاؤ اور بریانی کو چھوڑ کر ابلے ہوئے آلوؤں کا ذوق پیدا کر سکتے ہیں، تو تغیرِ لباس اور ذائقے کی تبدیلی میں مشکل کچھ نہیں ہوگی بشرطیکہ عقیدے پکے اور نیت درست ہو۔ اس کا ایک بڑا علاج جو میں نے لوگوں کو بتایا اور وہ کارگر ثابت ہوا وہ وہی ہے جو دوستوفکی اور طالسطائی نے اپنے پیغمبر کے سلسلے میں آزمایا تھا۔

شخصیتِ رسولؐ سے عقیدت ہمارے لیے بھی ناگزیر ہے کیونکہ ہم پاکستانیوں اور مسلمانوں کا کل سرمایۂ حیات بھی تو یہی ہے۔ شخصیتِ رسولؐ سے محبت رکھنے کے بعد اس راستے کے سب مراحل طے ہو سکتے ہیں:

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبیست،

اب مغربی ثقافت کا ذکر آتا ہے، شاید گزشتہ تصریحات سے آپ خوفزدہ ہو کر اپنے اپنے دل تھام تھام بیٹھتے ہوں کہ معلوم نہیں کہ اب میں کیا گل افشانی یا زہر چکانی کرنے لگا ہوں مگر حضرات آپ تسلی رکھیے، میرے نزدیک مغربی ثقافت کوئی ایسی چیز نہیں جس کا مجھ پر کوئی خاص خوف ہو۔ بشرطیکہ ہمارا اپنا فکری اور ذہنی مرکزِ ثقل اپنی جگہ پر قائم ہو، اقبال نے کیا خوب کہا:

دل ہو یک بین و یک اندیش تو پروا کیا ہے
بے خطر دیدۂ بینست۔ اب کو ہرجائی کر

اور ہرجائی پن کی یہ دعوت بے خیالی سے میں نہیں دے رہا ہوں۔ یہ تو مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کا ایک عام اور بار بار کا تجربہ ہے۔ مسلمان جہاں گئے انہوں نے مقامی اور اجنبی سوادِ زندگی سے فائدہ اٹھایا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس پر فکری مہر اپنی ہی لگائی۔ آپ کو معلوم ہے یہ مینار ہم نے کہاں سے لیے۔ یہ محراب کدھر سے آئے، یہ گنبد کیونکر فروغ پذیر ہوئے۔ یہ ہندسہ، یہ ریاضی ہم نے کہاں سے سیکھیں۔ یہ طبیعات ہم میں کدھر سے آن ٹپکا۔ یہ سب بیرونی مواد ہے، جس پر مسلمانوں نے اپنا ٹھپہ اس زور سے لگایا کہ اب کسی اور کا نقشِ موہوم بھی اس پر باقی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایران، ہند، شام، مصر، اندلس، بربر اور مراکش میں اسلامی تہذیب کے خارجی مظاہر داخلی فکری اشتراک کے باوجود الگ الگ رہے۔ مسلمانوں میں لباسوں کی رنگا رنگی ہی کو دیکھ لیجیے، ہر خطے میں آب و ہوا اور ضرورتوں کے تحت کتنا اختلافِ رنگ و وضع ہے۔ لباس کے معاملے میں کسی تعصب کا

کسی دور میں سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ایک بات ہر جگہ مشترک نظر آتی ہے کہ مسلمانوں نے بے حیائی، برہنگی اور نیم برہنگی کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہی حال دوسرے اوضاع و اطوارِ زندگی کا ہے کہ جن میں اسلامی تہذیب مغربی تیدنیشن کے برعکس بڑی کشادہ دل اور معقول ثابت ہوئی۔

میں مغربی ثقافت کو بھی اپنے ملک اور قوم کے لیے ایک تجربہ اور ایک امتحانِ دانش و عقل سمجھتا ہوں اور اس کے تازہ دم اور نوجوان ردیۂ حیات سے مستفید ہونے کا دل سے حامی ہوں مگر حضرات محض نقالی اور غلامانہ تقلید اور شے ہے اور استفادہ اور شے ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک نقالی زیادہ ہے اور حسنِ استفادہ کم ہے اور بعض جگہ تو نری حماقت معلوم ہوتی ہے، مثلاً دیسی زبان میں اچھے بھلے الفاظ موجود ہوتے ہوئے بعض مائیں اپنے بچوں کو باپ کا انگریزی تصور دلاتی ہیں، چنانچہ وہ معصوم ناکردہ گناہ ڈیڈی ڈیڈی اور انکل انکل کرتے پھرتے ہیں مگر ماؤں اور ان کی پیروی میں باپوں کا دل باغ باغ ہو رہا ہوتا ہے کہ چلو اور کچھ نہیں تو ہمارے بچے انگریزی کے دو جملے تو بول لیتے ہیں۔ حضرات معاف فرمایئے یہ نقالی قابل نفرت نقالی ہے اور دورِ منحوس غلامی کی یادگارِ مذموم ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پاکستان کا انگریزی خواں اب بالکل گرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی زبان سے نفرت کرتا ہے اور سلسلہ شاہ ولی اللہؒ اور غزالی سے ملانے کے بجائے بیکن اور سپنسر سے ملاتا ہے۔ آپ ذرا گھوم پھر کر دیکھ لیجیے، آپ کو سائن بورڈ بے ضرورت انگریزی میں ملیں گے، کارڈ انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اشتہار کا بِرتقضا اردو میں چھپ جاتا ہے تو دستخط انگریزی میں کر کے تسکین حاصل کر لی جاتی ہے۔ یہ سب نقالی اور ذہنی مغالطہ ہے، فریبِ نفس ہے، فکری افلاس ہے، بربادی ہے اور بربادی ہی بربادی ہے۔

میں انگریزی زبان کا مخالف نہیں مگر ملکی زبان کا دشمن بھی تو نہیں۔ ہمیں تو ان سب معاملات میں اپنے ملک اور قوم اور جمہور کا پہلے خیال رکھنا چاہیے۔ اس ایک استثنا کے ساتھ، مغرب کی ساری ٹیکنالوجی اور علوم سے استفادہ کرنا بےحد ضروری ہے۔

یہاں آپ سوال کریں گے کہ مغربی کلچر سے استفادے کا معیار کیا ہے؟ یہ قصہ بھی بہت طویل ہے مگر میں بڑے غور کے بعد دو نتیجوں پر پہنچا ہوں۔ اول یہ کہ مغرب کے وہ طریقے جو اسلامی آداب و ارکانِ حیاداری، معاشرت اور اخلاق کے خلاف ہوں ان سے اجتناب لازم ہے۔ دوسرا یہ کہ جن طریقوں کے خلاف خود یورپ کے مفکرین صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ ان پر ہم لوگوں کو بھی غور کرنا چاہیے۔ اس وقت مغرب کے عام مفکر ادھر کی مادر پدر آزادی سے پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب امریکہ میں گھر نہیں رہا۔ لوگ نگھرے ہوتے جاتے ہیں اس کے علاوہ جنسی انارکی اس حد تک پھیلتی جا رہی ہے کہ لوگ بعض ملکوں میں جانوروں کی طرح سرِعام ہنی مون منانے سے بھی نہیں چوکتے۔ مغربی تہذیب میں اسراف اور فضول خرچی بھی ایک شرطِ لازم ہے اور تمام امور میں نفع پرستی (PRAGMATIC) ایک نام فلسفۂ حیات بن چکا ہے۔ مگر مغربی طرزِ حیات میں چمک کچھ ایسی ہے کہ یہاں کا آدمی جب سرسری طور سے اس پر نظر ڈالتا ہے کہ ہائے وہ لوگ کیسے خوش خوش جی رہے ہیں۔ مگر مذکورہ بالا ادیبوں کا بیان اور ہی کچھ ہے:

مجھے انکارِ وصلِ غیر پر کیوں کر نہ شک گزرے
زبان کچھ اور ہے پیرِ سخن کچھ اور کہتی ہے

فرڈی نینڈ، لونڈ برگ اور ریوس کو مغرب میں جنسی اشتہار بازی کی بھی شکایت ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مرض ہمارے ملک میں بھی پھیل رہا ہے اور اس کے بڑے مضحکہ خیز مظاہرے ہوتے ہیں۔ دانتوں کا برش، مرد بھی استعمال کرتے ہیں اور عورتیں بھی۔ مگر اشتہار پر صرف عورت۔ بلیڈ جہاں تک مجھے معلوم ہے مردوں کے استعمال کی چیز ہے، مگر اس کے فلیپ پر عورت۔ دنگل کے اشتہار پر عورت اور مٹھائی کے اشتہار پر تو عورت کو ہونا ہی چاہیے، کیونکہ اس کی باتیں مٹھائی کی طرح میٹھی ہوتی ہیں، مگر حد سے زیادہ SEX APPEAL یورپ کا وہ تحفہ ہے جس کی آج کل بڑی مانگ ہے، مگر

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے فرنٹ پر سب اچھا نہیں، کچھ گڑبڑ بھی ہے۔ یہ تو آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ ہمارے یہاں امریکن فلم کے زیرِ اثر ٹیڈی بوائے کلچر عام ہو رہا ہے۔ جسے عام زبانوں میں کھاتے پیتے، پڑھے لکھے نوجوانوں کی غنڈہ گردی کہا جاسکتا ہے۔ یہ سوغات بھی تو ادھر سے آئی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغربی کلچر ایک وسیع اور متنوع نظامِ حیات ہے جس کے اچھے پہلو بھی ہیں اور برے بھی۔ مگر مناسب تنقید نہ ہونے کے باعث ہمارے معاشرے میں برے لچھن تو فوراً جذب ہوتے جا رہے ہیں، مگر خوبیوں کی تقلید کے لیے ہمت اور فکری قوت کی ضرورت ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

میں کلچر کے معاملے میں وسیع النظری کا قائل ہوں، مگر یہ دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستانیت بھی کسی نہ کسی شکل میں ترقی پذیر ہو اور دنیا میں پاکستان کی انفرادیت تسلیم ہو۔ اس کی تعمیر بڑی مشکل چیز ہے۔ مگر مسلسل تنقید اور تعبیر کرنے اور مناہمت کے اصول متعین کرنے سے یہ مشکل یقیناً رفع ہو جائے گی۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہمارا ملک تماشا ہوں کا بڑ بن جائے گا اور لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے اور سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ خود کلچر کا لفظ بدنام ہو جائے گا۔ چنانچہ اب بھی کلچر کے لفظ سے جمہور کو نفرت سی ہونے لگی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلچر صرف ناچنے گانے، شراب پینے، جوا کھیلنے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں اعلیٰ کلچر دل کے صرف ایک گوشے میں آتی ہیں۔ کلچر تو بر تر زندگی کے سب پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اسی بے احتیاطی اور غلط مبحث کا خمیازہ مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کو بھگتنا پڑا تھا، جب شہر میں ایک کلچر شو تھا اور لوگ مرحوم خلیفہ صاحب سے فون پر اسی کے لیے ٹکٹ مانگتے تھے۔ اب مرحوم لاکھ سمجھاتے ہیں کہ صاحب میں اسلام پر کتابیں لکھتا اور لکھواتا ہوں، یہ ٹکٹ آپ کو روشن آرا بیگم سے ملیں گے۔ مگر لوگ ہیں کہ مرحوم کو تنگ کیے جا رہے ہیں۔ غرض کئی دن تک مرحوم کو لوگوں نے روشن آرا کا پارٹ ادا کرنے پر مجبور کیا۔

مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم ہر چیز کی اپنی حد نہ پہچانیں اور اس غلط مبحث پر قائم رہیں گے تو کلچر کا یوں حلیہ بگڑے گا کہ ملک ہولو لو بن جائے گا۔

بہرحال یہ یاد رہے کہ ہماری قومیت کی بنیاد معنوی طور پر اسلام ہے۔ لہٰذا اس کے ظاہری نشانات میں اسلامی ارکان و آداب کا لحاظ از بس ضروری ہے ورنہ جس قوم کا اپنا کلچر نہیں، اس کی قومیت بھی محض خیالی ہوتی ہے۔

پاکستانی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کے بنیادی نقوش ایک ہیں اور سب میں مشترک ہیں۔ البتہ خطّوں کے بعض ضمنی رنگ بھی ہیں جن سے وحدت کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ اس لیے تو قائد اعظم نے بہ بانگِ بلند فرمایا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی تہذیب، تناسبِ اقدار اور شعورِ حسن و جمال زندگی ایک ہے۔ تھوڑا تھوڑا فرق تو ایک گھرانے اور ایک خاندان میں بھی ہو سکتا ہے، میرے نزدیک خطّوں کے کسی مزعومہ الگ کلچر پر زور دینا اور اس کے معمولی تنوعات کو پھیلا کر الگ ثابت کرنا قائد اعظم کے تصورات کے منافی اور پاکستان کی مزید تقسیم در تقسیم کے مذموم ارادے کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ

قائداعظم اور نیا پاکستانی مینی فسٹو

پاکستان تو صرف مسلمانوں کے اجتماعی مطالبے سے وجود میں آیا، ان کی قومیت، کلچر، تہذیبی اقدار سب کچھ اسلام اور اسلامی تاریخ پر مبنی ہے۔ اسی طرح لسانی لحاظ سے پاکستان کی تحریک میں قومی زبان کے تحفظ کا مطالبہ تو سرفہرست رہا لیکن کسی علاقائی زبان کے تحفظ کا کوئی مطالبہ نہیں اٹھا۔ اگر مسلمان علاقائی زبانوں کے لیے لڑتے تو یہ اُن کی خصوصی لڑائی کیونکر ہوتی کیونکہ ہندو اور سکھ غیر مسلموں کو اس سے کوئی اختلاف نہ ہوتا بلکہ وہ اس کا خیر مقدم کرتے تو کہنا یہ ہے کہ قائداعظم کی تحریک پاکستان میں علاقوں اور صوبوں اور ان کی کسی مخصوص معاشرت کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا اور نہ یہ چیزیں مسلمانوں کی وحدت کا مظہر تھیں۔ ہندی مسلمانوں کی وحدت تو اس عقیدے پر مبنی تھی کہ ان کا مذہب ایک ہے۔

اس لحاظ سے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ قائداعظم نے یہ مسئلہ حل کس طرح کیا۔ قائداعظم کی جنگ مسلمانانِ ہند کی اجتماعی آرزوؤں کی جنگ تھی۔ وہ کسی علاقے یا خطے اور اس کے کسی داخلی کلچر یا زبان کے لیے نہیں لڑے بلکہ انہوں نے مسلمان قوم کی وحدت کے احساس کے راستے میں اس کے جزوی احساسات کو رکاوٹ خیال کیا۔

یہ الگ علاقائی کلچروں اور علاقائی زبانوں کی بات قائداعظم کی وفات کے بعد، ملک میں (خصوصاً مشرقی پاکستان میں) پیدا کی گئی اور یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی طرف سے پاکستان کی ذہنی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اٹھائی گئی تھی تاکہ مسلمان عقیدے سے زیادہ علاقے کی وفاداریاں اختیار کر کے پارہ پارہ ہو جائیں۔ ان میں اختلافات پیدا ہوں اور وہ اسلامی عقیدے کی وحدت سے ہٹ کر کئی علاقائی تہذیبوں میں بٹ جائیں، ان کے بارے میں ان کے دل میں الگ الگ جذبہ تفاخر پیدا ہو اور وہ اسلام کے بجائے علاقے کے متعلقات پر فخر کرنے لگیں، وہ ایک نہ رہیں کئی ہو جائیں۔

اسی علاقائی عصبیت کی وجہ سے مشرقی پاکستان کٹ گیا۔ اگر ہمارے ملک میں علاقے اور زبان کی عصبیت اسی طرح بڑھتی گئی تو وہ دن دور نہیں جب یہ عصبیت پہلے قومیتوں کا پھر الگ الگ قومیں ہونے کا دعویٰ کرائے گی ہے کیونکہ قائداعظم نے فرمایا کہ ہر پاکستانی سب سے پہلے خود کو مسلمان اور پاکستانی سمجھے۔ اس کے بعد کچھ اور ....

مگر اب معاملہ دگرگوں ہے۔

اس کا حل اب بھی یہی ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کا ہر ہر فرد سب سے پہلے خود کو مسلمان اور پاکستانی سمجھے باقی باتوں کو ثانوی درجہ دے۔ اس طرح پاکستانی قوم میں وحدت کا جذبہ زندہ رہے گا، ورنہ یہ کئی قوموں اور قومیتوں کا مجموعہ بن کر نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ کسی روز بھی ان قومیتوں میں سے ہر کوئی ایک یا ہر ایک حق خود اختیاری مانگنے لگے یا علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگے۔

اندرونی مفادات کا مسئلہ جدا ہے، اس کے لیے ایک منشور مفادات تیار ہو سکتا ہے جو سب کو مطمئن کر سکتا ہے۔ لیکن یہ مفادات افراد قوم کے ہوں گے نہ کہ الگ الگ قومیتوں کے، پہلے سب کو ایک قوم بننا چاہیے اس کے بعد ذیلی طور سے وہ جو کچھ بنیں بنیں ٹھیک ہیں۔ میں تہذیبی و معاشرتی اختلافات کی دلیل کا کبھی قائل نہیں ہوا۔ پاکستانی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کے بنیادی نقوش ایک ہیں اور سب میں مشترک ہیں، البتہ خطوں کے بعض ضمنی رنگ بھی ہیں جن سے وحدت کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ اسی لیے تو قائداعظم نے ببانگ بلند فرمایا تھا کہ مسلمانان ہند کی تہذیب، تناسب اقدار اور شعور حسن و جمال زندگی ایک ہے۔ تھوڑا تھوڑا فرق تو ایک گھرانے اور ایک خاندان میں بھی ہو سکتا ہے میرے نزدیک خطوں کے کسی مزعومہ الگ کلچر پر زور دینا اور اس کے معمولی تنوعات کو پھیلا کر الگ ثابت کرنا قائداعظم کے تصورات کے منافی اور پاکستان کی مزید تقسیم در تقسیم کے مذموم ارادے کا مظہر ہے۔

یہ امر واقع ہے کہ قائداعظم نے سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں امتیاز کیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بحث بالکل بے کار ہے کیونکہ قائداعظم کے خیالات اس موضوع پر بالکل واضح تھے۔ انہوں نے بلاشبہ اسلامی سوشلزم کی اصلاح ایک دو مرتبہ استعمال کی ہے، لیکن ان کا مقصد اس سے اسلامی

ان کا مقصد مسلمانوں کو اس معروف معاشی نظام کی طرف لے جانا تھا جس کا اصطلاحی نام سوشلزم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ صاف صاف سوشلزم کا لفظ استعمال کرتے اور اسلامی کا پیوند نہ لگاتے اور ظاہر ہے کہ قائداعظم کی نظر میں دو اسلام نہ تھے، ایک ہی اسلام تھا جس میں عدل و احسان کا عقیدہ شامل تھا اس لیے اسلام کے ساتھ کسی پیوند کی خاص ضرورت کیوں پڑتی۔

اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے کئی عام تقریروں میں معاشی انصاف و اسلامی اخوت و مساوات کا ذکر کیا ہے اس ذکر میں انہوں نے بالعموم سوشلزم کی اصلاح استعمال نہیں کی۔ صرف دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ انہوں نے اسلامی سوشلزم کی ترکیب استعمال کی۔ اس میں چند باتیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں اول تو یہ کہ اسلامی سوشلزم سے ان کی مراد مروجہ سوشلزم کا نظام نہ تھا بلکہ وہی اخوت و مساوات و عدل اسلامی ہی تھا جس کا انہوں نے بار بار ذکر کیا، دوسری بات یہ ہے کہ قائداعظم نے دو تین مرتبہ جو استعمال کیا بھی تو اس کا ایک پس منظر تھا۔

پس منظر یہ تھا کہ جب پاکستان کا مطالبہ زور پکڑنے لگا اور ایک دلیل یہ بھی دی جانے لگی کہ ہندو قوم بنیا اور سرمایہ دار ہے۔ لہٰذا خطرہ یہ ہے کہ وہ اپنے سرمایے کی قوت سے مسلمانوں کو محکوم بنا لے گی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے بیانات میں اس کے جواب میں مسلمانوں کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خائف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آزاد ہندوستان کی معاشی پالیسی سوشلزم پر مبنی ہوگی۔ پنڈت نہرو کی اس قسم کی کئی تحریروں کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔

قائداعظم نے جو اس وقت کانگریس اور پنڈت نہرو کی ہر دلیل کا تجزیہ کرتے اور جواب دیتے تھے، الزامی جواب کے طور پر اس لفظ کے استعمال کی ضرورت سمجھی جس کے ذریعے وہ کہنا چاہتے تھے کہ ہمیں نہرو صاحب کے سوشلزم کی ضرورت نہیں ہمارے پاس اپنا ایک سوشلزم یعنی نظام عدل و مساوات ہے جو نہرو کے سوشلزم سے بہتر ہے۔ تو مقصد مروجہ سوشلزم سے ہٹنا تھا نہ کہ اس کی تلقین جیسا کہ اب سمجھا جا رہا ہے۔

اگر قائداعظم کا مقصد اس کی تلقین ہوتا تو اس وقت کے دینی طبقے جن کی قائداعظم کو تائید حاصل تھی اس کا ضرور نوٹس لیتے لیکن چونکہ وہ قائداعظم کے مقصد کو جانتے تھے اس لیے کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

بہرحال قائداعظم کی تقریروں پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہو

نہ کہ مروجہ نظام سوشلزم پر۔

پھر بھی میں اس بحث کو بےکار کہتا ہوں اس لیے کہ اگر اسلامی کے پیوند کی ضرورت سمجھی گئی ہے تو لازماً اس سے مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں ایسا معاشی و معاشرتی نظام رائج ہونا چاہیے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے اور وہ اسلامی تصور عدل و احسان پر مبنی ہو۔

ہم میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کے نظریۂ معاش کے بارے میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق تعبیر کرے لیکن یہ طے ہے کہ اس بارے میں فتویٰ اسلام ہی سے پوچھا جائے گا نہ کہ مروجہ سوشلزم سے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مروجہ سوشلزم کے بعض METHOD سے ہم استفادہ کر لیں لیکن اصول بہرحال اسلام سے لیے جائیں گے نہ کہ مروجہ سوشلزم سے۔ پھر یہ بھی مدنظر رہے کہ اگر ہم سوشلزم کی مروجہ اصطلاح سے قطع نظر کر لیں اور سوشلزم کی عام غایت ہی کو مقصود بنا لیں تو اختلاف رفع ہو جاتا ہے۔ سوشلزم کی غرض اگر معاشی عدل ہے اور اس کا طریق کار جبری پلاننگ بھی ہو تو بھی جزوی طور سے اس میں اختلاف کی کم گنجائش رہ جاتی ہے کیونکہ پلاننگ میں بہرحال جبر کا پہلو آ ہی جاتا ہے اور مؤثر نتائج کی حد تک اسلام نے بھی ضابطہ بندی کو روا رکھا ہے۔

اگر اسلامی سوشلزم کے یہ معنی ہیں تو اختلاف کی صورت کم رہ جاتی ہے لیکن اگر سوشلزم سے مراد مارکس اور اینگلز اور لینن کے نظریات پر مبنی نظام عقائد و نظام معیشت ہے تو اسلامی سوشلزم کی ترکیب میں داخلی تضاد نظر آتا ہے۔ یہ خیال کہ خدا کا عقیدہ رکھ کر مروجہ سوشلزم کو نافذ کر دینے سے اسلامی سوشلزم بن جاتا ہے، اس لیے درست نہیں کہ اسلامی نظام معاش خدا کے عقیدے کے ساتھ ایک مستقل نظام افکار بھی رکھتا ہے جو کئی پہلوؤں سے مروجہ سوشلزم کی ضد ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس بے نتیجہ بحث کو ختم کر کے قائداعظم کے واضح ارشادات کو مشعل راہ بنانا چاہیے جن میں انہوں نے استحصال کی ہر شکل کی مخالفت کی اور فرمایا کہ نظام معاش بنیادی طور سے ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں استحصال کی گنجائش نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصول اسلام کے لینے پڑیں گے لیکن ان کا انطباق، موجودہ معاشی پیچیدگیوں پر کرنا پڑے گا اور اس طرح ایک نیا "پاکستانی مینی فیسٹو" تیار کرنا ہوگا جو اسلام کی روشنی میں اور پاکستان کے مخصوص حالات میں معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کا ضامن ہوگا۔

انتخابِ خطبات ڈاکٹر سید عبداللہ

بسلسلہ نفاذِ اردو

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے نفاذ کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

ممتاز دانشور، محقق اور مصنف اور انجمن ترقی اردو لاہور کے صدر ڈاکٹر سید عبداللہ نے صوبے میں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں ضلعی سطح پر جو کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں ان کا خیر مقدم کیا ہے اور گورنر پنجاب کے نام انجمن ترقی اردو اور اس سے متعلقہ ۸۰ دوسری تنظیموں کی جانب سے ایک برقیہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کا یہ اقدام انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ برقیہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے نفاذ کے لیے مزید اقدامات کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں انجمن کی جانب سے ہر ممکن تعاون کا یقین بھی دلایا گیا ہے۔

(اخبار اردو ستمبر ۱۹۸۱ء)

اردو، اب لازمی کر دیجیے

انجمن ترقی اردو کے ناظم اور نامور محقق و ماہر تعلیم ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک بار پھر بااختیار حلقوں کی طرف سے ہونے والی اُن سازشوں کا ذکر کیا ہے جو وہ قومی زبان اردو کو اس کے جائز حق سے محروم رکھنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر صدر ضیا الحق نے اپنی سرکاری ذمہ داریوں میں جس جرأت مندی کے ساتھ اردو کا استعمال کیا ہے ماضی کے کسی سربراہ مملکت سے اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اردو سے ان کی محبت اور وابستگی کی بنیاد پر جناب صدر سے یہ مطالبہ کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ اردو اور انگریزی میں "اختیاری" استعمال کی صورت حال ختم کر کے قومی زبان کو لازمی دفتری زبان کے طور پر نافذ کر دیں۔ ایک مقررہ تاریخ کے بعد ہر اس سرکاری دستاویز کی باضابطگی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے جو قومی زبان میں نہ ہو، مستثنیات میں سوائے وزارت خارجہ اور دیگر وزارتوں کے بیرونی معاملات اور تجارت سے متعلقہ شعبوں کے اور کسی محکمے کو رعایت نہ دی جائے، جب تک یہ فیصلہ کن اقدام نہ کیا جائے گا بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "انگریزی کو جاری رکھنے اور اردو کو کمزور کرنے کی کوششیں" تیز ہوتی رہیں گی۔

(روزنامہ جنگ کراچی، ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء)

اردو کو دفتری زبان بنانے میں تاخیر

مقتدرہ قومی زبان نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو دفتری و سرکاری زبان بنانے کا اعلان ۱۴ اگست کو لازماً کر دیا جائے۔ قومی زبان کی مرکزی مجلس کے اجلاس میں جو مقتدرہ کے قائم مقام صدر نشین میجر آفتاب حسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مقتدرہ کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے صدر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس مقصد کے لیے ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مقتدرہ نے اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بنانے کے لیے اپنی تجاویز مارچ ۱۹۸۱ء میں پیش کر دی تھیں اور ان تجاویز کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اسلام آباد میں کابینہ ڈویژن میں تمام صوبائی حکومتوں، ڈویژنوں اور وزارتوں کے نمائندوں نے منظور کر لیا تھا لیکن یہ سفارشات کابینہ ڈویژن کے فائلوں کی زینت بنی رہیں، اس تاخیر کی بنا پر اجلاس نے صدر مملکت سے اپیل کی ہے کہ وہ اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے کر دفاتر میں اردو کے نفاذ کا اعلان ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء کو کر دیں۔

مقتدرہ اردو کی ایک قرارداد کے ذریعہ یہ مطالبہ بہت معقول اور مناسب ہے۔ مقتدرہ کی جانب سے تجاویز پندرہ ماہ قبل پیش کی گئی تھیں لیکن

اس طویل عرصے میں بھی تجاویز کو کابینہ کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ تجاویز پہلے کابینہ کمیٹی کے سامنے پیش کی جائیں گی جس کا قیام مارچ ۱۹۸۰ء میں عمل میں آیا تھا۔ اردو کو دفتری زبان بنانے کے بارے میں یہ تاخیر و تعویق بڑی تکلیف دہ ہے۔ اردو کو دفتری زبان بنانے کی راہ میں جو مشکلات وہ تقریباً دور ہو چکی ہیں۔ اردو ٹائپ دستیاب ہے اصطلاحات کے بارے میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان سہولتوں کے بہم پہنچنے کے باوجود اردو کو دفتری زبان بنانے میں تاخیر کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مقتدرہ کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ صدر ضیاء ۱۴ اگست کو اردو کو مکمل طور پر دفتری اور سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیں۔ اردو کو اس کا حقیقی مقام دلانے میں اب تک جو تاخیر ہوئی ہے اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۴ جون ۱۹۸۲ء)

اردو کے نفاذ میں مایوسی

انجمن ترقی اردو کے جاری کردہ ایک بیان میں جس کے آخر میں ناظم عمل درآمد کمیٹی انجمن ترقی اردو، صدر انجمن ترقی اردو عمر گودھا اور ڈاکٹر عبداللہ ناظم انجمن ترقی اردو لاہور کے دستخط ہیں، کہا گیا ہے کہ پاکستان کے اقتدار پسند مفاد پرست طبقے کی ظالمانہ قید سے قومی زبان کی رہائی کے لیے ۱۴ اگست کو اجتماعی نمازیں ادا کی جائیں اور دعائیں کی جائیں کہ خدا وند تعالیٰ دورِ غلامی کی یادگار انگریزی کی بالادستی سے نجات دلائے۔ بیان میں جن باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ اردو کو سرکاری حیثیت اور تعلیم میں اثر و رسوخ ملنے کی جو کچھ توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ اب یکسر ختم ہو گئی ہیں۔ با اثر طبقے پاکستان کو انگریزی کا ایک جزیرہ یا کالونی یا قلعہ بنا دینا چاہتے ہیں جس کا مقصد اپنے طبقے کو ہمیشہ با اختیار و با اقتدار رکھنے کے سوا کچھ نہیں۔ ترقی کا ذریعہ صرف انگریزی کو بنایا جا رہا ہے، با اثر طبقوں کے تازہ ترین فیصلوں نے تو انگریزی کو دائمی طور پر قابض بنا کر دفتروں میں اردو کے چلنے کے تمام دروازے عملاً بند کر دیے ہیں۔ انجمن نے اس صورتِ حال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ اب ہر ہر گلی کوچے سے فوری نفاذ اردو کی آواز اٹھنی چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ آئینی اور غیر سیاسی انداز میں تحریک

محبت کے ذریعہ کرنا ہوگا۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۹ اگست ۱۹۸۲ء)

اردو اور علاقائی زبانیں

انجمن ترقی اردو پنجاب کے صدر اور مقتدرہ کی تشکیل کردہ مجلس برائے زبان دفتری کے داعی ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے کراچی میں مقتدرہ کے دفتر میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں اردو کے نفاذ کے لیے مختلف رکاوٹوں کو بہانا بنایا جا رہا ہے جن میں سے ایک علاقائی زبانوں کا مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس خدشے کو مسترد کر دیا کہ اردو علاقائی زبانوں کے لیے خطرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خدشے کی حیثیت محض ایک بہانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اردو زبان خود برصغیر کی مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ دوسری زبانوں کے ساتھ اس کا رشتہ محبت اور اخوت کا ہے۔ یہ علاقائی زبانوں سے گھلتی ملتی ہے تو علاقائی زبانیں اس کے چشمے سے فیضیاب ہوتی ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ جو لوگ علاقائی زبانوں اور اردو کے درمیان مغائرت کی بات کرتے ہیں وہ شر انگیز ہیں۔ امید ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے ماہرین مل کر فتنہ انگیزی کا مقابلہ کریں گے۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۰ اگست ۱۹۸۲ء)

صدر محمد ضیاء الحق اردو کے سرسید ہیں

انجمن ترقی اردو لاہور کے سربراہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں اردو کو آگے بڑھایا جائے اور ملک میں انگریزی ذریعہ تعلیم کو مسترد کر دیا جائے۔ وہ لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ محمد ایوب خان کی صدارت میں ہونے والے انجمن ترقی اردو کے اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ کرنے والوں کے ساتھ پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ دیتے وقت سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو کی سرپرستی کرنے پر صدر ضیاء الحق کی خدمات کی تعریف کی انہوں نے کہا کہ جہاں تک اردو کی ترقی کا تعلق ہے جنرل محمد ضیاء الحق اردو کے سرسید ہیں۔

نظیر صدیقی

تعارف و تبصرہ

مقاصد اقبال

ڈاکٹر سید عبداللہ

افکار اقبال کی تشریح و تفہیم پر اردو میں جو اہم یا اہم ترین کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "مقاصد اقبال" تازہ ترین کتاب ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کتاب کے علاوہ بھی اقبال پر بہت کچھ لکھا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے علم و فضل، مشرقی و مغربی علوم سے وسیع اور گہری واقفیت، مشرقی و مغربی ادب و فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی اور اپنے دینی اور ملی جذبات کے اعتبار سے اقبال جیسے اسلام پرست، قوم دوست اور متبحر فلسفی شاعر پر چند موزوں ترین لکھنے والوں میں سے ہیں اور انھوں نے اقبال پر اب تک جو کچھ لکھا ہے اس سے اقبال کی تفہیم میں گراں قدر مدد ملتی رہی ہے۔

اگر ڈاکٹر سید عبداللہ کو اقبال کے معتبر مفسروں میں شمار کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ افکارِ اقبال پر تنقید سے پہلے ان کی تشریح ضروری ہے اور شاید اقبال کی تشریح ان پر تنقید سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کے سرانجام میں زیادہ سے زیادہ کامیابی انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو نہ صرف اقبال کی شاعری ان کے تصوف اور ان کے فلسفے کی تشریح اعام فہم تشریح) پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ وہ ان تینوں کی تشریح، ان تینوں کے بنیادی محرکات اور مقاصد کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے زیر بحث کتاب میں افکارِ اقبال کی تشریح و توضیح اسی زاویے سے کی ہے اور اسی بنا پر انھوں نے اپنی کتاب کا نام "مقاصد اقبال" رکھا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک فکر اقبال کا مرکزی نکتہ "تحریک بازیافت" ہے، جس کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے ثبات وجود ملی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "اقبال کا سارا شعری کلام اور ان کی اکثر نثری تحریرات کو بازیافت کا لائحہ عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اقبال پر تنقیدی یا تحقیقی مضامین لکھنے والے عام طور پر اقبال کے مضامین اور بیانات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ وہ اقبال کے ایک انگریزی لیکچر

ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لیکچر جو ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا بازیافت کے لائحہ عمل کا ایک مجمل خاکہ ہے۔ اقبال نے اس لیکچر میں جو کچھ کہا ہے اُن کی شاعری اور دوسری تحریرات کو اس کی تفصیل کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ کی کتاب "مقاصد اقبال" سات ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب	فکر اقبال کا مرکزی نکتہ بازیافت
دوسرا باب	ملی وجود کے چند بڑے دشمن، نئے اور پرانے
تیسرا باب	خارجی عصری حملہ، مغربیت
چوتھا باب	داخلی فتنے
پانچواں باب	ضعف قوائے ملی کا علاج
چھٹا باب	فکر اقبال مسلمانوں کی علمی روایت کے تسلسل میں
ساتواں باب	اقبال اور سائنس

ان عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "مقاصد اقبال" اقبال پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے کس حد تک مختلف کتاب ہے۔ اس بات کا بہتر اندازہ ہر عنوان کے ذیلی عنوانات کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ ذیلی عنوانات میں سے بیشتر عنوانات ایسے ہیں جن پر پہلے کوئی توجہ نہیں کی گئی یا پھر اگر ان میں سے بعض پر کچھ لکھا بھی گیا تو اس سیاق و سباق میں نہیں لکھا گیا جس میں ڈاکٹر سید عبد اللہ نے لکھا ہے۔

مثلاً اقبال نے مغرب پر جو تنقید یا نکتہ چینی کی ہے اس کا ذکر اقبال سے متعلق اکثر مضامین یا کتابوں میں ہے۔ یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال نے مغرب پر نہایت سخت نکتہ چینیاں کی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنی کتاب میں مغرب کا ذکر جن عنوانات کے تحت کیا ہے وہ اقبال سے متعلق دوسری کتابوں میں شاید ہی ملیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبد اللہ کے عنوانات یہ ہیں:۔

کلام اقبال میں فرنگ کی حیثیت

غلبۂ افرنگ کے تین محاذ (فرنگی سیاست، فرنگی معاشرت، اور فرنگی فکر و حکمت)

پہلا محاذ۔ فرنگی سیاست (صلیبی انتقامی ردعمل کی تنظیم)

دوسرا محاذ۔ فرنگی معاشرت

اقوام مشرق کا ثقافتی زوال

تیسرا محاذ فکر و حکمت

اسی طرح ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اس کتاب میں "اقبال اور سائنس" کے عنوان سے جن موضوعات پر بحث کی ہے ان میں سے کئی موضوعات ایسے ہیں جنہیں اقبال پر لکھنے والے ہاتھ نہیں لگاتے مثلاً:

۱۔ فطرت و کائنات کی نوعیت کیا ہے؟ مادے کی بحث، توانائی کیا ہے؟

۲۔ مادے کی فنا پذیری

۳۔ مادے کا نظام میکانکی جبری ہے یا آزادی

۴۔ علت و معلول، زمان و مکان، نظریۂ اضافیت، مطلقیت کا خاتمہ

۵۔ نور، حرارت، آواز، مقناطیسیت

۶۔ ہائزن برگ کا اصول عدم تعین

۷۔ کوانٹم میکانیات

۸۔ مذہب اور طبیعیات

۹۔ فلسفہ اور طبیعیات

۱۰۔ طبیعیات اور نفسیات

۱۱۔ کیا حال کوئی شے نہیں۔

۱۲۔ کائنات کا کوئی کنارہ نہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اس کتاب کے چھٹے باب میں بھی جس کا عنوان ہے "فکر اقبال مسلمانوں کی علمی روایت کے تسلسل میں"، بعض ایسے موضوعات سے بحث کی ہے جن پر پہلے یا تو کچھ نہیں لکھا یا نہ لکھنے کے برابر لکھا گیا۔ مثلاً اس باب میں ڈاکٹر عبد اللہ نے "ابن عربی اور اقبال" "اقبال، دانتے اور ابن عربی" "اقبال اور فخر رازی" "فکر اقبال کے مراحلِ ارتقا گلشن راز جدید، خطبات تک"، "اقبال الراسخون کے نقش قدم پر" جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۲۵۲ صفحے کی یہ کتاب اقبال پر اس سے زیادہ ضخیم کتابوں سے زیادہ معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے۔ اقبال شناسی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے یہ کتاب بالکل مبتدیوں کے لیے نہیں لکھی بلکہ ایسے لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اقبال اور اطراف اقبال سے بڑی حد تک واقف ہیں تاہم اس کتاب میں بہت سے ایسے فلسفیانہ اور سائنسی نظریے اور فقرے ایسے ملتے ہیں جنہیں خاصے پڑھے لوگ بھی سمجھ نہیں سکتے۔ اگر حاشیے پر ایسے نظریوں اور فقروں کی وضاحت کر دی جاتی جیسا کہ بعض نظریوں اور فقروں کی وضاحت کی بھی گئی ہے تو قارئین کو مزید سہولت بہم ہو جاتی۔

بہر حال مجموعی طور پر "مقاصد اقبال" اقبالیات کے سرمائے میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ ہے۔

مطبوعاتِ مقتدرہ

دفتری امور

نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	غیر مجلد	مجلد
۱	مختصر اصطلاحات دفتری		۵ روپے	–
۲	دفتری ترکیبات، محاورات اور فقرات کی لغت	مجیب الرحمان مفتی	۶۰ ″	۱۵۰ روپے
۳	دفتری مراسلت (انگریزی ۔ اردو)	ڈاکٹر صدیق شبلی	۲۰ ″	۴۰ ″
۴	سرکاری خط و کتابت (جلد اوّل) (زیر طبع)	″ ″ ″		
۵	″ ″ ″ جلد دوم	ربیعہ فخری / محمد اظہار الحق		
۶	″ ″ ″ جلد سوم	مسعود احمد چیمہ		
۷	″ ″ ″ جلد چہارم	پروفیسر نیاز عرفان		
۸	محکموں اور اداروں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ″	۳۰ ″
۹	وفاقی و صوبائی عہدوں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ″	۳۰ ″
۱۰	جدید اردو ٹائپ کاری	سید عرفان علی یوسف	۴ ″	–
۱۱	اردو ٹائپ کاری (جلد اوّل)	نور احمد نشاد	۱۵ ″	–
۱۲	″ ″ جلد دوم	″ ″	۲۵ ″	–
۱۳	اصطلاحات حسابداری و محاسبی (سستا ایڈیشن ۔ ۵ روپے)	مسعود احمد چیمہ	۱۰ ″	۲۵ روپے
۱۴	اصطلاحات بیمہ کاری	ڈاکٹر سہیل بخاری / حفیظ ملک	۲۰ ″	۳۵ ″
۱۵	مختصر قانونی اصطلاحات	مولوی فیروز الدین ڈسکوی	۱۲ ″	۲۰ ″
۱۶	اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری	ایچ ایچ ولسن	۲۵۰ ″	۲۵۰ ″
۱۷	فرہنگ اصطلاحات و محاورات قانون	مجلس اصطلاحات	۵۵ ″	۶۰ ″
۱۸	بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۹۵	۱۱۰ ″

مقتدرہ کے دفتری امور

نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	غیر مجلد	مجلد
۱۹	قرارداد اور قواعد و ضوابط			
۲۰	مقتدرہ قومی زبان (تعارف)			
۲۱	سفارشات مقتدرہ			
۲۲	سالانہ رپورٹیں (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۵)			
۲۳	ہیئت حاکمہ کی رودادیں (زیر طبع)			

لغات و کتب حوالہ

نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	غیر مجلد	مجلد
۲۴	سائنسی و تکنیکی اصطلاحات	مجلس استناد	۲۵ روپے	۱۵[illegible]
۲۵	اصطلاحات فنیات	ذیلی مجلس	۴۰ ″	[illegible]۰
۲۶	اصطلاحات مساحت	سید عارف رضوی	۳۰ ″	[illegible]۰
۲۷	اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد	۱۰ ″	[illegible]۰
۲۸	تعلیمی اصطلاحات	ذیلی مجلس	۴۵ ″	۱۰[illegible]
۲۹	اصطلاحات ریاضی	ذیلی مجلس ۔ کراچی	۲۷ ″	۱۰[illegible]
۳۰	اصطلاحات ڈراما	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۱۵ ″	[illegible]۰
۳۱	کشاف اصطلاحات کیمیا	ڈاکٹر ایم اے عظیم	–	۲۰[illegible]
۳۲	کشاف اصطلاحات سائنسی و تکنیکی (زیر طبع)	محمد اسلام نشتر		
۳۳	کشاف اصطلاحات موسمیات ″	سرفراز شاہد		
۳۴	کشاف قانونی اصطلاحات ″	رشید احمد صدیقی		
۳۵	کشاف اصطلاحات سیاسیات (جلد اوّل)	پروفیسر محمد صدیق قریشی	۶۵ ″	۱۰[illegible]
۳۶	″ ″ ″ جلد دوم		۷۰ ″	۱۰[illegible]
۳۷	کشاف اصطلاحات کتب خانہ	محمود الحسن، زمرد محمود	۶۵ ″	۱۰[illegible]
۳۸	کشاف تنقیدی اصطلاحات	حفیظ صدیقی / آفتاب جہاں	۱۱۰ ″	[illegible]۰
۳۹	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد اوّل)	جابر علی سید	۳۶ ″	۱۴[illegible]
۴۰	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)	وارث سرہندی	۷۵ ″	[illegible]۵
۴۱	″ ″ ″ ″ ″ (جلد سوم) زیر طبع ″ ″			
۴۲	″ ″ ″ ″ ″ (جلد چہارم)	اثر لکھنوی		
۴۳	″ ″ ″ ″ ″ (جلد پنجم) ″ ″ ″			
۴۴	اسپرانتو اردو لغت	سعید احمد فارانی	۷۵ ″	[illegible]
۴۵	جامع الامثال	وارث سرہندی	–	[illegible]۵۰

مطبوعاتِ مقتدرہ

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۴۶	خزینۃ الامثال	شاہ حسین حقیقت	۹۰ روپے	-

کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۴۷	اُردو اصطلاحات سازی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۳۰	۵۰
۴۸	فارسی اصطلاحات سازی	سید عارف رضوی	۳۶	۴۸
۴۹	عربی اصطلاحات سازی	محمد طاہر صوری	۴۵	۵۵
۵۰	کتابیات قواعد اُردو	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۳۰	۴۰
۵۱	کتابیات اُردو املا اور دوسرے مسائل	〃 〃 〃	۱۸	۳۶
۵۲	کتابیات لغات اُردو	〃 〃 〃 〃	۴۰	۵۵
۵۳	اُردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	-	۶۰
۵۴	کتابیات قانون	عطش درانی، محمود الحسن	۴۰	۷۵
۵۵	کتابیات درسی کتب سائنس (زیر طبع)	امین الدین		
۵۶	کتابیات تعلیم	نسرین زہرا	۳۵	۵۴
۵۷	کتابیات تراجم (جلد اوّل)	مرزا حامد بیگ	۷۵	۹۰
۵۸	〃 〃 (جلد دوم) (زیر طبع)	〃 〃		
۵۹	پاکستان کے اُردو اخبارات و رسائل (جلد اول)	محمود الحسن	۴۰	۵۶
۶۰	〃 〃 〃 (جلد دوم)	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۴۲	۵۸
۶۱	〃 〃 〃 (۱۹۴۷ سے قبل) (زیر طبع)	〃 〃 〃		
۶۲	کتابیات اردو مطبوعات ۱۹۸۳ء	خالد اقبال یاسر	۲۵	۳۵
۶۳	〃 〃 〃 ۱۹۸۴ء	〃 〃 〃	۳۶	۴۸
۶۴	تکملہ کتابیات اردو مطبوعات ۱۹۸۴ء (زیر طبع)	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری		
۶۵	کتابیات اردو مطبوعات ۱۹۸۵ء (زیر طبع)	خالد اقبال یاسر		

کتب حوالہ

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۶۶	نمونۂ منثورات	احسن مارہروی	۸۵	-
۶۷	بلوچستان میں اردو	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۹۰	۱۱۰
۶۸	اندلس کا تاریخی جغرافیہ	مولوی عنایت اللہ	۸۰	-
۶۹	جغرافیہ خلافت مشرقی	جی۔ لی۔ اسٹرینج	۱۵۰	-
۷۰	قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات (جلد اول)	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	۵۰	۶۵
۷۱	〃 〃 〃 〃 (جلد دوم)	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر نسرین اختر	۶۰	۷۵
۷۲	قلب (زیر طبع)	ڈاکٹر سید اسلم		
۷۳	افکار و اذکار	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	-	۳۰
۷۴	قائداعظم کے شب و روز	خورشید احمد خاں	۳۵	-

موادِ خواندگی

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۷۵	املا رموز اوقاف کے مسائل (روداد سیمینار)	اعجاز راہی	۴۵	۵۵
۷۶	اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل (روداد سیمینار)	〃	۴۵	۵۴
۷۷	اردو املا و رموز اوقاف (منتخب مقالات)	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	۶۰	۷۵
۷۸	سفارشات املا و رموز اوقاف	ڈاکٹر اعجاز راہی		
۷۹	تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات	〃 〃 〃	۳۵	۴۵
۸۰	قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ	〃 〃 〃	۲۴	۳۶
۸۱	اردو میں اصولِ تحقیق (جلد اوّل)	ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش	۶۰	۷۵
۸۲	〃 〃 〃 (جلد دوم) (زیر طبع)	〃 〃		
۸۳	ترجمہ۔ روایت اور فن (منتخب مقالات)	نثار احمد قریشی	۴۰	۵۵
۸۴	انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار	پروفیسر جیلانی کامران	۶۵	۸۵
۸۵	پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے	پروفیسر انوار صابر	۶۵	۸۰
۸۶	مشرقی ممالک میں قومی زبان کے ادارے	عطش درانی، طاہر صوری، بشیر احمد، ڈاکٹر محمد ریاض	۱۸ روپے	۳۸ روپے
۸۷	بھارت میں قومی زبان کا نفاذ (انگریزی)	مختار زمن	۳۰	۵۰
۸۸	〃 〃 〃 (اُردو)	〃 〃	۴۵	۶۰
۸۹	اُردو اور فارسی میں نقل حرفی	فرخندہ لودھی	۲۶	۳۶
۹۰	اُردو رسم الخط	پروفیسر سید محمد سلیم	۱۵	-

سروے

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۹۱	تعلیم، ملازمت اور زبان	ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، سید متین الرحمان		
۹۲	اسلام آباد اور راولپنڈی میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے ادارے	عبدالغفور اعوان		
۹۳	〃 〃 (انگریزی) ترجمہ (زیر طبع)			
۹۴	اردو انگریزی ٹائپ رائٹروں کا تقابلی جائزہ (زیر طبع)	نور احمد شاد		
۹۵	اسلام آباد کی خواتین اور قومی زبان	فریدہ حفیظ		
۹۶	قومی زبان اور خواتین میں عادات مطالعہ (زیر طبع)	انور قدوس سیمیں		
۹۷	قومی زبان اخبارات کے آئینے میں	بشیر محمود اختر، عطا الحق قاسمی	۴۵	۵۵

درسی کتب

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۹۸	غیر ملکی طلبہ کے لیے اردو کی نصابی کتاب (زیر طبع)	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا		
۹۹	نصابی کتاب کی کلید (زیر طبع)	〃 〃 〃		
۱۰۰	عربی سیکھیے (جلد اوّل)	عبدالرحمان طاہر سورتی	۲۵	۷۵
۱۰۱	〃 〃 (جلد دوم)			
۱۰۲	اسپرانتو خود سیکھیے (زیر طبع)	سعید فارانی		
۱۰۳	سطحی کیمیا	ڈاکٹر ایم اے عظیم	۱۵	-
۱۰۴	نباتاتی معیات (زیر طبع)	عبدالرحیم خاں		
۱۰۵	فرہنگ اصطلاحات برقیات	طارق محمود	۴۰	۵۰
۱۰۶	فرہنگ اسماء العلوم	〃	۱۹	.
۱۰۷	فرہنگ اصطلاحات کتب خانہ	زین صدیقی	۳۰	۳۸
۱۰۸	ہمارے کتب خانے (زیر طبع)	ڈاکٹر ملک حسن اختر		
۱۰۹	لائبریری سائنس اور اصول تحقیق	سید جمیل احمد رضوی	۶۰	۷۰
۱۱۰	تعارف اخلاقیات	سید محمود احمد سعید	۶۰	۸۵
۱۱۱	اصول نفسیات (زیر طبع)	پروفیسر عبدالحی علوی		
۱۱۲	فکر اسلامی کی تعبیر نو (زیر طبع)	پروفیسر شریف کنجاہی		
۱۱۳	پاکستان میں علم سیاسیات (زیر طبع)	ڈاکٹر عبدالحمید		
۱۱۴	انگریزی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۸۰	۱۵۰
۱۱۵	اُردو داستان	ڈاکٹر سہیل بخاری		
۱۱۶	اردو سٹیج ڈراما	ڈاکٹر اے بی اشرف	۴۴	۵۰
۱۱۷	تاریخ لسانیات پاکستان (زیر طبع)	ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی		
۱۱۸	تذکرۂ استعارات (زیر طبع)	بریگیڈیر (ریٹائرڈ) گلزار احمد		

براہ راست طلب فرمائیں

مقتدرہ قومی زبان شاہ اعوان پلازہ۔ ۱۹۔ ڈی (غربی) بلیو ایریا ایف ۶/۱ اسلام آباد

کراچی: مکان نمبر ۳۰۔ اے۔ بلاک نمبر ۱۳ اے گلشن اقبال نزد حسن اسکوائر۔ کراچی

لاہور: ۹۰۔ ریواز گارڈن۔ لاہور

پشاور: بالمقابل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، جمرود روڈ۔ پشاور

کوئٹہ: بی ۱۳ ۴۲-۲، تولارام روڈ، بالمقابل جی پی او۔ کوئٹہ

سکھر: بنگلہ نمبر ۴، ملٹری روڈ۔ سکھر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے کے اہم مضامین

○ رومن رسم الخط

○ جامعۂ عثمانیہ، چند یادیں

○ قومی زبان اردو کا فروغ

○ اُردو اور پشتو کے مشترک الفاظ

○ انگریزی الفاظ جو طبقۂ اُمراء کی بول چال میں مستعمل ہیں

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

فروری ۱۹۸۷ء

جلد: ۴
شمارہ: ۲

ماہنامہ
اخبار اُردو
اسلام آباد

فہرست

رومن رسم الخط
(تاریخی پس منظر)
______ سید مصطفیٰ اعلیٰ بریلوی - ۱

جامعۂ عثمانیہ، چند یادیں
______ پروفیسر حبیب الرحمٰن - ۴

قومی زبان اردو کا فروغ
______ ڈاکٹر وقار احمد رضوی ۸

اُردو اور پشتو کے مشترک الفاظ
______ ڈاکٹر گوہر نوشاہی -

انگریزی الفاظ جو طبقۂ اُمراء کی
بول چال میں مستعمل ہیں
______ اسرار اشفاق - ۱۸

اخبارِ اُردو کے نام
______ طاہر لشاری - کوئٹہ
______ غلام حسین ذوالفقار (ترکی) ۲۵

تعارف و تبصرہ
______ ڈاکٹر وحید قریشی - ۲۷

معروضات

ہماری طرح بہت سے اہل وطن ان تبدیلیوں پر اظہار اطمینان کرتے لگے ہیں جو بتدریج قومی زبان کو اپنانے کے سلسلے میں رونما ہو رہی ہیں. بیشتر شعبہ ہائے زندگی میں سرکاری اعانت کے بغیر یہ کام ہو رہا. تاہم بعض پہلو ایسے ہیں جن کی طرف سرکاری توجہ کی ضرورت ہے۔ اگرچہ گاڑیوں پر اب اردو کی عبارت دکھائی دینے لگی ہے لیکن یہ عمل اس وقت تک قانونی قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک ٹریفک کے قواعد ضوابط میں ترمیم نہیں ہوتی اس سے پہلے بھی اردو نمبر پلیٹوں کی طرف عوامی پیش رفت ہوئی تھی، لیکن پھر کچھ مدت کے بعد چالان ہونے لگے کیوں کہ اصل قانون میں تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ امید ہے ارباب اختیار اس سمت میں مثبت قدم اٹھائیں گے۔

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد . مقتدرہ قومی زبان . شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۶ - ڈی (غربی) بلیو ایریا، الف ۱/۶، اسلام آباد — طابع: برق سنز پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

قیمت: ۱ روپیہ سالانہ: ۱۰ روپے

سید مصطفےٰ علی بریلوی

رومن رسم الخط

تاریخی پس منظر

جب ہندوستان پر یورپین اقوام کے تاجروں کی یلغار ہوئی اور معاشی لوٹ کھسوٹ عام ہوگئی تو اپنے ان نامناسب افعال پر پردہ ڈالنے کے واسطے ان لوگوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کردی۔ رومن رسم الخط رائج کرنے کی ایسے ہی گروہوں کی طرف سے ابتدائی کوششیں سامنے آئیں۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ مقامی زبانوں میں رومن رسم الخط کے ذریعے انجیل مقدس سے لوگوں کو متعارف کرایا جائے۔ شروع شروع میں تجارتی فرموں کے ملازمین مقامی اشخاص اور علاقوں کے نام رومن حروف کے ذریعے یاد کرتے تھے۔ پھر تبلیغ یادداشت کے ذریعے تقریباً ایک صدی میں جب کافی لوگ عیسائی ہوگئے تو اس اقلیت کو فارسی زبان کے اثرات سے بچانے کے واسطے رومن حروف کا سہارا لیا جانے لگا۔ اسی طرح تامل، مرہٹی، بنگالی زبانیں رومن رسم الخط کے ذریعے لکھی جانے لگیں۔ جوں جوں غیر ملکی تسلط میں اضافہ اور استحکام آتا گیا رومن رسم الخط کے استعمال میں اضافہ ہوتا گیا یہ پالیسی ۱۷۹۹ء یعنی شہادت ٹیپو سلطان تک قائم رہی۔ جب کسی قسم کی سیاسی مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا تو انگریزوں نے محض رومن رسم الخط کے اجرا پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بالواسطہ انگریزی زبان کی اشاعت پر توجہ مبذول کردی۔

یہ کام اخلاقی اقدار کو پامال کر کے کیا گیا لیکن تقریباً پونے دو سو سالہ حکومتی سطح کی کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں انگریزی دان طبقہ کبھی بھی دو فیصد سے زائد نہ ہوسکا۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو زبان کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لیے بعض ذمہ دار اہل دانش کس بنا پر اکثر و بیشتر اصرار کرتے رہے ہیں؟ یہ مختصر گروہ اردو زبان و رسم الخط پر جو اعتراضات اٹھاتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ اردو کا موجودہ رسم الخط سیکھنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اس کے مقابلے میں رومن رسم الخط جلدی سیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ اعراب کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور چونکہ اعراب عام طور پر لکھنے میں نہیں آتے اس لیے قاری کی الجھن برابر قائم رہتی ہے اس کے برعکس رومن رسم الخط میں اعراب حروف کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔

۳۔ جدید علوم و فنون جن زبانوں میں موجود ہیں وہ تمام رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اس لیے اگر شروع ہی سے اس رسم الخط کو رواج دیا جائے تو تحصیل علوم میں بہت آسانی ہوسکتی ہے۔

۴۔ رومن رسم الخط کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اسی طرح دوسری زبانیں ہمارے لیے غیر مانوس نہیں رہیں گی۔

۵۔ ہمارے رسم الخط میں حروف شمسی و قمری (ا۔ ل والے حروف اور واؤ معدولہ) تو بہر حال ایسی چیزیں ہیں جو مبتدی تو کیا اوسط علمیت والے کے لیے بھی الجھن کا سبب بنے رہتے ہیں۔

۶۔ مشابہ الصوت حروف جیسے ذ، ز، ظ اور ض (نیز نسخ و نستعلیق) میں لکھی جانے والی زبانوں کے دوسرے مخصوص تلفظ والے حروف کا صحیح تلفظ تو کسی طرح بھی صحیح ادا نہیں ہوسکتا اگر رسم الخط بدل دیا جائے تو اس سارے بکھیڑے سے نجات مل جائے گی۔[1]

اردو زبان کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے فوائد اور اردو زبان کے استعمال و تلفظ کی دشواریاں بھی اردو کے ایک مستند ادیب کے قلم سے آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ اب اردو کے رومن رسم الخط کے خلاف دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ معروف ادیب و دانشور جناب شان الحق حقی لکھتے ہیں:

"اردو کا رسم الخط کیا ہو؟ مجھے یہ سوال ایسا عجیب معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پوچھے تمہاری شکل کیا ہونی چاہیے۔

"زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ ہر رسم الخط ایک خاص قسم کی صوتیات سے وابستہ ہے اور اسے کسی دوسری زبان یعنی دوسرے صوتی اقدار کے لیے استعمال کیا جاتے تو اس زبان کے لہجہ اور تلفظ کا رسم الخط سے متاثر ہونا لازم ہے۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے کی صورت میں ہمارے بعض حروف علت کا دوہرا ہو

[1] مقالہ "رسم الخط کا مسئلہ" از ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی۔ "العلم" سہ ماہی بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء صفحات ۲۵ تا ۳۵

جاتا یقینی ہو جائے گا مثلاً آپ لاکھ لفظ غیرت کو غیرت لکھنا چاہیں لیکن رومن میں یہ غائرت کی طرف مائل ہو کر رہے گا۔[2]

مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "اہل یورپ اپنی آسانی کی غرض سے ہمیشہ اور ہر جگہ یہ تجویز پیش کیا کرتے ہیں کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان ان کا رومن خط (لاطینی) قبول کر لے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور اردو زبان کے لیے بھی ان کی فیاضیانہ درخواست رہی ہے۔ ابھی حال میں شام میں یہ تحریک اٹھی تھی کہ جو آج کل فرانس کے پنجہ میں گرفتار ہے" پروفیسر سید انیس سلوم کا قول ہے کہ "اگر ہم عربی طرز کتابت و تحریر کو بدل دیں تو اس کے بعد ہمارا یہ فرض ہو گا کہ ابتدا سے آج تک عربی زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں سب کو آگ لگا دیں کیونکہ موجودہ نسل میں اگرچہ ایسے لوگ موجود ہیں جو عربی زبان کو موجودہ حروف اور موجودہ طرز تحریر میں پڑھ سکتے ہیں لیکن اس تبدیلی کے بعد جب ایسی نسل پیدا ہو جائے گی جو عربی زبان کو لاطینی حروف میں پڑھنا سیکھے گی تو عربی کی مطبوعات اور قدیم قلمی کتابیں بالکل بیکار ہو جائیں گی اور ان کا مطالعہ صرف وہی لوگ کر سکیں گے جو قدیم مردہ زبانوں مثلاً لاطینی یونانی وغیرہ کے سیکھنے میں اپنی عمر فنا کر دیں گے۔"

سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی زبان کا طریقہ تلفظ اور طرز املا اس کے معانی کے ساتھ اس زبان کے بولنے والوں کی قومیت کو محفوظ رکھنا ہے تو کیا ہم چند مستشرقین کو خوش کرنے کے لیے اپنی اس سرمایۂ محفوظ کو چھوڑ دیں گے۔ کیا یورپین لوگ بھی اس امر پر راضی ہوں گے کہ ان کی زبان کا طرز بدل دیا جائے؟"[3]

ڈاکٹر عبدالوحید قریشی رقمطراز ہیں :۔

"جس طرح زبان ایک پورے معاشرے، پوری ملت اور پوری تہذیب کی امانت دار ہے اسی طرح اس زبان کا پیرایۂ تحریر بھی ماضی کی روایات، قوم کے احساسات اور تہذیبی سرمائے کا حصہ ہے۔ جس طرح قوم اپنی ملی روایات اور تہذیبی سرگرمیوں کی اساس کو خیرباد کہہ کر خلا میں زندہ نہیں رہ سکتی، اسی طرح رسم الخط بھی قومی بقا اور تہذیبی ورثے سے کنارہ کش ہو کر کسی خلائی سفر کا پیش خیمہ نہیں بن سکتا۔

رومن رسم الخط کو اختیار کر کے ہمیں اپنی روایات اور فکری رجحانات سب کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی قربانی ہے جس کے لیے قوم تیار نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ معاشرہ اپنے ماضی کو کھو کر زندہ رہنے کے امکانات سے بھی محروم ہو جانے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ قوم کے احساسات کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔[4]

"لسانی اعتبار سے بھی رومن رسم الخط ہماری مشکلات کا حل نہیں ہے۔"

ہمیں عام طور پر ترکی کی مثال سمجھائی جاتی ہے۔ ترکی کی بات دوسری ہے۔ وہاں بعض جغرافیائی اسباب تھے یہاں ان کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے ہمارا رشتہ عرب و عجم سے ہے۔ رومن رسم الخط ہمیں اس رشتے سے بھی الگ کر دے گا۔"

رومن رسم الخط ہماری غلامانہ تقلید کا آئینہ دار تو ہے ہماری مشکلات کا حل ہرگز نہیں۔[4]

اس سلسلے میں سید الطاف علی بریلوی مدیر سہ ماہی "العلم" کی رائے بھی قابل توجہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"زبان اور لٹریچر کی ہم آہنگی افراد کے درمیان بالواسطہ رابطہ قائم کرنے کا یقینی ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں نظریاتی اختلافات کے باوجود یگانگت کا احساس باقی رہتا ہے"

"اردو زبان اور اس کا رسم الخط ایک مقدس ثقافتی ورثہ ہے جس کا کسی دوسری زبان یا رسم الخط سے سودا نہیں کیا جا سکتا"[5]

مولانا صلاح الدین تحریر فرماتے ہیں :۔[6]

"جب انگریز ہم پر پوری طرح غالب آ گئے تو ان کی رعونت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور وہ سیم و زر کے سوا اس دیس کی کسی چیز کو چھونے تک کے روادار نہ رہے لیکن اپنے سیاسی اور فوجی تقاضوں کے پیش نظر انہیں ایک وفادار دیسی فوج کی ضرورت تھی جن کے ان پڑھ سپاہیوں اور چھوٹے افسروں سے وہ زبانی اور کسی قدر تحریری رابطہ بھی رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت ان کی دیسی فوج کا عنصر غالب گورکھوں، سکھوں، مرہٹوں اور مدراسیوں پر مشتمل تھا جن میں سے اکثر خود اپنی اپنی زبانوں میں لکھنا پڑھنا نہیں

---

[1] مقالہ "رسم الخط کا مسئلہ" از شان الحق حقی۔ "العلم" سہ ماہی بابت اکتوبر تا دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء صفحات ۳۶ تا ۴۷

[2] معارف اعظم گڈھ جلد نمبر ۴ صفحہ ۲۸۸

[3-4] قومی زبان کراچی یکم مارچ تا یکم جون ۱۹۶۱ء

[5] ذیلی اداریہ "العلم" سہ ماہی بعنوان "قومی یکجہتی کے لیے عربی رسم الخط کی اہمیت" جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء

[6] قومی زبان کراچی مقالہ "ہماری قومی زبان اور اس کا رسم الخط" مارچ تا جون ۱۹۶۱ء

جانتے تھے اور انگریز کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ان سب کے رسم الخط سیکھے ملک کی عام زبان اردو تھی لیکن انگریز فوجی افسر کو اردو پڑھنا لکھنا بھی گوارا نہیں تھا وہ اپنے بیروں۔ خان ساماؤں سے گٹ پٹ کر لیتا تھا لیکن صوبے داروں اور حوالداروں سے کبھی کبھی تحریری ربط کی بھی ضرورت پیش آتی تھی اور انہیں ہدایات جاری ہوتی تھیں یا انہیں جو کتابچے پڑھائے جاتے تھے وہ ان پر بھی اپنی نظر رکھنا چاہتا تھا پس اس کی آسانی کے لیے یہ رسم الخط ایجاد کیا گیا اور چھوٹے درجے کے لشکریوں کے لیے اس میں مہارت پیدا کرنا لازمی قرار پایا۔ انگریز کی دیسی فوج کے سوا کسی کو اس رسم الخط کی ضرورت تھی اور نہ قدر اس لیے یہ ہم سے دور رہا اور الحمد للہ ہم بھی اس سے دور دور رہے۔

میاں بشیر احمد لکھتے ہیں :۔

"ہماری زبان کا عربی رسم الخط سے ایک نفسیاتی اور تہذیبی و روحانی تعلق ہے جسے کھو کر وہ نیم جان ہو جائے گی اور یوں خطرہ ہے کہ ہماری قوم اپنا نصب العین کھو بیٹھے گی ہمیں یہ خطرہ کسی قیمت پر بھی مول نہ لینا چاہیے"[1]

ڈاکٹر سید عبد اللہ کا کہنا ہے :۔

اردو کے لیے رومن حروف اختیار کر لینے کا سوال انگریزوں کے زمانے میں سیاسی نوعیت رکھتا تھا مگر اب اس کی حیثیت ایک نفسیاتی بیماری کی ہے۔ یہ وہی بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر ہمارا درزی ٹیلر ماسٹر کہلوانے پر فخر کرتا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق کی رائے ہے کہ :۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر رومن خط اختیار کریں گے تو اس سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم دوسری زبانیں جو اس رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں آسانی سے سیکھ لیں گے۔ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اول تو رومن حروف میں جو زبانیں لکھی جاتی ہیں ان کے الفاظ اور حروف کے تلفظ میں بہت بڑا فرق ہے۔ دوسرے صرف حروف پہچاننے سے زبان نہیں آجاتی، اگر یہ ہوتا تو آج ہمارے ملک میں کثرت سے ہفت زبان ہوتے۔ ہفت زبان ہونا تو درکنار انگریزی زبان بھی جس کی تحصیل میں ہماری عمر عزیز کا حصہ صرف ہوتا ہے صحیح طرز سے بولنی اور لکھنی پڑھنی نہیں آتی۔ اس قسم کے دلائل دیکھنے میں معقول معلوم ہوتے ہیں لیکن عمل کے وقت ناکارہ اور فریب آمیز ثابت ہوتے ہیں[2]

مشفق خواجہ کا یہ خیال ہے :۔

کہ کسی زبان سے اس کے رسم الخط کا تعلق بڑا گہرا ہوتا ہے یہ تعلق جسم اور لباس کا سا نہیں ہے کہ جو موقع محل کی مناسبت سے بدلتا رہے اور نہ ہی کوئی رسم الخط علامات کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے کہ جس کا زبان کی اصل روح سے کوئی تعلق ہو۔ زبان کی ایک مخصوص صورت ہیئت اور مزاج کی تعمیر میں رسم الخط نمایاں حصہ لیتا ہے اور اس کی تمام خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اگر ہم نے اردو کے مروجہ رسم الخط کو ترک کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے بالکل علیحدہ ہو جائیں گے۔ علم و ادب کا وہ سرمایہ جو موجودہ رسم الخط میں ہمارے لیے بیکار ہو جائے گا اور اگر یہ سوچا جائے کہ ہم اس تمام علمی و ادبی سرمایہ کو رومن رسم الخط میں منتقل کر لیں گے تو اس کی حقیقت خوش فہمی سے زیادہ نہیں[3]

---

[1] قومی زبان کراچی مقالہ "ہمارا رسم الخط" از میاں بشیر احمد یکم مارچ تا یکم جون ۱۹۶۱ء

[2] اداریہ قومی زبان کراچی یکم مارچ تا یکم جون ۱۹۶۱ء

[3] مقالہ رسم الخط کا مسئلہ از مولوی عبد الحق۔ قومی زبان کراچی ۱۹۶۱ء

مکاتیب ڈاکٹر سید عبد اللہ

ڈاکٹر سید عبد اللہ مرحوم کے مکاتیب کی ترتیب و تدوین پروفیسر ظفر حجازی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان اصحاب سے اپیل کی ہے جن کے پاس سید مرحوم کے مکاتیب موجود ہیں وہ ان کے عکسی نقول انہیں بھیج دیں۔ مکاتیب مختصر حواشی اور مکتوب الیہ کے تعارف کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ خطوط پروفیسر ظفر حجازی کو گورنمنٹ ڈگری کالج سمندری ضلع فیصل آباد (پنجاب) کے پتے پر بھیج سکتے ہیں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن

جامعہ عثمانیہ چند یادیں

علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں میرے ایک ساتھی تھے ابن حسن۔ جو ہیر ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے جلسوں میں اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان ملاقاتوں نے آہستہ آہستہ دوستی کی شکل اختیار کی جو بڑھتے بڑھتے دو تین سال کے اندر بہت گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی یہاں تک کہ جب ہم ایم اے ایل ایل بی کی جماعتوں میں پڑھ رہے تھے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ زندگی بھی ایک ہی جگہ گزاریں گے اور ملازمت بھی ایک ساتھ کریں گے۔

اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور اخباروں میں اکثر اس کا چرچا رہتا تھا، مخالفت میں کم اور موافقت میں زیادہ۔ سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی، انگریزی حکومت سے نفرت کا جذبہ عام تھا اور قومی رہنما اور ماہرانِ تعلیم نظام حیدرآباد اور ان کی حکومت کے اس جرأت مندانہ اقدام کو وقتاً فوقتاً سراہا کرتے تھے۔ اس کے برعکس انگریز حاکموں کو یہ تحریک ناپسند تھی اور جب کبھی موقع ملتا وہ یونیورسٹی کے خلاف حیدرآبادی عوام کو اکسانے سے کبھی دریغ نہ کرتے۔

شاید اسی ماحول کا اثر تھا کہ میں اور ابن حسن دونوں نے پہلے ہی ایم۔اے پاس کرکے عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کرلی گئے۔ ابن حسن کا مضمون تھا تاریخ اور میرا معاشیات۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر میں حیدرآباد لوٹا اور ابن حسن اپنے وطن مارہرہ (یو۔ پی) گئے اور چند روز بعد حیدرآباد آکر میرے ساتھ رہنے لگے۔

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس وقت یونیورسٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ ہم دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنی خواہشات کا اظہار کیا اور نتیجہ نکلنے کے چند روز بعد (غالباً اپریل میں) ابن حسن کا اور اکتوبر میں میرا تقرر مددگار پروفیسری پر ہوگیا۔ تاریخ کے صدر شعبہ ہارون خاں صاحب شیروانی اور معاشیات کے صدر شعبہ الیاس برنی صاحب تھے۔

ہم دونوں بہت خوش تھے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ ہمیں حصولِ ملازمت میں دشواری نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں اس موقع پر ڈاکٹر عبدالستار کی سنجیدگی، شرافت، دیانتداری اور بے تعصبی کا دل سے اعتراف نہ کروں۔ بے تعصبی کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس دور میں "ملکی وغیر ملکی" کا مسئلہ بڑی شدت اختیار کرگیا تھا۔ غرض مند افراد جو عثمانیہ یونیورسٹی تحریک کو دل ہی دل میں ناپسند کرتے اور کھل کر مخالفت کی ہمت نہیں رکھتے تھے، وہ طرح طرح سے یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بڑا الزام یونیورسٹی پر یہ تھا کہ وہ غیر ملکیوں (یعنی شمالی ہند والوں) کا اکھاڑا ہے۔ چنانچہ اسی کو بنیاد بنا کر بعض غرض مند اور ذی اثر اصحاب نے صدیقی صاحب کے خلاف طوفانی پروپیگنڈہ چلایا۔ از روئے معاہدہ تین سال کے لیے موصوف کا تقرر ہوا تھا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو بانیٔ جامعہ عثمانیہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم مرحوم نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی توسیع منظور کی۔ سر اکبر حیدری، سر راس مسعود اور نواب حیدر یار جنگ نے (جو اس زمانے میں یونیورسٹی کے کرتا دھرتا تھے) بہتیرا اصرار کیا لیکن صدیقی صاحب اپنے ارادے پر اٹل رہے اور معاہدے کی میعاد ختم ہوتے ہی حیدرآباد سے چلے گئے۔ میں اور ابن حسن ابھی اپنی جگہوں پر مستقل نہیں ہوئے تھے اس لیے کہ دو دو سال کی امتحانی مدت ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن صدیقی صاحب کی شرافت دیکھیے کہ انہوں نے ہماری درخواست اور علم و اطلاع کے بغیر بالا بالا ہمارے استقلال کی منظوری حاصل کرلی تاکہ آنے والا نیا دور ہمارے استقلال میں کسی قسم کی دشواری کا باعث نہ بنے۔ ایک مدت تک الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر کی خدمت پر فائز رہنے کے بعد ہندوستانی اکادمی الہ آباد کے صدر کی حیثیت سے علمی اور ... کاموں میں مصروف گوشہ نشینی کی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں بہت خوش تھے کیونکہ کسی جنگ یا دولہ کی خوشامد یا کسی بڑے آدمی کی سفارش حاصل کیے بغیر ہی ہم کو حیدرآباد میں ملازمت مل گئی تھی اور ملازمت بھی اس زمانے کے معیار کا لحاظ کرتے ہوئے خاصی معقول تھی۔ مددگار پروفیسر کو اس وقت ساڑھے تین سو تا چھ سو کا گریڈ دیا جاتا تھا۔ اس

کے علاوہ ہم اپنے اس خیال میں بھی مست تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی نوکری کر کے ہم گویا ایک طرح سے اردو کی بھی خدمت کرتے جا رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ سب باتیں ہمارے حسبِ منشا ہوگئی تھیں لیکن ایک خیال دل ہی دل میں پریشان کر رہا تھا کہ یا اللہ ہماری ساری تعلیم تو انگریزی میڈیم سے ہوئی ہے اور انگریزی ہم پر اتنی مسلط ہے کہ ہم مختلف امور اور بالخصوص علمی مسائل پر سوچتے بھی انگریزی میں ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا کہ ہم پہلے ہی دن سے اردو میں لیکچر دے سکیں۔ ابن حسن کا معاملہ نسبتاً "آسان تھا کیونکہ ان کا مضمون تاریخ تھا لیکن معاشیات، اس کا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔

خدمت کا جائزہ لینے سے پہلے جب کبھی یہ خیال آتا تھا تو مارے ہیبت کے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اندر ہی اندر دل بیٹھا جا رہا ہے۔ گو دکھانے کے لیے چہرے پر سکون و طمانیت قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ اس دہشت نے مجھ پر یہاں تک غلبہ پایا کہ میں دار الترجمہ میں مترجم معاشیات کی جگہ پر تبادلہ کرا لینے کا خیال پکانے لگا اور ڈرتے ڈرتے ابنِ حسن پر اس کا اظہار کیا۔ ابن حسن نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور تین چار مہینوں کا اپنا تجربہ پیش کرتے ہوئے میری ڈھارس بندھائی۔ نیز مجھے مشورہ دیا کہ الیاس برنی صاحب سے (جو علی گڑھ میں میرے استاد رہ چکے تھے) مشورہ کروں۔ برنی صاحب سے مشورے کی نوبت نہ آئی البتہ ان کی کتاب "علم المعیشت" اس نازک مرحلے پر میرے بہت کام آئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ برنی صاحب کو اصولِ معاشیات پر کتنا عبور حاصل تھا اور اس کٹھن مضمون کے مشکل سے مشکل مسائل کو انہوں نے کس خوبی اور سلاست سے اردو کا جامہ پہنایا۔

علی گڑھ میں کوئی دو تین مہینے میں نے برنی صاحب کے لیکچروں میں حاضری دی تھی۔ وہ لیکچر سب انگریزی میں تھے مگر بعض سینیئر ساتھیوں سے معلوم ہوا تھا کہ برنی صاحب طلبہ کی فرمائش پر معاشی مسائل کبھی کبھی اردو میں بھی سمجھاتے تھے مگر مجھے ایسے کسی لیکچر میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ میرے بی۔ اے میں داخل ہونے کے تین چار ماہ بعد ہی اور آخر ۱۹۱۷ء میں برنی صاحب حیدر آباد آکر دار الترجمہ سے منسلک ہوگئے تھے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں علم معاشیات کا باقاعدہ آغاز انگلستان میں ہوا۔ آدم اسمتھ کو اس علم کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نام کی مناسبت سے اسے معاشیات کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اگر برنی صاحب کو "بابائے معاشیات" کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

غرض خدا خدا کر کے وہ دن آیا کہ جامعۂ عثمانیہ میں معاشیات کی مددگار پروفیسری پر میری تقرری کے احکام صادر ہوئے اور یکم آذر ۱۳۳۲ ف م (اکتوبر ۱۹۲۲ء) کو میں نے اپنی خدمت کا جائزہ (چارج) حاصل کیا۔ برنی صاحب مجھ پر مہربان تھے۔ پہلے دن وہ خود مجھے کلاس میں لے گئے۔ طلبہ سے میرا تعارف کرایا اور چند رسمی جملے کہہ کر کلاس کو میرے اور مجھے کلاس کے حوالہ کیا اور خود واپس ہوگئے۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے نبض کی حرکت تیز ہو رہی تھی، دل دھک دھک کر رہا تھا اور زبان پر آیۃ الکرسی کا ورد جاری تھا۔ قسمت دیکھیے کہ پہلے ہی مرحلے پر جو کلاس ملی وہ اس وقت کالج کی سب سے اونچی کلاس تھی یعنی فورتھ ایئر۔

برنی صاحب کی تعارفی تقریر کے دوران میں میں نے کلاس پر جو نظر دوڑائی تو یہ محسوس ہوا کہ ایک خاصی بڑی تعداد ایسے لڑکوں کی ہے جو عمر میں میرے برابر ہی نہیں بلکہ مجھ سے زیادہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ قریب ہی ایک ایسے صاحب بھی دکھائی پڑے جو برسوں پہلے مفید الانام مڈل اسکول میں میرے ہم جماعت تھے اور انقلاباتِ زمانہ کی بدولت علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چکر کاٹتے ہوئے اب عثمانیہ یونیورسٹی کے فورتھ ایئر کی کلاس میں براجمان تھے۔ مثل مشہور ہے کہ لوگ خون لگا کر شہیدوں میں ملتے ہیں۔ یہ حضرت سیاست کی الٹ پھیر کی بدولت طالب علموں میں شامل ہوگئے تھے اور اس وقت شاید میری گھبراہٹ میں کچھ اور اضافہ کرنے کے لیے پہلی ہی صف میں تشریف فرما تھے۔ یہ بزرگ ماشاء اللہ اب بھی ہم میں موجود ہیں۔ سیاست اور خدمتِ خلق ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کئی سال سے راجیہ سبھا کے رکن ہیں اور موقع بہ موقع اس کی کرسئ صدارت کو بھی رونق بخشتے ہیں اور بجا طور پر پدما بھوشن کے خطاب سے سرفراز ہیں۔

یہ تھا میری بے کسی کا عالم جب میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں معاشیات پر لیکچر دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ لیکن چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد گھبراہٹ میں تیزی سے کمی ہونے لگی اور خود اعتمادی کا احساس بڑھنے لگا اور جب گھنٹہ ختم ہونے پر کلاس سے اٹھنے لگا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک مدت سے یہ کام کرتا رہا ہوں۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد جب اس واقعے پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ کسی بات کے سمجھنے سمجھانے کے لیے جو سہولت اپنی زبان سے ملتی ہے وہ کسی دوسری زبان کے ذریعہ میسر نہیں ہو سکتی۔

درس و تدریس کو ہمیشہ یک رخی راستے کی شکل نہیں دینی چاہیے۔ اس طرح

کے استاد یک ٹک بولتا چلا جائے اور طلبہ دم سادھے ٹکٹکی باندھے سنتے چلے جائیں ۔ اس سے کلاس میں ایک طرح کی مصنوعی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ استاد نے جو لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دی اس کا کچھ حصہ طلبہ کے بھی پلے پڑا کہ نہیں اور اگر پڑا تو کتنا ؟ یہ پتہ صرف اس صورت میں چل سکتا ہے جب آپ کلاس روم لیکچر اور پبلک پلیٹ فارم والی تقریر کا فرق ملحوظ رکھیں اور طلبہ کو کلاس میں پوچھنے پاچھنے کی نہ صرف اجازت دیں بلکہ اس کی ہمت افزائی کریں ۔ کلاس میں سوال کرنے کی ہمت وہی طالب علم کرے گا جو پہلے سے اس مضمون پر کچھ نہ کچھ پڑھ کر آیا ہو اس طرح طلبہ کو کلاس میں لیکچر سننے سے پہلے گھر پر مطالعہ کرنے کی عادت پڑے گی اور اسی مناسبت سے وہ استاد کے ارشادات زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھیں گے ۔

میں نے اپنی ان یادوں کا آغاز عزیز ساتھی ابن حسن کے ذکر سے کیا تھا چاہتا ہوں کہ اسے ختم بھی انہی کے ذکر سے کروں ۔

میری اور ابن حسن کی دوستی اور ہم دونوں کا ہمہ وقت ساتھ رہنا عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے اساتذہ اور طلبہ میں کبھی کبھی موضوع گفتگو بن جاتا تھا اور اس کی بدولت گاہے گاہے کوئی لطیفہ بھی ظہور پذیر ہوجاتا تھا ۔ دو لطیفے آپ بھی سن لیجیے :

محلہ توپ کے سانچے میں ، سٹیٹ بینک آف حیدر آباد کی بڑی عمارت کے عین پیچھے آپ کو ایک بنگلہ اب بھی نظر آئے گا جسے اس زمانے میں لیاقت منزل کہتے تھے ۔ لیاقت منزل میں پرنسپل کا آفس ، سٹاف روم ، دو تین لیکچر ہال اور اساتذہ کے لیے ایک ٹینس کورٹ تھا ۔ ایک مرتبہ میں اپنی کلاس کے وقت کا انتظار کرتے ہوئے سٹاف روم میں اکیلا بیٹھا تھا کہ اردو کے نامور ادیب پروفیسر وحید الدین سلیم داخل ہوئے ۔ علیک سلیک کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا ارے میاں تم نے ابھی تک ہمیں یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو ۔ کیا تمہارا بھی وہی وطن ہے جو ابن حسن کا ہے ؟ میں نے کہا " نہیں مولوی صاحب میرا وطن تو حیدر آباد ہے ۔"

" ایں تمہارا وطن حیدر آباد " میں نے کہا جی ہاں " اس پر مولوی صاحب کو نہ معلوم کیوں ذرا غصہ آ گیا کہنے لگے " لونڈے ہو کر بڈھے آدمی سے مذاق کرتے ہو ؟" میں نے پھر عرض کیا " نہیں مولوی صاحب میں مذاق نہیں کر رہا ہوں واقعی میں حیدرآبادی ہوں ۔" مولوی صاحب نے چیختے ہوئے کہا " تم جھوٹ کہتے ہو اردو بولتے ہو تو شمالی ہندوالوں کی سی ، اٹھتے بیٹھتے ہو ابن حسن کے ساتھ اور مجھ سے کہتے ہو حیدر آبادی ہوں " خیریت ہوئی کہ اسی لمحے خلیفہ عبدالحکیم اسٹاف روم میں داخل ہوئے ، وہ مجھ سے واقف ہو چکے تھے ، انہوں نے میری تصدیق کی تب مولوی صاحب " عجیب بات ہے " کہتے ہوئے خاموش ہو گئے ۔ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ پر بڑی شفقت کا اظہار فرماتے تھے ۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے ۔

دوسرا لطیفہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں اور ابن حسن اسی اسٹاف روم میں چند اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ مشہور عالم اور یونیورسٹی میں فلسفے کے مددگار مولوی عبدالباری ندوی اپنی کلاس برخاست کر کے حاضری کا رجسٹر ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئے ، ہم دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا " حضرات ہمارے ان نوجوان ساتھیوں کی دوستی اب طلبہ میں بھی رنگ دکھانے لگی ہے ۔ رات میں گھر پر طلبہ کے جوابی بیاض جانچ رہا تھا ۔ ایک سوال یہ پوچھا گیا تھا کہ ASSOCIATION OF IDEAS کا کیا مطلب ہے ؟ مثالیں دے کر سمجھاؤ ۔ ایک صاحبزادے نے جواب میں لکھا کہ اگر ایک چیز کو دیکھو اور اس کے ساتھ ہی دوسری چیز کا خیال آ جائے تو اسے ASSOCIATION OF IDEAS کہتے ہیں مثلاً ابن حسن صاحب کو دیکھو تو حبیب الرحمٰن صاحب نظر میں آجاتے ہیں اور حبیب الرحمٰن صاحب کو دیکھو تو ابن حسن صاحب نگاہ میں گھومنے لگتے ہیں ۔ اس پر اسٹاف روم میں ایک زوردار قہقہہ پڑا ۔ آٹھ سال یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد میں اور ابن حسن مزید تعلیم کے لیے ۱۹۲۹ء میں انگلستان گئے ۔ مجھے لندن اسکول آف اکنامکس میں اور ابن حسن کو اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخلہ ملا ۔ یہ دونوں ادارے لندن یونیورسٹی سے متعلق ہیں ۔ دو سال بعد ابن حسن تو فوراً حیدر آباد لوٹ آئے اور میں مزید ایک سال تک آکسفورڈ یونیورسٹی کے اگریکلچر اکنامکس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے کے لیے رک گیا ۔

تاریخ ہند کے ایک عالم اور محقق کی حیثیت سے اس کم عمری میں جو مرتبہ ابن حسن نے حاصل کر لیا تھا اس کا کچھ اندازہ مشہور مستشرق سر ڈینی سن راس کے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ابن حسن کی کتاب " دولت مغلیہ کی ہیئت ترکیبی " کے دیباچے میں لکھے ہیں :

> اس کتاب کی تالیف میں انہوں نے گہری تحقیق اور محنت شاقہ سے کام لیا ہے ۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ کوئی ماخذ ہندوستانی یا انگریزی ، ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا اور جہاں تک مغلوں کی مرکزی حکومت کا تعلق ہے اس کی تحقیق وسیع پیمانے پر کی گئی ہے کہ اس سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی ۔ آئندہ زمانے میں یہ کتاب " آئین اکبری " کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے گی اور مغلوں

کہ تاریخ کے تمام محقق اس کو حرزِ جاں بنائیں گے۔

اب یہ کہانی ختم ہونے والی ہے اور یہ مقدر ہو چکا ہے کہ اس کا اختتام ایسے پر ہو۔

انگلستان جانے سے بہت پہلے ہی ہم دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور دونوں خاندان پاس پاس کرائے کے گھروں میں رہنے لگے تھے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد بھی یہی صورت قائم رہی لیکن ابھی بمشکل چار سال گزرنے پائے تھے کہ ابن حسن پر یکایک لوکیمیا کا حملہ ہوا، عثمانیہ ہاسپیٹل میں ڈاکٹر ہارڈیکر کے زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت عثمانیہ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے اور یونیورسٹی کلب میں روزانہ ہمارے ساتھ ٹینس کھیلتے تھے۔ ابن حسن کے علاج میں انہوں نے رات دن ایک کر دیے لیکن آخری گھڑی آگئی تھی۔ دس روز بعد دواخانے ہی میں روح پرواز کر گئی۔ لاش میرے گھر لائی گئی۔ وہیں تجہیز و تکفین ہوئی اور ۱۱ مارچ ۱۹۴۵ء کو مجھے اپنے بیس برس کے ساتھی، اس گوہرِ نایاب، کو یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کرنا پڑا۔ رہے نام اللہ کا!

(بشکریہ سب رس، کراچی
دسمبر ۱۹۸۶ء)

قوم کی ذہانت
اور
صلاحیتوں
کے
قطرے
انگریزی زبان کے سمندر میں
گر کر
معدوم ہو رہے ہیں

جمیل جالبی
پاکستانی کلچر : صہ ۱۹۱

ڈاکٹر اشتیاق حسین کی برسی

اسلام آباد (نمائندہ خصوصی) مقتدرہ قومی زبان نے ممتاز سکالر ماہر تعلیم اور مقتدرہ کے پہلے صدر نشین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی برسی کے موقع پر ۲۱ جنوری ۱۹۸۷ء کی شام چار بجے ہوٹل شالیمار راولپنڈی میں ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا ہے جس میں کراچی سے ڈاکٹر جمیل جالبی، ہلال احمد زبیری، لاہور سے ڈاکٹر انور سدید اور اسلام آباد سے ڈاکٹر یوسف عباسی اور پروفیسر سعید الدین ڈار مقالات پڑھیں گے

روزنامہ مشرق لاہور ۹-۱-۸۷ء

اردو داں اساتذہ مقرر کئے جائیں!

ضلع بدین کے اکثر اردو میڈیم اسکولوں میں درس و تدریس کا کام غیر زبان داں اساتذہ سے لیا جا رہا ہے۔ بدین اردو پرائمری اسکول میں اس وقت دس اساتذہ کی جگہ صرف دو اساتذہ اردو داں ہیں۔ حکومت سندھ سے پر زور اپیل ہے کہ وہ فوری طور پر ماتحت محکموں کو ہدایات کا اجرا کرے۔ اردو داں اساتذہ نہ ہونے کی وجہ سے اسکولوں میں دن بدن حاضری گھٹ رہی ہے اور والدین کافی حد تک پریشان ہیں۔ (منور جمیل اختر، بدین)

روزنامہ نوائے وقت کراچی ۱-۱-۸۷ء

نسیم آہیر نے اردو لغت بورڈ کے اجلاس کی صدارت کی۔

کراچی ۱۷ جنوری (اسٹاف رپورٹر) وفاقی وزیر تعلیم ملک نسیم احمد آہیر نے کہا ہے کہ حکومت اردو کی ترقی و ترویج اور خاص طور پر اسے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں روشناس کرانے کے ہر ممکن اقدامات کرے گی۔ وہ آج یہاں اردو ڈکشنری بورڈ کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ اردو پرنٹنگ کا کام دوسرے اداروں سے لے کر بورڈ میں ہی تیار کیا جائے گا۔ وزیر تعلیم کو بتایا گیا کہ اردو لغت کی تیاری کا کام جاری ہے اب تک سات جلدیں تیار کی جا چکی ہیں۔ مکمل لغت ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہوگی

روزنامہ حریت کراچی ۱۸-۱-۸۷ء

مقتدرہ قومی زبان کا سیمینار

اسلام آباد ۲۱ جنوری (پ پ ا) مقتدرہ قومی زبان اخبارات اور اردو، ملکی ترقی کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار منعقد کر رہا ہے اس سلسلے میں ملک بھر میں اردو اخبارات کے ممتاز صحافیوں اور ایڈیٹروں کی ایک مشاورتی کمیٹی میں یہ طے کیا گیا ہے کہ اس سیمینار میں ملک بھر کے صحافیوں کو مدعو کیا جائے۔

روزنامہ حریت کراچی ۲۲-۱-۸۷ء

ڈاکٹر وقار احمد رضوی

قومی زبان اردو کا فروغ

جہاں تک پاکستان کی سالمیت کا تعلق ہے اس کے لیے پاکستان میں نفاذِ اسلام اور قومی زبان اردو کو فروغ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ انہی دو چیزوں کے ذریعے پاکستان میں اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی کی فضا ہموار ہو سکتی ہے۔ قومی زبان اردو پاکستان کی قومی زندگی کی عمارت کا ستون ہے جس کی تعمیر و ترقی کے لیے بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز غیر زبان میں پڑھائی جاتی ہے تو پوری طرح دل میں نہیں اترتی۔ صرف انگریزی پڑھ کر، انگریزی بول کر ہم صاحب زبان نہیں بن سکتے۔ جو انگریزی میں بولتے لکھتے ہیں، انگریز اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہم اپنی قومی زبان بولیں گے تو کوئی ہمارا مذاق نہیں اڑا سکتا۔

جاپان اور چین نے اپنی قومی زبان ہی کے ذریعے دنیا میں ترقی کی۔ اسی لیے ہمیں بھی قومی زبان کو اپنانا اور سمجھنا چاہیے اور اس احساس کمتری کو دور کرنا چاہیے جو ہمارے اندر قومی زبان و ثقافت کے بارے میں ہے سب سے پہلی چیز جو قومی زبان کے حق میں جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قومی زبان (اردو) وسیلۂ اتحاد و ترقی ہے۔ پاکستان میں یہی وہ واحد زبان ہے جو آزاد کشمیر اور چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ملک و ملت کی تعمیر میں قومی زبان اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ قوم میں خود اعتمادی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی اپنی قومی زبان ہو اور اسی کے بل بوتے پر وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام سب اپنی قومی زبان کے ذریعے ہی مستحکم ہو سکی ہیں۔ اس لیے پاکستان میں ملک اور قوم کا استحکام قومی زبان (اردو) کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یگانگت پیدا کرنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ قومی زبان کی ترویج ہو تاکہ پاکستانی عوام کے فکر و ذہن میں یکسانیت پیدا ہو۔ ایک دوسرے سے محبت کا جذبہ ابھرے۔ ہم چونکہ اپنی زبان کو حقیر سمجھتے ہیں اسی لیے ہم اپنی ہر چیز کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارا احساس کمتری ہے۔ بھارت کو اپنی زبان ہندی اور ہندی ثقافت اس قدر عزیز ہے کہ وہ اغیار کے ساتھ شرکت کی زندگی کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ ہمیں بھی اپنی قومی زبان اور قومی ثقافت اسی حد تک عزیز ہونا چاہیے۔ بھارت والے ہندی بول کر شرمسار نہیں ہوتے تو ہم اردو بول کر کیوں نادم ہوتے ہیں۔ یہ بات سوچنے کی ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو وہ کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ علمی اور صنعتی ترقی کا خواب اس وقت پورا ہو سکتا ہے جب ہم اجنبی زبان (انگریزی) کا جوا اپنے سر سے اتاریں۔ بھارت میں ہندی نے بھی اسی طرح ترقی کی ہے۔ آزادی کے بعد سے ہندی اب ایک توانا لٹریچر ہے اب اس میں طبیعی علوم، معاشیات، سیاسیات، میڈیکل، انجینئرنگ اور سائنس ٹیکنالوجی میں تمام کتابیں ہندی میں دستیاب ہیں، انہوں نے تمام علوم کو ہندی میں منتقل کر لیا ہے۔ بیشتر درسگاہوں میں ایم اے تک تعلیم ہندی میں دی جاتی ہے کیا ہماری قومی زبان اس دوڑ میں ہندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی؟ یقیناً کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان میں سوچیں اور اپنی زبان میں لکھیں۔ یورپ جب تک لاطینی اور یونانی زبانوں کے سہارے جیتا رہا اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ انگلستان نے اصل ترقی اس وقت کی جب اس نے لاطینی اور یونانی زبانوں کا جوا اپنی گردن سے اتارا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو ہر اس عمل کی مخالفت کرتا ہے جو نفاذ اسلام اور قومی زبان کے فروغ کے لیے ہو اور جو اسلامی اقدار اور دینی تعلیمات پر مبنی ہو۔ کیونکہ ان اقدار و تعلیمات اور قومی زبان اردو کے فروغ سے اس طبقے کا زوال یقینی ہے۔ مغربیت کا غلط تصور اور تجدد پسندی اس طبقے کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اگر ہمیں زندگی کو ایک خوبصورت شکل میں ڈھالنا ہے تو اس کے لیے ادبی اور اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ قومی زبان سے رشتہ جوڑنا ہوگا۔ اس کے ذریعے ہمارے خیالات میں صفائی پیدا ہوگی اور دل کی بات سانچے میں ڈھل کر آئے گی۔ اسی کے ذریعے ہم اپنے دور و نزدیک ساتھیوں کے ساتھ بات چیت اور میل جول رکھ سکیں گے۔

بغیر قومی زبان کے ہماری حالت ایسی ہوگی جیسے ایک بہت بڑے ساگر میں پھیلے ہوئے جزیرے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اپنی قومی زبان سے محبت ایک فطری اور شریفانہ جذبہ ہے قومی زبان ایک ایسی لازوال دولت ہے جو ملک کی مختلف زبانوں کے بیچ مفاہمت کا پل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی زبان (اردو) پاکستان کی مشترک زبان، ملک کی وحدت کو ظاہر کرنے اور مضبوط بنانے کا واحد ذریعہ ہے۔ وہ فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں اس طرح رچی بسی ہوئی ہے جس طرح جسم میں روح اور شمع میں روشنی قومی زبان نہ صرف ملک و قوم کے دلوں کی دھڑکن اور ان کی ترجمان ہے بلکہ ان تمام صوبائی زبانوں کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتی ہے جو ملک میں بولی جاتی ہیں وہ سب زبانیں ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ قومی زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا، اس کے لفظوں کا جغرافیہ نہیں ہوتا۔ وہ عوام کی زبان ہوتی ہے عوام سے اپنا رشتہ نہیں توڑتی۔ پاکستان کے لیے یہ مسئلہ صرف زبان کا نہیں بلکہ ملک کی وحدت اور قوم کی زندگی اور موت کا ہے دلوں کو ملانے کے لیے ایک ملی جلی صاف اور شستہ زبان کی ضرورت ہے اور قومی زبان میل جول اور محبت کی زبان ہے۔ یہ مسئلہ ملک کے دوسرے مسائل سے اہم ہے۔ اگر ہم نے اپنے خیالات اور جذبات میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا نہیں کی اگر ہم اپنے ملک کے رہنے والوں میں پیار اور محبت اور میل جول نہیں بڑھا سکے تو یہ تاریخ کا بدنما باب ہوگا۔ ہمیں اپنے دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہیے تاکہ اُن میں حیات بخش کرنیں اور ہوائیں داخل ہوسکیں۔ ایک دوسرے کو کھلے دل سے اپنانا چاہیے اسی سے ملک اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم نے ان دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کیا تو اس سے قومی زندگی میں بے گانگی پیدا ہوگی۔

قومی ترقی کا راز، قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں ہے۔ اجنبی یا غیر ملکی زبان میں تعلیم دینا پسماندگی کی غمازی کرتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں وہ ہیں جنہوں نے قومی زبان کو ذریعۂ تدریس بنایا۔ چنانچہ رومن امپائر کی ترقی کا سورج اس وقت طلوع ہوا جب انہوں نے لاطینی زبان کو اپنایا، حالانکہ اس وقت کی مروجہ زبان قبطی تھی۔ عربوں نے یونانی کی بجائے عربی کو قومی زبان بنایا۔ اہل یورپ نے عربی کو اپنی درسگاہوں میں داخل نہیں ہونے دیا حالانکہ تمام جدید علوم انہوں نے عربی زبان سے لیے اقوام مغرب میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اسپینی اور جاپانی کی ترقی کا راز ان کی اپنی زبانوں کو قومی زبان بنانے میں ہے۔ کیا ہم اقوام کی ترقی سے سبق حاصل نہیں کرسکتے؟

ہمارے مصنفین

اور

مؤلفین

اگر

یہ یاد رکھیں تو انہیں بہت سکون اور اطمینان نصیب ہو کہ اُردو میں سائنس اور ریاضی پر عرصے سے کام ہو رہا ہے اور ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں ان سے ہمیں پورا فائدہ اٹھانا ہے ہمارے بزرگوں نے نہایت محنت اور جانسوزی سے طرزِ نگارش کا ایک انداز متعین اور مقرر کیا ہے ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا اور ممکن ہو تو ان کو اور بھی بہتر بنانا ہے۔

آفتاب حسن

سائنس اور ریاضی کی درسی کتابیں ص۵

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

اُردو اور پشتو کے مشترک الفاظ

اردو اور پشتو کے پانچ ہزار سے زائد مشترک الفاظ پر مشتمل جناب پروفیسر پریشان خٹک کی کتاب حال ہی میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی۔ یہ کتاب پاکستان کی قومی اور اہم صوبائی زبان کے درمیان فکری اور لسانی وحدت کو تلاش کرنے کی ایک اہم کوشش ہے۔ پشتو زبان کے الفاظ کی اردو میں آمیزش ایک مسلسل تاریخی اور تہذیبی عمل کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی ساخت اور تعمیر میں پشتو کا کردار نمایاں ہے۔ تاریخی اعتبار سے پشتو سرزمین پاکستان کی قدیم علاقائی زبانوں میں سے ہے اور اردو کی ہیئت ترکیبی میں دوسری علاقائی زبانوں کی طرح اس کا حصہ بھی موجود ہے۔ اردو کے ابتدائی ادوار میں جہاں ہمیں قدیم فارسی اور عربی تصانیف میں اردو کے الفاظ ملتے ہیں وہاں ان تصانیف میں پشتو الفاظ بھی نظر آتے ہیں جس سے ثابت ہے کہ اردو کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی تدوین اور تشکیل میں پشتو کو فراموش نہیں کیا گیا۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر اس جگہ امیر خسرو دہلوی کا ایک شعر درج کیا جائے جس میں "رد" یا "برد" کی جگہ "جُل[1]" یعنی چل کا لفظ استعمال ہوا ہے

من کز برسرنمی نہادم گُل
باربرسر نہاد وگفتا "جُل"

پروفیسر پریشان خٹک نے تلاش وجستجو کے بعد پشتو اور اردو کے مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پشتو بھی پاکستان کی دوسری دوسری زبانوں کی طرح اردو کا لغوی اور لسانی ورثہ ہے اور کوئی زبان بھی اپنے ورثے سے متصادم نہیں ہوتی۔

زیر نظر فہرست الفاظ پروفیسر پریشان خٹک کی فہرست پر معمولی سا اضافہ ہے پشتو الفاظ کی یہ فہرست افغانستان کے مشہور محقق شاہ عبداللہ بدخشی کی تصنیف "د افغانستان دځینو ژبو اولہجو قاموس" (افغانستان کی بعض زبانوں اور لہجوں کی قاموس) مطبوعہ ۱۳۳۹ھ سے مرتب کی گئی ہے، یہ الفاظ آج بھی اردو کا حصہ ہیں۔

اردو	پشتو
آبا	ابا
آٹھ	اته
ارک (کہنی)	اڑاخ (پہلو)
امرود	امروت
بستر	ستره
کن کٹا۔ بچا	بوچئی (مذکر) بوچیئ
بوڑھا	بوڈا
پلید	پلیت (پنجابی تلفظ)
ٹوکری	ٹوکری
جال	جال
جھگڑا	جھگڑا
جھنڈا	جنڈه
مٹکی	چاٹی۔ مٹکئی
چمگادڑ	چیڑکاؤ
سلفچی	چلمچی
چُپ	چوپ
چغل خور	چوغل
چیخ	چیغ

---

[1] یہ لفظ پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی انہیں معنوں میں مستعمل ہے (ادارہ)

ڈھوڑ	دوڑہ
ڈر	ڈار
ڈبنا	ڈوب
ڈھیر	ڈیر
رسی	رسی
جیبھ ۔ زبان	ژبہ
سانس	سا
دوشاخہ ۔ سانگ	سانگہ (پنجابی تلفظ)
سپاہی	سپائی
سایہ (اردو ۔ پنجابی)	سوی
کاشکے	کاشکی
کاگ ۔ کوا	کاغ
کان	کان
کٹارہ	کٹارہ
کٹھل	کمل
کرنا	کرنا
کھڑکی	کیڑکئ
گڑوا	گڈوہ
گیدڑ (شغال)	کیدڑہ
لتاڑا	لتاڑ
لمبوا ۔ الاؤ	لمبہ
لنڈا	لنڈی
مات	مات
مکان	مکان
مٹھی	موٹ
موچی	موچی
نہالی	نالی
نقارہ	نغارہ
واٹ (باٹ)	واٹ

مقتدرہ قومی زبان کی مطبوعات کی نمائش آج ہوگی

اسلام آباد ۔ ۳ ر نومبر (سٹاف رپورٹر) مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ادارے کی مطبوعات کی نمائش اسلام آباد ہوٹل میں بدھ ۴ نومبر شام ساڑھے پانچ بجے منعقد ہو رہی ہے نمائش کا افتتاح ہمدرد فاؤنڈیشن (وقف) کراچی کے صدر حکیم محمد سعید فرمائیں گے اس موقع پر مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی مقتدرہ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالیں گے۔

روزنامہ [illegible] ۔ ۴۔۱۱۔۸۷ء

انگریزی زبان

ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ انگریزی زبان کو ترک کر دیا جائے کیونکہ یہ بہر حال ایک بین الاقوامی زبان ہے [illegible] کہ اردو پروگراموں میں انگریزی کا بے مقصد بے جا اور نامناسب استعمال کر کے اپنی قومی زبان کو غیر فعال ثابت کیا جاتا ہے۔

(علی رضوی کراچی)

ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۸۷ء

انگلش میڈیم سکولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد روکنے [illegible]

(نمائندہ [illegible]) وفاقی حکومت [illegible] انگلش میڈیم سکولوں کی بے تحاشا تعداد کم کرنے کیلئے سنجیدگی سے غور کر رہی ہے

روزنامہ مشرق لاہور ۱ ۔ ۱۲ ۔ ۸۷ء

اسلامیات کی لازمی حیثیت ختم نہ کی جائے

کوٹلی (نمائندہ پکار) جموں و کشمیر تنظیم اساتذہ کے سیکرٹری جنرل پروفیسر شوکت حسین مرزا نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت نویں تا بارھویں جماعت کے لیے اسلامیات اردو اور مطالعہ پاکستان کی لازمی حیثیت ختم کر کے اختیاری بنانے کی تجویز واپس لے کیونکہ یہ فیصلہ قومی تعلیمی پالیسی قومی امنگوں، اور حکومت کے پانچ نکاتی پروگرام کے منافی ہے اور اس پر عمل درآمد سے پاکستان کی نظریاتی اساس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے انہوں نے کہا کہ موجودہ دور میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور ترویج کے لیے ان مضامین کی تدریس لازمی ہے اور اسے موثر بنانے کے اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں، تاکہ نوجوان نسل بالخصوص مسلمان اور محب وطن بنے انہوں نے مزید کہا کہ حکومت مشنری تعلیمی اداروں کو کسی قیمت میں واپس نہ کرے کیونکہ اس طرح یہ عیسائیت کے فروغ اور نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا سبب نہیں گے نہ صرف سامراجی مقاصد پورے کرنے کا سبب بنیں گے بلکہ ان اداروں کے ہزاروں اساتذہ کی ملازمتوں کے لیے خطرہ ثابت ہوں گے۔

روزنامہ پکار اسلام آباد ۱۹ ۔ ۱ ۔ ۸۸ء

Urdu shorthand centre at Sukkur

National Language Authority has chalked out a comprehensive programme to impart training in Office Language to the employees of Federal Government besides the courses in Urdu Shorthand and Typewriting in centres established at Sukkur, Karachi, Quetta, Peshawar and Lahore.

This was stated by Dr. Waheed Qureshi, Chairman, National Language Authority, while briefing a delegation of writers and intellectuals currently visiting Islamabad under inter provincial tours.

The Chairman said: "four hundred officers have so far completed Office Language Course in four badges, one hundred each, with the collaboration of Allama Iqbal Open University, while more than eighteen thousand employees of Federal and Provincial Governments, successfully completed Urdu Typewriting and Short Hand Course. These were the steps taken by the Authority for enforcement and adoption of Urdu as National Language, he added.

Dr Waheed Qureshi said that Authority has already prepared a key board of Manual Typewriters and were negotiating with IBM for manufacturing Electronic Typewriters. A world processor had been made which would be helpful in maintaining computerised official record.

He said: "The Authority has submitted a detailed report regarding the competitive examination being conducted by the Public Service Commission and suggested Urdu medium for the canidates completing their education in Urdu.

The Chairman also presented books published by the Authority to the leader of the delegation.—APP.

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۳-۱۱-۱۹۸۹ء

Western classics Open Varsity offers new B.A. course in Urdu

By a Staff Reporter

The Urdu Department of the Allama Iqbal Open University has offered a new B.A. level course in Urdu based on a bridged translations of Western classics.

The course includes Shakespeare's Othelo, Goethe's Faust, Dante's Divine Comedy, Homer's Odyssey, Dostoevsky's Crime and Punishment, Hemingways, the Old Man and the Sea, Victor Hugo's Les Miserables and Cervante's Don Quixote.

The course contains selections from English, German, Latin, Greek, Russian, American, French and Spanish masterpieces.

It marks the first attempt to introduce Western classics through an Urdu course. The course, it is hoped, will be of tremendous interest not only for the students but also for common readers.

The purpose of introducing this course, according to the university authorities is to promote a taste for the study of Western classics and to narrow down the distance between Eastern and Western literature.

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۹-۱۲-۱۹۸۹ء

Hakim Saeed opens books exhibition

Hakim Saeed of the Hamdard Foundation inaugurated an exhibition of the books and pamphlets published by Muktadara Qaumi Zaban (National) Language Authority in Islamabad on Monday.

Speaking on the occasion Dr. Waheed Qureshi, Chairman of the Muktadara said that in all 90 books have so far been published by it on various subjects to help enforce Urdu as the national language in offices and other institution. He said such exhibitions would also be organised in other big cities of the country so that people would know what Muktadara was doing for the enforcement of Urdu especially in offices.

The chief guest Hakim Saeed also underlined the need to give due importance to Urdu as national language. He said the regional languages have never created any hindrance in the enforcement of Urdu in offices and other institutions.—APP.

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۳-۱۲-۱۹۸۹ء

Books, pamphle[ts] show ends

The first national exhibition [of] books and pamphlets published [by] the National Language Author[ity] concluded in Islamabad.

A total of 94 books and 54 pam[ph]lets published by the Authori[ty] during the past five years we[re] placed on display.

The exhibition, which lasted f[or] three days, was witnessed by ov[er] 3,000 persons including MNAs, S[e]nators, delegates to the Seer[at] Conference and top governme[nt] and literary figures.

Also placed for exhibition wer[e] charts explaining administrativ[e] literary, research and publicatio[n] activities of the authority.

35 books and 25 pamphlets pub[]lished during the current yea[r] were also prominently dis[]played.—PPI.

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۹-۱۲-۱۹۸۹ء

جدید سائنسی علوم کی ترقی قومی زبان کے فروغ میں ہے

اردو کو فروغ دیکر ہی ہم اپنا تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ (مقررین کا اظہار خیال)

سیالکوٹ (نامہ نگار) مذہب قومیں ہمیشہ اپنی قومی زبان ثقافت اور اپنے مذہب سے پہچانی جاتی ہیں ان خیالات کا اظہار گزشتہ روز ... کے زیر اہتمام مذاکرہ "اردو ہماری قومی زبان" پر ڈاکٹر ... شاہ عزیز چوہدری مقصود احمد ... خالد ندیم تنویر فاضل اور دیگر مقررین نے کیا مقررین نے کہا کہ اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں بلکہ یہ ہماری وراثت بھی ہے اردو زبان وسیع القلب اور عظیم ہے مقررین نے کہا کہ دنیا کی تمام قومیں ہمیشہ اپنی قومی زبان کو اہمیت دیتی ہیں جس کی بدولت آج وہ اپنا وقار برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں مقررین نے کہا کہ آج اگر ہم اپنی قومی زبان کی ساکھ مضبوط کرنے کی بجائے غیر ملکی زبانوں کو اردو پر ترجیح دے رہے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ جب بھی ہم قومی زبان کے وجود سے منحرف ہوئے ہمارا اتحاد و یکجہتی کا دامن تار تار ہو جائے گا مقررین نے کہا کہ نظام تعلیم کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبہ جات میں ابھی تک انگریزی زبان کی چاپلوسی کی جا رہی ہے ہمیں فی الفور ایسے نظام کو ختم کرنا ہوگا جس میں اردو پر کسی دوسری زبان کو فوقیت دی ہوگی مقررین نے بتایا کہ ماہرین تعلیم کے علاوہ سائنسدان بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو میں سائنس کی تعلیم ممکن ہے پاکستان میں جدید سائنسی ترقی کا انحصار سائنس کی قومی زبان میں تدریس پر ہے ماہرین تعلیم کو اس نظام کو جلد از جلد رائج کرنا چاہئیے تاکہ ہر پاکستانی اپنی قومی زبان کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر ترقی کی لامحدود منازل طے کر سکے اور اتحاد و یکجہتی کو فروغ دے۔

روزنامہ ... اسلام آباد ۱۴-۱-۱۹۸۹ء

اردو کی مخالفت تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی دلیل ہے

بھارت میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرکے اردو کی حمایت کرنے سے روکا جا رہا ہے

لکھنؤ ۵ نومبر یوپی کی اردو رابطہ کمیٹی کے چیئرمین رام لعل نے یہاں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں ۸۰ فیصد سے زائد الفاظ برصغیر کی علاقائی زبانوں کے ہیں لہٰذا اس زبان کو غیر ملکی زبان کہنے والے نہ صرف تاریخی حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں بلکہ اپنی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا بھی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات نے اردو سے مسلم گھرانوں کو سہارا، احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اردو کے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے سے بھی گھبرانے لگے ہیں۔ مگر اردو کے وہ غیر مسلم مہاجرین جو تقسیم ملک کے بعد پاکستان سے آئے انہوں نے اردو کے مسلمان گھرانوں کو احساس کمتری سے نکالا اور غیر مسلم اردو مصنفین کی دو روزہ کانفرنس کرکے انہیں یقین دلایا کہ غیر مسلم اردو گھرانے کے ساتھ ہیں اور اردو کے حقوق کو منوانے کے لیے جدوجہد میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ رام لعل نے کہا کہ ہماری تحریک پُرامن ہے بھرپور عوام میں بیداری پیدا کر کے حکومت کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ اردو کا مطالبہ محض چند ادیبوں اور دانشوروں کا نہیں ہے بلکہ اترپردیش کے کروڑوں عوام اس مطالبہ میں شامل ہیں اردو رابطہ کمیٹی کے جنرل سیکرٹری پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ دینی درسگاہوں، مشاعروں، قوالیوں غزل کی محفلوں اور فلموں کی آزادی کے بعد اردو کی بقا و تحفظ میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اسے کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو جس انداز میں حکومت نے خاص کے ساتھ بے اعتنائی کی ہے اردو کب کی مٹ چکی ہوتی۔ اور یہ محض دانشوروں اور کتب خانوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہوتی۔

روزنامہ ... ۔۔۔

انجمن سرکاری ملازمین برائے نفاذ اردو کا اجلاس

اسلام آباد (نامہ نگار) انجمن سرکاری ملازمین برائے نفاذ اردو کا اجلاس زیر صدارت ... شاہ ہوا اجلاس میں تمام عہدیداروں اور ممبران کی کافی تعداد نے شرکت کی انجمن سے متعلق امور بجٹ کی گولڈ کیٹ سازی اور انجمن کے انتخابات کا سلسلہ میں اہم فیصلے کئے گئے حکومت کی جانب سے نفاذ اردو کے سلسلہ میں بعض اقدامات کو سراہتے ہوئے مقتدرہ قومی زبان کی ۱۰۰ مطبوعات جن کا تعلق نفاذ اردو سے ہے کو مستحسن قرار دیا اور توقع کی کہ اکادمی ادبیات پاکستان خصوصاً موجودہ چیئرمین کی سربراہی میں اردو ادب میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی دسمبر کے آخر میں جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہو

روزنامہ ... راولپنڈی ۔۔-۱۲-۱۹۸۹ء

۱۹۸۹ء سے اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات اردو میں ہوں گے

راولپنڈی ۲۶ اکتوبر (اے پ پ) وزیر مملکت برائے تعلیم ناصر علی بلوچ نے آج یہاں ایک سکول کی تقریب میں بتایا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۸۹ء سے ملک میں اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات اردو میں ہوں گے۔

روزنامہ اردو ... ۲۷-۱۰-۱۹۸۹ء

اسرار اشفاق

انگریزی الفاظ جو طبقۂ اُمرا کی بول چال میں مستعمل ہیں

English	اردو
Magic	جادو۔ سحر
Magician	جادوگر
Magnet	مقناطیس
Manuscript	مسودہ۔ قلمی نسخہ
Map	نقشہ
Margin	حاشیہ
Massage	مالش
Mature	پختہ۔ بالغ
Maxim	اصول۔ قاعدہ۔ ضابطہ۔ قول
Maximum	انتہائی۔ زیادہ سے زیادہ
Meal	طعام۔ کھانا
Measurement	پیمائش۔ ناپ تول
Memorandum	یادداشت۔ روداد۔ غیر رسمی خط
Memory	حافظہ۔ یادداشت
Mentality	ذہنیت
Mercury	سیماب۔ پارہ
Message	پیغام۔ پیام
Migration	ہجرت۔ نقلِ وطن
Mineral	معدنی
Minimum	قلیل ترین۔ کم سے کم
Minority	اقلیت
Mirror	آئینہ
Misappropriation	غبن
Misbehaviour	بداخلاق، بدسلوکی۔ بداطواری۔ بدچال چلن
Miscalculation	غلط اندازہ
Miscellaneous	متفرق
Mischief	شرارت
Misconduct	ناشائستہ حرکت۔ بدعملی
Misdeed	بُرا کام
Miser	بخیل۔ کنجوس
Miserable	مصیبت زدہ۔ بدنصیب۔ شکستہ حال
Misfit	ناموزوں۔ ٹھیک نہ بیٹھنا۔
Misfortune	بدنصیبی۔ بدقسمتی
Misguide	بہکانا۔ گمراہ کرنا
Mislead	گمراہ کرنا
Missing	غائب۔ گم
Mistake	غلطی
Misunderstand	غلط سمجھنا
Misunderstanding	غلط فہمی
Misuse	غلط استعمال
Moment	لمحہ۔ منٹ
Monday	سوموار۔ پیر
Money	زر۔ رقم۔ پیسے
Money lender	سودخور۔ قرض دینے والا
Monopoly	اجارہ
Month	مہینہ۔ ماہ
Moral	اخلاق
Mortgage	رہن کردی
Mosaic	پچی کاری
Mother in law	ساس۔ خوشدامن
Mother tongue	مادری زبان
Motive	محرک
Mouth	منہ۔ دہن
Movies	سنیما
Murder	قتل
Murderer	قاتل
Muscle	پٹھا
Mustard	رائی
Mutiny	غدر۔ بغاوت
Mystic	عارفانہ
Name	نام۔ اسم
Narration	بیان۔ روایت۔ نقل
Narrow	تنگ
Naughty	شریر۔ شوخ
Necessity	ضرورت۔ حاجت۔ شدید ضرورت
Needy	مفلس۔ محتاج۔ نادار۔ ضرورت مند
Needle	سوئی۔ سوزن
Negative	منفی

Negligence	غفلت۔ بے پروائی۔ تغافل
Negotiation	گفت وشنید۔ معاملہ
Nephew	بھتیجا۔ بھانجا
Neutral	غیرجانبدار۔ بے تعلق
Nice	عمدہ۔ نفیس
Nickname	عرفی نام
Nomad	خانہ بدوش
Nominal	برائے نام
Nomination	نامزدگی
Nonsense	لغویات۔ واہیات
Nourishment	غذا۔ قوت پرورش
Nuisance	باعث تکلیف۔ وبالِ جان
Nutrition	غذا۔ غذائیت

Obedient	اطاعت شعار۔ مطیع۔ فرمانبردار
Object	مقصد۔ شے۔ چیز۔ غرض۔ مراد
Objection	اعتراض
Obligatory	لازمی۔ واجب۔ ناگزیر
Oblige	ممنون ہونا۔ احسان مند ہونا۔ مجبور ہونا
Obervation	مشاہدہ۔ معائنہ
Occasion	موقع محل
Occupation	قبضہ۔ پیشہ
Ocean	سمندر۔ بحر
Offence	حملہ۔ خلاف ورزی قانون۔ بدعنوانی
Officiate	قائم مقامی کرنا
Ointment	مرہم۔ روغن
Olive	زیتون
Olive Oil	زیتون کا تیل
Omission	فروگزاشت
Open	کھلا۔ عیاں
Open hearted	صاف دل۔ پرخلوص
Openly	کھلے بندوں۔ کھلم کھلا
Opinion	رائے۔ خیال۔ عقیدہ۔ مشورہ
Opportunist	زمانہ ساز۔ مصلحت پرست۔ ابن الوقت
Opportunity	عمدہ موقع۔ مناسب موقع۔ نیک ساعت
Optician	عینک ساز
Optimist	خوش امید۔ رجائی
Option	انتخاب۔ پسند کا حق
Oral	زبانی
Orator	مقرر۔ خطیب۔ خوش بیان
Ordinary	معمولی۔ عام
Organic	عضوی
Origin	ماخذ۔ جڑ۔ بنیادی
Original	اصل۔ ابتدائی
Ornament	زیور۔ باعث زینت
Orphan	یتیم
Outcome	نتیجہ۔ حاصل
Outdoor	بیرونی۔ باہر کا۔ کھلا ہوا
Outline	خاکہ۔ خلاصہ
Outlook	نظریہ
Output	ماحصل
Outrage	بے حرمتی۔ پامالی۔ دست درازی
Outright	بالکل۔ تمام تر۔ سراسر۔ قطعی۔ صاف صاف
Outside	باہر۔ ظاہر
Outside	غیر۔ غیرملکی۔ باہر والا
Outspoken	صاف گو۔ بے باک
Outstanding	ممتاز۔ نمایاں۔ تعمیل طلب
Outward	بیرونی۔ سطحی
Overburden	زیر بار۔ حد سے زیادہ
Overcast	گھرا ہوا۔ تاریک
Overcharge	قیمت سے زیادہ لینا۔ زائد قیمت
Overcome	مغلوب کرنا۔ شکست دینا
Overconfident	حد سے زیادہ اعتماد کرنے والا
Overestimate	زیادہ تخمینہ
Overflow	چھلکنا۔ سیلاب۔ طغیانی
Overhead charges	بالائی اخراجات
Overhear	اتفاقیہ سننا۔ چھپ کر سننا
Overjoyed	بے انتہا خوشی
Overlook	چشم پوشی۔ اغماض کرنا
Overnight	راتوں رات
Overrate	اصل سے زیادہ سمجھنا۔ اندازہ لگانا
Oversale	مسترد کرنا۔ رد کرنا
Overseas	سمندر پار
Overtake	جالینا۔ جا پکڑنا
Overthrow	تہ وبالا کرنا۔ گرانا۔ مغلوب کرنا
Overweight	فاضل وزن
Overwhelming	بے پناہ۔ بے حد

Page	صفحہ
Pair	جوڑا
Palm	ہتھیلی

English	Urdu
Palpitation	دھڑکن۔ اختلاج قلب
Panic	بے بنیاد خوف۔ دہشت
Panther	چیتا
Parallel	متوازی
Paralysis	فالج
Paraphernalia	سازوسامان۔ مال اسباب
Parasite	طفیلی۔ لیمونچوڑ
Parent	والد یا والدہ
Parity	مساوات برابری
Partial	جانبدار
Partition	تقسیم۔ حصے
Patience	صبر تحمل۔ برداشت
Patient	مریض۔ صابر
Peculiar	خاص انفرادی
Pedigree	شجرہ نسب۔ نسل۔ خاندان
Pending	معلق۔ زیرِ غور۔ زیرِ سماعت
Peon	چپڑاسی
People	لوگ۔ افراد۔ قوم
Percentage	فیصد
Performance	بجاآوری عمل۔ کام
Permission	اجازت
Person	آدمی۔ انسانیت
Personal	ذاتی
Personnel	اشخاص۔ عملہ
Pessimist	قنوطی
Pet	لاڈلا۔ پالتو جانور
Physical	جسمانی۔ طبعی

English	Urdu
Piece	ٹکڑا۔ حصہ
Pilgrimage	حج۔ زیارت
Pillar	ستون۔ کھمبا
Pillow	تکیہ
Pimple	پھنسی۔ دانہ۔ مہاسا
Pivot	محور
Plebiscite	رائے عامہ
Pledge	عہد۔ پیمان۔ حلف۔ رہن۔ گروی زبان دینا۔
Plenty	زیادتی۔ کثرت۔ بہتات۔ افراط
Poem	نظم
Poet	شاعر
Poetry	شاعری
Poison	زہر
Pond	تالاب
Possession	قبضہ
Postpone	ملتوی کرنا
Prayer	دعا۔ التجا۔ نماز
Precedent	رواج۔ مثال۔ نظیر
Precious	قیمتی۔ بیش بہا
Precise	ٹھیک ٹھیک۔ بے کم وکاست صاف
Predecessor	سابق۔ پیش رو
Predominant	غالب
Preface	دیباچہ۔ تمہید۔ مقدمہ
Prefer	ترجیح دینا۔ بہتر جاننا
Prejudice	تعصب
Preliminary	تمہیدی۔ ابتدائی۔ افتتاحی
Premature	قبل از وقت۔ پیش رس

English	Urdu
Preparation	تیاری۔ کمربندی
Prescribe	تجویز کرنا۔ ہدایت کرنا۔ نسخہ لکھنا
Presciption	نسخہ
Present	حاضر۔ موجود۔ حال۔ تحفہ۔ سوغات ملاقات کرانا۔
Prestige	شہرت۔ ناموری۔ نیک نامی۔ عزت
Presumption	قیاس۔ خیال۔ گمان
Pretend	بہانہ کرنا۔ بننا
Prevalent	رائج۔ عام
Previous	سابق۔ پہلا
Pride	غرور۔ تکبر
Priest	پجاری۔ پادری
Principle	اصول
Prison-er	قیدی
Privilege	حق۔ استحقاق۔ رعایت
Procedure	کارروائی۔ طریق کار
Proceed	بڑھنا۔ ابتدا کرنا۔ کارروائی کرنا
Proceeding	کارروائی۔ روئداد
Process	طریق عمل۔ قدرتی عمل
Production	پیداوار
Profession	پیشہ
Profit	فائدہ۔ نفع
Promise	وعدہ۔ عہدوپیمان۔ اقرار قول
Prompt	آمادہ۔ بروقت بلاتاخیر۔ مستعد
Prophesy	پیش گوئی
Prophet	نبی۔ رسول۔ پیغمبر
Proportion	حصہ۔ مقدار۔ تعداد۔ نسبت۔ تناسب
Proposal	تجویز۔ منصوبہ

English	Urdu
Protection	حفاظت۔ بچاؤ
Proverb	ضرب المثل۔ کہاوت
Provisional	عارضی۔ وقتی۔ ہنگامی
Psycological	نفسی۔ ذہنی۔ دماغی
Pulse	نبض
Punishment	سزا۔ سرزنش
Pupil	شاگرد۔ طالب علم۔ آنکھ کی پتلی
Puppet	کٹھ پتلی
Pure	خالص۔ پاک صاف
Purpose	غرض۔ غایت۔ مراد۔ مقصد۔ مدعا
Pursue	تعاقب۔ پیچھا کرنا۔ تلاش کرنا
Puzzle	مسئلہ۔ مشکل۔ معما۔ الجھن
Pyramind	اہرام مصر۔ مینار مخروطی
Quack	عطائی۔ اناڑی حکیم
Quarterly	سہ ماہی
Query	سوال۔ دریافت طلب بات
Question	سوال۔ استفسار
Raid	چھاپا
Rainbow	قوس وقزاح۔ دھنک
Random	بے تک۔ اوٹ پٹانگ
Ransom	تاوان۔ زرِ رستگاری
Ratio	اندازہ لگانا۔ نسبت۔ تناسب
Reaction	ردِعمل
Real	حقیقی۔ اصلی
Reason	وجہ۔ سبب۔ علت
Reasonable	معقول۔ سمجھدار۔ مناسب
Recess	وقفہ۔ مہلت۔ چھٹی
Recovery	صحت یابی۔ وصولی
Reduction	تخفیف۔ کمی
Refund	واپس کرنا۔ ادا کرنا
Regard	توجہ۔ غور۔ لحاظ۔ عزت۔ ادب
Regime	نظام حکومت۔ نظام۔ عہد
Regret	پچھتانا۔ اظہار افسوس
Rehabilitation	بحالی
Reign	فرماں روائی۔ حکومت۔ بادشاہی
Reinforce	کمک پہنچانا۔ مضبوط کرنا
Reinstate	بحال کرنا۔ درست کرنا
Reject	مسترد کرنا۔ نامنظور کرنا
Rejoinder	جواب الجواب۔ ترکی بہ ترکی جواب
Relapse	دوبارہ مبتلا ہونا۔ عودِ مرض
Relate	بیان۔ نقل۔ روایت کرنا
Relation	رشتہ دار۔ قرابت دار
Release	رہا کرنا۔ رہائی
Relevant	برمحل۔ باموقع۔ مناسب۔ حسب حال
Reliable	قابل اعتماد۔ بھروسے کا
Reputation	شہرت۔ نیک نامی یا بدنامی
Request	درخواست۔ التجا
Requirement	ضرورت۔ حاجت
Reservation	محفوظ کرنا۔ نشستِ مخصوص
Resign	ترک کرنا۔ استعفا دینا
Resignation	استعفا
Resource	وسائل۔ ذرائع
Respectable	قابلِ عزت و شرف
Responsible	ذمہ دار۔ جواب دہ
Revise	نظرثانی کرنا
Revolution	گردش۔ انقلاب
Rheumatism	وجع المفاصل
Rich	دولت مند۔ امیر
Riddle	پہیلی
Riot	ہنگامہ۔ شورش
Rival	رقیب۔ حریف
River	دریا
Roof	چھت
Rope	رسی۔ رسا
Rumour	افواہ
Rust	زنگ
Such	بوری۔ تھیلا۔ ایذا رسانی
Sacred	پاک۔ مقدس۔ متبرک
Sacrifice	قربانی۔ ایثار
Saddle	کاٹھی۔ زین
Sail	بادبان
Salary	تنخواہ
Salvation	نجات۔ مکتی
Sanction	منظوری۔ اجازت۔ اختیار دینا
Satire	ہجو۔ تضحیک۔ موجب ننگ
Satisfaction	تسکین۔ اطمینان۔ تسلی
Saturday	ہفتہ
Sauce	چٹنی
Scapegoat	قربانی کا بکرا۔ بھینٹ
Sculpture	سنگ تراشی۔ نقاشی
Seasickness	بحری بیماری
Seal	مہر۔ چھاپ

English	Urdu
Search	تلاش۔ جستجو
Segregate	علیحدہ کرنا
Seldom	شاذ و نادر۔ کبھی کبھی
Sensational	ہنگامہ خیز۔ جوش انگیز
Sensible	قابل۔ فہیم۔ ذی ہوش
Sensitive	حساس۔ زود رنج
Sentence	جملہ
Sentiment	احساس۔ جذبہ
Sequence	سلسلہ۔ تسلسل
Serious	متین۔ سنجیدہ
Settle	فیصلہ کرنا۔ تصفیہ کرنا۔ آباد ہونا۔ بیٹھ جانا
Shame	شرم۔ حیا
Shape	شکل۔ صورت
Share	حصہ
Sharp	تیز۔ نوکدار
Sheep	بھیڑ
Shock	جھٹکا۔ صدمہ
Shore	ساحل۔ کنارہ
Short	چھوٹا۔ مختصر
Shortage	کمی۔ قلت
Shrink	سکڑنا۔ سمٹنا
Sight	نظر۔ نظارہ
Sign	نشان۔ علامت۔ آثار
Signature	دستخط
Significance	معنی خیز۔ مفہوم۔ مطلب۔ اہمیت
Silence	خاموشی
Sincere	مخلص۔ صادق
Situation	موقع۔ مقام۔ محل
Skin	کھال۔ جلد
Slaughter house	مذبح
Sleep	نیند۔ خواب
Slice	ٹکڑا۔ قتلہ
Slope	ڈھلان۔ نشیب
Smell	قوت شامہ۔ سونگھنا
Smile	مسکرانا۔ مسکراہٹ
Smoke	دھواں۔ سگریٹ پینا
Smooth	ہموار
Sober	متین۔ سنجیدہ۔ محتاط
Soil	مٹی۔ زراعتی زمین
Solution	محلول۔ حل
Soul	عقل۔ روح
Source	ماخذ
Spare	فالتو۔ فرصت کا۔ درگزر کرنا
Specially	خصوصیت۔ خاص چیز
Specification	تصریح۔ تفصیل
Specimen	نمونہ۔ مثال
Spelling	ہجے
Sphere	حلقہ۔ ماحول
Splendid	شاندار۔ عالیشان
Spoon	چمچہ
Sprain	موچ
Spray	چھڑکنا
Square	مربع۔ چوک
Stable	مضبوط۔ اصطبل
Stamina	سکت۔ قوت۔ برداشت
Standing	وقعت۔ حیثیت
Statement	بیان۔ اظہار۔ دعویٰ
Statesman	سیاستدان
Stature	رتبہ۔ درجہ۔ حیثیت
Stimulant	نشاط انگیز۔ کیف آور
Stipend	وظیفہ
Straightforward	صاف۔ بے لاگ۔ سیدھا سادا۔ صاف گو
Strain	حد سے زیادہ بوجھ۔ کھچاؤ۔ تناؤ
Stranger	اجنبی۔ پردیسی
Strap	پٹی۔ فیتہ
Strategy	فوجی حکمت عملی
Strong	پختہ۔ طاقتور۔ مضبوط
Structure	بناوٹ۔ ڈھانچہ۔ ساخت۔ بناوٹ
Struggle	ہاتھ پیر مارنا۔ سخت کوشش کرنا
Stupid	مخبوط۔ غبی۔ بے وقوف
Submission	تسلیم۔ اطاعت۔ گزارش
Subordinate	ماتحت۔ طابع
Subscriber	خریدار۔ چندہ دینے والا
Subsidize	امدادی رقم
Substance	لب لباب۔ اصل مدعا۔ جوہر۔ روح
Substitute	بدل۔ قائم مقام
Success	کامیابی۔ ترقی
Succession	حق جانشینی
Successor	جانشین۔ وارث
Suicide	خودکشی
Sunday	اتوار
Supernatural	مافوق الفطرت

Superior	اعلیٰ۔بڑا۔برتر
Supplement	اضافہ
Support	سہارا۔تائید
Surety	ضمانت
Surface	سطح
Surplus	فاضل۔زاید۔مقدار سے فاضل
Surprise	تعجب۔خلاف توقع
Surrender	حوالے کرنا۔مغلوب ہونا۔اطاعت قبول کرنا
Surroundings	گرد و پیش۔ماحول
Suspend	معلق۔معطل۔ملتوی کرنا
Suspense	تشویش۔امید و بیم کی حالت
Swear	حلف اٹھانا۔قسم کھانا
Sweeper	جاروب کش
Sword	تلوار۔شمشیر
Sympathy	ہمدردی۔دردمندی
Sympton	علامت مرض۔نشانی
Systematic	با اصول۔باقاعدہ
Table	میز
Tackle	مقابلہ کرنا۔سلجھانا
Tact	موقع شناسی۔حکمت۔ہوشیاری
Tactful	ہوشیار۔موقع شناس۔محل شناس
Tactics	حکمت۔جنگی حکمت عملی
Talkative	باتونی
Target	نشانہ۔ہدف
Teak	ساگوان
Temperament	مزاج۔افتاد
Temporary	عارضی۔وقتی
Tenant	کرایہ دار
Tendency	میلان۔رجحان
Tension	کھچاؤ۔کشاکش۔تناؤ
Tensure	میعاد۔زمانہ
Territory	عملداری۔علاقہ
Testimonial	سند۔تصدیق
Thoroughfare	شاہراہ۔شارع عام
Thrill	ہیجان۔سنسنی
Throne	تخت
Thought	قوت خیال۔فہم۔سوچ
Tone	آواز۔لہجہ
Tongue	زبان
Touchy	زود رنج۔زود حس
Tough	سخت۔جفاکش
Tout	دلال
Towel	تولیہ
Tradition	روایت۔رسم۔رواج
Transaction	تجارتی معاملہ۔سمجھوتہ
Trap	دام۔جال۔پھندا
Treasure	خزانہ
Treasurer	خزانہ دار
Treatment	برتاؤ۔علاج
Treaty	عہد نامہ۔معاہدہ
Trench	خندق۔کھائی
Trend	رجحان۔میلان۔رخ
Trespass	مداخلت۔خلاف ورزی
Triangle	مثلث
Tribe	جرگہ۔قبیلہ
Trouble	تکلیف۔مصیبت
Truce	عارضی صلح
Tuesday	منگل
Turban	پگڑی۔صافہ
Typical	مثالی۔امتیازی۔مخصوص
Unaware	ناواقف۔لاعلم
Uncalled for	بے موقع۔بے تکا
Uncertain	غیر یقینی۔متلون
Uncomfortable	بے آرام۔بے چین۔تکلیف دہ
Uncommon	غیر معمولی۔نادر
Uncompromising	مصالحت نہ کرنے والا
Unconcerned	غیر متعلق
Undesirable	ناپسندیدہ
Undivided	سالم
Uneducated	جاہل۔ناخواندہ
Unemployed	بے روزگار
Undue	ناواجب۔نامناسب
Uneasy	بے آرام۔پریشان
Unequal	غیر مساوی
Uneven	اونچا۔نیچا۔ناہموار
Unending	لازوال۔مسلسل
Unfit	ناموزوں۔نامناسب
Unfortunate	بدنصیب۔ناکام۔بدبخت
Unhappy	غمگین۔رنجیدہ۔ناخوش
Unhealthy	بیمار۔غیر صحت مند

English	اردو
Unkind	بے رحم - بے درد - نامہربان
Unknown	نامعلوم - گمنام
Unlawful	خلاف قانون - ناجائز
Unlucky	نامراد - بدنصیب
Unnatural	خلاف فطرت - بناوٹی - غیر طبعی
Unparliamentary	خلاف دستور - خلاف پارلیمنٹ - غیر پارلیمانی
Unpleasant	ناخوشگوار - ناپسندیدہ
Unpopular	غیر مقبول
Unreasonable	غیر معقول - ناواجب
Unusual	غیر معمولی - انوکھا
Unwell	علیل
Unwholesome	مضر صحت
Unworthy	نااہل - ناقابل - نامناسب
Unemployment	بے روزگاری
Underground	زیر زمین
Underhand	خفیہ - پوشیدہ
Understanding	سمجھ فہم - سمجھوتا - اتحاد
Uniformity	یک رنگی - یکسانیت - ہم شکلی - یکساں روی
Unique	بے مثل - یکتا
Unity	وحدت - یک جہتی
Universe	کائنات
Uphold	حمایت کرنا - بحال کرنا
Upset	پریشان کرنا - درہم برہم کردینا
Upstart	نودولتیا
Urgency	شدت - حمایت - تاکید
Urgent	تاکید - فوری
Useful	کارآمد - مفید
Useless	بے فائدہ - بے کار
Vacant	خالی
Vagabond	آوارہ - سیلانی
Vague	مبہم - غیر واضح
Valid	بجا - صحیح
Valley	وادی
Valuable	بیش قیمت - قابل قدر
Value	قدر و قیمت - قیمت
Venture	خطرناک مہم - جسارت کرنا
Verbal	لفظی - زبانی
Verdict	فیصلہ - رائے - فتویٰ
Verification	تصدیق - جانچ
Vertebra	ریڑھ کی ہڈی
Victim	شکار
View	نظارہ - منظر
Village	گاؤں
Vinegar	سرکہ
Virgin	دوشیزہ - کنواری
Vision	نظارا - بصارت - بینائی
Visit	ملاقات
Vocabulary	فرہنگ - خزینہ الفاظ
Volcano	کوہ آتش فشاں - جوالامکھی
Voyage	بحری سفر
Vulgar	عامیانہ - بازاری - بیہودہ
Wealth	دولت - مالی
Weather	موسم
Wednesday	بدھ
Weight	وزن - بوجھ
Welcome	خوش آمدید - خیر مقدم
Wholesome	صحت بخش - مفید
Window	کھڑکی
Withdraw	واپس لینا
Witness	گواہ
Woman	عورت
Worm	کیڑا
Worthy	لائق - قابل
Year	سال
Yearly	سالانہ
Yellow	پیلا - زرد
Youngster	بچہ - لڑکا
Zig Zag	ٹیڑھا میڑھا - پر پیچ
Zoo	چڑیا گھر

محمد طفیل ایوارڈ

ادارہ نقوش نے بانی ادارہ جناب محمد طفیل مرحوم کی "یاد میں "محمد طفیل ایوارڈ" کے اجراء کا فیصلہ کیا ہے۔ دس ہزار روپے کا یہ ایوارڈ ہر سال نمایاں ادبی خدمات پر دیا جائے گا۔

اخبارِ اُردو کے نام

گرامی قدر جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

آداب : السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ

اخبارِ اُردو شمارۂ ستمبر میں اسرار اشفاق صاحب کا شائع شدہ مضمون ،بعنوان " انگریزی الفاظ جو اردو تحریر و تقریر کا حصہ بن چکے ہیں" پڑھا۔ یہ جان کر سخت حیرت و استعجاب ہوا کہ اسرار اشفاق صاحب نے اکثر ایسے انگریزی الفاظ ، جن کے متبادل اردو میں نہ صرف نہایت جامع اور پرکشش الفاظ میں موجود ہیں ، بلکہ روزمرہ زندگی میں نہایت روانی و فراوانی کے ساتھ مستعمل ہیں ، وہ بھی اپنی فہرست میں بلاوجہ شامل کر دیے ہیں۔ چیدہ چیدہ الفاظ مع اردو متبادل پیشِ خدمت ہیں :۔

میس	طعام گاہ	پیراشوٹ	چھتری
ملٹری	فوج	پارک	گلشن، سیرگاہ
مل	کارخانہ۔ کارگاہ	پارٹی	تنظیم
مشن	مقصد، منصوبہ	پارلیمنٹ	مجلس
مکسچر	آمیزہ، محلول	پاسپورٹ	اجازہ
موبائل	گشتی، متحرک	پیٹنٹ	اصل
ماڈل	نمونہ	پویلین	گوشہ
ماڈرن	جدید	پینی	پائی
موڈ	مزاج	پرمٹ	اجازت نامہ
ماؤنٹینئر	کوہ پیما	پٹیشن	درخواست۔ عرضی
آرڈر	حکم، فرمان	فارمیسی	دواخانہ
اوورہال	مرمت	فزیشن	معالج
اوورسیئر	نگہبان	سائیکالوجی	نفسیات
پمفلٹ	کتابچہ	پکنک	تفریح

پلان	منصوبہ	پروویژن	ترسیل
پاکٹ	جیب	پبلک	سرکاری
پالیسی	منصوبہ	پمپ	نل
پالٹیکس	سیاست	پرس	بٹوہ
		کیو	قطار
پولی ٹیکنک	کثیرالعلوم	کورم	حاضری
پورٹ فولیو	قلمدان	ریزولوشن	قرارداد
پورٹریٹ	خاکہ، تصویر	ریسٹ ہاؤس	تفریح گاہ
پوسٹیج	ڈاک	ریسٹورنٹ	قیام گاہ
پوسٹر	اشتہار	ریونیو	مال
پریس	مطبع	ریونیو افسر	افسرمال
پریشر	دباؤ	ریوالور	طمانچہ
پرنسپل	صدر	ربن	فیتہ
پرائیویٹ	نجی	رومانس	عشق، معاشقہ
پرابلم	مسئلہ، مشکل	رائل	شاہی
پروڈیوسر	پیش کار	سیل	فروخت، بکری
پروجیکٹ	منصوبہ	سیلون	ڈبہ، حمام
پرامپٹر	مستعد	سکیل	پیمانہ
پروٹین	نشاستہ	سیکنڈل	افسانہ
پروٹسٹ	احتجاج	سکارف	گلوبند

بقیہ الفاظ کے معانی / متبادل بھی اردو میں بجا طور پر موجود ہیں جنہیں بتدریج رائج کیا جا سکتا ہے۔ بعد اعتذار ، عرض ہو کہ زیرِ نظر فہرست سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ عمالِ مقتدرہ بھی ترویج و نفاذِ اردو میں مخلص نہیں اور من و عن انگریزی

الفاظ ہی کو اردو میں لکھ کر زبانِ اردو کا حصہ بنانے پر تلے ہوتے ہیں[1]۔ میری گزارش ہے کہ "مقتدرہ" کو ایسی خود ساختہ بے معنی اصطلاحات کو اپنے ماہانہ جریدہ میں جگہ دینے سے گریز کرنا چاہیے اور ایسی فہرست فاضل "مقتدرہ" کے شعبۂ اصطلاحات کی خصوصی تحقیق کے بعد شائع کی جانی چاہیے۔

مزید براں، چند برس قبل "مقتدرہ" نے بسلسلہ نفاذِ اردو فوری طور پر تمام کاروباری اشتہارات، تفریح گاہوں اور شاہراہت و شارعات کے نام اور تمام نجی و سرکاری گاڑیوں کی نمبر کی تختیاں اردو میں تبدیل کرنے کی اصلاحات / سفارشات مرتب کی تھیں جن پر جزوی طور پر عمل درآمد بھی ہوا تھا، لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ چکا ہے[2]۔

امید ہے کہ حضور ان گزارشات پر ذاتی طور پر مناسب غور فرمائیں گے۔

فقط والسلام

طاہر انصاری

معرفت

عسکری شفاخانہ (۸۸)،
کوئٹہ

O

استانبول

۷ دسمبر ۱۹۸۶ء

برادرِ گرامی شریف کنجاہی صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف

اخبارِ اردو کے ذریعے آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ گزشتہ ماہ اگست، ستمبر، اکتوبر کے تینوں پرچے اکٹھے ملے۔ فرصت ملتی ہے تو انہیں جستہ جستہ دیکھ لیتا ہوں۔ جون، جولائی کے شماروں میں اسرار اشفاق صاحب کا مضمون "انگریزی الفاظ جو اردو تحریر و تقریر کا حصہ بن چکے ہیں" دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ ان کے پیشِ نظر بابو انگلش کی طرح بابو اردو ہے جو ایک زمانے میں انگریز صاحب بہادر ہمارے ملک میں رومن خط میں جاری کرنے کا سوچا کرتے تھے۔ نہ انگریزی آئے نہ اردو باقی رہے اور اینگلو انڈین مخلوط نسل کی طرح اردو انگریزی کا ایک ملغوبہ تیار ہو جائے۔ یقیناً اردو نے انگریزی علم و ادب سے بہت استفادہ کیا ہے اور اپنے مزاج کے مطابق انگریزی کے کئی الفاظ بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیے ہیں۔ مگر اسرار اشفاق کی یہ فہرست غیر محتاط ہے اور اردو کے مزاج اور ذخیرۂ لفظی سے بے خبری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بے ضرورت الفاظ پر نشانات لگانے شروع کیے تھے کہ آپ کو مطلع کروں پھر دوسری قسطوں کے انتظار اور چند در چند مصروفیات کے باعث آپ کو لکھ نہ سکا۔ اب ستمبر میں انوار فیروز صاحب کا خط دیکھا تو یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ انوار فیروز صاحب نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔ میرے خیال میں مقتدرہ کے اخبار میں ایسے مضمون کو نظرِ ثانی اور احتیاط سے چھان بین کے بعد چھپنا چاہیے تھا۔ ورنہ اس مضمون کے عنوان "...... جو اردو تقریر و تحریر کا حصہ بن چکے ہیں!" سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ موقف مقتدرہ کی پالیسی کا حصہ ہے۔ حالانکہ جہاں آپ جیسے اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے صاحبِ ذوق لوگ ہوں، وہاں اس قسم کی اینگلو پاکستانی شتر گربگی نہیں ہو سکتی۔ میں انوار فیروز صاحب کے خیالات کی پوری تائید کرتا ہوں مناسب ہو کہ وہ اس مضمون پر نظرِ ثانی کر کے اسے دوبارہ اخبارِ اردو میں چھپنے کے قابل بنائیں اور اردو میں انگریزی کے صرف اُن الفاظ کو لیں جو واقعی اردو کی سنجیدہ تحریروں کا حصہ بن چکے ہیں یا اردو کے مزاج کے مطابق اور ضرورت کے پیشِ نظر داخل ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اردو کا دامن بڑا کشادہ ہے اور یہ بڑی روادار زبان ہے۔ اس کا تو خمیر ہی رواداری اور وسیع المشربی سے اٹھا ہے۔ مگر زبان کو بگاڑنا اور بات ہے، اسے بنانا دوسری بات ہے۔

غلام حسین ذوالفقار

(ترکی)

---

[1] فاضل مکتوب نگار کا یہ خیال درست نہیں۔ مقتدرہ کے جریدے میں شائع ہونے والے جملہ مقالات کے مطالب کی تمام تر ذمہ داری مقالہ نگاروں پر ہوتی ہے۔ اخبارِ اردو میں اس مقالے کی اشاعت کا مقصد یہی تھا کہ مقتدرہ قومی زبان کے نزدیک انگریزی الفاظ کے استعمال کا مسئلہ ایک اختلافی امر ہے جس پر قارئین کی آرا درکار تھیں، اسی لیے یہ مکتوب بھی شائع کیا جا رہا ہے تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آسکیں (ادارہ)

[2] اسی سے آپ اس نیم سرکاری ادارے کی بے بسی کا اندازہ لگا لیجئے۔ اس ادارے کو قوتِ نافذہ کا درجہ ابھی تک نہیں مل سکا (ادارہ)

ڈاکٹر وحید قریشی

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : اقبال کی ابتدائی زندگی
ناشر : اقبال اکیڈمی
مصنف : ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کی کتاب "اقبال کی ابتدائی زندگی" اقبال اکیڈمی لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس سے قبل حیات اقبال پر اکیڈمی کی طرف سے دانائے راز از سید نذیر نیازی، سرگزشت اقبال از عبدالسلام خورشید روایات اقبال از عبداللہ چغتائی اور دوسرے اداروں کی طرف سے زندہ رود از جاوید اقبال، ذکر اقبال از سالک "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" از عبداللہ قریشی اور "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" از سید حامد جلالی شائع ہو چکی ہیں۔ سلطان محمود حسین کی ایک کتاب اقبال اکیڈمی کی طرف سے بعنوان "علامہ اقبال کے استاد شمس العلماً سید میر حسن" شائع ہوئی جس میں اقبال کی زندگی کی کچھ جھلکیاں سامنے آئی تھیں۔ اس سال حیات اقبال ہی کے سلسلے کی دو کتابیں یکے بعد دیگرے چھپ کر سامنے آگئی ہیں، اول اعجاز احمد کی "مظلوم اقبال" اور دوسری سید سلطان محمود حسین کی "اقبال کی ابتدائی زندگی" دونوں کتابیں چند مقامات پر ایک دوسرے کے بیانات کی تائید و توثیق بھی کرتی ہیں لیکن اکثر جگہ ایک دوسرے کی معلومات کی تردید و تنسیخ بھی کر دیتی ہیں۔ فی الوقت سید سلطان محمود حسین کی کتاب کا تعارف مقصود ہے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ابھی تک زیادہ معلومات دستیاب نہ تھیں۔ سلطان محمود حسین نے سیالکوٹ میں رہ کر جو کچھ زبانی روایات اور تحریری مواد یکجا کیا ہے اس سے علامہ کی ابتدائی زندگی کی صورت گری کا کسی حد تک سامان ہو گیا ہے اور ہمارے سامنے بعض نئی معلومات آئی ہیں۔ علامہ کا پہلی جماعت کا نتیجہ، ان کے ابتدائی اساتذہ، علامہ کے ہم جولی، ہم جماعت اور ساتھی، سیالکوٹ کے مشنری ادارے اور شخصیات اور علامہ کی پہلی بیوی کے خاندان کے بارے میں بعض معلومات نئی ہیں اور ان سے علامہ کی ابتدائی زندگی کی کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔ اخذ نتائج میں کہیں کہیں فاضل محقق سے بعض تسامحات بھی ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر ان کے پیش کردہ نتائج سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اقبال کے تعلیمی ریکارڈ کی مدد سے ۱۸۷۵ء کو ان کا سال پیدائش قرار دیا ہے۔ اس حد تک تو ان کا کہنا درست ہے کہ اقبال کے مڈل، میٹرک، انٹرنس کے داخلہ فارموں میں جو فرق محسوس ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عموماً ہم اعلان نامہ نتائج سے علامہ کی عمر کا حساب کرتے ہیں۔ فارم داخلہ میں عمر کا اندراج دراصل فارم داخلہ کے پر ہونے کی تاریخ سے ہونا چاہیے۔ انہوں نے فارموں کو بھیجنے کی حتمی تاریخوں کو بنیاد بنا کر اس تناقض کو دور کر دیا ہے لیکن ان کا پیش کردہ استدلال اس بناء پر مشکوک دکھائی دیتا ہے کہ ص ۲۲، ۲۳ پر علامہ کا سال تولد ۱۸۷۵ء قرار دیا ہے لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۱۷۶ پر علامہ کی چھوٹی بہن کریم بی بی کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء بتا کر انہیں علامہ سے تین سال چھوٹی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حساب سے تو علامہ کا سال پیدائش ۱۸۷۳ء ہی قرار پاتے گا۔ کہیں کہیں ڈاکٹر سلطان محمود حسین صاحب نے قیاسی نتائج کو حتمی بنا دیا ہے، علامہ اقبال کسی بالائی جماعت میں براہِ راست داخل ہوتے تھے اس بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کے لیے ان کا انحصار صرف ان کے پہلی جماعت کے نتیجے پر رہا ہے حالانکہ انہوں نے یہ امتحان برانچ سکول سے دیا تھا اور بالائی جماعتیں دوسرے سکول سے کی تھیں۔ پرائمری سکول کی ابتدائی کلاس میں داخلے کا ہمارے پاس کوئی تحریری ثبوت نہیں۔ اس طرح ان کا یہ بیان بھی قیاسی ہے کہ علامہ اقبال نے سکاچ برانچ سکول قلعہ سیالکوٹ سے یہ امتحان پاس کیا۔ صفحہ ۲۴ اور صفحہ ۱۱۷ پر اسے حتمی رائے کے طور پر اور صفحہ ۱۰۲ پر "غالباً" کے لفظ کے ساتھ بیان کیا ہے یہ ان کا اپنا قیاس ہے کہ وہ قلعہ سکول میں پڑھتے رہے، متعلقہ رپورٹ میں سکول کا نام درج نہیں۔ صفحہ ۱۲۰ پر علامہ کا دوسری اور تیسری جماعت میں داخلہ اور ایک سال میں دو جماعتیں پاس کرنے کا ذکر ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ صفحہ ۱۳۶ پر انہوں نے لکھا ہے کہ (جب اقبال) انٹرنس کا امتحان دینے کے لیے گجرات گئے تو گجرات میں ان کے ہونے والے خسر موجود تھے۔ اسی کتاب صفحہ ۱۷۱ پر درج ہے کہ اس زمانے میں علامہ کے ہونے والے خسر پنڈ دادنخان میں تعینات تھے۔ گجرات شیخ عطا محمد کا وطن ضرور تھا لیکن وہاں اس زمانے میں ان کی موجودگی، بظاہر قیاسی ہے جسے حتمی بنا دیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۷۴ پر علامہ کے برادر نسبتی غلام محمد کی لیورپول یونیورسٹی میں تعلیم کا زمانہ ۱۹۰۹ء سے پہلے بتایا گیا

ہے اور دوسری بار سفرِ یورپ پہلی جنگِ عظیم کے دوران بیان کیا ہے۔ غلام محمد ایک ہی بار یورپ گئے تھے دو بار نہیں۔ صفحہ ۳۰۲ پر جسٹس محمد منیر فاروقی کو مولانا غلام حسن کا پوتا اور صفحہ ۳۶۳ پر ان کا پڑ پوتا قرار دیا ہے۔ بیک وقت دونوں باتیں درست نہیں ہوسکتیں۔ ان چند مقامات سے قطعِ نظر کتاب کے اندراجات مجموعی طور پر قابلِ قدر ہیں خصوصاً علامہ کی تعلیم، نصابات، پرچہ ہائے امتحان اور سسرال کے بارے میں مفصل معلومات پہلی بار رقم ہوئی ہیں۔ اس کتاب سے "اقبال اور ان کی پہلی بیوی" کے مصنف کی بعض فروگزاشتوں کی بھی بخوبی اصلاح ہوگئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اقبالیات میں ایک اہم اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔

نام کتاب: مظلوم اقبال ○

ناشر: مصنف

مصنف: اعجاز احمد کراچی

علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے خاندانی معلومات کی بناء پر یہ کتاب تحریر کی ہے۔ کتاب دراصل ان کے متفرق مقالات کا مجموعہ ہے، کوئی مربوط کتاب نہیں ہے۔ اس میں انھوں نے چند پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں حیاتِ اقبال کے بعض گوشوں کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے اور دوسرے حصے میں علامہ کے ۱۰۳ خط شائع کیے ہیں۔ ان مکتوبات سے ان حصوں کو حذف کر کے شائع کیا گیا ہے جن کا تعلق علامہ کی پہلی بیوی یا ان کے خاندان کے افراد سے تھا۔ یہ کاٹ چھانٹ اس بے دردی سے ہوئی ہے کہ خطوط کے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ لے دے کر کتاب کا پہلا حصہ کئی اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ سب سے اہم وہ شجرہ ہے جو خاندان کی بزرگ خواتین کی اعانت سے تیار کیا ہے اور اس سے قبل زندہ رود میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ علامہ اقبال کے والد بزرگوار کے حالات بھی مفصل بیان کیے گئے ہیں جن کی بنیاد اکثر ذاتی معلومات یا خاندانی بیانات پر ہے۔ علامہ کے بڑے بھائی یعنی اپنے والد کے بارے میں ملازمتی کوائف پہلی بار اس قدر تفصیل سے ہمارے سامنے آئے ہیں اور سرکاری دستاویزات پر مبنی ہیں۔ سیالکوٹ میں خاندانی جائداد کے بارے میں بھی بڑے اہم کاغذات شائع کیے گئے ہیں۔ اعجاز احمد علامہ کی اولاد کے متولیوں میں شامل تھے اس لیے علامہ کے وصیت نامے اور دیگر امور کے بارے میں ان کی مہیا کردہ اطلاعات خاصے کی چیز ہیں۔ اسی طرح اس کی کمیٹی کی روداد بھی پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی ہے جو، ایک آدھ تاویل سے قطعِ نظر، عموماً قابلِ اعتبار ہے۔ مذہبی عقیدے کی وجہ سے ان کے بعض بیانات مزید محلِ نظر ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳۳ پر ان کا یہ ارشاد کہ علامہ کے والد کچھ عرصہ قادیانی رہے اور ۱۹۰۲ء میں اس سے کنارہ کشی اختیار کی، تحقیق طلب ہے۔ اس طرح علامہ کے بارے میں ایک پورا باب باندھا گیا کہ وہ قادیانی رہ چکے ہیں (صفحہ ۱۹۴ ببعد)۔ تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ خصوصاً اس کا وہ حصہ جس میں علامہ کے بارے احرار کے دباؤ کی وجہ سے قادیانیت کی مخالفت کا راز بیان ہوا ہے مزید ثبوت کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ اعجاز احمد کے اپنے والد کے مذہبی عقائد کے بارے میں بیانات ممکن ہے بڑی حد تک درست ہوں لیکن خود علامہ کے بارے میں ان کے ارشادات شکوک شبہات سے خالی نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کا بڑا مقصد غالباً یہ ہے کہ جاوید اقبال نے اپنے والد کی سوانح عمری "زندہ رود" میں ان کے بعض بیانات کو تو قبول کیا تھا لیکن جن امور کو پایۂ اعتبار سے ساقط جان کر رد کر دیا تھا انھیں بھی پبلک کے سامنے لایا جائے۔ "مظلوم اقبال" میں علامہ اقبال واقعی مظلوم دکھائی دیتے ہیں۔

> "مجھے یہ کہنے میں باک نہیں
>
> اور میں چاہتا ہوں کہ صاف الفاظ میں واضح کردوں کہ
>
> اُردو اور صرف اُردو
>
> ہماری قومی زبان ہے
>
> اور یہی ایک زبان ہے
>
> جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی
>
> مستحق ہے"
>
> (شہیدِ ملت لیاقت علی خاں
>
> خطبۂ صدارت
>
> جلسہ انجمن ترقی اردو کراچی
>
> ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹ء)

مطبوعاتِ مقتدرہ

دفتری امور		غیر مجلد	مجلد
مختصر اصطلاحات دفتری		۵ روپے	-
دفتری ترکیبات، محاورات اور فقرات کی لغت	مجیب الرحمان مفتی	۶۰ ″	۱۵۰ روپے
دفتری مراسلت (انگریزی ۔ اردو)	ڈاکٹر صدیق شبلی	۲۰ ″	۴۰ ″
سرکاری خط و کتابت (جلد اوّل) (زیر طبع)	″ ″		
″ ″ ″ جلد دوم	ربیعہ فخری / محمد اظہار الحق		
″ ″ ″ جلد سوم	مسعود احمد حبیبہ		
″ ″ ″ جلد چہارم	پروفیسر نیاز عرفان		
محکموں اور اداروں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ″	۲۰ ″
وفاقی و صوبائی عہدوں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ″	۳۰ ″
جدید اردو ٹائپ کاری	سید عرفان علی یوسف	۴ ″	-
اردو ٹائپ کاری (جلد اوّل)	نور احمد شاد	۱۵ ″	-
″ ″ جلد دوم	″ ″	۲۵ ″	-
اصطلاحات حسابداری و محاسبی (دستی ایڈیشن ۔ ۵ روپے)	مسعود احمد حبیبہ	۱۰ ″	۲۵ روپے
اصطلاحات بیمہ کاری	ڈاکٹر سہیل بخاری / حنیظ ملک	۲۰ ″	۳۵ ″
مختصر قانونی اصطلاحات	مولوی فیروز الدین ڈسکوی	۱۲ ″	۲۰ ″
اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری	ایچ ایچ ولسن	۲۵۰ ″	۲۵۰ ″
فرہنگ اصطلاحات و محاورات قانون	مجلس اصطلاحات	۵۵ ″	۶۰ ″
بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۹۵ ″	۱۱۰ ″

مقتدرہ کے دفتری امور

- قرار داد اور قواعد و ضوابط
- مقتدرہ قومی زبان (تعارف)
- سفارشات مقتدرہ
- سالانہ رپورٹیں (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۵)

		غیر مجلد	مجلد
۲۳ ہیئت حاکمہ کی رودادیں (زیر طبع)			
لغات و کتب حوالہ			
۲۴ سائنسی و تکنیکی اصطلاحات	مجلس استناد	۲۵ روپے	۴۵ روپے
۲۵ اصطلاحات فنیات	ذیلی مجلس	۴۰ ″	۶۰ ″
۲۶ اصطلاحات مساحت	سید عارف رضوی	۳۰ ″	۴۰ ″
۲۷ اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد	۱۰ ″	۳۰ ″
۲۸ تعلیمی اصطلاحات	ذیلی مجلس	۴۵ ″	۶۰ ″
۲۹ اصطلاحات ریاضی	ذیلی مجلس ۔ کراچی	۲۷ ″	۶۰ ″
۳۰ اصطلاحات ڈراما	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۱۵ ″	۳۰ ″
۳۱ کشاف اصطلاحات کیمیا	ڈاکٹر ایم اے عظیم	-	۱۲۰ ″
۳۲ کشاف اصطلاحات سائنسی و تکنیکی (زیر طبع)	محمد اسلام نشتر		
۳۳ کشاف اصطلاحات موسمیات ″	سرفراز شاہد		
۳۴ کشاف قانونی اصطلاحات ″	رشید احمد صدیقی		
۳۵ کشاف اصطلاحات سیاسیات (جلد اوّل)	پروفیسر محمد صدیق قریشی	۶۵ ″	۸۰ ″
۳۶ ″ ″ ″ جلد دوم		۷۰ ″	۸۰ ″
۳۷ کشاف اصطلاحات کتب خانہ	محمود الحسن، زمرد محمود	۶۵ ″	۸۰ ″
۳۸ کشاف تنقیدی اصطلاحات	حفیظ صدیقی / آفتاب احمد خان	۱۱۰ ″	۱۴۰ ″
۳۹ کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد اوّل)	جابر علی سید	۳۶ ″	۵۴ ″
۴۰ کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)	وارث سرہندی	۷۵ ″	۸۵ ″
۴۱ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد سوم) زیر طبع ″ ″			
۴۲ ″ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد چہارم) ″	اثر لکھنوی		
۴۳ ″ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد پنجم) ″ ″ ″			
۴۴ اسپرانتو اردو لغت	سعید احمد فارانی	۷۵ ″	۸۵ ″
۴۵ جامع الامثال	وارث سرہندی	-	۱۵۰ ″

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ۰ اسلام آباد

جلد: ۴ مارچ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے کے اہم مضامین

- تحقیق کی راہ دشوار اور مقتدرہ کی رہنمائی
- ترکی میں مطالعۂ اردو
- مغربی ممالک ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز
- اغلاطِ تکلم
- بشیر احمد بلوچ سے ایک ملاقات
- دفاتر میں اردو کا استعمال
- اصطلاحات فلسفہ موجودیت

ماہنامہ
اخبارِ اُردو
اسلام آباد

فہرست

تحقیق کی راہ دشوار اور مقتدرہ کی رہنمائی ۱
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ترکی میں مطالعۂ اُردو ۴
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز ۶
عطش درانی

اعضائے تکلم ۱۰
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

بشیر احمد بلوچ سے ایک ملاقات ۲۹
نصیراء اعظم

دفاتر میں اردو کا استعمال ۳۲
اشفاق الزمان

اصطلاحاتِ فلسفۂ موجودیت ۱۰
محمد امین

اخبارِ اردو کے نام ۳۶

تعارف و تبصرہ ۳۹

قیمت: ۱ روپیہ   سالانہ: ۱۰ روپے

معروضات

مقتدرہ قومی زبان کی بعض مشکلات کا تذکرہ سطور ذیل میں کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ کا تعلق مالی امور سے ہے مثلاً دارالترجمہ کی توسیع، ترجمہ لائبریری کا قیام، شعبہ درسیات کا قیام، مقتدرہ کے لیے مستقل عمارت کا بندوبست اور ملازمین کے لیے بہتر شرائط ملازمت خصوصاً پنشن کی سہولت۔ یہ توسیعی منصوبے ۱۹۸۸ء ہدف کے لیے بھی ضروری ہیں اور اس مقصد کے لیے حکومت کو چاہیے کہ ادارے کو خاص گرانٹ بھی دے۔ تاکہ یہ ادارہ بہتر طور پر ان مقاصد کو پورا کر سکے جن کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے لیے نارمل گرانٹ کافی نہیں اور اس میں بھی کٹوتی کے بعد مقتدرہ کے لیے اپنے روز مرہ کے کاموں کو چلانے میں بھی دقت پیش آ رہی ہے۔

بعض امور کا تعلق انتظامی معاملات کے ساتھ بھی ہے۔ مثلاً افسروں کی تربیت کاری امور کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اس میں مقتدرہ قومی زبان کو بھی مناسب نمائندگی ملنا چاہیے۔ اسی طرح ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کے امتحانات کے بارے میں مدت ہوئی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ عملدرآمد ڈویژن کے سپرد کیا جائے گا لیکن اس پر ابھی تک عمل درآمد نہیں ہوا۔

اسی طرح مقتدرہ قومی زبان کی قرارداد تاسیس بھی نظر ثانی چاہتی ہے، جس کے بارے میں سالانہ رپورٹوں میں مسلسل توجہ مبذول کرائی جاتی رہی ہے۔ اس ادارے کو ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے جن اختیارات کی ضرورت ہے وہ اسے حاصل نہیں بلکہ اس نوع کے بعض دوسرے اداروں سے بھی بعض معاملات میں زیادہ تر اختیار دیے گئے ہیں، جس سے نفاذِ اُردو کی پیش رفت میں بار بار مداخلت اور رکاوٹوں کی نوبت آتی ہے اور اگر واقعی ۱۹۸۸ء میں اردو کو نافذ کرنا مقصود ہے اور حکومت اس معاملے میں اس ادارے سے کوئی کام لینا چاہتی ہے تو یہ اشد ضروری ہے کہ ادارہ ایک فعال قوت کے طور پر اپنے مقاصد پر عمل پیرا ہو

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد مقتدرہ قومی زبان۔ شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۲۰-ڈی (غربی) بلیو ایریا، ایف ۶/۱، اسلام آباد — طابع: برق سنز پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

تحقیق کی راہ دشوار اور مقتدرہ کی رہنمائی

تحقیق کا کام مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے:

۱۔ پہلا مرحلہ موضوع کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ تحقیق کا میدان کوئی ہو موضوع ایسا ہونا چاہیے جس میں تحقیق کا فیضان زیادہ وسیع دائرے میں عام ہو سکے اور اگر فیضان دائمی نہ ہو تو دیرپا ضرور ہو اور اگر حرف آخر ثابت نہ ہو سکے تو آئندہ کسی تحقیق کی مضبوط بنیاد ضرور بن سکے۔ انتخاب موضوع کا یہ مرحلہ اساتذہ کی رہنمائی میں بہ آسانی طے ہو جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا مرحلہ متعلقہ ضروری مآخذ کی تلاش کا ہوتا ہے۔ عام طور پر استاد اہم اور ضروری مآخذ و مراجع تک رہنمائی کر دیتا ہے۔ آگے یہ مرحلہ طالب علم یا ریسرچ اسکالر کا ذوق طے کراتا ہے۔ اگر موضوع کا کسی مقام سے بھی مطالعہ شروع کر دیا جائے تو پردے اٹھنے لگتے ہیں مراجع یکے بعد دیگرے نمایاں ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام مآخذ تک رہنمائی ہو جاتی ہے۔

۳۔ لیکن اس سے آگے کا مرحلہ دشوار ہوتا ہے۔ یعنی ضروری مآخذ سے استفادہ اور رطب و یابس سے بچ کر ضروری مواد تحقیق کا اخذ کر لینا۔ یہ مرحلہ ہمت شکن ہوتا ہے اور راہ پُر پیچ اور مشکلات سے پُر ہوتی ہے۔ اس میں ملک و بیرون ملک کے اشخاص کی معلومات اور کتب خانوں سے استفادہ، نادر و نایاب کتب اور مواد تحقیق کا حصول شامل ہے۔

آج کل پاک و ہند کی تاریخ، سیاسیات، تعلیم، فنون، اشخاص، اقوام، تحریکات پر کسی چھوٹے سے چھوٹے دائرے میں بھی کام کیا جائے اس کا مواد ایشیا و یورپ کے بیسیوں ممالک کے علمی و تاریخی خزائن میں اس طرح منتشر ملے گا کہ ایک محقق، خصوصاً ہمارے ملک میں معاشرے کے جس طبقے سے لوگ تحقیق کے میدان میں آتے ہیں، ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ ان کے لیے تو اپنے ملک ہی کے تمام مآخذ تک بذات خود ایک مرتبہ بھی پہنچنا ممکن نہیں ہوتا اور بالفرض ایک مرتبہ پہنچ بھی جائیں تو مطالعہ و تحقیق کے لیے فرصت و فراغت محدود ہوتی رہتی ہے اس لیے حسب ضرورت قیام کو طول نہیں دیا جا سکتا۔ گھر کے علمی و تعلیمی ادارے سے کوئی مدد نہیں ملتی، ضرورت کی ہر کتاب خریدی نہیں جا سکتی۔ متعلقہ اداروں، کتب خانوں، عجائب گھروں میں بیرونی اسکالروں کو مواد کی فراہمی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اسکالر مراسلت کے لیے مستعد ہوتا ہے لیکن اول تو مراسلت سے تحقیق کا کام نہیں چلتا۔ کوئی نئے مواد کی نشاندہی نہیں کرتا۔ خوف ہوتا ہے کہ نشاندہی کے بعد فراہمی مواد کا مطالبہ ہوگا عزم و ذوق، تعاون کی کمی، ہمت افزائی کا فقدان، ریسرچ اسکالر کے وسائل محدود اور بعض اوقات مفقود قدم قدم پر رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ اس مرحلے میں تحقیق کا کام بہت سست رفتاری سے آگے بڑھتا ہے اور بہت سے شائقین جو تحقیق کا پکا عزم رکھتے ہیں۔ اس مرحلے میں ہمت ہار دیتے ہیں اور تحقیق کو ایک بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو کئی کئی سال کی محنت اور بہترین ذہنی و دماغی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

ان حالات میں اگر کوئی کام انجام پاتا بھی ہے تو اس میں تحقیق کا معیار اور جامعیت نہیں ہوتی۔ ریسرچ اسکالر اپنے مطالعہ و تحقیق کے بہترین نتائج کو عمدہ انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ انہی حالات کا نتیجہ ہے کہ ایک رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ موضوع تحقیق ایسا ہو جس پر مواد کم اور کسی ایک جگہ موجود ہو بلکہ بالکل نہ ہو تو اور خوشی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی دیوان کا مخطوطہ منحصر فرد ہو تو کیا کہنا!

تحقیق کا سفر عام طور پر ایک شخص کرتا ہے اور اسی کا ذوق اس سفر کا رہنما ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحقیق کا کام ایک شخص کے انجام دے لینے کا نہیں ہوتا۔ اس میں مختلف اشخاص اور اداروں کا تعاون اور ان کی رہنمائی شامل ہوتی ہے۔ اگر یہ کام ایک ہی شخص کا شمار ہو اور دوسروں کی رہنمائی اور تعاون سے بے نیاز قرار پائے تو ہمیں تحقیق کے معیار اور جامعیت سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا طریق کار اختیار کیا جائے کہ راہِ تحقیق کی رکاوٹیں اور مشکلات دور ہوں، اہم علمی اور دائمی افادیت کے موضوع منتخب کیے جائیں اور جو تحقیقی مقالات لکھے جائیں وہ تحقیق کے معیار پر بھی پورے اتریں اور اس سے آگے بڑھ کر ان مقالات کی اشاعت کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ مجرد اس انتظام سے کہ ہر مقالہ لازماً شائع ہوگا اور اس پر نقد و تبصرہ سے کسی کے قلم کو روکا نہیں جا سکتا۔ محققوں اور مقالہ نگاروں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔

لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ معاشرے میں ایسے اشخاص اور ادارے ہونے چاہییں جو مواد کی نشاندہی اور اس کی فراہمی میں مدد کریں۔

یہ کام صرف اسی وقت انجام دینے کا نہیں ہوتا جب کوئی طالب علم کسی صاحب علم کے دروازے پر دستک دے یا کسی علمی و تحقیقی ادارے یا کتب خانے میں داخل ہو۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون ان کے ذیلی و ضمنی مباحث و موضوعات، علمی، ادبی، تاریخی شخصیات، علمی، تعلیمی، تاریخی، سیاسی، سماجی، اصلاحی، مذہبی تحریکات پر ضروری اور اہم مواد اور ان کے خزائن کی نشاندہی کر دی جائے، یعنی مختلف علوم و فنون، اشخاص و تحریکات پر کتابیات مرتب کر دی جائیں اور علمی و تحقیقی اداروں اور کتب خانوں میں ایسا انتظام کیا جائے کہ ان مآخذ میں جس مواد کی نشاندہی کی گئی ہو، اس کی فراہمی کا مناسب انتظام بھی ہو۔

اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ جن اداروں میں تحقیق کروائی جا رہی ہے ان میں ایک شعبہ ایسا ضرور ہو جو اپنے طلبہ اور ریسرچ اسکالر کے لیے ملک اور بیرونِ ملک کے علمی ذخائر و خزائن سے مواد کی فراہمی میں طلبہ کی رہنمائی اور ان کی مدد کرے بلکہ ہر یونیورسٹی اور اس کی ہر فیکلٹی میں تحقیق کا ایک بنیادی شعبہ ہو جو اس بارے میں رائے دینے کا مجاز بھی ہو کہ اس موضوع میں جو طالب علم اختیار کرنا چاہتا ہے کتنی وسعت و گنجائش ہے۔ اس کی کیا افادیت اور اہمیت ہے، اس موضوع پر کام کرنے کی شائق و طالب تحقیق میں کتنی صلاحیت ہے۔ نیز اس موضوع پر کتنا اور کہاں مواد حاصل ہو سکتا ہے اور اس مواد کے حصول کے لیے طالب علم کے حالات و وسائل کیا ہیں اور وہ شعبہ خود اس سلسلے میں طالب علم کی کیا مدد اور خدمت کر سکتا ہے! اس شعبے کی رپورٹ ہی پر موضوعِ تحقیق کی منظوری دی جائے اور جامعہ کے تحت اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت ہو۔ آج کل یونیورسٹیوں میں اس سلسلے میں جو پروسیجر اختیار کیا جاتا ہے وہ اس درجہ ناقص ہے کہ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمام خدمت کوئی ایک ادارہ انجام نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر کوئی ادارہ خاص اسی مقصد سے قائم کر دیا جائے تو وہ تحقیق کے تمام مراحل میں طلبہ کی رہنمائی اور ان کے کاموں پر تعاون کرے گا۔ لیکن ایسا کوئی ایک ادارہ سارے ملک کے علمی تحقیقی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہ ادارے ہر جامعہ کی ہر فیکلٹی میں ہونے چاہییں۔ البتہ اگر ملک کے تمام موجودہ علمی، تحقیقی ادارے، کتب خانے، جامعات اور بیرونی جامعات اس علمی قومی ضرورت کو محسوس کریں تو تحقیق کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف تحقیق کی رفتار تیز ہو سکتی ہے بلکہ معیار و جامعیت کی خوبی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان واحد ادارہ ہے جس نے سب سے پہلے اس علمی قومی ضرورت کا احساس کیا ہے اور اپنے صدر نشین کے کامل علمی و تحقیقی شعور کی روشنی میں علمی، ادبی، تاریخی موضوعات اور شخصیات و تحریکات پر مواد کی نشاندہی اور مختلف علوم و فنون کی کتابیات کی تالیف و اشاعت کے ایک جامع منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

مقتدرہ قومی زبان نے گزشتہ دو سال کے اندر جو کام کیے ہیں وہ نہ صرف مقدار کے لحاظ سے بلکہ معیار و جامعیت کے لحاظ سے بھی ایسے ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ بعض کام جو میری نظر سے گزرے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ عربی اصطلاحات سازی (محمد طاہر منصوری)
۲۔ کتابیات تراجم (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ)
۳۔ اردو اصطلاحات سازی

کتابیات قواعد

کتابیات اردو املا اور دوسرے مسائل

پاکستان کے اردو اخبارات و رسائل (جلد اول، نثر و السن

پاکستان کے اردو اخبارات و رسائل (جلد دوم)

کتابیات قانون (عطش درانی)

اُردو میں لغت سازی

فارسی اصطلاحات سازی (سید عارف نوشاہی)

اس فہرست کی نمبر ۳، ۴، ۵، ۷ اور ۹ خاکسار راقم الحروف کی مؤلفہ و مرتبہ ہیں۔

ترتیب و تدوین کا سلسلہ وغیرہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے لیکن یہ مقتدرہ کی کل گزاری نہیں، اس کی عظیم الشان خدمات کا ایک حصہ اور مقتدرہ علوم و فنون اور علمی و تاریخی شخصیات اور تحریکات پر کام انجام پا رہے ہیں ان کے علاوہ علمی قومی رجال کی کتابیات کی تالیف و اشاعت کا ایک بہت اہم منصوبہ زیر تکمیل ہے۔

بعض نہایت مفید کام دوسرے اداروں نے بھی انجام دیے ہیں مثلاً انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی)، کا جامع سلسلۂ قاموس الکتب جس کی تین جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ہمیں ان خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں قومی زبان کے بارے میں اہم تاریخی دستاویزات کی

پاکستان کا ایک پارلیمانی وفد حال ہی میں بیرونی ملکوں کے دورے کے بعد وطن واپس آیا ہے وفد کے ایک رکن خواجہ محمد صفدر نے بیان کیا ہے کہ جب وہ برطانوی دارالعلوم کے سپیکر سے ملاقات کر کے ان کے ایوان سے باہر نکلنے لگے تو دارالعلوم کے سپیکر بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ پاکستانی مسلمانوں نے کہا "حضرت آپ کیوں زحمت کرتے ہیں" اس پر برطانوی دارالعلوم کے اسپیکر نے نہایت شستہ اردو میں جواب دیا "آپ ہمارے بھائی بند ہیں میں آپ کو دروازے تک چھوڑنے جاؤں گا"

اب تو خیر برطانیہ میں اردو کا خاصہ عمل دخل ہو چکا ہے کئی اخبار و جرائد اردو میں چھپ رہے ہیں برطانیہ میں اُردو کے کئی قابل ذکر اہل قلم موجود ہیں۔

ہمارے کئی سیاسی لیڈر جو گزشتہ آٹھ نو برس سے وہاں مقیم تھے اردو ہی میں تقریریں اور جلسے کرتے رہے ترقی پسند اہل قلم نے بھی اپنی کانفرنس کے لیے لندن ہی کو منتخب کیا۔

اردو کے مشہور انگریز اسکالر پروفیسر رالف رسل نے برطانیہ میں اردو سکولوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ سید میر حضرت شاہ اور ان کے رفقاء بریڈفورڈ میں ایک عالمی اردو کانفرنس کا ڈول ڈال رہے ہیں زمین دوز ریلوے (ٹیوب) میں جو آواز میں کان میں پڑتی ہیں وہ عموماً اردو، بنگلہ اور پنجابی آوازیں ہوتی ہیں کیونکہ انگریز تو سفر میں بولتا ہی نہیں سو جو آواز ہمارے کان میں پڑتی ہے وہ ضرور انگریزوں کے کان میں بھی پڑتی ہوگی اور وہاں تو لوگ بڑے بڑے ٹیوب اور بس ہی میں سفر کرتے ہیں بوڑھے ہی سہی مگر برطانیہ میں ابھی تک وہ انگریز بھی موجود ہیں جو بھارت میں دکانداری یا ڈپٹی کمشنری کر چکے ہیں۔ پھر چھاؤنیوں میں گورا فوج کے سپاہی لال کرتیوں میں تھوڑی بہت اردو سیکھ لیتے تھے۔ انگریز افسر کو مقامی زبانیں سیکھنے کا خصوصی بھتہ ملتا تھا لہذا کچھ عجب نہیں کہ دارالعلوم کے سپیکر نے بھارت کے بھتے پر ہی اُردو زبان میں کچھ شُد بُد پیدا کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پاکستانی وفد کے ساتھ رد من اردو میں اردو بول رہے ہوں جس طرح دوسری جنگ عالمگیر میں لارڈ مونٹ بیٹن جنوب مشرقی ایشائی کمان میں اپنی سپہ سالار کے زمانے میں خطاب کیا کرتے تھے۔ تقریر کا مسودہ اردو زبان کے صاحب طرز ادیب میجر (مولانا) چراغ حسن حسرت نہایت آسان اردو میں لکھ دیتے کیپٹن (اب ریٹائرڈ کرنل) مسعود احمد اس کو رومن اردو میں ڈھال دیتے اور سپریمو (لارڈ مونٹ بیٹن)، ریڈیو سے یا پریڈ پر سپاہیوں کے سامنے فرفر پڑھ ڈالتے۔

(روزنامہ امروز لاہور ۶-۱۲-۱۹۷۵)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (ترکی)

ترکی میں مطالعۂ اُردو

ہمارے ہاں کسی بے خبر "دانا" کا یہ قول ضرب المثل بنا رہا ہے کہ:

"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم!"

ترکیہ و پاکستان کی دوستی بھی اسی روایتی انداز میں مثالی کہی جاتی رہی ہے اردو اور ترکی زبانوں کے براہ راست مطالعے اور تقابل پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ان زبانوں کا مطالعہ کچھ ہوا بھی ہے تو انگریزی زبان کے ذریعے، یعنی ستان میں ترکی انگریزی کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔ کتابیں انگریزی میں ں جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ مشترکہ ذخیرۂ الفاظ کے معنی بھی انگریزی میں سمجھائے جاتے .. ماہرین کو اس کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ قواعد کے لحاظ سے بھی ترکی ریزی کے مقابلے میں اردو کے زیادہ قریب ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو س سے .. زیادہ ترکی اردو کے نزدیک آجاتی ہے۔ عثمانی دور کی ترکی تو ی اور فارسی ذخیرۂ الفاظ کو زیادہ سے زیادہ جذب کر لینے کی وجہ سے مشترکہ رسم الخط کی بدولت اردو سمیت مشرق وسطیٰ کی زبانوں کے قریب ہی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس خطے کی اور باتوں پر زیادہ زور دیا گیا لسانی اشتراک کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ اب کچھ اس سلے کی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جو انشاء اللہ مزید کاوشوں کے لیے زمین ار کریں گی۔

انقرہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ بیس پچیس سال پہلے قائم ہو گیا تھا۔ استنبول یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ انقرہ اور استنبول میں بت پاکستان نے اردو اور مطالعۂ پاکستان کی چیئرز قائم کی ہیں اسے "دیر آید درست ۔" ہی کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ آر۔ سی۔ ڈی کی اکثر مطبوعات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا رہا ہے کہ جہاں ایران کی قومی زبان فارسی ہے اور ترکیہ کی می زبان ترکی ہے، وہاں پاکستان کی قومی زبان انگریزی ہے۔ یہ ہمارے من صاحب لوگوں کی کرشمہ سازی تھی کہ جن کا اوڑھنا بچھونا انگریزی رہی ہے ر جو یہ بھی اندازہ نہ کر سکے کہ جس مقصد (آر۔ سی۔ ڈی) کی تقویت کی خاطر وہ یہ لٹریچر چھپواتے ہیں اس سے کئی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ایران اور ترکی کے لوگ اپنی اپنی قومی زبانوں کے بارے میں بڑے حساس ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ہر ملک اپنی اجتماعی قومی زندگی میں اپنی قومی زبان کو وہی حیثیت دیتا ہے جو انہوں نے اپنے ملکی، دفتری، تعلیمی اور نجی معاملات میں فارسی اور ترکی کو دے رکھی ہے۔ مگر پاکستان کی قومی زبان کون سی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا اظہار دبی زبان سے (بر بنائے دوستی) یہاں کے لوگ کرتے ہیں۔ استنبول میں میرا پہلا سیمینار لیکچر ہی لسانی مسائل پر تھا اور بھری مجلس میں تو نہیں مگر بعد میں چائے کے موقع پر کچھ اسکالروں نے یہ "راز" کی بات پوچھ ہی لی کہ پاکستان کی سرکاری زبان کون سی ہے؟ مجھے ایک سال کے دوران اکثر محفلوں میں اس استفسار سے وابستہ پڑا تو حیرت ہوئی کہ جن ملکوں سے ہمارے تعلقات انتہائی خوشگوار کہے جا سکتے ہیں وہاں بھی ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کچھ کم نہیں۔ اس کا باعث ہمارے بعض ملکی "صاحبوں" کی روایتی سہل انگاری اور انگریز سے زیادہ انگریزی اور انگریزیت کی پرستش رہی ہے۔ یہ تو نہیں کہ ایران اور ترکی کے لوگ یورپی زبانوں سے نفرت کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ترکی یونیورسٹی میں کئی یورپی زبانوں کے شعبے ہیں۔ خصوصاً جرمن اور فرانسیسی کے شعبے مقبول ہیں اور اب انگریزی کی طرف بھی زیادہ توجہ دی جا رہی ہے مگر یہ مطالعہ ان زبانوں سے محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ افادیت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ پاکستان میں بھی صاحب فہم لوگ اس افادیت کے منکر نہیں اور اسی لیے انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کی مؤثر تدریس پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اپنی قومی زبان کے جلد از جلد نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، جس کی معقولیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شریف تعلیمی کمیشن (۱۹۵۹ء) اور نور خان تعلیمی کمیشن (۱۹۶۹ء) کی سفارشات میں بھی اسی موقف کو اختیار کیا گیا تھا۔ مگر مقتدر

صاحبوں کے تاخیری حربوں کی بدولت ہم اپنی قومی زبان کو ملکی معاملات میں وہ مقام نہ دے سکے جس کی آرزو قائدِ اعظم کو تھی۔ چالیس برس گزر گئے اور ابھی قومی زبان اپنے نفاذ کے لیے تختِ طاؤس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ تاہم ملک سے زیادہ بیرونِ ملک میں اردو زبان و ادب کی مقبولیت پر نظر جاتی ہے تو تعجب انگیز مسرت ہوتی ہے۔

اس ہفتے مجھے ایشیائے کوچک کے تاریخی شہر قونیہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی زیارت کے لیے جانا نصیب ہوا، تو وہاں جاکر سلجوق یونیورسٹی کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ سلجوق یونیورسٹی ترکیہ کی نئی یونیورسٹی ہے جس کی عمر ابھی دس سال ہے۔ ابھی اس کا نیا کیمپس بن رہا ہے۔ مگر اپنے محدود وسائل کے اندر یہ یونیورسٹی مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کے فروغ و ترقی کا پروگرام شروع کر چکی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے شعبوں کے ساتھ اردو کا شعبہ بھی قائم ہو چکا ہے جس کی ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ سلجوق یونیورسٹی کئی لحاظ سے ترکیہ کے نظامِ تعلیم میں اہم مقام حاصل کر سکے گی۔ ایک تو قونیہ کا قدرتی محلِ وقوع ہے کہ یہ ایک پرسکون خطۂ ارضی ہے۔ اس کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہے کہ سلجوقی دور میں قونیہ ایک بڑی سلطنت کا مرکز رہا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی زیارت یہاں ہے جن کا علمی اور وجدانی فیض مشرق کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ یونیورسٹی کے ریکٹر خلیل جن (HALIL GIN) اور ڈین فیکلٹی فن و ادبیات خالوق آنل (HALUK ANIL) سے میری گفتگو ہوئی اور ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ صاحب اپنی یونیورسٹی کے اس تاریخی، علمی ماحول کی پوری طرح بصیرت رکھتے ہیں اور اس کے حوالے سے سلجوق یونیورسٹی کو مشرقی اور مغربی علوم کی اعلیٰ تحقیق کا مرکز بنانے کے آرزومند ہیں۔ مولانا رومیؒ سے علامہ اقبالؒ کے ذہنی و قلبی تعلق کی بنا پر عربی و فارسی کے ساتھ یہاں اردو زبان کے مطالعے کو بھی خاص اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ مئی ۱۹۸۷ء میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے سلسلے میں ایک کانفرنس کا پروگرام بن رہا ہے۔ پاکستان کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ شعبہ اردو کے فروغ کے لیے بھی انہیں توقع ہے کہ اس بارے میں انہیں پاکستان کا تعاون حاصل ہو جائے گا۔

عربی، فارسی اور اردو کے شعبے ابھی نئے ہیں اور ان کی سربراہی ڈاکٹر ایرکان ترکمان کر رہے ہیں جو ترکی، فارسی، انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی وسیع درک رکھتے ہیں۔ ترکی میں اردو زبان و ادب پر ان کے کئی مقالات چھپ چکے ہیں۔ مجھے ان کے بعض مقالات دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اردو ادب (خصوصاً غالب، اقبال اور سجاد حیدر یلدرم) پر ان کے تحقیقی مقالات سے میں بہت متاثر ہوا۔ اُن کی سربراہی میں سلجوق یونیورسٹی کا شعبہ اُردو ان شاء اللہ پھلے پھولے گا۔

ترکی میں اردو زبان کے مطالعے کا سلسلہ انقرہ، استنبول اور قونیہ میں پائیدار بنیادوں پر استوار ہو جائے اور اردو مطالعۂ پاکستان کو اختیاری مضمون کے طور پر مقبولیت حاصل ہو تو یہ امر ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کے استحکام کے لیے ذہنی و فکری غذا مہیا کرے گا ان شاء اللہ۔

پڑھو تم اپنی زبان میں کہ فن کی ہو تسہیل
تمہاری منزلِ مقصود کی یہی ہے سبیل

مترجموں کی ہو محنت ذریعۂ تحصیل
ہر ایک قوم کے پہلے یہی ہوئے ہیں کفیل

زبانِ غیر کو پڑھ پڑھ کے وقت کھوتے ہو
یہ تم ترقیوں کے حق میں کانٹے بوتے ہو

مرزا محمد جعفر اوج۔ معراج الکلام
مرتبہ سرفراز شاہد شبیر (لکھنؤ ۱۹۲۵ء)
(بشکریہ: جناب محمد رضا کاظمی)

عطش درانی

مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز (۳)

اور

انگریزی زبان میں ترجمے کے ذرائع

ایسے سائنسدانوں اور محققوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جن کی زبان
نگریزی نہیں۔ بعض تو سرے سے انگریزی ہی سے نابلد ہیں۔ چنانچہ
ب دنیا میں کئی تحقیقات بیک وقت مختلف زبانوں اور ملکوں میں انجام دی
اتی ہیں۔ جن سے انگریزی زبان کے اکثر سائنسدان لاعلم ہی رہتے ہیں۔
۱۹۸ء میں ایک سروے کے مطابق اوسطاً ۱۸ فیصد ایسے تحقیقی کام سامنے
ئے جو بیک وقت ایک سے زیادہ زبانوں میں انجام دیے جا رہے تھے
س طرح غیر ضروری اعادہ و تکرار سے سائنسی علم دوچار رہوا
Engineering Index سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صرف انجینئرنگ ہی
یں سائنس کا ۲۸ فیصد تحقیقی کام انگریزی کے سوا دوسری زبانوں میں ہوا ہے
ذکورہ اشاریے کی ہر جلد میں سال میں ایک لاکھ پندرہ ہزار مقالات کا
ندراج ہوتا ہے۔ ان میں سے ۳۲ ہزار مقالے انگریزی کی بجائے دوسری
زبانوں کے ہوتے ہیں۔ یہ تعداد اس کے علاوہ ہے جو "انڈکس" میں
درج ہی نہیں ہو پاتی۔ خصوصاً ترقی پذیر ممالک کی زبانوں میں شائع
ہونے والے مقالے، جن کا کوئی بھی رابطہ انگریزی زبان سے نہیں۔
اسی طرح برٹش لائبریری کے ایک سروے کے مطابق روسی زبان
میں انجینئرنگ کے بہت سے اہم مقالات طبع ہوتے ہیں لیکن انگریز ماہرین
کی ۹۳٫۵ فیصد تعداد ان سے ناواقف رہتی ہے۔

یورپ کے جو ملک اپنے جرائد میں تراجم شائع کرتے ہیں وہ بھی لاتعداد
ہیں۔ بعض علمی جرائد بیک وقت دو زبانوں (ملکی زبان اور انگریزی زبان) میں
بھی چھپتے ہیں، بعض انگریزی، فرانسیسی، جرمن میں بھی اپنے مقالات
یا ان کے خلاصے چھپاتے ہیں۔ ان جرائد میں روسی اور جاپانی سرفہرست
ہیں۔ روسی جریدہ Radio Tekhnika جو ریڈیو انجینئری کے
بارے میں ہے، ترجمے بھی شائع کرتا ہے۔ ایک اور روسی رسالے
Izvestiqa VUZ Tsvetnaya Metallurgiya کا
ترجمہ ایک دوسرے نام
Soviet Nonferrous Metal Research
سے شائع ہوتا ہے۔ اسی طرح جاپان میں
Reports of the Electrical Communications
Laboratory
متعدد غیر ملکی زبانوں کے مقالوں کے تراجم اور خلاصے چھاپتا رہتا ہے۔ مغربی جرمنی
کا رسالہ Kustoffe بعض مضامین کے تراجم اور خلاصے انگریزی میں
بھی شائع کرتا ہے۔ ان منتخب تراجم کے علاوہ بعض جرائد صرف تراجم کے
لیے مخصوص ہیں۔ روسی جریدہ Referativnyi Zhuranal
ایسا ہی جریدہ ہے جس میں خلاصے بھی شائع ہوتے ہیں اور تراجم بھی۔

ایسے دو زبانی جرائد کی ایک مفصل فہرست ۱۹۷۸ء میں نیدرلینڈ کے
عالمی مرکزِ ترجمہ نے ڈیلفٹ سے
Journals in Translations کے نام سے شائع کی ۱۹۸۲ء میں
اس کا تیسرا ایڈیشن بوسٹن سے برٹش لائبریری (BLLD) کے تعاون سے
چھاپا گیا۔ اس کاوش میں روسی اور جاپانی اداروں کو بھی شریک کیا گیا تھا۔
اس میں ۹۸۲ جرائد کی فہرست دی گئی ہے۔ ان کو الفبائی ترتیب
سے موضوع وار درج کیا گیا ہے آخر میں جرائد کے پورے نام کا اشاریہ بھی
شامل ہے۔ اشاریہ کمپیوٹر کی مدد سے کوئک (KWIC) انداز سے مرتب

کیا گیا ہے، یعنی کلیدی لفظ متن میں رکھا گیا ہے۔

نمونے کا ایک صفحہ ملاحظہ ہو:۔

ENGINEEI

225	ENGINEERING	Cybernetics	U
220	ENGINEERING	Journal	U
91	ENGINEERING	Journal	U
...	ENGINEERING	Review	
321 Institute for Geological and Geophysical Research Bulletin Series B	ENGINEERING	Geology and Hydrology	
326 International Chemical	ENGINEERING		
327 International Civil	ENGINEERING		
303 Ishikawajima	ENGINEERING	Review	
320 Izvestiya VUZov Radio	ENGINEERING		
2 Journal of Abstracts Electrical	ENGINEERING		
384 Journal of	ENGINEERING	Physics	
386 Journal of	ENGINEERING	Physics	
393 Machine Tool	ENGINEERING	and Production News	
339 News of Higher Educational Institutions Radio	ENGINEERING	Serie	
523 Power	ENGINEERING		
524 Power	ENGINEERING	Journal	
523 Power Generation	ENGINEERING		
581 Radio	ENGINEERING		
582 Radio	ENGINEERING		
583 Radio	ENGINEERING	and Electronic Physics	
584 Radio	ENGINEERING	and Electronics	
585 Radio	ENGINEERING	and Electronics	
586 Radio	ENGINEERING	Series	
600 Railway Research and	ENGINEERING	Bulletin	
606 Railway Research and	ENGINEERING	News Section D	
607 Railway Research and	ENGINEERING	News Section I	
600 Review of Electrical	ENGINEERING		
607 Review of the General Meeting (Technical Session) Japan Cement	ENGINEERING	Association	
614 Russian	ENGINEERING	Journal	
680 Selections on Hydrogeology and	ENGINEERING	Geology in Communist China	
690 Soil Mechanics and Foundation	ENGINEERING		
702 Soviet Electrical	ENGINEERING		
703 Soviet Electrical	ENGINEERING		
706 Soviet	ENGINEERING	Journal	
707 Soviet	ENGINEERING	Research	

"جرنلز ان ٹرانسلیشن" کا ایک صفحہ

اسپیشل لائبریری ایسوسی ایشن نیویارک نے بھی ۱۹۷۲ء میں جرائد کی ایک کتابیات A Guide to Scientific and Technical Journals in Translations کے نام سے شائع کی۔ اس کے مرتبین C.J.Brocinar اور C.J.Hinnebsbach تھے۔ اس میں کتابیاتی تفاصیل کے علاوہ تراجم کا تنقیدی جائزہ بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۹۸۵ء میں ایک اور فہرست پی اے الیگزینڈر نے سائنس ریفرنس لائبریری، لندن کی طرف سے Journals with Translations held by the Science Reference Library کے نام سے شائع کی۔

جرائد اور اشاریوں کے علاوہ ایسی فہارس بھی ملتی ہیں جو مختلف ادارے چھاپتے رہتے ہیں۔ برطانیہ میں مندرجہ ذیل اداروں کی فہرستیں قابل توجہ ہیں:۔

Blue Circle Industries Ltd. Greenhithe. Kent
British Cast Iron Research Association Alvechurch. Birmingham

British Gas Corporation, London

Technical Help to Exporters. British Standards Institution. Milton Keynes

Overseas Relations Branch. Electricity Council, London

Health and Safety Executive, Explosion and Flame Laboratory, Buxton

Translations Service, Metals Society, London

Motor Industry Research Association, Nuneaton

Translations Department. PIRA, Leatherhead
Property Services Agency Whitgift Centre, Croydon

Steel Casting Research and Trade Association, Sheffield.

Translations Dept., Water Research Centre, Medmenham
Welding Institute, Abington, Cambridge

برطانیہ میں برٹش لائبریری (BLLD)، امریکہ میں قومی مرکز ترجمہ اور یورپ میں عالمی مرکز ترجمہ (نیدر لینڈ) تراجم کے اشاریے شائع کرنے میں سرگرم ہیں۔ ذیل میں ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

برٹش لائبریری (BLLD)

برٹش لائبریری میں تراجم کا وسیع ذخیرہ ہے۔ اس میں امریکی مراکز ترجمہ اور عالمی مرکز ترجمہ میں جمع ہونے والے تراجم کی نقول بھی مزاہم ہیں۔ (BLLD) اپنا ماہنامہ بلیٹن بھی شائع کرتا ہے۔ جسے British Reports, Translations and Thesis. کا نام دیا گیا ہے۔ ابتداء میں اس کا نام BLL Announcement Bulletin

جو ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ پھر ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں یہ NLL Announcement Bulletin کے نام سے اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک NLL Translation Bulletin کے نام سے شائع ہوا۔

لندن میں ASLIB کی طرف سے غیر مطبوعہ تراجم کا اشاریہ بھی فراہم ہے۔ یہ اشاریہ کارڈوں پر ہے ۱۹۸۴ء تک ASLIB کے پاس ۴۰۰ سے زائد اداروں کے تراجم پر مشتمل ۵ لاکھ کارڈ تھے۔ ان میں BLL اور امریکی قومی مراکز کے تراجم کی تفصیلات ان میں خاص طور پر اہم ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۴ء سے اسلیب کا اشاریہ عالمی مرکز ترجمہ کے سپرد کیا جا چکا ہے۔

۲۔ امریکہ کے قومی مراکز ترجمہ (NTC)

امریکہ کے قومی مرکز ترجمہ (شکاگو) کی طرف سے ایک اشاریہ Translations Register Index کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ۱۹۶۸ء سے جاری ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک اسے Technical Translations کے نام سے جاری کیا جاتا تھا لیکن اب اس کا نام بدل کر "ٹرانسلیشن رجسٹر انڈیکس" کر دیا گیا ہے اس میں اندراجات موضوع کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ اس میں جرائد کے پورے نام اشاریے میں دیے جاتے ہیں۔ یہ اشاریہ کمپیوٹر کی مدد سے ترتیب پاتا ہے۔ اس انڈکس کے اب تک اٹھارہ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ عالمی مرکز ترجمہ (نیدرلینڈ)

عالمی مرکز ترجمہ کی معلومات Government Publications Research Service امریکہ سے بھی دستیاب ہے۔ تراجم کے بارے میں ان کا اشاریہ مائیکروفش کی صورت میں ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء تک ادارے نے ۲۵۰۰ فش شائع کی ہیں۔ اس میں اشاریے کے علاوہ ۸۵۹۸۰۰ کارڈ پورے پورے مضامین پر مبنی ہیں۔ جن میں سے زیادہ کا تعلق سماجی اور سیاسی علوم سے ہے۔

عالمی مرکز ترجمہ (نیدرلینڈ) کی طرف سے بیل اور ہوول ماہانہ World Transindex شائع کرتے ہیں۔ یہ اشاریہ ۱۹۷۸ء سے شائع ہو رہا ہے پہلے یہ دو جریدوں کی صورت میں تھا۔

World Index of Scientific Translations کے نام سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۷ء تک اور پھر Translations Bulletin کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دونوں جریدے ہر ماہ مشرقی یورپ کی زبانوں کے تقریباً دو ہزار تراجم کا اشاریہ پیش کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء سے اس میں ہسپانوی تراجم بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ اب اس میں ایک اور جریدہ Bulletin of Translations بھی ضم کر دیا گیا ہے۔ سال میں Transindex کے گیارہ عام شمارے شائع ہوتے ہیں اور بارہواں ان گیارہ پرچوں کا جامع اشاریہ ہوتا ہے۔

ترجمہ شدہ کتابوں کی فہرستیں یوں تو کانگرس لائبریری کیٹلاگ Books in Print اور برطانیہ کی شائع کردہ National Bibliography سے حاصل ہو سکتی ہیں لیکن BLL بھی اپنے اشاریے میں کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ تاہم دنیا بھر کی زیادہ سے زیادہ جامع معلومات ہمیں یونیسکو کے اشاریے Index Translationum سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ اشاریہ سالانہ ہے۔ اس میں ترجمہ شدہ کتابیں ملکوں کے حوالے کے تحت درج ہوتی ہیں اور آخر میں مصنفین کا اشاریہ دیا جاتا ہے لیکن اس میں ایک کمی یہ ہے کہ موضوعات کا اشاریہ شامل نہیں کیا جاتا۔ اس لیے مطلب کا مواد تلاش کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس کمی کو ایک دوسرا وسیلہ پورا کرتا ہے کو گریٹ بٹلر نے ۱۹۷۹ء میں نیویارک سے Translations and Translators شائع کی۔ اس میں دنیا بھر کے انگریزی مترجمین، ترجمے کے اداروں، ایجنسیوں کے موضوعات اور ادبیات کی طویل فہرست شامل ہے جس کی مدد سے ضروری معلومات مل سکتی ہیں۔

BIBLIOGRAPHY

1. Anthony, L.J., (ed)., Information sources in engineering, Butterworths, London,(sec ed) 1985, PP. 90-98.

2. "ASM translation index"(1977). (American Society for Metals).

3. Birch, J.B., Tracking down translat... "Aslib Proceedings" 31,(11)P P 500-511.(1979).

16. Ingle, N.C., Language Identification table (TTI ltd.), 1981.

17. Large, J.A., The Foreign Language Barrier, Andre Deutsch, London, 1983,

18. Morton, B. JPRS and FBIS Translations Polycentrism at the reference desk. Reference services Review". 11(1) PP.99 110 (1983).

19. Mount, Ellis (ed), Role of translation in sci - Tech library, The Haworth press, N.Y., 1983. PP.3-20, 31-46.

20. Nedic, Z. and McCoy, B.Sc. EI's inside look at technical Translation, "Science and Technology libraries". 1982 3(2)P.57.

21. Nowak, I.D., The National translation Centre: "Science and technology libraries", 1982 3(2), 57.

22. NTC(1969), Consolidated index of translations into English, 1969 (1953-1966).

23. Parker, C.C. and Turley R.V., Information Sources in the Science and technology (second ed.). Butter worths, London, 1986. PP.257-258.

24 .Piette. J.R.F., A guide to foreign languages for science librarians and bibliographers (2nd ed.) Aslib, London. 1965.

25. Science Reference library, Holding of journals in translation, Aids to readers, No.1 (British Library) 1981.

4. BLLD/ITC. Journals in Translation (3rd ed). 1982.

5. "British Reports, Translations theses"(1980). British Libr Lending Division, Boston Spa.

6. Chan, G.K.L., The foreign Langu barrier in Science Technology, "Inte tional Library Review." P. (1976).

7. Chillage, J.P., Translations and th "NLL review" Vol. 1. No.2, A 1971, PP. 46-53.

8. Chillage, J.P., Translation and trans ting services at the lending Divis "Interlanding Review" Vol. 8. No Oct. 1980. PP. 1367.

9. Deutsches Institute fur Normun English Translations of Germ Standards, annual list of DIN Stan ards in English (Beuth Verlag).

10. Ellen. S.R., Survey of foreign langu problems facing the research worker "Interlanding review". 7(2)PP. 38 (1979)

11. Fedunok, S., Printed and onli sources for technical translation, "Science and Technology libraries 3(2), PP. 3-12 (1982).

12. Finlay, I.F., Managing to meet transl tion needs.s "Aslib proceedings". 31(11)PP 4 499 (1979).

13. Fleurent, F., The business side translation "Technical translati Bulletin"29(1) PP.22-25 (1983).

14. Glover, W. Services provided Aslib relating to translation, "Asl proceedings" 31(11), P:P.525 — 5 (1979).

15. Index Translationum, UNESCO, Paris 1948.

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

اعضائے تکلم

اعضائے تکلم کا مطالعہ عام معلوماتی نقطۂ نظر سے دلچسپ ہوگا اور ایک ماہر صوتیات کے لیے اعضائے تکلم کے مختلف ممکن اشکال اور افعال کا علم بے حد ضروری ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ دنیا کے کسی بھی قطعہ کا انسان ہو اس کے دہن میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دہن انسانی کا بھرپور مشاہدہ ہی اعضائے تکلم کے اشکال اور افعال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا بہترین طریقۂ کار یہ ہے کہ مشاہدہ بہن روشنی کے سامنے ٹھہر جائے اور ایک چھوٹے آئینے کو منہ کے سامنے اس طرح تھام لے کہ آئینے کی روشنی منہ کے اندر کے تمام حصوں پر پڑے تاکہ آئینہ تھامنے والے کو منہ کے اندر کا حصہ صاف نظر آئے۔

طبی آلات کی دکانوں سے مصنوعی اعضائے تکلم یا دہن انسانی حاصل کیا جا سکتا ہے جو مشاہدے میں ضرور مددگار ثابت ہو سکے گا۔ مگر چونکہ اس میں زندہ انسانی دہن کی سی حرکت، یعنی زبان، ہونٹ تالو وغیرہ کا گھماؤ، کھنچاؤ، سکڑاؤ اور پھیلاؤ وغیرہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے مشاہدہ بہن مکمل سیر حاصل اور تسلی بخش مشاہدے سے محروم رہتا ہے۔ دراصل اعضائے تکلم کی حرکت ہی ہے جو آواز کے مخرج کی ذمہ دار ہوتی ہے اور مشاہدہ بہن اپنے دہن کے مشاہدے کے دوران آواز کے مخرج کے بارے میں بھرپور علم حاصل کرتا ہے۔ اس طریقے سے حاصل کیا ہوا علم مستند ہوگا جو مصنوعی اعضائے تکلم کے مشاہدے سے بالکل ممکن نہیں۔ لہٰذا اپنے ہی دہن کا مشاہدہ اور آوازوں کو نکالنے کی مشق صوتیات کے طالب علم کا بہترین استاد ہوگا۔ آوازوں کے فرق کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بھی بہت مفید اور مددگار رہو گا۔ کسی زبان کی نئی آواز کو سیکھنے کے لیے بھی اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں استعمال ہونے والی آوازوں کو عام طور سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ مصوتے یا حروف علت — Vowels
۲۔ مصمتے یا حروف صحیح — Consonants

مصمتوں اور مصوتوں کی ادائیگی انسانی پھیپھڑوں سے باہر نکلنے والی ہوا یا سانسوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ مصوتے یعنی حروف علت کی ادائیگی کے دوران مقام تنفس ریوں سے ہونٹوں تک منہ کا پورا راستہ کھلا رہتا ہے اور حروف صحیح یعنی مصمتوں کی ادائیگی کے دوران منہ کے اندر کا خاص حصہ خاص آواز کی ادائیگی کے لیے نیم بند یا مکمل طور پر بند ہو جاتا ہے۔ مطلوبہ آواز کی ادائیگی کے لیے اعضائے تکلم حرکت میں لائے جاتے ہیں تو منہ کے اندر کی جمع شدہ ہوا منہ یا منہ اور ناک کے راستے سے یک دم خارج ہوتی ہے۔ مثلاً پاپا کی ادائیگی کے لیے بند ہونٹ جدا کیے جاتے ہیں تو منہ کے اندر کی ساری ہوا ایک دم خارج ہوجاتی ہے اور یہی ہوا جب ناک اور منہ کے ذریعے خارج کی جاتی ہے تو "ما" کی آواز کی ادائیگی ہوگی۔ اعضائے تکلم کی ان حرکات کا عمل اور پھیپھڑوں کی ہوا کا منہ اور ناک کے ذریعے آواز کی ادائیگی کے لیے خارج ہونا اس قدر تیز رفتاری سے ہوتا ہے کہ انسان کو باتوں کے دوران اس کا رمق بھر احساس نہیں ہوتا۔

ہر زبان میں مصوتوں اور مصمتوں یعنی Vowels اور Consonants کی خاص خاص تحریری علامتیں ہوتی ہیں جو حروف تہجی کہلاتی ہیں۔ اسی لیے ہر زبان کے حروف تہجی الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً "پ" کی آواز کے لیے انگریزی میں P حرف یا علامت ہے تو ہندی میں प۔ ظاہر ہو گیا کہ صوت کی تحریری علامت حرف ہے۔

انہیں اصوات یا حروف کے اجتماع سے الفاظ بنتے ہیں۔ ان الفاظ اور جملوں کو انسان اپنے دہن سے دانستہ ادا کرتا ہے۔ باتیں کرنا یا بولنا انسان کا ایک خود اختیاری عمل ہے۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام مصوتوں، مصمتوں، الفاظ اور جملوں کی

ادائیگی انسانی دہن سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ان آوازوں کی ادائیگی کے عمل کو جاننے کے لیے ماہرینِ صوتیات نے دہنِ انسانی کو مختلف حصوں میں ان کی کارکردگی کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ اس علم نے برطانیہ میں خوب ترقی کی ہے۔ برطانیہ کے ایک مشہور ترین ماہرِ صوتیات Danial Jones نے اپنی (انگریزی تلفظ) The Pronunciation of English میں اعضائے تکلم کو چودہ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو حسبِ ذیل ہیں۔ خاکے کے ذریعے ان کی تقسیم بھی دکھائی گئی ہے۔

۱۔ لب — Lips
۲۔ دانت — Teeth
۳۔ مسوڑھے — Teeth Ridge
۴۔ سخت تالو — Hard Plate
۵۔ نرم تالو — Soft Plate
۶۔ لہاتی — Uvvla
۷۔ زبان کا پھل — Blade of Tongue
۸۔ زبان کا اگلا حصہ — Front of Tongue
۹۔ زبان کا پچھلا حصہ — Back of Tongue
۱۰۔ گل سکھ یا کنٹھ — Pharynx
۱۱۔ مزمار یا کنٹھ ڈھکنا — glottis
۱۲۔ مقام صوت تنتریاں — Cords
۱۳۔ زبان کی نوک — of Tongue
۱۴۔ ناک کا خلا — al Cavity

N.A. QUESTION HOUR

Urdu in Govt. offices;

اردو کے تراشے

ISLAMABAD, Feb. 10: The National Assembly was assured today that earnest efforts were being made to introduce Urdu language in all the government departments within a stipulated period of 15 years as enunciated in the 1973 Constitution.

This was stated by the Parliamentary Secretary for the Cabinet Division, Rana Naeem Mehmud, while replying to a barrage of supplementaries on the question asked by Mr. Fazle Raziq during Question Hour. The Speaker, using his discretion, allowed several supplementaries, keeping in view the importance of the matter.

The Parliamentary Secretary informed the House on a supplementary raised by Shah Tarabul Haq Qadri that the Cabinet Committee had set up two sub-committees in its last meeting to furnish their reports in this matter. The report of one sub-committee had been received while the report of other was being awaited after which, he added, a decision would be taken.

To another question raised by Mr. Hamza, he hoped that the report of the Cabinet committee regarding the use of Urdu language as medium of competitive examinations would be received soon.

The Parliamentary Secretary said that major recommendations made by the National Language Authority pertained to standardisation of a key-board for the Urdu typewriter, adoption of Urdu as the official language, greater use of Urdu in competitive examinations, adoption of Urdu as medium of instruction at all levels of education according to a phased programme.

He further said that 2500 Urdu typewriters were being manufactured by the telephone industry every year. 780 stenographers and stenotypists had been imparted training to carry out their official work in Urdu language.

Some members including Sardar Aseff Ali, Syed Zafar Ali Shah and Mir Zafarullah Khan Jamali, pointed out that Urdu was an official language, not national language. Referring to the 1973 Constitution, Rana Naeem Mehmud said that in accordance with Article 251 of the Constitution, Urdu was declared as National language of Pakistan.

Referring to the recommendations of the National Language Authority, the Parliamentary Secretary said that the standardisation of Urdu keyboard was approved by the Cabinet and had been fully implemented.

A phased programme of action is being followed in adopting Urdu as the official language.

The NLA recommendations on Urdu as the medium of competitive examinations are presently under examination of the committee of the Cabinet constituted for this purpose. Besides, he added, the recommendations had to be implemented largely by the Provincial Governments. These were accordingly forwarded to them as also to the Federal Ministries and agencies concerned with education and science for their views. These have since been received and the matter was being examined by the Cabinet committee.

In the Punjab province, he said that most of the official work was being done in Urdu at the level of Municipal Committees, Town Committees, Union Councils, Zakat Committees, schools, District Councils, Municipal Corporations and the offices of Assistant Commissioners in the sub-divisions.

In Sind, the business in most Government offices (especially those in the field), educational institutions and the courts is carried out largely in English and/or in Sindhi and has been the practice since before Independence, without dislocation of the use of Sindhi. Adoption of Urdu in place of English, wherever it is in use, is being promoted.

In NWFP, in police stations, Municipal Corporations/Committees, Tehsils/sub Tehsils, Town Committees, District and Union Councils, etc. business is largely carried out in Urdu. In the courts of Civil Judges and Magistrates, statements of the parties concerned are recorded in the language in which they are made. That is in Urdu or Pushto. In the courts of Districts and Seasons Judges and higher judicial courts, evidence may be given/examined in Urdu or Pushto.

روزنامہ مسلم اسلام آباد ۱۱-۲-۸۷ء

From the Press Gallery

From Nusrat Javed

Urdu, English controversy

The private Members' day in the Assembly was wasted on redefining the status of Urdu. Though rules categorically state that one could speak in English or Urdu in the House, there are Members who keep objecting to someone's using English.

In the question hour too the Cabinet Division is repeatedly asked to report about the progress made about the constitutional commitment that by the year 1988 Urdu shall be the National language of Pakistan. For galleries it has become appalling that with regular intervals this trivial matter is fought aggressively in the House. And on each occasion it leaves bad taste.

A few Punjabi Members like Syeda Abida Hussain and Sardar Asif insist that Urdu was not their mother tongue with an obvious message that it were Punjabis contributing positively for Urdu at the cost of their own mother tongue.

روزنامہ دی نیشن لاہور ۱۱-۲-۸۷ء

اردو — سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم

پاکستان میں دفتری زبان کا مسئلہ ایک مرتبہ پھر گزشتہ روز قومی اسمبلی میں بحث اور تیز و تند تقریروں کا موضوع بنا ہے۔ ایوان کو بتایا گیا ہے کہ حکومت اگلے سال اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ایسا کرنا ایک آئینی ضرورت بھی ہے۔ ایوان میں مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے پیش کردہ سفارشات پڑھ کر سنائی گئیں جو کابینہ کمیٹی کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ سفارشات میں مقابلہ کا امتحان اردو میں منعقد کرنے اور اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو ہماری قومی زبان ہے اور آئین کی رو سے اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل ہے مگر آزادی کے بعد اب تک وہ ہماری دفتری زبان نہیں بن سکی بلکہ وہ ابھی تک ذریعہ تعلیم کا درجہ بھی حاصل نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز نے یہاں اپنے دو سو سالہ دور حکومت میں اپنے مداحوں کا ایک مضبوط حلقہ قائم کر لیا تھا اور انہیں اس طرح کی تربیت دی تھی کہ وہ انگریزی زبان اور انگریزی ادب و ثقافت کے پرستار بن گئے تاہم انگریزی ثقافت تو مقامی ثقافت سے مات کھا گئی اور زندگی کے وہ طور طریقے یہاں رائج نہ ہو سکے جن کا مشرقی شرم و حیا، وضع داری اور تواضع سے براہ راست تصادم تھا لیکن انگریزی زبان نے مقامی مادری زبانوں اور سرکاری و دفتری زبان فارسی پر پوری طرح غلبہ پا لیا۔ اگر فارسی جو انگریزی دور سے پہلے سرکاری اور دفتری زبان تھی کسی علاقے کی مادری زبان بھی ہوتی تو شاید انگریزی کو یہ عروج حاصل نہ ہوتا، لیکن فارسی بھی مقامی نہیں ایک اجنبی زبان تھی اس لیے انگریزی کو فروغ حاصل کرنے میں مدد ملی۔ علاوہ ازیں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو سرکاری اور دفتری زبان حکمران رائج کرنا چاہتا ہے وہ رفتہ رفتہ گھر کر لیتی ہے اور آسانی سے رائج بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ساحلی مقامات جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے اپنا اثر و رسوخ قائم کیا شمالی برصغیر تک اس کا اقتدار پہنچنے تک انگریزی زبان سیکھ چکے تھے اور انگریز کو جس نظام کے چلانے کے لیے منشی متصدیوں کی ضرورت تھی اس میں بڑی حد تک مہارت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ شمالی برصغیر انگریزوں کے زیر نگین آیا تو یہی لوگ یہاں سرکاری دفتروں کے چلانے کے لیے بلائے گئے لہٰذا ہر جگہ ملٹری اکاؤنٹس کا دفتر کلکتہ دفتر ہی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

انگریزی کا رائج ہونا برصغیر کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب بھی ہے۔ انگریز کی راج سے پہلے بڑی حد تک مسلمان کا اقتدار برصغیر میں قائم تھا اس لیے مسلمانوں نے شروع شروع میں انگریزی تعلیم کا مقاطعہ کیا اور اپنی سابقہ کروفر باقی رکھنے کی کوشش کی، لیکن اب وہ صرف محروم اقتدار ہو چکے تھے بلکہ نئے حکمران کے زیر عتاب بھی تھے اس لیے ان کی کچھ پیش نہ گئی اور ہندو افسر اور منشی ہر جگہ غالب آ گیا کیونکہ اسے نہ تو انگریز کے اقتدار میں آنے کا کوئی غم تھا اور نہ وہ فارسی اردو سے کوئی ایسا جذباتی لگاؤ رکھتا تھا کہ انگریزی اختیار کرنے میں اسے کوئی تامل ہوتا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان بڑی مشکل اور دیر سے انگریزی پڑھنے اور سیکھنے کی طرف مائل ہوا تاہم اس اثنا میں انگریزی کی تعلیم ایک ناگزیر ضرورت بن چکی تھی اس لیے مسلمان کو بھی اپنی روش میں تبدیلی کرنا پڑی اور اپنی بعض قومی تحریکوں کے اصول نظر انداز کر کے بھی وہ انگریزی سیکھ گیا، لیکن عام لوگوں نے تو اسے حصول معاش کے لیے سیکھا تھا اور خاص لوگوں کو انگریز نے اپنے ماتحت انہیں عام لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے سکھایا تھا۔ شاید ابتدائی دور حکومت میں انگریز کا برصغیر سے نکل جانے کا کوئی ارادہ نہ ہوگا تاہم اس نے اس خطے کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ مغل بھی وسط ایشیا سے آئے تھے مگر یہاں آنے کے بعد یہیں کے ہو رہے، لیکن انگریز غالباً چلے ہی جانے کے لیے آیا تھا اس لیے اس کا طرز عمل ابتدائی حکمران مغلوں سے بالکل مختلف تھا۔ انگریز نے اپنے مفاد کی نگرانی کے لیے یہاں ایک انگریز پرست طبقہ قائم کیا اور اپنے آخری دور حکومت میں اسے اس طرح یہاں سرفراز کیا کہ انگریز کے رخصت ہونے کے بعد اسے انگریزوں کی جگہ لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ علاوہ دوسری باتوں کے یہ طبقہ کبھی انگریزی کی جگہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کا بھی حامی نہ ہوا چنانچہ جب قائد اعظم نے پاکستان میں اردو کے قومی زبان ہونے کا اعلان کیا تو یہ طبقہ تلملا اٹھا اور طرح طرح کی لسانی بحثوں کے باب کھول دیئے۔ اگر قائد اعظم خدانخواستہ انگریزی کو قومی سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کرتے تو غالباً کوئی بحث نہ چھڑتی لیکن وہ جانتے تھے کہ اردو ہمارا مضبوط تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہے۔ ہمارے عوام میں دینی اور سیاسی شعور پیدا کرنے اور مسلمان عوام کو ان کی قومی امنگوں سے روشناس کرانے کے لیے اردو نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں اور یہی زبان پاکستان کو مختلف لسانی جھگڑوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے اس لیے انہوں نے اردو کو یہ اہمیت دی لیکن افسوس کہ ان کی حیات مستعار نے وفا نہ کی اور وہ پاکستان قائم ہونے کے چند ماہ بعد علیل رہنے لگے اور تقریباً اس کے ایک سال بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

قائد اعظم کے بعد جو لوگ برسر اقتدار آئے وہ انگریزی سے حد درجہ مرعوب اور باطنی و ذہنی طور پر اس کے پروردہ تھے۔ تاہم انہیں قائد اعظم کے فیصلے سے کھلم کھلا اختلاف کرنے کی جرأت تو نہ ہوئی مگر انہوں نے یہاں ایسے اٹکے ڈالے کہ آج تک انگریزی ہی کی حکومت ہے۔ حکمران طبقات کو اس سے [illegible] فائدے ہیں۔ اول تو یہ کہ کوئی عام آدمی ان کے حلقے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اس [illegible] انگریزی تعلیم کے حصول کا موقع نہیں ہوتا جو امریکہ یا برطانیہ میں حاصل ہوتی ہے دوسرے تمام سرکاری اور دفتری کارروائی انگریزی میں ہونے کی وجہ سے عوام یہ سمجھنے میں قاصر ہوتے ہیں کہ کیا کیا جا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے [illegible] کیوں ہو رہا ہے۔ ایک [illegible] اور ایک ملزم کسی بڑی عدالت میں جا کر ججوں اور وکیلوں کے اس طرح منہ دیکھتے ہیں جیسے بلی کسی زمین پر [illegible] کے تماشے کو دیکھتی ہے۔ انہیں یہاں تک پتہ نہیں چلتا کہ عدالت میں ان کے مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے یا جج اور وکیل کسی اور ہی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔

بقیہ اگلے صفحے پر

سرکاری دفاتر میں آئندہ سال تک اردو کے مکمل نفاذ کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ قومی اسمبلی کو یقین دہانی

سندھی کو ... غیر سندھیوں ... اردو کو ... کی جگہ ... کے اقدامات کئے جا رہے ہیں ... زیادہ تر سرکاری کام اردو میں ہو رہا ہے

اسلام آباد ۱۰ فروری (ریڈیو رپورٹ) آج قومی اسمبلی کو یقین دلایا گیا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے دیئے ہوئے عرصہ پندرہ سال کے اندر یعنی ۱۹۸۸ء تک اردو زبان کو تمام سرکاری محکموں میں رائج کر دینے کی بھرپور اور مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وقفہ سوالات کے دوران حاجی فضل رازق کے متعدد ضمنی سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہ یقین دہانی کیبنٹ ڈویژن کے پارلیمانی سیکرٹری رانا نعیم محمود نے کی۔ اسپیکر نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے سوال کنندہ کو سوالات کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ضمنی سوالات کرنے کی اجازت دے دی۔ پارلیمانی سیکرٹری نے شاہ تراب الحق کے ایک ضمنی سوال پر ایوان کو بتایا کہ اردو زبان کو تمام سرکاری سطحوں پر رائج کرنے کے مقصد کے لیے کیبنٹ کمیٹی نے اپنے پچھلے اجلاس میں دو سب کمیٹیاں قائم کی تھیں جن سے اس سلسلہ میں ہونے والے کام کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا تھا ان میں سے ایک سب کمیٹی کی رپورٹ موصول ہو گئی ہے جبکہ دوسری کی رپورٹ کا انتظار کیا جا رہا ہے جس کے موصول ہو جانے کے بعد مزید کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ ایم حمزہ کے ایک سوال پر انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ مقابلے کے امتحانات میں اردو کو میڈیم (وسیلۂ اظہار) بنانے کے بارے میں کیبنٹ کمیٹی کی رپورٹ بھی جلدی موصول ہونے والی ہے۔ پارلیمانی سیکرٹری نے کہا کہ اردو ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ کا معیار مقرر کرنے، اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے، مقابلے کے امتحانات میں اردو کے نسبتاً زیادہ استعمال اور تمام سطحوں کی تعلیم و تدریس میں اردو کو میڈیم آف انسٹرکشن (ذریعہ تعلیم) کی حیثیت سے نافذ کرنے کے لیے ایک مرحلہ وار پروگرام کے مطابق مقتدرہ قومی زبان (نیشنل لینگویج اتھارٹی) کی سفارشات پر کام کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیلیفون انڈسٹریز ہر سال ڈھائی ہزار ٹائپ رائٹر تیار کر رہی ہے جبکہ ۱۵۰ اسٹینو گرافر اور اسٹینو ٹائپسٹ سرکاری کام کاج اردو زبان میں انجام دینے کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ بعض ارکین سردار آصف احمد علی، سید ظفر علی شاہ اور میر ظفر اللہ خان جمالی نے اعتراض کیا کہ اردو قومی زبان نہیں سرکاری زبان ہے۔ رانا نعیم محمود نے ۱۹۷۳ء کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی سفارشات کا حوالہ دیتے ہوئے پارلیمانی سیکرٹری نے کہا کہ اردو کی بورڈ کے معیار کے تعین پر کابینہ منظوری دے چکی ہے اور اس پر پوری طرح عملدرآمد کیا جا رہا ہے انہوں نے کہا کہ صوبہ پنجاب میں ڈویژنل کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، زکوٰۃ کمیٹیوں، ... اور اسسٹنٹ کمشنروں کے دفاتر میں زیادہ تر سرکاری کام کاج اردو زبان میں ہی ہو رہا ہے انہوں نے کہا کہ صوبہ سندھ میں اکثر و بیشتر سرکاری دفاتر خاص کر فیلڈ آفسوں اور عدالتوں میں کام کاج انگریزی زبان میں یا پھر سندھی زبان میں ہوتا ہے کیونکہ ماقبل تقسیم ہند بھی کام کاج اسی طرح ہو رہا ہے انہوں نے کہا کہ سندھی زبان کے استعمال کو ختم کئے بغیر اردو کو انگریزی زبان کی جگہ جہاں جہاں بھی انگریزی زبان استعمال ہو رہی ہے، رائج کئے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں انہوں نے کہا کہ صوبہ سرحد میں پولیس اسٹیشنوں اور تحصیلوں کی تمام چھوٹی بڑی سطحوں پر زیادہ تر سرکاری کام کاج اردو میں ہوتا ہے جبکہ سول ججوں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں فریقین کے بیانات ان زبانوں میں قلمبند کئے جاتے ہیں جن میں ممکن ہو کہ گفتگو پشتو یا اردو زبان میں ہوتے ہیں اس طرح ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں اور ان سے بڑی عدالتوں میں شہادتیں اور جرح وغیرہ اردو یا پشتو میں قلمبند کی جاتی ہیں بلوچستان میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کا کام اس سے خاصا زیادہ ہوا ہے اور اکثر و بیشتر دفاتر اور عدالتوں میں اردو یا تو پوری طرح یا جزوی طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ سید ظفر علی شاہ کے ایک ضمنی سوال کے جواب میں چوہدری نثار علی خان نے کہا کہ حکومت نے اپنی عمومی پالیسی کے تحت خسارہ کی سرمایہ کاری کی حد کم سے کم کر دی ہے انہوں نے کہا کہ رواں مالی سال کے پہلے ۶ مہینوں کے دوران خسارہ کی سرمایہ کاری دس ارب روپے تک پہنچ جانے کی بات اخباری رپورٹوں پر مبنی ہے اور سر دست اسے قیاس آرائی کہا جا سکتا ہے کرنسی نوٹوں کی تعداد میں افراط کے بارے میں ایک ضمنی سوال پر انہوں نے

سردار آصف احمد علی، سید ظفر علی شاہ اور میر ظفر اللہ خان جمالی نے اعتراض کیا کہ اردو قومی زبان نہیں سرکاری زبان ہے۔ رانا نعیم محمود نے ۱۹۷۳ء کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی سفارشات کا حوالہ دیتے ہوئے پارلیمانی سیکرٹری نے کہا کہ اردو کی بورڈ کے معیار کے تعین پر کابینہ منظوری دے چکی ہے اور اس پر پوری طرح عملدرآمد کیا جا رہا ہے انہوں نے کہا کہ صوبہ پنجاب میں ڈویژنل کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، زکوٰۃ کمیٹیوں، ... اور اسسٹنٹ کمشنروں کے دفاتر میں زیادہ تر سرکاری کام کاج اردو زبان میں ہی ہو رہا ہے انہوں نے کہا کہ صوبہ سندھ میں اکثر و بیشتر سرکاری دفاتر خاص کر فیلڈ آفسوں اور عدالتوں میں کام کاج انگریزی زبان میں یا پھر سندھی زبان میں ہوتا ہے کیونکہ ماقبل تقسیم ہند بھی کام کاج اسی طرح ہو رہا ہے انہوں نے کہا کہ سندھی زبان کے استعمال کو ختم کئے بغیر اردو کو انگریزی زبان کی جگہ جہاں جہاں بھی انگریزی زبان استعمال ہو رہی ہے، رائج کئے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں انہوں نے کہا کہ صوبہ سرحد میں پولیس اسٹیشنوں اور تحصیلوں کی تمام چھوٹی بڑی سطحوں پر زیادہ تر سرکاری کام کاج اردو میں ہوتا ہے جبکہ سول ججوں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں فریقین کے بیانات ان زبانوں میں قلمبند کئے جاتے ہیں جن میں ممکن ہو کہ گفتگو پشتو یا اردو زبان میں ہوتے ہیں اس طرح ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں اور ان سے بڑی عدالتوں میں شہادتیں اور جرح وغیرہ اردو یا پشتو میں قلمبند کی جاتی ہیں بلوچستان میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کا کام اس سے خاصا زیادہ ہوا ہے اور اکثر و بیشتر دفاتر اور عدالتوں میں اردو یا تو پوری طرح یا جزوی طور پر استعمال ہو رہی

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۱۱ فروری ۱۹۸۷ء

اردو قومی نہیں سرکاری زبان ہے: قومی اسمبلی میں بحث

اردو زبان کے استعمال سے متعلق کیبنٹ کمیٹی کی رپورٹ جلد موصول ہو جائے گی: پارلیمانی سیکرٹری

اسلام آباد ۱۰ فروری (اسٹاف رپورٹر) قومی اسمبلی میں آج قومی زبان اردو کے بارے میں گرماگرم بحث ہوئی اور بعض ممبروں نے یہاں تک کہا کہ اردو قومی نہیں سرکاری زبان ہے جس پر مولانا ظفر ندوی نے سپیکر کو متوجہ کیا کہ ان ارکان نے آئین پر حلف لیا ہے جس میں درج ہے کہ اردو ملک کی قومی زبان ہے اب انہوں نے اردو کو قومی زبان تسلیم نہ کر کے انتہائی حلف عدولی کی ہے اس پر سپیکر کو رولنگ جاری کرنا چاہیے۔ سپیکر مسٹر حامد ناصر چٹھہ نے کہا کہ وہ اس پر بعد میں رولنگ دیں گے۔ اردو کو صرف سرکاری زبان کہنے والے ارکان سید ظفر علی شاہ، سردار آصف احمد علی اور میر ظفر اللہ خان جمالی تھے۔ اردو کے بارے میں بحث مولانا فضل الرازق کے ایک سوال پر شروع ہوئی جس کے جواب میں پارلیمانی سیکرٹری برائے کیبنٹ ڈویژن رانا نعیم محمود نے ایوان کو بتایا کہ آئین کے تحت حکومت ۱۹۸۸ء تک اردو کو بطور سرکاری زبان رائج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے آئین کی رو سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ قومی زبان ہے اور آئین میں اسے مکمل طور پر سرکاری زبان بنانے کے لیے پندرہ سال کا عرصہ دیا گیا ہے جس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی انہوں نے ایک ضمنی سوال کے جواب میں بتایا کہ قومی زبان کے فروغ کے لیے کیبنٹ کمیٹی ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء کو قائم کی گئی تھی اور ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کمیٹی کی رپورٹ کب آئے گی تاہم کوشش کی جائے گی کہ رپورٹ جلد آ جائے۔ مسٹر لیاقت بلوچ کے ایک ضمنی سوال کے جواب میں پارلیمانی سیکرٹری نے بتایا ٹیلی فون انڈسٹریز آف پاکستان سالانہ ڈھائی ہزار اردو ٹائپ رائٹر تیار کر رہی ہے اور ہر محکمہ اسے خرید رہا ہے انہوں نے بتایا کہ اردو سٹینو یا ٹائپسٹوں کے لیے کسی باقاعدہ تربیتی کورس کا کوئی انتظام نہیں البتہ ۸۰ افراد کو اس مقصد کے لیے تربیت دی گئی ہے۔ اردو کے بارے میں متعدد ضمنی سوالات پوچھے گئے جس پر سپیکر نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اجازت دے دی سوال پوچھنے والوں میں شاہ تراب الحق، آپا نثار فاطمہ، مسٹر حمزہ، لیاقت بلوچ، سردار آصف احمد علی، عبداللہ بخاری، شاہ جمیل الدین، میر ظفر اللہ جمالی، سید ظفر علی شاہ، پیر محمد اشرف، بیگم عابدہ حسین شامل تھے ایک سوال کے جواب میں پارلیمانی سیکرٹری نے بتایا کہ کیبنٹ کمیٹی کی دو سب کمیٹیوں میں سے ایک کی رپورٹ موصول ہو گئی ہے اور دوسری کا انتظار ہے انہوں نے توقع ظاہر کی کہ مقابلے کے امتحان میں اردو زبان کے استعمال سے متعلق کیبنٹ کمیٹی کی رپورٹ بھی جلد موصول ہو جائے گی انہوں نے مزید بتایا کہ مقتدرہ قومی زبان کی سفارشات پر مرحلہ وار عمل ہوگا۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۱۱ فروری ۱۹۸۷ء

اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے اقدامات

قومی اسمبلی میں پارلیمانی سیکرٹری رانا نعیم محمود کا یہ انکشاف انتہائی حوصلہ افزاء ہے کہ ۱۹۸۸ء کے آخر تک اردو کو ملک میں دفتری زبان کا درجہ دیا جائے گا اس سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان قائم کی جائے گی جو اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کرے گی علاوہ ازیں ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو سرکاری اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ شائع کرے گا دارالتصنیف کے ذریعے جدید کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۵ء میں قائم ہونے والی کیبنٹ کمیٹی وفاقی اور صوبائی سطح پر سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں مقتدرہ اردو کی سفارشات پر عمل درآمد کرائے گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حصول آزادی کے فوری بعد ہی قومی زبان اردو کو دفتری زبان قرار دینے کے لئے عوامی مطالبات نے زور پکڑ لیا تھا ہمارے اعلیٰ حکام کی طرف سے تاخیری حربوں کے باوجود ۱۹۷۳ء کے آئین میں حکومت کو اس بات کا پابند بنا دیا گیا تھا کہ ۱۹۸۸ء کے آخر تک تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں اور عدالتوں میں اردو کو رواج دیا جائے لیکن کئی سال تک حکمرانوں نے عوامی امنگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی اس آئینی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کوئی ٹھوس اقدام نہ کیا ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت اور قومی اسمبلی نے اس مسئلے پر فوری توجہ دی اور ایک کیبنٹ کمیٹی قائم کی گئی تاکہ قومی زبان کی ترویج کے لئے کام کرنے والے اداروں کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے اگرچہ مقتدرہ اور بعض دوسرے اداروں نے اردو کے فروغ کے لئے خاصا کام کیا ہے لیکن مقتدرہ قومی زبان اور دارالتصنیف اور دارالترجمہ کے قیام سے اس مسئلے کے حل میں ٹھوس پیش رفت ہو گی اور اردو کو دفتری زبان بنانے میں مدد ملے گی خوش قسمتی سے اس وقت ماتحت عدالتوں ڈپٹی کمشنروں اور تحصیلداروں کے دفاتر اور تھانوں میں زیادہ تر سرکاری امور کی انجام دہی قومی زبان اردو میں ہو رہی ہے وفاقی شرعی عدالت میں بھی اردو کا [illegible] ہو رہا ہے اب اگر متذکرہ اداروں نے سرکاری دفاتر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا اردو میں جامع ترجمہ پیش کر دیا تو ہو وفاقی حکومت کے اداروں میں بھی اردو کو دفتری زبان کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اس طرح نہ صرف آئینی تقاضا پورا ہو گا بلکہ عوام افرنگی زبان کے شکنجے سے محفوظ ہو جائیں گے تاہم اس موقع پر یہ گذارش بے محل نہ ہو گی کہ سائنسی علوم کو عام کرنے کے لئے انگریزی اصطلاحات کے جامع تراجم کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے نوجوان سائنس و ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم قومی زبان کے ذریعے حاصل کر سکیں اس کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کو بھی اس حد تک جاری رکھا جائے کہ بین الاقوامی رابطے کی اس زبان سے استفادہ کیا جائے اور غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

روزنامہ مشرق لاہور ۱۲-۲-۸۶ء

The language issue

The Parliamentary Secretary for Cabinet Division, Rana Naeem Mehmud, informed the National Assembly about the steps being taken to introduce Urdu in all the government departments by 1988 as stipulated in the 1973 Constitution. He said the Cabinet Committee in its last meeting had set up two sub-committees to furnish their reports in the matter. The Parliamentary Secretary disclosed that the report of one sub-committee had already been received and the other was awaited for the final decision to be taken.

Under Article 251 of the Constitution Urdu has been declared the national language of Pakistan and it has been enunciated that it would be introduced in all government departments within a period of 15 years. A phased programme is already being followed towards that end. As recommended by the National Language Authority (NLA) the standardisation of Urdu key board has been approved by the Cabinet and fully implemented. The recommendation of NLA to adopt Urdu as the medium for competitive examinations is also under examination of the Cabinet committee. The NLA (Muqtadra Qaumi Zaban) had last year announced that a study was being carried out about the difficulties faced by other countries during the process of switchover to their national language and remedial tion would be taken in vi of their experience. It was a said that special cours would be conducted at the lama Iqbal Open Universi for Government officers facilitate them to correspo in Urdu. At that time we h pointed out in these colum that coming out of "t shadow of a language whic has been hovering ov government offices for en less years and whose effec have permeated the pores functionaries, specially at th higher echelon, is a stupe dous undertaking." We sti feel that this process has to b handled methodically an with the utmost care. In th Punjab, NWFP an Baluchistan the official work at least at the lower level, ha always been mostly carrie out in Urdu, but in Sind it ha only been in Sindhi or En glish. In that province a com plete switchover to Urd would be something extreme ly difficult to accomplish. A the same, the adoption o Urdu as the 'daftari zaban' i in no way at the expense o or prejudicial to the provincia and regional languages. Th promotion of such language has always been assured at a official levels. However, lan guage is a sensitive issue and all decisions in this respect should be taken after careful thought. The entire matter needs adept handling and every step should be taken with caution.

روزنامہ پاکستان ٹائمز، اسلام آباد ۱۲-۲-۸۶ء

NA QUESTIONS

Urdu in 15 years:

ISLAMABAD, Feb 10: The National Assembly was assured today that earnest efforts were being made to introduce Urdu language in all the government departments within a stipulated period of 15 years as enunciated in the 1973 Constitution.

This was stated by the Parliamentary Secretary for Cabinet Division, Rana Naeem Mehmud while replying to a barrage of supplementaries on the question asked by Mr Fazl-e Raziq during the question hour.

The Parliamentary Secretary informed the House on a supplementary raised by Shah Tarab ul Haq Qadri that the Cabinet Committee had set up two sub committees in its last meeting to furnish their reports in this matter. The report of one sub committee had been received while the report of other was being awaited after which, he added, decision would be taken.

To another question raised by Mr Hamza, he hoped that the report of the Cabinet Committee regarding the use of Urdu language as medium of competitive examinations would be received soon.

The Parliamentary Secretary said that major recommendations made by the national language authority pertained to standardisation of key board for the Urdu typewriter, adoption of Urdu as the official language, greater use of Urdu in competitive examinations, adoption of Urdu as medium of instruction at all levels of education according to a phased programme.

Some members including Sardar Asif Ali, Syed Zafar Ali Shah and Mir Zafar Ullah Khan Jamali pointed out that Urdu was an official language not national language. Referring to the 1973 Constitution, Rana Naeem Mehmud said that in accordance with the Article 251 of the Constitution, Urdu was declared as the national language of Pakistan.

Referring to the recommendations of the National Language Authority, the Parliamentary Secretary said that the standardisation of Urdu key board were approved by the Cabinet and had been fully implemented. A phased programme of action was being followed in adopting Urdu as the official language.

The NLA recommendations on the Urdu as medium of competitive examination were presently under examination of the Committee of the Cabinet constituted for this purpose. In Punjab, most of the official work was being done in Urdu, he said.

In Sind, the business in most government offices (especially those in the field), educational institutions and the courts was carried out largely in English and/or in Sindhi, as has been the practice since before independence. Without dislocating the use of Sindhi, adoption of Urdu in place of English, wherever it was in use, was being promoted.

In NWFP, in police stations, municipal corporations/committees tehsils/sub-tehsils, town committees, district and union councils, business was largely carried out in Urdu.

روزنامہ [illegible] لاہور ۱۱-۲-۱۹۸۶ء

Which language is the national one?

From Our Correspondent

ISLAMABAD, Feb. 10: A controversy over Urdu being the national language or not was sparked off in the National Assembly today when a few members claimed that both Urdu and English were only official languages and nothing more.

The Speaker, Hamid Nasir Chattha observed that he would read the relevant rules and give a ruling if the members who had challenged Urdu as the national language had breached the oath taken under 1973 Constitution. "The Constitution makes it explicitly clear that Urdu would be the only national language" pointed out few other members.

The heated debate was generated on a written question from Haji Fazale Raziq during the question hour of the Assembly whether Urdu would be introduced as official language of the country by 1988. The Government responded that it would be so as the 1973 Constitution had made it mandatory.

During the course of supplementary questions, Sardar Asif Ahmed Ali stood on a point of order and said Urdu and English were only official languages and nothing more. "My mother tongue is Punjabi and not Urdu," said Sardar Asif. He was strongly supported by Syed Zafar Ali Shah who went on to say that trouble started in Pakistan when Quaid-i-Azam said in 1948, in one of his statements that Urdu would be the national language. "Urdu is not our national language," said Zafar Ali Shah. He was rebutted by Shah Turab ul Haq who wanted this expunged from the proceedings. The Speaker however ignored this request.

Syeda Abida Hussain conceded that though Urdu was considered a national language in the Constitution, but there were several regional languages as well. She asked if Urdu speaking people had bothered to learn the regional languages with the same pain as the others did regarding Urdu. A large number of the members however strongly rebutted these remarks.

Waseeh Mazhar Nadvi reminded that 1973 Constitution explicitly laid it down that Urdu was the national language. "Sardar Asif and Zafar Ali Shah had both challenged it," said Nadvi. "Thereby both had violated the oath they had taken under 1973 Constitution when becoming members of the National Assembly". The Speaker however reserved his ruling on this, and observed he would examine the entire issue before giving a decision.

Many members defended Urdu and asked the Government to give details regarding how much work

Questions in National Assembly

Urdu will be introduced in all Govt. offices

The National Assembly was assured on Tuesday that earnest efforts were being made to introduce Urdu language in all the Government departments within a stipulated period of 15 years as enunciated in the 1973 Constitution.

This was stated by the Parliamentary Secretary for Cabinet Division, Rana Naeem Mehmud, while replying to a barrage of supplementaries on the question asked by Mr Fazle Raziq during the Question Hour The Speaker, using his discretion allowed several supplementaries keeping in view the import of the matter

The Parliamentary Secretary informed the House on a supplementary raised by Shah Tarabul Haq Qadri that the Cabinet Committee had set up two subcommittees in its last meeting to furnish their reports in this matter The report of one subcommittee had been received while the report of other was being awaited after which, he added decision would be taken

To another question raised by Mr. Hamza, he hoped that report of the Cabinet Committee regarding the use of Urdu language as medium of competitive examinations would be received soon

The Parliamentary Secretary said that major recommendations made by the National Language Authority pertained to standardisation of keyboard for the Urdu typewriter, adoption of Urdu as the official language, greater use of Urdu in competitive examinations, adoption of Urdu as medium of instruction at all levels of education according to a phased programme

TYPEWRITERS

He further said that 2500 Urdu typewriters were being manufactured by the telephone industry every year Some 780 stenographers and steno typists had been imparted training to carry out their official work in Urdu language.

Some members including Sardar Asif Ali, Syed Zafar Ali Shah and Mir Zafarullah Khan Jamali pointed out that Urdu was an official language not national language. Referring to the 1973 Constitution, Rana Naeem Mehmud said that in accordance with the Article-251 of the Constitution, Urdu was declared as national language of Pakistan.

Referring to the recommendations of the National Language Authority, the Parliamentary Secretary said that the standardisation of Urdu keyboard were approved by the Cabinet and had been fully implemented

A phased programme of action is being followed in adopting Urdu as the official language.

NLA PROPOSALS

The NLA recommendation on the Urdu as medium of competitive examination are presently under examination of the committee of the Cabinet constituted for this purpose Besides, he added the recommendations had to be implemented largely by the provincial governments These were accordingly forwarded to them as also to the Federal Ministries and agencies concerned with education and science for their views These have since been received and the matter was being examined by the Cabinet Committee

In the Punjab province, he said that most of the official work was being done in Urdu at the level of Municipal committees, town committees, union councils, Zakat committees, schools, district councils, municipal corporations and the offices of Assistant Commissioners in the sub-divisions

In Sind, the business in most Government offices (especially those in the field), educational institutions and the courts is carried out largely in English and/or in Sindhi, as has been the practice since before independence Without dislocating the use of Sindhi adoption of Urdu in place of English, wherever it is in use, is being promoted

In NWFP, in police stations, municipal corporations/committees, tehsils/sub tehsils, town committees, district and union councils, etc business is largely carried out in Urdu In the courts of Civil Judges and magistrates, statements of the parties concerned are recorded in the language in which they are made, that is in Urdu or Pushto In the courts of District and Sessions Judges and higher judicial courts, evidence may be given/examined in Urdu or Pushto

In Baluchistan, there has been a very substantial changer-over to Urdu and most of the offices and courts are using Urdu either fully or partially, he said

FROM THE PRESS GALLERY

By ANWAR IQBAL

Lady member protests; English finds supporters

ISLAMABAD, Feb. 10: Feminist and Islamist women clashed in the National Assembly today when Abida Hussain objected to being called a 'Lady member'. Today's session also saw a heated discussion over the fate of English in Pakistan and the "good old colonial legacy" had more supporters among Pakistan's legislators than one would have imagined.

The two controversies injected some interest in otherwise dull proceedings. The ground for the first battle was provided by the Justice Minister, Waseem Sajjad, who called Syeda Abida Hussain "a lady member from Jhang." Abida was quick to remind the Minister that he was not justified in calling her a lady member. "Unlike some women members of this House I have been directly elected to this seat and I am as much a member as anybody else."Her remarks would have gone unnoticed but for Jamaat's Apa Nisar Fatima who converted it into an issue and insisted that "the honourable member from Jhang should be proud of being called a lady."

Mr. Hamza from Toba Tek Singh added fuel to the fire when he addressed Begum Salma Ahmad as Salma Ahmad Saheba, saying he was omitting the Urdu equivalent of lady because some members don't like it. While Abida kept her cool, Apa Nisar Fatima tried to drag her again and again into the controversy. "Don't they seem to have a love-hate relationship," commented another woman MNA on seeing Fatima's eagerness to drag Abida into the fray.

Pressing the microphone button to draw the attention of the Speaker seems to have become rather complicated for some members. After the installation of the new computerised system their microphones only work when the Speaker noticed their names on his computer and asks the operator to put on the member's microphone.

A Maulana was finding it specially difficult today. He kept on pressing his button but it wouldn't work. "Has he been pressing the button of his sherwani," quipped Shah Turabul Huq.

There was a question about the promotion of Urdu as the national language. Rana Naeem Ahmad, the Parliamentary Cabinet Secretary, began his speech in English in defence of Urdu. However, noticing his mistake he soon switched to Urdu. Welcoming his gesture, some Jamaat MNAs from NWFP urged other Ministers to follow his example. Waseem Sajjad agreed to speak in Urdu if Maulana Gauhar Rahman, a Jamaat MNA, promised to speak in English.

These rather chatty comments took a serious turn when Zafarullah Jamali questioned the status of Urdu as the national language.

A lot of PML and Opposition members rose on points of order to protest against his comments. The House was clearly divided into two groups- the supporters of Urdu and the well-wishers of English. Sardar Aseef Ali demanded to know what the Government was doing for the promotion of English as that was also an official language.

Syed Zafar Ali Shah generated more heat when he commented that the Quaid-e-Azam's stance on Urdu caused a serious controversy in 1948. Shah Turabul Huq asked the Speaker to expunge the remark from the proceedings of the House "as it was factually inocrrect." The Speaker merely agreed to look into the matter.

Syed Zafar Ali Shah also questioned the status of the National Language Authoritiy. "The language issue is a very sensitive subject and there should be an elected body to deal with it." The Parliamentary Secretary disagreed with him. He said that the final implemention of Urdu as the national language was no more an issue. "It was already settled in the 1973 Constitution." The National Language Authority was only an administrative organisation set up to implement what had already been settled by the previous Assembly.

The discussion on the controversy continued at the Cafeteria as well where Ilahi Bakhsh Soomro claimed that a language needs a land to bloom and flourish and Urdu has no land. Javed Hashmi, who usually prefers to speak Urdu inside the House, was among the supporters of English. However, Ahmad Nawaz Bugti had a different stand. "The whole controversy was uncalled for," said he. "There are other issues as well and they are of a more pressing nature. Let every language grow. Each language is knowledge."

Nur Khan was also among those who believed that there was no need to raise this controversy.

Pir Ashraf and his friends, who had become very emotional while speaking in favour of Urdu, continued defending the language at the Cafeteria as well. However, some of the PML members also agreed that there was no need to re-open a settled issue. "We have full sympathy for the local languages. We also believe, that one should be taught in one's mother tongue, but we have to disagree with those who raise the issue of regional languages only to defend English," commented a PML MNA. Another thought that it was the Aitchisonian lobby which was trying to re-open the language controversy.

روزنامہ مسلم اسلام آباد ۱۱-۲-۸۶ء

conceived decision

THE Federal Education Ministry's decision to abolish primary sections in the model schools and colleges of the Capital is not only hasty but ill-conceived. It will not solve any problems but may in fact create new ones because of the dismantling of unique institutions like ICB and ICG built with considerable effort over the past two decades to fill the vacuum of quality education in the still evolving city.

No one will quarrel with the Federal Education Minister's anxiety to ensure the entry of only the meritorious students into model institutions. But this objective can be achieved without destroying the already existing primary sections by devising a more vigilant and streamlined procedure to regulate admissions strictly on merit. The Education Minister should expend his zeal for education reform on more fundamental issues rather than wasting his energy on secondary issues like opening or closing primary sections in schools and colleges already functioning smoothly. It is still not too late for the Minister to reverse this decision and use his innovative skills for worthier causes in educational reconstruction.

Signboards in Urdu

NEARLY a year ago, the CDA came out with a sor[t] of warning to the shopkeepers of Islamabad to ge[t] their fading signboards repainted and, more importantly, that the major portion of the inscriptions should be in the national language – Urdu. Th[e] notice, published as an advertisement in the newspapers, said the Authority would take action agains[t] those who don't comply. Weeks passed and sprin[g] gave way to summer but nothing happened. Thos[e] who want the Capital to look neat and bright wer[e] disappointed. None took any notice of the CD[A] warning. And CDA itself took action against none. Urdu failed [t]o get pride of place in the Capital – ironically, n[ot] even on the facade of the building o[f] the Authority.

Either the CDA was not serious when it put ou[t] the notice or it is too weak to get its decisions an[d] bye-laws implemented, and powerless to take actio[n] against the defaulters. It also showed the apathy o[f] the Government and the people towards giving Urd[u] the importance it deserves.

As a matter of fact both English and Urdu can coexist. The painting of signs in Urdu should be mad[e] compulsory so that when one moves about i[n] Islamabad one has the feeling of being in the Capita[l] of Pakistan..

روزنامہ مسلم ۱۰ جنوری ۱۹۸۹

انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز کی مذمت

حیدرآباد (نمائندہ جنگ) [illegible]

[illegible]

روزنامہ جنگ کراچی ۲ جنوری ۱۹۸۹

انجمن سرکاری ملازمین برائے نفاذ اردو کا اجلاس

اسلام آباد [illegible]

[illegible]

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۲ اگست ۱۹۸۹

پاکستان میں ناخواندگی کا تناسب بڑھانے کے تجاویز

پرائمری تعلیم کو توسیع دینے کی ذمہ داری لوکل باڈیز کے سپرد کر دی جائے

تحریر : اکرم حیدری

پاکستان کے تعلیمی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ [ا]ن خواندگی کا تناسب کیسے بڑھایا جا سکتا ہے اس وقت کے [اع]داد و شمار کے مطابق پاکستان میں شرح خواندگی صرف ستائیس [فی ص]د ہے اور خواندگی کا یہ تناسب مہذب اقوام کے مقابلے [میں] بہت کم ہے اس میں شک نہیں کہ تیسری دنیا کے اکثر [مما]لک میں شرح خواندگی اس شرح سے بھی کم ہے لیکن تیسری [دنیا] کے بعض ممالک میں خواندگی کی شرح ہمارے ملک کے [مق]ابلے میں کہیں زیادہ ہے بعض ممالک جن میں جاپان اور [چی]ن خاص طور پر نمایاں ہیں تعلیم کے میدان میں بہت ترقی کر [گئ]ے ہیں کئی دوسرے ممالک جو معاشی اور اقتصادی اعتبار سے [ابھی] ان لوگوں سے بہت پیچھے بھی ہیں تعلیم کے میدان میں [ہم] سے ترقی یافتہ ہیں مسلمان ممالک گزشتہ تین سو سال کے [دور]ان میں سیاسی طور پر بہت پیچھے رہ گئے تھے اور یورپی ممالک [جو] سولہویں صدی عیسوی سے پہلے کئی صدیوں تک اسلامی [مما]لک کے مقابلے میں پیچھے تھے سیاسی عسکری اور تہذیبی [میدا]نوں میں نہ صرف ان سے بہت آگے نکل گئے بلکہ عملی طور [پر ا]ن کے حاکم بن گئے اور تین سو سال تک انہوں نے جزائر [شر]ق الہند سے لے کر بحر اوقیانوس کے مشرقی ساحلوں تک [تما]م مسلمان ممالک کو اپنا غلام بنائے رکھا ان تین صدیوں کے [دور]ان صرف ترکی اور ایران دو ایسے ممالک تھے جو آزاد رہ [سک]ے تھے اور عرب ممالک بھی ترکوں کی سرپرستی کی بدولت ہی [یور]پی اقوام کی غلامی سے کسی قدر بچے رہے باقی تمام ممالک جن [میں ب]رصغیر ہند و پاکستان ملائشیا انڈونیشیا اور ہند چینی کے علاقے [خص]وصیت سے قابل ذکر ہیں یورپی اقوام کے محکوم ہو گئے تھے [عج]یب ہے کہ افغانستان جو کسی زمانے میں بھی محکوم نہ رہا تھا [انگر]یزوں کے بالواسطہ تسلط کے نیچے ایسا دب گیا تھا کہ کسی [دوس]رے ملک کے ساتھ اپنے طور پر کوئی سیاسی معاہدہ بھی نہ کر [سکت]ا تھا

مسلمانوں کے اس دردناک دور غلامی کی سب سے بڑی [خراب]ی یہ تھی کہ ان کے حکمرانوں نے عوام کی تعلیم کی طرف قطعاً [کوئی] توجہ نہ دی تھی حکومتی سطح پر تعلیمی ادارے قائم کرنے کا [رواج] ہی نہ رہا تھا صرف مخیر حضرات نے کہیں کہیں تعلیمی [ا]دارے قائم کئے ہوئے تھے جہاں طلباء آ کر تعلیم حاصل کیا [ک]رتے تھے اور ہر چند کہ ان تعلیمی اداروں کے طلباء کو تعلیم [ح]اصل کرنے کے علاوہ کھانے پینے لباس و رہائش کی تمام [س]ہولتیں انہی اداروں کی طرف سے حاصل ہوتی تھیں لیکن اس [ک]ے باوجود طلباء کی تعداد بہت محدود ہوتی تھی طلباء کی تعداد کے [مح]دود ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نصاب تعلیم جو [ص]دیوں پرانا تھا روز مرہ کی زندگی میں بہت کم کام آتا تھا اور [ح]قیقت میں ایسا علم تھا جس کے بارے میں آنحضورؐ دعا فرمایا [ک]رتے تھے کہ اللھم انی اعوذبک من العلم لا ینفع اے خدا میں [ا]س علم سے پناہ مانگتا ہوں جو فائدہ نہ پہنچائے

البتہ اس دور میں مساجد کے ساتھ مکتب قائم تھے جہاں امام اور خطیب بچوں کو رضاکارانہ طور پر تعلیم دیا کرتے تھے مساجد میں دی جانے والی تعلیم زیادہ تر ابتدائی دینی تعلیم ہوا کرتی تھی اس تعلیمی نظام میں ناظرہ قرآن اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں یعنی کریما پندنامہ شیخ عطار نام حق وغیرہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں علاقائی زبانوں میں بھی دینی تعلیم دی جاتی تھی جس سے بچے ابتدائی دینی مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے پڑھنے کے ساتھ لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا اور اس طرح ان مکاتب کے پڑھے ہوئے بچوں کی بدولت خواندگی کا تناسب خاصا بلند تھا

انگریزوں کے دور حکومت میں ان ابتدائی دینی مدارس کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی چلی گئی حصول معاش کے لئے لوگوں نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کی تاہم سکول کم تھے اور دور دور مقامات پر واقع تھے اس لئے عام والدین کے لئے اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا بہت مشکل تھا اس طرح شرح خواندگی کم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا خواندگی کی شرح بارہ تیرہ فی صد سے زیادہ نہ تھی اور لڑکیوں کی تعلیم کا تناسب تو اور بھی کم تھا

حکومت نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا اقراء پراجیکٹ کے تحت تعلیم کی توسیع کے لئے انقلابی اقدامات شروع کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ موثر اقدام نئی روشنی سکول ہیں جنہیں کثیر تعداد میں کھولنے کے منصوبے تیار کئے گئے ہیں اس وقت جو پرائمری سکول ملک کے اندر موجود ہیں ان میں نئی روشنی سکولوں کی وجہ سے معقول اضافہ ہو گا اور لاکھوں بچوں کو جو آج کل سکول دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یونہی گلیوں میں آوارہ پھر رہے ہیں داخلہ مل جائے گا اور چار پانچ سال کے اندر توقع ہے کہ خواندگی کی شرح میں کافی اضافہ ہو جائے گا

اقراء پراجیکٹ کے تحت راولپنڈی اور اسلام آباد میں تعلیم بالغاں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے اور جیسا کہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے بہت لوگوں نے پرائیویٹ طور پر ناخواندہ افراد کو پڑھانے کا کام شروع بھی کر دیا ہے تاہم اس سکیم کے فوائد تو کچھ عرصے کے بعد ہی معلوم ہو سکیں گے

شرح خواندگی میں اضافہ

تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شرح خواندگی میں قابل لحاظ اضافہ صرف زیادہ سے زیادہ بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے سے ہو سکتا ہے بالغ افراد خصوصاً ایسے افراد جن کی عمر چالیس سال سے زائد ہو چکی ہو ان کی تعلیم سے شرح خواندگی میں اگر وقتی طور پر اضافہ ہو بھی جائے تو وہ اتنا قلیل ہو گا کہ اس سے مجموعی طور پر بہت کم فائدہ ہو گا دوسری بات یہ ہے کہ بالغ افراد کی تعلیم میں استادوں کو جتنا محنت کرنا پڑتی ہے اور خود تعلیم حاصل کرنے والوں کو جتنا وقت اور محنت صرف کرنا پڑتی ہے اس کے مقابلے میں حاصل ہونے والے ثمرات نہایت قلیل اور ناقابل اعتنا ہوتے ہیں بالغ بالخصوص عمر رسیدہ افراد کو تعلیم دینا ایسے ہی ہے جیسے پرانے اور اندر سے کھوکھلے درختوں کو پانی اور کھاد دے دے کر ہرا بھرا رکھنے کی کوشش کی جائے حالانکہ وہ تمام پانی اور کھاد نئے پودوں اور درختوں پر صرف ہونی چاہئے تاکہ ان کی نئی نئی کونپلیں بھی نکل سکیں اور ان سے پھل پھول بھی حاصل ہو سکے

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو چاہئے کہ وہ ملک کے اندر زیادہ سے زیادہ پرائمری سکول کھولیں اس مقصد کے لئے پرائمری تعلیم کا شعبہ از سر نو لوکل باڈیوں یعنی میونسپل کارپوریشنوں کمیٹیوں اور کنٹونمنٹ بورڈوں کے سپرد کر دیا جائے دیہات میں بھی تمام پرائمری تعلیم از سر نو ڈسٹرکٹ کونسلوں کے حوالے کر دینی چاہئے اور ہر ڈسٹرکٹ کونسل میونسپل کارپوریشن کمیٹی اور کنٹونمنٹ بورڈ کے اپنے تعلیمی افسران ہونے چاہئیں جو ان سکولوں کی ہمہ وقت نگرانی کریں اور اساتذہ کو [illegible] کام میں سست نہ ہونے دیں پرائمری سکولوں کے علاوہ مڈل اور ہائی سکول بدستور صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی تحویل میں رہیں ان اقدامات سے تعلیم کے میدان میں دو چار سال کے اندر ہی انقلابی توسیع ہو سکتی ہے اور شرح خواندگی پچاس ساٹھ فی صد تک بڑھ سکتی ہے اور ملک صحیح معنوں میں ترقی کرنے کے قابل ہو سکتا ہے

تعلیمی پسماندگی کا مسئلہ دوسرے کئی ممالک کے لئے بھی درد سر بنا رہا لیکن ان ممالک میں بے علمی اور جہالت کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا گیا اور اس جہاد کے ذریعے تھوڑے ہی عرصے میں ان قوموں کی کایا پلٹ گئی ترکی میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد قومی حکومت قائم ہوئی تو اتاترک نے جس مسئلے کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی وہ تعلیم کا مسئلہ تھا اتاترک نے قوم کو حکم دیا کہ وہ شہروں میں محلے محلے میں اور دیہات میں ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں سکول قائم کریں ان سکولوں میں نہ صرف بچے تعلیم حاصل کریں بلکہ شام کے وقت ناخواندہ بالغ بھی تعلیم حاصل کریں اس سلسلے میں اتاترک نے اتنی دلچسپی لی کہ وہ مختلف مقامات پر جاتے اور خود سکولوں میں بچوں اور بالغوں کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھتے تھے بعض مقامات پر تو وہ خود بھی تھوڑی دیر پڑھا کر لوگوں کو علم سیکھنے کی طرف مائل کرتے تھے

ترکی میں تعلیمی پھیلاؤ کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے یہ ہے کہ حکومت نے سکولوں کے لئے اعلیٰ عمارتوں کی تعمیر کی مطلقاً پرواہ نہ کی جیسی معمولی عمارتیں میسر آئیں انہی کے اندر سکول جاری کر دیئے گئے پاکستان میں بھی تعلیم کی توسیع کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ سکول قائم کئے جائیں اور اس مقصد کے لئے جیسی عمارتیں بھی دستیاب ہوں انہیں کام میں لایا جائے اعلیٰ قسم کی عمارتوں کی تعمیر سے ایک تو تعلیمی بجٹ کا زیادہ روپیہ عمارات پر خرچ ہو جاتا ہے دوسرے وقت کا ضیاع بہت ہوتا ہے وقت اور روپے پیسے کا اس طرح کے بے جا صرف سے بچنا تعلیمی مقاصد کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے

تعلیم کی توسیع کے لئے اس وقت زیادہ سے زیادہ پرائمری سکول کھولنے کی ضرورت ہے اور یہ پرائمری سکول حکومت یا مقامی کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کی طرف سے کھولے جانے چاہئیں تاکہ ان سکولوں میں فیسیں یا تو بالکل نہ ہوں یا اگر ہوں تو اتنی کم کہ غریب سے غریب والدین آسانی سے ادا کر سکیں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بڑے شہروں [میں] آبادی کے مقابلے میں بہت کم سکول ہیں بعض شہروں میں آج اتنے پرائمری سکول بھی نہیں جتنے قیام پاکستان کے وقت تھے حالانکہ گزشتہ چالیس سال کے دوران ان کی آبادی بڑھ چکی ہے اور اس وقت قیام پاکستان سے پہلے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ سکول ہونے چاہئیں تھے نئے پرائمری سکول نہ کھلنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں حکومت نے [تمام] سکولوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا تھا اور مرکزی حکومت کے علاقوں میں تمام سکول مرکزی حکومت کے اور [صوبوں کے علاقوں میں صوبائی] حکومتوں کی تحویل میں آ گئے اس سے لوکل سیلف گورنمنٹ کے ادارے یعنی میونسپل کارپوریشنیں کمیٹیاں ڈسٹرکٹ کونسلیں اور کنٹونمنٹ بورڈ اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہو [گئے]

برطانوی حکومت کے دور سے ہی مسلمانان برصغیر میں ناخواندگی کا تناسب بڑھتا آرہا ہے

صوبائی حکومتوں کی تحویل میں آنے سے دیہات میں [تو] سکولوں کی حالت تو بہتر ہو گئی اور آبادی کے اضافے [کے] ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں بھی معمولی اضافہ ہوتا رہا [لیکن] شہروں میں واقع پرائمری سکولوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا حالانکہ شہروں کے اندر آبادی میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا اگر شہروں میں سکول کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کی تحویل [میں] ہوتے تو مقامی کونسلر ہر علاقے کی ضرورتوں سے واقف ہونے کی بناء پر سکولوں میں مناسب اضافہ کراتے رہتے اور اس طرح وہ خلاء پیدا نہ ہوتا جو اس وقت تعلیم کے میدان [میں] شدت سے پیدا ہو چکا ہے تعلیم کے میدان میں خلاء پیدا ہونے کا سب سے زیادہ فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو تجارتی اصول پر تعلیمی ادارے چلا رہے تھے ۱۹۷۲ء میں تمام تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لیتے وقت ایسے لوگوں کے لئے ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا یعنی انگلش میڈیم سکولوں کو قومی تحویل میں نہ لیا گیا تھا سکولوں کی کمی اور تعلیم کے خواہش مند طلباء کی تعداد میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے ایسے سکولوں کی اہمیت بڑھ گئی اور انہوں نے اپنی فیسوں میں من مانی اضافے کر دیئے [کچھ عرص]ے چند سال پہلے جب حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دے دی تو گلی گلی اور محلے محلے میں انگلش میڈیم سکول کھلنے شروع ہو گئے ان سکولوں کے کھلنے سے مسئلہ اور بھی شدید صورت اختیار کر گیا کیونکہ ان کی فیسیں اتنی زیادہ ہیں کہ اوسط درجے کی آمدنی والے والدین ان کے متحمل نہیں ہو سکتے اور غریب لوگوں کے بچوں کی تعلیم کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں لہٰذا سکول نہ ہونے کی وجہ سے جتنے بچے آج بغیر تعلیم کے پھر رہے ہیں ان کی تعداد آج سے پندرہ بیس سال پہلے سکول نہ جانے والے بچوں سے کہیں زیادہ ہے ایسی صورت میں شرح خواندگی میں اضافہ کیونکر ہو سکتا ہے

روزنامہ مشرق لاہور ۶-۲-۸۷ء

MNAs question status of Urdu as national language

Dawn Islamabad Bureau

FEBRUARY 10: The question raised by Haji Fazle Raziq in the National Assembly on Tuesday as to whether the Government intend to introduce Urdu as the official language of the country by 1988 created a stir among some members of smaller provinces, who disowned Urdu as their "national language".

Those who opposed Urdu as national language included Mir Zafarullah Khan Jamali, Sardar Asif Ahmad Ali and former federal minister Syed Zafar Ali Shah

While the Parliamentary Secretary for Cabinet Division was informing the House about the steps being taken to promote Urdu in the country, Mir Zafarullah Khan Jamali stood up on a point of order and questioned "who says Urdu is our national language."

Opposing the national language he asked why Urdu was being imposed as a national language.

Syed Zafar Ali Shah also stood up and said that Sindhi was their mother tongue and they feel at ease while speaking in Sindhi.

Sardar Asif Ahmad Ali supported the contention of Mr Jamali and Mr Shah and observed that **Urdu was not a national language** but had the status of **"official language"**

Defending regional languages, **Syed Abida Hussain asked the** Parliamentary Secretary to explain the logic of adopting Urdu as a national language keeping in view the historical background of the language.

She said that it was as difficult for the people of various provinces to learn Urdu as was it difficult for Urdu-speaking people to learn regional languages. "Will these people also bear to learn regional languages," she questioned.

'73 CONSTITUTION: However, these members were accused by Mr Wasi Mazhar Nadvi of violating the 1973 Constitution, in which Urdu has been declared as the national language of Pakistan.

Mr Nadvi from Hyderabad said that all these members had taken oath under the 1973 Constitution and their opposition to adopt Urdu as a national language amounted to violation of the Constitution.

Mr Liaquat Baluch, a Jamaat-i-Islami member in the National As- [illegible]

Secretary to brief the House about the steps being taken by the Government to adopt Urdu as a National Language by 1988.

Shah Baleeghuddin also defended Urdu and pointed out that besides Constitutional provision, the Father of the Nation had also said that "the national language of Pakistan would be Urdu, Urdu and only Urdu".

Mr Gohar-ur-Rehman rising on a point of order asked the chair to direct the ministers to use Urdu as their medium of expression in the National Assembly

However, Minister for Justice and Parliamentary Affairs Wasim Sajjad **said** that the Ministers would be **ready** to use Urdu, provided, Mr Rehman spoke in English.

Pir Mohammad Ashraf pointed out to the chair that under the rules, not more than three supplementary questions could be asked on any particular question. He questioned the rules under which the chair was allowing the members to ask more than three supplementaries.

Speaker Hamid Nasir Chatha observed that the chair had the discretion to allow more than three supplementaries on any question.

ASSURANCE: The parliamentary Secretary for Cabinet Division assured the House that earnest efforts were being made to introduce Urdu in all the Government departments within a stipulated period of 15 years as enunciated in the 1973 Constitution (APP adds).

He said the Cabinet committee had set up two sub-committees in its last meeting to furnish their reports in this matter. The report of one sub-committee had been received while the report of other was being awaited after which, he added, decision would be taken.

To another question raised by Mr Hamza, he hoped that report of the Cabinet committee regarding the use of Urdu as medium of competitive examinations would be received soon.

The Parliamentary Secretary said that major recommendations made by the National Language Authority pertained to standardisation of key-board for Urdu typewriters, adoption of Urdu as the official language, greater use of Urdu in competitive examinations and adoption of Urdu as medium of instruction at [illegible]

programme.

He further said that 2500 Urdu typewriters were being manufactured by the telephone industry every year and 780 stenographers and steno-typists had been imparted training to carry out their official work in Urdu.

PROVINCE-WISE USE: In the Punjab, he said, most of the official work was being done in Urdu at the level of municipal committees, town committees, union councils, Zakat committees, schools, district councils, municipal corporations and the offices of assistant commissioners in the sub-divisions

In Sind, he said the business in most government offices (specially those in the field), educational institutions and the courts was carried out largely in English or Sindhi or both as had been the practice since before independence.

In NWFP, in police stations, municipal corporations/committees tehsils/sub tehsils, town committees, district and union councils, etc. business was largely carried out in Urdu. In the courts of civil judge and magistrates, statements of the parties concerned were recorded in the language in which they are made, that is either in Urdu or in Pushto in the courts of district and sessions' judges and higher judicial courts, evidence might be given/examined in Urdu or Pushto.

In Baluchistan, there had been a very substantial change-over to Urdu and most of the offices and courts are using Urdu either fully or partially, he said.

ماخذ: ڈان کراچی ۱۱ فروری ۸۶ء

اُردو کو اختیاری مضمون بنانے کی سازش

ایک مقامی اخبار میں یہ خبر نظر سے گزری کہ اسلامیات، مطالعۂ پاکستان اور اردو کو اختیاری مضامین کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

اردو کے بارے میں حضرت قائد اعظم نے دو ٹوک الفاظ میں فرمایا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی مگر آج کل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ اردو زبان کی بیخ کنی کے لئے کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا جس کی واضح مثال اردو کو اختیاری مضمون قرار دینے کا اعلان ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم اسلامیان پاکستان اس زبان کو گلے لگاتے کہ اس زبان کا خمیر ہمیں سے اٹھا تھا تو اسے سرکاری دفاتر میں بھی نہیں آنے دیتے۔

علاقائی زبانیں اپنی جگہ پر مگر رابطے کے لئے اردو ہی ایسی زبان ہے کہ اسے ہر جگہ بولا اور سمجھا جاتا ہے آج پاکستان کو وجود میں آئے ۳۹ برس ہو چکے ہیں مگر اردو زبان کو آج تک اس کا اصل مقام نہیں مل سکا جو کہ ملنا چاہیئے تھا یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرمن، چین، فرانس، جاپان وغیرہ میں ممالک کی قومی زبان ہی میں ہر طرح کی تدریس ہوتی ہے جبکہ ہمارے ہاں اس کے برعکس ہو رہا ہے۔

آخر میں ہم صدر پاکستان سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ اردو زبان کے خلاف ہونے والی اس سازش کو ختم کریں اور اردو کی لازمی مضمون کی حیثیت جو کہ پہلے دی مگر آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں یہ زبان اپنے ہی گھر میں اجنبی نہ بن جائے۔ آخر کون سی وجہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں تو ڈاکٹری کی تعلیم بھی اردو میں ہوتی رہی مگر یہاں اس کے برعکس ہوا اور ارباب بست و کشاد کو چاہیئے کہ احکامات صادر فرمائیں اور ان مخصوص افراد کی جو رنگ پشت پناہی کر رہے ہیں انکو بے نقاب کیا جائے۔

(محمد افضل اعوان۔ گلبرگ III لاہور)

ہفت روزہ تکبیر ۱۵ / ۱ / ۸۷ء

یکساں اردو ٹائپ رائٹر مہیا کئے جائیں

کرمی۔ میں جناب صدر مملکت جنرل ضیاء الحق اور وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ حکومت اردو کو دفاتر میں رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے اس مقصد کے لئے گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوشن میں طلبہ کو اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت دی جاتی ہے لیکن جب وہی طلبہ عملی زندگی میں جاتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے جو مشکل درپیش ہوتی ہے وہ ٹائپ رائٹر کی ہوتی ہے کیونکہ جس ٹائپ رائٹر پر انہیں کمرشل انسٹی ٹیوٹ میں تربیت دی جاتی ہے دفاتر میں ٹائپ رائٹر اس قسم کا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اردو ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" کئی مرتبہ تبدیل ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے امیدواروں کو بہت زیادہ دشواری پیش آتی ہے اور کئی تو دل برداشتہ ہو کر چھوڑ دیتے ہیں اور پرائیویٹ ادارے اسی وجہ سے اردو ٹائپ رائٹر نہیں خریدتے اس ضمن میں آپ سے استدعا ہے کہ جس طرح انگریزی ٹائپ رائٹر کا "کی بورڈ" ایک ہے اسی طرح اردو ٹائپ رائٹر کا "کی بورڈ" بھی ایک ہی طرح کا ہونا چاہیئے اور جتنے پرانے ٹائپ رائٹر ہیں ان کی جگہ تمام دفاتر اور کمرشل انسٹی ٹیوشن میں ایک ہی طرح کے اردو ٹائپ رائٹر مہیا کئے جائیں تاکہ دفاتر میں اردو کی ترویج میں رکاوٹ نہ ہو سکے اور دفاتر میں جلد از جلد اردو کا نفاذ ہو سکے۔

○ — احسان اللہ اشرف، پی اے ٹو ڈپٹی ڈائریکٹر تعلقات عامہ لاہور ڈویژن

روزنامہ امروز لاہور ۳ / فروری ۸۷ء

ماڈل سکولوں میں پرائمری سیکشن کے مسئلے پر [illegible]

وفاقی وزیر تعلیم اس مسئلے پر قومی اسمبلی [illegible] بیان

راولپنڈی (سٹاف رپورٹر) وفاقی وزیر تعلیم نسیم آہیر نے مقامی ماڈل سکولوں میں پرائمری سیکشن ختم کرنے کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک تین رکنی کمیٹی تشکیل دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان انہوں نے وزیر تعلیم بچوں کے والدین کی ایکشن کمیٹی سے ملاقات کے دوران کیا۔ وفاقی وزیر نے کہا کہ حکومت بچوں کے والدین کے روئیے سے پوری طرح آگاہ ہے [illegible] کہ یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں بھی اٹھایا جا رہا ہے [illegible] اس ضمن میں پالیسی بیان [illegible] [illegible]

والدین ایکشن کمیٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے [illegible] اراکین والدین کی ایکشن کمیٹی اور [illegible] بچوں کے والدین سے لئے جائیں [illegible] ایکشن کمیٹی نے اس مطالبے کو بھی [illegible] بورڈ آف گورنرز میں والدین کو بھی شامل کیا [illegible] حکومت نے ماڈل [illegible] [illegible] کالونی کے مقام پر [illegible] سنٹر کے قیام

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۰ / فروری ۸۷ء

پرائمری کا نیا نصاب

تحریر: محمد مسرور کیفی

وفاقی وزیر تعلیم نے گزشتہ دنوں اس موضوع پر اظہار کرتے ہوئے جو معلومات بہم پہنچائیں ان کے مطابق یہ کتاب بیک وقت قومی اور علاقائی زبانوں میں شائع کی جائے گی اور طالب علموں کو اجازت ہو گی کہ کسی ایک زبان کا انتخاب کر سکیں۔ اس طرح پہلی جماعت سے اردو کی لازمی تدریس کی جو پابندی تھی اسے بالواسطہ طور پر ختم کیا جا رہا ہے۔ اس کی بنیاد یہ دل خوش کن خیال ہے کہ چونکہ جماعت چہارم سے اردو کی تدریس لازمی ہو گی اس لئے طلبہ ابتداء ہی سے قومی زبان کے انتخاب پر مجبور ہوں گے۔

اردو زبان کے ساتھ یہ سلوک اس سے پہلے انٹرمیڈیٹ کے موجودہ نصاب کو مرتب کرتے وقت بھی روا رکھا گیا ہے۔ قومی زبان کے خلاف اس دو طرفہ حملہ سے قومی حلقوں میں

پرائمری کی سطح تک نصاب کا مسئلہ ایک عرصہ سے توجہ طلب چلا آ رہا ہے۔ اس سطح پر مضامین کی کثرت اور کتابوں کی بھرمار کی طرف بار بار توجہ دلائی جاتی رہی ہے جس کے نتیجے میں وفاقی حکومت نے ایک نئی پالیسی وضع کی اور طے یہ کیا گیا، وزارت تعلیم اصولی طور پر اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے کہ پہلی سے تیسری تک کے بچوں کے لئے صرف ایک ہی نصابی کتاب ہونی چاہئے جس میں مختلف نصابی تقاضوں کو یکجا کر دیا جائے۔ اس مربوط نصاب کے ساتھ اہمیت کا مسئلہ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ ہے کہ یہ کتاب کس زبان میں پڑھائی جائے گی اور آگے چل کر اس کے مضمرات کیا ہو سکتے ہیں۔

تشویش کی [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] علاقائی اور اردو زبان کے بارے میں دو عملی اس سے پہلے بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۸۹ء کے بعد میٹرک کے امتحانات صرف اردو زبان میں ہوں گے اس پر درجہ بدرجہ عمل کرنے میں دس سال صرف ہوئے لیکن سال گزشتہ سوشل سیکورٹی نے جو سکول قائم کئے ہیں ان کی بالاصرار تشہیر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سکول انگریزی میڈیم ہوں گے [illegible] حکومت نے خود اپنی تردید کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے

اردو ذریعہ تعلیم کے ضمن میں بھی وفاقی وزیر تعلیم کا ارشاد یہ تھا کہ یہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا ہے اس لئے قابل عمل نہیں ہے۔ جس کا اعلان کابینہ کی منظوری کے بعد کیا جائے گا۔ دس سال کا طویل عرصہ اگر عجلت قرار دیا جا سکے تو پھر تحمل اور [illegible] مسائل کے متعلق سوچ کا یہ انداز کسی طور مستحسن نہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جس طبقہ کے لئے اردو ذریعہ تعلیم دشوار ہے انہیں پہلے ہی غیر ملکی امتحانات کی اجازت دی جا چکی ہے۔ اس طرح محاذ آرائی کی وہ صورت جو آزادی کے وقت سے اس فیصلہ میں مزاحم تھی ختم کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود اس فیصلے کو موخر کرنے کے ذرائع تلاش کرنا ناقابل فہم ہے۔

پرائمری کی اس نئی کتاب کے ساتھ ذریعہ تعلیم کے مسئلہ نے ایک بار پھر گھمبیر صورت اختیار کر لی ہے۔ علاقائی زبانوں میں تدریس کی اہمیت مسلمہ ہے اور ماسوائے پنجاب کے اس پر عمل [illegible] بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس نئی صورت حال میں اردو کو تدریس [illegible] ثانوی حیثیت دے کر پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ تیسری جماعت تک ایک بچہ جب اپنے مطالب کے اظہار پر مادری زبان میں دسترس حاصل کر لے گا۔ تو اس وقت اس کی قومی زبان کے ذریعہ تعلیم میں تبدیلی اس کے لئے نئی دشواریاں پیدا کر دے گی۔ اس طرح قومی زبان میں تدریس کا عمل تعطل سے دوچار ہو گا جس کا دائرہ وقت کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور رفتہ رفتہ یہ ہو کر رہ جائے اور یہ زبان جو ہمارے [illegible] سب سے مضبوط بنیاد ہے اتنی کمزور ہو جائے کہ گرمجوشی کی متحمل نہ ہو سکے کہ وطن کے مسائل [illegible] سب سے

علاقائیت کے بڑھتے ہوئے رجحانات [illegible] مشرقی حصہ میں بھی بے اعتمادی کی فضا [illegible] قومی رابطے کے اس موثر ترین وسیلے کو پس پشت ان حقائق کے پیش نظر ضرورت اس [illegible] میں ذریعہ تعلیم کی ترجیحات کا تعین [illegible] نصابی کتاب صرف قومی زبان میں پڑھائی حسب سابق علاقائی زبان کی تدریس کو بھی میٹرک کی سطح تک جس پالیسی کا اعلان [illegible] کیا گیا تھا اس پر قومی جذبے کے ساتھ عمل

روزنامہ نوائے وقت کراچی ۱۰ / فروری

نصاب تعلیم

اسلامیات، مطالعۂ پاکستان اور اُردو کے اخراج کی سازش

فاروق سلیمی

گزشتہ کچھ عرصے سے بحیثیت قوم ہماری بدنصیبی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کوئی خبر بھی اچھی نہیں ملتی اور پے در پے ایسے حادثات اور المیے وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں جو دل و دماغ اور جذبہ و احساس کو مجروح اور مضمحل کر دیتے ہیں۔ شاید غالب نے ہمارے ہی لئے کہا تھا ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

چونکہ کراچی کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے، فضا ابھی دھواں دھواں ہے اور دل سینوں کے اندر سہمے سکڑے دشمن کی سازشوں اور اپنوں کی حماقتوں پر ماتم کناں ہیں کہ بے رحم صیاد نے جسدِ قومی پر ایک بھرپور وار کیا ہے جو نتائج کے اعتبار سے بے پایاں جانی و مالی نقصان سے کہیں زیادہ خوفناک اور نظریاتی و ملی نقطۂ نظر سے غیر معمولی ہلاکت آفرینی کا حامل ہے۔ مگر افسوس کہ کئی دن گزرنے کے باوجود علمی، سیاسی اور صحافتی حلقوں کی طرف سے اس پر کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ شاید دشمن نے موقع محل پہچان کر تیر پھینکا ہے کہ جسم زخموں سے چور ہو تو روح پہ پڑنے والے پتھروں کو لوگ نظرانداز کر دیتے ہیں۔

فیصلہ ہوا ہے کہ تعلیمی نصاب میں سے اردو، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی لازمی حیثیت ختم کر کے اسے اختیاری درجہ دے دیا جائے یعنی جس طالب علم کا جی چاہے اس کی تعلیم حاصل کرے اور جس کا جی نہ چاہے اسے اختیار نہ کرے۔ اس کی بجائے آرٹس اور سائنس کے سب طلبہ و طالبات کو ریاضی اور شماریات لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کا پابند کیا جائے۔

وطن عزیز کے سیکولر اور دین بیزار طبقے پر یہ بات خواہ کتنی گراں گزرے، مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست ہے اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ تحریک پاکستان میں اسلام اور اردو نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان بنتے ہی یہاں اسلامیات کی تعلیم اعلیٰ ترین درجوں تک لازمی قرار دی جاتی، تمام تر ذریعۂ تعلیم اُردو زبان ہوتی اور قیام پاکستان کے محرکات، مقاصد نصاب کا لازمی حصہ بن جاتے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور اس کے جو خوفناک اثرات بے مقصد تعلیم کے حوالے سے نوجوانوں پر مرتب ہوئے اس پر کچھ کہنا بیکار ہے۔ ہر شعبۂ حیات کی ابتری اور زبوں حالی اس پر شاہدِ عادل ہے اور یہ سراسر بے مقصد تعلیم ہی کا فسانہ ہے۔

خدا خدا کر کے جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے

> **کیا تعلیم کے ذمہ دار پاکستانی نوجوانوں کو مادہ پرستی اور زراندوزی کا درس دینا چاہتے ہیں۔**

اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کو بی۔ اے تک لازمی قرار دے دیا۔ مگر بے رحم بیوروکریسی میں چھپے ہوئے اسلام اور پاکستان کے دشمنوں نے موقع ملتے ہی اس مفید اور بامقصد منصوبے کو ختم کرنے کا عزم کر لیا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ نئی نسلیں اسلام کی مبادیات اور تاریخ اسلام سے باخبر نہ ہو سکیں، ان میں مقاصدِ قیام پاکستان کا شعور بیدار نہ ہو، اُن کے دل و دماغ میں اُردو کی محبت جاگزیں نہ ہونے پائے نہ اُردو کے حوالے سے اُن کی زباندانی کی استعداد بہتر ہو سکے۔ بلکہ وہ بے مقصدیت کے اندھیروں میں نامک ٹوئیاں مارتے رہیں تاکہ مستقبل میں کوئی بھی عیار شکاری آسانی سے اُن کا شکار کر سکے۔

میں اس فیصلے کے ذمہ دار اصحاب سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ پاکستانی نوجوانوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک اخلاقی، روحانی اور ملی تقاضوں کی کوئی اہمیت نہیں؟ کیا آپ نوجوان نسلوں کو محض مادہ پرستی اور زراندوزی کا درس دینا چاہتے ہیں اور اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور اُردو کی تعلیم سے دُور رکھ کر اور ریاضی و شماریات کا ہیری لوجیا آن پہلا دکر کیا آپ انہیں سود خور مہند بنیوں اور یہودیوں کے راستے پر چلانا چاہتے ہیں؟ کاش آپ کے علم میں ہوتا یہودیوں نے اپنی صدیوں پرانی مردہ زبان ۔عبرانی۔ کو ازسرِنو زندہ کر دیا ہے۔ اور اسرائیل میں سو محکناف تو مہتوں کے یہودی ساری تعلیم عبرانی ہی میں حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح پورے اسرائیل میں یہودی مذہب کی تعلیم ہر سطح پر لازمی ہے اور ہر یہودی بچے کو ابتدا ہی سے نہ صرف یہودی تاریخ سے آگاہ کیا جاتا ہے بلکہ وسیع تر اسرائیل کے حوالے سے ان کے ذہنوں میں مستقبل کے یہودی عزائم کو راسخ کیا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال ہمارے پڑوس میں ہندوستان کی ہے۔ کیا ہندوستان میں ہندی زبان لازمی نہیں ہے اور کیا ہندو نوجوانوں کو اپنے مذہب اور تاریخ آزادی سے بے خبر رکھا جاتا ہے! کاش آپ لوگ روس کے نظام تعلیم ہی سے کچھ باخبر ہوتے اور آپ کو علم ہوتا کہ نظریاتی ممالک اپنے بنیادی نظریات کی کس انداز میں تعلیم دیتے اور ان کی حفاظت و اشاعت کا کیا اہتمام کرتے ہیں۔

ان مثالوں کی روشنی میں میں حیرت، افسوس اور کرب کے ساتھ آپ سے سوال کرتا ہوں کہ متذکرہ فیصلے کے حوالے سے آخر آپ کے عزائم کیا ہیں! اگر آپ کو اسلام سے پرخاش ہے تو کم از کم اس پاکستان ہی سے کچھ محبت کا ثبوت دیجئے جس کی وجہ سے آپ اتنی اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ بات تلخ ہے مگر آپ تو میر جعفر و صادق کا کردار ادا کر رہے ہیں اور پاکستان کے متشدد دشمنوں کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ افسوس آپ جس کشتی میں بیٹھے ہیں اسی میں سوراخ کر رہے ہیں اور جس چھتری نے آپ کو کڑی دھوپ سے بچا رکھا ہے، اسی کو پھاڑنے پر کمربستہ ہیں۔ کاش آپ اس انتہائی قیمتی ملک اور غیر معمولی باصلاحیت مگر قیادت کے اعتبار سے بدنصیب قوم سے یہ سنگدلانہ سلوک روا نہ رکھتے .... کاش۔

روزنامہ جسارت کراچی ۹-۲-۱۹۸۴

نصیر اعظم

بشیر احمد بلوچ سے ایک ملاقات

پاکستان کو بنے بمشکل تین سال ہوئے تھے، مسلمانوں نے ایک علیحدہ وطن تو لے لیا تھا مگر اس میں ابھی تمام کام باقی تھے۔ ابھی تو پورے طور پر کاموں کی ابتدا، بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہر شہر مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک انتشار کی کیفیت تھی ملک کے دور دراز علاقوں سے شہروں کو ملانے والے ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایسے میں ضلع مکران کا ایک نوجوان دسویں جماعت کے امتحان کے لیے سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ مکران اور کوئٹہ جو ترقیاتی ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے اب زیادہ دور نہیں رہے اس وقت ان میں میلوں کا فاصلہ حائل تھا اور یہ سفر کئی ہفتوں میں طے کیا جاتا تھا۔ نوجوان کا امتحانی مرکز کوئٹہ تھا۔ وہ اپنا اسباب لے کر مکران سے نکلا، راتیں اونٹ پر، سفر کرنے کے بعد پسنی پہنچا وہاں سے اسٹیمر پر کراچی اور پھر کراچی سے ٹرین پر کوئٹہ جا پہنچا۔ یہ باہمت نوجوان کوئٹہ ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر بشیر احمد بلوچ تھے۔

س۔ بلوچستان میں ذرائع ابلاغ کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟

ج۔ آپ کو معلوم ہے بلوچستان بہت وسیع علاقہ ہے۔ پورے ملک کی ۴۴ فیصد زمین پر بلوچستان قائم ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع اچھے نہیں ہیں، تعلیم کا تناسب بہت کم ہے یہ کل پاکستان کے تعلیمی تناسب کا دس فیصد ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اس تناسب میں قرآن شریف پڑھنے والے محض دستخط کرنے والے بھی شامل ہیں اور خواتین میں تعلیم بالکل کم ہے۔ ظاہر ہے اخبارات و رسائل پڑھنے والے بہت کم ہوں گے۔ اب لے دے کر ریڈیو ہی واحد ذریعہ ہے جس کی نشریات تک پہنچ جاتی ہیں لوگ سنتے ہیں۔ اس وقت بلوچستان میں کوئٹہ، خضدار اور تربت میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہیں مگر خضدار اور تربت کے ریڈیو اسٹیشنوں میں چھوٹا ٹرانسمیٹر نصب ہے۔ اب انشاء اللہ خضدار میں اسی سال کے آخر تک یا اگلے سال تک طاقت ور ٹرانسمیٹر نصب کر دیے جائیں گے۔ جن کی وجہ سے نشریات کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے گا اور جن علاقوں میں ریڈیو کی نشریات یا تو واضح نہیں سنائی دیتیں، یا بالکل نہیں سنائی دیتیں، وہاں تک بھی نشریات صاف طور سے سنائی دینے لگیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو ہی ایک اہم ذریعہ ہے جس کی مدد سے ملکی حالات لوگوں تک سرعت سے پہنچ جاتے ہیں اور ریڈیو کے مقاصد میں تعلیم اور تربیت شامل ہے۔ بلوچستان میں ریڈیو کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

س۔ ٹیلی ویژن کی آمد سے ریڈیو پر کوئی اثر پڑا؟

ج۔ ٹیلی ویژن کا دائرہ کار زیادہ تر شہروں تک محدود ہے کیونکہ دیہاتی علاقوں میں اول تو بجلی نہیں اور پھر ٹیلی ویژن کو ریچ نہیں ہے کیونکہ بوسٹرز زیادہ نہیں لگے کہ پورے علاقے تک ٹیلی ویژن کی نشریات پہنچ سکیں۔ اس لیے ریڈیو ہی ذریعہ ابلاغ ہے اور یہاں سے ساحل مکران تک ریڈیو ہی کارآمد ہے۔

س۔ بلوچستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں مختلف پروگرام، کن زبانوں میں نشر ہوتے ہیں؟

ج۔ کوئٹہ واحد اسٹیشن ہے جہاں سے روزانہ دو چینل پر تقریباً ۳۰ گھنٹے کے پروگرام ہوتے ہیں ان میں قومی پروگرام ہیں جو سارے کے سارے اردو زبان میں ہوتے ہیں اس کے علاوہ بلوچی میں تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے کے پروگرام ہوتے ہیں۔ پشتو

میں اتنے ہی دورانیے کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ براہوی میں تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کے پروگرام ہوتے ہیں اور ہزارگی (جو کوئٹہ کی فارسی زبان اور سرحد کے پار بولی جاتی ہے) میں ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام ہوتا ہے۔ روزانہ تمام ریڈیو اسٹیشنوں کے مقابلے میں کوئٹہ کی روزانہ نشریات سب سے زیادہ سنی جاتی ہیں۔

خ ج ۔ پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے کچھ عرصہ تک مکران ایک ریاست تھی وہاں آج بھی آمد و رفت کے ذرائع ناموزوں ہیں ہم لوگ اسکول میں تو پڑھتے رہے اور ہمارا ہائی اسکول پنجاب بورڈ سے ملحق تھا مگر امتحانی مرکز کے لیے وہ منظور شدہ نہیں تھا۔ دسویں کا امتحان دینے کے لیے بہت بڑا ایڈونچر کرنا پڑا۔ تربت سے ٹرک میں بیٹھ کر ۷۰۰، ۸۰۰ میل، تین راتوں میں پسنی گئے پھر وہاں سے اسٹیمر کے ذریعے کراچی اور پھر کراچی سے ٹرین میں بیٹھ کر کوئٹہ امتحان دینے آئے۔

س ۔ یہ کس سنہ کی بات ہے؟

خ ج ۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے ہمارے بیچ میں کوئی ۳۲ طلباء تھے اس میں سے ہم چار پاس ہوئے تھے۔ پھر ایس ایم کالج کراچی سے بی اے کیا، پھر کراچی یونیورسٹی (جو اس وقت سول ہسپتال کے پاس کچھ متروک گھر تھے ان میں یونیورسٹی کے مختلف شعبے تھے) وہیں سے ایم اے اکنامکس میں کیا۔

س ۔ ریڈیو تک کیسے رسائی ہوئی؟

خ ج ۔ اس وقت کراچی ریڈیو سے بلوچی میں پروگرام شروع ہوا تھا۔ ۴۵ منٹ کا شارٹ ویو پر وہاں پر میں جز وقتی اعلانات، کہانیاں وغیرہ پڑھنے جاتا تھا۔ ایم اے کے بعد پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہوا۔ ان دنوں بلوچستان اور سندھ کے لیے نئے اسٹیشن کھل رہے تھے۔ کوئٹہ میں ۱۹۵۶ء میں ریڈیو اسٹیشن کا آغاز ہوا تو پوسٹیں نکلیں ہم نے پی ایس سی کے ذریعے درخواست دی اور کامیاب ہو گئے۔

س ۔ اس وقت سے اب تک کی لوگوں کی ریڈیائی تحریروں میں کوئی فرق آیا؟

خ ج ۔ بڑا فرق آیا اور یہ فرق مجھے کوئی خوش آئند نظر نہیں آتا۔ آج سے ۴۰ سال پہلے ہم کوئٹہ سے ڈرامے نشر کرتے تھے۔ ریڈیو کی وجہ سے پہلی بار لوگوں نے سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا پھر باقاعدگی سے یہاں پر ڈرامے نشر ہوتے رہے، اس وقت یہاں یونیورسٹی نہیں تھی، کالجوں میں اتنے طالب علم نہیں تھے، یہاں پر سیکریٹریٹ نہیں تھا اب جبکہ یہ تمام چیزیں موجود ہیں تو کافی پڑھے لکھے لوگ کوئٹہ شہر ہی میں موجود ہیں، مگر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ لوگ ڈرامے نہیں لکھتے۔ پہلے مصنفوں کا معاوضہ بہت کم تھا اس زمانے کی بات ہے جب یہ سرکاری محکمہ تھا۔ ہم کسی اچھے مصنف سے کوئی اچھا سا ڈرامہ لکھوا لیتے تو ان کو معاوضہ کسی قدر اچھا ملتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے زمانے سے جو اصول قوانین چلے آ رہے تھے وہی برقرار تھے مگر ۱۹۷۲ء میں کارپوریشن بننے کے بعد ہمارے قواعد و ضوابط میں خاصی تبدیلی ہوئی، معاوضے کی شرح بڑھ گئی اور ایک طرح سے اسٹیشن ڈائریکٹر اور اسٹاف کو یہ سہولتیں مل گئیں کہ اگر کوئی اچھا ڈرامہ لکھ کر لائے تو اسے مناسب معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ یا تو لوگوں میں لکھنے کا جذبہ اور شوق نہیں رہا یا پھر شاید ہمارے پروڈیوسر حضرات ہی اتنی لگن سے کام نہیں لیتے اور لوگوں کے پاس جا کر نہیں لکھواتے اس کا مجھے صدمہ ہے۔

س ۔ اس کی وجہ ٹیلی ویژن تو نہیں؟

خ ج ۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کی نشریات کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے مگر ٹیلی ویژن کی نشریات کا دائرہ شہروں تک محدود ہے جہاں لوگ ٹی وی خرید سکتے ہیں، ریڈیو ڈرامہ سننے والے ابھی موجود ہیں۔ دور دراز علاقوں میں بھی اور شہروں میں بھی۔ شہروں میں ابھی صد فی صد لوگوں کے پاس تو ٹیلی ویژن موجود نہیں۔ پھر ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے کہ جس کے ذریعے ہم کوئی بھی پیغام لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں چنانچہ اس کے لیے ہم عموماً ڈرامے رات میں نشر کرتے ہیں اور دوپہر ڈیڑھ بجے دوبارہ وہی ڈرامہ نشر ہوتا ہے۔

س ۔ کس زبان میں؟

ج ۔ یوں تو کئی زبانوں میں ڈرامے نشر ہوتے ہیں مگر قومی زبان میں زیادہ ڈرامے نشر کرتے ہیں ۔ یہاں چونکہ اردو زبان ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اس کا اثر بھی ہوتا ہے ۔

س ۔ سماجی برائیوں پر یقیناً آپ نے ڈرامے نشر کیے ہوں گے مگر کیا ان کا کوئی اثر بھی عوام پر پڑا ۔

ج ۔ ہاں ۔ اب یہی دیکھیے ہمارے ہاں شادیوں میں ایک بڑی رقم لڑکی والوں کو دی جاتی ہے جسے پشتو میں "ور بل" کہتے ہیں ۔ براہوی اور بلوچی میں لب ہم نے یہ نظریہ رکھ کر ڈرامے لکھوائے کہ یہ چیز معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ ہے ۔ ان چیزوں کا اثر بہرحال ہوا اور معاشرے میں تبدیلی آئی ۔

س ۔ "ہّام درک اور مست توکلی" جن پر آپ نے بھی کام کیا ہے ان کے ترجمے ہوئے ہیں کہ نہیں !

ج ۔ جام درک کا ترجمہ میر مٹھا خان مری نے کیا اور اکادمی ادبیات والے اسے شائع کریں گے ۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس کا منظوم ترجمہ اردو میں شائع کروں ۔ عابد رضوی صاحب میری مدد کر رہے ہیں ۔

س ۔ بلوچستان نے سب سے پہلے اردو کو صوبائی زبان کی حیثیت دی کیا نیپ کی حکومت کے جاتے ہی اردو کی رخصتی بھی یہاں سے ہو گئی ؟

ج ۔ جی نہیں ۔ اردو زبان عوام کی زبان ہے ۔ اسے عام آدمی استعمال کرتا ہے جس کی نشست و برخاست اسی زبان میں زیادہ ہو وہ کیسے رخصت ہو سکتی ہے ۔ پھر ہمارے ہاں ذریعہ تعلیم بھی اردو ہے ۔ ایک بات مزید کہوں گا کہ صرف نظام تعلیم بدل دینے سے دور رس نتائج حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اس نظام کے لیے وہ تمام اشیاء ہمیں فراہم کرنا ہوں گی جس کی بنیاد پر یہ نظام صحیح طور پر چل سکے ۔

س ۔ مثلاً ؟

ج ۔ مثلاً سب سے پہلے نصابی کتب تمام کی تمام اردو میں ہونا چاہییں ۔

واضح رہے کہ صرف ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد کتابیں بھی ساتھ ہی انگریزی زبان کو بہ حیثیت ایک غیر ملکی زبان کے بھی پڑھانا چاہیے تاکہ ہمارے بچے اگر باہر کہیں جائیں تو کام چلا سکیں ۔ میں سمجھتا ہوں قومی تشخص کے لیے قومی زبان کی ترقی بے حد ضروری ہے ۔

س ۔ آپ کے ہاں دفتری کام اردو ہی میں ہوتا ہے !

ج ۔ اردو انگریزی دونوں ہی زبانوں میں ہو رہا ہے مگر اردو میں زیادہ

س ۔ کچھ افراد ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اردو کی ترقی پاکستان کی دوسری زبانوں پر اثر انداز ہو گی ؟

ج ۔ میرے خیال میں جو یہ کہتے ہیں وہ اردو کی وسعت سے اور اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں ۔ یہ زبان تو ہماری دوسری زبانوں کو مزید تقویت پہنچائے گی اور پہنچا رہی ہے اس کا دامن تو اتنا وسیع ہے کہ الفاظ دوسری زبانوں سے اردو میں آ رہے ہیں جو لفظ مقبول ہو گیا وہ پھر کہیں نہیں جاتا اردو کا ہو جاتا ہے اگر دیکھا جائے تو اردو نے کئی زبانوں کے مردہ الفاظ کو بھی زندگی عطا کی ہے آپ خود سوچیے کہ جو زبان کسی لفظ کو توانائی بخش سکتی ہے کیا وہ کسی زبان کو توانائی نہیں دے سکتی ! اردو سے صوبائی زبانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا ۔

قائدِ اعظم کا فرمان

اُردو ہماری قومی زبان ہے ہمیں اس کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ، آلودگیوں سے پاک اور مخالفین کے جارحانہ اور معاندانہ عزائم سے بچائے رکھنے کے لیے اپنی پوری توانائی اور زور لگا دینا چاہیے

دوسری کل پنجاب اُردو کانفرنس کے نام قائد اعظم کا پیغام ۱۳ فروری ۴۱ء

اشفاق الزمان خان

دفاتر میں اُردو کا استعمال

یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ وفاق اور صوبہ سرحد کی کئی وزارتوں، بلدیہ عظمیٰ کراچی اور ملک کے بہت سے مقتدر اداروں میں خط و کتابت کے لیے قومی زبان اردو کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ملک کے تمام سرکاری دفاتر میں اردو انگریزی کی جگہ لے لے گی۔ دفاتر میں اردو کا نفاذ کوئی ایسا وقت طلب امر نہیں تھا جس کے لیے برسہا برس انتظار کیا جاتا۔ جب ایک زبان کو قومی زبان قرار دے دیا تھا تو ہر سطح اور ہر مقام پر رائج بھی کرنا چاہیے تھا اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو پھر اسے قومی زبان کا درجہ دینا چہ معنی دارد!

اس وقت ہمارے ذرائع ابلاغ بھرپور طریقے سے اپنی قومی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آپس میں قومی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ تمام معاملات قومی زبان میں ہو رہے ہیں۔ دفاتر، دکانوں، کمپنیوں اور دوسرے بڑے اداروں میں ہر معاملے پر قومی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اعلیٰ اجلاسوں میں عام طور پر اردو ہی میں تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے۔ انگریزی کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے۔ لیکن جب تحریر کا مرحلہ آتا ہے تو انگریزی وارد ہو جاتی ہے۔ آخر جب زبانی طور پر تمام معاملات اپنی زبان میں فیصل ہو جاتے ہیں تو ایسی کیا وقت ہے کہ قرطاس پر منتقلی بدیسی زبان میں ہو۔

دفاتر میں اردو کے اختیار کرنے کے سلسلے میں بڑا مسئلہ ٹائپ مشینوں کا بتایا جاتا ہے۔ لیکن اگر سنجیدگی سے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو صورتحال کچھ یوں ہے کہ انگریزی کی جگہ اردو کے استعمال میں بہت سی سہولتوں کے علاوہ وقت کی بھی کافی بچت ہے۔ عام طور پر دفتر کا اہل کار کسی معاملے پر انگریزی میں مسودہ تیار کرتا ہے، جسے پہلے اسسٹنٹ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ یا ایڈمنسٹریٹو افسر یہاں تک کہ سربراہ ادارہ تک بغور پڑھ کر تصحیح کرتے ہیں۔ اس تصحیح کے بعد مسودہ ٹائپ کرایا جاتا ہے۔ ٹائپ کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب ٹائپ کی غلطیاں درست کی جاتی ہیں۔ اکثر مسودہ دوبارہ ٹائپ ہوتا ہے۔ اس طویل عمل کے بعد ایک خط تیار ہوتا ہے جس پر متعلقہ افسر اپنے دستخط کرتا ہے۔ اردو میں یہ عمل مختصر اور آسان ہو جاتا ہے۔ اپنی ہی زبان میں مسودہ نویسی کرنے میں اہل کار کو کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اسے جو کہنا ہوتا ہے بآسانی تحریر کر دیتا ہے۔ اردو میں خطوط ٹائپ کرانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ براہِ راست تحریر کیے گئے خط کو مستقل حیثیت دی جا سکتی ہے اگر خط کی زائد نقول درکار ہوں تو کاغذات کے درمیان کاربن لگا کر بآسانی صاف اور واضح کم از کم چار نقول تیار کی جا سکتی ہیں۔ زیادہ نقلیں حاصل کرنے کے لیے مشین کی مدد لی جا سکتی ہے

متذکرہ بالا سطور سے صاف عیاں ہے کہ انگریزی کے مقابلے میں اردو میں خط و کتابت میں نہ صرف سہولتیں زیادہ ہیں بلکہ وقت کا ضیاع بھی نہیں ہوتا اور کسی بھی قوم کے لیے وقت کا صحیح اور برمحل مصرف ہی اس کی خوشحالی اور ترقی کا عنصر اول ہوتا ہے۔

سب سے بڑا اعتراض جو قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی دورِ حاضر کی ترقی یافتہ زبان ہے جس میں جدید علوم موجود ہیں، لہٰذا انگریزی کو اپنا کر ہی ترقی کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر ملک میں، جسے وجود میں آئے ۴۹ سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور جہاں انگریزی کا سکہ قائم ہے، محصلہ نتائج سے بھی آگاہ کیا جائے۔ گنے چنے محترم حضرات کو چھوڑ کر بین الاقوامی معیار کے مختلف علوم و فنون کے ان لاتعداد ہم وطن ماہرین کی بھی ذرا نشاندہی کی جائے جنہوں نے بدیسی زبان میں تعلیم پا کر ملک کو ترقی پذیری سے نکال کر ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا ہو! اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو پھر اس تاریخی حقیقت کو بلا توقف تسلیم کر لینا چاہیے

کہ بدیسی زبان اپنا کر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی۔ جب اس خطے میں انگریزی کا دور دورہ نہیں ہوا تھا تب بھی تو کاروبارِ حیات رواں دواں تھا۔ بلکہ آج سے کئی گنا زیادہ خوش حال اور مستحکم معاشرہ وجود پذیر تھا۔

یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ انگریزی سے خواہ مخواہ تعصب برتا جائے۔ ہونا یہ چاہیے کہ جس زبان کی جتنی ضرورت ہو اتنا ہی اسے موقع دیا جائے اس دور میں انگریزی کی افادیت سے انکار بڑی جہالت ہوگی لیکن اس افادیت کی نوعیت الگ ہے اور قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت کی نوعیت الگ۔ اگر قوموں کی نظروں میں ان کی اپنی زبان کی اہمیت نہ ہوتی تو روس، چین، فرانس وغیرہ بھی انگریزی ہی کو اختیار کرتے۔ جب یہ ممالک انگریزی کا دست نگر ہوئے بغیر بھی مستحکم اور ترقی یافتہ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی زبان کو اپنی ہی فلاح کی خاطر جائز مقام دینے میں تردد کریں!

ہم کاروباری حضرات کی توجہ اس معاملے کی جانب مبذول کرانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تاکہ بعد میں ان کو کسی قسم کی پریشانی اور مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ملک کی خوشحالی اور ترقی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

خط و کتابت میں اردو کے استعمال سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے نہ اسے مسئلہ بنایا جائے نہ ہوا سمجھا جائے۔ چند سادہ اصول مقرر کر کے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کر دیا جائے۔ چند اصول جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ مسودہ نگاری میں سادہ اور سلیس زبان استعمال کی جائے۔ ثقیل اور نامانوس الفاظ کی شمولیت سے گریز کیا جائے۔ مقصد کو چھوٹے آسان جملوں میں بیان کر دیا جائے۔

۲۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لی جائے کہ اردو کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے اور اس میں انگریزی کے عمل دخل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انگریزی کے ایسے الفاظ جو اردو میں رچ بس گئے ہیں اور عام طور پر بولے جاتے ہیں انہیں بلا اکراہ استعمال کیا جائے۔ یہ اُردو کی خوبی اور خوبصورتی ہے کہ اس میں بدیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہو جاتے ہیں اور زبان کی روانی بھی برقرار رہتی ہے۔

۳۔ ایسی اصطلاحات جن سے فوری طور پر واقفیت نہ ہو ان کے ساتھ قوسین میں انگریزی اصطلاحات بھی درج کر دی جائیں ان اصطلاحات سے مانوس ہونے کے بعد قوسین میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال ترک کر دیا جائے۔

۴۔ ہمارا معاشرہ مشرقی اقدار کا علمبردار ہے لہٰذا یہاں کی روایات ادب و آداب اور محبت و انسیت کی چاشنی کو اپنی تحریروں میں نمایاں کیا جائے تاکہ یکجہتی اور قربت کا احساس قائم و دائم رہے۔ بنادٹی اور محض انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر دینے والی تحریروں سے گریز کیا جائے۔

۵۔ یہ خیال رکھا جائے کہ اس ملک کے عوام کی غالب اکثریت انگریزی سے نابلد ہے لیکن قومی زبان سے سب واقف ہیں جبکہ انگریزی جاننے والے اردو سے بھی آشنا ہیں۔ اس طرح اردو تو سب کی زبان ہے مگر انگریزی کے جاننے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ لہٰذا سب کی بہبود اور بھلائی اسی میں ہے کہ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے قومی زبان کو فروغ دیا جائے نہ کہ ایک مخصوص طبقے کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا "میں واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی"۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ بابائے قوم کے اقوال زرین اتحاد، تنظیم اور یقین محکم پر عمل درآمد تو قومی زبان کی ترویج و ترقی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

قائداعظم کے فرمان پر صدر مملکت نے یہ کہہ کر عمل درآمد شروع کرا دیا ہے کہ "پاکستان اور اردو کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے اردو پاکستانی قوم کی آواز ہے۔ اردو کی شناخت پاکستان سے ہے اور پاکستان کی شناخت اردو سے ہے"۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ کراچی ۱-۱۲-۸۶)

زبان ایک لباس کی طرح نہیں
ہے جسے اتار کر پھینک دیا جائے
—— یا ——
حسب منشا پہن لیا جائے

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

محمد امین

اصطلاحاتِ فلسفۂ موجودیت

فلسفہ موجودیت کی اصطلاحات کے یہ تراجم پروفیسر محمد امین صاحب نے ارسال کیے ہیں، جنہیں "اخبار اردو" میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین ان اصطلاحات کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع کر سکیں۔

(مدیر)

English	اردو	English	اردو	English	اردو
Image	تمثال	Conscious Being	وجود شعور	Absurd	لایعنی
Good and Evil	خیر و شر	Concrete Individual	فرد مبین	Absurdity	لایعنیت
Individual	فرد	Communication	ابلاغ	Anguish	کرب
Individuality	انفرادیت	Death	موت	Anxiety	اضطراب
Loneliness	تنہائی	Despair	مایوسی	Authentic	مصدقہ
Mind	ذہن	Dread	وحشت	Authentic Existence	موجود مصدقہ
Morality and Beyond	اخلاق و ماوراء	Essence	جوہر	Authentic Individual	فرد مصدقہ
Negation	نفی	Ethical Choice	اخلاقی انتخاب	Being	وجود
Nihilism	معدومیت	Existence	موجود	Being-in-itself	وجود فی نفسہٖ
Nothingness	لاشیئت	Existence precedes essence	موجود جوہر پر مقدم ہے	Being-for-itself	وجود لنفسہٖ
Object	معروض	Existential	موجودیاتی/موجودی	Being-in-the-World	وجود فی الدنیا
Objective	معروضی	Existentialism	موجودیت	Being and Nothingness	وجود و لاشیئت
Objectivity	معروضیت	Fear	خوف	Being and Time	وجود و زمان
Ontology	وجودیات	Fear and Trembling	خوف و لرزہ	Being-in-Time	وجود فی الزمان
Ontological	وجودیاتی	Falling	ہبوط	Being-in-advance of himself	وجود از پیش خود
Paradox	استبعاد	Freedom	آزادی	Body	جسم
Phenomenon	مظہر	Historicity	تاریخیت	Care	احتیاط
Phenomenology	مظہریات	Homesickness	فراق	Choice	انتخاب
Phenomenological	مظہریاتی	I and Thou	من و تو	Consciousness	شعور

امکان	Possible
استدامِ محض	Pure duration
ذمہ داری	Responsibility
خودی	Self
خود علیحدگی	Self estrangement
خود مغائرت	Self alienation
صورتِ حال	Situation
موضوعیت	Subjectivity
موضوعیت صداقت ہے	Subjectivity is truth
موضوعیت حقیقت ہے	Subjectivity is reality
زمانیت	Temporality
نزول	Thrownness
صداقت	Truth
غیر مصدقہ	Unauthentic
ابھی ہونا	Yet to be

حکومت پاکستان

وزارت اطلاعات ونشریات

اسلام آباد

نمبر ۱(۹)/ ۸۴ - ۹۴ - کوارڈ   مورخہ ۱۵/ جنوری ۱۹۸۶ء

موضوع : اُردو بطور دفتری زبان

وزارت ہذا میں اردو کے نفاذ کا اعلان ہوئے ایک عرصہ گزرنے کے باوجود کوئی خاطر خواہ پیش رفت اس سمت نہیں ہوسکی۔ ایک موقع پر سیکرٹری اطلاعات کے احکام پر مبنی ایک گشتی مراسلہ بھی جاری کیا گیا تھا جس میں جملہ افسران سے درخواست کی گئی کہ وہ مسلوں پر جو مختصر کیفیت نگاری (نوٹنگ) ہاتھ سے کریں وہ اردو میں کیا کریں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ سلسلہ بھی ختم نہیں تو کمزور ضرور پڑ گیا ہے۔

(۲) اسی طرح گزشتہ ماہ فروری میں کابینہ ڈویژن کی طرف سے اردو کے فروغ کے سلسلے میں موصولہ ہدایات بذریعہ وزارت ہذا تطہیر مورخہ ۴/ مارچ ۱۹۸۵ء جملہ افسران کو ارسال کی گئیں تھیں جن میں سے چیدہ چیدہ ہدایات درج ذیل ہیں:

۱۔ افسران اپنے دفتری کام کا کچھ حصہ اردو میں سرانجام دیں جس سے اردو میں تربیت یافتہ ٹائپ کار اور اسٹینوگرافر کی مشق جاری رہ سکے نیز اس سلسلے کو بتدریج وسعت دی جائے۔

۲۔ جہاں تک ممکن ہو مسلوں پر مختصر کیفیت نگاری اردو میں کی جائے۔

۳۔ اردو میں موصولہ خطوط کے جواب نیز عوام کے ساتھ خط و کتابت (جہاں تک ممکن ہو) اردو میں کی جائے۔

۴۔ چھوٹے ملازمین (سکیل ۱ تا ۴) کے ساتھ تمام مراسلت اردو میں کی جائے۔

۵۔ دفاتر کے لیے داخلی ہدایات/حکم نامے اردو میں جاری کیے جائیں نیز اندرونی اجلاسوں میں کارروائی اردو میں کی جائے۔

۶۔ تازہ رسیدوں پہ مختصر احکامات مثلاً "اسے فوری پیش کریں" "متعلقہ ریکارڈ کے ساتھ پیش کریں" وغیرہ اور دستخط اردو میں کیے جائیں۔

۷۔ مختصر مراسلات یاد داشت جہاں تک ممکن ہو اردو میں جاری کیے جائیں۔

۸۔ جنرل سیکشن سے مختلف اشیاء مثلاً اسٹیشنری وغیرہ اردو میں طلب کی جائیں۔

۹۔ چھٹی کی درخواست اردو میں تحریر کی جائے

(۳) درج بالا ہدایات پر عمل درآمد کی رپورٹیں جو کہ تین ماہ میں مطلوب تھیں بعض افسران سے حال ہی میں موصول ہوئیں، جن سے عام تاثر ملتا ہے وہ عمل درآمد میں سنجیدگی یا دلچسپی کا فقدان ہے جبکہ وقت کی ضرورت اس عمل کو وسعت یا فروغ دینے کی ہے اور یہ ہماری قومی ضرورت بھی ہے۔

لہٰذا جملہ افسران سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ وزارت میں اردو کے نفاذ کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور تعاون کریں اور تا حال اس سلسلے میں جاری کردہ احکامات کو بروئے عمل لانے کی اپنی مخلصانہ کوششیں تیز تر کر دیں نیز اس سلسلے میں عمل درآمد کی آئندہ رپورٹ فروری ۲۸، ۱۹۸۶ء تک پیش کی جائے۔

(ریحانہ گل)

ڈپٹی سیکرٹری رابطہ

حبیب صدیقی

اخبارِ اردو کے نام

اخبارِ اردو کے شمارہ نمبر ۵ میں اصطلاحات اصولِ تحقیق کے عنوان سے جناب سید جمیل احمد رضوی کی بنائی ہوئی انگریزی الفاظ کی اردو متبادلات شائع ہوئی ہیں اور اس ضمن میں ادارے نے رائے زنی کی خواہش ظاہر کی ہے چنانچہ راقم الحروف نے بہ نظرِ غور ان متبادلات کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو میں مشکل پسندی مشکلات کا باعث ہے اردو کے لیے یہ خطرہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یہ لکھنے کی اور بولنے کی کچھ اور ہوتی جا رہی ہے کسی زبان کے بولنے اور لکھنے میں تضاد ترقی کا باعث نہیں ہوتا۔ انگریزی زبان کی ترقی کا راز یہی ہے کہ اس کے بولنے اور لکھنے میں کوئی تضاد نہیں۔ تحریر اور تقریر میں یکسانی زبان کی ترقی کا باعث ہوتی ہے راقم الحروف اپنے کئی ایک مضامین[1] کے حوالے سے ایک مرتبہ پھر اہلِ زبان کی توجہ اس اہمیت کی طرف دلانا چاہتا ہے کہ اردو زبان سے متعلق اس قدر غلط پروپیگنڈا کیا جاتا ہے جس کی بنا پر عام طور پر غلط فہمی پیدا ہوتی رہی ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ اصطلاحات میں عربی فارسی کے دقیق اور نامانوس الفاظ اور فارسی تراکیب استعمال کی جاتی ہیں، بالخصوص سائنس کی متبادلات بنانے میں اکثر طلبہ کو یہ شکایت ہے کہ اصطلاحیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں حتیٰ کہ ان متبادلات کے معانی اردو لغات میں بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں مقصد یہ کہ متبادلات بنانے میں غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے یہ بات کہاں تک درست ہے میں اسی شمارے میں اصطلاحات کے تراجم کی اہمیت کے عنوان سے عرض کر چکا ہوں اردو ایک ملی جلی عوامی زبان ہے۔ اس کا تشخص اس بات میں ہے کہ متبادلات بناتے وقت اس کا یہ تشخص برقرار رکھا جائے مطلب یہ کہ ایک طالب علم جہاں انگریزی الفاظ کے مطالب سمجھنے کے لیے انگریزی ڈکشنری کا محتاج ہے اسی طرح اردو متبادلات کے سمجھنے کے لیے بھی اسے ایک اردو لغات کی ضرورت ہے چنانچہ وہ اس الجھن کا شکار ہے کہ اردو متبادلات کے معانی کہاں تلاش کیے جائیں جبکہ نصابی کتابوں میں بعض متبادلات اس قدر دقیق اور ثقیل الفاظ میں بنائی گئی ہیں جن کے معانی اردو لغات میں نہیں ملتے۔ اس صنعتی دور میں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت انگریزی زبان نے کم و بیش دنیا کی ساری زبانوں کو مقابلہ کی قوت سے محروم کر رکھا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں مقابلہ کی قوت موجود ہے، جس طرح جرمنی، فرانسیسی، چینی اور جاپانی زبانیں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اردو بھی ان کے مقابل آ رہی ہے۔ اصطلاح کے کام میں بول چال کی زبان کو استعمال کیا جائے تو مزید ترقی کی گنجائش ہے اس لیے کہ اردو زبان میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک ترقی یافتہ زبان کی ترویج کے لیے ممکن ہے۔ علاوہ ازیں خود انگریزی زبان طور پر سخت ترین زبان ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کی بین الاقوامی حیثیت نے دنیا کو اپنی تہذیب میں لپیٹ لیا ہے اور دنیا انگریزی تہذیب کے گرد گھومتی نظر آتی ہے ہمیں سرسید کی روش اختیار کرنی چاہیے[2] میں صرف ان ہی باتوں کو درخورِ اعتنا سمجھا جائے جو تعلیم و ترقی اردو کے مفاد میں ہوں ان مندرجات کے ساتھ مذکورہ بالا متبادلات کے[3] سے چند مشتق الفاظ پیش کرتا ہوں جو راقم الحروف کے خیال میں آسان عام فہم متبادل الفاظ ہیں۔

---

[1] اخبارِ اردو دسمبر ۱۹۸۳ء۔ جون ۱۹۸۲ء ستمبر ۱۹۸۲ء شمارہ ۵ ۱۹۸۶ء ماہنامہ قومی زبان انجمن ترقی اردو فروری ۱۹۸۳ء

انگریزی الفاظ	جمیل احمد رضوی متبادلات	حبیب صدیقی کے مشق الفاظ	تبصرہ
۱۔ Action research	عملی تحقیق (شائع شدہ اخبار اردو شمارہ ۵)	تحقیقی کام	عملی تحقیق کے لیے انگریزی اصطلاح action research بھی غلط ہے راقم الحروف نے یہ الفاظ کہیں نہیں پڑھے ان الفاظ کو کہاں استعمال کیا جاتا ہے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ نوٹ :۔ عملی تحقیق کے لیے انگریزی میں Practical research کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔
۲۔ Analysis of data	تجزیہ معطیات	امور معلومہ تجزیاتی معلومہ	Analysis of Data یہاں Analyse نہیں لکھا۔
۳۔ Analysis of Problem	مسئلے کا تجزیہ	* مسئلہ کا تجزیہ	تجزیہ - Analyse تجزیات - Analysis مسئلہ جمع کے صیغے میں استعمال کیا گیا ہے جب کہ Problem Singular Form ہے۔
۴۔ Archival Collection	دستاویزی ذخیرہ	دستاویزی مجموعہ	محافظ خانہ کا دستاویزی مجموعہ۔ ذخیرہ کے لیے انگریزی میں Store کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دستاویزی ذخیرہ تو مختلف دستاویزات کا بھی ہو سکتا ہے لیکن یہاں لفظ Archival ہے جس سے مراد وہ دستاویزی مجموعے جو آثارِ قدیمہ کے دفتر میں ہوتے ہیں۔
Archieve		محافظ خانہ یا دفترِ دستاویزات قدیمہ	
Archives		دفاترِ آثارِ قدیمہ	
۵۔ Authority		با اختیار	
Authorize		مختار	
Authorized		مجاز	
۶۔ Cause	علت	وجہ، سبب	
Cause and effect	علت و معلول	وجہ اور اثر	
Central Tendency	مرکزی میلان	درمیانی رجحان	
Check list	پڑتالی فہرست	فہرست جانچ جانچی ہوئی فہرست	

اسلوبِ انشاء کے مطابق جب کسی لفظ کا آخری حرف ہائے ہوز اور بعد میں کوئی اضافتی لفظ (کا۔ کے۔ کی) آئے تو ہائے ہوز کو یائے مجہول میں بدل دیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

۱۰-	Collection of data	معطیات کی جمع آوری	جمع شدہ معلومات	
۱۱-	Critical out look	تنقیدی زاویۂ نگاہ	تنقیدی نظریہ یا نظریات	
۱۲-	Deduction	منطق استخراجی	منہاجی استخراج	
۱۳-	Deed	وثیقہ	دستاویز	
۱۴-	Descriptive [illegible]	شماریات بیانیہ	بیانی شماریات	
۱۵-	[illegible] Variable	متغیر مستقل	خود متغیر۔ بدلا ہوا	
۱۶-	Internal appraisal	داخلی جانچ پڑتال	اندرونی جانچ	
۱۷-	Internal Criticism	داخلی تنقید	اندرونی تنقید	
۱۸-	Interview			یہ لفظ اردو میں داخل ہو چکا ہے اس کی ضرورت یہاں بے محل ہے۔ جمع انٹرویو جات میں سے کی ہے۔
۱۹-	Irrelevent variable	غیر متعلقہ متغیرات	بے تعلق بدلتی حالت	
۲۰-	Mechanical Records	میکانکی ریکارڈ		
۲۱-	Mode	طور کثرتیہ	مزاج	
۲۲-	Multiple Causeative Variables	متعدد تعلیلی متغیرات	دو وجوہاتی تبدیلیاں	
۲۳-	Objective Critarian	معروضی معیار	خارجی معیار	
۲۴-	Open System	تغیر پذیر نظام	کھلا نظام	
۲۵-	Qualitative Variable	کیفیاتی متغیرات	کیفیتی متغیر	
۲۶-	Quantitative variable	مقداری متغیرات	مقداری متغیر	
۲۷-	Ratio	نسبت		
۲۸-	Ratio Scale	نسبتی پیمانہ	نسبتی درجہ	
۲۹-	Review	جائزہ	نظر ثانی	
۳۰-	Sampling Techniques	نمونہ بندی کی تیکنیکیں	نمونوں کی ہنرمندی	اگر نمونوں کی ترکیبیں کہا جاتا بہتر تھا لیکن تیکنک کی جمع تیکنیکیں عجیب اصطلاح ہے اس متبادل سے مقصد واضح نہیں ہوتا
۳۱-	Statement of of Problem	بیان مسئلہ		
۳۲-	Style of Writings	انداز تحریر	طرز تحریر	
۳۳-	Survey	سروے، جائزہ	جانچ پڑتال	موصوف review کی اصطلاح جائزہ بنا چکے ہیں جبکہ review اور Survey کے معانی اور مطالب مختلف ہیں۔
۳۴-	Tertiary Sources	مصادر ثالثہ	ارضیاتی ذرائع یا ارضی ذرائع	

نظیر صدیقی

تعارف و تبصرہ

مشفق خواجہ - ایک مطالعہ

مشفق خواجہ پاکستان کے نہایت گوشہ نشین ادیبوں میں سے ہیں ان کی گوشہ نشینی کے بنیادی اور ضمنی اسباب تحقیق کے لیے ایک جاندار موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہر حال ان کی گوشہ نشینی کا ایک اہم سبب ان کا محقق ہونا بھی ہے کہ جب تک انسان بتا مار کر اپنے ذاتی کتب خانے میں نہ بیٹھے تحقیق کے میدان میں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مشفق خواجہ بڑی مشکل سے کسی سفر پر آمادہ ہوتے ہیں ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ سفر کرنے سے زیادہ قصد سفر کو توڑنے اور رخت سفر باندھنے سے زیادہ رخت سفر کو کھلا رکھنے میں صرف ہوا ہے۔

نہ جانے وہ کون سی مبارک ساعت تھی جب انہوں نے بھارت کے سفر کی نیت باندھی اور پچھلے سال (۱۹۸۵ء) کے آخر میں اس سفر پر روانہ بھی ہو گئے۔ سب سے پہلے دلی پہنچے اور بڑی حد تک اسی انداز سے پہنچے جس انداز سے ماضی میں کئی مہم آزماؤں کے پہنچنے کا ذکر معتبر تاریخوں میں درج ہے یعنی" میں آیا۔ میں نے دیکھا اور میں نے فتح کر لیا"۔ جہاں تک فتح کرنے کا تعلق ہے دراصل وہ کراچی میں بیٹھے نہ صرف دلی بلکہ پورے بھارت کو فتح کر چکے تھے۔ بھارت کے موجودہ حکمران بھارت کو فتح کرنے کے فقرے کا برا نہ مانیں یہاں بات علمی فتح کی ہو رہی ہے نہ کہ عسکری فتح کی۔ مشفق خواجہ شہرت اور مقبولیت کی تلاش میں کبھی نہ نکلے البتہ شہرت اور مقبولیت ان کی تلاش میں ہمیشہ رہی۔ چنانچہ دلی میں ان کے ورود مسعود پر ان کے بھارتی قدر دانوں اور مداحوں نے دو کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک تو ان کی اہم تحقیقی کتاب غالب اور صفیر بلگرامی کا بھارتی ایڈیشن اور دوسری زیر تبصرہ کتاب جس میں مختلف زاویوں سے ان کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے لیے مالک رام، مجتبیٰ حسین (مشہور ہندوستانی مزاح نگار)، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر شمیم حنفی جیسے ممتاز بھارتی اہل قلم نے صرف تین دن میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر مضامین لکھے اور کل ڈیڑھ ہفتے کی قلیل مدت میں دونوں کتابیں شائع ہو گئیں۔ ڈیڑھ ہفتے میں دو کتابوں کا شائع ہو جانا یقیناً مشفق خواجہ کے بھارتی قدر دانوں اور مداحوں کے خلوص کا معجزہ ہے اور ایک ایسا معجزہ جو پاکستان میں اپنے آپ کو دہراتا نظر نہیں آتا۔ مشفق خواجہ - ایک مطالعہ، کے مرتب بھارت کے نامور محقق ڈاکٹر خلیق انجم ہیں جو نہ صرف ان دو کتابوں کی طباعت میں پیش پیش رہے ہیں بلکہ جنہوں نے زیر تبصرہ کتاب میں ذکر خیر مشفق خواجہ کا کے عنوان سے مشفق خواجہ کے سوانحی حالات لکھے ہیں اور ان کی ادبی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ مشفق خواجہ کے آئندہ سوانح نگار ڈاکٹر خلیق انجم کے اس مضمون کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

کتاب کا دوسرا مضمون "مشفق خواجہ عرف خواجہ ادیب نواز" بھارت کے مشہور و مقبول مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے اور یہ بات مبالغے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ مشفق خواجہ کی شخصیت پر اتنا دلچسپ اور شگفتہ مضمون شاید ہی آئندہ لکھا جا سکے۔ اس مضمون کے لیے ہم سب لوگوں کو مجتبیٰ حسین کا اور مجتبیٰ حسین کو مشفق خواجہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہیں مشفق خواجہ کی ذات میں اتنا جاندار موضوع ملا۔

آج کل بھارت کے مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کے علاوہ یوسف ناظم بھی بہت نمایاں ہیں۔ یہ مشفق خواجہ کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں دونوں مزاح نگاروں نے خراج تحسین پیش کیا ہے، جس کے بجا طور پر حق دار وہ یوں ہیں کہ وہ خود بھی برصغیر کے بہترین مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ مشفق خواجہ کی مزاح نگاری (بہ شکل کالم نگاری) پہلے ایک راز تھی بعد میں وہ ایک کھلا راز بنی اور اب اس میں راز کا کوئی پہلو باقی نہ رہا۔ اہل خبر کے علاوہ بے خبروں کو بھی خبر ہو چکی ہے کہ قدرت نے ان کی ذات میں محقق اور مزاح نگار دونوں کو جمع کر دیا ہے جبکہ دونوں ایک شخصیت میں جمع ہونے پر کبھی راضی نہیں ہوتے حالانکہ یہ دونوں کام

ایک ہی طرح کا کرتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ محقق سنجیدگی سے کھال کھینچتا ہے اور مزاح نگار مزاحیہ انداز میں مزاح نگار کی حیثیت سے مشفق خواجہ ابھی تک اپنے فرضی نام (خامہ بگوش) کی نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔ یہ نقاب پوشی اس لحاظ سے بے ضرورت ہے کہ آج کل تو ڈاکو بھی نقاب پوش نہیں ہوا کرتے۔ ویسے مجھے ان کی نقاب پوشی پر زیادہ اعتراض یوں نہیں ہے کہ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کا نام فرضی سہی لیکن ان کا کام تو اصلی مزاح نگار ہی کا ہے۔

ایک محقق کا مزاح نگار ہونا اسے مہنگا پڑتا ہے۔ مزاح نگاری تحقیقی کارناموں کو پس پشت ڈال دیتی ہے سو اس قسم کا نقصان مشفق خواجہ کو بھی پہنچ رہا ہے۔ اردو ادب میں ان کی بنیادی حیثیت محقق کی ہے اور ثانوی یا ضمنی حیثیت مزاح نگار کی۔ لیکن اب ان کی بنیادی حیثیت ضمنی حیثیت بنتی جا رہی ہے اور ان کی ضمنی حیثیت بنیادی حیثیت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مزاح نگاروں کا ٹولہ چاہتا بھی یہی ہے کیونکہ اس کے نزدیک تحقیق کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ مشفق خواجہ محقق ہیں، مزاح نگار ہیں، شاعر ہیں۔ ایڈیٹر ہیں اور بڑے اونچے پائے کے ناشر بھی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتب کردہ کتاب سے ان کی آخر الذکر حیثیت کے سوا باقی تمام حیثیتوں پر خاطر خواہ روشنی پڑ رہی ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں پر مالک رام، رشید حسن خاں اور خلیق انجم جیسے ممتاز ترین ہندوستانی محققوں نے اظہار خیال کیا ہے اور ان کی کارکردگی کو بہت سراہا ہے۔ ان کی شاعری پر بھارت کے مشہور شاعر مخمور سعیدی نے مضمون لکھا ہے اور ان کا ایک نہایت معلومات افزا انٹرویو طاہر مسعود نے لیا تھا اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ان کی نثر و نظم کا انتخاب بھی دے دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ یہ کتاب خوبصورت کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر بڑے سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ماہنامہ کتاب نما کا مشفق خواجہ نمبر ہے۔ اس کی قیمت تیس روپے ہے۔

ملک اور قوم کی ترقی و خوشحالی کیلئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے، ڈاکٹر جالبی

جاپان اور ... عربی ممالک کا ... اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ...

اردو زبان میں سائنس پڑھنے والے امیدوار سائنس کو بہتر اور موثر طور پر استعمال کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں؛ اردو سائنس کالج میں نمائش کا افتتاح

کراچی ۱۳ دسمبر (اسٹاف رپورٹر) شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر جمیل جالبی نے مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہمیں اگر مغربی ممالک کا مقابلہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم منتخب کریں وہ آج یہاں دفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج میں سائنس کلب کے زیر اہتمام سائنسی نمائش کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہے تھے اس نمائش میں شہر کے ۲۲ کالجوں کے طلبہ و طالبات نے حصہ لیا ہے ان میں گورنمنٹ کالج میں سائنسی نمائش کا سلسلہ ۱۹۵۸ء سے برابر جاری ہے انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا بہت ضروری ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں انگریزی زبان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے بلکہ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ جو طلبہ اردو میں سائنسی مضامین پڑھتے ہیں ان میں انگریزی زبان میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے مقابلے میں زیادہ معلومات اور سمجھ بوجھ ہے وہ سائنس کو بہتر اور موثر طور پر استعمال کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں انہوں نے نمائش کے انعقاد پر آرگنائزرز کو مبارکباد دی اور توقع ظاہر کی کہ اردو سائنس کالج روایت کے مطابق سائنسی نمائش کا انعقاد کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس موقع پر اعلان کیا کہ کالجوں کے سائنسی کلبوں کو زیادہ موثر اور طلبہ کے لئے مفید بنانے کے سلسلے میں وہ عنقریب تمام کالجوں کے سائنس کلبوں کے سربراہوں کا ایک اجلاس طلب کریں گے بعد ازاں شیخ الجامعہ نے نمائش میں شرکت کرنے والے مختلف کالجوں کے طلبہ کے اسٹالز دیکھے اور ان کی کارکردگی کو سراہا ... گیس سے چلنے والی استری اور سستے داموں ... ان ... کا اظہار کیا۔ قبل ازیں کالج کے پرنسپل پروفیسر ... نجمی نے شیخ الجامعہ کا خیر مقدم کیا اور کالج کی کارکردگی اور اس نمائش کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ حریت کراچی ۱۴-۱۲-۸۶ء

... اردو سائنس کالج میں سائنسی نمائش ... دیکھ رہے ہیں (تصویر حریت)

مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام سیمینار

لاہور ۱۳ اکتوبر (پ ر) ملک میں اردو ٹیلی پرنٹر کی ترقی و ترویج اور اردو خبریات کی ترسیل میں سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ایک جامع منصوبہ پر مقتدرہ قومی زبان نے جو اقدامات کئے ہیں اسی تسلسل میں مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ایک دو روزہ سیمینار خبریات اور اردو ٹیلی پرنٹر کے موضوع پر منعقد کرایا جا رہا ہے پروگرام کو حتمی شکل ...

باقی صفحہ ... کالم ... پر

بقیہ — سیمینار

دینے کے لئے اردو اخبارات کے چیدہ صحافیوں اور مدیران سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے مقتدرہ قومی زبان نے اسلام آباد اور کراچی کے بعد لاہور میں ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ سیمینار کے اجلاسوں میں عامل صحافیوں کو شرکت کی دعوت دی جائے اور مربوط سفارشات مرتب کر کے حکومت کا تعاون حاصل کیا جائے کہ اردو ٹیلی پرنٹر کو اردو خبریات کی ترسیل کے لئے رائج کرنے کے اقدامات کرے اور ان اخبارات کے لئے جو گراں قیمت پر اردو ٹیلی پرنٹر خریدنے کی استعداد نہیں رکھتے آسان قسطوں پر اردو ٹیلی پرنٹر فراہم کرنے کا انتظام کیا جائے اس اجلاس میں ملک کے ممتاز اخباروں کے مدیران چیدہ صحافیوں، ریڈیو ٹیلی ویژن کے متعلقہ شعبوں کے ماہرین کے علاوہ بعض ہفت روزوں اور ماہناموں کے مدیران نے بھی شرکت ...

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۴-۱۰-۸۶ء

عدالتی کارروائی اردو میں ہونا چاہئے

... پی (پ ر) سوسائٹی برائے فلاح و بہبود اسیران کے جنرل سیکرٹری راشد سعید نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں نچلی عدالتوں سے اعلیٰ عدالتوں تک مقدمات کی سماعت و کارروائی تمام تر انگریزی میں کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدعی و ملزم عدالتی کارروائی سے قطعی طور پر نابلد رہتے ہیں انہوں نے کہا کہ حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کو بنے ہوئے انتالیس سال ہو گئے ہیں مگر ابھی تک پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کو باقاعدہ اردو کے قرار دے دینے کے عدالتی کارروائی اردو میں نہیں ہوئی۔ انہوں نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ فوری طور پر احکامات جاری کرے کہ تمام تر عدالتی کارروائی اردو ...

کسٹم اصطلاحات کی معیار بندی کا کام مکمل ہو گیا

اسلام آباد (نیوز ڈیسک) مقتدرہ قومی زبان کے زیر انتظام قائم کردہ مجلس استناد نے کسٹم اصطلاحات کی معیار بندی کا کام مکمل کر لیا ہے۔ مجلس استناد کے صدر سی۔ بی۔ آر۔ کے چیئرمین عرفان احمد امتیازی تھے۔ اصطلاحات حسین احمد شیرازی ...

نیویارک ٹائمز کے بیورو چیف کی ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات

اسلام آباد (نیوز ڈیسک) گذشتہ روز نیویارک ٹائمز کے جنوب ایشیا کے بیورو چیف ... نے ادارہ مقتدرہ قومی زبان میں ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات کی۔ ... نے پاکستان میں ... ترقی اور تحقیقی کام کے بارے میں ڈاکٹر ... قریشی سے گفتگو کی ... اردو زبان اور اس کے عمل ... سے تحقیقی کتاب مرتب کر رہے ہیں

مطبوعاتِ مقتدرہ

		غیر مجلد	مجلد
...تری امور			
...اصطلاحات دفتری		۵ روپے	-
...ترکیبات، محاورات اور فقرات کی لغت	مجیب الرحمان مفتی	۶۰ ″	۱۵۰ روپے
...ی مراسلت (انگریزی - اردو)	ڈاکٹر صدیق شبلی	۲۰ ،	۴۰ ،
...ری خط و کتابت (جلد اوّل) (زیر طبع)			
جلد دوم	ربیعہ فخری/محمد اظہار الحق		
جلد سوم	مسعود احمد حبیبہ		
جلد چہارم	پروفیسر نیاز عرفان		
...ں اور اداروں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ″	۳۰
...وصوبائی عہدوں کے نام	مجلس استناد	۱۵ ،	۳۰ ″
...اردو ٹائپ کاری	سید عرفان علی یوسف	۴ ،	-
...ٹائپ کاری (جلد اوّل)	نور احمد شاد	۱۵	-
جلد دوم	″ ″	۲۵	-
...احات حسابداری و محاسبی (سستا ایڈیشن - ۵ روپے)	مسعود احمد حبیبہ	۱۰ ،	۲۵ روپے
...احات بیمہ کاری	ڈاکٹر سہیل بخاری/حفیظ ملک	۲۰ ،	۳۵ ،
...قانونی اصطلاحات	مولوی فیروز الدین ڈسکوی	۱۲ ،	۲۰ ″
...لاحات عدلیہ و مالگزاری	ایچ ایچ ولسن	۲۵۰ ″	۳۵۰ ،
...اصطلاحات و محاورات قانون	مجلس اصطلاحات	۵۵ ″	۶۰ ،
...ان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۹۵	۱۱۰ ″
...رہ کے دفتری امور			
...داد اور قواعد و ضوابط			
...رہ قومی زبان (تعارف)			
...شاعت مقتدرہ			
...نہ رپورٹیں (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۵ء)			

			غیر مجلد	مجلد
۲۳	ہیئت حاکمہ کی رودادیں (زیر طبع)			
	لغات و کتب حوالہ			
۲۴	سائنسی و تکنیکی اصطلاحات	مجلس استناد	۲۵ روپے	۴۵ روپے
۲۵	اصطلاحات فنیات	ذیلی مجلس	۴۰ ″	۶۰ ″
۲۶	اصطلاحات مساحت	سید عارف رضوی	۳۰ ،	۴۰ ″
۲۷	اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد	۱۰ ″	۳۰ ،
۲۸	تعلیمی اصطلاحات	ذیلی مجلس	۴۵ ،	۶۰ ″
۲۹	اصطلاحات ریاضی	ذیلی مجلس - کراچی	۲۷ ″	۶۰ ″
۳۰	اصطلاحات ڈراما	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۱۵ ″	۳۰ ،
۳۱	کشاف اصطلاحات کیمیا	ڈاکٹر ایم اے عظیم	-	۱۲۰ ″
۳۲	کشاف اصطلاحات سائنسی و تکنیکی (زیر طبع)	محمد اسلام نشتر		
۳۳	کشاف اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد		
۳۴	کشاف قانونی اصطلاحات	رشید احمد صدیقی		
۳۵	کشاف اصطلاحات سیاسیات (جلد اوّل)	پروفیسر محمد صدیق قریشی	۶۵ ″	۸۰ ″
۳۶	″ ″ ″ ″ (جلد دوم)		۷۰ ″	۸۰ ″
۳۷	کشاف اصطلاحات کتب خانہ	محمود الحسن، زمرد محمود	۶۵ ،	۸۰
۳۸	کشاف تنقیدی اصطلاحات	حفیظ صدیقی/آفتاب احمد خان	۱۱۰ ″	۱۴۰ ″
۳۹	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد اوّل)	جابر علی سید	۳۶ ″	۵۴ ″
۴۰	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)	وارث سرہندی	۷۵ ،	۸۵ ″
۴۱	″ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد سوم) زیر طبع ″ ″			
۴۲	″ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد چہارم)	اثر لکھنوی		
۴۳	″ ″ ″ ″ ″ ″ (جلد پنجم) ″ ″ ″			
۴۴	اسپرانتو اردو لغت	سعید احمد فارانی	۷۵ ″	۸۵ ″
۴۵	جامع الامثال	وارث سرہندی	-	۱۵۰ ″

اس شمارے کے اہم مضامین

* انجمن ترقی اُردو کا کتب خانہ عام (ایک سرسری جائزہ)
* مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز (۳)
* وزیر اعلیٰ بلوچستان میر جام غلام قادر سے گفتگو
* جامعہ عثمانیہ میں اُردو میں طبی علوم کی تعلیم
* اُردو تحقیق (ایک اجمالی نظر)
* اُردو کا مولد سندھ اور تحقیق سلیمانی
* ذریعۂ تعلیم اُردو

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

اپریل
۱۹۸۷ء

جلد: ۴
شمارہ: ۴

وسیم الدین صدیقی

انجمن ترقی اردو کا کتب خانۂ عام (ایک سرسری جائزہ)

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے دو کتب خانے ہیں (۱) کتب خانۂ خاص (۲) کتب خانۂ عام اول الذکر کتب خانہ محققین علم و ادب کے لیے ہے۔ دوسرا کتب خانہ عوام کے لیے ہے جو ۲۲ ستمبر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا تھا اور اس کا افتتاح شہید ملت لیاقت علی خان نے کیا تھا ابتداء میں اس میں تقریباً بارہ ہزار کتب و رسائل تھے۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں عوامی کتب خانے برائے نام ہیں۔ کتب خانۂ عام اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتا ہے۔ یہ کتب خانہ بعض وجوہ کی بنا پر ۱۲۸ پریل ۱۹۷۱ء کو بند کر دیا گیا تھا بعض حضرات کی تحریک پر انجمن نے ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء کو عوام کے لیے دوبارہ کھول دیا مطالعہ کرنے والے اراکین کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ داخلہ فیس ایک روپیہ اور ماہانہ چندہ دو روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ بیس روپیہ بطور زر ضمانت جمع کرانے پڑتے ہیں جو رکنیت ختم ہونے پر واپس کر دیے جاتے ہیں۔ کتب خانے میں کتابوں اور رسائل کی مجموعی تعداد اس وقت تقریباً ۱۲ ہزار ہے اور ہر ماہ نئی کتابوں اور رسائل کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس وقت کتب خانۂ عام میں جو کتابیں موجود ہیں ان کی تعداد بلحاظ موضوع درج ذیل ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتب خانہ میں علم و ادب کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کتابوں کی کل گیارہ ہزار نو سو چھتیس ہے۔

نمبر شمار	موضوع	تعداد	نمبر شمار	موضوع	تعداد	نمبر شمار	موضوع	تعداد
۱	اسلامیات	۳۹۷	۶	سوانح عمری اکابر اسلام	۲۵۷	۱۱	سکھ قوم	۴
۲	تفسیر	۸۷	۷	تصوف	۶۵	۱۲	عیسائیت	۷
۳	حدیث	۳۳	۸	اوراد و اعمال	۴۱	۱۳	ڈرامہ	۳۴۶
۴	فقہ	۷	۹	احمدیت	۲۰	۱۴	افسانہ	۱۳۶۶
۵	سوانح عمری اسلام	۱۵۲	۱۰	ہندویات	۱۰۹	۱۵	ناول	۱۵۶۹

انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ عام کو دوبارہ کھلے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے مگر بشمول کارکنان انجمن، کتب خانہ عام کے اراکین کی مجموعی تعداد صرف ۳۰۰ تک پہنچی ہے۔ یہ صورت حال شائقین علم کی طرف سے یک گونہ بے دلی کی غماز ہے۔ اس کم توجہی کو شائقین مطالعہ کی لاعلمی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ یہ کتب خانہ عام عروس البلاد کراچی میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے اس کا ماہانہ چندہ بہت معمولی یعنی صرف دو روپے ہے۔ کتب خانے میں تقریباً بارہ ہزار علمی و ادبی کتابیں ہیں جن کا مختصر جائزہ شامل اشاعت ہے۔ شکایت بے جا نہ ہوگی اگر ہم اس موقع پر کتب خانہ عام کے قدیم ارکان سے ان کتابوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کریں جن کو جمع کرائے کافی مدت گذر چکی ہے۔ ان قدیم ارکان کو فرداً فرداً اطلاع بھی دی جا چکی ہے مگر افسوس کہ ان کرم فرماؤں کی اکثریت نے ہمارے معروضے کو ہنوز قابل اعتنا نہیں سمجھا قارئین پر یہ حقیقت روشن ہے کہ یہ کتابیں قومی امانت ہیں جن کی بازیافت فراہمی اور اجرا ارکان کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا استدعا ہے کہ قدیم ارکان یا ان کے متعلقین انجمن کے کتب خانہ عام سے جاری کردہ کتابیں واپس کر دیں۔ ان کا یہ اقدام ادارے کی سرپرستی

اور علم پروری کے مترادف ہوگا۔

پانچسو چودہ کتابیں سابق ممبران کے پاس ہیں جو ابھی تک واپس نہیں ہوئی ہیں۔ انجمن ان کتابوں کی بازیافت کے لیے کوشاں ہے توقع ہے کہ ممبران جلد واپس کردیں گے۔ اس طرح کتب خانہ میں تقریباً ساڑھے بارہ ہزارہ کتابیں ہوں گی۔ (ادارہ)

نمبر شمار	موضوع	تعداد	نمبر شمار	موضوع	تعداد	نمبر شمار	موضوع	تعداد
۱۶	نظم	۱۳۱۳	۴۰	تاریخ ایران	۹	۶۴	صنائع مع دستکاری	۱۵۱
۱۷	مضامین و مقالات	۳۴۳	۴۱	" افغانستان	۱۴	۶۵	جنسیات	۵۴
۱۸	ادبی تنقید	۳۶۸	۴۲	" اسپین۔پرتگال	۲۰	۶۶	حفظان صحت	۶۳
۱۹	مکاتیب	۱۵۱	۴۳	" افریقہ	۶	۶۷	عکاسی و فلم سازی	۱۱
۲۰	تاریخ ادب	۳۶۱	۴۴	" امریکہ	۱	۶۸	موسیقی	۱۲
۲۱	شرحات	۸۹	۴۵	" ترکستان	۱۸	۶۹	قانون	۳۴
۲۲	قواعد	۶۴	۴۶	" روما	۱۲	۷۰	معاشیات	۱۰۳
۲۳	لغت	۹۰	۴۷	" حیدرآباد	۳۰	۷۱	منطق	۳
۲۴	مزاحیہ	۷۴	۴۸	" ہند	۱۲۴	۷۲	درسیات	۲۰۳
۲۵	خطابت	۸۵	۴۹	" یورپ	۱۱	۷۳	رپورٹیں	۴۱
۲۶	لسانیات	۳۷	۵۰	" یونان	۳	۷۴	متفرقات	۴۸
۲۷	سوانح	۳۳۵	۵۱	" جغرافیہ	۱۴	۷۵	ادب نسواں	۲۹۹
۲۸	تاریخی سوانح	۱۳۳	۵۲	" اٹلس	۸	۷۶	" باورچی خانہ	۲۹
۲۹	سفرنامہ	۱۱۸	۵۳	فلکیات	۱۳	۷۷	" اطفال کہانیاں	۱۱۲۱
۳۰	فلسفہ	۸۵	۵۴	نجوم	۱۶	۷۸	" کھیل	۲۰
۳۱	اخلاقیات	۱۴۱	۵۵	انجینیری	۷۴	۷۹	" سوانح	۷۷
۳۲	نفسیات	۶۸	۵۶	حیاتیات	۱۰	۸۰	" تاریخ	۶۲
۳۳	طب	۱۲۸	۵۷	حیوانیات	۶۷	۸۱	" جغرافیہ و سفرنامے	۶۴
۳۴	عمرانیات	۴۶	۵۸	نباتات	۷	۸۲	" تعلیمات و نصائح	۱۹
۳۵	تعلیمات	۱۰۲	۵۹	زراعت	۳۵	۸۳	" نظم	۷۸
۳۶	تاریخ	۵۵	۶۰	کسان دوبیات	۱۶	۸۴	اخبار و رسائل	۳۰۸
۳۷	تاریخ اسلام	۱۷۱	۶۱	ارضیات	۴	۸۵	تاریخ پاکستان	۱۳
۳۸	" شام و فلسطین	۷	۶۲	سائنس	۱۰۷	۸۶	علم کتب داری و فہارس	۱۳
۳۹	" انگلستان ہالینڈ	۲	۶۳	سیاسیات	۴۹۲	۸۷	سال نامہ و جنتری	۴
							میزان	۱۱۹۳۴

عطش درانی

مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز (۳)

دفتر ترجمہ کینیڈا

سیاسی مفاہمت کے طور پر کینیڈا کو ایک ذولسانی مملکت قرار دے دیا گیا تھا۔ یہاں انگریزی اور فرانسیسی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ کیونکہ کینیڈا کی دونوں بڑی قومیں ایک دوسرے کی زبان کو تسلیم نہیں کرتیں یہی بات کینیڈا میں ترجمے کی ضرورت پیدا کرتی ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ "ترجمہ نہیں تو کینیڈا نہیں" اب حالت یہ ہے کہ ہر دستاویز جو انگریزی میں لکھی جائے اس کا فرانسیسی میں بھی ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہر فرانسیسی دستاویزات کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا جاتا ہے۔ ان مقاصد اور ضروریات کے پیش نظر کینیڈا کی حکومت نے مترجمین کا ایک دفتر قائم کیا ہے۔

۱۹۳۴ء تک ہر محکمے میں مترجمین ملازم رکھے جاتے تھے جو سرکاری دستاویزات و مراسلات کا انگریزی سے فرانسیسی میں ترجمہ کرتے رہتے تھے۔ اس وقت ان کی تعداد بمشکل ایک سو تھی۔ ضرورتیں بہت زیادہ تھیں لیکن رفتار کار انتہائی کم۔ انگریزی متن سے دو تین سال بعد بھی بمشکل ایک تہائی مواد کا ترجمہ ہو پاتا تھا اس وقت وفاقی سطح پر انگریزی استعمال ہوتی تھی اور دستور کی رو سے ہر فرانسیسی جاننے والے کے لیے انگریزی دستاویزات کا ترجمہ مہیا کرنا ضروری تھا۔ ترجمے سے رفتار کار پر جو اثر پڑا، اس سے کاروبار حکومت بھی متاثر ہونے لگا۔ اس صورت حال کو بہتر کرنے کے لیے تنظیم نو کی ضرورت محسوس کی گئی۔

۲۹ جنوری ۱۹۳۴ء کو ایک نیا قانون نافذ کیا گیا جس کے ذریعے ان تمام مترجمین کو یکجا کر کے ایک دفتر ترجمہ (ٹرانسلیشن بیورو) بنا دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں اس دفتر نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی۔

کینیڈا کے دفتر ترجمہ کا نیا نام "خدمات زبان دفتری" کا نام دیا گیا ہے اس کا بجٹ اور تنظیم دفتری زبان کی ترقی اور ترویج کے دوسرے اداروں مثلاً کمشنر زبان ہائے دفتری اور تربیت گاہ زبان دفتری سے منسلک ہے۔ اس طرح دفتر ترجمہ صرف ترجمے سے سروکار رکھتا ہے تربیت گاہ دفتری کا کام ملازمین کی دفتری تربیت اور کمشنر زبان ہائے دفتری کا مقصد اس امر کی نگرانی ہے کہ دفتروں میں دونوں قومی زبانوں کو برابر کی اہمیت حاصل ہے یا نہیں۔ دفتر ترجمہ کا مرکزی محکمہ ٹورنٹو میں ہے اس کے علاوہ بارہ دیگر مقامات پر ذیلی شاخیں بھی ہیں اس وقت کل عملہ نو سو مترجمین، ایک سو ترجمانوں، سو سے زائد ماہرین اصطلاحات اور ساڑھے پانچ سو سے کچھ اوپر دیگر ملازمین پر مشتمل ہے یہ سارے ذیلی دفاتر مرکزی کمپیوٹر کے ساتھ منسلک ہیں جو اسی لاکھ الفاظ سالانہ ترجمہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اصطلاحات کا ایک کمپیوٹر بنک بھی ہے جس میں اب تک سولہ لاکھ اصطلاحات جمع کی جا چکی ہیں۔ کمپیوٹر بنک میں اس کے علاوہ سینکڑوں اعداد گیر ۱۴ الفاظ شمار اور درجنوں نقل گیر (ورڈ پراسیسر) کام آ رہے ہیں۔

دفتر ترجمہ کی تاریخ کو ہم بآسانی دو انتظامی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے تیس برس میں (۱۹۶۳ء تک) یہ ادارہ بی اینڈ بی کمیشن کے ماتحت تھا۔ یہ اس کی آہستہ روی کا دور تھا۔ دوسرا دور جب اس دفتر کو ۱۹۶۹ء کے قانون کی رو سے "خدمات زبان دفتری" کے تحت کر دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء تک اس کے عملے کی تعداد ۳۲۰، ۱۹۶۸ء میں ۵۵۰ اور ۱۹۷۸ء میں ۱۸۰۰ ہو گئی۔ ۱۹۵۴ء میں یہ بیورو سالانہ ساڑھے سات کروڑ الفاظ پر مبنی مواد کا ترجمہ مہیا کرتا تھا اس سے

پہلے کا ریکارڈ دستیاب نہیں۔ بعد میں تعداد الفاظ اور کارکردگی بڑھتی چلی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں نو کروڑ، ۱۹۶۴ء میں ساڑھے دس کروڑ، ۱۹۷۰ء میں ساڑھے تیرہ کروڑ، ۱۹۷۵ء میں اکیس کروڑ اور ۱۹۸۶ء میں تیس کروڑ الفاظ سالانہ تک جا چکی ہے ۱۹۴۳ء میں دفتر ترجمہ کا بجٹ

تقریباً اڑھائی لاکھ ڈالر سالانہ تھا ۱۹۵۳ء میں دس لاکھ ڈالر، ۱۹۶۴ء میں بیس لاکھ ڈالر اور ۱۹۷۴ء میں دو کروڑ ڈالر تک پہنچ گیا۔ ۱۹۷۵ء میں مزید چار کروڑ کا اضافہ ہوا اور ۱۹۸۶ء میں نو کروڑ ڈالر سالانہ سے تجاوز کر گیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کینیڈا کو ذولسانی خطہ قرار دینے کی کتنی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

ادارے کی سالانہ رپورٹوں میں مہتمم دفتر ترجمہ نے متواتر اس امر کی نشاندہی کی کہ قابل مترجمین کی تلاش ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس فن کے ماہر مترجمین نہیں ملتے۔ ان مشکلات کی بنا پر ۱۹۵۰ء تک یہ حالت عموماً دیکھنے میں آئی کہ فرانسیسی ترجمہ اصل انگریزی کے کئی کئی ماہ بعد جا کر دستیاب ہوتا تھا۔ کینیڈا کی پارلیمنٹ کو بھی مشکلات کا سامنا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں کینیڈا پارلیمنٹ میں دوہری ترجمانی یعنی بیک وقت انگریزی اور فرانسیسی کی ترجمانی کے نظام کا آغاز کیا گیا تاکہ پارلیمنٹ کی حد تک اس مشکل پر قابو پایا جا سکے۔ یہ نظام ۱۹۵۸ء میں جا کر پوری طرح قابل عمل ہو سکا۔ اس طرح وفاقی اسمبلی اور سینیٹ کی روداد میں فوری طور پر ہر دو زبانوں میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اس صورت حال میں مزید پیچیدگی اس وقت ہوئی جب ملک میں لسانی اختلاف کی آگ بھڑکنے لگی۔

۱۹۶۴ء میں ملک بری طرح ذولسانی تحریک کی لپیٹ میں آگیا عصبیتوں نے سر اٹھایا۔ دو ثقافتوں کا پرچار ہونے لگا۔ دفتر ترجمہ کا کام بھی ازحد بڑھ گیا۔ اب انگریزی سے فرانسیسی اور فرانسیسی سے انگریزی کے بیک وقت ترجمے کی ضروریات بیش از بیش ہو گئیں۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ اصطلاحات کی معیار بندی نہیں ہو رہی تھی، اس لیے ہر شخص اپنی مرضی کی اصطلاحوں سے کام لے رہا تھا۔ آخر نومبر ۱۹۸۷ء میں کابینہ نے دفتر ترجمہ کو اصطلاحات کو حتمی قرار دینے کا اختیار دے دیا۔ طے پایا کہ انگریزی اور فرانسیسی کے باہمی ترجمے اور اصطلاحات کی تصدیق و توثیق کے علاوہ استناد اور معیار بندی کا کام بھی دفتر ترجمہ ہی انجام دے گا چنانچہ حکماً دفاتر کو پابند کر دیا گیا کہ صرف دفتر ترجمہ کی معیار بند اصطلاحیں ہی اسمبلی اور سرکاری دفاتر میں استعمال ہو سکیں گی اور حتمی سمجھی جائیں گی۔ چنانچہ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے دفتر ترجمہ نے اصطلاحات کی ذخیرہ کاری شروع کر دی تاکہ یکسانی اور معیار بندی کے ذریعے تکنیکی ضروریات سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں۔ حصولِ مقاصد کے لیے ایک کمپیوٹر بنک قائم کیا گیا جس میں دفتری سے لے کر سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات تک کا ذخیرہ کیا جائے گا۔ یہ ذخیرہ بڑھتے بڑھتے اب سولہ لاکھ سے تجاوز کر چکا ہے۔ بنک سے مترجمین کے علاوہ کسی حد تک عوام بھی استفادہ کرتے ہیں۔ تعلیمی اساسی مراکز کے علاوہ اس کمپیوٹر کے ۱۶۰ کے قریب ٹرمنل قائم کر دیے گئے ہیں، جن سے اصطلاحات کی ترسیل کا کام کسی حد تک آسان ہو گیا ہے۔

رفتارِ ترجمہ بڑھانے کی غرض سے جون ۱۹۷۷ء میں دفتر ترجمہ نے مشینی ترجمے کا آغاز کیا۔ مشینی ترجمہ، سرکاری دستاویزات کے علاوہ موسمیات کی رپورٹوں میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ترجمے کا عالمی ادارہ "نظامت کثیرلسانی خدمات" بھی اس ذخیرۂ اصطلاحات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب یہ عالمی مشینی نظام ۱۶۰ زبانوں کے دو کروڑ الفاظ سالانہ ترجمے کے لیے مہیا کرتا ہے دفتر ترجمہ بھی اس سے استفادہ کرتا ہے۔

دفتر ترجمہ کو اس حد تک وسعت دی جا چکی ہے کہ مشینی ترجمے اور دیگر معاملات میں بھی تحقیق کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ استناد اور معیار بندی اور اصطلاحات کی ذخیرہ کاری کے علاوہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے لیے تحریر و تسوید میں تربیت کے انتظامات بھی ہونے لگے ہیں اور صوبائی اور مرکزی سطحوں کے علاوہ نجی سطح کے اداروں تک اس کا دائرہ ترسیل بڑھا دیا گیا ہے۔ انتظامی لحاظ سے یہ ادارہ خالصتاً سرکاری محکمہ ہے جس کا نگران اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری (معاون تحت معتمد) ہے۔ نجی اور نیم سرکاری اداروں کے لیے بھی یہی دفتر پالیسی وضع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ لسانی مسائل میں عالمی سطح پر بھی حکومت کینیڈا کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ ان بین الاقوامی

اداروں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا جواز بھی ہے جو ترجمے اور اصطلاحات
کے میدان میں کام کر رہے ہوں مثلاً ISO ، AFNOR
INFOTERM وغیرہ۔
کینیڈا میں ترجمے کا جملہ کام سیاسی مصلحتوں کی بنا پر چل رہا ہے
اس لیے علمی، اقتصادی یا ثقافتی دوائر میں اس کا اثر نہ ہونے کے برابر

ہے کیونکہ اس پہلو کو مکمل کرنے کے لیے جس رقم کی ضرورت ہوگی
وہ کینیڈا جیسا ترقی یافتہ ملک بھی شاید مہیا نہ کر پائے اپنی موجودہ
حدود میں بنیادی طور پر یہ ادارہ دفتری ترجمے ہی کا مرکز قرار دیا جا
سکتا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی ترجمے ضمنی طور پر اس کی حدود میں آتے
ہیں اور ان کی طرف ادارے کی زیادہ توجہ بھی نہیں۔

BIBLIOGRAPHY

1. Commissioner of official languages, Annual reports 1981 to 1986, Minister of supply and services, Canada, Ottawa, 1982 to 1987, (Six Reports)

2. Delisle, jean, serving official bilingualism, "language", "Ottawa, and Society" No.15, winter 1985.

3. Filmon, gary, The opposition view "Language" and Society Ottawa. No.16 Sep. 1985.

4. Pawley, Howard, The Governmen Perspective, "Language and Society" Ottawa, No.16, Sept. 1985.

5. Ryan, Claude, defining the problem, "Language and Society" Ottawa, No.17 March, 1986.

6. Sabourin, peal, A recipe for redress, "language and Society"

6. Sabovrin, peal, A recipe for redress, "language and Society Ottawa, No.16 March, 1986.

7. Scott, stephen A. Judicial guaranties, "language and Society" Ottawa, No.17 March, 1986.

8. Youngs, Fred, Linguistic wrongs and rights "Language and Society" Ottawa, No.16, Sep. 1985.

2. Delisle, Jean, serving official bilingualishm, "language and Society" Ottawa, No.15, winter 1985.

پاکستان اور اردو کا مستقبل
ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اردو پاکستانی قوم کی آواز ہے
اردو کی شناخت پاکستان سے ہے
اور پاکستان کی شناخت اردو سے ہے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق، لاہور میں ایک تقریب سے خطاب

لطیف اُمنم

وزیر اعلیٰ بلوچستان

میر جام غلام قادر سے گفتگو

س ۔ بلوچستان کے اور دوسرے کسی صوبے کے سماجی حالات میں کیا فرق ہے!

ج ۔ دیکھیے ! اگر یورپ سے مقابلہ کریں تو وہاں کی معاشرت ہمارے معاشرے سے مختلف ہے ۔ اس کا موازنہ ابھی نہیں کرسکتے، ہمارے معاشرے کی بنیاد مذہب پر ہے اور یورپ کی لادینی نظام پر اگر اسلام پاکستان کے ذہن سے اتر جائے تو پھر ممکن ہے کہ یہاں بھی ایک دنیاوی سوشل اسٹرکچر آجائے۔ مگر اتنی جلدی اس کا امکان نہیں ہے جہاں ملک پاکستان کے تمام صوبوں سے موازنے کی بات ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی واضح فرق نظر نہیں آئے گا رہن ، سہن ، زبان ، تمدن ، تہذیب میں تھوڑا بہت فرق ہے ۔

س ۔ انسانی ذہن کی نشوونما تعلیم سے ہوتی ہے صوبہ بلوچستان میں تعلیم کا کیا تناسب رہا ہے ؟ خصوصاً خواتین کی تعلیم کا تناسب!

ج ۔ بلوچستان کے تعلیمی معیار کی اوسط نکالنے کے لیے ہمیں پورے پاکستان کا اوسط نکالنا ہوگا میں سمجھتا ہوں کہ شرح تعلیم پاکستان میں ابھی تک تسلی بخش نہیں ، ہمارے وزیر اعظم نے پانچ نکاتی پروگرام پیش کیا ہے جس میں سب سے اہم تعلیم ہے ہم اس پر عمل کر رہے ہیں۔ خواتین کو تعلیم کی سہولت میسر آسکے گی ۸۵ ـ ۱۹۸۴ء میں ۴۲ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے اور اس سال کے بجٹ میں ۵۴ کروڑ روپے تعلیمی ترقی کے لیے رکھے گئے ہیں اسی سے آپ خود اندازہ کرسکتی ہیں کہ ہماری خصوصی توجہ تعلیم کی طرف ہے تاکہ خواندگی صوبے کے طول و عرض میں پھیل جائے۔

س ۔ گویا عملی اقدامات کر رہے ہیں ؟

ج ۔ جی ہاں ! اسکولوں میں اساتذہ کا فقدان ہے اچھے اساتذہ کا خاص طور پر دیہی علاقوں میں سہولیات نہیں ہیں۔ اب ہماری توجہ یہ ہے کہ جہاں جہاں پرائمری اسکول وغیرہ ہیں وہاں اساتذہ کے لیے رہائش اور دوسری سہولیات مہیا کی جائیں تاکہ صحیح استاد بغیر کسی مشکل کے میسر آسکیں ۔

س ۔ آپ اساتذہ کا معیار بھی بڑھانا چاہ رہے ہیں! مالی بھی ، معاشی بھی ۔

ج ۔ جی ہاں ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ استاد معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح بچہ ماں کی گود میں پرورش پاتا ہے اسی طرح استاد کی زیر نگرانی بچے کا شعور پرورش پاتا ہے جو کچھ استاد اسے دے گا بچہ اس کو لے کر معاشرے میں آگے چلے گا ۔ اس لحاظ سے استاد کا بہت اہم کردار ہوتا ہے اساتذہ کے مسائل حل کرنے کی بہت ضرورت ہے جس پر اب تک خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ہم اللہ کا نام لے کر کوشش تو کر رہے ہیں مگر جیسا آپ کے علم میں ہے کہ ہم ایک غریب ملک کے باسی ہیں اور ہمارے ذرائع بے حد محدود ہیں ہم اپنی حدود میں رہتے ہوئے اس اہم مسئلے کا حل تلاش کریں گے ۔

س ۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہے ؟

ج ۔ آپ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوگی کہ اردو ہماری سرکاری زبان ہے اور بلوچستان کا ہر آدمی اسے سمجھ اور بول سکتا ہے ۔

س ۔ بلوچستان میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کام ہو رہا !

ج ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کی ابتدا ہی بلوچستان نے کی ۔

س ۔ ابتدا تو ہو چکی ہے حالیہ برسوں میں اس کام میں کس حد تک پیش رفت ہوئی ہے ؟ آپ کے دفتر میں تمام کام کس زبان میں

سر انجام دیے جاتے ہیں؟

ج ۔ پہلے تو کوشش یہی کی گئی ہے کہ فائل سسٹم اردو میں ہونا چاہیے لیکن چونکہ ہمارا نظام کچھ ایسا تھا کہ اب تک انگریزی زبان سے ہم باہر نہیں نکل سکے۔ کچھ وقت لگے گا کہ انگریزی مکمل طور پر دفاتر سے باہر ہو جائے۔

س ۔ آپ لوگوں نے افسران کی تربیت کے لیے کچھ سوچا ہے؟

ج ۔ سوچا تو پہلے بھی تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ پہلے وہ اتنا کامیاب نہیں ہوا تھا اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا لیکن اس سے صرف ایک صوبے کا تعلق نہیں۔ مرکز میں بھی تبدیلی چاہیے۔

س ۔ قوموں کی زندگی میں قومی زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس باب میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

ج ۔ پاکستان کے بارے میں خاص طور سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قومی زبان نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ تمام صوبوں نے اردو ہی کو قومی زبان کہا ہے۔ اب یہی ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور باقی ساتھ ساتھ دوسری صوبائی سطح کی زبانیں ہیں ان کے لیے بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ انہیں اپنا اپنا مقام حاصل ہو۔

س ۔ کسی بھی زبان کو قومی زبان بننے کے لیے کس قسم کی صلاحیت درکار ہے یا قومی زبان کے لیے سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ہر ملک کا ایک ذہن ہوتا ہے ایک نظریہ ہوتا ہے اور اس کے لیے پوری قوم کو وہ نظریہ اپنانا ہوتا ہے اب تک یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ہم کسی ایک نظریہ پر قائم نہیں رہ سکے۔ ویسے تو ہم سب ماشاءاللہ مسلمان ہیں یہ ملک نظریاتی طور پر حاصل کیا گیا لیکن اب تک اس نظریے کو صحیح طور پر اپنایا نہیں گیا۔

س ۔ اس کی کیا وجہ ہے، جام صاحب؟

ج ۔ اس کی وجوہات تو بہت ساری ہو سکتی ہیں۔ جب انسان کو اپنے آپ پر اور اپنے ملک پر اعتماد نہ ہو جو عموماً آزادی کے بعد لوگوں میں ہو جاتا ہے تو اس مسئلے پر سوچنا ضروری ہو جاتا ہے۔

س ۔ علاقائی زبانوں کی ترویج کے لیے کون سے ادارے ہیں؟

ج ۔ یہاں پر کئی ادارے ہیں، بلوچی اکادمی، براہوی زبان کی اکیڈمی ہے پشتو کی اکیڈمی ہے اس کے لیے کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔

س ۔ ترجمے بھی ہو رہے ہیں؟

ج ۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی خاص آدمی ایسا پیدا ہوا جس نے ان زبانوں میں سے اُردو یا انگریزی میں اُردو کا سارا کام کیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوا تو ہے۔

س ۔ کیا انگریزی کا چلن کسی ایک فوری حکم سے ختم کیا جا سکتا ہے؟

ج ۔ کوئی چیز بیک جنبشِ قلم ختم نہیں کی جا سکتی جس وقت انگریز یہاں آیا تو اس نے یہ کام کیا کہ اپنی زبان کو تدریجاً یہاں رائج کیا حکمرانوں غاصبوں کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر لوگوں کو اپنی طرف مائل کریں - پھر لباس، تہذیب، تمدن کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا انگریز نے اپنی بنیادی چیزوں پر عمل کیا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ صوبے میں دو آدمی اگر کہیں جا رہے ہیں تو بے شک آپس میں بہت اچھی اردو بول رہے ہیں انگریزی کے بغیر وہ اردو بھی نہیں بولیں گے۔ انگریزی کے الفاظ وہ بھی اپنی گفتگو میں استعمال کریں گے۔

س ۔ امتحان مقابلہ کی زبان انگریزی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟ کیا انگریزی ہی رہنا چاہیے؟

ج ۔ یہ تو ضروری نہیں ہوتا کہ اس قسم کے امتحان کو صرف انگریزی تک محدود رکھنا چاہیے۔ جب تک قومی زبان پورے طریقے سے عملی طور پر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں داخل نہیں ہوتی دو عملی تو رہے گی۔ میڈیکل وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ ہونا چاہیے جو اس وقت تک مشکل ہے اردو کو اس مقام پر لے آئیں جو ٹیکنالوجی کے شعبے میں کام دے سکے تو بڑی بات ہو گی گو کہ اس سمت کام ہوا ہے مگر بہت کم ہے زیادہ کام کی ضرورت ہے۔

س ۔ کیا اردو کے ادارے اس سمت میں کام کر رہے ہیں؟ کیا آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج ۔ مطمئن کا لفظ اپنی جگہ۔ ان کا کام اپنی جگہ پر ہے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آیا وہ اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں یا نہیں۔

موجودہ ٹائپ رائٹر جو رائج ہو رہا ہے اس میں بھی اصلاح ضرورت ہے وہ نسخ میں ہے ابھی ہم اس کی عبارت کو آسانی سے نہیں پڑھ سکتے میں سمجھتا ہوں کہ رسم الخط میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

س۔ بلوچی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جنہیں اردو میں بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے آپ کا خیال ہے کہ ان الفاظ کو خود آنے دیا جائے یا شعوری طور پر انہیں لایا جائے۔

ج۔ بلوچی میں بھی پوری تحقیق کی ضرورت ہے بلوچ کے بہت سے علاقے ہیں مثلاً مکران کی زبان مری سے مختلف ہے، بگٹی کے علاقے کی مکران سے مختلف ہے۔ بلوچی زبان میں بھی کافی اختلافات ہیں بلوچی رسم الخط میں بھی غور کی ضرورت ہے۔ قومی زبان کے سلسلے میں سب سے بڑی فراخدلی کا ثبوت بلوچستان نے دیا۔ پہلی اسمبلی جب یہاں ہوئی تو اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور یہ بہت بڑا اقدام تھا۔ اردو زبان کو ہماری قومی زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن اب تک اس کا نفاذ نہیں ہو سکا بہت سے شعبوں میں ابھی تک اردو میں کام نہیں ہوا اس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

س۔ یعنی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو کی مایئگی ہے؟

ج۔ یہ مطلب نہیں، مطلب صرف یہ ہے کہ تعلیم کے شعبوں جیسے سائنس ہے اس کے سب سرمائے کو اردو میں منتقل کرنا پڑے گا اور یہ کام اس طرح کرنا پڑے گا کہ طالب علم کو باہر جا کر کسی تشنگی کا احساس نہ ہو۔

س۔ بیشتر سائنسی اصطلاحات بین الاقوامی ہیں کیا ان کو اردو میں ترجمہ کرنے سے مشکلات نہیں ہوں گی؟

ج۔ مثلاً انجینئرنگ ہے اس کی اصطلاحات کو بیشک اردو میں ترجمہ نہ کریں بین الاقوامی ہی رکھیں عربی زبان کی مثال لیجیے آپ جس چیز کا بھی ترجمہ کرنا چاہیں اس میں گنجائش موجود ہے ابھی اردو کے دامن کی مزید وسعت کا ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ وہ بھی عربی کے درجے پر آجائے۔

س۔ پچھلے دو برسوں میں مقتدرہ نے ۶۵ موضوعات پہ کتابیں شائع کی ہیں۔

ج۔ وہ ٹھیک ہے، ترجمہ ہوا ہے کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ایک بچہ جب کتاب پڑھنا شروع کرے گا تو وہ ترجموں سے تو شروع نہیں کرے گا۔ پرائمری سکول کا حساب، جغرافیہ، الجبرا ان تمام کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کام کی ضرورت ہے۔ مگر ترجمہ کا اپنا مقام ہے لیکن کسی علم کا ابتدائی درجوں کے لیے حصول اپنی جگہ پہ ہے۔ ابتدائی درجوں کی تدریسی کتابوں پر توجہ کی سخت ضرورت ہے۔

س۔ مقتدرہ کے زیر اہتمام بہت سی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو خاص طور پر دفتری اردو کے لیے لکھی گئی ہیں۔ کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ ان کتابوں کو صوبائی دفاتر میں رائج کیا جائے؟

ج۔ ہاں۔ ہونا تو چاہیے صوبوں کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ وفاقی حکومت قومی زبان کی ترقی اور نفاذ کے لیے کس حد تک کام کر چکی ہے اور کتنا کام باقی ہے۔

س۔ آپ وزیر اعلیٰ ہیں آپ کی طرف سے بھیجا گیا ایک چھوٹا سا مراسلہ اس سلسلے میں معاون ہوگا۔

ج۔ اچھی تجویز ہے۔ معقول ہے، سب سے پہلے تو آپ کو فائل سے شروع کرنا ہے کہ فائلوں کو اردو میں کرنا ہے اور نوٹنگ اردو میں کرنا ہے تب آسانی ہوگی۔

انگریز نے یہاں جو سول انتظامیہ قائم کی اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بعد میں آزادی کے بعد جب پاکستان کی حکومت آئی پھر ان تمام چیزوں کو تبدیل ہونا چاہیے جو اب تک تبدیل نہیں ہو سکیں۔

> ”ملک میں سائنس کی تعلیم نہ ہونے اور پوری قوم میں ایک علمی نقطہ نظر پیدا نہ ہونے کا سب سے بڑا اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے اس تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے“
>
> ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
>
> (”ادب و لسانیات“ ص۱۱)

ڈاکٹر منور علی

جامعہ عثمانیہ میں اردو میں طبی علوم کی تعلیم

پانچ سال تک اردو میں ڈاکٹری پڑھنے اور پھر پڑھانے کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے پہلے میڈیکل گریجویٹ ہونے کے فوراً بعد مجھے ۱۹۳۲ء میں ڈیمانسٹریٹر کلینکل سرجری بنایا گیا ۱۹۳۸ء سے بحیثیت پروفیسر کلینکل سرجری میں نے ڈاکٹری کی تعلیم اردو میں دی ہے۔ ۱۹۴۹ء سے ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں کئی سال تک انگریزی میں بھی ڈاکٹری پڑھائی ہے، اس طویل تجربہ کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہر طالب علم کا دماغ جس سہولت اور عمدگی کے ساتھ اپنی زبان میں طبی علوم سمجھ سکتا ہے وہ قطعی غیر زبان کے ذریعے ناممکن ہے۔ اردو کے ذریعے طالب علم اپنے ہر مضمون پر آسانی سے عبور حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اردو میں تعلیم پانے والا طالب علم جب انگریزی درسی کتب اور دیگر طبی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف جب انگریزی ذریعہ تعلیم ہو تو طالب علم سمجھنے اور فنی تربیت حاصل کرنے سے زیادہ رٹ کر امتحان پاس کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ سمجھنے کے بجائے حافظہ پر اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹروں نے اوروں کے مقابلے میں نظری اور عملی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جامعہ عثمانیہ کا ایک طبی گریجویٹ جس کے پاس مزید کوئی ڈگری یا ڈپلومہ نہ تھا محض اپنی قابلیت اور کارکردگی کی بناء پر برٹش ملٹری اسپتال کا کمانڈنگ افسر بنایا گیا تھا۔ شاید ہی ایسا امتیاز اردو کے ذریعے تعلیم پانے والے کے سوا کسی اور کم عمر ڈاکٹر کو حاصل ہوا ہو!۔

۱۹۳۵ء میں صدر شعبہ طب ناظم طبابت و حفظان صحت ایک انگریز تھے۔ انہوں نے رائل کالج آف سرجنز آف انگلینڈ کو دعوت دی کہ وہ عثمانیہ میڈیکل کالج اور عثمانیہ اسپتال کا معائنہ کر کے اسے تسلیم کر لیں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سارے براعظم کی طبی اسناد کو برطانیہ کی جنرل میڈیکل کونسل نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ جانے والے ڈاکٹر دوبارہ ابتدائی طبی سند کے امتحانات پاس کرنے اور اس کے بعد پھر ایف۔ آر۔ سی۔ ایس، ایم۔ آر۔ سی۔ پی وغیرہ کی سند حاصل کرنے کی کوششوں میں حیران و پریشان رہتے تھے تفصیلی معائنہ کے بعد ماہروں کی سفارش پر عثمانیہ کے گریجویٹس کو اس زمانہ میں ایف آر۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں طبی طیلسانین کا پہلا بیچ کامیاب ہو کر نکلا تھا۔ صرف تین سال بعد اس قسم کا RECOGNITION برصغیر کے سارے میڈیکل کالجوں کے مقابلے میں عثمانیہ میڈیکل کالج کے لیے ایک غیر معمولی کامیابی اور امتیاز تھا۔

انگریز ڈائریکٹر جنرل کی جب یہ خواہش تھی کہ ان طبی ماہرین سرسیل واکلی اور مسٹر فاگ سے اردو کی بجائے انگریزی میں ڈاکٹری کی تعلیم دینے کی سفارش حاصل کی جائے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان ماہرین نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر ہم انگلستان میں طبی تعلیم انگریزی میں دیتے ہیں، فرانس میں طب فرنچ میں پڑھائی جاتی ہے، جرمنی میں میڈیسن جرمن زبان میں سکھائی جاتی ہے، حتی کہ چھوٹے سے ولندیزی ملک میں ڈاکٹری کی تربیت ڈچ زبان میں دی جاتی ہے، جاپان میں ڈاکٹری جاپانی زبان میں سکھائی جاتی ہے تو ہمیں تعجب ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی طرح سارے برصغیر میں کیوں اپنی زبان میں طب کی تعلیم نہیں دی جاتی !!۔

۱۹۵۱ء میں جب پاکستانی طبی وفد تاشقند پہنچا تو ہماری حیرت

کی انتہا تو رہی کہ وہاں میڈیکل کالج میں تعلیم روسی زبان کی بجائے ازبک زبان میں دی جا رہی تھی اور جب الما آتا پہنچے تو وہاں بھی میڈیکل کالج میں کازک زبان میں تعلیم دی جا رہی تھی۔ انشاء اللہ آج تو (شاہ ایران کے وقت ہی سے) فارسی میں بھی ڈاکٹری تعلیم ہو رہی ہے! نہ معلوم ہم کب تک ٹس سے مس ہوں گے؟

چین نے انقلاب اور آزادی حاصل کرنے کے بعد انگریزی، جرمنی اور جاپانی زبانوں کی بجائے ڈاکٹر تعلیم چینی زبان میں دینی شروع کر دی اس تبدیلی سے چین میں ایک بڑی تعداد اچھے تعلیم یافتہ ہنر مند ڈاکٹروں کی مہیا ہونے لگی اور طبی سہولتیں عام ہونے کا آغاز ہوا۔ چین کی ڈاکٹری کی ترقی سے دنیا حیران ہے۔ کٹے ہوئے ہاتھ اور پاؤں دوبارہ جوڑنے میں چینی ڈاکٹروں کی ساری دنیا میں سبقت اور مہارت مشہور ہے اور وہ اس شعبہ میں دنیا میں سب سے آگے ہے!۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے دو صدی سے زیادہ عرصہ پہلے جب اقتدار اس برِاعظم میں جما لیا تو سب سے پہلے حیدر آباد دکن میں انگریزوں نے مغربی طب اردو میں پڑھائی۔ انگریز پروفیسر رائل سوسائٹی کے اردو زبان میں تیار کیے ہوئے لیکچر بھی طالب علموں میں تقسیم کرتے تھے، اس طرح اردو میں ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے والے آخری بیچ میں ارسطو یار جنگ تھے جو حیدر آباد کے اپنے زمانہ کے ممتاز اور شہرت یافتہ سرجن تھے جنہوں نے سرجری میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔

آیئے آپ کو عثمانیہ میڈیکل کالج کے متعلق کچھ اور سناؤں انڈین میڈیکل کونسل کے نمائندوں کی حیثیت سے ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے اور کرنل جلال شاہ نے برسوں پہلے عثمانیہ میڈیکل کالج اور عثمانیہ اسپتال میں نظری، عملی تعلیم اور امتحانات کی جانچ پڑتال کی تھی۔

بی۔ سی۔ رائے نے اعتراف کیا تھا کہ عثمانیہ میڈیکل کالج کے طالب علم بھارت کے دوسرے میڈیکل اسٹوڈنٹس کے مقابلہ میں بہتر اور عمدگی کے ساتھ ڈاکٹری سمجھتے ہیں اور اسپتال میں ان کی کارکردگی کا معیار بہت آگے ہے۔

ایک مہمان پروفیسر سرجری ایڈن برگ کے سرجان براؤن کی خواہش پر میں نے عثمانیہ میڈیکل کالج کے طلباء کو ان کے منتخب کردہ عنوان پر اردو میں تقریباً چالیس منٹ لیکچر دیا جس کے بعد موصوف اندازاً بیس منٹ تک اسی عنوان کے متعلق انگریزی میں طالب علموں سے سوالات کرتے رہے۔ طالب علموں کے جوابات سے وہ اس قدر مطمئن ہوئے کہ انہوں نے اعتراف کیا کہ اپنی زبان میں مضمون نہایت عمدگی سے سمجھ کر اس پر کافی عبور حاصل کر لیتے ہیں

جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کو بین الاقوامی طبی کانفرنسوں میں کبھی انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے جھجک نہ ہوتی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ مانٹریال میں بارہ سو سے زیادہ ڈاکٹر مندوبین کی ورلڈ میڈیکل اسمبلی میں انگلش فرنچ اور ہسپانوی زبانوں میں تقریر کرنے کے لیے جب نمائندوں کا انتخاب ہوا تب ایک عثمانیہ کے ڈاکٹر کو انگلش میں بولنے والوں کی طرف سے خطاب کرنے کے لیے چنا گیا تھا۔

عثمانیہ کے طیلسانین کے تحقیقاتی مضامین دنیا کے ممتاز انگریزی رسالوں اور کتابوں میں چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے طالب علم اردو ذریعہ تعلیم کے باوجود انگریزی زبان پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے انگریزی شعبہ میں لازمی طور پر ایک دو پروفیسر اعلیٰ سند یافتہ انگریز ہوا کرتے تھے تاکہ طالب علم صاحب زبان سے صحیح انگریزی سیکھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بھی اعلیٰ تعلیم کے دوران عثمانیہ کے ڈاکٹروں نے سبقت حاصل کی۔

حالانکہ پاکستان میں ابھی ڈاکٹری کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے لیکن انگلستان میں غل مچ رہا ہے کہ ہمارے ڈاکٹرز انگلش اچھی بولتے ہیں اور نہ ہی مریضوں کی بات سمجھتے ہیں۔

جناب! آپ معیار قابلیت کے متعلق کچھ نہ پوچھیے گلی کوچوں میں اسٹینڈرڈ کے متعلق چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ میرے ناچیز خیال میں یہ بات ہمارے لیے لمحۂ فکر ہونی چاہیے! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم کیوں اس فطری طریقۂ تعلیم سے انحراف کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر یہ ضد اور ہٹ دھرمی کیوں؟ ساری دنیا کی طرح ہم بھی اپنی زبان میں تعلیم دے کر معیار بلند کر کے بہتر اور قابل ڈاکٹر پیدا کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟!

اللہ ہمیں توفیق دے۔

[illegible] اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اپنا لیا جائے گا،

...اسمبلی میں حاجی فضل رازق کے سوال پر حکومت کی یقین دہانی

...بار وفاقی نظامت قومی اسمبلی میں قومی زبان اردو کو رائج کرنے ...پر گرما گرم بحث ہوئی اس بحث کا آغاز اس وقت ہوا جب ...ق کے ایک سوال کے جواب میں کیبنٹ ڈویژن کے پارلیمانی ...سلیم محمود خان نے بتایا کہ حکومت ۱۹۸۸ء تک اردو کو بطور ...ن رائج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے کیونکہ یہ آئینی ضرورت ...سلسلے میں انہوں نے مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے پیش کی گئی ...[illegible] انہوں نے کہا کہ یہ سفارشات کابینہ کمیٹی کے ...ن میں مقابلے کے امتحان کے اردو میں انعقاد اور اردو ...تعلیم اختیار کرنا بھی شامل ہیں انہوں نے بتایا کہ وفاقی حکومت ...دیگر افراد اور ٹیلیفون آپریٹر حضرات کو اردو ٹائپ سیکھنے کا پابند ...کیا گیا ہے اس کے علاوہ بعض وزارتوں کو فائلوں پر اردو ...نے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے جن میں وزارت تعلیم ...[illegible] کمشن آف پاکستان شامل ہیں ...پارلیمانی سیکرٹری سے [illegible] جواب پڑھا تو ...نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ وزارت کو بھی پابند کیا جائے کہ وہ ...کریں اس پر اردو کے حق میں اور خلاف بحث چھڑ گئی بیگم [illegible] ...ذکر کے فکر کی زبان ہے سردار آصف احمد علی نے کہا کہ سرکاری زبان انگریزی ہے اور مادری زبان پنجابی ہے میاں مظہر علی خان نے کہا کہ ہم نے سندھی زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے ظفر اللہ خان جمالی نے کہا کہ ایک زبان سرکاری ہوتی ہے وہ انگریزی ہے ایک مادری زبان ہوتی ہے یہ قومی زبان کا معاملہ کہاں سے آ گیا اس پر مولانا وصی مظہر ندوی نے سپیکر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر پر پوچھنا چاہا کہ اردو کو ۱۹۷۳ء کے آئین میں قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی مخالفت آئین کی خلاف ورزی ہے سپیکر نے اپنی رولنگ محفوظ رکھی۔ ایک رکن نے کہا کہ مقتدرہ قومی زبان منتخب ادارہ نہیں ہے وہ کس طرح سفارشات پیش کر سکتا ہے۔ جماعت اسلامی کے ارکان نے اردو کے خلاف دلائل کا مقابلہ کیا مولانا گوہر الرحمن نے [illegible] سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو میں تقریر کیا کریں جس پر [illegible] نے کہا کہ آپ انگریزی میں تقریر کر کے دکھا دیں تو میں اردو میں تقریر کیا کروں گا مسز [illegible] نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اردو کو انگریزی کی جگہ اور انگریزی کو اردو کی جگہ دے دی جائے۔

روزنامہ پکار اسلام آباد ۱۱-۲-۸۷ء

اپنی قومی زبان کو زندہ رکھئے

اردو ہماری قومی زبان ہے یہی زبان ہماری قومی سالمیت، یکجہتی اور باہمی اتحاد و اتفاق کا سب سے بڑا اور واحد وسیلہ ہے۔ ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری حکومت نے اردو زبان کو سرکاری سطح پر کما حقہٗ نافذ نہیں کیا لیکن خود ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم اپنی عام بول چال تک میں انگریزی جملے اور انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہم اپنے بچوں کو انگریزی طرز کے سکولوں میں تعلیم دلاتے اور ان کے منہ سے انگریزی جملے سن کر پھولے نہیں سماتے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے قومی زبان سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں، اردو طرز کے مدارس میں تعلیم کا حصول ہمارے بچوں کے لئے ایک طعنہ بنتا جا رہا ہے۔ قومی زبان پر ہونے والے اس ستم کے خلاف جدوجہد کرنا آج ہمارے ذرائع ابلاغ کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اس قومی فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے "روزنامہ امروز" نے جو اپنے آغاز ہی سے قومی زبان اور شعر و ادب کی خدمت میں شب و روز تندہی سے مصروف ہے، پاکستانی طلبہ اور قارئین میں قومی زبان کی ترویج کے لئے ایک تاریخی اقدام کیا ہے اس اقدام کو آپ اپنی آسانی کے لئے "امروز علمی معمہ" کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

روزنامہ امروز لاہور ۶-۲-۸۷ء

انگریزی کا غلبہ ذہنی غلامی کی علامت ہے؛

...اسمبلی کی پوری کارروائی اردو میں کی جائے: متعدد ارکان کی رائے۔

...۱۰ فروری (نمائندہ خصوصی) قومی اسمبلی کے رکن [illegible] خان ...کہ اردو متفقہ طور پر قومی زبان ہے اور اسمبلی کی کل ...میں ہونی چاہئے۔ انہوں نے یہ بات ایوان میں قومی ...نے والے مباحثے سے متعلق ایک سوال کے جواب ...انہوں نے کہا کہ اسمبلی کے بیشتر ارکان نہ صرف اردو بلکہ ...زبان میں تحریر و تقریر کے بھی ماہر ہیں۔ اس میں شک نہیں ...وں کو ترقی دینا چاہئے لیکن قومی زبان صرف ایک ہوتی ...[illegible]۔ انہوں نے کہا کہ ...جیسے اہم ایوان میں اردو اگر [illegible] کا تسلط ہو تو ...اگر حکومت خود اسمبلی کے ارکان پر پابندی لگا دے کہ ...نا جاننے والوں کو ایوان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں یا پھر پورا ...رمی کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اردو اسلامی زبان ہے کہ ...ملی طور پر کوئی نہ چاہے تو بھی اپنا مطمح نظر بخوبی اردو ...بیان کر سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی کا غلبہ ...[illegible] ہے۔ مولانا وصی مظہر ندوی نے کہا کہ ...زبان ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت متفقہ طور پر قرار دیا جا ...کے مطابق اس کی حد ۱۹۸۸ء تک مقرر کی گئی ہے لیکن ...بعض ارکان اس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھانے ...کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ ایوان میں اٹھایا گیا تھا اس لئے اس کے خلاف کارروائی کی واحد صورت یہ ہے کہ اسپیکر بحث میں اپنی رولنگ دیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ سپیکر صاحب محافظ کی حیثیت سے اپنی رولنگ جلد از جلد دیں گے۔ میر نواز خان مروت نے کہا کہ رابطے کی صرف ایک زبان ہے اور وہ ہے اردو۔ یہ ہماری قومی زبان ہے جس پر ہم سب کو فخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ تحریک پاکستان کا [illegible] تقاضا یہ ہے کہ اسے مسلط [illegible] جس طرح ہر زندہ قوم کو اپنی زبان اپنے تشخص پر ناز ہوتا ہے ہم کو بھی اپنی قومی زبان پر ناز ہے انہوں نے کہا کہ یہ صرف برصغیر کی زبان نہیں بلکہ خلیج، وسطی اور مشرق بعید کے بیشتر ملک میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اردو کو جلد از جلد اس کا جائز مقام ملنا چاہیے جو اس کا حق ہے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے [illegible] نے کہا کہ اس وقت ملک کو بہت سے ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کے لئے عوام ایوان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۱۱-۲-۸۷ء

[illegible] ادبیات [illegible] کی عمارت

اسلام آباد ۵ مارچ (پ پ ا) وزیر اعظم محمد خان جونیجو پاکستان اکادمی ادبیات کے مستقل دفتر کے لئے [illegible] قریب میں [illegible] کا سنگ بنیاد رکھیں گے [illegible]

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۶/۳/۸۷ء

قومی زبان اور ہماری بقا

جنگ فورم اور مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام جنگ قومی زبان سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی نے کہا ہے کہ ہمیں پشاور سے کراچی تک مکمل طور پر خود کو قومی زبان اردو سے منسلک کرنا چاہئے تاکہ قومی سوچ پیدا ہو کیونکہ قومی زبان کے حوالے سے ہی پاکستان کی بقا اور اس کا مستقبل روشن ہے اردو چونکہ عربی اور فارسی کا حسین امتزاج ہے اس لئے ہماری تاریخی روایات سے ہمارے رشتے بھی اسی حوالے سے قائم ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ہی پاکستان اور اسلام کا دوسرا نام ہے۔

قومی فکر کو اجاگر کرنے اور قومی روایات اور تاریخی رشتوں میں اردو زبان کی اہمیت اور کردار ایسی زندہ حقیقتیں ہیں جنہیں ایک لمحہ کیلئے بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قومی زبان اردو کے حوالے سے ان قومی روایات اور تاریخی رشتوں کا ذکر تو سننے میں بہت آیا، لیکن حکمرانوں نے ہمیشہ قومی زبان کو بری طرح نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل جاری رکھا۔ اردو کو قومی زبان کے طور پر اپنانے کیلئے غیر سرکاری سطح پر جو کوششیں ہوئیں بیوروکریسی ان کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنی رہی۔ انگریزی زدہ طبقہ اردو کو کم مایہ اور غیر ترقی یافتہ زبان قرار دیتا رہا۔ اس لئے کہ وہ دور غلامی کی ایک یادگار کو اپنا احساس برتری برقرار رکھنے کیلئے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا تھا اسے ترک کرنے سے اس طبقے کی ساری صلاحیتوں کا بھرم کھلتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہمارے یہاں قومی سوچ اور فکر نے جنم نہیں لیا۔ ہم اپنی تاریخی روایات سے قومی زبان کے حوالے سے اپنے رشتوں کو بھی کمزور اور فراموش کرتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جدوجہد آزادی اور دو قومی نظریے کی اساس میں اردو زبان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان سے ہمارے تہذیبی ثقافتی اور تاریخی رشتے اتنے مضبوط اور گہرے ہیں کہ زبان کو نظر انداز کر کے ہم ان رشتوں کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ گورنر پنجاب نے درست کہا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل اردو ہندی کا جھگڑا ہی تھا جس نے دو مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ کو جنم دیا جس کے نتیجے میں ہم نے ایک آزاد مملکت حاصل کی اب اس مملکت کے استحکام و بقا کیلئے جس قومی انداز فکر کی ضرورت ہے وہ قومی زبان سے اپنے رشتے مضبوط کئے بغیر جنم نہیں لے سکتا۔ یہ ایسی اٹل حقیقت ہے کہ اس کا اعتراف کر کے قومی زبان کے فروغ اور خود کو اس سے منسلک کرنے کی جتنی جلدی کوشش کی جائے اسی قدر ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔ قومی زبان سے خود کو منسلک کئے بغیر ہم اپنا قومی تشخص اجاگر نہیں کر سکتے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۱۰-۲-۸۸ء

اپنے نظامِ تعلیم کو مرتب کرتی ہے۔ اس نوعیت سے ہر ملک کا تعلیمی نظام اس کے فلسفۂ زندگی و نظریۂ زندگی سے ہم آہنگ ہوتا ہے امریکہ میں جمہوری نظامِ حکومت ہے لہٰذا وہاں کے تعلیمی نظام کا مقصد جمہوریت کو فروغ دینا ہے وہاں ابتدا ہی سے شخصی آزادی کا احترام سکھایا جاتا ہے روس ایک کمیونسٹ ملک ہے اس لئے وہاں کے نظامِ تعلیم میں اشتراکیت کی جھلک نمایاں ہے وہاں شخصی آزادی کے برعکس مملکت کی بقا کا نظریہ زیادہ اہم نظر آتا ہے دنیا کے دیگر ممالک بھی دو بڑی طاقتوں کے تعلیمی نظام کو اپنے اپنے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

لیکن جب اس سلسلے میں پاکستان کا ذکر آتا ہے تو ہم اس کے نظامِ تعلیم کو اسلام سے ہم آہنگ کئے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ پاکستان بننے کے بعد جو پہلا تعلیمی کمیشن قائد اعظم نے قائم کیا تھا اس نے اس بات کو پیش کر دیا تھا کہ دینی تعلیم نصاب میں لازمی حیثیت میں شامل کی جائے۔ اس کے بعد سے اب تک جتنی بھی تعلیمی اصلاحات نافذ ہوتی رہیں اس میں اسلامی تعلیم پر زور دیا جاتا رہا لیکن پھر بھی تعلیم کو صحیح خطوط پر گامزن نہ کیا جا سکا اس کی مختلف وجوہات رہی ہیں جن میں سے سب اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک دو زبانیں رائج رہی ہیں جس میں سے ایک خواص کی اور دوسری عوام کی زبان رہی ہے یعنی ایک انگریزی اور ایک اردو آج تک یہ صحیح طور پر سمجھا نہ جا سکا کہ ذریعہ تعلیم کونسی زبان ہو۔ اور یہی ہمارے نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا المیہ رہا کہ اردو میڈیم اسکولوں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب طالب علم کالجوں کا رخ کرتے ہیں تو وہ وہاں سائنسی اور فنی یا کوئی بھی اعلیٰ نوعیت کی تعلیم حاصل کرنے میں شدید دشواری محسوس کرتے ہیں کیونکہ نصاب کی اعلیٰ کتب انگریزی زبان میں ہوتی ہیں جن کو نہ وہ مؤثر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنا پچھلا تعلیمی ریکارڈ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یا تو چین اور جاپان کی طرح تمام تر تعلیمی کتب کو ملکی زبان میں ترجمہ کیا جائے یا پھر انگریزی کو ابتدا ہی سے اپنا لیا جائے ان ممالک نے ہمارے بعد آزادی حاصل کی ہے لیکن سائنسی اور فنی میدان میں وہ ہم سے جتنا آگے بڑھ چکے ہیں وہ قومی زبان کو اہمیت دینے کا نتیجہ ہے کیونکہ ان کی تمام تر تعلیمی کتب ان کی اپنی زبان میں ہوتی ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری تعلیم بے مقصد تعلیم ہے ممتاز مفکر ارسطو کا قول ہے کہ "ہم تعلیم کا کوئی مقصد متعین نہیں کر سکتے کیونکہ اگر تعلیم کا کوئی مقصد متعین کر دیا جائے تو پھر وہ مقصد حاصل کرنے کے بعد تعلیم بے مقصد ہو جائے گی" ارسطو کی بات درست ہے لیکن امریکی ماہر تعلیم جان ڈیوی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "ہم تعلیم کو کسی مقصد سے وابستہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے" یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں یہ پہلو مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور ابتداء ہی سے بچے کو اس کے رجحان کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے چنانچہ وہ ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی اس قابل ہو جاتا ہے کہ ملازمت کر سکے۔

ہمارا ملک ایک پسماندہ ملک ہے والدین کسی نہ کسی طرح تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں میٹرک کے بعد طلبہ کی ایک کثیر تعداد تعلیم کو خیرباد کہہ دیتی ہے اور معاشی حالات سے مجبور ہو کر ملازمتیں کر لیتی ہے لیکن یہ تعلیم ان کو عملی زندگی میں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی یہاں تک کہ بی اے اور ایم اے کرنے کے بعد بھی طالب علم اس وقت شدید مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم نے انہیں معاشرے سے ہم آہنگی پیدا کر سکنے میں کوئی مدد نہیں دی اور نہ ہی انہیں کسی شعبے میں ماہر بنایا ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کی ایک اور بنیادی خامی طلبہ کی سوچ کا غلط انداز ہے ہمارے ملک میں بچوں کے ذہنوں میں ابتداء ہی سے یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ انہیں ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر ان دونوں پیشوں کے علاوہ وہ کسی اور شعبے کو قوم کی خدمت کا ذریعہ نہیں سمجھتے پاکستان ایک زرعی ملک ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو زرعی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کا ایک ایسا ڈھانچہ مرتب کیا جائے جس میں ذریعۂ تعلیم کوئی ایک ہو۔ فنی تعلیم کو نہ صرف یہ کہ اہمیت دی جائے بلکہ طالب علموں کے ذہنوں میں بھی اس کی اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے تعلیم طلبہ کے قدرتی رجحانات کے تحت دی جائے اور اس نوعیت کی ہو کہ اسکول اور کالج کے مراحل کے بعد طلبہ عملی زندگی میں کوئی دشواری محسوس نہ کریں تعلیم میں مغربی انداز کو دینی تعلیم سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے اس میں اسلامی رنگ شامل ہو تاکہ مغرب کی طرح سے مکمل مادہ پرست بن کر روحانی آسودگی سے دور نہ ہو جائیں۔ بلکہ اگر ایک طرف زندگی سے بہتر مطابقت حاصل کریں تو دوسری طرف ایک اچھے مسلمان کے اوصاف بھی اپنے اندر پیدا کریں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی تنخواہیں اتنی رکھی جائیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس پیشے کو بخوشی اپنائیں اور معاشی طور پر مطمئن ہو کر تعلیمی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۸-۱۲-۸۶ء

تعلیمی اداروں میں جسمانی سزائیں ترک کی جائیں

ہمارے ہاں سکولوں میں بچوں کو جسمانی سزائیں دینے کا رواج ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک ختم نہیں ہو سکا یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر حکومت اور عوام دونوں کو توجہ دینی چاہئے کیونکہ یہ آئندہ نسلوں اور پوری قوم کو متاثر کرنے والی بات ہے۔ بچوں کو اکثر و بیشتر سکولوں میں مارا پیٹا جاتا ہے اور کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ دنوں تک سکول ایک ایسی فضا اور ایسے ماحول میں جہاں ہماری خواندگی کی شرح تیسری دنیا کے ہمسایہ ممالک سے بھی کہیں کم ہے اس میں طلبہ کو مار پیٹ کر ان کو سکولوں سے بھاگنے اور پڑھائی سے متنفر کرنے کا یہ وسیلہ اختیار کرنا انتہائی افسوسناک ہے۔ اس صورتحال کو ختم کرنے کے لئے چند تجاویز ایسی ہیں جن پر اگر طلبہ ان کے والدین اور ڈاکٹر حضرات توجہ دیں تو بہت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس بچے کو جسمانی سزا دی جائے وہ اپنے والدین کو آ کر بتائے اور اگر وہ ڈاکٹر کے پاس آئے تو ڈاکٹر اس کا پتہ گھر کا پتہ ریکارڈ ہی نوٹ نہ کریں بلکہ اس سکول، مدرسے اور استاد کا نام بھی اپنے پاس درج کریں۔ سکول انسپکٹر سکولوں کا دورہ کرتے وقت اس طرف خصوصی توجہ دیں اور ایسے سکولوں کو بلیک آؤٹ کریں اور ان کی امداد بند کرنے کی سفارش کریں جہاں طلبہ کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ مختلف سماجی تنظیموں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے لائحہ عمل میں یہ ایشو بھی شامل کریں۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۴-۲-۸۷ء

اردو، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو اختیاری مضامین قرار دینے پر اظہارِ تشویش

لاہور ۲۸ دسمبر (پ پ ا) جمعیت اسلامی کے نائب امیر چودھری رحمت الٰہی نے ایف اے کے امتحان میں اردو، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو اختیاری مضامین قرار دینے سے متعلق حکومت کے فیصلے پر تشویش کا اظہار کیا ہے آج یہاں ایک اخباری بیان میں انہوں نے کہا کہ ایک طرف تو حکومت کو ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے اور اردو کو قومی زبان کے طور پر اختیار کرنے کا سامنا ہے اور دوسری طرف اس قسم کے غیر دانشمندانہ فیصلے کئے جا رہے ہیں انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ فیصلہ واپس لیا جائے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۹-۱۲-۸۶ء

اردو ہماری پہچان ہے — سید قاسم شاہ

اسلام آباد ۲۹ دسمبر (نیوز ڈیسک) ریاستوں، سرحدی علاقوں اور کشمیر و شمالی علاقہ جات کے وفاقی وزیر سید قاسم شاہ نے کہا ہے کہ جن چیزوں سے ایک قوم کا تانا بانا بنتا ہے ان میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زبان قوم کی پہچان ہوتی ہے اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ بحیثیت پاکستانی ہماری پہچان اردو ہے وہ آج شام انجمن سرکاری ملازمین برائے نفاذ اردو کی طرف سے منعقدہ مجلس مذاکرہ سے خطاب کر رہے تھے مجلس مذاکرہ کا عنوان تھا اردو کا قومی یکجہتی میں کردار۔ انہوں نے کہا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور اس زبان نے قومی یکجہتی میں اہم کردار ادا کیا ہے

اس مجلس مذاکرہ سے ڈاکٹر عبدالحمید قریشی صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے بھی خطاب کیا۔ مہمان خصوصی سید قاسم شاہ نے تقریب کے اختتام پر دفتری زبان کی تربیت پانے والوں میں اول دوم اور سوم آنے والوں میں انعامات اور اسناد تقسیم کئے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۳۰-۱۲-۸۶ء

پی ٹی وی [illegible]

[illegible]

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی [illegible]

A.K. education system to be revolutionised

MUZAFFARABAD, Feb. 17: Major emphasis has been laid on technical and scientific education in the 7th Five-Year Plan which is under preparation in Azad Jammu & Kashmir.

This was stated by the Prime Minister of Azad Jammu and Kashmir Sardar Sikandar Hayat Khan, while speaking here as chief guest at a prize distribution ceremony of Girls High School.

He said that the 7th five-year plan will reflect in real sense the aspirations of the people. He also said that the objectives of Kashmir liberation movement were being incorporated in the educational syllabus in AJK. He further said that the educatinal system would be reorganised on revolutionary basis within the next three months.

The Prime Minister announced a donation of Rs. 10,000 for the school and Rs. 5,000 for the girl students on their presentation of various programme. He approved the grant of Rs. 60,000 as financial assistance to the children of late Public Prosecutor Kh. Amiruddin.

Earlier the Prime Minister addressed a high level Forest Conference.

Addressing the conference the Prime Minister called for evolving a strategy for improving the forest wealth to meet the requirements of the people. He said that according to a report of international experts the population of Azad Kashmir was increasing at the rate of 400 persons per square mile. Alternative means would have to be explored to meet the requirements of the increasing population of this magnitude.

The Prime Minister assured the Forest Employee that the Government would solve their problems within its resources. He announced the award of scale No. 1 from next year to the 'beldars' of the Forest Department. He appreciated the administrative capabilities of the Forest Department and urged it to serve with more devotion and dedication.—P.R.

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۸-۲-۸۷ء

RAMBLER'S DIARY

By SULTAN AHMED

What we may lose with English

If we go by the 1973 Constitution, Urdu should become the national language effectively from next year and it would replace English as the official language. It has been officially stressed the medium of examination for the matric from next year will be Urdu.

The over-pasted Constitution also says that English may be used for official purposes until arrangements are made for its replacement by Urdu.

The question instantly arises, despite the stipulation of the 1973 Constitution that arrangements should be made to replace English as the official language within 15 years besides the point whether adequate and comprehensive arrangements have been made by now for replacement of English in key areas.

Judging by the paucity of basic Urdu text books, reference books and the flourishing translating industry which ought to have come up to render English books into Urdu, the arrangements made within the 15 year interregnum are too inadequate. If the government wanted the transformation to be smooth, it should have pumped in a great deal of money into this area, but that has not taken place.

It has yet not been decided finally whether Urdu words should be coined for every invention and discovery made outside Pakistan, whether that be in the U.S., Britain, Germany, Soviet Union or China or we should use the original terms that be for X-ray or computers. Dr. I. H. Usmani who visits Pakistan with a bagful of sweeping advice from time to time, wants Pakistan to use the original term and not go into devising new Urdu words for each of them. I think he is right. If the English can accept words like curry, pucca nawab etc., I see no reason not to accept their inventions with the names they give to them in the manner we call a man by the name given by his parents, even they may at times seem too incongruous, instead of inflicting our own names on them.

But the bigger question is, is the purpose of replacing English as the official language with Urdu at this stage really to fulfil the provisions of a constitution which has been dishonoured by the present ruling votaries of Urdu in too many ways? Many here argue that the change over is part of the process of Islamisation or the persistents to break away from the West politically,socially and culturally.

It is assumed by such persons that in a country where schools, colleges and universities remain closed too often, and for long periods English as a second language may not make much headway. The standard of English is bound to be very low, and those who matriculate or even graduate with Urdu as medium of instruction may not be able to read standard English books and comprehend their real import.

If this process goes for sometime, it is argued, you may hardly see anyone standing up in the Pakistan Parliament quoting May's Parliamentary Practice or other handbooks of major parliaments of the world. Interest in English books on politics, economics, sociology and culture would also wane and that holds good of books in other languages, like the French German, and Russian, translated into English. As a result we will be becoming more and more of an inward looking society, pre-occupied with local issues and seeking solutions to them based on local precedents.

Such pessimisim will be countered by the votaries of Urdu with the argument that once the dominance of English ends, major foreign books would be translated into Urdu quick. But judging by the paucity of the prescribed Urdu text books, their poor standards and the confusion which lasts in this area, one cannot assume the end of English as the dominant language will mean triumph or spectacular success of Urdu publishing.

Look at what is happening in the area of republishing foreign books of great relevance to Pakistan.The foreign publishers and the local republishers cannot too often agree on the terms as the number of books they can reprint and sell in Pakistan is held as small and uneconomic.

Of course, there is a pirating industry. But what books are most often pirated? They are popular semi-erotic novels or thrillers by Harold Robbins, Sydney Sheldon Erica Jong, Jackie Collins, etc. Quality books with small sale are not pirated on a commercial scale.

Of course, after English slides away the government and private publishing houses will come up with new Urdu books. Writers will be encouraged,, rewarded and large prizes bestowed on them. But such books are bound be safe or conventional books and those which will not incur the displeasure of the government or the conservative society.

Few publishers would want to rock the boat and annoy the government which is not good business, not even publishing business. How are we going to overcome such sterile prospects in a country where authoritarian rule is more the norm than the exception.

It has been noticed as well that many of the major books on Islam read in Pakistan are written by Western writers. They can be historians like Hitti, or scholars of Islam like Gibb, Ruben Levy, Von Greunebaum or Jospeh Hell. Many of these books are not popular with the very conservative Muslim scholars who do not want us to see Islam or Islamic history through Western scholarship however intensive that is as Western scholastic discipline demands. Many of such books may not get tranlated into Urdu at all. Instead we would be expected to be content with local scholars in this vital areas.

I also see that many of the writings of Arab scholars and writers come to us through English. Few of them are translated directly into Urdu from Arabic. So if English ceases to be an effective medium between Pakistan and the rest of the world including the Islamic world we can become terribly poor intellectually and culturally for that, and deeply conservative too.

Of course, it would be argued that if Japan and Germany could make tremendous progress without English as their main language, Pakistan could do likewise. But both Japan and Germany, and for that matter Iran next door do not have any other major language. But we have four other major provincial languages and dialects.

In Sind for example, replacement of English and Urdu has become major political issue. Dr Ghulam Mustafa Shah of Jaeye Sind Mahaz for example, argues that Urdu may become the official language but never the national language, not in Sind.

In Germany and Japan the approach to education, particularly the official approach, is far different from ours. And schools and colleges do not remain closed with the first bus burned or cop assaulted.

So while the major provisions of the 1973 Constitution remains submerged or grossly twisted, let not the article relating to the official language be implemented with blind and unthinking zeal.

کتنے لوگ انگریزی کو سرکاری زبان بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں

اکثریت قومی زبان کے حق میں ہے۔ اس موضوع پر کوئی تنازعہ نہیں

قومی یکجہتی کے موضوع پر مجلس مذاکرہ

قومی زبان سے مجرمانہ بے اعتنائی

مقتدرۂ اردو زبان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی دردمندی سے یہ انتباہ کیا ہے کہ اگر قومی زبان اردو کو مکمل طور پر ذریعہ تعلیم نہ بنایا گیا تو وطن عزیز میں احساس محرومی بڑھتا اور پھیلتا جائے گا اور بالآخر ہم اپنی قوم کی کشتی ڈبو بیٹھیں گے انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ سائنس کے میدان میں جو دھماکہ خیز ترقی ہوئی ہے اسکے نتیجے میں اب انگریزی تمام علوم کا سرچشمہ نہیں رہی اسلئے سائنسی ترقی کیلئے صرف انگریزی پر انحصار کرنے کا استدلال بھی اب غلط ہو گیا ہے آج کی دنیا میں سائنسی میدان میں آگے بڑھنے کیلئے انگریزی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانیں بھی سیکھنا پڑتی ہیں اسلئے کیوں نہ انگریزی کو بھی ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے انہوں نے کہا کہ مقابلے کے امتحانات میں بھی ہر سطح پر قومی زبان کو اختیار کرنا چاہئے۔

قومی زبان کے بھی سکالر تحریک پاکستان کے وقت سے اردو کو قومی زبان کے شایان شان درجہ دینے کی باتیں کرتے آئے ہیں مگر ان کی شنوائی اب تک نہیں ہوئی خدا خدا کر کے ۷۳ء کے آئین میں حتمی طور پر یہ بات طے کی گئی تھی کہ ۸۶ء تک اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دے دی جائے گی اب موجودہ حکومت نے بھی یقین دہانی کرائی ہے کہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اقدامات کر لئے گئے ہیں لیکن عملاً ابھی صورتحال یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی چلی آ رہی ہے تمام اعلیٰ امتحانات اور مقابلے کے امتحانات میں انگریزی کا ہی سکہ رواں ہے اور جس شہر لاہور میں قیام پاکستان کے وقت کل پانچ انگلش میڈیم سکول تھے ان میں اس وقت ۲۶۳ انگلش میڈیم سکول ہیں۔ اس سے ہر کوئی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ انگریزی زبان کی عملداری کے خاتمے کے ابھی کوئی آثار نہیں ان حالات میں اپنے سینے میں قومی زبان کا درد رکھنے والا ہر دانشور اپنے ان ارباب تعلیم کی عقل و دانش کا ماتم کرنے پر مجبور ہے جو ابھی تک اپنی قومی زبان کو مکمل طور پر تعلیم اور امتحانات کی زبان کا درجہ بھی نہیں دے سکے ہمارے نزدیک اردو کو دفتری زبان کا درجہ دینے سے کہیں پہلے اردو کو مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ مشرق لاہور ۶-۳-۸۷ء

نظام تعلیم بنانے والے پاکستان کی تہذیب سے ناآشنا ہیں

اردو کی ترقی کیلئے موثر اقدامات کی ضرورت ہے

اردو فاؤنڈیشن کے مذاکرے سے مقررین کا خطاب

لاہور (نامہ نگار) قیام پاکستان سے قبل اردو زبان مسلمانوں کے تشخص کا نشان تھی پاکستان کی ہر حکومت نے اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا لیکن کسی نے سنجیدگی سے اسکی طرف توجہ نہ دی۔ مقتدرہ قومی زبان نے بھی صرف اصطلاحات کا ترجمہ کرنے پر زور دیا اردو زبان آج بھی وہیں ہے جہاں نصف صدی قبل تھی۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے قومی تحریک چلائی جائے۔ ان خیالات کا اظہار گذشتہ روز مختلف مقررین نے اردو فاؤنڈیشن پاکستان کی طرف سے منعقدہ مذاکرہ میں کیا جس کا موضوع "ہمارے نظام تعلیم میں اردو کی حیثیت" تھا۔ اس تقریب کی صدارت شعبہ اردو اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کی حکیم سعید کے علاوہ پروفیسر رضی عابدی اور بریگیڈیئر گلزار احمد نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا کہ ہر دور میں بیان بازی کی حد تک اردو کی حمایت کی گئی عملاً کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی بجائے انگریزی طریقہ تدریس پر زور دیا جاتا رہا ہے یعنی اعلیٰ تعلیم میں اردو زبان کی کوئی حیثیت مقرر نہیں کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ نظام تعلیم بنانے والے پاکستان کی تہذیب سے ناآشنا ہیں یہی وجہ ہے کہ انکے بیشتر منصوبے عملی صورت میں تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مقتدرہ قومی زبان نے جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا ہے میں اردو کا پروفیسر ہوتے ہوئے بھی انہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

پروفیسر رضی عابدی نے کہا کہ یہاں انگریزی بولنے والے کو پڑھا لکھا اور مہذب سمجھا جاتا ہے جبکہ اردو نچلے متوسط طبقے کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قومی یکجہتی کے لئے ضروری ہے کہ علاقائی زبانوں کی اصطلاحات کو اردو زبان میں استعمال کیا جائے بریگیڈیئر گلزار احمد نے کہا کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل ۸۰ فیصد مسلمان پڑھے لکھے تھے لیکن اب یہ شرح کم ہو کر صرف ۲۸ فیصد رہ گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب بیوروکریسی کا کمال ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تعلیم کا محکمہ عوام کے سپرد کر دیا جائے تو آئندہ چند برس تک معیار تعلیم بلند ہو سکتا ہے۔ اردو کو بھی اس کا مقام ملنا چاہئے۔ حکیم محمد سعید نے کہا کہ یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ ہم اب تک اپنے نظام تعلیم کی سمت کا تعین نہیں کر سکے۔

روزنامہ جنگ لاہور ۶-۳-۸۷ء

تعلیمی پالیسی بنانے والوں کا ہماری تہذیب کے ساتھ کوئی وابستگی نہیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی

قیام پاکستان کے بعد اردو کی اہمیت سے مسلسل انکار کیا جا رہا ہے، پروفیسر رضی عابدی

لاہور ۵ مارچ (وقائع نگار) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اردو کو ابھی تک دفتری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیمی پالیسی بنانے والوں کو ہماری تہذیب سے کوئی دلچسپی نہیں اور ان کے بیشتر منصوبے عملی صورت میں تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی آج شام اردو فاؤنڈیشن کے مذاکرہ میں صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ "ہمارے تعلیمی نظام میں اردو کی حیثیت" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مقتدرہ اردو زبان نے اردو کی جو اصلاحات بنائی ہیں انہیں اردو کا پروفیسر ہوتے ہوئے بھی انہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ زبان اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے جب نظام کی سمت درست ہو۔ پروفیسر رضی عابدی نے کہا قیام پاکستان سے قبل اور تحریک پاکستان کے دوران اردو مسلمانوں کے تشخص کا نشان تھی مگر قیام پاکستان کے بعد اس کی اہمیت سے مسلسل انکار کیا جاتا رہا اور اسے اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا جبکہ انگریزی بولنے والوں کو مہذب قرار دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ بریگیڈیئر گلزار احمد نے کہا کہ تعلیم میدان حکومت کے بجائے عوام کے ہاتھ میں دے دیا جائے انہوں نے کہا کہ پہلا طبقہ اردو میں دفتری زبان لکھنا اور بولنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے اردو میں زبان استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ حکیم محمد سعید نے کہا کہ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج تک ہم اپنے نظام تعلیم کی سمت کا تعین نہیں کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے اردو کو قومی زبان بنانا ہے تو ہمیں اپنے نظام تعلیم میں بھی اسے وہی مقام دینا ہو گا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۶-۳-۸۷ء

دو زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے طبقاتی فرق بڑھے گا۔ ڈاکٹر وحید قریشی

میانوالی ۵ مارچ (نمائندہ جسارت) تحریک فروغ اردو میانوالی کے زیر اہتمام قومی یکجہتی میں اردو کے کردار پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کی صدارت تحریک کے صدر شیر بہادر خان نے کی جبکہ ڈاکٹر وحید قریشی چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اور بریگیڈیئر گلزار احمد مہمان خصوصی تھے۔ مقررین نے کہا کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں ہماری ہیں۔ علاقائی زبانیں یقیناً اظہار خیال کا مؤثر ذریعہ ہیں مگر چونکہ اردو کی جڑیں تمام علاقائی زبانوں میں موجود ہیں اور اردو تمام علاقائی زبانوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے اس لئے قومی یکجہتی میں اردو کا کردار نہایت اہم ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ ہم انگریزی کے قطعاً مخالف نہیں اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی کو اختیاری مضمون کر دیا جائے بلکہ اسے لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جانا چاہئے۔ لیکن ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اگر انگریزی کو اختیاری مضمون قرار دے دیا گیا اور دو ذریعۂ تعلیم شروع ہو گئے تو پھر طبقاتی فرق بڑھے گا اور اردو میڈیم کے طلبا انگریزی میڈیم کے مقابلے میں بہتر ملازمتیں حاصل نہ کر سکیں گے اس لئے ضروری ہے کہ یکساں ذریعہ تعلیم ہو اور وہ اردو ہونا چاہئے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۶-۳-۸۷ء

کمنٹری صرف اردو میں نشر کی جائے

مکرمی۔ میں آپ کے روزنامہ کے ذریعے حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان اب ایک جمہوری ملک ہے اردو ہماری قومی زبان ہے۔ لیکن کرکٹ میچ میں زیادہ تر کمنٹری انگریزی میں نشر ہوتی رہی ہے یعنی ایک گھنٹہ کمنٹری انگریزی میں اور نصف گھنٹہ اردو میں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں خواندگی کی شرح ۲۶ فی صد ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ ۱۰ فی صد لوگ ایسے ہوں گے جو انگریزی زبان سمجھتے ہوں گے جبکہ دوسری طرف اردو واحد قومی زبان ہے جو ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ کرکٹ نے اب عوامی کھیل کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے جمہوری اصولوں کا احترام کرتے ہوئے انگریزی زبان کی کمنٹری بند کر کے مکمل طور پر اردو زبان میں کمنٹری نشر کی جایا کرے۔

— گلزار احمد قریشی لاہور

روزنامہ امروز لاہور ۲۷-۱-۸۶ء

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اردو تحقیق

(ایک اجمالی نظر)

جملہ اصنافِ ادب میں تحقیق وہ بھاری پتھر ہے جسے اردو کے بیشتر نقادوں نے محض چوم کر چھوڑ دینے ہی میں عافیت سمجھی ہے تحقیق، پتہ ماری اور جگر کاوی کا دوسرا نام ہے اور ایک محقق کو ہر آن پل صراط سے گزرنے والے کی طرح محتاط ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں اول درجے کے بیسیوں نقادوں کے مقابلے میں پاسنگ کے محققوں کے نام بآسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

دکنیات کے سلسلے میں ابتدائی کام محی الدین قادری زور، سید محمد عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کا ہے ہر چند کہ انہیں مغرب میں تحقیق کے طریقۂ کار سے کسی قدر واقفیت تھی، مگر ان کے ہاں تکمیل اور گہرائی کا فقدان ہے صحیح معنوں میں ادبی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی سے ہوتا ہے۔ تحقیق سے انہیں طبعی مناسبت تھی، مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب کو مغربی طرزِ تحقیق سے بھی شناسائی تھی۔ انہیں کئی برس مغرب میں رہنے کا موقع ملا، سب نے ان کے علمی تجربے میں اضافہ اور تحقیقی مزاج میں استحکام پیدا کیا شیرانی صاحب لغت، لسانیات اور عروض کے ماہر تھے بلکہ عتیقیات سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سکوں، کتبوں، مہروں، تصویروں اور علم خط سے اپنی تحقیق اور استخراجِ نتائج میں مدد لی۔ ان کی دشوار پسند طبیعت کو یکسوئی کے ساتھ تحقیق و تصنیف کا موقع ملا۔ اُن کی گرفت سے کوئی نہ بچ سکا "شعر العجم" اور "آبِ حیات" پر اُن کی تنقید کو بے رحمانہ یا "ظالمانہ" (وحید قریشی) تو کہہ سکتے ہیں مگر اس میں شبہ نہیں کہ شیرانی صاحب کی بت شکنی نے مقامِ تحقیق سے آسان گزرنے والوں کے اندر محنت اور ذمہ داری سے کام لینے کا احساس پیدا کیا وہ حقیقی معنوں میں "اردو تحقیق کے معلمِ اوّل ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم کو شیرانی صاحب کی سی یکسوئی حاصل نہیں تھی "یک سرو ہزار سودا" کے مصداق، ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا دائرہ وسیع اور متنوع تھا۔ انہوں نے قدیم متون دریافت کر کے ان کی تدوین کی، ان پر تحقیقی مضامین لکھے اور تنقید بھی کی ترویجِ اردو کے لیے اُن کی جو کھم لڑائی اس پر مستزاد! بحیثیت مجموعی اردو کے لیے ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں مگر ان کی سی ہنگامہ خیز زندگی، تحقیق کو راس نہیں آتی۔ مولوی عبدالحق کے مقلدین و متبعین ان جیسی جانفشانی اور لگن سے عاری تھے انہوں نے تحقیق و تدوین کے نام پر جو طومار باندھے وہ دنیائے تحقیق میں ناقابل التفات ہیں۔

مولوی محمد شفیع مرحوم بنیادی طور پر عربی کے محقق تھے مگر محمد حسین آزاد، ذوق اور داغ پر ان کے مقالات بقول ڈاکٹر وحید قریشی "تحقیق کا اعلیٰ نمونہ" ہیں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق میں ریاضت کے ساتھ وسعت اور گہرائی میں جانے کا ذوق پیدا کیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے شاگردوں کی تربیت کی اور انہیں تحقیق کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔ مولوی محمد شفیع کی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ بھی عربی، فارسی اور مشرقی علوم کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ سید صاحب ابتدائی دور میں فارسی ادب کی تحقیق میں مصروف رہے۔ بعدہٗ انہوں نے اردو میں شہر آشوب تذکروں اور زبان و لغت کے بعض مسائل پر نہایت وقیع تحقیقی مقالات لکھے تحقیق میں ان کا اسلوب بھی ان کی شخصیت کی طرح مرنجاں مرنج اور توازن و اعتدال پر مبنی ہے۔ اب اُن کا جھکاؤ تحقیق سے زیادہ تنقید کی طرف ہو گیا ہے اور علمی و ادبی تحقیق ان کے

علم و فضل اور تحقیقی نظر سے محروم ہو گئی ہے ۔

قاضی عبدالودود اردو تحقیق میں ایک بڑا نام ہے ۔ قدیم مشرقی علوم اور عربی و فارسی میں مہارت کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب انگریزی، یونانی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف ہیں ان کی سخت گیری اور صاف گوئی و بے باکی دراصل شیرانی کی اخلاقیات تحقیق کی توسیع ہے ۔ مزید برآں قاضی صاحب کا انتہائی معروضی اور کھرا انداز اور مختصر نویسی اردو تحقیق کے حق میں ایک نیک فال ہے ان کی بیشتر تحریروں کو معروضانہ اور احتسابی تحقیق کا نام دیا گیا ہے مگر قاضی صاحب کے اعتراض و احتساب اور ان کی چیرہ دستیوں نے اردو تحقیق کو گمراہی سے باز رہنے اور گمراہی سے بچنے کا سلیقہ سکھایا ہے ۔ تحقیق میں کوئی شخص کامل و اکمل نہیں ہو سکتا قاضی صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں بھی کمزور اور ناکام حوالوں داخلی تضادات اور سہل انگاری کی متعدد مثالیں موجود ہیں ۔ بعض اوقات وہ مخففات کو چیستاں بنا دیتے ہیں کبھی ان کے ہاں طنزیہ رنگ آجاتا ہے جو غیر علمی اور غیر تحقیقی انداز ہے اسی طرح کہیں کہیں ان کا اسلوب خشکی و بے کیفی اور ضرورت سے زیادہ اختصار و اجمال کا شکار ہو گیا ہے ۔ (دیکھئے : معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون ص ۹۵ - ۱۱۹)

تحقیق میں قاضی عبدالودود کی تمام تر مثالیت پسندی کے باوجود یہ سوال بڑا اہم ہے کہ "تحقیق میں ان کا کارنامہ کیا ہے" ؟ اس ضمن ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں : " مالک رام نے ذکر غالب اور گل رعنا کے علاوہ ابوالکلام آزاد کی کتابوں کی خوب سے خوب تر ترتیب دی لیکن قاضی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی بڑا کام نہ کیا ۔ کاش وہ مصحفی یا انشا پر کوئی یادگار کتاب لکھ جاتے ۔ کاش وہ تمام تذکروں کو سمو کر ادیبوں کی سوانح ڈکشنری (۱۸۵۷ء تک) تیار کر دیتے کیسے خاصے کی چیز ہوتی یہ مسلم کہ ان کی تنبیہوں کی بڑی قیمت ہے اس سے راہ تحقیق کی استقامت میں بہت مدد ملی لیکن تنقید شعرالعجم کا مرتبہ شعرالعجم کے برابر نہیں ہوتا ۔ انہوں نے کتنے زیادہ علم سے کتنا چھوٹا کام لیا " (معاصر، قاضی عبدالودود نمبر: ص ۱۱۹)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کو تحقیق کے لسانی، نحوی اور املائی مسائل سے دلچسپی رہی ۔ ان کی خدمات کا اعتراف بہر حال ضروری ہے، مسعود حسن رضوی کی بیشتر تحقیق قدیم اسٹیج ڈرامے اور میر انیس سے متعلق ہے ادبی تحقیق میں وہ احتسابی رویہ کے برعکس تعمیری تحقیق کے قائل ہیں ان کے نزدیک سچائی کی تلاش تحقیق کا سب سے بڑا اصول ہونا چاہیے، مسعود حسن رضوی نے اپنی کاوشوں کو کبھی بھی حرف آخر نہیں سمجھا، وہ ہمیشہ خوب تر کی جستجو اور اپنی ہی کاوشوں کو مزید جامع بنانے کی فکر میں رہتے ان کا مرتبہ دیوان فائز اعلیٰ درجے کی تحقیقی کاوش ہے ۔ اسی طرح لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج انیسیات، نگارشات ادیب اور (ان کے مرتبہ) متعدد تذکرے ان کی یادگاروں میں شمار ہونے کے لائق ہیں ۔ میر انیس اور اردو ڈرامے کی خوش بختی ہے کہ انہیں مسعود صاحب جیسا محقق نصیب ہوا ۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا تعلق حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع مرحوم کے دبستان تحقیق سے ہے ۔ انہوں نے دونوں بزرگوں سے معنوی فیض اٹھایا اور مؤخر الذکر سے براہ راست استفادہ بھی کیا ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے تحقیقی مجموعۂ مقالات "کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ" کے آغاز میں مولانا شبلی کا یہ اقتباس درج کیا ہے :-

" آج اجتہاد اور تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے آج ہم کو کسی مسئلہ کو اس بنا پر ماننا یا انکار کرنا چاہیے کہ کسی بڑے سے بڑے شخص کی رائے اس کے متعلق کیا ہے ؛ بلکہ اس لیے کہ فی نفسہ وہ مسئلہ کیا ہے ؛ ہم وہ لوگ ہیں کہ پیغمبر کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے "

(مقالات شبلی، جلد اول : ص ۱۵۶)

اس سے تحقیق میں ڈاکٹر وحید قریشی کا زاویۂ نظر واضح ہوتا ہے تاریخ سے خصوصی شغف کے سبب انہوں نے اپنی فارسی اور اردو تحقیقات میں تاریخ کو آمیز کیا اور استخراج نتائج میں تاریخ کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی، محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کی روایت میں ان کے بعض مقالات، احتسابی تحقیق کے ذیل میں آتے ہیں، مگر زیادہ تر تحریریں، بعض نئے موضوعات سے متعلق ہیں ان کی مرتبہ "مثنویات میر حسن" اور "دیوان جہاں دار" تدوین کے ضمن میں عمدہ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ ان کی تحقیقی کاوشوں کا دائرہ نسبتاً

وسیع ہے۔

رشید حسن خان کا کام نظری و عملی تحقیق میں تطابق کی ایک عمدہ مثال ہے لغت اور زبان و قواعد کے ساتھ انہوں نے املا کے مسئلے پر پہلی بار اتنی شرح و بسط کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اپنی کتاب" ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ" میں انہوں نے تحقیق کے اصولوں اور اخلاقیات کی نشان دہی کے ساتھ بعض ہم عصر تصانیف کے تجزیے میں ان کا اطلاق بھی کیا ہے جو عملی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تحقیق کے ایک اہم شعبے تدوین کے ضمن میں بھی انہوں نے بعض شعراء کی تصانیف (سودا، ناسخ، دیا شنکر نسیم) اور بعض نثر نگاروں (میر امن دہلوی) کی مرتب کیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ صحت متن، تدوین اور املا کے اصول مجسم ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، حق گوئی و بے باکی اور احتساب میں وہ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کی روایت کے امین ہیں۔

مرحوم بزرگوں میں عندلیب شادانی اور سید وقار عظیم کے ہاں تنقید کے ساتھ تحقیق کے نقوش ہیں۔ بنیادی طور پر وہ محقق نہیں تھے مگر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق میں بھی یادگار نقوش ثبت کیے ہیں، انہیں اپنے مزاج اور تحقیقی کام کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ ایسے بزرگوں کی صف میں شمار کرنا چاہیے، معاصرین میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ہاں تنقید اور تحقیق کا امتزاج ملتا ہے یوں ان حضرات سے خالصتاً تحقیق میں بھی بعض اہم نمونے پیش کیے ہیں (مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شاعری کے بعض متون مرتب کیے ہیں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام تحقیقی مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں ان کا بیشتر کام ہنوز غیر مطبوعہ ہے تحقیق میں مولینا امتیاز علی خاں عرشی کا مقام و مرتبہ مسلم ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ عربی زبان و ادب کی طرف رہی۔ ان کا سا وسیع مطالعہ قدیم و جدید علوم اور متعدد زبانوں سے واقفیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہے اردو میں ان کی تحقیقی کاوش غالبیات پر مرکوز رہی۔ نوابان کرم پور کے نام مکاتیب اور دیوان غالب کی تدوین و ترتیب اردو تحقیق کو ان کی عطا کہنا چاہیے، غالبیات کا ذکر آیا تو اس ضمن میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تحقیقی کاوشیں لائق توجہ ہیں۔ "غالبیات اور انقلاب ستاون کے بعد" "تحقیق غالب" ان کے مطالعہ و تحقیق اور تدبر غالب کا نچوڑ ہے جسے سلیقے اور دیدہ ریزی کاوش سے پیش کیا گیا ہے۔ غالبیات کے باب میں ان کی تحقیق "یک گیرد محکم گیر" کی خوب صورت مثال ہے اور ہمہ گیری کے شائقین کی توجہ چاہتی ہے۔

معاصر محققین میں مشفق خواجہ کو تدوین متون سے نسبتاً زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" اور "اقبال" بلا شبہ تحقیقی تدوین کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ شاعری کے باب میں ان کی دریافتیں بھی قابل قدر ہیں۔ "جائزہ مخطوطات اردو" اونچے معیار کا ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جو کسی بڑے ادارے کا کام تھا، مگر اسے مشفق خواجہ نے تن تنہا انجام دیا ہے محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خان کی احتسابی روش کے برعکس مشفق خواجہ نے اپنے لیے مثبت طور پر تعمیری تحقیق کا راستہ اختیار کیا ہے۔ ادبی تحقیق کا مستقبل بجا طور پر ان جیسی نظر رکھنے والوں سے وابستہ ہے۔

برصغیر میں نئی نسل سے متعدد اہل قلم تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں بعض اصحاب کی اکا دکا چیزیں سامنے آئی ہیں جس سے تحقیق کے باب میں ان کی فطری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے مثال کے طور پر اس وقت میرے ذہن میں پاکستان سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محمد اکرم چغتائی اور بھارت سے ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر عابد پشاوری کے نام آ رہے ہیں۔

تحقیق کے مختلف شعبوں کو پہنچے تو تحقیق کے اصول و مبادی اور نظری پہلوؤں پر بہت مبہم لکھا گیا ہے اور جو کچھ بھی میسر ہے وہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے۔ مبادیات تحقیق (عبدالرزاق قریشی) متنی تنقید (خلیق انجم) اصول تحقیق و ترتیب متن (تنویر احمد علوی) ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ (رشید حسن خان) رہبر تحقیق (شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) تحقیق و تدوین (مرتبہ احمد ہاشم) علاوہ ازیں رسالہ "آج کل" کا اردو تحقیق نمبر اور تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر چند متفرق مضامین لسانی تحقیق اگرچہ "اردو محققین کا کمزور ترین پہلو ہے" (ڈاکٹر مسعود حسین خان) تاہم اس ضمن میں ڈاکٹر زور، سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری، ابو اللیث صدیقی، سہیل بخاری، عین الحق فرید کوٹی نے داد تحقیق دیتے ہوئے اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

دکنی اردو پر ہندی زبان میں ڈاکٹر شری رام شرما کا تحقیقی کام (جس کا اُردو ترجمہ غلام رسول نے "دکنی زبان کا آغاز و ارتقا" کے عنوان سے کیا ہے) اپنے موضوع پر وقیع تصنیف ہے۔ اُردو اور ہندی کے لسانیاتی رشتے پر ڈاکٹر سری رام آسرا کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ لسانی حیثیت سے اوسط اردو اور اوسط ہندی میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے اور ہندی اردو کے لسانی سرمایے کا بیشتر حصہ دیسی الفاظ پر مشتمل ہے۔ دونوں زبانوں کی گرامر میں بھی خاصی حد تک ہم آہنگی ہے اس اشتراک کی بنا پر تاریخی اور خاندانی اعتبار سے اردو اور ہندی سگی بہنیں ہیں جن میں لسانی یگانگت کا ایک قدیم اور گہرا رشتہ موجود ہے۔ اردو ہندی لسانی رشتے پر ڈاکٹر سہیل بخاری کی دو کتابیں " اردو کا روپ" اور "اردو کی کہانی" ایک منفرد نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی بولی کے دو نام ہیں جب اس بولی میں سنسکرت کے بول ملا کر بولتے ہیں تو اسے ہندی کہتے ہیں اور جب اس میں عربی فارسی کے بول بھر لیتے ہیں تو اردو کہنے لگتے ہیں .... (مزید یہ کہ) ہندی، دیوناگری رسم الخط میں اور اُردو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے (اردو کی کہانی: ص ۳۰) ڈاکٹر نصیر احمد نے اردو کی ایک بولی کراخنداری کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ پیش کیا ہے (ادارہ تصنیف دہلی، ۱۹۷۹ء) مشرف الدین اصلاحی نے نحوی ساخت، صرفی اور تشکیلی خصوصیات اور نظامِ اصوات نیز ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے اردو اور سندھی کے لسانی روابط و اشتراک کا سراغ لگایا ہے۔

اردو کے تحقیقی سرمایے کا معتد بہ حصہ ان امتحانی مقالات پر محیط ہے جو برصغیر کی جامعات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے اور پیش کیے گئے مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ان کا بیشتر حصہ غیر معیاری ہے چونکہ مقصود محض ڈگری کا حصول تھا اس لیے ایسے مقالات میں تحقیق کے اصولوں اور اخلاقیات کو بری طرح پامال کیا گیا ہے، اتفاق سے اس وقت میرے سامنے "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" کے نام سے مطبوعہ ایک مقالہ ہے جس پر مقالہ نگار کو لکھنؤ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ سعادت علی خان ناصر کے اس تذکرے کے چار قلمی نسخے دستیاب ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی، پٹنہ، علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ متذکرہ بالا تدوین، چاروں نسخوں کا باہمی موازنے کے بجائے صرف دو نسخوں کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ مرتب نے مخطوطۂ لکھنؤ کو اپنی تدوین کی بنیاد بنایا اور نسخہ پٹنہ کے اختلافاتِ متن حاشیے میں درج کر دیے گئے، یہ لیجیے تذکرہ مدون ہو گیا اور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بخش دی۔

رہے باقی دو نسخے تو علی گڑھ کے مخطوطے میں بقول مرتب: "شعرا کی ترتیب پٹنہ کے نسخے کے مطابق ہے، لیکن نہ تو ان میں حواشی ہیں اور نہ ہی متن میں ان شعرا کا ذکر ملتا ہے، جو نسخۂ پٹنہ کے حواشی پر درج ہیں، اس لیے اس سے مقابلہ کرنا ضروری خیال نہیں کیا گیا" (ص ۸) اور جہاں تک چوتھے نسخے (انجمن ترقی اردو کراچی) کا تعلق ہے اس کے بارے میں مقالہ نگار کہتے ہیں کہ اس تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی، سنا ہے وہ پٹنے والے نسخے کی نقل ہے" اب جہاں "سنا ہے کہ....." کی بنیاد پر کاروبارِ تحقیق چلایا جائے، وہاں نتیجہ معلوم! چار نسخوں میں سے دو کو دیکھے بغیر ہی چھوڑ دینا، سہل انگاری کی مثال ہے۔

یہ سہل انگاری اور تن آسانی، بھارت کی جامعات کے ساتھ مخصوص نہیں، پاکستان میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ تاہم بھارت میں تحقیق کا معیار اس لیے بطورِ خاص غور طلب ہے کہ اخلاقیاتِ تحقیق کی بحثیں زیادہ تر وہیں سے اٹھائی گئی اور تحقیق کے اصول و ضوابط پر تقریباً سب کتابیں وہیں کے اکابرین نے لکھی ہیں مزید یہ کہ بعض اوقات ایک ہی موضوع پر ہندوستان میں ہونے والی تحقیق، باعتبار معیار اسی موضوع پر کسی پاکستانی محقق کی کاوش سے فروتر ہے۔ اس سلسلے میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً: پاکستان میں جناب مشفق خواجہ کا مرتبہ "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" متذکرہ بالا مرتبہ

---

[1] متنی تنقید از خلیق انجم۔ مبادیاتِ تحقیق از عبدالرزاق قریشی۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ از رشید حسن خان اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن از ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ نیز "آج کل" کا اردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "اخلاقیاتِ تحقیق" (رسالہ بمبئی) وغیرہ

اس تذکرے سے کہیں زیادہ معیاری ہے، جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مقالہ ("اکبر الہ آبادی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" لاہور، ۱۹۸۰ء) اسی موضوع پر ہندوستان پر لکھے جانے والے مقالوں (از ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور ڈاکٹر فصیح ظفر) سے بہرصورت زیادہ جامع، مستند اور دقیع ہے، تاہم ہندوستان میں ہونے والے بعض تحقیقی کام یقیناً لائقِ تحسین ہیں مثلاً تنویر احمد علوی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اسی طرح ان کا مرتبہ کلیاتِ ذوق (مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۷ء) بھی تدوین کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اردو کے تحقیقی سرمایے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام انفرادی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہیں، پاکستان ہو یا بھارت اداروں کے زیرِ اہتمام مرتب ہونے والے اجتماعی منصوبوں کا حشر بالعموم افسوس ناک بلکہ عبرت ناک ہوا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کی تاریخ ادب اردو اور پنجاب یونیورسٹی کی تاریخِ ادبیات کے سلسلے میں تاریخِ ادب اردو کی پانچ جلدوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اردو تحقیق کو کئی طرح کے مسائل در پیش ہیں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت قدیم متون کی تدوین اور ان پر تحقیق کی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے بعض نقادوں اور جدید لکھنے والوں کا رویہ نامناسب ہے۔ کرم خوردہ مخطوطات اور قدیم متون پر دیدہ ریزی کرنے والوں کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ان جدید لکھنے والوں کے نزدیک کرم خوردہ مخطوطات دریا برد کر دینے کے لائق ہیں مگر یہ نادانی کی بات ہے۔ لغت قواعدِ زبان اور لسانیات کی بنیاد انہی متون کی صحیح اور تحقیقی تدوین پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔ تحقیقِ متون کے نتیجے میں بعض اوقات تاریخ ادب کے مسلمات تبدیل ہو جاتے ہیں اردو زبان و ادب کی ایک جامع اور مفصل تاریخ لکھنا باقی ہے مگر اس کا انحصار قدیم شعری و نثری مخطوطات و متون کی دریافت اور ان کی سائنٹی فک تدوین پر ہے۔

دورِ جدید میں سائنسی ایجادات مثلاً فوٹو اسٹیٹ، مائیکرو فلم، مائیکرو فیشن اور بعض دیگر تکنیکی سہولتوں نے تحقیق کو آسانیاں فراہم کی ہیں۔ اسی طرح مخطوطات و نوادر کی فہارس کی دستیابی اور مختلف اشاریوں کتابیات کی اشاعت بھی تحقیق کی رفتار کو تیز اور معیار کو بلند کرنے کا باعث ہوئی ہے مگر دوسری طرف تہذیبِ جدید کا مزاج ادبی تحقیق کے لیے سم قاتل ثابت ہوا ہے دنیاداری، مادہ پرستی، جاہ طلبی اور منفعت پسندی اور زمانہ شناسی کے اس دور میں کوچۂ تحقیق کا رخ کرنا دل گردے کا کام ہے۔ منصبی، مجبوریوں اور معاشی الجھنوں نے اہلِ قلم سے یکسوئی اور جمعیت خاطر چھین لی ہے، پھر ادبی کالموں، رونمائی کی تقریبوں اور فرمائشی تبصروں کی بیساکھیوں کے ذریعے شہرت طلبی کے رجحان نے بھی بحیثیت مجموعی ادب کو اور بہ طور خاص ادبی تحقیق کو نقصان پہنچایا ہے۔

پاک و ہند میں جامعات ہی اردو میں تحقیق کی تربیت گاہیں ہیں اور یہی ہماری ادبی تحقیق کا المیہ بھی ہے، سینئر اساتذہ کو نہ تو احساس ہے اور نہ اُن کے پاس وقت ہے کہ خُردوں کی تربیت کر سکیں اور خُردوں کے ہاں بھی "کاتا اور لے دوڑی" کا شوق صبر اور تواتر و تسلسل کے ساتھ کام کرنے میں مانع ہے۔ بہ قول غالب: عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔

آج ایسے لوگ خال ہیں جو تحقیق سے اپنی طبعی اور مزاجی مناسبت کے ساتھ، اس کے تقاضوں کا بھی احساس و ادراک رکھتے ہوں یہی لوگ اس میدان میں کوئی بات پیدا کر سکتے ہیں اردو تحقیق کی نگاہیں ایسے ہی لوگوں کی طرف لگی ہوئی ہیں تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے اقبال کا یہ شعر لائقِ تأمل ہے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اگر قومی سطح پر کسی تحریک کو منظم کر دیا جائے تو نفاذِ اردو کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر وفا راشدی

اُردو کا مولد سندھ اور تحقیق سلیمانی

سرزمین سندھ ہزاروں سال سے پرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ مختلف قوموں اور زبانوں کا مولد و مسکن رہا ہے اردو زبان کی کہانی بھارت میں ہزاروں برس بیشتر اس وقت شروع ہوئی ہے جب آریا وسط ایشیا کے میدانوں سے اتر کر پنجاب کی راہ ملتان سے بھارت آئے وہ علاقہ جہاں آرین اقوام نے پہلے پہل قدم رکھا تھا اس وقت ملتان سندھ کا ایک اہم خطہ تھا۔ اس زمانے میں آریا قوم کی زبان سنسکرت تھی۔ اردو زبان کا اصل سرچشمہ یہی آریائی سنسکرت ہے جو بعد میں پراکرت (ہندی)، پھر برج بھاشا کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام سے بہت پہلے عرب، عجم، مشرق وسطیٰ اور دوسرے اسلامی ممالک کے سندھ کے ساتھ تجارتی و اقتصادی تعلقات رہے اسی بناء پر بحری راستے کے ذریعے سندھ و ہند میں ان قوموں کی آمد و رفت اور مختلف زبانوں میں بول چال کا آغاز ہو چکا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے اس بیان میں تاریخ سندھ کے اس عہد زریں کے پس منظر کا احاطہ کیا ہے جب ۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سندھ میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا یہ وہ عہد تھا جب بھارت کے مختلف علاقوں اور صوبوں مثلاً پنجاب میں پنجابی، سرحد میں پشتو، بنگال میں بنگالی، مہاراشٹر میں مرہٹی، مدراس میں تامل، تلنگی مالا بار میں ملیالم، ملتان میں ملتانی اور سندھ میں سندھی الگ الگ بولیاں تھیں۔ لیکن ایک زبان ایسی تھی جو مشترکہ زبان کی حیثیت سے پورے برصغیر میں پشاور سے لے کر راس کماری تک بولی جاتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت اس زبان کی ہیئت و صورت وہ نہ تھی جو آج ہے یا جس کا نام اردو پڑ گیا۔ اس زبان کو قدیم ہندی یا پراکرت کہتے تھے۔ یہ زبان کسی نہ کسی شکل میں ملتان اور سندھ میں بھی موجود تھی۔

عربوں کی آمد سے سندھ و بھارت میں نہ صرف مسلم تہذیب و معاشرت کا چراغ روشن ہوا بلکہ عربی زبان و ادب اور علوم و فنون کا چشمہ بھی پھوٹا۔ ...۱۰۰۰ء میں سلطان محمود کی فتوحات کے بعد سندھ میں فارسی کا آغاز ہوا اس کے بعد سندھ میں سمہ سومرا، ارغون، ترخان مغل، کلہوڑا عہد تک (انگریزوں کے قیام سلطنت سے پہلے) فارسی نہ صرف سرکاری و دفتری زبان رہی بلکہ علم و ادب کی زبان کی حیثیت سے بھی روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ عربی و فارسی کو مسلم تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھا جاتا ہے اس طرح فاتح و مفتوح قوموں کے میل جول اور اختلاط و ارتباط سے مجموعی طور پر جس زبان نے جنم لیا اس کا نام ہندی یا ہندوی پڑ گیا۔ بعد میں ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی قرار پایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اپنی معرکہ آرا کتاب نقوش سلیمانی مطبوعہ کلیم پریس کراچی کے صفحہ ۹۸، ۹۹ میں اس تقریر کے حوالے سے جو انہوں نے "ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبہ اردو میں ۲۹ / مارچ ۱۹۳۷ء میں فرمائی تھی تحریر فرماتے ہیں۔ اس ملک میں عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک ترکی بولتے آئے مگر کچھ ہی دنوں بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہیں کی کسی زبان بولنے لگے جس کا نام انہوں نے ہندوی یا ہندی رکھا..... لیکن صوبے وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا" پھر اسی ہندی ہندوی یا ہندوستانی نے مسلمانوں کے عہد جہانگیری میں "ریختہ" کا نام پایا۔ بقول مولوی عبدالحق یہیں سے اردو کی ابتدا ہوتی ہے۔"

اس طویل عرصے میں یعنی محمد بن قاسم کے عہد سے لے کر عہد شاہجہانی تک اردو مختلف ادوار سے گزرتی رہی، متعدد صورتوں میں بدلتی رہی اور جب یہ زبان سنسکرت، پراکرت، بھاشا، ہندی، ریختہ کے ناموں سے آزاد ہو کر اس منزل تک پہنچی جب اس میں عربی فارسی کے علاوہ ترکی، فرانسیسی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے بے شمار الفاظ و محاورات، تراکیب و استعارات شامل ہو گئے تو ان تمام زبانوں کے روابط و اشتراک سے جس ایک زبان نے جنم لیا اس کا نام شاہجہان کے دور میں پہلے "اردوئے معلیٰ" پھر "اردو" ہو گیا۔

اردو نے جنم تو لیا لیکن اس کی جنم بھومی کا مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا۔ اردو کی جائے پیدائش سے متعلق محققین و مورخین کی آراء مختلف ہیں پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب کو "پنجاب میں اردو" میں نصیر الدین ہاشمی نے دکن کو "دکن میں اردو" میں، حامد حسن قادری نے دلی و نواح دلی کو "داستان تاریخ اردو میں" رام بابو سکسینہ نے گجرات کو "تاریخ ادب اردو" میں مولوی عبدالحق نے دوآبہ گنگا جمنا کو "اردو زبان کی کہانی" میں اور شیخ اکرام الحق نے ملتان کو "ارض ملتان" میں اردو کا مولد بتایا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ناچیز کتاب "بنگال میں اردو" (مطبوعہ مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد سندھ ۱۹۵۵ء) میں علامہ ناطق لکھنوی کی منظوم تاریخ ادب اردو موسوم بہ "نظم اردو" میں ص ۱۵ کے حوالے سے یہ لکھا ہے " اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمایئے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا۔ دہلی میں آکر دریا بنا، اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں، ایک بنگال کو گئی، ایک بہار کو ایک اودھ اور ایک گجرات کو یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام بھارت خصوصاً آگرہ اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنؤ میں صاف کیا اور صاف کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑا دیں۔ مذکورہ بالا مورخوں، محققوں اور نقادوں کے خیالات و نظریات کو پیش نظر رکھ کر جب ہم مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کا تحقیقی سرمایہ اردو زبان کے مولد اور ابتدا کے بارے میں اساسی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے مولانا موصوف نقوش سلیمانی کے صفحہ ۳۱ میں رقمطراز ہیں۔

" بھارت کی متعدد زبانوں کا پہلا گہوارہ سندھ ہے جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ساہیولا اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

پیر حسام الدین راشدی مرحوم کے ایک مقالے مطبوعہ رسالہ اردو (کراچی اپریل ۱۹۵۱ء) کا اصل ماخذ بھی مولانا کی یہی تحریر ہے مولانا سلیمان ندوی اور پیر حسام الدین راشدی کے ان بیانات کو علامہ نیاز فتح پوری مدیر ماہنامہ نگار لکھنؤ جیسے مقتدر محقق اور یگانہ روزگار نقاد کی حسب ذیل توضیحات سے مزید تقویت پہنچی۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اردو کی بنیاد سب سے پہلے وہ حملہ تھا جو شاہان اسلام نے ہندوستان پر کیا۔" علامہ نیاز فتح پوری کے اس خیال کی تائید محمود شیرانی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے" اردو زبان (یعنی اردو کا) وجود اس زمانے سے ہے جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے" (پنجاب میں اردو ص۹) علامہ نیاز فتح پوری آگے تحریر فرماتے ہیں۔" میرے نزدیک وہ اولین تخم ریزی تھی جو عرصے سے عدم آبیاری کی وجہ سے کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکی لیکن بعد کو جب رفتہ رفتہ شاہان اسلام نے یہاں قیام کر کے مستقل سلطنتیں بنائیں اور باہمی میل جول بڑھنے لگا تو اس تخم کی نشوونما کے آثار شروع ہوئے اور برج بھاشا میں (جو خود آرین اقوام کی اصل زبان سنسکرت اور بھارت کے اصل باشندوں کی زبان سے مل کر تیار ہوئی تھی) فارسی و ترکی الفاظ کی آمیزش اس تک ہوئی کہ آخر کار خلجیوں کے عہد میں اس درخت کی سب سے پہلی کلی امیر خسرو کی شکل میں نمودار ہوئی۔"

علامہ نیاز فتح پوری کے اس تاریخی مطالعے کی روشنی میں اور "تحقیقات سلیمانی" کی تائید میں کئی باتیں تاریخی شواہد کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ (۱) شاہان اسلام کا سب سے پہلا حملہ سندھ کے راستے ہندوستان پر ہوا اور سندھ ہی ان کی حکومت اور قیام حکومت کا مرکز رہا۔ (۲) آرین قوموں نے سب سے پہلے بھارت کے جس قطعے میں سکونت اختیار کی وہ سندھ ہی کا ایک حصہ ملتان تھا۔ (۳) مسلمان بادشاہوں کے تقریباً ہر عہد میں

سندھ یا ملتان علوم وفنون اور شعر و ادب کا مرکز رہا (۴) امیر خسرو سندھ میں آئے اور پانچ سال ملتان میں قیام کیا ان کے قیام سے سندھ اور ملتان میں قیام سے سندھ اور ملتان کی زبان اور اس کے ادب کو یقیناً آبیاری کا موقع ملا۔ ان تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا مولد ہند کا کوئی اور خطہ نہیں بلکہ سندھ ہے۔ مولانا سلیمان ندوی کی اس تحقیق کو مزید جلا ملتی ہے اس فقرے سے جو سلطان فیروز شاہ کے عہد میں سب سے پہلے سندھ میں معرض وجود میں آیا۔ سندھ میں اردو کا پہلا فقرہ کس طرح وجود میں آیا۔ اس کی تاریخ سے متعلق مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں۔ "سندھی سلطان فیروز شاہ کے ٹھٹھہ سے ناکام گجرات جانے کے بعد اپنی کامیابی کو سندھ کے مشہور بزرگ حضرت پیر پٹھو کی کرامت قرار دیتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا" (تاریخ سندھ اول ص ۴۰۲) "پنجاب میں اردو" (صفحہ ۸ پر محمود شیرانی نے اس فقرے کو شمس سراج عفیف کی روایت سے یوں نقل کیا ہے۔ " برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا"۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں اس فقرے کا تاریخی پس منظر یہ ہے۔" ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور یہاں سے گجرات اور کاٹھیاوار تک ہوا ہوگا۔ ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔ سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والوں نے اسے اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا۔ برکت شیخ پٹھا، اک موا اک نٹھا یعنی شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا مر گیا اور دوسرا سلطان فیروز شاہ تغلق ناکام رہا (نقوش سلیمانی ص ۲۵۹) اہل تحقیق نظران دو لفظوں پٹھا نٹھا کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں جیسا کہ اوپر کی نقلوں سے ظاہر ہے کہ سندھ کے نامور درویش صفت استاد کامل، ممتاز محقق اور جید عالم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی جدید تحقیق کے مطابق وہ فقرہ صحیح ہے جسے مولانا قدوسی نے تاریخی سندھ کے حصہ اول کے صفحہ ۴۰۲ پر درج کیا ہے یعنی "برکت شیخ پٹھا، اک موا اک نٹھا" اک موا سے مراد سلطان محمد تغلق ہے۔ اک نٹھا سے اشارہ سلطان فیروز تغلق کی طرف ہے۔

بہر حال! اس تاریخی واقعہ کی اب تک کوئی تردید نہ ہو سکی کہ اردو کا یہ سب سے پہلا فقرہ سندھ ہی میں بولا گیا اس طرح ان تاریخی حقائق (جن کے حوالے اوپر کی سطروں میں پیش کیے گئے) کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ سندھ ہی اردو کا مولد ہے اور اس کا اولین اور بنیادی ماخذ تحقیق سلیمانی ہے۔ پھر بھی مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کوئی بھی تحقیقی کام حرف آخر نہیں ہوتا اس موضوع پر مزید تحقیقات کی روشنی میں گفتگو آگے بڑھ سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ اردو زبان کی کہانی، مولوی عبد الحق ص ۱۱

۲۔ ارض ملتان از شیخ اکرام الحق ص ۲۱

۳۔ اردو زبان کی کہانی ص ۱۳

۴۔ نقوش سلیمانی مصنف سید سلیمان ندوی ص ۴

۵۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۶۔ داستان تاریخ اردو مولانا حامد حسن قادری ص ۱۲

۷۔ بنگال میں اردو مصنفہ ڈاکٹر وفا راشدی ص ۵۰۴

۸۔ ایضاً

۹۔ مقالہ اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ ماہنامہ نگار لکھنؤ اردو شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۵ء

پروفیسر سید محمد سلیم

ذریعۂ تعلیم اُردو

اہلِ پرتگال مسیحیت کی تبلیغ کے جذبے سے سرشار تھے۔ ایک صدی بھارت میں رہنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ سارے بھارت میں اگر کوئی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے تو وہ ہندوستانی ہے۔ اس زبان کو ہندوستانی کا نام بھی انہوں نے ہی دیا ہے اس لیے جب انہوں نے ملک میں تبلیغی مدارس قائم کیے تو وہاں لاطینی، پرتگالی کے ساتھ ہندوستانی زبان کی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا (واضح رہے اس وقت اُردو زبان ہی ہندوستانی زبان تھی۔ ہندی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم میں گھڑی گئی ہے)، اکبر بادشاہ کے زمانے میں انہوں نے آگرہ میں پہلا مسیحی کالج قائم کیا۔ پھر ۱۶۱۱ء میں گوا میں دوسرا کالج قائم کیا۔ وہاں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا۔ بہت سے اہلِ علم کے لیے یہ بات نئی ہوگی کہ سب سے پہلے گوا کالج کے لیے پرتگالی پادریوں نے اردو ریڈر (نصابی کتب) لکھی ہیں۔ یہ پونے چار صدی قبل کی بات ہے۔

۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان نے بھارت میں پہلی یونیورسٹی قائم کی جس کا نام جامع العلوم والفنون تھا۔ اس میں اردو زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بلکہ سلطنت کی سرکاری زبان اردو تھی۔ فوجی قواعد و پریڈ اردو میں ہوتی تھی (ملاحظہ ہو فتح المجاہدین۔ تصحیح از ڈاکٹر محمود حسن)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ان میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ کلکتہ میڈیکل کالج کی زبان انگریزی تھی مگر ایک حصہ اہلِ اردو کی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ دہلی کالج (سائنس و فنون) (۱۸۲۴ء) میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ میڈیکل کالج آگرہ (۱۸۲۴) کی زبان اردو تھی۔ بریلی کالج (فنون) (۱۸۳۷ء) کی زبان اردو تھی۔ انجینئرنگ کالج رڑکی (۱۸۴۸ء) کی زبان اردو تھی ویٹرنری کالج پونا (۱۸۵۴) کی زبان اردو تھی وہاں نصاب میں شامل گھوڑے کی تشریح اعضاء کی کتاب از ڈاکٹر فریاد راقم کے پاس ہے واضح رہے اس دور میں فوج کے اندر رسالہ، گھوڑے سوار کی اہمیت بہت زیادہ تھی اسی لیے علم بیطاری کی تعلیم بہت اہمیت رکھتی تھی۔

۱۸۲۹ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ بھارت کا گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا۔ یہ شخص بھارت کی مسیحی مشنریوں سے متاثر تھا پہلے یہ مدراس کا گورنر تھا تو مسیحی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث ویلور میں فوجوں میں بغاوت (۱۸۰۶) میں ہوئی تھی۔ گورنر جنرل کی کونسل کا نیا ممبر میکالے ایک سال پہلے ہی آیا تھا اس لیے بھارت کے حالات سے نابلد تھا پھر وہ زکریا میکالے اور اس کا باپ یا بنگٹھن میکالے دونوں اس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جو پادری گرانٹ کا فرقہ تھا۔ گرانٹ نے ۱۷۹۴ء میں ایک کتاب میں اہلِ ہند کے حالات بیان کیے ہیں اور اپنی تجویز پیش کی کہ یہاں مسیحیت کو مقبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ذریعہ تعلیم انگریزی کو مقرر کیا جائے اور انگریزی کو مقبول کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری زبان انگریزی کو مقرر کیا جائے فارسی کو ختم کر دیا جائے۔ انگلستان اور بھارت میں اس کی کوششیں جاری تھی کہ اس کی تجویز منظور کر لی جائے ۱۸۳۰ء میں جو تعلیمی ڈھانچہ میکالے اور ولیم بنٹنگ نے منظور کیا اس میں یہ دونوں تجویزیں قبول کر لی گئیں، اس وقت سے گورنمنٹ کی پالیسی اردو کے مخالف ہو گئی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کے انتقام کے طور پر مذکورہ بالا تمام تعلیمی اداروں میں اردو بطور ذریعہ تعلیم ختم کر دی گئی اور شوشہ یہ چھوڑا کہ اردو زبان میں جدید مغربی علوم پڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے یہ جملہ سوا سو سال سے آج تک مغرب پرستوں کی زبان پر رواں ہے بنٹنگ اور میکالے جب اپنی اسکیم نافذ کر رہے تھے اس وقت سول سروس کے پرانے انگریز آفیسر جن کی تقریباً ساری عمر بھارت میں گزری تھی اس اسکیم کے مخالف تھے۔ الفنسٹن (بمبئی)، منرو (مدراس)، مٹکاف (دہلی) کی رائے یہ تھی کہ اس اسکیم سے ایک مختصر سا طبقہ تو تعلیم یافتہ ہو سکتا

ہے لیکن بھارتیوں کو عمومی اعتبار سے تعلیم یافتہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ انگریزی ایک محدود طبقہ کی زبان تو بن سکتی ہے مگر بھارت کی عمومی زبان نہیں بن سکتی۔ اس لیے وہ لوگ ہندوستانی کو ذریعۂ زبان بنانے کے حق میں تھے۔ ان لوگوں کی رائے کتنی صائب تھی آج ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد بھی ایک محدود طبقہ تعلیم یافتہ ہے۔ ایک محدود طبقہ جدید علم کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے، پوری قوم جدید علم کی نعمتوں سے بے بہرہ ہے اور جاہل ہے۔

اس محرومی کا احساس اس وقت بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے جب ایران اور مصر کے حالات پر ہم نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے یہاں مغربی تعلیم کی عمر ڈیڑھ صدی ہے۔ ایران اور مصر میں اس کی عمر نصف صدی ہے ایران میں اول روز سے فارسی زبان ذریعہ تعلیم رہی اور مصر میں عربی زبان ذریعہ تعلیم رہی۔

ذریعہ تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ شخص کو ذریعہ تعلیم ہی سے اظہارِ بیان پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایران میں اہل علم مغربی علوم پر کتابیں لکھتے ہیں جن کو عام ایرانی بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح علم پورے ملک کی آبادی میں پھیلتا رہتا ہے، مصر میں اہل علم عربی زبان میں کتابیں لکھتے ہیں جن کو عام مصری پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح علم پورے ملک کی آبادی کی دسترس میں آجاتا ہے۔ ہمارے ملک کا طرفہ حال ہے۔ اہل علم انگریزی میں پڑھتے ہیں اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ اردو میں وہ کتابیں نہیں لکھ سکتے۔ اگر ان کو کبھی مجبوراً اردو میں لکھنے کی نوبت آجائے تو دو چار جملے لکھنے کے بعد کہتے ہیں اردو میں اس کے مترادفات نہیں تھے۔ بقول سید سلیمان ندوی "اردو میں الفاظ نہیں ہیں یا تمہارے دماغ میں الفاظ نہیں ہیں"۔ پاکستان میں ڈیڑھ سو سال سے مغربی تعلیم حاصل کرنے والا ملک اپنے عوام کو مغربی علوم سے بہرہ ور نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے مصر و ایران میں وہاں کے اہل علم نے اپنے عوام کی خدمت کی ان کو علم سے بہرہ ور کیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہاں روزِ اول سے ان کی ملکی زبان ذریعۂ تعلیم رہی اور ہماری ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روزِ اول سے انگریزی ملکی زبان اور سرکاری زبان رہی۔ ڈیڑھ صدی سے یہ کتنا بڑا ضیاعِ قوم برداشت کر رہی ہے۔ اگر دفتری زبان اردو مقرر کر دی جائے اگر سول سروس کے امتحانات اردو زبان میں منعقد ہونے لگیں تو پھر خود بخود یہ انگریزی میڈیم اسکول بند ہو جائیں گے جہاں ننھے منے بچوں کو آغاز سے انگریزی الفاظ رٹائے جاتے ہیں۔ نہ اللہ رسول کا نام، نہ کلمہ سب انگریزی الفاظ سکھائے جا رہے ہیں اور پھر یہاں کے تعلیم یافتہ بھی اردو میں اظہار پر قادر ہوں گے جب جدید علوم پر کتابیں کثرت سے اردو میں آئیں گی تو پھر دینی مدرسوں کے طلبہ بھی اگر چاہیں گے کہ مغربی علوم سیکھیں تو ہزاروں کتابیں موجود ہوں گی۔ مصر اور ایران کی آبادی کم ہے مگر شرحِ خواندگی زیادہ ہے، پھر اس طرح ہمارے یہاں بھی شرحِ خواندگی بڑھ جائے گی۔

ہمارے مصنفین اور مؤلفین اگر یہ یاد رکھیں تو انہیں بہت سکون اور اطمینان نصیب ہو کہ اردو میں سائنس اور ریاضی پر عرصے سے کام ہو رہا ہے اور ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سے ہمیں پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے نہایت محنت اور جانسوزی سے طرزِ نگارش کا ایک انداز متعین اور مقرر کیا ہے۔ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا اور ممکن ہو تو اس کو اور بھی بہتر بنانا ہے۔

آفتاب حسن

(سائنس اور ریاضی کی درسی کتابیں۔ ص۵)

اخبارِ اردو کے نام

محترم ڈاکٹر وحید قریشی
صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ۲۹ جنوری ۱۹۸۷ء

جنابِ عالی!

بار خاطر تو ہوگا مگر آپ کو یہ چند سطور لکھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔ آپ کی خدمات اردو کے لیے جو ہیں وہ مسلمہ ہیں اور مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی قابلِ صد ستائش ہے۔ یہ ایک ایسا ہمگیر پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے اردو کی بہتری کے لیے کافی کچھ کیا جا سکتا ہے ایک مسئلہ ہے "الف" کے استعمال کا جو ایک "کرائسس" بن چکا ہے لیکن آپ کی توجہ سے یہ آہستہ آہستہ درست ہو سکتا ہے اور اس میں یقیناً کافی دیر لگے گی۔

انگریزی زبان کے الفاظ بڑی تعداد میں اردو میں مستعمل ہیں لیکن بعض لوگ جب اردو میں لکھتے ہیں تو "الف" کو غائب کر دیتے ہیں۔ جیسے

غلط استعمال	صحیح	انگریزی
سکول	اسکول	School
سٹیشن	اسٹیشن	Station
سٹور	اسٹور	Store
سٹوڈیو	اسٹوڈیو	Studio
سٹینلیس	اسٹینلیس	Stainless
سٹیل	اسٹیل	Steel
سٹاپ	اسٹاپ	Stop
سٹوری	اسٹوری	Story
سکیل	اسکیل	Scale
سٹون	اسٹون	Stone
سپاٹ	اسپاٹ	Spot
سپورٹ	اسپورٹ	Sport
سپورٹ	اسپورٹ	support

اب یہاں انگریزی لفظ sport کو سپورٹ لکھتے ہیں جب کہ SUPPORT کو سپورٹ لکھیں گے ہی۔ یہ املا کی غلطی نہیں کہی جا سکتی بلکہ غلط املا جو شروع شروع میں لکھی گئی وہی اب تک چلی آ رہی ہے جس کی بنیادی وجہ وہ استاد ہیں جنہوں نے انگریزی پڑھی ضرور مگر تلفظ درست نہ کر سکے اور علاقائی ٹون میں اس انگریزی کے لفظ کو اردو میں لکھا اور پڑھایا اور یہ سلسلہ بس چلتا ہی رہا۔ آج حالت یہ ہے کہ اخبارات و رسائل اور قومی ادارے سب جگہ یہی صورت مستعمل ہے وجہ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ پہلے بھی لوگوں نے سوچا ہوگا اور کوشش بھی کی ہوگی کہ یہ ٹھیک ہو سکے مگر یہ بہت بڑا المیہ ہے اور یہ کسی فردِ واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر مقتدرہ قومی زبان اور آپ بذاتِ خود اس امر میں کوشش کریں تو بتدریج خاطر خواہ نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میری کچھ تجاویز ہیں۔ ٹیلیویژن والے بھی اب سٹوڈیو لکھنے لگے ہیں انہیں تو آپ مشورہ دے سکتے ہیں یہ بہت بڑا قومی ذریعہ ابلاغ ہے۔ دوسرے نمبر پر اخبارات جو رائے عامہ کو درست کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لہٰذا ہر اخبار کو لکھا جائے مروجہ املا درست لکھی جائے تیسرا اور بہت ہی اہم شعبہ ایجوکیشن کا ہے لہٰذا تمام سکولوں اور کالجوں کو ایسی ہدایت دی جائے کیونکہ اسکول ہی بنیاد ہے اس غلطی کی درستگی کی اس کے علاوہ کم سے کم آپ اسلام آباد کے اسکولوں اور جی ٹی ایس کی بسوں پر کے بورڈ درست کرا سکتے ہیں۔

چونکہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں ہے تو کم سے کم اسلام آباد سے ہی یہ شروع کر دیں پھر آہستہ آہستہ دوسری جگہوں سے اس درستگی کے اقدام اٹھنے لگیں گے۔

شکریہ

فقط سید صابر علی
مرکز تحقیقات فارسی
ایران و پاکستان، اسلام آباد

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : پنجابی ڈرامہ

مصنف : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ضخامت : ۲۳۲ صفحات

قیمت : ۵۰ روپے

ناشر : ادارہ ثقافت پاکستان اسلام آباد

پاکستانی زبانوں کے ادبی ورثے کو اردو زبان میں پیش کرنا قومی یکجہتی اور ثقافتی تشخص کے عمل کو مضبوط اور مربوط کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب پاکستان کے ممتاز اہل قلم جناب انعام الحق جاوید کی علمی و تحقیقی صلاحیتوں کی قابل قدر کاوش ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے یہ دیکھنا ممکن ہو گا کہ جس ملی و ملکی ثقافت کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا اس کی اقدارِ مشترک ادبیات میں کہاں اور کس قدر ملتی ہیں۔

پنجابی زبان میں بیسویں صدی کے ربع اول سے پہلے کوئی باقاعدہ ڈرامہ نہیں لکھا گیا۔ لیکن بنیادی ڈھانچے کے اعتبار سے اس کی روایت بہت قدیم ہے۔ راس دھاریوں کا ذکر بارھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں بھانڈ اور میراثی بیاہ شادیوں اور دوسری تقاریب پر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مزاحیہ رنگ دے کر ڈرامے کی صورت میں پیش کرتے۔ ان کے علاوہ علاقے کے حاکموں اور بزرگوں کے کارناموں کو عوامی فن کار راس دھاریے اور نقلیے ڈرامائی انداز میں پیش کرکے داد وصول کیا کرتے تھے۔ اسی طرح رام لیلا اور کرشن لیلا کے میلوں میں بھی ڈرامے کے ابتدائی نقوش مل جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ڈرامے کی ابتدا اور فنی و تاریخی اعتبار سے پنجابی ڈرامے کی ابتدا و ارتقا اور روایت کے ساتھ ساتھ جدید عہد میں لکھے جانے والے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج ڈراموں اور مطبوعہ منظوم اور ترجمہ کیے ہوئے ڈراموں کا تحقیقی مواد فراہم کیا ہے۔ جو تخلیقات اس ماحول میں ابھریں ان کا تنقیدی جائزہ لے کر پنجابی ڈرامے کی ادبی تاریخ مرتب کی جو یقیناً ایک مستحسن اور کامیاب کوشش ہے۔

کتاب کا آخری حصہ چار ضمیموں پر مشتمل ہے جس میں گورمکھی اور اردو رسم الخط میں چھپنے والی کتابیں اور ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر دکھائے جانے والے ڈراموں کی فہرست ہے۔ اس حوالے سے غالباً یہ پہلی کوشش ہے جو قومی زبان میں پاکستانی ثقافت اور اس سے وابستہ اظہار کے ذرائع کے بارے میں وقیع معلومات مہیا کرتی ہے یہ کتاب قومی ثقافت کی پہچان کے سلسلے میں ایک اہم اور مفید اضافہ ہے۔ اس لیے فاضل مصنف ہماری مبارک کے مستحق ہیں۔

پاکستان کے ثقافتی و ادبی ورثے کو متعارف کرانے میں ادارہ ثقافت پاکستان نے نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور ادب کے قارئین کے لیے پنجاب کے ڈراموں کے بارے میں مواد مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ثقافتی روابط کا ذریعہ بھی ہوگی۔ کتاب کی طباعت معیاری، گیٹ اپ نہایت

خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔

نام کتاب : اردو اسٹیج ڈراما

مصنف : ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

ضخامت : ۲۴۸ صفحات

قیمت : مجلد ۵۲ روپے

غیر مجلد ۴۲ روپے

ناشر : مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

جنوبی ایشیا میں ڈرامے کی روایت صدیوں کے تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ اپنی صورتیں بدلتی رہی ہے۔ برصغیر کے مختلف خطوں اور مختلف علاقوں میں اس کی مختلف روایتیں اور روپ اظہار کا ذریعہ رہے ہیں۔ بھانڈوں کی نقلیں، بھگت بازی، رام لیلائیں، نوٹنکی، روپ بہروپ، پتلیوں کے تماشے اور رقص و سرود کی تمثیلیں اظہارِ ذات کی فطری خواہش کو بیان کرنے کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ہر دور میں فن کار اپنے تشخص کے اظہار کے لیے مختلف اصناف کے ذریعے کسی نہ کسی تخلیقی عمل سے وابستہ رہے ہیں یہی وہ مختلف روایتیں ہیں جو اردو ڈرامے کو فنی پس منظر مہیا کرتی ہیں

ڈراما اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے متنوع اور پہلو دار صنفِ ادب ہے اردو کے ممتاز محقق اور فاضل استاد جناب ڈاکٹر اے بی اشرف نے زیرِ نظر کتاب میں رادھا کنہیا سے لے کر انارکلی تک اردو اسٹیج ڈرامے کی مکمل تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ فاضل مصنف نے ڈرامے کا فن اور قدیم ڈرامائی روایات اور برصغیر میں ڈرامے کی روایت اور ابتدائی صورتوں سے اب تک ہونے والی ارتقائی تبدیلیوں پر بحث کرتے ہوئے سنسکرت، چینی، مصری اور یونانی ڈراموں کا موازنہ اس انداز سے کیا کہ اس سے اردو ڈرامے کے فنی پس منظر کی تاریخ خود بخود مرتب ہو گئی۔ اردو ڈرامے کی ابتدا اور زمانی لحاظ سے اردو ڈرامے کا نقشِ اول رادھا کنہیا کا کھوج لگا کر قارئین کے لیے دلچسپ اور قابلِ مطالعہ مواد مہیا کیا ہے۔

کسی مخصوص دور میں لکھے گئے ڈراموں کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ کسی خاص مزاج کا ڈراما اپنی ابتدائی صورت میں ابھرتا ہے اور ترقی کرتا ہے ارتقا کی کسی خاص منزل پر پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مزاج اور طرز کے ڈراموں میں تجربے ہوتے ہیں اور وہ تجرباتی دور سے گزر کر ارتقا کی ایک خاص منزل پر پہنچتے ہیں اس طرح مختلف طرز کے ڈراموں کے مختلف ادوار بنتے ہیں۔ فاضل مصنف نے ایک خاص سیاسی و سماجی پس منظر کے تحت مخصوص دور میں لکھے گئے مخصوص مزاج کے ڈراموں کے ادوار کا تعین کیا اور لکھنؤ کے اسٹیج سے دورِ جدید تک کے ادوار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے فاضل مصنف کی یہ تحقیقی کاوش اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے اور طلباء کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس کے لیے مصنف ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب آفسٹ پیپر پر دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ بڑے سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔

> اگر ہندی اردو کے تنازعہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو قومی نظریہ اردو کی بدولت وجود میں آیا اس لیے ہم جا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت میں سب سے اول اردو ہی پاکستان کی بنا کا باعث ہوئی۔
>
> بابائے اردو مولوی عبدالحق

مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی گورنر سرحد فدا محمد خان کو مقتدرہ کی کتب پیش کر رہے ہیں

گورنر سرحد فدا محمد خان مقتدرہ قومی زبان کے ذیلی دفتر پشاور کے زیر اہتمام فروغ اردو کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے سیمینار کی صدارت کر رہے ہیں

ماہنامہ اخبار اردو
مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
MAY 1987
بسم اللہ الرحمن الرحیم
ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول
شریف کنجاہی
مدیر اعزازی
ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی
اس شمارے کے اہم مضامین
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
شخصیت، تصانیف اور خدمات
پیدا کہاں ہیں ایسے ...
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
ایک عظیم مؤرخ
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
بحیثیت مؤرخ
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
ایک سچا اور قدیم پاکستانی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
ڈرامہ نگار
مقتدرہ نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد منائی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد میں ایک نشست
مقتدرہ قومی زبان ۰ اسلام آباد

جلد: ۴ شمارہ: ۵

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ـــــ صفحہ

شخصیت، تصانیف اور خدمات ـــــ

ہلال احمد زبیری ـــــ ۱

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر جمیل جالبی ـــــ ۱۱

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ـــــ

ایک عظیم مؤرخ ـــــ

پروفیسر سعید الدین ڈار ـــــ ۱۵

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ـــــ

بحیثیت مؤرخ ـــــ

ڈاکٹر محمد یوسف عباسی ـــــ ۱۷

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ایک سچا اور قدیم پاکستانی ـــــ

ڈاکٹر انور سدید ـــــ ۳۲

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ـــــ

ڈرامہ نگار ـــــ

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ـــــ ۳۶

مقتدرہ نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد منائی ـــــ

فارقلیط ـــــ ۳۹

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد میں ایک نشست

سید سردار احمد پیرزادہ ـــــ ۴۱

تعارف و تبصرہ ـــــ

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ـــــ ۴۴

قیمت: ۱ روپیہ سالانہ: ۱۰ روپے

معروضات

حکومت کے اعلان کے مطابق ذریعۂ تعلیم اور دفتری زبان کی تبدیلی کا ... ۱۹۸۹ سے ... اس سلسلے میں مقتدرہ نے وفاقی دفاتر میں اُردو مختصر نویسوں، ٹائپ کاروں اور ٹائپ مشینوں کے بارے میں ایک سروے کرایا تاکہ معلوم ہو سکے کہ دفاتر نے نفاذ اردو کے لیے کیا عملی اقدامات کیے ہیں۔ اس سروے کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کی مسلسل ہدایات کے باوجود وفاقی دفاتر نے اس سمت میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔

سروے کے نتائج کے مطابق منصوبہ بندی ڈویژن میں ۳۰۰ انگریزی ٹائپ مشینیں اور ۲ اُردو ٹائپ مشینیں ہیں۔ وزارت خارجہ میں بھی ۱۷۹ انگریزی مشینوں کے مقابلے میں اُردو مشینوں کی تعداد صرف ۲ ہے۔ نظامت اعلیٰ ڈاک خانہ جات میں ۱۱۵ ٹائپ رائٹر انگریزی کے اور ۳ اُردو کے۔ اسی طرح وزارت داخلہ میں ۱۳۲ کے مقابلے میں ۱۔ وزارت خزانہ میں ۳۰ کے مقابلے میں ۱۲، وزارت تعلیم میں ۱۷۰ کے مقابلے میں ۴، ریڈیو پاکستان میں ۲۸۰ کے مقابلے میں ۲، وفاقی محتسب کے دفتر میں ۹۵ کے مقابلے میں ۱۲، مرکزی محاصل میں ۸۴ کے مقابلے میں ۱ اور ادارہ ترقیات اسلام آباد میں ۴۵۰ انگریزی ٹائپ رائٹروں کے مقابلے میں صرف ایک اُردو ٹائپ رائٹر ہے۔ دفتری نظام میں اُردو کو نافذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُردو ٹائپ مشینیں اور اُردو ٹائپ کار مختصر نویسوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے۔ اس کے لیے مقتدرہ کی تجاویز حسب ذیل ہیں:

(الف) حکومت مراسلہ جاری کرے کہ آئندہ بغیر اشد ضرورت کے سوا کوئی انگریزی ٹائپ مشین نہیں خریدی جائے گی۔

(ب) تمام محکموں کو ہدایت کی جائے کہ انگریزی کی ناکارہ مشینوں کی جگہ آئندہ صرف اُردو مشینیں خریدی جائیں اور اس مقصد کے لیے حکومت فنڈ فراہم کرے۔

(ج) آئندہ صرف اُردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی جاننے والے امیدواروں کو ملازمت دی جائے اور اسامیوں کے اشتہارات میں اس کی باقاعدہ صراحت ہو۔

(د) اگر فی الحال ایسا ممکن نہ ہو تو کچھ عرصے کے لیے ان امیدواروں کو انتخاب میں ترجیح دی جائے جو انگریزی کے ساتھ اُردو ٹائپ اور اُردو مختصر نویسی جانتے ہوں۔

(ہ) اُردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کی استعداد پیدا کرنے کے لیے زیر ملازمت افراد کو خصوصی اضافی ترقیاں دی جائیں۔

(و) اُردو ٹائپ اور مختصر نویسی جاننے والے ٹائپ کاروں کو اُردو میں کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ حاصل شدہ تربیت کو برقرار رکھ سکیں۔

(مدیر)

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد مقتدرہ قومی زبان، شمع پلازہ، ۱۲۔ ڈی (۶ بی) بلیو ایریا، الف ۶ / ۱، اسلام آباد ــ طابع: برق سنز پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

ہلال احمد زبیری

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
شخصیت، تصانیف اور خدمات

اس سے قبل کہ میں آج کی اس تقریب کے موضوع بحث پر کچھ عرض کروں میرا اولین فرض یہ ہے کہ میں صدر نشین مقتدرہ قومی زبان کا دلی شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے اپنے سابق صدر نشین اور ملک کے مایہ ناز دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی برسی کے موقع پر اس سیمینار میں شرکت کے لیے مجھے طلب فرمایا اور یہ حکم دیا کہ میں اس ذاتی تعلق کی بنا پر جو مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک حاصل رہا، ان کی شخصیت خدمات اور علمی و ادبی تصانیف کے متعلق کچھ عرض کروں میں اس کرم گستری کے لیے ان کا انتہائی ممنون ہوں اور ۵ جنوری کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگار جلد کی تقریب افتتاح کی مصروفیات کے باوجود جسے عین وقت پر بعض ناگزیر معاملات کی بنا پر ملتوی کرنا پڑا۔ امتثالاً بالا سر حاضر ہوگیا ہوں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کو ہم سے جدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ صرف چھ سال ہوئے کہ وہ ہمارے درمیان موجود تھے اور ابھی ہیں سے اکثر وہ حضرات جو آج یہاں تشریف فرما ہیں ان سے بالمشافہ گفتگو کر چکے ہوں گے یا ان کی تقریریں سن چکے ہوں گے یا کم سے کم ان کی تصانیف ضرور ان کی نظر سے گزری ہوں گی۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ میں ان کا تعارف ماضی بعید کی کسی عظیم ہستی کی طرح تاریخی معلومات یا تخیلی بوقلمونی کا سہارا لے کر کراؤں۔ ان کی شخصیت ابھی تک جانی پہچانی ہے اور اس کے خدوخال ہنوز ان کے دیکھنے والوں کی یادوں میں تازہ ہیں وہ ایک سادگی پسند، منکسر المزاج، حلیم الطبع انسان تھے، اپنے تبحر علمی پر کسی تفاخر یا تعلی سے قطعاً عاری تھے۔ اپنی زندگی میں ہزار ہا طلبہ کو تاریخ کا درس دینے اور فارغ التحصیل بنانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو آخر دم تک، بغیر تصنع کے بڑے خلوص کے ساتھ ایک طالب علم ہی کہتے رہے۔

علم کی اس ناپیدا کنار حقیقت کے احساس ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کبھی ان کی تصنیف میں ان کی تحقیق کے کسی سقم یا کوتاہی کی طرف کوئی اشارہ کرتا تھا تو وہ فوراً اس پر توجہ کرنے لگتے تھے اور ہر معقول ترمیم کو بڑی وسعت قلب کے ساتھ قبول کر لیتے، ایڈیشن بر اصلاح نوٹ کر لیتے تھے۔ ان کا اپنا مضمون تاریخ تھا مگر انہوں نے اس مخصوص مضمون کے ساتھ دیگر علوم انسانی، مثلاً فلسفہ، عمرانیات، نفسیات، بشریات، دینیات، سیاسیات، معاشیات، لسانیات، جغرافیہ، تمثیلات کو اس طرح ضم کر دیا تھا کہ جب لکھتے تھے تو ان جملہ علوم کے متعلق اپنی اساسی معلومات ساتھ لے کر چلتے تھے اور جہاں تاریخ کے عریاں واقعات سے حقائق کے استنباط و استخراج کا موقع ہوتا تھا وہاں ان معلومات سے بھرپور کام لیتے تھے۔ آپ ان کی تصانیف کو ملاحظہ فرمائیے وہ تاریخ پر لکھ رہے ہوں یا تعلیمات پر لکھ رہے ہوں یا سیاسیات و ادبیات کا کوئی موضوع زیر بحث ہو آپ کو جا بجا علوم انسانی کی بصیرت افروز جھلکیاں کارفرما ملیں گی علم کے معاملے میں ان کی یہ کلیت پسندی صرف علوم انسانی تک ہی محدود نہیں تھی وہ سائنس علوم مثلاً طبیعات، کیمیا، حیاتیات، نباتیات، جینیات، ارضیات، شماریات کے بنیادی اصولوں پر بھی اچھا خاصا عبور رکھتے تھے۔ اس کا اظہار اس وقت ہوتا تھا جب وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہر سال ہر شعبہ میں ایک مرتبہ جاکر اساتذہ و طلبہ کو مخاطب کرتے تھے۔ ان کے اس معمول میں سائنس کے مختلف شعبے بھی شامل ہوتے تھے۔ جب وہ سائنس کے ہر شعبے میں اسی شعبے کی زبان و اصطلاحات کے ساتھ کسی نئی دریافت یا

سائنسی پیش رفت کی گفتگو چھیڑ دیتے تھے تو اساتذہ اور طلبا کو تاریخ کے ایک پروفیسر کی زبان سے اپنے سائنسی علم کے رموز و حقائق پر معنی خیز بحث سن کر ایک خوشگوار حیرت ہوتی تھی جس کا اظہار ان کے چہروں سے ہوتا تھا۔ ان کی اس ہمہ گیر خصوصیت کے باعث ہر شعبہ کے پروفیسر خواہ وہ فنون سے تعلق رکھتے ہوں یا سائنس سے ان کے قریب ہو جاتے تھے اور جب وہ اپنی ضروریات لے کر ان کے پاس جاتے تھے تو افہام و تفہیم میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی اور اکثر یہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے ابتدائی اختلاف کے باوجود یقین و وثوق کے ساتھ مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے۔ اس طرح ذمہ داری کے عہدوں پر ان کی شخصیت ایک مستند اسکالر اور ایک مدبر منتظم کی حیثیت سے ہمیشہ قابل احترام سمجھی گئی۔

بہت سے علما و زعما کی عوامی اور نجی زندگیوں میں تفاوت رہ از کجا تا بکجا ہوتا ہے مگر ان کی زندگی میں یہ تفاوت بالکل نہیں تھا وہ اسلامی نظریہ حیات پر یقین کامل رکھتے تھے اور اسی کے اتباع پر زور دیتے تھے، ایک پروفیسر، ایک وزیر مملکت، ایک وائس چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے شاگردوں، اپنے ماتحتوں، اپنے رفقائے کار پروفیسروں یا عوام الناس کو جن بنیادی اصولوں کی تلقین کی ان ہی پر خود بھی عمل پیرا رہے ہیں ان کی شخصیت کو قدامت و تجدد کا ایک ایسا امتزاج سمجھتا ہوں جو اپنی دونوں خصوصیات میں بحد ممکنہ قائم و ثابت تھا وہ توحید رسالت پر وجدانی اور منطقی دونوں اعتبارات سے پکا یقین رکھتے تھے اور آخرت کے متعلق ان کا تصور اس طرح تھا جیسے کسی ممالک کے چشم دید حالات کا ایک خاکہ موجود حقیقت کی حیثیت سے ذہن میں محفوظ ہو۔ خدا کا خوف ان کے دل میں جاگزیں تھا۔ ذرا سی بات پر لرز جاتے تھے اور ان کی اندرونی کیفیت کا اظہار ان کے چہرہ پر نمایاں ہو جاتا تھا۔ آخر زمانہ تک وہ نہایت رقیق القلب ہو گئے تھے کسی کی مظلومیت کا ذکر سن کر بے اختیار رونے لگتے تھے، صوم و صلوٰۃ کی پابندی انہوں نے آخری دم تک کی۔ اس طرح ان کی پوری زندگی ایک عملی مسلمان کی زندگی رہی اور یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا کہ ان کی اعلیٰ تعلیم ایک مشنری کالج میں ہوئی جہاں ان کا واسطہ انگریز پروفیسروں سے رہا جو اپنے مذہب کی مضمر تبلیغ ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ وہ پہلے ایک شاگرد کی حیثیت سے اور پھر رفیق کار کی حیثیت سے ان کے ساتھ گھل مل کر رہے۔ اس سے کچھ پہلے، تحریک خلافت کے دور میں کھدر کی شیروانی پہنتے تھے پھر تحریک ختم ہونے کے بعد جب سینٹ اسٹیفنس کالج میں داخل ہوئے تو انگریز پروفیسروں کی صحبت میں مغربی لباس اپنایا اور مدت العمر بجز زندگی کے چند آخری ایام کے وہی لباس پہنتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال انگلستان میں رہے۔ یورپ میں فرانس، جرمنی، اٹلی اور اسپین کا سفر کیا وہاں مغربی تہذیب و ثقافت کے طوفان میں سے گزرے۔ مغرب کے قدیم و جدید فلسفہ ادب کی مستند کتابوں اور اشتعالی جدلیات کے لادینی مباحث کا گہرا مطالعہ کیا اور اس طرح قعر دریا میں تختہ بند ہونے کے باوجود دامن کو تر کیے بغیر باہر نکل آئے۔ ان آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ان کی شخصیت میں قدامت پسندی و تجدد کا امتزاج پختہ ہو گیا اور وہ ایک طرف مومن باعمل اور دوسری طرف اپنی قوم کی مادی و سائنسی ترقی کے پرجوش علم بردار بن گئے ان کے زمانے میں کراچی یونیورسٹی برعظیم ایشیا کی ایک نہایت ممتاز یونیورسٹی گنی جاتی تھی اور اس کا استنادی وقار ممالک غیر میں بھی قائم ہو گیا تھا ان کی شخصیت کے یہ دو نمایاں پہلو اسلامی احکام کے اتباع اور ملتِ اسلامیہ کی مادی و سائنسی ترقی کے لیے جدوجہد ہی ان کے امتیازات خصوصی تھے۔

ان کی تاریخ نگاری کا اصل موضوع برعظیم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر متعدد تصانیف آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑی ہیں جو برعظیم کی مسلم تاریخ کے مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں اس سلسلے کی سب سے پہلی تصنیف ہندوستان کی سب سے پہلی مسلم حکومت کے متعلق ہے جسے سلطنت دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلطنت کے نظم و نسق کے متعلق یہ ایک مستند و جامع تصنیف ہے اور اس کی پہلی اشاعت کو پینتالیس سال گزر جانے کے باوجود اسے اب تک اس موضوع پر حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصنیف اصل" ان کا وہ مقالہ ہے جسے یونیورسٹی آف کیمبرج نے ان کی ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند کے لیے منظور کیا تھا انگریزی میں اس کا عنوان The Administration

of the Sultanate of Dehli تھا جس کے متعدد ایڈیشن پے در پے شائع ہوتے رہے ہیں اس کا ایک اردو ایڈیشن "سلطنت دہلی کا نظم حکومت" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا اور وہ دستیاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں اردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی کی مستند کتابوں اور مخطوطات سے بڑی تحقیق و تدوین کے بعد ایسا مواد جمع کیا ہے جس سے اس زمانے کے طرز حکومت" آئین سلطنت اور مختلف شعبہ ہائے حکومت کے نظم و نسق کی مکمل تفصیلات واضح ہو جاتی ہیں اور سلطنت دہلی کا ایک ایسا جاندار تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ گویا ہم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ معمولی سے معمولی تفصیل کے لیے انہیں بے شمار کتابیں پڑھنی پڑی ہیں اور بڑی چھان بین کے بعد ذرا ذرا سی بات کو جدید سیاسی سائنٹیفک زبان میں بغیر کسی حشو و زوائد کے پیش کیا ہے اور ہر تفصیل کے لیے جابجا مستند تاریخی کتابوں اور معاصر مورخوں کے حوالے دیے ہیں۔

انہوں نے اپنی اس کتاب میں مختلف واقعات و شواہد کے حوالوں سے یہ ظاہر کر دیا کہ "سلطنت دہلی" باعتبار مذہب حقیقتاً اس مسلم دنیا کا ایک مربوط حصہ تھی جو وسط ایشیا، جنوبی ایشیا، ایران، عرب اور شمالی افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں آئینی اور انتظامی اعتبارات سے شریعت اسلامیہ کو اصولاً بالادستی حاصل تھی جو مختلف خاندان "سلطنت دہلی" میں برسر اقتدار رہے ان سب کی اس روش میں کم و بیش یکسانیت اور حکومت کے مختلف شعبوں مثلاً مالیات، فوج، انصاف، محتسب اور پولیس، امور دینی، تعلیمات اور تعمیرات عامہ میں ایک خاص قسم کا نظم و ضبط جو موجودہ معیاروں کے مطابق بھی قابل قدر ہے پایا جاتا تھا اس طرح ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اس عہد کی تاریخ کو مکمل وضاحت کے ساتھ بڑے مستند انداز میں پیش کرتی ہے۔

اس سلسلے کی ان کی دوسری تصنیف جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی The Administration of the Mughal Empire ہے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع نہیں ہوا ہے یہ کتاب ان کی پہلی کتاب کا جوڑا ہے جس طرح سلطنت دہلی کا نظم و نسق پہلی کتاب میں بیان کیا گیا ہے اسی طرح سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی کتاب اس زمانے میں لکھی اور شائع کی گئی تھی جب اس موضوع پر کوئی تحقیقی تصنیف موجود نہیں تھی اور مصنف کو شروع سے لے کر آخر تک ہر چھوٹی بڑی معلومات کے لیے ابتدائی تحقیق کرنی پڑی تھی جس کا خیر مقدم علمی حلقوں میں بڑے جوش کے ساتھ کیا گیا تھا جب دوسری کتاب شائع ہوئی تو اس موضوع پر متعدد اور تصانیف بھی موجود تھیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے پیش لفظ میں ظاہر کیا ہے البتہ دوسری تصانیف کی موجودگی کے باوجود اس کتاب کی یہ خصوصیت اس کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں جملہ پرانی اور نئی معلومات کو ایک جگہ جمع کر کے ایک خاص ماہرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا گیا کہ آئندہ تحقیق کرنے والے طلبہ اور عام قارئین دونوں کے لیے اس کا مطالعہ نفع بخش اور دلچسپ ہو سکتا ہے پھر "سلطنت مغلیہ" پر انہوں نے سالہا سال تک اپنے طلبا کو جو لیکچر دیے تھے ان کا نچوڑ اس کتاب میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تاریخی حقائق و واقعات کے ساتھ ان کی اپنی سوجھ بوجھ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں سلطنت مغلیہ کے نظام حکومت سے متعلق بعض ایسے مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو عرصہ دراز سے متنازعہ فیہ چلے آ رہے تھے۔

اس کے نظام منصب داری، مالیات، زرعی نظم و نسق اور مغل بادشاہوں کی سیاست کے رہنما اصولوں اور ان کی حکمت عملی پر بصیرت افروز ابواب اس کتاب میں شامل ہیں اس دور کی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ان کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

ان کی ایک اور تصنیف اسی دور کے ایک ایسے نمایاں مغل فرماں روا کے متعلق ہے جسے وہ سلطنت مغلیہ کا "بانی" قرار دیتے ہیں۔ اکبر پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر ہر مصنف کی تحقیق کا معیار اور زاویہ نگاہ یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔ انہوں نے اکبر کی زندگی کے جو حالات پیش کیے ہیں اور ان پر جو تبصرے کیے ہیں وہ ایک نیا زاویہ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۷۸ء میں سپرد قلم کی تھی جب وہ کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہو چکے تھے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہر قسم کی سرگرمیوں

سے الگ ہو کر تنہائی اور بیماری کی حالت میں پوری توجہ کے ساتھ اس کتاب پر اپنا سارا وقت صرف کر رہے تھے ان کی شدید مذہبیت کے باعث یہ گمان ہو سکتا تھا کہ جب وہ اکبر پر کتاب لکھیں گے تو اس کی دینی بے راہ روی کے باعث اس کے کردار کی مکمل مذمت کریں گے مگر یہ قیاس ان کی تاریخ نگاری کے بنیادی اصولوں کے قطعاً منافی ہوتا۔ انہوں نے اکبر کی پوری زندگی کو جس طرح پیش کیا ہے اس میں اپنے معروضی انداز فکر کو برابر قائم رکھا ہے انہوں نے خود اس کتاب کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ غیر معمولی دلیرانہ عظمت کا حامل انسان تھا مگر اسی قسم کے دوسرے غیر معمولی بہادروں کی طرح" اس کی ٹانگیں لوہے کی اور پاؤں جزوا" لوہے کے اور جزوا "مٹی کے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعض مخصوص اعمال اور حکمت عملیاں اس کی مسلمہ عظمت کے راستہ سے ہٹ گئیں۔ ایک معروضی مطالعہ اور تجزیہ کا حقیقی مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ اس کی عظمت اور کمزوریوں کے اوصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی صحیح کردار نگاری کی جاتی" چنانچہ انہوں نے ایک طرف اس کی شجاعت و بہادری کے کارناموں اور مصلحت آمیز حکمت عملیوں کو صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اور دوسری طرف اس کی کمزوریوں پر مبنی بے راہ روی اور ناعاقبت اندیشانہ روش پر بھی روشنی ڈالی ہے اس طرح اکبر کے پیچیدہ کردار کو جس نے زبردست سیاسی کامیابیوں اور عسکری فتوحات کے ساتھ ساتھ اپنے بعض اعمال سے نہ صرف برعظیم کی ایک سلطنت کے زوال بلکہ پوری دنیائے اسلام کی غلامی کی بنیادیں رکھیں، بڑی صحت و مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا بھی اردو ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔

سلطنت دہلی اور سلطنت مغلیہ کے متعلق ان کتابوں کے بعد ان کی بعض ان تصانیف کا تذکرہ ضروری ہے جن میں برعظیم کے مسلمانوں کی مجموعی تاریخ کو انہوں نے ایک خاص نکتۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جو سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع کی گئی
The Muslim Community of the Indo Pakistan Subcontinent
تھی جس کا اردو ترجمہ " برعظیم پاکستان و ہند کی ملت اسلامیہ" کے عنوان سے کراچی یونیورسٹی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اس کتاب کے دو دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور بہت مقبول ہوئے ہیں۔ یہ کتاب برعظیم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ایک مکمل مربوط تاریخ ہے جب عرب سے آئے ہوئے پہلے مسلمان نے بھارت کے ساحل پر قدم رکھا اس وقت سے لے کر تشکیل پاکستان تک تیرہ سو سال کے عرصے میں مسلمانوں کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے مختلف ادوار کو اس کتاب میں ایک مسلسل داستان کے طور پر بڑے جوش وولولے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ہر چھوٹے بڑے واقعہ اور کیفیت کے متعلق مستند حوالے دے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں اپنی انفرادی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھا اور مقامی آبادی میں سے جو نئے مسلمان ملت اسلامیہ میں شامل ہوئے وہ بھی کبھی ہندوؤں یا کسی اور مقامی مذہبی گروہ میں ضم ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ یہ برعظیم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی وہ امتیازی حیثیت تھی جو انہیں باہر سے آنے والے دوسرے گروہوں سے جو رفتہ رفتہ ہندومت میں ضم ہو گئے، ممتاز کرتی تھی اور یہی حیثیت ان کے اس مقدر کی تشکیل کا باعث ہوئی جو پاکستان کی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور جسے آخر کار انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ یہ حقیقت ایک نظریہ کی حیثیت سے تو تحریک پاکستان کے دوران بہت سے ذہنوں میں نمایاں ہو گئی تھی مگر اس حقیقت کو تاریخی شہادتوں کے ساتھ مستند، مربوط، دلچسپ انداز میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جیسا ایک ماہر مورخ ہی پیش کر سکتا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اب تک بہت سے مضامین اور کتابوں میں اس حقیقت کو ایک مسلم الثبوت دعوے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور وہ زبانیں جو تحریک پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کی اصولاً مخالفت کرتی تھیں خاموش ہو گئی ہیں۔

اسی سلسلے کی ان کی دوسری کتاب Struggle for Pakistan ہے جس کا ترجمہ "جدوجہد پاکستان" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اصل اور ترجمہ دونوں کراچی یونیورسٹی نے شائع کیے ہیں

اصل کتاب ۱۹۶۵ء کے بعد سے اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو کر ختم ہو چکے ہیں اردو ترجمہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا ہے اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں تحریک پاکستان کے پس منظر کے طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے واقعات، سر سید احمد خان کی جد و جہد کا دور، کانگریس کی ابتدائی سرگرمیوں، شملہ وفد کے مطالبات، مسلم لیگ کے قیام، میثاق لکھنو اور آئینی اصلاحات کے مختلف مراحل وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ہندو مسلمانوں کے درمیان شدید سیاسی اختلافات اور سمجھوتہ کی تمام کوششوں کی ناکامی کے نتیجے میں مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی قرارداد پیش کیے جانے کا تذکرہ ہے۔ یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور اصل دستاویزات، یادداشتوں، مختلف کتابوں اور اخباری بیانات کے حوالوں سے ہر واقعہ کے متعلق اعداد و شمار اور صحیح کوائف پر روشنی ڈالی گئی ہے چوں کہ ڈاکٹر صاحب تحریک پاکستان میں خود بھی شامل رہے تھے اس لیے انھوں نے ہندو مسلمانوں اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان گفت و شنید کے واقعات کو بڑی صحت کے ساتھ اپنے بلاواسطہ علم کی بنیاد پر قلم بند کیا گیا ہے۔ پاکستان کے لیے مسلمانوں نے قائد اعظم کی رہنمائی میں جو جد و جہد کی اس کے مضمرات و شواہد کا پورا علم اس کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کتاب کے متن میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان کے علاوہ آخر میں جو ضمیمے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں وہ ان اہم دستاویزات کی صحیح نقول ہیں جو اخبارات کی خبروں میں نہیں مل سکتی تھیں اور اب یک جا کر دی گئی ہیں اور مزید تحقیق کرنے والے طلبا کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب اور برعظیم کی ملت اسلامیہ دونوں پر حکومت کی جانب سے انعام بھی دیا جا چکا ہے۔

اوپر کی دو کتابوں کے ساتھ ایک ہی سلسلے میں منسلک ان کی تیسری کتاب Ulema in Politics ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب ۱۵۵۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برعظیم جنوبی ایشیا میں علما کی سیاسی سرگرمیوں کا ایک مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے مگر ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ کتاب مسلم معاشرے میں علما کی حیثیت ان کے اثر و نفوذ ان کی افادیت کے حقیقت پسندانہ جائزے سے شروع کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی جدید علمی ناواقفیت کے خطرناک نتائج پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تمہید کے بعد ملکی سیاست میں علما کے کردار کا سلسلہ ان واقعات سے شروع ہوتا ہے جن کا تعلق سلطنت مغلیہ کے بادشاہ اکبر کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کی مذہبی حکمت عملیوں سے پیدا ہونے والی بغاوتوں سے متاثر راسخ العقیدہ مسلمانوں پر تشدد اور اکبر کے خلاف علما کے احتجاج کی تفصیلات نام بنام دی گئی ہیں جن میں اس عہد کے جید علما کے افکار شامل ہیں اور یہ سلسلہ شیخ احمد سرہندی تک پہنچتا ہے جنہوں نے اکبر کے بعد جہانگیر کے زمانے میں حالات کی درستگی کے لیے بہت کام کیا پھر اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت کا مکمل زوال شروع ہو گیا تو شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے علما کی علمی خدمات اور عملی جہاد کے اقدامات کا ذکر آیا ہے اور اسی سلسلے میں آگے چل کر سید احمد شہید کے منظم جہاد کا تذکرہ ہے اور اس پر مکمل بحث ہے۔ ۵۷ء کی عظیم بغاوت میں علما کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے پھر سر سید کی تعلیمی اصلاحات کا زمانہ اور اس میں علما کا رد یہ اور مسجد کانپور کے واقعہ میں علما کا کردار اور تحریک خلافت میں علما کے ایک جماعتی حیثیت سے شریک ہونے اور ملک گیر مہم میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر سرگرم عمل ہونے کا حال بھی بیان کیا گیا ہے اور آخر میں مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں علما کی شرکت بیان کی گئی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب کو اس اپیل پر ختم کیا ہے کہ علما کو ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اگر انہیں سیاست میں حصہ لینا ہے تو اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک سیاستداں کو قوم کی رہنمائی کے لیے موجودہ دور کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اسے قومی و بین الاقوامی مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھنا پڑتا ہے جس کے لیے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی علوم سے استفادہ ضروری ہوتا ہے اس لیے سیاست میں حصہ لینے کے لیے

جس طرح قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کے علوم پر کامل دسترس ضروری ہے اسی طرح ان علوم پر عبور بھی لازم ہے جو ایک سیاست دان کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں تاکہ وہ ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر صحیح رائے قائم کرکے مناسب اقدام کر سکے۔

اب تک جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہوں نے ایک ماہر تاریخ کی حیثیت سے لکھی تھیں۔ ان کی یہ حیثیت تمام دنیا کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف ہے، مگر اب میں ان کی جس کتاب کا تعارف کرانا چاہتا ہوں وہ انہوں نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے لکھی تھی۔ ایک بلند پایہ مؤرخ ہونے کے ساتھ وہ اس ملک کے سب سے بڑے ماہر تعلیم بھی تھے کیونکہ ان کی ساری عمر تعلیم و تدریس میں گزری تھی اور وہ مسلسل تعلیمی مسائل پر غور و فکر کیا کرتے رہتے تھے اور اپنے اخذ کردہ اصولوں کو اپنے عملی تجربات کی کسوٹی پر کس کر دیکھتے رہتے تھے۔ قائد اعظم نے انہیں تشکیل پاکستان سے عین قبل ایک ایسی کمیٹی کا رکن مقرر کیا تھا جس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ "پاکستان میں تعلیم" کا ایک خاکہ تیار کرے۔ پاکستان بننے کے بعد حکومت نے جو پہلی تعلیمی کانفرنس طلب کی وہ اس کے بھی رکن تھے ۱۹۵۳ء میں انہیں کابینہ کا وزیر تعلیم مقرر کیا گیا تھا جب وہ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر تھے تو انہیں حکومت پاکستان نے تعلیم کے متعلق قائم کردہ شریف کمیشن کے مشیر کی حیثیت سے بطور خاص مدعو کیا۔ انہوں نے گیارہ سال تک کراچی یونیورسٹی کی حکمت عملیوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ نباہا۔ اس زمانے میں بین الجامعاتی بورڈ کے جو اجلاس منعقد ہوتے تھے ان میں اسی حتمی آرا کے اظہار کے لیے ہمیشہ مرکز توجہ رہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۰ء میں جامعاتی تعاون اور ایشیائی ترقی کے موضوعات پر مختلف جامعات کے سربراہوں کی جو ایشیا فاؤنڈیشن کانفرنس بمقام ہانگ کانگ منعقد ہوئی وہ اس کانفرنس میں کراچی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شریک تھے۔ یونیسکو کی طرف سے ایشیا کے وزرائے تعلیم کی جو کانفرنس ۱۹۷۱ء میں بمقام سنگاپور منعقد ہوئی اس کے لیے انہوں نے پاکستانی وفد کی قیادت کی تھی اس طرح تعلیم کے جملہ مسائل پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہونے کے بعد تعلیم کے مسئلہ پر جو کتاب Education in Pakistan کے عنوان سے لکھی وہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اسے ان کی اہم ترین کتاب قرار دیا جا سکتا ہے یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس کتاب کی قدر و منزلت ممالک غیر میں تو بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی مگر خود ہمارے ملک میں اس پر بہت کم توجہ منعطف کی گئی ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں تعلیم کے مقاصد اور ان کو حاصل کرنے کے ذرائع پر پوری سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ تحقیق کی گئی ہے اس تحقیق میں ڈاکٹر قریشی نے نہ صرف پاکستان اور دوسرے ممالک میں حاصل کردہ اپنے تعلیمی تجربہ سے کام لیا ہے بلکہ دوسرے علوم سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً فلسفہ، عمرانیات اور نفسیات جن پر ان کو کافی دسترس حاصل تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے مقاصد پر بھی ان کی نظر رہی ہے اور اس کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو جو کچھ کرنا ہے وہ بھی بڑی وضاحت کے ساتھ شروع سے آخر تک ان کی نگاہ میں رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نظریۂ پاکستان پر عقیدہ رکھنے والے سکالروں کی ایک جماعت اس کتاب میں پیش کردہ اصولوں کا ایک جائزہ تیار کرے اور انہیں ہماری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے نظاموں پر منطبق کرنے کے لیے حکومت کو پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی کے پیشِ نظر کاموں میں یہ منصوبہ بھی شامل ہے۔

ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والی ایک بڑی کتاب A Short History of Pakistan ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن کراچی یونیورسٹی نے چار جلدوں میں ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا اس کی پہلی جلد کے مصنف پروفیسر اے ایچ درانی ہیں اور اس کا موضوع مسلمانوں کے عہد سے قبل کی تاریخ ہے دوسری جلد کے مصنف پروفیسر ایم کبیر صاحب ہیں اور مسلم سلاطین دہلی کا عہد اس کا موضوع ہے۔ چوتھی جلد کے چار مصنفین پروفیسر ایم۔ اے رحیم، پروفیسر ایم ڈی چغتائی

پروفیسر ڈبلیو زمان اور اے حمید ہیں اور اس کا موضوع اجنبی حکومت
اور مسلم قومیت کے ظہور کی تاریخ ہے۔ ان چاروں جلدوں کو
ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ ایڈٹ کیا تھا
اور جگہ جگہ بعض تعبیرات کو بدلا اور بعض معلومات کا اضافہ اپنے
قلم سے کیا تھا ان چاروں جلدوں کا پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا کہ ختم ہو
چکا تھا اب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب شیخ الجامعہ کراچی نے ان کا
ایک مجموعی ایڈیشن شائع کرایا ہے اور اس پر ایک مختصر پیش لفظ
بھی لکھا ہے۔ پاکستان کی یہ مختصر تاریخ کی کتاب نہ صرف طلبا
بلکہ عام قارئین کے لیے بھی نہایت مفید ہے اس کا اردو ترجمہ
پہلے ایڈیشن کے بعد ہی ہو چکا تھا مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا
ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دو اور چھوٹی کتابیں قابل ذکر ہیں جن میں سے
ایک Perspectives of Islam and Pakistan
ہے جو ۱۹۷۹ء میں شائع کی گئی تھی اور جس میں اسلام کی
نشاۃ ثانیہ اور پاکستان کی تشکیل سے متعلق ان کے مختلف مضامین بزبان
انگریزی سلسلہ وار جمع کیے گئے ہیں اور ان کا ایک مختصر دیباچہ
ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے جو انہیں باہم مربوط کرتا ہے۔ برعظیم
جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اسلامی روح کو بیدار کرکے
جس طرح پاکستان حاصل کیا گیا اسی طرح دنیائے اسلام کے
دوسرے ممالک میں فتوحات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ اس
کتاب کا بنیادی موضوع ہے اور اس کے تمام مضامین معلوماتی
اور فکر انگیز ہیں۔ دوسری چھوٹی کتاب "افکار داذکار" ہے جس
میں ڈاکٹر صاحب کے منتخب مقالات، خطبات، مشاہدات اور
نشری تقاریر بزبان اردو جمع کی گئی ہیں۔ ابتدا میں خود ڈاکٹر
صاحب کا قلمبند کیا ہوا پیش لفظ، میجر آفتاب حسن صاحب کا
لکھا ہوا تعارف اور میرا بحیثیت مؤلف دیباچہ ہے جس
میں ڈاکٹر صاحب کی مختصر سوانح عمری دی گئی ہے۔ یہ کتاب
مقتدرہ قومی زبان نے ۱۹۸۱ء میں شائع کی تھی۔ براہ راست اردو
زبان میں ان کی تحریروں اور تقریروں کا یہ واحد مجموعہ ہے جسے
پڑھ کر ان کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کے بیان اور لہجہ کا
اندازہ ہوتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بعض بڑے بڑے مجموعوں میں ان کے
لکھے ہوئے نہایت اہم ابواب شامل ہیں مثلاً

A Nation Born of Sacrifices
The History and Culture
Tradition اور of Indian Peoples
Values and Socio Economic Deve-
lopment میں ان کے ابواب موجود ہیں ان کے علاوہ
Foreign Policy in a World of Change
Cambridge اور Sources of Indian Tradition
History of Islam میں بھی ان کے نہایت فاضلانہ مقالات
درج ہیں۔

پوری انگریزی داں دنیا کے مشہور و معروف علمی جرائد میں ان کے
تاریخی و معاشرتی مضامین بکثرت شائع ہوتے رہے ہیں مجھے
افسوس ہے کہ اپنی عدیم الفرصتی کے باعث میں اس
مضمون کے ساتھ ان مقالات کی ایک خاصی طویل فہرست شامل نہیں
کرسکتا جو میرے پاس اس توقع کے ساتھ محفوظ ہیں کہ ان کے
اردو ترجموں کو کسی ایک یا چند مجموعوں میں شائع کیا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے متعلق یہ ایک مختصر ترین جائزہ
تھا جو پیش کر دیا گیا ہے اب ان کی ملی و دینی خدمات کے بارے
میں کچھ عرض کرنا ہے وہ ۱۹۰۲ء میں یوپی (بھارت) کے ایک
چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے تھے ان کی ابتدائی و ثانوی
تعلیم کے بعد ہی ۱۹۲۰ء میں ان کی ملی خدمات کا سلسلہ شروع
ہو گیا جب انہوں نے تحریک خلافت میں حصہ لینے کے لیے
ایک قصبہ کی مڈل سکول کی ملازمت سے استعفادے دیا
اور بی اے کے امتحان کی جو تیاری کر رہے تھے اس کو بھی التوا میں
ڈال کر گاؤں گاؤں خلافت کمیٹیاں قائم کرتے رہے یہ ان کی پہلی
ملی خدمت تھی جو انہوں نے پانچ سو علما کے فتوے اور
علی برادران و مولانا ابوالکلام آزاد کی اپیلوں پر اپنے
مستقبل کی توقعات کو قربان کرکے انجام دی۔ دو سال تک
انتہائی نامساعد حالات میں کام کرنے کے بعد تحریک خلافت کے

ختم ہو جانے پر وہ دہلی آ گئے تو انہیں بڑی مشکل کے بعد تلافی مافات کا کچھ موقع ملا انہوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج سے بی اے آنرز اور ڈبل ایم اے کے امتحانات پاس کیے اسی کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے اور کافی عرصے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند لے کر آئے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دہلی یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے ان کی ملازمت بھی ایک قومی خدمت ہی تھی۔ ان کی ذات سے مسلم طلبا کو بہت مدد حاصل ہوتی تھی اور انہوں نے اس زمانے میں وہ معیاری تربیت اور تجربہ حاصل کیا جس نے انہیں ایک بلند پایہ مؤرخ اور دانشمند بنا دیا۔ جس زمانے میں وہ انگلستان میں تھے انہوں نے چوہدری رحمت علی کی پاکستانی قومی تحریک میں شرکت کی اور جب واپس دہلی آئے تو دہلی یونیورسٹی میں ہندو غلبہ کے باوجود مسلم طلبا میں اس تحریک کی تبلیغ کرتے رہے۔ تشکیل پاکستان سے قبل ہی مسلم لیگ کے قائدین ان کی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیت کے معترف ہو گئے تھے۔ انہیں بھارت کی مجلس دستور ساز کا اور اس کے بعد پاکستان کی مجلس دستور ساز کا رکن منتخب کرایا گیا۔ تحریک خلافت میں انہیں جو گراں قدر تجربہ حاصل ہوا تھا اور اس کے بعد مسلم لیگ کے زعما سے روابط کے بعد انہیں جو حوصلہ ملا اس نے انہیں پاکستان کی مجلس دستور ساز میں بڑی اہم خدمات انجام دینے کے قابل بنا دیا وہ بنیادی طور پر ایک استاد تھے اور درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہنا چاہتے تھے مگر پاکستان میں صحیح خطوط پر کام کرنے والے سیاستدانوں کے قحط الرجال کے باعث انہیں زبردستی کابینہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک حکومت پاکستان میں شامل رہے اور اس دوران میں انہیں مختلف شعبوں کی وزارتوں پر فائز کیا گیا جن میں وزارت تعلیم و وزارت معلومات و ابلاغ عامہ بھی شامل تھیں۔ انہوں نے اس زمانے میں حکومت پاکستان کی خدمت بڑی بے لوثی اور اخلاص مندی کے ساتھ انجام دی وہ گروہ بندیوں سے بالاتر رہے اور انہوں نے اپنی سطح ذاتی مفادات سے بہت اونچی رکھی جس کا اعتراف ان کے ہم عصر دوست اور دشمن سب کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان کی کابینہ میں پانچ سال تک رہنے کے بعد وہ اس وقت الگ ہو گئے جب اندرونی ریشہ دوانیوں کے باعث حکومت میں انتشار برپا ہوا وہ کولمبیا یونیورسٹی چلے گئے۔

کولمبیا سے انہیں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کی تشکیل و تنظیم کے لیے خاص طور پر بلایا گیا اور جب وہ اس ادارہ کو منظم کر چکے تو انہیں ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی کا مستقل وائس چانسلر ایک ایسے وقت بنا دیا گیا جب طلبا اور اساتذہ میں بڑا خلفشار تھا اور ڈسپلن قائم رکھنے کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا تھا انہوں نے یونیورسٹی کے حالات کو بہت جلد درست کر دیا، یونیورسٹی کا ماحول ہر قسم کے ہنگاموں سے پاک ہو گیا، اس کے مختلف شعبوں میں درس و تدریس کا سلسلہ بڑے امن و امان کے ساتھ جاری کر دیا گیا ان کے علمی وقار اور ذاتی کردار کے باعث کراچی یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ دونوں نے شروع سے آخر تک ان کا بڑا احترام کیا وہ تقریباً گیارہ سال تک وائس چانسلر رہے اس عرصے میں انہوں نے بہت سے جدید شعبوں کا افتتاح کیا اور یونیورسٹی کیمپس کے وسیع رقبہ پر مختلف شعبوں بالخصوص سائنس کے تمام شعبوں کے لیے بڑی بڑی عمارتیں اور اساتذہ کے لیے نہایت آرام دہ اور گنجائش والے جدید آسائشوں کے مطابق مکانات تعمیر کرائے ایک بڑی لائبریری کے لیے کئی منزلہ وسیع عمارت مہیا کی اور اسے جدید انداز میں منظم کیا، بے شمار اساتذہ کو ملک سے باہر بھیج کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے انہیں تعلیمی مقاصد کے لیے تنخواہوں کے ساتھ رخصتیں دیں جس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں قابل اساتذہ کی بڑی تعداد مہیا ہو گئی اور اس یونیورسٹی کو تمام ایشیا میں ایک نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔ مختلف ایشیائی اور افریقی ممالک اور مشرق بعید کے طلبا اس میں تعلیم کے لیے داخل ہونے لگے۔ کراچی یونیورسٹی کی اس خدمت پر انہوں نے اپنے گیارہ سال شب و روز محنت کر کے گزارے اور ایک ایسا معیار قائم کیا جو آج بھی پرانے طلبا اور اساتذہ کی یادوں میں بڑے جذبہ احترام کے ساتھ محفوظ ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ

کو فروغ دیا اور اس کے ذریعے بہت سی نصابی کتابوں کے تراجم شائع کرائے اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے سائنسی اصطلاحات کے اردو مترادفات بڑی باقاعدگی سے وضع کرائے۔ انہوں نے سعیٔ بلیغ کے بعد یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں امتحانات کے لیے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کو بطور متبادل زبان منظور کرایا۔ یونیورسٹی کی انتظامی مجالس میں انگریزی کی بجائے اردو کو رائج کرایا۔ تقسیم اسناد کے سالانہ جلسوں میں جو بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد کیے جاتے تھے انگریزی کا رروائی اردو میں جاری کی گئی وہ خود اپنا خطبہ اردو میں پڑھتے تھے اسی طرح انہوں نے یونیورسٹی میں معارف اسلامیہ کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اسے امتحان کا لازمی مضمون بنوایا۔ ان تمام اصلاحات نے کراچی یونیورسٹی کے ماحول کو بہت بڑی حد تک اسلامی بنا دیا تھا اور نئے سائنسی شعبوں کے اجرا کے ساتھ ساتھ اس کی علمی خصوصیت بھی نمایاں ہوگئی، جب ۱۹۷۱ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے سے سبکدوش ہوتے تو کراچی کے خواص و عوام نے ان کی عدیم المثال گیارہ سالہ شاندار خدمات کے اعتراف میں ایک نہایت وسیع پیمانے میں استقبالیہ دیا جس میں کراچی کی تقریباً تمام سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے نمائندوں اور منتخب شہریوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور ان کی خدمت میں جو سپاسنامہ بڑے خلوص اور والہانہ جذبات کے ساتھ پیش کیا گیا اس میں ان کی خدمات جلیلہ کو کھلے دل سے سراہا گیا اور انہیں بڑی محبت اور احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۱ء تک نصف صدی سے زائد کی یہ مدت جو انہوں نے مسلسل قومی خدمت میں گزاری یقیناً اس کی متقاضی تھی کہ وہ کراچی یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد مکمل آرام کرتے اور اپنی زندگی امن و سکون کے ساتھ باغبانی اور صبح کی تفریح جیسے مشاغل میں گزار دیتے تھے جوان کی ہابی تھے مگر ان کی تخلیق جس مادہ سے ہوئی تھی اس میں سکون کا نام و نشان نہ تھا وہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی سکون سے نہیں بیٹھے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ انہوں نے "پاکستان میں تعلیم" "علما سیاسی میدان میں" اور "سلطنت مغلیہ کا بانی اکبر" جیسی ضخیم کتابیں اسی زمانے میں لکھیں۔ پاکستان کی قومی زبان اردو کے متعلق حکومت سندھ کے معاندانہ اقدام پر ایک زبردست احتجاجی تحریک کی عملاً قیادت کی اور اسے ایک نتیجہ تک پہنچایا حکومت وقت کے ظالمانہ جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے تحریک استقلال میں شرکت کی اور آخر میں جب اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو صدر مملکت کے اصرار پر قومی زبان کے نفاذ و فروغ کے لیے ایک با اختیار ادارہ "مقتدرہ قومی زبان" کی تشکیل کی اور اس کی ذمہ داریاں بحیثیت صدر نشین سنبھال لیں ایک ایسے شخص کے لیے جس نے ایک غیر معمولی طویل مدت ان تھک محنت اور زبردست جد و جہد میں گزاری تھی اپنی آخری عمر میں اس قدر گراں قدر بار برداشت کر لینا خطرناک تھا اس کا جو قدرتی نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا قلب و جگر کی متعدد بیماریوں نے انہیں گھیر لیا وہ کام کرتے رہے اور بیماریاں بہترین علاج و معالجہ کے باوجود بڑھتی رہیں یہ سب کچھ اس شوق و ولولہ کی وجہ سے ہوا جو قومی خدمت کے لیے ان کی سرشت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ قومی زبان اردو سے انہیں عشق تھا اس لیے مقتدرہ قومی زبان کے قیام اور اس کے ذریعے اردو کے نفاذ و فروغ کے امکانات کی کشش ایسی تھی کہ وہ صدر مملکت کی پیشکش قبول کرنے سے حتمی انکار نہیں کر سکتے تھے، بیماریوں کے باعث ان کے دوسرے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے مگر دماغ پوری صحت کے ساتھ آخری وقت تک کام کرتا رہا تھا وہ اپنے بستر علالت پر مقتدرہ کے مسائل کو سنتے اور ان کے متعلق احکام جاری کرتے تھے اور صدر مملکت سے مقتدرہ کے متعلق ان کی خط و کتابت جاری رہتی تھی۔ منجملہ دیگر بیماریوں کے ان کی بصارت بھی کچھ عرصہ کے لیے جاتی رہی تھی وہ اپنی آنکھوں پر تاریک چشمہ لگا کر لوگوں سے اس طرح ملاقات کرتے اور گفتگو جاری رکھتے تھے کہ کسی کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ انہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے کراچی کے ایک مشہور ماہر امراض چشم نے ان کی آنکھوں کا بڑا کامیاب آپریشن کیا۔ ان کی بصارت بحال ہوگئی تو پٹی کھلنے کے بعد انہوں نے

نے سب سے پہلے قرآن مجید منگا کر اس کی چند آیات کا مطالعہ کیا اور بہت خوش ہوئے اس علاج کی کامیابی سے انہیں اپنی مکمل صحت کے متعلق حد سے زیادہ اعتماد ہو گیا علاج تو جاری تھا مگر وہ اپنی نقل و حرکت اور معمولات کے سلسلے میں احتیاط بہت کم کرنے لگے ایک دن اچانک صدر مملکت سے ملاقات کے لیے اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن اپنے کسی ذاتی خادم یا ڈاکٹر کے نسخوں اور دواؤں کے بغیر بڑی مستعدی کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہو گئے وہاں پہنچ کر صدر مملکت سے ملاقات تو ہو گئی مگر واپسی پر جب وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو رات کو ان کی طبیعت شدید خراب ہوئی، ہسپتال منتقل کیے گئے مگر ڈاکٹروں کی فوری ہنگامی تدابیر کے باوجود وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون یہ حادثۂ فاجعہ ۲ جنوری ۱۹۸۱ء کو پیش آیا، اگلے روز ان کی نمازِ جنازہ پاکستان ایئر فورس کے میدان میں ادا کی گئی جس میں ان کے شاگردوں، رفیقوں، مداحوں اور اعلیٰ حکام کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق بھی شریک تھے جب جنازہ کراچی روانہ کرنے کے لیے ایئر پورٹ لے جایا گیا تو انہوں نے بھی اسے کندھا دیا اور وہ اس وقت تک ایئر پورٹ پر رہے جب تک ان کی میت کو لے جانے والا جہاز کراچی روانہ نہ ہو گیا

کراچی میں جب ان کا جنازہ ایئر پورٹ سے روانہ ہو کر ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچا تو ایک جمِ غفیر اس کے ساتھ تھا سوسائٹی کی وسیع جامع مسجد میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی اور گاڑیوں کا ہجوم انہیں قبرستان تک لے گیا۔ سارے ملک کے اردو، انگریزی اخبارات نے ان کی وفات پر افتتاحیے لکھے اور مفصل خبریں اور مضامین شائع کیے جن میں ان کی شخصیت اور خدمات کے متعلق بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ تفصیلات درج کی گئیں۔

مقتدرہ قومی زبان ایک ایسا ادارہ ہے جو ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا آخری مرکز تھا ان کا یہ پکا عقیدہ تھا کہ قومی زبان کا نفاذ نہ صرف سرکاری دفاتر میں ہونے سے تعلیمی اداروں میں بھی اس کے ذریعہ تعلیم بننے اور روز مرہ کے کاروبار میں اس کے رائج ہونے پر پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کا بڑی حد تک دارومدار ہے جس طرح انہوں نے اپنی وہ تصانیف جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اپنے ورثہ میں چھوڑی ہیں اسی طرح مقتدرہ قومی زبان کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے اس ادارہ کی وسعت و ترقی اور اس کے مقاصد کی کامیابی کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے وہ ان کی روح کے لیے باعث مسرت ہوگا۔

میانوالی، مارچ (نامہ نگار) پاکستان میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں محب وطن افراد کی اکثریت قومی زبان کی حامی ہے مگر انگریزی کے حامی افراد کا ایک مخصوص طبقہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے انگریزی کو دفتری زبان بنانے پر تلا ہوا ہے جبکہ یہ عیاں حقیقت ہے کہ ملکی یکجہتی کو مضبوط بنانے کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اشد ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقتدرہ قومی زبان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی نے کینال ریسٹ ہاؤس میانوالی میں صحافیوں سے ایک ملاقات کے دوران کیا۔ انہوں نے کہا مقتدرہ نے اردو کو مکمل دفتری زبان بنانے کے لئے اپنے فرائض احسن طریقے سے ادا کئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ۳ ہزار الفاظ پر مشتمل لغت مجلس دفتری زبان کے لئے تیار کی گئی ہے جو ۳۰ مارچ تک پنجاب حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔ علاوہ ازیں اردو کی ترویج کے لئے اس ادارے نے ۱۲۸ کتابیں ۹۰ کتابچے شائع [illegible] سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ملک میں صرف ایک [illegible] خط و کتابت انگریزی میں ہوتی ہے جبکہ ملک کی تمام [illegible] خط و کتابت کرتی ہے جس سے اردو کی عوام میں مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۸-۳-۸۶ء

[illegible] کے ملازمین کے بچوں کے لیے ملازمتوں کا کوٹہ حکومت غور کر رہی ہے

ساہیوال (نمائندہ پیکار) صوبائی وزیر تعلیم و خزانہ چوہدری ممتاز [illegible] نے کہا کہ [illegible] تعلیم کے ملازمین کے بچوں کا ملازمتوں میں کوٹہ مقرر کرنے پر حکومت غور کر رہی ہے انہوں نے اس امر کا انکشاف گورنمنٹ ہائی سکول ۸۹ / ۹ آر میں ہائی سکول کے ٹورنامنٹ کے اختتام پر جلسہ تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے کیا انہوں نے کہا کہ جن اساتذہ کی ۱۹۷۷ء سے ترقیاں رکی ہوئی ہیں آپ آٹھ سو اساتذہ کی ۱۹۸۰ء تک ترقیاں دے دی ہیں کا مزید چار سو اساتذہ کو ترقیاں دی جائیں گی انہوں نے کہا کہ سابق حکومتوں کی تعلیم کے شعبہ پر عدم توجہ کی وجہ سے تعلیم کا معیار زرعی ممالک سے بھی گر گیا تھا اب دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے برابر تعلیمی معیار لایا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بنانا ہماری حکومت کا پلان ہے۔

روزنامہ پیکار اسلام آباد ۲۸ مارچ ۸۶ء

[illegible] دسویں جماعتوں تک لازمی قرار دیکر

سکھر، ۱۰ مارچ (پ ر) تنظیم فکر و نظر سندھ کے زیر اہتمام سکھر میں منعقدہ مقررین جو میلہ میں حکومت سے سفارش کی گئی ہے کہ سکولوں میں عربی کی تعلیم کو دسویں جماعتوں تک لازمی قرار دیا جائے اور اس کی ترویج کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں اور عربی کے اساتذہ کے لئے ان کے شایان شان مشاہرہ مقرر کی جائے۔ علاوہ ازیں سرکاری تعلیمی اداروں کی حالیہ فیصد منسوخ کر کے ذہین اور نادار طلباء کو پرائمری کی سطح سے معقول اسکالرشپ دیئے، اردو عربی اور دینی مضامین پڑھانے والے اساتذہ کے بچوں کو پروفیشنل کالجوں میں داخلہ اور ملازمتیں دینے، اساتذہ کی تنخواہوں میں معقول اضافے، فنی تعلیم کو لازمی قرار دینے، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو یونیورسٹی تک لازمی قرار دینے اور نصاب تعلیم سے لادینی رجحانات کو ختم کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۱ مارچ ۸۶ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ایسے لوگ جیسے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں شاید میر تقی میر نے انہی کے لیے کہا تھا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے ملتِ مسلمہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ ایسی دل سوزی اور ایسی دردمندی کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مجسم علم۔ سرتا پا عمل، تحریر پر قدرت، تقریر پر قادر، مشفق بھی اور مخلص بھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان سے ملا تھا تو یہی احساس ہوا تھا۔ اس وقت وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تھے اور جب ہلال احمد زبیری صاحب کے ہمراہ اُن سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور جب اسلام آباد سے واپس آئے تو اپنے پیروں پہ نہیں دوسروں کے کاندھوں پر آئے۔ انسان جب آتا ہے تو دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہی رِیت ہے۔

اس ہستی کی یاد میں جناب ہلال احمد زبیری صاحب نے محنت اور سلیقہ سے ایک یادگاری مُجلّدہ مرتب کیا جس کے مطالعے سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی شخصیت و فکر کے وہ تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں جن سے وہ عبارت تھے اسی لیے یہ کتاب سب کو پڑھنی چاہیئے تاکہ لوگ ایک سچے مسلمان، ایک اچھے انسان، ایک معتمد دوست، ایک شفیق اُستاد، ایک اچھے منتظم، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک مُستند مورخ کے کارناموں سے واقف و متعارف ہوسکیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا اندازِ فکر ایک ایسے محبِ وطن پاکستانی کا تھا جو ایک طرف تحریکِ پاکستان کا سپاہی اور داعی تھا اور دوسری طرف فکر و نظر اور تہذیب و ثقافت کی سطح پر اُن عوامل کو فکرِ پاکستان میں شامل کرنا چاہتا تھا، جو پاکستان کی پہچان ہیں اور جن سے پاکستان، صحیح معنی میں ایک ملک اور پاکستانی، صحیح معنی میں، یک جہتی کے رشتے میں پیوست۔ ایک متحد قوم بن سکتے ہیں اسی لیے وہ ہمیشہ تین بنیادی باتوں پر زور دیتے ہیں، پہلی بات یہ کہ وہ اسلام کو پاکستان کی بنیادی شناخت سمجھتے تھے جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا اور جس سے یہ ملک قائم و دائم رہے گا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ،

"میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بغیر پاکستان ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان کی وحدت کا سبب صرف اسلام ہے اس وحدت میں اور عناصر بھی شامل ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت اسلام کو حاصل ہے۔ اگر اسلام نہ ہو تو پاکستان کے شیرازہ کو جمع رکھنا بہت دشوار ہوجائے۔" ص ۱۲۰

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نزدیک اسلام زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تو سراسر عمل کا نام ہے۔ ایسا عمل جس سے انسان کا کردار بنتا ہے۔ ایسا کردار جس سے اسلام انسان کی روح میں سرایت کرکے معاشرے اور فرد کی شناخت بنتا ہے۔ اسی لیے جب وہ موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ہماری ناکامیاں دراصل ہمارے کردار کی خامی کی وجہ سے ہیں پاکستان میں آئین ناکام نہیں رہا ہے بلکہ آئین کو چلانے والے ناکام رہے ہیں۔ ہماری ناکام حکومتیں کرداری خامی کے سبب صحیح نہ چل سکیں۔ اگر ہمارا کردار دُرست ہوتا اور آئین ناقص بھی ہوتا تو بھی ہم کردار کے زور پر اسے کامیاب بنا سکتے تھے۔ اگر آئین اچھا بھی ہو اور کردار ناقص ہو تو آئین کبھی نہیں چل سکتا (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر قریشی خود غرضی کو پاکستان کی بدحالی کا سبب جانتے ہیں: "ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں خود غرضی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی

غرض کو پورا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں" (ص ۱۲۳) اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ رشوت لو۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ رشوت نہ لو۔ جس قوم کے دل سے خُدا کا خوف چلا جاتا ہے تو اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف اسی دنیا کو بنانا ہے اور دنیا بھی ایسی نہیں بنانی جس سے ساری قوم یا ملک کے فائدے پہنچے، بلکہ مقصود محض ذاتی منفعت ہوتا ہے اور فرد بھول جاتا ہے کہ اگر قوم تباہ ہو جائے گی تو خود فرد بھی کہاں رہے گا۔" (ص ۱۲۳)

ڈاکٹر قریشی کے نزدیک دوسری بات جس سے پاکستان ایک ملک اور پاکستانی ایک متحد قوم بن سکتی ہے، یہ ہے کہ قوم کو تعلیم اپنی قومی زبان میں دینی چاہیے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر اپنی زبان کو ترک کر دیا جائے یا پس پشت ڈال دیا جائے تو تھوڑے عرصے کے بعد جذبات بدلتے نہیں بلکہ فسخ ہونے شروع ہو جاتے ہیں کہ جذبات یا جتنے خیالات باریک ہوتے ہیں وہ ایک خاص طریقے سے نشو و نما پاتے ہیں۔ ان کا ایک پس منظر ہوتا ہے، ان کے پیچھے تاریخی تجربات و حیات کی پوری کشمکش ہوتی ہے۔ اگر کسی اور جگہ سے زبان مستعار لی جائے تو نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ جذبات و خیالات بھی مستعار لینے پڑیں گے۔ جو چیز اس طرح سے مستعار لی جاتی ہے اس پر کبھی انسان کو نہ پورا قابو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ مستعار لی ہوئی قوتوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستے پر چلا سکے یہی سبب ہے۔ جو قومیں اپنی زبان سے ناآشنا ہوتی ہیں وہ کبھی ایسا کارنامہ علمی یا فطری یا ذہنی، پیش نہیں کر سکتیں جن پر انہیں فخر ہو۔ تمام ایسے ممالک میں جہاں اپنی زبان کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاتا خیالات کی ایسی پستی پائی جاتی ہے کہ دماغ کبھی ترقی نہیں کرتے بلکہ ترقی بند ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے درختوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں نہ دھوپ ملے نہ ہوا ملے، جو ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معیارِ تعلیم مسلسل گر رہا ہے۔ کسی دوسری زبان میں رٹ کر امتحان پاس کرنے سے دماغ کی ترقی یا علم کا فروغ نہیں ہوتا بلکہ دماغ سکڑ کر، ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ طالب علم میں حصولِ علم کی لگن ہی پیدا نہیں ہوتی۔ صاحبانِ اقتدار اس بات کی کتنی ہی مخالفت کریں لیکن یہی اور یہی بات اپنی جگہ درست ہے۔ انگریزی ضرور پڑھیے اور خوب پڑھیے، اس پر پوری قدرت حاصل کیجیے۔ میرا خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو بہت اچھی انگریزی آنی چاہیے لیکن اصل مسئلہ اچھی انگریزی آنے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ تو ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ ذریعۂ تعلیم اگر اپنی زبان میں ہو تو ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہو کر پستی سے رفعت کی طرف جانے لگتی ہیں۔ یہ بات جتنی جلد صاحبانِ اقتدار کی سمجھ میں آ جائے اتنا ہی قوم کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ

"یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں تھوڑی بہت علمی ترقی جو ہوئی ہے۔ اس کی بنیاد تمام تر لاطینی پر قائم تھی لیکن کیا وہ علمی ترقی کا پاسنگ بھی تھی؟ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی کسی غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوئی بلکہ قومی زبانوں کے استعمال سے میسر آئی چنانچہ انگریز جن کی تقلید کا بار ہم اپنے گلے میں اب تک ڈالے ہوئے ہیں۔ اس دن سے اپنی ترقی کی ابتدا شمار کرتے ہیں جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور لاطینی سے انہیں نجات ملی" (ص ۵۰) "علم اسی حالت میں ترقی کر سکتا ہے اور عوام میں پھیل سکتا ہے۔ جب انہیں ان کی زبان میں اسے سکھایا جائے ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی تعلیم عام ہونی چاہیے اور عوام کو سائنس سے تعلق ہونا چاہیے اور دوسری طرف ہم عوام کے اور سائنس کے درمیان وہ دیواریں کھڑی کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کبھی سائنس سے روشناس نہ ہو سکیں گے۔" ص ۵۳

تیسری بات جس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم زور دیتے ہیں وہ اپنی میراث کا احساس و شعور ہے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ "اب ہمیں کسی چیز پر اعتماد نہیں رہا۔ ہمارے دل میں اپنی کسی روایت سے وابستگی اور اپنی میراث کے کسی حصے سے لگاؤ کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ ہمارے احساس کمتری کا اس سے زیادہ اور کیا مظاہرہ ہوگا کہ ہمارے مکانوں، محلوں، راستوں، اداروں، کارخانوں حتیٰ کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیا تک کے نام غیر ملکی ہیں۔ ہماری قوم کے والدین کی تمام تر کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ایک خارجی زبان کو بے تکلف بول سکیں اور اگر اپنی مادری یا قومی زبان بولنے سے یکسر قاصر ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بات مزید اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ "جب میری نسل کا عنفوانِ شباب تھا تو ہمیں مسدس حالی کے بند، بانگ درا کی پوری پوری نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ کے جستہ جستہ حصے ازبر تھے۔ شعر کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی

صلاحیت تھی۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر تھا۔ اگر کوئی ہمارے ماضی کو بُرا کہتا تھا تو ہمارا دل دکھتا تھا اور اگر کوئی ہمارے مقدسات پر حملہ کرتا تھا تو ہم برافروختہ ہوتے تھے۔ یہی تو وہ جذبات تھے جو ہماری قوتِ عمل کو بیدار کرتے تھے۔ یہی وہ رجحانات تھے جو پختگی پا کر ایک سیلِ رواں بن گئے اور جنہوں نے ہندی اور برطانوی سامراجیت کو اپنے راستے سے یوں ہٹا دیا جیسے دریا کا دھارا خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پوچھتے ہیں کہ "میں اپنی راہ گم کردہ قوم سے نہایت ادب کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ پاکستان حاصل کرنے کا جذبہ ہمارے دل میں شیکسپیئر پڑھ کر پیدا ہوا یا حالی کی مسدس کے ورد سے؟ ورڈسورتھ نے ہمارے دلوں میں ہیجان پیدا کیا یا اقبال نے؟" اور پھر خود جواب دیتے ہیں کہ "اگر ہمارے دلوں میں اپنی ثقافت کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہونے پر تیار ہوتے اور اپنی انفرادیت کو قائم کرنے کے لیے ان سب مصائب کا مقابلہ نہ کرتے جو ہمیں پاکستان کے حصول کی راہ میں پیش آئے...... مقامِ عبرت ہے کہ وہ قوم جو اس دعوے کے ساتھ اٹھی تھی کہ اسے اپنی ثقافت اتنی عزیز ہے کہ وہ اغیار کے ساتھ شرکت کی زندگی کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں وہ اسی ثقافت کو بے سوچے سمجھے مٹا رہی ہے" (ص ۶۱-۶۲)

اسی اندازِ فکر سے ڈاکٹر قریشی کا تصورِ ثقافت پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی قوم کی شناخت سمجھتے ہیں۔ ان تمام عناصر کو اس کی تہذیبی و فکری روح میں شامل کر کے قوم کی انفرادیت کی پہچان بناتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے؟ قوم بے جان افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی وہ معتقدات، تاریخ، عصبیت، ثقافت اور انفرادیت پر اصرار سے وجود میں آتی ہیں۔ افراد اس وقت اپنی زندگی نثار کرتے ہیں جب انہیں قوم کی حیات میں ان قدروں اور روایات کی بقا نظر آئے...... ورنہ آرام و آسائش اچھے کپڑوں، لذیذ خوراک، نفیس ساز و سامان اور غیر ملکی آلات کی حفاظت کے لیے نقدِ حیات کون گنواتا ہے۔ اس قوم میں خواہشِ زیست کیا ہوگی جو اپنے وجود کا جواز ثابت نہ کر سکے؟ کسی قوم کا جوازِ وجود یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کے زندہ رہنے سے دنیا میں وہ خوبیاں زندہ ہیں جن کے نہ ہونے سے انسانیت خسارہ میں رہے گی۔ نہیں تو محض ایک بیکار انبوہ کے ہونے نہ ہونے سے کسی زیاں کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اسی بات کو وہ زندگی کے عام رویوں اور نظامِ اقدار میں دیکھتے ہیں تو انہیں بے حساب معاشرتی و اخلاقی کمزوریاں نظر آتی ہیں جنہوں نے قوم کو منتشر اور عدمِ اعتماد و بے یقینی کا شکار بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ "کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ ثقافت کی کمزوری سے آپ کی قوم میں خود غرضی، سہل انگاری، فرض ناشناسی، اخلاقی کمزوری اور اخلاق کی پستی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ اپنی عزت کیا کرے گا جو اپنے اندر کوئی چیز قابلِ توقیر نہ پائے۔ جو اپنی عزت نہ کرے اور خودداری سے بیگانہ ہو، وہ اپنے کردار کو کیا بلند کرے گا" اور ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ "کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ سب نتیجہ ہے ایک بے پناہ احساسِ کمتری کے سیلاب کا جس کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ وہ سیل ہے جس نے اس قوم کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دیا۔"

یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت وحدت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ وحدت و یک جہتی از خود پیدا نہیں ہوتی اس کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے بخصوص حکمتِ عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کو محلہ سے لے کر ضلع تک اور ضلع سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سارے ملک کے چپے چپے تک پھیلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے ہم قومی وحدت و یک جہتی کے مسئلے کو التوا میں ڈال کر ایک ایسی "طفلانہ خوش فہمی" کا شکار ہیں کہ جس کے نتائج کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ انتشار بڑھ رہا ہے۔ دشمنوں کے ہاتھ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ہماری بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ اگر مزید غفلت برتی گئی اور نئی حکمتِ عملی وضع نہ کی گئی اور صرف ایک ایک دن گزارنے پر اکتفا کیا گیا تو ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ "مزید غفلت سے یہ خوف ہے کہ پانی سر سے نہ گزر جائے" (ص ۷۴)

تشویش ناک بات یہ ہے کہ اس عمل کی طرف جو قومی ترجیحات میں سب سے اوّل ہونا چاہیے، ہم کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ صرف وقتی اور لمحاتی بنیادوں پر اہم مسائل کو نمٹانے میں مصروف ہیں۔ قوم کی بے کرداری، بے ضمیری اور مقصد و منزل کے نہ ہونے نے ہر چیز کو مسخ کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریل پٹڑی سے اتر گئی ہے۔ پٹڑی سے اترنے اور موجودہ صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ چالیس سال میں ناانصافیوں کی حکمتِ عملی نے، وحدت و یک جہتی کے عمل کو کمزور

سے کمزور تر کیا ہے۔ مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنا کر جس وحدت کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ ناانصافیوں کی حکمت عملی کو اپنانے سے پورا نہ ہوا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بھی اسی وجہ سے ہم سے الگ ہوا۔ ناانصافی کی حکمت عملی سے تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی ادارے بھی اس لیے ضعیف و خستہ ہو گئے۔ ناانصافی کی مثال اس گیند کی طرح ہے جسے جتنی قوت سے دیوار پر مارا جائے گا وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ رقص بسمل کا تماشائی ہے اور خود کو بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے

انصاف اور صرف انصاف، قومی یک جہتی اور تہذیبی و سیاسی اداروں کی نشوونما کے لیے ویسا ہی ضروری ہے جیسے سانس کی آمد و رفت انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ جو انصاف کو حکمت عملی بنائے گا۔ جو پورے اخلاص اور پورے دیانت کے ساتھ انصاف کو زندگی کی ہر سطح پر نافذ کرے گا وہی ایک زندہ، تنومند اور متحد معاشرے کو جنم دے سکے گا۔ یہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا تھا اور یہی ہمارے ارباب حل و عقد کو بھی کرنا چاہیے۔ یہی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نقطہ نظر ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

اس سال ۷۰ سکولوں میں تیسری جماعت تک کے طلبا کو ایک کتاب پڑھائی جائیگی

لاہور: یہ کتاب [illegible] صفحات پر مشتمل ہو گی اور اس میں تمام ضروری مضامین شامل ہوں گے۔

لاہور (سودی) اس سال سکولوں کی چھوٹی جماعتوں کے طلبہ پر کتابوں کا بوجھ نہایت کم کر دیا جائے گا۔ زیر تعلیم بچوں پر کتابوں کا بوجھ کم کرنے کے پیش نظر اس سال ۷۰ سکولوں میں تجرباتی طور پر ایک نئی تدریسی سکیم شروع کی جا رہی ہے جس کے تحت پنجاب کے ہر ضلع کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک ایک پرائمری سکول میں تیسری جماعت تک مختلف مضامین کی علیحدہ علیحدہ کتابوں کی بجائے ایک کتاب پڑھائی جائے گی جو کم و بیش ۵۰ صفحات پر مشتمل ہو گی۔ اس کتاب میں تمام ضروری مضامین ریاضی، اردو، معاشرتی علوم اور دینیات شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاہم پکی جماعت میں بدستور پہلے والا قاعدہ پڑھایا جائے گا۔ مذکورہ سکولوں میں بچوں کی تعلیم کے لیے جو اساتذہ تعینات کیے جائیں گے انہیں خصوصی تربیت دی جائے گی اور سکیم کی کامیابی کی صورت میں صوبہ بھر کے تمام پرائمری سکولوں میں اس سکیم کو رائج کر دیا جائے گا۔

روزنامہ جنگ لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء

آئندہ تعلیمی سال سے ماڈل پرائمری سکولوں میں تیسری جماعت تک صرف ایک کتاب پڑھائی جائے گی

ساہیوال ۳۰ مارچ (نامہ نگار) صوبائی وزیر تعلیم چودھری ممتاز حسین نے کہا کہ پرائمری کی سطح پر بچوں کے بستوں کا بوجھ کم کرنے اور قوم کے نونہالوں کی صحیح طور پر ابتدائی تعلیم و تربیت کے پیش نظر حکومت امسال پنجاب کے ۷۰ سکولوں میں تجرباتی طور پر ایک نئی تدریسی سکیم شروع کر رہی ہے۔ وہ آج یہاں صحافیوں، معززین شہر اور ماہرین تعلیم کے ایک مشترکہ وفد سے بات چیت کر رہے تھے۔ صوبائی وزیر تعلیم نے کہا کہ اس سکیم کے تحت پنجاب بھر کے ہر ضلع میں ایک مردانہ اور ایک زنانہ ماڈل پرائمری سکول کھولا جائے گا جس میں تیسری جماعت تک ہر مضمون کی بھاری کتابوں کی بجائے ایک کتاب پڑھائی جائے گی جو کم و بیش پچاس صفحات پر مشتمل ہو گی۔ اس کتاب میں تمام ضروری مضامین ریاضی، اردو، معاشرتی علوم اور دینیات ہوں گے تاہم پکی جماعت میں بدستور وہی قاعدہ پڑھایا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذکورہ سکولوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو اساتذہ متعینات کئے جائیں گے انہیں پہلے سے اس خاص مضمون کی تربیت دی جائے گی۔ ایک سوال کے جواب میں وزیر تعلیم نے کہا کہ اس سکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے گا اگر یہ سکیم کامیاب ہو گئی تو یہ سکیم پنجاب بھر کے پرائمری سکولوں میں آئندہ سال سے رائج کر دی جائے گی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء

ایجوکیشن سروس کو سول سروس کے خطوط پر ترقی دی جائے گی، نسیم آہیر

اقراء پائلٹ پروجیکٹ میں بدعنوانیوں کی تحقیقات کرائی جائے گی

اسلام آباد (پی پی آئی) وفاقی وزیر تعلیم ملک نسیم احمد آہیر نے کہا ہے کہ حکومت پاکستان کی ایجوکیشن سروس کو سول سروس کے خطوط پر ترقی دینے کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہے تاکہ پرائمری اور سیکنڈری سطح تک کے تمام اساتذہ بھی تدریس کے شعبے میں زیادہ دلچسپی اور تندہی سے کام کر سکیں۔ انہوں نے یہ بات یہاں ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ "اقراء" پائلٹ پروجیکٹ میں بدعنوانیوں کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تاہم انہوں نے زور دے کر کہا کہ وہ اس سلسلے میں تحقیقات کرائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت صرف اسلام آباد اور راولپنڈی میں یہ پروجیکٹ اس امید پر شروع کئے گئے ہیں تاکہ ان کی کامیابی کے بعد ملک کے دیگر حصوں میں بھی شروع کئے جا سکیں۔

روزنامہ جنگ کراچی یکم اپریل ۱۹۸۷ء

[illegible] ذریعہ تعلیم [illegible]

اسلام آباد (پ ر) تنظیم اساتذہ پاکستان ضلع اسلام آباد کے قائم مقام صدر محمد طارق خٹک اور سیکرٹری جاوید اقبال [illegible] نے وفاقی وزارت تعلیم کی طرف سے ماڈل اور دیگر سکولوں کی تمام جماعتوں میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم [illegible] انگریزی [illegible] کے احکامات پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ قومی زبان سے [illegible] وہ قوم کو بدستور انگریزی دانوں کا غلام بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ مزید یہ کہ اس حکم کے ذریعے ۱۹۸۹ء میں میٹرک تک تمام مضامین کا امتحان اردو میں لینے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ چونکہ انگریزی زبان پاکستانی طلباء کیلئے سائنس اور ریاضی پڑھنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اس لئے اس حکم کو [illegible] اور پاکستان میں تمام [illegible] میڈیم تعلیمی اداروں کو ختم کیا جائے۔ ۱۹۸۹ء میں کسی بورڈ کو انگریزی میں کسی مضمون کا امتحان نہ لینے کے حکم کو برقرار رکھا جائے اور ۱۹۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ کے درجہ پر بھی تمام سائنسی مضامین اردو میں لیا جائے۔

روزنامہ جنگ پنڈی ۱۱-۳-۸۷ء

آٹھویں جماعت کے امتحانات علیحدہ تعلیمی بورڈ لیا کریں گے

کوئی سکول اپنے طور پر امتحانات لے کر طالب علموں کو اگلی جماعتوں میں ترقی نہیں دے سکے گا

لاہور (سودی) آئندہ سال سے صوبہ بھر میں آٹھویں جماعت کے امتحانات سکولوں کی بجائے علیحدہ تعلیمی بورڈوں کی نگرانی میں ہوا کریں گے اور کوئی سکول اپنے طور پر امتحانات لے کر طالب علموں کو اگلی کلاسوں میں ترقی نہیں دے سکے گا۔ حکومت پنجاب کے فیصلے کے مطابق اس سلسلے میں پنجاب بھر میں آٹھویں جماعت کے امتحانات لینے کے لئے ہر ضلع میں علیحدہ بورڈ قائم کئے جا رہے ہیں جن کی سربراہی [illegible] جبکہ پانچویں جماعت کے طالب علموں کے لئے بھی علیحدہ بورڈ قائم کئے جا چکے ہیں [illegible]

روزنامہ جنگ لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء

پروفیسر سعید الدین ڈار

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک عظیم مؤرخ

برصغیر جنوبی ایشیا پر انگریزوں کا قبضہ دیرپا اثرات کا حامل تھا۔ یہ محض ایک سیاسی تبدیلی نہ تھا بلکہ انگریز اپنے ساتھ مغربی افکار بھی لائے تھے جنہوں نے علم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا جس سے فکر کا ایک نیا انداز پیدا ہوا اور تحریر کا اسلوب بدلا دیگر علوم کی طرح فنِ تاریخ نویسی بھی اس تبدیلی سے متاثر ہوئی Dowson اور Elliot نے برصغیر کی تاریخ کے مآخذ کا انگریزی میں ترجمہ کرکے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی توجہ برصغیر کی تاریخ کو از سر نو لکھنے کی طرف دلوائی۔ انگریز مصنفوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا Smith نے Akbar the Great لکھ کر ایک نئے انداز فکر کی بنیاد رکھی۔ کیمبرج یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں برصغیر کی تاریخ پر تحقیق نے محققین کو ایک نئی راہ دکھائی سر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر، بینی پرشاد نے ہمایوں پر اور سکسینہ نے شاہجہان پر بالکل نئے انداز سے کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں مغرب کے وضع کردہ تحقیقی اصولوں کے مطابق تھیں جس طرح ہندوؤں نے جمہوریت کو اپنے سیاسی عزائم کے لیے ڈھال بنایا ہے اسی طرح تحقیق کے پردے میں تاریخ کو یوں پیش کیا گیا کہ وہ اس دور کے ہندوؤں کے سیاسی خیالات کی تائید کر سکے یہ وہ دور تھا جب آل انڈیا کانگرس کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی قومیت کا پرچار ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی نفی کی جا رہی تھی اس تحقیق کے پیشِ نظر اسی نظریہ کو علمی اور فکری تحفظ دینا تھا اگر ایشوری پرشاد نے History of Medieval India لکھ کر مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہندو تعصب کا برملا اظہار کیا تو تارا چند نے Impact of Islam on Hindu Culture لکھ کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں کوئی نمایاں فرق نہیں، اختلافات سیاسی ہے جو حکمران طبقہ کا پیدا کردہ ہے۔

اس دور میں مسلمانوں نے برصغیر پر کوئی نمایاں کام نہ کیا۔ علی گڑھ میں جو مسلمانوں کا علمی مرکز تھا پروفیسر حبیب کی زیر سرگردگی جن نظریات کی ترویج کی گئی وہ کسی طرح بھی ماضی کے ترجمان نہ تھے Sultan Mahmud of Ghazna کے سرورق سے پروفیسر حبیب کا نام مٹا دیا جائے تو اسے پڑھنے والا فوراً ہی کہے گا کہ یہ کتاب کسی ہندو کی تصنیف کردہ ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے The Administration of the Sultanate of Dehli لکھ کر برصغیر میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے بارے میں مروجہ خیالات کو تبدیل کرنے کی ابتدا کی اور مسلمانوں میں اس شعور کو زندہ کیا کہ ان کا ماضی درخشندہ ہے اور وہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نیا میدان تھا۔ اس سے پہلے تاریخ دانوں نے ضمناً اس موضوع پر کچھ لکھا ہو تو لکھا ہو مگر اسے مستقل مضمون بنا کر کسی نے تحقیق نہ کی تھی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی چونکہ فارسی جانتے تھے اس لیے انہوں نے فارسی تاریخی مآخذوں سے استفادہ کیا اور اپنے ہم عصر مؤرخوں کے برعکس ان کے تراجم پر انحصار نہ کیا انہوں نے بہت سے ایسے مآخذ استعمال کیے جو اس سے پہلے دورِ جدید میں کبھی حوالہ نہ بنے تھے، مزید براں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور کو یعنی سلاطین دہلی کے عہد کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا جو تاریخ نویسی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے مسلمان حکمرانوں کے انتظامی امور میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دلچسپی برقرار رہی اور بعد میں The Administration of Mughal Empire لکھ کر اس کام کو مکمل کیا جس کی ابتدا آپ نے The Administration of the Sultanate of Dehli لکھ کر کی تھی اس کتاب

نے سلاطین دہلی کے بارے میں تحقیق کا تجسس پیدا کیا اور ۱۹۴۵ء میں ایم۔بی۔ ایم حبیب اللہ کی کتاب The Foundation of Muslim Rule in India شائع ہوئی اور پھر ایک سلسلہ چل نکلا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کو مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے تحقیق کرنے والوں کے میر کارواں تھے اور آپ کی کتاب The Muslim Community of Indo-Pakistan Subcontinent برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر ایک جامع اور منفرد تصنیف ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا قلم تحریک پاکستان، نظریہ پاکستان اور پاکستان سے متعلق موضوعات کے لیے وقف ہوگیا تھا بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ڈاکٹر قریشی کی سب کتابوں میں "ایک نقطۂ نظر کارفرما ہے اور وہ ہے " تصدیق و توثیق نظریہ پاکستان" ان کی ہر کتاب ایک دلیل اور برہان کا درجہ رکھتی ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کتابوں سے ان کے قارئین کے عقیدے زیادہ مستحکم اور ایمان زیادہ پختہ ہوگئے" تحریک پاکستان پر لکھی جانے والی کتابوں میں آپ کی تصنیف The Struggle for Pakistan کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے گو کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور رہنما تھے اور اس تحریک کے دوران پیش آنے والے اکثر و بیشتر واقعات کے عینی شاہد تھے مگر انھوں نے اپنے ذاتی تاثرات کو علمی تحقیق پر حاوی نہیں ہونے دیا، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دو کتابیں یعنی Education in Pakistan اور Ulema In Politics موضوع اور رویے کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی چھ جلدوں میں شائع ہونے والی کتاب A History of Freedom Movement کے ایڈیٹروں میں سے ایک تھے اس کتاب کی جلد اول میں آپ نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا پُرمغز تجزیہ ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تاریخ کی جو خدمت کی اس کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر میں چار جلدوں میں شائع ہونے والی A Short History of Pakistan کا ذکر نہ کروں یہ کتاب ۱۹۶۷ میں کراچی یونیورسٹی نے شائع کی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس کے General Editor تھے یہ کتاب کالج کے طالب علموں کے لیے نصابی کتاب کی غرض سے لکھی گئی اور اس میں زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر ۱۹۵۹ء تک کی تاریخ پاکستان عالمانہ مگر انتہائی سادہ اور خوبصورت طریقہ سے لکھی گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب دو وجوں کی بنا پر اہم ہے اولاً اس کتاب کو پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ذہن میں کالج کے طالب علموں کو تاریخ پڑھانے کا کیا معیار تھا اور جب اس کا مقابلہ آج کل پڑھائی جانے والی نصابی کتب سے کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا معیار کس قدر پست ہوگیا ہے ثانیاً اس کتاب کے عام اداریتی نوٹ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ایک نہایت اہم سوال اٹھایا ہے کہ کیا پاکستان کی تاریخ لکھنی ممکن ہے؟ جبکہ پاکستان تو ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا اس سے قبل اس نام کا کوئی ملک یا خطہ زمین موجود نہ تھا! اور پھر اس کا جواب انھوں نے خود ہی دیا ہے، میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے الفاظ ہی دہراتا ہوں۔

> It is true that Pakistan is new, but the land and its people are not new. They have existed, by Whatever names they might have been known before the present country of Pakistan came into existance. This land and people have a history which some times flow by itself and some times it Comingles its waters with other streams. This stream, however was not lost and when it again found a new channel, it may have lost its Pristine characteristics but it could Assert its own new found entity as a resurrection, not a new birth.

میں اپنا یہ مختصر مقالہ اس تجویز پر ختم کرتا ہوں کہ اس کتاب میں پاکستان کی ۱۹۸۵ء تک کی تاریخ کا اضافہ کیا جائے اور اس کا اردو ترجمہ شائع کرکے اسے پاکستان کے کالجوں میں نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جائے۔

ڈاکٹر محمد یوسف عباسی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرخ

ہر عالم اور مورخ اپنے زمانے کے ماحول اور نفسیاتی فضا اور معاشی و سیاسی عوامل کی پیداوار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے مستشرق مغربی امپیریلزم کے آئینہ دار تھے۔ اسی طرح سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مسلمانوں کے مدافعتی دور کی علامت ہیں۔ انگریز اور ہندو مورخین نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا منظر پیش کیا تھا جس سے مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی عظمت کی نفی ہوتی تھی۔ چنانچہ مسلمان مورخ کے لیے جو اہم مسائل تھے ان کا تعلق مسلمانوں کے تاریخی ورثہ کا دفاع تھا۔ انگریز اور ہندو مؤرخ محمود غزنوی کو ایک شاہی قزاق سمجھتے تھے اور اس کے برعکس مسلمان اسے مجاہد اعظم کے روپ میں اجاگر کرنے پر مُصر تھے۔ ڈاکٹر حبیب کانگرسی خیال کے تھے۔ انہوں نے محمود کے متعلق جو کتاب لکھی اس میں محمود کے حملوں کے سیاسی اور اقتصادی عوامل پر زور دیا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ محمود کے فوجی عزائم میں مذہب کو چنداں دخل نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے مذہبی جذبہ کو استعمال کیا۔ اس نظریہ کے برعکس ڈاکٹر ناظم نے محمود کی حمایت میں قلم اٹھایا اور اسے عظیم مسلم فاتح کی حیثیت سے پیش کیا۔ محمود کی بت شکنی متنازعہ ہوکر رہ گئی۔ اسی انداز پر اکبر اور اورنگ زیب پر بھی موافق و مخالف آرا کا اظہار کیا گیا۔ کانگرس پرست مورخین نے اکبر کو متحدہ قومیت کا نقیب قرار دیا بلکہ اس کی تاریخی عظمت سے بھی منکر ہو گئے۔ اسی طرح اورنگزیب کو اسلامی احیا کا علمبردار قرار دیا گیا۔ اس ضمن میں شبلی نے اورنگ زیب کی مذہبی رواداری کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے برعکس غیر مسلم مورخ اورنگ زیب کی ملکی اور مذہبی حکمت عملی کے سخت نقاد تھے افراط و تفریط کے اس عالم میں تاریخی حقیقت پسندی کو بہت نقصان پہنچا اور آج تک ہم ان تعصبات سے آزاد ہوکر تاریخی تحقیق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تاریخی محاذ آرائی اور مجادلہ کی فضا میں پروان چڑھے۔ وہ عملی سیاست میں بھی شامل رہے اور تحریک عدم تعاون میں بھی حصہ لیا۔ وہ متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ لیکن تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم مناقشات نے انھیں متحدہ قومیت کے متعلق اپنے خیالات کی اصلاح پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد جب وہ کیمبرج گئے تو چوہدری رحمت علی کی تحریک پاکستان سے متاثر ہوئے اور واپسی پر مسلم لیگ کے حامی و معاون بن گئے

ڈاکٹر قریشی کی تاریخ کا پہلا دور برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکومت سے متعلق ہے۔ ۱۹۴۲ء میں وہ بحیثیت مؤرخ متعارف ہوئے جب ان کی کتاب سلطنت دہلی کا ملکی نظام The Administration of the Sultanate of Dehli شائع ہوئی۔ اس وقت تک انگریز اور ہندو مورخین کی کتابیں رائج تھیں اور مستند سمجھی جاتی تھیں جن دنوں یہ کتاب شائع ہوئی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ مسلمان طالب علم بہت خوش ہوئے کہ کسی مسلمان مؤرخ کی کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی یہ کتاب ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کر دی گئی اور مجھے اس کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ نئے تاریخی مواد پر مبنی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ڈاکٹر قریشی نے ایسے تاریخی شواہد پیش کیے تھے جس سے سلطنت دہلی عالم اسلام سے مربوط نظر آتی تھی۔

انہوں نے ماوردی کی احکام السلطانیہ کے علاوہ دیگر معاصر کتب سے استفادہ کیا تھا چنانچہ سلطنت دہلی کے ملکی انتظام کے متعلق معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ وزیر تفویض اور وزیر تنفید کے اختیارات کا نئے انداز سے محاکمہ کیا گیا۔ یہ کتاب ڈاکٹر قریشی کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تھا جو خاصی

محنت سے لکھا گیا تھا۔

اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ڈاکٹر قریشی کی کتاب سلطنت مغلیہ کا ملکی نظام The Administration of the Mughal Empire تھی مغل تاجداروں اور مغل سلطنت پر کتابوں کی کمی نہ تھی انگریزی اور سندھ مورخین نے قابل قدر کام کیا تھا۔ بابر کی کئی سوانح انگریزی میں موجود تھیں اسی طرح ہر مغل حکمران کی مستند سوانح پر تحقیقی کتب وافر تعداد میں موجود تھیں۔ سر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر سیر حاصل علمی کام کیا تھا۔ آپ جادو ناتھ سرکار کے نقطہ نظر سے متفق نہ ہوں لیکن اس کی محنت اور تحقیق کی داد نہ دینا بے انصافی ہو گی۔ اسی طرح سے مغلیہ نظام کے مختلف پہلوؤں پر مثلاً اقتصادی نظام مذہبی حکمت عملی، فوجی نظام پر کتابوں کی کمی نہ تھی۔ اس ضمن میں مورلینڈ (Morland) سمتھ (V.A. Smith) شرما ایشوری پرشاد، بینی پرشاد، جادو ناتھ سرکار کے علاوہ دیگر غیر مسلم مورخین نے اپنے اپنے انداز سے نہایت بیش بہا کام کیا تھا۔ ڈاکٹر قریشی نے ان کتب سے استفادہ کیا اور ساتھ ہی فارسی زبان میں موجود بنیادی ماخذ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے اپنے نقطہ نظر سے مغل سلطنت کے نظام سلطنت پر بحث کی۔ گو ڈاکٹر قریشی نے بہت زیادہ نئی باتیں نہیں کیں تاہم انہوں نے ایک مسلمان مورخ کی حیثیت سے مغلوں کے ملکی نظام کا تجزیہ پیش کیا ہے فطری طور پر انہوں نے غیر مسلم مورخین کی آرا سے اختلاف کیا اور مدلل اور مستند انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر قریشی کی کتاب Akbar: The Founder of the Mughal Empire کو مغلوں کے ملکی نظام کی ایک کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ اکبر ہی مغلوں کے ملکی نظام کا بانی تھا۔ اکبر کی گوناگوں شخصیت سیاسی اور مذہبی اعتبار سے متنازعہ ہے جو مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی پر ہی انحصار کرتے ہیں ان کی نظر میں اکبر ملحد اور مشرک تھا۔ لیکن جو ملا عبدالقادر کی ذاتی رنجش کے پیش نظر دیگر ماخذ کو مناسب اہمیت دیتے ہیں ان کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ اکبر مشرک اور بے دین تھا یا نہیں اس کا حتمی فیصلہ تو محل نظر ہے البتہ ایک بات قابل غور ضرور ہے کہ اکبر کے سارے عہد حکومت میں نظام شریعت جاری رہا اور اسے معطل نہیں کیا گیا۔ اکبر کے متعلق ڈاکٹر قریشی صاحب کا نقطہ نظر عالمانہ ہے لیکن ان کے اخذ کردہ نتائج شاید مکمل طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

قریشی صاحب کی یہ تینوں کتابیں اس قدر وقیع ہیں کہ انھیں قرون وسطی کی مسلمان تاریخ کے ماہر کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور عصری تاریخ کی طرف کی۔ غالباً اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ تھی کہ وہ تحریک پاکستان کے سرگرم رکن رہے تھے اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ بحیثیت مورخ اور ماہر تعلیم انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی پر اغیار نے اپنے نقطہ نظر سے اس قدر فراوانی سے لکھا ہے کہ انہی کی رائے مستند سمجھی جانے لگی ہے۔ ضرورت اس چیز کی تھی کہ مسلمانوں کی کہانی ان کی اپنی زبانی پیش کی جائے۔ انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۶۵ء میں The Struggle for Pakistan لکھی۔ آپ نے انڈیا آفس کے شائع کردہ مواد سے کما حقہ فائدہ اٹھایا۔ اس کتاب میں وہ محقق کے علاوہ ایک Participant کے روپ میں بھی سامنے آتے ہیں۔ واقعات پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ صرف سیاسی اور سماجی محرکات سے ہی واقف نہیں بلکہ وہ اس پر ہنگامہ دور کے جذباتی مزاج سے بھی آشنا ہیں یہ کتاب اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں دوبارہ شائع ہوئی اور ۱۹۷۴ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن طبع ہوا گرچہ یہ کتاب مستند ہے لیکن ایک مخصوص مکتبہ فکر کی ترجمان ہے۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مکتبہ فکر کے داعی ہیں۔ چنانچہ جو تحریکیں یا لیڈر اس حلقہ سے باہر ہیں اس کتاب میں ان کا ذکر ناپید ہے۔ علی گڑھ کی تحریک کو ہی مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی واحد تحریک قرار دیا گیا ہے۔ یہ انداز فکر سراسر غلط نہ سہی، تمام تر درست بھی نہیں۔

ڈاکٹر قریشی صاحب کی کتاب Ulema in Politics ایک منفرد تصنیف ہے اس میں ۱۵۵۶ء یعنی اکبر کے زمانہ سے لے کر قیام پاکستان تک مختلف ادوار میں علما کے سیاسی کردار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ اس موضوع پر یہ پہلی وقیع تصنیف ہے اس سے پہلے محمد میاں کی کتاب علمائے حق کے سیاسی کارنامے موجود تھی نیشنلسٹ علما پر بھی لکھا گیا تھا۔ لیکن اتنے وسیع تاریخی تناظر میں یہ کتاب ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انگریزی دور میں دارالحرب اور دارالسلام کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولوی احمد اللہ جیسے صاحب نظر اور اہل سیف عالم کا حریت افروز تذکرہ ہے۔ جنگ آزادی میں شکست

کے بعد سیاسی اور معاشی مسائل مدرسہ دیوبند کا قیام اور کانگرس میں شمولیت جیسے موضوعات کا عالمانہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تحریک آزادی میں علما کی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے یہ ایک یادگار تصنیف ہے۔

تاریخ کے موضوع پر ان کی آخری بلند پایہ تصنیف

The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent (610-1947)

۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی سابقہ تصانیف اور تحقیق کا ماحصل اور اجمالی جائزہ ہے۔ تیرہ صدیوں کی تاریخ کا مختصر خاکہ ۳۴۹ صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے۔ برصغیر میں اسلام کی آمد سے لے کر ظہور پاکستان کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی عوامل و محرکات پر ماہرانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ یہ جنگوں اور بادشاہوں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ مسلمان قوم کے کارناموں مسائل اور عزائم کا تاریخی محاکمہ ہے۔ اختصار میں ایجاز سے کام لیا گیا ہے۔

بحیثیت مورخ ڈاکٹر قریشی کی شہرت کا انحصار ان چھ مستند کتابوں پر ہے ان میں سے تین کتابیں برصغیر کے قرون وسطی کی تاریخ یعنی دور سلطانی اور دور مغلیہ سے متعلق ہیں اور دوسری تین کتابوں میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد پر بحث کی گئی ہے ان دونوں اصناف میں ان کی ماہرانہ قدرت مسلمہ ہے ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے مضامین ہیں۔ تاریخ تعلیم پر کتاب ہے اور بحیثیت مدیر کام ہے لیکن سارا کام اس پائے کا نہیں ہے کہ اسے ان چھ کتابوں کے مقابل پلے میں رکھا جائے۔ قریشی صاحب نے نہایت اعلیٰ پائے کی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کا شمار شبلی اور سلیمان ندوی جیسے نامور مورخوں کے زمرہ میں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ان کے پایہ کا دوسرا مورخ نہیں ہے بلا جواز ہوگا جس طرح سے کسی شخصیت کی عظمت کے اعتراف میں بخل ناروا ہے

اسی طرح اس میں مبالغہ آرائی بھی چنداں مستحسن نہیں۔ ڈاکٹر جالبی صاحب قریشی صاحب کو "اس صدی کے عظیم مورخوں" میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "انہوں نے برعظیم پاک و ہند کی تاریخ مخصوص تاریخی شعور کے ساتھ اس انداز سے لکھی ہے جس انداز سے اسپینگلر نے ڈیکلائن آف دی ویسٹ Decline of the West یا ٹائن بی نے اے سٹڈی آف ہسٹری لکھی ہے"[1] معلوم ہوتا ہے کہ جالبی صاحب کا وفور عقیدت حقائق سے تجاوز ہے اس صدی میں کئی ایسے مورخ ہوئے ہیں جن کا کام ڈاکٹر قریشی سے کہیں زیادہ ہے اس لیئے انہیں عالمی سطح کے عظیم مورخوں کی صف میں کھڑا کرنے کی بجائے اگر برصغیر میں بیسویں صدی کا ایک نامور مسلمان مورخ کہا جائے تو قرین انصاف ہوگا رہا ٹائن بی سے موازنہ کا سوال تو یہ دور کی بات ہے۔ ٹائن بی نے ہیگل اور مارکس کے جدلیاتی نظریہ تاریخ سے ہٹ کر ایک نیا نظریہ تاریخ پیش کیا ہے جو ماضی کے بائیس تہذیبوں کے عروج و زوال کے تجزیہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ ٹائن بی کا نظریہ تاریخ ایک عہد آفرین کارنامہ ہے قریشی صاحب نے کبھی اس قسم کا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اس کا ادعا تھا۔ قریشی صاحب سے وہ عظمت منسوب کرنا جو ان کا حصہ نہ تھی قریشی صاحب جیسے اعتدال پسند مورخ سے زیادتی کے مترادف ہوگا۔ البتہ ان کی تحقیق کی اصابت اور افادیت واقعی قابل ستائش اور ہمارے فن تاریخ نویسی میں اعلیٰ درجہ کی حامل ہے۔

---

[1] جمیل جالبی۔ ڈاکٹر قریشی کی تاریخ نگاری کا ایک رخ۔ از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلد۔ کراچی ۱۹۸۶ء۔ صفحہ ۷۴

تعلیمی اداروں میں قومی ترانہ نمایاں جگہ پر لکھوانے کی ہدایت

لاہور (نامہ نگار) پنجاب بھر کے تمام سکولوں اور کالجوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں قومی ترانے کو اچھی جگہ پر نمایاں طور پر بڑے سائز میں لکھوائیں۔ اس امر کا اعلان حکومت پنجاب کے جاری ہونے والے ایک نوٹیفیکیشن میں کیا گیا ہے۔

روزنامہ جنگ لاہور ۲۷ - مارچ ۱۹۸۷ء

[illegible] قومی زبان [illegible] مذاکرہ

کراچی ۳۰ مارچ (سٹاف رپورٹر) مقتدرہ قومی زبان ذیلی دفتر کراچی کی جانب سے ایک مجلس مذاکرہ ۳۱ مارچ کی شام ساڑھے پانچ بجے سینما آڈیٹوریم میں منعقد کی جا رہی ہے جس کی صدارت [illegible] ضیاء الدین احمد کریں گے مقررین میں ڈاکٹر حنیف فوق ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری اور پروفیسر سحر انصاری شامل ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت کراچی ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء

خانیوال میں اردو کانفرنس

راولپنڈی ۲۰ مارچ (نمائندہ نوائے وقت) مجلس فروغ زبان اردو خانیوال کے زیر اہتمام ۶ اپریل کو خانیوال میں اردو کانفرنس ہوگی جس کا افتتاح گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی کریں گے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ء

سائنسی اور تحقیقی تصانیف کی حوصلہ افزائی

وزیراعظم محمد خان جونیجو نے پاکستان [illegible] کی بہترین سائنسی اور تحقیقی تصانیف پر تقسیم انعامات کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے سائنسدانوں نے جس حوصلے سے عصر حاضر کے چیلنج کو قبول کیا ہے اس پر حکومت ان کی بھرپور اعانت کرے گی تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت سائنسدانوں کو زیادہ فراخدلی کے ساتھ اعزازات دے گی۔ بہترین سائنسدان کو دو لاکھ روپے نقد انعام اور وزیراعظم گولڈ میڈل دیا جائے گا تحقیقی اور تخلیقی کتب کے بہترین مسودے پر ایک لاکھ روپے اور بچوں کی بہترین کتاب پر پچاس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکومت چار سال کے دوران شرح خواندگی کو دگنا کرنے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گی۔

وزیراعظم نے سائنسی اور تحقیقی کتب کے لئے انعامات کا جو اعلان کیا ہے ہمارے خیال میں اس کے بڑے مفید نتائج مرتب ہوں گے اور ہمارے سائنسدانوں اور اہل علم طبقے میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھے گا لیکن اگر اس کے ساتھ یہ پابندی بھی لگا دی جائے کہ انعامات صرف اردو تصانیف پر دیئے جائیں گے تو اس سے ملک اور قوم کا اور بھلا ہوگا۔ انگریزی یا بعض دوسری زبانوں میں ہر سائنسی موضوع پر کتب کا وافر ذخیرہ موجود ہے لیکن ان کتب سے صرف وہی طالب علم استفادہ کر سکتے ہیں جنہوں نے انگریزی زبان میں یہ علوم پڑھے ہوں اور انگریزی پر عبور رکھتے ہوں۔ سائنسی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے دوسرے خواہشمند لوگ ان سے قطعی استفادہ نہیں کر سکتے حالانکہ [illegible] وغیرہ کئی ایسے شعبے ہیں جن سے ایک عام پڑھا لکھا پاکستانی بھی واقفیت حاصل کرنے کا خواہاں ہو سکتا ہے اور [illegible] زبان میں [illegible] تو ان معلومات میں معقول اضافہ کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ ہمارے دانشور اور [illegible] انگریزی میں گفتگو کرنے اور انگریزی میں لکھنے پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں، [illegible] سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن انگریزی کی سائنسی اور تحقیقی کتب پاکستان کے عوام کی کوئی خدمت نہیں کر سکتیں [illegible] ان کا ہونا نہ ہونا ہمارے لئے ایک جیسا ہے۔

[illegible] فیصلہ [illegible] کہ اگر ہم انگریزی کو ناگزیر سمجھتے ہیں تو اسے بطور دوسری زبان کے ہمیں اپنانے میں تاخیر نہیں [illegible] کہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم دینے کی ابتدا مادری زبان کے ذریعے کی جانا چاہیئے۔ [illegible] تعلیم اردو [illegible] مادری زبان میں دینے کے بعد طالب علم کو اگلے درجے میں انگریزی کے ذریعے تعلیم دینا [illegible] ذریعہ تعلیم کی تبدیلی طالب علم پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے اور وہ نہ ادھر کا رہتا [illegible] تمام علوم کی تعلیم اس کی اپنی زبان میں ہی دینا چاہئے تو پھر اول سے آخر تک ذریعہ تعلیم [illegible] سائنسی تحقیق کے شعبے میں ہماری پسماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے پاکستانی سائنسی ذہن تیار نہیں کیا اور اردو میں سائنسی علوم کی تعلیم [illegible] انتظام نہیں کیا۔ اگر ہم اپنی اسی روش پر چلتے رہے تو ہم کبھی پاکستان میں سائنسی ذہن [illegible] رہے گی۔ ہمیں اس بارے میں قطعی فیصلہ کرنا چاہیئے اور بہت جلد کرنا چاہیئے [illegible] بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

روزنامہ مرکز اسلام آباد ۲۰-۳-۸۷ء

سی ایس پی پرنسپل

اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی حکومت چاروں صوبوں میں ایجوکیشن مینجمنٹ گروپ قائم کر کے محکمہ تعلیم میں انتظامی اور تدریسی شعبوں کو یکسر علیحدہ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہے اور اس تجویز پر عملدرآمد کے نتیجے میں پرنسپلوں اور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں کی آسامیوں پر سی ایس پی افسر تعینات کر دیئے جائیں گے۔

یہ ایک پرانی بحث ہے کہ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ شعبوں کے انتظامی امور انہی محکموں سے تعلق رکھنے والے افسروں کے پاس ہونے چاہئیں یا ان پر پی سی ایس اور سی ایس پی افسر مقرر ہونے چاہئیں۔ سی ایس پی افسروں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ تمام انتظامی عہدے انہی کی تحویل میں رہنے چاہئیں کیونکہ وہ انتظامی امور کے ماہر اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں جبکہ ٹیکنیکل شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو ٹیکنیکل معاملات کا علم تو ان سے زیادہ ہوتا ہے لیکن انتظامی امور میں چونکہ وہ خصوصی مہارت نہیں رکھتے اس لئے بطور انتظامی افسر وہ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ٹیکنیکل شعبوں کے افسران کا کہنا ہے کہ چونکہ ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے افسروں کو ٹیکنیکل امور سے واقفیت نہیں ہوتی اس لئے وہ ان محکموں کے لئے بہتر منتظم ثابت نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان خصوصی شعبوں کی انتظامیہ بھی انہی شعبوں کے افسروں پر مشتمل ہونی چاہئے۔ وہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں بیان کرتے ہیں جن میں میڈیکل انجینئرنگ اور تعلیم وغیرہ شعبوں کے تمام افسر انہی شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں۔ اور اس لئے یہ ٹیکنیکل شعبے قومی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جن ممالک میں انتظامی افسروں کو ٹیکنیکل افسروں پر برتری حاصل ہے وہ پسماندہ رہ جاتے ہیں اور وہاں یہ خصوصی مہارت کے شعبے اپنا رول صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے۔

پاکستان میں بھی کچھ عرصہ پہلے اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ خصوصی مہارت کے شعبوں میں انتظامی عہدوں پر اس شعبہ کے افسر متعین کئے جائیں گے۔ لیکن چونکہ وطن عزیز میں بیوروکریسی کو برتری حاصل ہے اس لئے اس کی طرف سے بار بار کوشش کی جاتی ہے کہ ٹیکنیکل شعبوں کی افسری بھی اس کے قبضے میں آ جائے۔ وفاقی حکومت کی تازہ ترین تجویز بھی اس پس منظر میں نظر آتی ہے المیہ یہ ہے کہ اس قسم کے فیصلے کرتے وقت قومی نفع نقصان کو سامنے رکھنے اور معروضی فیصلے کرنے کے بجائے ذاتی اور گروہی مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور جس طبقے کو بالادستی حاصل ہوتی ہے وہ اپنے حق میں فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر وفاقی حکومت کی اس تجویز کو تسلیم کر لیا گیا تو نہ صرف اس سے محکمہ تعلیم متاثر ہوگا بلکہ اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبوں میں بھی انتظامی عہدوں پر پی سی ایس اور سی ایس پی افسر قابض ہو جائیں گے۔ اس طرح ملک میں جو تھوڑی بہت پیش رفت ان شعبوں میں نظر آتی ہے وہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

تعلیمی اداروں کی سربراہی محض ایک انتظامی عہدہ نہیں ہے بلکہ پرنسپل اور طلبہ کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ ہونا چاہئے۔ اگر وفاقی حکومت کی تجویز منظور ہو گئی تو اساتذہ کا احساس محرومی احساس کمتری میں تبدیل ہو جائے گا۔

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۱۱-۳-۸۷ء

عالمی اردو کانفرنس کا اعلان

انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری جنرل جمیل الدین عالی نے ایک بیان میں کہا کہ انجمن نے اس سال دسمبر ۸۷ء یا آئندہ سال جنوری ۸۸ء میں ایک عالمی اردو کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں مختلف ممالک مثلاً بھارت، بنگلہ دیش، برطانیہ امریکہ، کینیڈا، افریقہ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور اسکنڈے نیویائی ممالک کے وفود شرکت کریں گے اور ان ممالک میں اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ہونے والے کام پر روشنی ڈالیں گے۔ اس موقع پر اردو کی ایک عالمی انجمن کے قیام پر غور کیا جائے گا۔ مذکورہ عالمی اردو کنونشن لاہور کراچی اور اسلام آباد میں سے کسی ایک شہر میں منعقد ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس میں غلام مصطفیٰ قاسمی ڈاکٹر جمیل جالبی، میر خلیل الرحمان، پروفیسر پریشان خٹک، شیخ منظور الٰہی اور معتمد اعزازی کنوینر شامل ہیں۔

جمیل الدین عالی نے کہا کہ انجمن نے ہر سہ ماہی میں پاکستان کے کسی ایک مشاہیر اہل قلم کی علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ہر جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آئندہ جن مشاہیر اہل قلم کو خراج تحسین پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ان میں ابو الفضل صدیقی، پروفیسر شریف کنجاہی، غلام مصطفیٰ قاسمی، امیر حمزہ خان شنواری، اور میر مٹھا خان مری شامل ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۱۶-۳-۸۷ء

میٹرک سائنس اور ریاضی کا امتحان انگریزی میں دینے کی اجازت ہوگی

بین الاقوامی ٹیلی فون کالوں کی شرح پر نظرثانی عالمی ... مواصلات یونین کے فیصلے پر کی گئی

ترقیاتی فنڈ جاری نہ کرنے پر آفتاب شاہ کی تحریک استحقاق کمیٹی کے سپرد

اسلام آباد ۱۴ مارچ (مانیٹرنگ ڈیسک) مواصلات کے انچارج وزیر نسیم احمد آہیر اور پارلیمانی سیکرٹری پرنس محی الدین نے آج قومی اسمبلی کو بتایا کہ بین الاقوامی ٹیلیفون کالوں کی شرح پر بین الاقوامی ٹیلی مواصلات یونین کے فیصلے کے مطابق نظرثانی کی گئی ہے پاکستان اس یونین کا ممبر ہے انہوں نے یہ بات استحقاق کی ایک جیسی تحریکوں پر تقریر کرتے ہوئے کہی جو شاہ تراب الحق، ملک محمد اسلم کھیڑا علامہ مصطفیٰ الازہری اور ملک عبدالرؤف پیش کرنا چاہتے تھے محرکین نے اس بیان کے بعد اپنی تحریکوں پر زور نہیں دیا ایوان نے آج جناب آفتاب شاہ کی تحریک استحقاق، استحقاق کمیٹی کے سپرد کر دی انہوں نے اپنی تحریک میں کہا ہے کہ وزارت ہدایات کی طرف سے منظور کی گئی ان کی ترقیاتی اسکیموں کے لئے فنڈ جاری نہیں کئے گئے ہیں شیخ رشید احمد نے وزیر تعلیم کی طرف سے ایوان کو یہ بتائے جانے کے بعد کہ حکومت میٹرک کے طلبہ کو اردو یا انگریزی میں امتحان دینے کی اجازت دینے کا ارادہ رکھتی ہے شیخ رشید احمد اپنی تحریک التوا پر زور نہیں دیا وزیر تعلیم نے کہا کہ یہ بھی تجویز ہے کہ صرف سائنس کے مضامین اور ریاضی میں میٹرک کے طلبہ کو انگریزی میں امتحان دینے کی اجازت ہوگی اور باقی مضامین اردو میں پڑھائے جائیں گے اور امتحان بھی اردو میں ہوگا میاں محمد زمان اور صاحبزادہ محمد احمد پنجاب میں ہتھیاروں کے لائسنسوں کے اجرا پر پابندی سے متعلق التوا کی دو ایک جیسی تحریکیں اور جناب لیاقت بلوچ قدیم لاہور میں تاریخی عمارتوں کے تحفظ سے متعلق التوا کی ایک تحریک پیش کرنا چاہتے تھے یہ تحریکیں اس وقت ملتوی کر دی گئیں جب وزیر داخلہ نے کہا کہ پنجاب کی حکومت کی طرف سے مکمل رپورٹیں حاصل کر کے ایوان میں پیش کی جائیں گے۔

روزنامہ نوائے وقت کراچی ۱۵-۳-۸۷ء

خود مختار اور نیم خود مختار اداروں کے ملازمین کو سرکاری ملازمین کے برابر پنشن اور دیگر مراعات دینے پر غور

اسلام آباد ۱۴ مارچ (نمائندہ خصوصی) حکومت خود مختار اور نیم خود مختار سرکاری اداروں کے ملازمین کو سرکاری ملازمین کے برابر پنشن اور دوسری مراعات دینے کی تجویز پر غور کر رہی ہے جن کا اعلان آئندہ بجٹ کے موقع پر متوقع ہے یاد رہے کہ اس وقت ملک میں ۹۶ کے قریب خود مختار اور نیم خود مختار ادارے حکومت کے تحت کام کر رہے ہیں ان میں سے صرف ۱۹ اداروں کے ملازمین کو پنشن اور گریجویٹی کی سہولت حاصل ہیں اس طرح سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین کے قواعد و ضوابط کو باقاعدہ سرکاری ملازمین کی سطح پر برابر کیا جا رہا ہے اس فیصلے کا اشارہ ہے کہ نیم سرکاری اور خود مختار اداروں کے وہ ملازمین جو باقاعدہ کیڈر کے تحت سرکاری ملازمین کی فہرست میں جانا چاہتے ہیں وہ دلجمعی کے ساتھ کارپوریشنل اور متعلقہ اداروں میں خدمات انجام دے سکیں گے

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۱۵-۳-۸۷ء

مکتوب جوہرآباد

رئیس صدیق ملک، نامہ نگار

مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی کا دورۂ جوہرآباد

- **انگریزی سے صرف پچاس فیصد علم حاصل ہو سکتا ہے۔ باقی پچاس فیصد جرمن فرانسیسی، جاپانی اور چینی زبانوں سے حاصل کرنا ہوگا۔**
- **ذریعہ تعلیم قومی زبان ہو، انگریزی کو لازمی ثانوی حیثیت سے پڑھایا جائے**
- **۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء میں ملک بھر میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جانا چاہیے**

مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی اور معروف ادیب ریٹائرڈ بریگیڈیئر گلزار احمد دو روزہ دورہ پر ۲۸ فروری کو جوہرآباد آئے جہاں انہوں نے متعدد تقریبات میں شرکت کی۔ ۲۸ فروری کو انہوں نے سرور شہید لائبریری میں دانشوروں کے اجتماع سے خطاب کے علاوہ مقامی صحافیوں کے ساتھ ایک خصوصی نشست کی یکم مارچ کو صبح دس بجے انہوں نے اردو مجلس گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے زیر اہتمام اردو کانفرنس سے خطاب کیا اور بعدازاں سہ پہر دو بجے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ضلع خوشاب نے ان کے اعزاز میں ایک علیحدہ تقریب کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مجلس اردو کی تقریب میں صدارتی خطبے کے دوران کہا کہ جب تک ملک میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہمارا تعلیمی انحطاط دور نہیں ہوگا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے طلبہ کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارا ملک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ مقتدرہ قومی زبان انگریزی پڑھنے کے قطعاً خلاف نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کا ذریعہ تعلیم اردو ہو اور انگریزی کو لازمی ثانوی حیثیت دی جائے کیونکہ انگریزی سے ہمیں صرف پچاس فی صد علم حاصل ہو سکتا ہے جب کہ باقی پچاس فی صد علم جرمن فرانسیسی، جاپانی اور چینی زبانوں سے حاصل کرنا ہوگا۔ اس لئے ہمیں ان تمام علوم سے مستفید ہونے کے لئے اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنا کر دیگر زبانوں کے تراجم اردو میں کر کے اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کرنے کے قابل بنانے پر توجہ دینی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ جس آسانی سے ہم اردو میں اپنا مافی الضمیر پیش کر سکتے ہیں دیگر کسی اور زبان میں ایسا ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک کے غریب طلبہ کی اکثریت انگریزی میں فیل ہو جاتی ہے جس سے وہ اعلیٰ ملازمتوں کے حصول میں ناکام رہتے ہیں جب کہ دوسری طرف امراء کا طبقہ جو انگلش میڈیم سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے وہ مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہو کر کلیدی عہدوں پر فائز ہو جاتا ہے جس سے طبقاتی تضاد پیدا ہوتا ہے اور ملک کئی مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ جب کہ ضرورت اس امر کی ہے۔ ملک سے طبقاتی کشمکش اور تضاد کو دور کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ غریب مگر ذہین طلبہ جو سرمائے کی کمی کی وجہ سے انگلش میڈیم اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وہ ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں اس کا موثر حل یہ ہے کہ حکومت فوری طور پر اردو کو ملک بھر میں ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرے۔ انہوں نے کہا اردو ذریعہ تعلیم ہونے کے بعد ملک میں نوجوان طلبہ کو سائنس دان بن کر ابھرنے میں آسانی رہے گی اور ملکی ترقی میں اضافہ ہوگا۔ انہوں نے عوام پر زور دیا کہ وہ اردو کو ملک میں ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے بھی طور پر کاوشیں کریں اور اپنے رہن سہن اور دیگر معمولات زندگی میں اردو کو قومی زبان کے طور پر استعمال کریں۔ قبل ازیں بریگیڈیئر گلزار احمد نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اردو زبان ہی کی وجہ سے لڑی گئی تھی جب کہ مملکت پاکستان کا قیام بھی اردو زبان کے رائج کرنے کے جھگڑے کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا اس لئے ہمیں غیروں کی زبان کو ترک کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہیے۔ اس موقع پر ڈپٹی کمشنر ناصر جاوید بسرا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان کی بقا اسلام اور اردو میں ہے اور پاکستان اسلام اور اردو نظام تعلیم کی وجہ سے ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اردو کی سرکاری اور رابطہ زبان قرار دینے کا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ضلع خوشاب میں تمام خط و کتابت اردو زبان میں ہوتی ہے اور قومی زبان کی ترویج اور فروغ پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے انہوں نے اس موقع پر اردو سیکشن کے لئے دس ہزار روپے

حسین شاہ، پروفیسر محمد مشتاق شوکت اور پروفیسر مظفر حسن منصور نے بھی خطاب کیا اور اردو کی افادیت اور اہمیت پر اپنے مقالے پیش کئے اور پرنسپل پروفیسر اعجاز حسین چودھری نے مہمان خصوصی کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی اور بریگیڈیئر گلزار احمد نے سرور شہید لائبریری میں صحافیوں سے بات چیت کے دوران اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ موجودہ حکومت اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں مخلص نظر نہیں آتی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے وفاقی وزیر تعلیم کو اپنے مطالبات پیش کئے اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر زور دیا مگر ان کے جواب نے ہمیں مایوس کیا وفاقی وزیر تعلیم نے کہا کہ اگر ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیں اور انگریزی کو ثانوی حیثیت دے دیں تو پوری قوم بالخصوص نئی پود کلرک اور چوکیدار بن جائے گی اور کوئی بھی شخص کسی کلیدی عہدہ کے قابل نہیں بن سکے گا حالانکہ ہم نے واضح کر دیا تھا کہ ہم انگریزی علم کے قطعاً خلاف نہیں لیکن حکومت کے عزائم وفاقی وزیر تعلیم کے ریمارکس سے واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ بعدازاں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کی تقریب میں شرکت کے دوران صدر بار ایسوسی ایشن حافظ خان محمد مائل نے مہمانان خصوصی کو خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب اور بریگیڈیئر صاحب کی ذات گرامی کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں بابائے اردو مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد اردو کی ترویج و ترقی کے لئے آپ کی خدمات قابل صد تحسین ہیں۔ اس موقع پر بریگیڈیئر گلزار احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس امر کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ آئندہ پندرہ سالوں میں ملک بھر میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے گا۔ لیکن اب ان پندرہ سالوں میں سے صرف ایک سال باقی ہے لیکن اس جانب کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ حکومت کی پالیسی سے اردو دان طبقہ کو بے حد مایوسی ہو رہی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت ملکی استحکام اور بقا کے لئے قومی زبان اردو رائج کرنے کے لئے خصوصی اقدامات کرے۔ ڈاکٹر پروفیسر وحید قریشی نے اعداد و شمار کی روشنی میں اردو کے فوائد پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ قبل ازیں ممتاز شاعر علامہ جوہر نظامی نے غزل پیش کی جسے بے حد پسند کیا گیا۔

مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی جوہرآباد میں ایک خصوصی نشست میں اظہار خیال کر رہے ہیں

اردو اور نظامِ تعلیم

گزشتہ دنوں معروف ادیب و دانشور اور شیخ الجامعہ کراچی جناب جمیل جالبی نے جسارت کو انٹرویو دیتے ہوئے نظامِ تعلیم کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ۹۰ فیصد طلبہ کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے صرف دس فیصد طالب علم فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمارے ملک میں تعلیم کی شرح نہ بڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اپنی زبان میں تعلیم نہیں دی جا رہی اور انگریزی ابتدا سے پڑھنے کے باوجود لوگ اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتے۔ جس کے نتیجے میں نہ انگریزی آتی ہے اور نہ اردو۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے طالب علم پر کسی نئے علم کی باریک پہلو اور بنیادی تصورات واضح نہیں ہوتے۔ یہی نظام تعلیم رہا تو اس سے ہم کبھی بھی کوئی تخلیقی ذہن حاصل نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے گریز کا سبب من حیث القوم احساسِ کمتری کو قرار دیا ہے۔

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے کہ جہاں ۴۰ سال گزرنے کے بعد بھی اب تک قومی زبان اور ذریعہ تعلیم کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ پاکستان اس اعتبار سے کوئی نرالا ملک نہیں جہاں علاقائی سطح پر کئی زبانیں بولی جاتی ہوں، دنیا میں اور بہت سے ایسے ملک ہیں جہاں پاکستان سے بھی زیادہ زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر ملک کی اپنی قومی زبان ہے اور اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ یہاں ایک عجیب تماشا ہے کہ حکومت کی طرف سے بار بار اعلان کے باوجود اردو اب تک اپنے ہی دیار میں بے گھر ہے۔ حالانکہ بانیٔ پاکستان اور بابائے قوم حضرت قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ "میں واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ جو شخص آپ کو اس سلسلے میں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے وہ "پاکستان کا پکا دشمن" ہے۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

یہی نہیں بلکہ ۷۳ء کے آئین میں بھی یہ طے کر دیا گیا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور ۸۸ء تک پورے ملک کی دفتری زبان اردو کر دی جائے گی۔ لیکن دوسری طرف ۹ فروری کو ہماری قومی اسمبلی میں چند فاضل ارکان اور عوامی نمائندے اردو زبان کے سلسلے میں قوم کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے اور سوال کیا کہ اردو کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے کیوں مسلط کیا جا رہا ہے اور کون کہتا ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر کی اہلیہ اور پنجاب سے تعلق رکھنے والی خاتون رکن محترمہ سیدہ عابدہ حسین نے ارشاد فرمایا کہ "اردو کو قومی زبان کی حیثیت دینے کی منطق کیا ہے۔ جبکہ پاکستان میں ۹۰ فیصد بچوں کو حصولِ تعلیم کے لئے اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان اختیار کرنا پڑتی ہے۔" کوئی اور زبان سے ان کی مراد اردو ہے اور انہوں نے بھی بات وہی کہی ہے جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہی تھی مگر کسی اور ڈھنگ سے اور کسی اور سیاق و سباق میں۔ سیدہ عابدہ حسین کے ضمن میں ہم نے پنجاب کا حوالہ خاص طور پر اس لئے دیا ہے کہ اب تک یہ صوبہ اردو کو قومی زبان بنانے اور بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنے میں سب سے آگے رہا ہے اور عملاً بھی اس صوبہ میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ پنجاب کے چھوٹے چھوٹے اسکولوں میں بھی تعلیم اردو ہی میں دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس صوبے کے کسی نمائندے کی زبان سے اردو کی مخالفت یقیناً مزید افسوسناک ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض ارکانِ اسمبلی کو انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل ہے کہ وہ سوچتے بھی انگریزی ہی میں ہیں، لیکن اس سوچ کی ضرورت لارڈ میکالے کو تھی اور اس کی افادیت ایک خاص معنی میں تقسیم برعظیم سے پہلے تک تھی، اب نہیں ہے اور بقول ڈاکٹر جمیل جالبی دنیا کے کسی بھی ایسے ملک میں جہاں قومی زبان میں تعلیم نہ دی جاتی ہو وہاں کوئی بین الاقوامی معیار کی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ دراصل انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر مسلط رکھنے اور اس کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت وہی ۱۰ فی صد تعلیم یافتہ طبقہ کرتا ہے جو صرف اس زبان کے سہارے قوم پر مسلط ہے اور جسے خطرہ ہے کہ اگر یہ رکاوٹ دور ہو گئی تو قوم کا صحیح معنی میں ذہین عنصر بڑی تیزی سے چھا جائے گا جو اس وقت محض انگریزی پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے ابھر نہیں سکا۔ ہمارے ملک میں ماسٹرز کی ڈگری رکھنے والوں میں سے بھی بیشتر ایسے ہیں جو صحیح طور پر انگریزی لکھ پڑھ اور بول نہیں سکتے۔ ایسے لوگوں نے اس زبان میں کیا تعلیم حاصل کی ہوگی، یہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ کیا ہمارے حکام، دانشور اور عوامی نمائندے قوم کو مستقل طور پر جہالت میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قوم کو مربوط رکھنے کے لئے زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور پاکستان میں یہ شرف صرف اردو کو حاصل ہے جو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۹-۳-۸۷ء

ملکی استحکام کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے

لاطینی اصطلاحات کو اصل تلفظ کے ساتھ اپنا لینے کی تجویز

لاہور ۱۳ مارچ (رپورٹر) جامعہ اسلامیہ کالج آف کامرس لاہور کے زیر اہتمام تحفظ اردو کانفرنس کے حوالے سے ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت پنجاب یونیورسٹی کے سائنس کے معروف سکالر پروفیسر ایمریطس ڈاکٹر محمد بشیر گورایہ مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ وطن عزیز کی سالمیت استحکام اور ترقی کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے۔ پروفیسر عارف عبد المتین نے اس بات پر زور دیا کہ طلباء کو تعلیم خصوصاً سائنس اور فنی تعلیم کی تدریس اردو زبان میں کی جائے اور [illegible] اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی بجائے انہیں اصل زبان کے تلفظ کے ساتھ اپنا لیا جائے۔ اختر کاشمیری، بیمار سرمد، نیاز حسین لکھویرا اور ظفر منصور نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ صدر تقریب نے کہا کہ انگریزوں نے بھی سائنسی تعلیم تدریس کے لئے یونانی اور لاطینی اصطلاحات کو اصل تلفظ کے ساتھ اپنی تعلیم کا حصہ بنایا جو بظاہر نامانوس لگتی تھیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد بشیر گورایہ نے کہا کہ انجینئرنگ، سائنس، کامرس ہر طرح کی تعلیم کے لئے اردو اپنے دامن میں وسیع ذخیرہ الفاظ رکھتی ہے اور حکومت کو اس ضمن میں کسی تاخیر کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ظفر منصور نے تقریب کے آخر میں قرارداد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں ۱۹۸۹ء [illegible] کے امتحانات اردو میں لینے کا وعدہ پورا کرے اور آئندہ تعلیمی سال کے تمام امتحانات اردو زبان میں لینے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

روزنامہ امروز لاہور ۵-۳-۸۷ء

تحریر: سید سردار احمد پیرزادہ

تحریک فروغ اردو میانوالی کے زیر اہتمام "قومی یکجہتی میں اردو کا کردار" کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ مذاکرہ کی صدارت تحریک فروغ اردو میانوالی کے صدر شرر صہبائی نے کی۔

خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے میانوالی تحریک کے سینئر نائب صدر اول انجم جعفری نے کہا کہ میانوالی جیسے دور افتادہ علاقہ میں اس مذاکرہ کا انعقاد یقیناً عوام کی اردو سے محبت کو ظاہر کرتا ہے انہوں نے مہمان خصوصی ڈاکٹر وحید قریشی کی سرپرستی میں ملک میں فروغ اردو کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو سراہا سید محمد فیروز شاہ نے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے تحریک پاکستان کی بنیاد جن دو عناصر پر تھی وہ مذہب اور زبان تھے یعنی پاکستان کا مذہب اسلام ہو گا اور سرکاری و قومی زبان اردو ہو گی جب بلوچی، سندھی، پنجابی یا کسی دوسرے علاقے کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تو صرف اردو ان کے درمیان گفتگو کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اس اعتبار سے اردو یکجہتی کا وسیلہ ہے

سید اقبال حسن کاظمی، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میانوالی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ یونیسکو اقوام متحدہ کی ایک جائزہ رپورٹ کے مطابق اردو دنیا میں تیسرے نمبر پر بولے جانے والی زبان ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اردو سے زیادہ اسلامی کتب موجود نہیں ہیں انہوں نے کہا کہ مقبول مہاتما گاندھی اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی طرف سے مہمان مقالہ نگار ڈاکٹر بشیر سیفی نے اپنے مقالے میں کہا کہ اگرچہ صوبائی زبانوں کی اہمیت مسلم ہے اردو بہر لحاظ سے فعال اور ترقی پذیر ہیں مگر تمام علاقائی اور صوبائی زبانیں اپنے اپنے صوبے تک محدود ہیں یہی نہیں بلکہ صوبوں کے اندر بھی لسانی اختلافات موجود ہیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اردو کسی صوبے کی زبان نہیں مگر اس کا رشتہ تمام صوبوں سے ہے اور اس کی جڑیں تمام علاقائی زبانوں میں موجود ہیں چونکہ اردو کی لسانی تشکیل میں تمام علاقائی زبانیں شامل ہیں اس لئے اردو کو علاقائی زبانوں کا حریف نہیں سمجھنا چاہئے اردو کے فروغ سے علاقائی زبانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ میانوالی تحریک فروغ اردو کے رکن علامہ ابو المعانی عصری نے "اردو" کے عنوان سے ایک نظم پیش کی۔

بعد ازاں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے مذاکرہ میں شامل دوسرے مہمان مقالہ نگار عطش درانی نے اپنے خیالات کا اظہار اللہ کے اس فرمان سے کیا جس میں کہا گیا ہے کہ "جو کہتے ہیں سوائے بے قیمت پر پورا کرو" انہوں نے کہا کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت دلوانے کا وعدہ ملک کے آئین میں کیا گیا ہے مگر اسے یہ حیثیت ابھی تک نہیں دی جا سکی۔ انہوں نے انگریزی کی علمی اور علمی وسعت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ ملک جن کی علمی زبان محض انگریزی ہے دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں کیونکہ دنیا کا پچاس فی صد علم اب انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں پایا جاتا ہے۔

جہاں تک دفاتر میں نفاذ اردو کا تعلق ہے حکومت پاکستان نے ۱۹۷۹ء میں جس ادارے یعنی مقتدرہ قومی زبان پاکستان کی بنیاد رکھی تھی وہ اپنی رپورٹ کر کے حکومت کو پیش کر چکا ہے۔ دفتری اصطلاحات دفتری خط و کتابت اور دیگر تمام ضروری مواد تیار ہے یعنی مسئلہ صرف نیتوں کا ہے اس

...صاری نے "اردو" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار چند اشعار میں کیا اور نظم پڑھی مذاکرہ کے اگلے مقرر پروفیسر ڈاکٹر غلام سرور خان نے کہا کہ اردو اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں اور یہ زبان شروع ہی سے مسلمانان ہند کی میراث رہی ہے مغل درباروں کی سرکاری زبان اگرچہ فارسی تھی مگر عوامی زبان اردو ہی تھی اردو وہ واحد زبان ہے جس میں دوسری زبانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے یہ علاقائی زبانوں کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے۔

ظفر اقبال نیازی نے اپنی نظم "اردو" حاضرین کو سنائی۔

موتمر عالم اسلامی پاکستان کے ممبر اور مشہور ادیب بریگیڈیئر گلزار احمد نے "قومی یکجہتی میں اردو کا کردار" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غیر منقسم ہندوستان میں اردو اور پاکستان دونوں مطالبات ساتھ ساتھ رکھے گئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا جزلا ینفک تھے لیکن پاکستان حاصل کر لینے کے بعد اس کے لازمی حصے "اردو" کو ٹالا جا رہا ہے ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ اردو کو فی الفور نافذ کیا جائے حکومت جس انداز سے اردو کے نفاذ میں اقدامات کر رہی ہے وہ سراسر غلط ہے کیونکہ حکومت کا اس مسئلے کو طول دینا اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہونے کے مترادف ہے تمام سائنسی مضامین اردو میں ترجمہ کر کے پڑھانے چاہئیں۔ جس شخص کا اردو سے کوئی واسطہ نہیں اس کا پاکستان پر کوئی حق نہیں۔

اس کے بعد تقریب کے صدر شرر صہبائی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی میڈیم کو اختیاری قرار دے کر حکومت انگریزی کی پذیرائی کر رہی ہے اور انگریزی میڈیم کے طلبہ کو اردو میڈیم پر فوقیت دلوا رہی ہے اردو کے سلسلے میں ان تمام سازشوں کے پیچھے بیورو کریسی کا ہاتھ ہے۔

آخر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر وحید قریشی، صدر نشین "مقتدرہ قومی زبان نے خطاب کیا انہوں نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ قومی یکجہتی کی ضرورت جو اب ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی جب کوئی مسئلہ طوالت اختیار کرے تو بگاڑ پیدا ہوتا ہے ہماری طویل پالیسیاں بار بار بحران کی طرف لے جاتی ہیں ہماری تعلیمی پستی ایک دن میں نہیں چالیس برسوں میں محیط ہے۔ ہر سیاسی گروہ نے اسے لسانی بنا کر پیش کیا گیا اس کی واضح مثال بلوچستان ہے جہاں آج سے کچھ عرصہ پہلے لسانی تعصب ابھر رہا تھا جب ان لوگوں کے بنیادی مسائل حل ہوئے تو وہاں اکثریت اردو کے حامیوں کی نکل آئی سندھ کا مسئلہ بھی اصل ان مسائل پر توجہ کا مرہون منت ہے جو سندھی شہری کو درپیش ہیں مگر ہم نے اس کو لسانی مسئلہ بنا کر انداز اپنایا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ ہم انگریزی قطعاً مخالف نہیں بلکہ انگریزی ذریعہ تعلیم کے مخالف ہیں چاہتے ہیں کہ انگریزی کو اختیاری مضمون قرار نہ دیا جائے بلکہ اسے بطور لازمی مضمون تدریسی اداروں میں پڑھایا جانا چاہئے اور ذریعہ تعلیم صرف اردو ہی ہو تاکہ یکساں نظام رائج ہو سکے انہوں نے کہا کہ وہ ۱۹۰۰ کے بعد پوری علم کا دھاکہ ہو چکا ہے اور اب صرف انگریزی وہ واحد زبان نہیں جو پورے علم پر محیط ہو اس لئے اسے پاکستان میں ثانوی زبان کی حیثیت دی جانی چاہئے مقابلے کے امتحانات میں معیاری طور پر وہ ذریعہ اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے جس میں طلبہ نے یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اگر اس کا ذریعہ تعلیم سندھی ہے تو اسے سندھی میں مقابلے کا امتحان دینے کی اجازت دی جانی چاہئے متوسط طبقہ کے افراد بھی اعلیٰ ملازمتوں تک رسائی حاصل کر سکیں جب کہ آج کل گریڈ ۱۷ سے گریڈ ۲۲ تک کی ملازمتیں انگلش میڈیم افراد کا حق سمجھی جاتی ہیں۔

تقریب کے اختتام پر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی جانب سے فروغ اردو کے سلسلے میں شائع شدہ کتب حاضرین میں تقسیم کئے گئے۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۹-۳-۱۹۸۸ء

Ethnicity, language and autonom

Ethnicity and linguistic identity have acquired salience in the politics of Pakistan. These are gradually emerging as the important bases of group solidarity and vehicles for popular mobilisation. The serious riots in Karachi and Hyderabad in the last quarter of 1986 and January 1987 can be described as the new style of politics which is mounting pressures on the national/federal framework.

There are several other trends in our politics which are likely to crystallise in the future, unless a new equilibrium is found amongst the old and the new contending political approaches and groups. The concept of nationalities and their rights has caught on a large section of population in the smaller provinces and it evokes enthusiasm amongst the youths/students and a section of intellectuals. The original concept of four nationalities is being stretched to accommodate the aspirations for group-identity expression by others (i.e. Mohajir, Seraiki). There are several proposals of redrawing the provincial boundaries so as to rectify the imbalance in size and resources, make these administratively more manageable, and accommodate the identities of some sub-national groups. Confederation has become a political currency for some political groups, although the confederal model advocated by these groups suffers from ambiguity. They often use it as a synonym to a loose federation with a centre enjoying very limited powers. Still others talks in terms of separatism.

EMERGING TREND

These trends are indicative of the fact that the political process is not moving in the direction of consensus building or aggregation. Rather, polarisation and fragmentation of the process appear to be the emerging trend. Instead of a nation-wide political process attracting the linguistic, ethnic and regional groups and encouraging political alignments across these discontinuities, it is keeping these political entities at the periphery or it is endeavouring to bypass them. This encourages alienation, reinforces the threat perception of these groups/identities and makes them more inward looking in their disposition.

Federal system was adopted ostensibly to accommodate the regional personality but in practice the system manifested unitary trends. The federal spirit was

By DR. HASAN-ASKARI RIZVI

diluted by the adoption of the Vice-regal style of administration which assigned premium to "administer, control and regulate" *rather than participation in the* decision-making process. A narrow based and entrenched elite dominated the national as well as provincial decision-making process which reinforced the colonial heritage of centralised system.

This created resentment and alienation in the regional/local elite who began to perceive a dual threat: the chances of their upward mobility were restricted except through their co-option by the dominant elite. The positions of power and authority in their province and district were also dominated by the nationally-dominant elite — the colonial elite was replaced by another set of elite which did not identify with them and was colonial in style. This created a feeling amongst the regional/local elite that it was not merely the positions of power at the national level which were "denied" to them but the same dominant elite was controlling their local affairs.

The denial of a role or participation to these elements in the national political process may contribute to preserving the political status quo but, in the long run, this policy will be counter productive. These groups may not be in a position to create a nation-wide alignment to counter the power elite because of the narrow-based and segmented disposition of each of these groups, but they will, given the persistence in the national power arrangements, endeavour to delink themselves from the national framework. They will start viewing the national parameters as their adversary, if some of these groups are not already thinking on these lines.

SMALLER IDENTITIES

This raises a fundamental question. Why are those groups falling back on the smaller identities which has multiplied the problem of management for the national power elite? Pakistan comprises distinct linguistic and cultural/regional groups the roots of whose identities go back in history. These groups established mutual relevance in the pre-independence period in the wake of the shared threat of being dominated by an unsympathetic majority. They worked together under the banner of the Muslim League for the establishment of Pakistan in order to secure a better future in a partnership with all those engaged in the struggle for independence. While engaged in the Pakistan Movement, the linguistic and ethnic groups maintained their identities but their political relevance declined in that political context.

Soon after independence, these groups began to manifest their attachment with their linguistic/ethnic and cultural identities which came in conflict with the policy of the ruling elite designed to create a monolithic and all-embracing abstract Pakistani identity by discarding all other attachments or identities.

LIMITED SYSTEM

The limited or non-participatory system enabled the military-bureaucratic elite to tailor the political arrangements to protect their position. They also created ground rules of politics to their advantage which accentuated alienation amongst those who were either excluded or were given a minimal role in decision-making.

These policies intensified pressure for autonomy, provincial right, linguistic or ethnic identity because these groups now perceived threats from within the federation rather than from the outside of the political system. This increased the political relevance of these identities which shaped into the symbols and vehicles of political expression of these groups.

Given the pluralist nature the society and the growing as tivonoss of tho ethnic, lingui and regional identities and o particularistic attachments, issues will be central to political and constitutional arra ment. One, provincial rights autonomy in letter and spirit to extent that most of the gro consider the arrangement to b satisfactory starting point. T decentralisation of decisi making and the administra system. Autonomy and provin rights are meaningless unless decision-making power is shifte provinces in a reasonable quant Similarly, the execution of s policies should be entrusted provincial and local elite. administrative and finan controls of the federal governm should also relax.

STRATEGIES

Any meaningful effort achieve these goals will invo political, economic and cult strategies. On the political fro a participatory system wh provides ample opportunity to regional/local elite and interest become an integral part of national mainstream will be ins mental to building a stable pol Unless the provincial/local e have the opportunity to move in the political system thro popular support, their stake in national political system will minimal.

On the economic front, provinces need financial autono and the system must strive establishing an egalitarian soc economic order. The cultu strategies need to be aimed at giv a clear recognition to these ide ties. A pluralist and accommoda policy towards Pakistan langua and cultural identities will enr our culture and society. Th policies will promote inter-gro and inter-province confiden facilitate nation-wide polit alignments, and thus strengthen national polity.

اردو سرکاری دفاتر میں اپنا مقام حاصل کر رہی ہے

رپورٹ۔ مسرّت اکرم

اردو کے فروغ کے سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل اسٹاف ویلفیئر اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی جانب سے وفاقی حکومت کی سطح پر اردو ٹائپ رائٹنگ اردو مختصر نویسی کا مرکز قائم کیا گیا ہے۔ جہاں پندرہ بیس کے قریب اردو ٹائپ رائٹر رکھے گئے ہیں گزشتہ دنوں اس کی افتتاحی تقریب ہوئی جس میں مختلف وفاقی اداروں کے ملازمین کے علاوہ اسٹاف ویلفیئر کے افسران اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کراچی ریجن کے ڈائریکٹر جناب نظر کامرانی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے جناب نظر کامرانی نے اسٹاف ویلفیئر کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے سلسلے میں یہ مرکز اہم کردار ادا کرے گا۔ ہماری شناخت اردو ہے ہمیں اس پر عبور حاصل ہونا چاہیئے کیونکہ ایک درخشاں مستقبل ایسے افراد کا منتظر ہے جو یہ فن سیکھ لیں گے۔ اردو مختصر نویسی، وقت کی اہم ضرورت ہے جس پر توجہ دینا بہت ضروری ہے

اس کے علاوہ تقریب سے سینئر انسٹرکٹر، اسٹاف ویلفیئر عاشق، محمد افضل نے بھی مختصر خطاب کیا۔

ابھی تک اردو کی ترویج کا پلان فائلوں کی حد تک تھا۔ اس مرکز کے قیام سے یہ امید ہو چلی ہے کہ سرکاری دفاتر میں اردو فروغ پائے گی کیونکہ ہر ادارے کے کلرک اور ٹائپسٹ حضرات اس کورس میں شامل کئے جائیں گے۔ اس طرح یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ ملک میں اردو مختصر نویسی میسّر نہیں۔

ہمیں انگریزی سے کوئی دشمنی نہیں لیکن جب ہم دوسرے ممالک کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ملک اپنی قومی زبان میں بات کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ جب کہ پاکستان کو وجود میں آئے ۴۰ سال ہو گئے۔ مگر اردو کو وہ مقام جو ملنا چاہیئے نہیں ملا۔ البتہ یہ چرچا ضرور ہے کہ ہماری قومی زبان اردو ہے۔ فائیل اٹھا کر دیکھیں تو انگریزی خطوط کی بھرمار ہے۔ خواہ کسی کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں جبکہ سرکاری دفاتر میں زیادہ تر کم گریڈ میں کام کرنے والے افراد انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔ وہ انگریزی میں جاری کئے جانے والے اظہار وجوہ کے نوٹس یا کسی بھی سرکاری خط کا انگریزی میں جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ ہمارے یہاں نفسیاتی ہے۔ یعنی جب تک دو چار انگریزی کے جملے ادا نہ کر لئے جائیں یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں پر تعلیم یافتہ ہونے کی دھاک نہیں بیٹھتی۔ یہی نہیں بلکہ اعلیٰ افسران بھی ایسے افراد کو اس بنا پر ترقی دیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جو انگریزی پر عبور نہ رکھتے ہوں

زبانیں سیکھنا بہت اچھی بات ہے۔ تاکہ جہاں کہیں ضرورت پڑے اپنے ملک کی نمائندگی بہتر انداز میں کر سکیں ہم اس اقدام پر ڈائریکٹر جنرل جناب آغا قیصر زیدی کے اس انداز فکر پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے سرکاری سطح پر اردو کے فروغ میں پہلا پتھر پھینکا۔ اس مرکز کے قیام سے جمود ٹوٹے گا۔ اور اردو سرکاری دفاتر میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

روزنامہ حریت کراچی ۲۲ - ۳ - ۱۸۷

اردو کو بی اے تک لازمی قرار دیا جائے

مقتدرہ قومی زبان سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم نے کہا کہ انگریزی میں چونکہ سب سے زیادہ طلباء فیل ہوتے ہیں اس لئے نئی تعلیمی پالیسی میں انگریزی کو اختیاری مضمون بنا دیا جائے گا وزیر تعلیم کے اس حقیقت پر مبنی تجزیاتی بیان کا اساتذہ طلباء اور قومی اکابرین دانشور بھرپور خیر مقدم کریں گے کیونکہ ہمارے تعلیمی انحطاط کا بڑا سبب انگریزی مضمون کا لازمی ہونا ہے حالت یہ ہے کہ بی اے تک انگریزی پڑھنے پر بھی طالب علم میں اس زبان میں واجبی سی دسترس اور مہارت بھی پیدا نہیں ہوتی اپنے مافی الضمیر کا اظہار تو کیا انگریزی میں درخواست برائے ملازمت لکھنے کی اہلیت بھی پیدا نہیں ہوتی جب اس زبان پر عبور کی یہ کیفیت ہے تو اسے لازمی رکھنے میں کیا افادیت ہے اور کیا منطق ہے حقیقت پسندی اور قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ محکمہ تعلیم قومی زبان اردو کو بی اے کی سطح تک لازمی کرنے پر فوری غور و خوض کرے اردو یک زبان ہی نہیں ہماری تاریخ تہذیب اور ماضی ہے جس کے آئینے میں ہم اپنے روشن مستقبل کی جھلک دیکھ سکتے ہیں پشاور سے کراچی تک مکمل طور پر ہمیں اپنے آپ کو اردو زبان سے منسلک کرنا چاہئے تاکہ اس کے نتیجے میں قومی سوچ پیدا ہو ایسا نہ ہو کہ ہماری آئندہ نسلیں بھی یہی بحث کرتی رہیں کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو یا اردو حکومت عالیہ کو اس نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے انگریز کی پیدا کردہ نوکر شاہی کی گرفت پر زیادہ مضبوط نہیں رہی زیادہ تر دفتری اور عدالتی کام اب اردو میں بخیر و خوبی سر انجام دیا جا رہا ہے پاکستان کی انتظامیہ مقننہ [illegible] انجینئرز دفتری اہلکار غرض ہر طبقے کو فرائض منصبی ادا [illegible] اور رابطہ عوام کے لئے انگریزی کی بجائے قومی زبان [illegible] میں مہارت تامہ کی اشد ضرورت ہے لہٰذا اس کی لازمی تدریسی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اردو کو بی اے تک [illegible] قرار دینا وقت کی اہم ضرورت ہے گورنر پنجاب نے مقتدرہ قومی زبان سیمینار میں کہا کہ اردو پاکستان اور اسلام کا دوسرا نام ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو کہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق افسران محکمہ تعلیم پنجاب کے ایک اجلاس میں غور فرمایا گیا کہ انٹرمیڈیٹ سے لازمی اردو کو اختیاری مضمون بنا دیا جائے ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے یہ کس قدر افسوسناک ریورس گیئر ہو گا کیا حکام محکمہ تعلیم پنجاب کا اردو کے بارے میں منفی رویہ حکومت عالیہ کی اردو نواز پالیسی سے کوئی مطابقت رکھتا ہے حکومت عالیہ کی پالیسی کے مطابق افسران محکمہ تعلیم کو چاہئے کہ اردو کی تدریس ترقی اور ترویج کے لئے مؤثر مثبت اقدامات کرے اردو لازمی کو انٹر سے خارج کرنے کی بجائے اردو کو بی اے تک لازمی کرے

(پروفیسر رانا شمشیر خان مرے کالج سیالکوٹ ڈویژن صدر پی پی ایل اے گوجرانوالہ ڈویژن)

روزنامہ مشرق لاہور ۲۹-۳-۱۸۷

اردو ہماری قومی زبان کب بنے گی؟

تحریر: عشرت رحمانی

جو لوگ اپنی قومی زبان پر غیر ملکی زبان کو ترجیح دیتے ہیں باعث ننگ ہیں

دراصل اردو زبان سرکاری دفاتر میں پوری طرح رائج نہ ہونے کا اصل سبب ہمارے ملک کی وہ بیورو کریسی ہے جو اردو سے پوری طرح واقف نہیں اور انگریزی زبان کی برتری و بالا دستی کی معترف ہے کیونکہ ہمارے اکثر اعلیٰ حکام و افسران بالا ... میں مردہ اور لنگڑی زبان سمجھتے ہیں اور اپنی ... کو چھپانے نیز عوام کو انگریزی کے ذریعہ مرعوب کرنے کی غرض سے اردو زبان کو سرکاری دفاتر میں عام رواج دینے سے گریز کرتے رہے ہیں یعنی ہمارا افسر شاہی طبقہ (چند) اردو زبان کو غلامی کی اور انگریزی زبان کو حاکموں کی زبان سمجھ کر اپنی قومی زبان کی دفتری اصطلاحات سے وقوف حاصل کرتا اور اردو ادب کا مطالعہ کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے اور ہر عہد کی حکومت کو اسی لئے مختلف حیلوں بہانوں سے بعض دشواریوں کا ذکر کر کے مستقبل بعید پر بات ٹال دیا ہے البتہ چند اعلیٰ حکام جو خود مسلمات اردو ادب اور علم و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ پورے خلوص سے اردو زبان کو دفتری کاروبار میں بلا تاخیر رائج کرنے کے حق میں ہیں مگر اکثریت مخالف ہے جو اپنی مادری اور قومی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے اردو زبان پر غیر ملکی انگریزی زبان کو فوقیت دینے پر آمادہ ہے۔۔۔

انگریزی زبان کی ضرورت کو موجودہ زمانہ میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ــــــ جدید علوم خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کی معتبر کتابوں کا ذخیرہ انگریزی میں ہے اس لئے انگریزی زبان کی تعلیم بھی ضروری ہے لیکن ذریعہ تعمیر قومی زبان کے سوا غیر ملکی زبان کو بنانا قطعاً غیر مناسب ہے اردو اور انگریزی زبانوں میں تفریق کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ زبان انسان کی کائنات میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے جیسے بدن میں ... کروڑوں افراد کے درمیان یہ رشتہ ارتباط ہے فرد اس سے فروغ پاتا ہے۔ جماعت اس سے شکل پذیر ہوتی ہے وہ لوگ قابل ... اور باعث ننگ ہیں جو اپنی زبان سے متنفر اور غیر ملکی زبان کو اپنی مادری و قومی زبان پر ترجیح دیتے ہیں انگریزی زبان سیکھنا ہماری موجودہ نسل کے لئے بلاشبہ ضروری ہے مگر مادری و قومی زبان کو بھلا کر اور اس سے بے نیاز ہو کر نہیں انسانی جسم کا خاصہ ہے کہ خارجی مادہ کو رد کر دیتا ہے چنانچہ صالح و صحت مند انسانی ذہن بھی اسی طرح خارجی (غیر ملکی) زبان کو اپنے میں پیوست نہیں ہونے دیتا وہ خارجی (غیر ملکی) زبان سیکھتا ہے لیکن اس کی پذیرائی مہمان کی طرح کرتا ہے نہ کہ خاندانی فرد کی طرح اگر ذہن خارجی زبان کو اپنے اوپر مسلط کر کے مادری زبان کو بھلا دینے پر آمادہ ہو تو اس کے حق میں یہ بات انتہائی شرمناک ہے اور اس کی نسبت یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنے والا اپنی ماں کو بھی بھلا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ ایسے انسان کی جو قومی زبان سے لاپرواہ ہو جائے اس کی آبرو باقی نہیں رہتی دنیا بھر کی قومیں اور ان کے حکمران و عوام موجودہ دور میں غیر ملکوں میں جا کر بھی اپنی قومی زبان میں ہی گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ گوشت سے ناخن کا جدا ہونا تصور میں آتا ہے مگر انسان کا اپنی قومی و مادری زبان سے جدا ہونا ہے قومی زبان کا مرتبہ نہ دینا اور پھر اپنے آپ کو زندہ اور غیرت مند قوم کا ذہ سمجھنا تصور میں آنے والی بات نہیں قومی وجود کو برقرار رکھنے اور اسے ترقی و استحکام اور حیات آمیز و حیات آموز بنانے کے لئے جملہ کاروبار حیات اور سرکاری دفتری امور انجام دینے کے لئے واحد قومی زبان اردو کو فروغ دینا اور بلا تاخیر دستاویل اختیار کرنا بقول قائد اعظم ہمارا آئینی اخلاقی اور قومی فریضہ ہے۔۔۔

ہمارے اعلیٰ حکام و افسران بالا (نوکر شاہی) و عام طور پر اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لئے یہ عذر اور مجبوری ظاہر کرتے ہیں کہ اردو بھی ابھی تک مکمل طور پر دفتری اصطلاحات موجود نہیں ہیں اس لئے ابھی اس میں سرکاری زبان بننے کی پوری صلاحیت نہیں ہے حالانکہ خود ان اصحاب میں خود اپنی قومی زبان کو سمجھنے اور غور کی پوری صلاحیت نہیں ہے ورنہ گذشتہ چالیس سال سے مستند اردو اداروں ... مشتمل ایک کمیٹی دفتری اصطلاحات تیار کرنے کے لئے متعین ہے اور ان کی فراہمی کے بیان کے مطابق تمام ضروری اصطلاحات مکمل ہو چکی ہیں بعض حکام اردو زبان کو دفتری زبان بننے کے ناقابل بھی کہتے ہیں جبکہ ریاست حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ کی مرتب کی ہوئی دفتری اصطلاحات اور متعدد کتب ایسی مذکورہ کمیٹی میں حیدر آباد سے حاصل کی ہوئی موجود ہیں جو جملہ مروجہ علوم کی معتبر تالیفات انگریزی کا مستند ترجمہ ہیں ان میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی بعض اہم و معتبر کتب بھی ہیں لہٰذا کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا اور نصابی کتابوں کا فراہم کیا جانا قطعاً دشوار نہیں بلکہ نہایت آسان ہے۔۔۔

وزیر اعظم جونیجو کے پانچ نکات میں پہلا اور بنیادی نکاتی منصوبہ پاکستان کو نظریاتی بنیادوں پر اسلامی فلاحی مملکت بنانا اور اس مقصد کے لئے نظام اسلام مکمل طور پر نافذ کرنا ہے اس سلسلہ میں بھی یہ امر لازمی و لابدی ہے کہ اردو زبان کو سرکاری و قومی زبان بنانا نظریہ پاکستان میں شامل ہونے کے اعتبار سے یقین ہے کہ وزیر اعظم موثر اقدامات کے ذریعہ ایسی عملی تدابیر بروئے کار لائیں گے اور اپنے وزراء اور حکام بالا کو ہدایت کریں گے کہ بلا تاخیر اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کیا جائے اور ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو زبان کو مکمل طور پر رائج اور اختیار کیا جائے گا تاکہ قائد اعظم اور قومی نظریہ و نظریہ پاکستان کی تکمیل ہو اور پاکستان کا قومی وقار بھی بلند ہو! قومی اردو زبان تابندہ باد! پاکستان پائندہ باد

(این پی پی سنڈیکیٹ)

روزنامہ مشرق لاہور ۱۹-۳-۸۸ء

اردو کو وسعت دینے کے لیے علاقائی و مقامی الفاظ شامل کیے جائیں جسٹس قدیر

مقابلے کے امتحانات میں اردو کو متبادل زبان کی حیثیت دی جائے۔ اردو اور مقتدرہ قومی زبان پر مجلس مذاکرہ

کراچی ۲۰ اپریل (اسٹاف رپورٹر) جسٹس (ریٹائرڈ) تنزیل الرحمٰن ... محققین اور ماہرین لسانیات کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اردو زبان کو عام فہم اور سہل بنانے کے لیے مشکل الفاظ و عربی ... سے اجتناب کریں وہ آج شام ... آڈیٹوریم میں اردو زبان کی ترویج و نفاذ کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان کی کوششوں کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ کی صدارت کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ دنیائے اسلام میں عربی کے بعد دوسری بڑی زبان ہے اردو کو مزید وسعت دینے کے لیے ضروری ہے کہ علاقائی و مقامی الفاظ کو قومی زبان میں داخل کرنے پر توجہ دی جائے

مجلس مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری نے مقابلے کے امتحانات میں اردو کو بحیثیت متبادل زبان اپنانے اور دستور و آئین کے تحت اردو کو امتحانی حیثیت دینے کے اقدامات کی ضرورت پر روشنی ڈالی ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے نفاذ اردو کے ضمن میں مقتدرہ قومی زبان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۶ء کے دوران شائع کی جانے والی کتب کی تفصیلات بیان کیں جن میں سائنس کاروبار، زبان، و ادب، مختلف علوم اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی فرہنگیں خصوصیت کی حامل ہیں ڈاکٹر حنیف

استقبالیہ میں اقرار کیا کہ ۱۹۷۹ء میں مقتدرہ قومی زبان کے قیام سے اب تک شائع ہونے والی ساٹھ تصانیف اور مسلسل کاوشوں کے باوجود قوم کو انگریزی کی بالادستی سے چھٹکارا نہیں دلوایا جا سکا مجلس مذاکرہ کے دوران میر علی احمد تالپور اور نوری نستعلیق کی نشوونما کے لیے خدمات انجام دینے والے مرزا جمیل کی والدہ کے انتقال پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئیں اور مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی گئی۔

... نے کہا کہ قومی زبان مجموعی قومی زندگی کی حرکات کا پتہ دیتی ہے انہوں نے توقع ظاہر کی کہ نفاذ اردو سے قومی

انگریزی کا بھوت کون اتارے گا؟

اُم کلثوم ۔ لاہور

انگریزی میں طالب علموں کے فیل ہونے کی بنیادی وجہ ہماری انگریزی سے نفرت ہے۔ یہ انگریزوں کی زبان ہے جنہوں نے ہمیں ایک صدی غلام رکھا یہ فطری نفرت ہے جو ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے جن کے دل میں انگریزوں سے نفرت نہیں وہ غیر ملکی زبان سمجھتے ہوئے اس کو مشکل جانتے ہیں اور اس پر خصوصی توجہ نہیں دیتے۔ انگلش سے نفرت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے یا پھر اس کے مشکل ہونے کا خیال بھی جڑ پکڑتا چلا جاتا ہے۔ یہ لمحہ فکریہ خصوصی توجہ کا محتاج ہے!

دوسری وجہ ہمارا نظام تعلیم بھی ہے کہ اردو نظام تعلیم میں پرائمری سکولوں میں پانچویں تک انگریزی نہیں پڑھائی جاتی بچے اس سے متعارف نہیں ہوتے جب چھٹی کلاس میں جا کر یک دم ان کو انگلش سے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ فوراً اس سے گھبرا جاتے ہیں۔ چونکہ انہیں آتی نہیں اول تو اس سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے دوئم مشکل سمجھی جانے لگتی ہے سوئم اساتذہ بھی خاص توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی اس معاملہ میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں حالانکہ چھٹی کلاس میں چاہئے کہ اساتذہ انگریزی پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے بچوں کو پڑھائیں۔ ایسے وقت میں بہت ہی کم بچوں کے گھروں میں کوئی پڑھانے والا یا ان کی اس میں دلچسپی پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو والدین کو دوسرے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی وہ بچے پر کیا توجہ دیں! جب طالب علم کسی طرف سے خاطر خواہ مدد نہیں پاتے تو ان کی نفرت انگلش کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس مضمون میں نالائق شمار ہونے لگتے ہیں اور ان میں سے کچھ رٹا مار کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔

اساتذہ کا یہ رویہ کہ انہیں ٹیوشن چاہئے وہ ان کی انگلش پختہ نہیں کرواتے یہاں تک کہ بی اے کے بہت سے طالب علم ریڈنگ تک نہیں کر سکتے مڈل کے طالب علم کو ٹینس ضرور آ جانے چاہئیں اور ترجمہ بھی مگر اس پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی۔ ایف اے میں بھی "رٹا" چل جاتا ہے مگر جونہی آپ بی اے میں پہنچیں آپ کے لئے لازمی ہے کہ آپ کو انگریزی لکھنی آتی ہو جبکہ بی اے کے طلبہ میں سے بہت کم کو مرضی لکھنی آتی ہو جبکہ بی اے ہی میں تو ایک طالب علم کی اب تک پڑھی انگلش کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنا پختہ ہو چکا ہے۔ لیکن

بی اے میں اساتذہ بیپر بی کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے

بی اے کو پڑھانے والے اساتذہ کا حال کیا بتاؤں وہ بھی اس چیز کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف پیپر اے مکمل کرواتے ہیں اور بی کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ انگلش ب کا پیریڈ ہفتے میں دو دن ہی ہوتا ہے اور اس میں بھی طالب علم حاضری نہیں دیتے کیونکہ اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اساتذہ نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں دلایا؟ انہوں نے بی اے کے طالب علم کا حکومت کے مطابق معیار نہیں بنایا؟ اساتذہ کلاس میں انگریزی بولتے ہیں جو ان کے پلے نہیں پڑتی اور پھر بہت سے طالب علم کلاسیں چھوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

طالب علم کو قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہے اور استاد کو شاید ٹیوشن کی ضرورت ہے؟ کلاس میں طالب علموں کے لئے دلچسپی پیدا نہیں کی جاتی۔ انگریزی میں جتنی مغز ماری طالب علم کرتے ہیں اگر اتنی ہی دوسرے مضمونوں میں کی جائے تو بہت اعلیٰ رزلٹ ہو بہت سے طالب علموں کا خیال ہے کہ انگریزی اختیاری کر دینی چاہئے اس کا غیر ملک میں لازمی ہونا بے تکی سی بات لگتی ہے۔ انگلش اختیاری ہو یا لازمی یہ تو علیحدہ موضوع گفتگو ہے انگلش لازمی ہی رہے اسے پڑھانے کا انداز تبدیل کرنا ہو گا جو انگلش میڈیم تھے وہ پہلی بار ہی پاس ہو گئے فیل ہونے والوں سے کچھ اس دفعہ پاس ہو جائیں گے۔ سارے لوگ عموماً کلیر نہیں کر سکتے پھر کچھ مسلسل ناکامی کی وجہ سے ناامید ہو جاتے ہیں اور پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں۔ انگلش رزلٹ خراب کرتی ہے اگر معاملہ ایسا ہی رہا تو معیار تعلیم اور گرنے کا اندیشہ ہے

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۶-۳-۸۸ء

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
ایک سچا اور قدیم پاکستانی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۱۹۰۲ء میں ہندوستان کے صوبہ جات متحدہ کے غیر معروف قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوئے اس وقت غلامی کا دبیز اندھیرا پورے ہندوستان پر مسلط ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد اگرچہ سرسید نے مفاہمت کی فضا پیدا کرنے اور انگریز کے دل سے مسلمانوں کی بغاوت کا کانٹا نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے اس اقدام کے سب اثرات مثبت اور ثمرات شیریں نہیں تھے اور یہ باور کرنا شاید درست ہے کہ ولی اللٰہی تحریک جس نے برصغیر میں جذبہ جہاد کو زندہ و توانا رکھا تھا اور جس کی آخری عملی صورت جہادِ بالاکوٹ کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی، سرسید کے عہد میں کمزور پڑ گئی تھی اور لوگوں کے ہاتھوں سے حکومت ہی نہیں گئی تھی دلوں سے احساسِ زیاں جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سرسید نے نہ صرف نئے وسائل سے ترقی کی طرف پیش قدمی کی بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بھی زندہ کیا۔ وہ پہلے مسلمان راہنما تھے جو اس نتیجے پر اپنے تجربے اور مشاہدے سے پہنچے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس ملک میں ان دو قوموں کا اکٹھا رہنا ممکن نہیں تھا بقائے انفرادیت کا یہی احساس تھا جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کے قلوب میں زندگی کی رمق قائم رکھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے غربت اور افلاس اور معاشی بدحالی کو تو قبول کر لیا لیکن ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریز کی خوشامد کو پسند نہیں کیا اور انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ محاذ بنایا تو اس میں بھی مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت قائم رکھنے کی شرط عائد کر دی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا بچپن مسلمانوں کی بقائے انفرادیت کے دور میں گزرا۔ اس دور میں ہندوؤں کی سیاسی تنظیم انڈین نیشنل کانگرس سے الگ مسلمان مسلم لیگ کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ قومی شاعری کے افق پر علامہ اقبال کا ظہور ہو چکا تھا۔ الطاف حسین حالی کی مسدس کے اشعار ہر مسلمان کے لبوں پر جاری تھے۔ اس دور میں اشتیاق حسین قریشی نے اپنے اندر یہ احساس پایا کہ

"ایک زمانے میں ہم حاکم تھے اور آج غلام ہیں۔"

یہ احساس ان کے دل میں ایک معمولی سے چشم دید واقعہ نے پیدا کیا تھا۔ یہ واقعہ پٹیالی کے چھوٹے سے قصبے میں پیش آیا تھا۔ یہ کرسمس کا دن تھا اور قصبے کے عیسائی اپنا مذہبی تہوار منا رہے تھے۔ انگریز عورتیں جب کرسمس منانے کے لیے گھوڑے پر سوار قصبے کے بازار میں نکلتیں تو گھوڑے کو دلکی چال سے چلایا کرتی تھیں۔ اس دن اشتیاق قریشی بھی کسی وجہ سے بازار میں تھے۔ جب کرسمس کا جلوس نکلا تو لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ اشتیاق حسین قریشی کے ساتھ محمد نامی ایک شخص تھا۔ اس نے جلوس کو دیکھا۔ آہ سرد بھری اور کہا۔

"ایک زمانے میں ہم بھی یونہی نکلتے تھے اور لوگ ہمیں دیکھتے تھے۔"

وہ زمانہ جب مسلمان گھوڑوں پر نکلتے تھے اور لوگ انہیں دیکھتے تھے سن ستاون میں انگریزوں کی اڑائی ہوئی دھول میں گم ہو چکا تھا اب قصبہ پٹیالی کا ایک بزرگ شخص اشتیاق حسین قریشی کی انگلی تھامے اس زمانے کو حسرت سے یاد کر رہا تھا۔ لیکن بے بس تھا۔ اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ اس بزرگ نے اشتیاق حسین قریشی کے دل میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا احساس بیدار کر دیا۔

چنانچہ جب اشتیاق حسین قریشی اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ میں داخل ہوئے تو ان کے دل میں اسلام کا درد اور اس کی عظمت کا پختہ نقش پیدا ہو چکا تھا اور جب سلطنتِ عثمانیہ پر کوہِ غم ٹوٹا تو مسلمانانِ ہند کے ساتھ ان کے دل میں بھی اسلام کی بین الاقوامی اہمیت نے ایک شدید جذبے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ وہ طالب علمی کے زمانے میں ہی تحریکِ ترکِ موالات میں اپنا کردار حتی المقدور ادا کرنے کے لیے قصبوں اور دیہات میں نکل گئے اور ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ انہیں کس طرح گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے۔

اشتیاق حسین قریشی سرسید احمد خان جیسے ماہر تعلیم اور دانشور علامہ اقبال جیسے مفکر اور قائد اعظم جیسے سیاستدان تھے لیکن اس بات کی طرف اشارہ ضروری

ہے کہ سر سید، اقبال اور قائدِ اعظم تینوں نے برصغیر کی تحریک آزادی میں ابتدا میں ہندوؤں کو اپنا تعاون فراہم کیا لیکن بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں کے مذہبی اور سیاسی عزائم ہم رشتہ تھے اور وہ آزادی کے ثمرات سے نہ صرف مسلمانوں کو الگ رکھنے کے خواہاں تھے بلکہ وہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں ضم کرنے کے درپے بھی تھے۔ چنانچہ ملتِ اسلامیہ کے ان تین عظیم راہنماؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس شدت سے پیدا ہوا۔ اس کا ایک بڑا باعث ہندوؤں کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب بھی تھا۔ اس احساس نے ہی برصغیر میں مسلمانوں کی قسمت کا دھارا تبدیل کر دیا۔

اشتیاق حسین قریشی کی زندگی کی اس جہت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے کہ وہ بھی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت تک اسی راستے سے آئے جو سر سید اقبال اور قائدِ اعظم نے اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ...... انہوں نے تحریکِ ترکِ موالات میں حصہ لیا لیکن جب وہ کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے گئے تو چوہدری رحمت علی کی پاکستان نیشنل مومنٹ میں شریک ہو گئے اور ۱۹۳۹ء میں اس تحریک کا ایک وفد قائدِ اعظم سے ملنے کے لیے دہلی گیا تو اشتیاق حسین قریشی کے دوستوں کی باتیں سن کر قائدِ اعظم نے فرمایا کہ

"تمہارے دلائل اس قدر قائل کرنے والے ہیں کہ میں اپنے آپ کو تبدیل شدہ انسان محسوس کرتا ہوں۔" ان کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کیمبرج میں پاکستانی بنے اور وہ ان لوگوں کی بہ نسبت جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد پاکستانی کہلائے قدیم پاکستانی تھے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو صرف پاکستانی کہنا ان کے ساتھ انصاف نہیں۔ وہ سچے پاکستانی تھے اور نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک ایسی علیحدہ نسل ہے جو ہمارے ملک میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

پاکستان کی سیاست میں ان کا عمل دخل اس ملک کی نوزائیدگی کے دور میں شروع ہوا اور یہ وہ دور تھا جب مملکتِ خداداد پاکستان کے عہدے تفویض کرنے کے لیے اہلِ علم و فن کو تلاش کیا جاتا تھا اور اس قسم کے اربابِ فضل و دانش کے سامنے ان کا منصبِ جلیلہ ہیچ نظر آتا تھا۔ اشتیاق حسین قریشی کو بھی لیاقت علی خان نے تلاش کیا اور انہیں مرکزی حکومت میں وزارت کی پیش کش کی اس اقدام میں لیاقت علی خان نے اشتیاق حسین قریشی کی راست فکری کے اس زاویے کو یقیناً اہمیت دی ہو گی کہ دہلی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے انتخاب میں انہوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کی نامزدگی کی تائید نہیں کی تھی اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس نامزدگی کو یونیورسٹی اور لیاقت علی خان دونوں کے لیے نقصان دہ تصور کرتے تھے۔ اس اختلاف رائے کے باوجود اشتیاق حسین قریشی نے اینگلو عربک کالج کی گورننگ باڈی پر یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت میں اس وقت کام کیا جب لیاقت علی خان اس کے صدر تھے۔ دوسری طرف لیاقت علی خان کے کردار کی عظمت کی شہادت بھی اشتیاق حسین قریشی نے ہی فراہم کی ہے کہ

"نواب زادہ صاحب نے قریشی صاحب کو گورننگ باڈی کا نائب صدر نامزد کرایا اور جب وہ خود حکومت ہند کے فنانس ممبر بنے تو کالج کا سارا انتظام قریشی صاحب پر چھوڑ دیا۔"

ایک فعال اور باعمل سیاست دان کی حیثیت میں قریشی صاحب کی خدمات ٹھوس، گوناگوں اور متنوع ہیں لیکن میں انہیں عملی زندگی کے جس زاویے سے بھی دیکھتا ہوں وہ مجھے سیاست دان کم اور معلم زیادہ نظر آتے ہیں۔ کتاب ان کی دوست بھی تھی اور ان کی راہنما بھی۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ان کے گھر پر حملہ ہوا تو ان کی سب کتابیں لوٹ لی گئیں لیکن وہ اتنے ہردلعزیز معلم تھے کہ اس واقعہ پر ان کے ہندو شاگرد زیادہ برہم ہوئے اور انہوں نے گاندھی جی کی شام کی پرارتھنا میں شکایت کی کہ ان کے پروفیسر کا گھر اور کتابیں لوٹ لی گئی ہیں۔ آج جب ہمارے پروفیسروں کے گھر ذاتی لائبریریوں سے خالی ہیں اور کتاب دوستی کی روایت ختم ہو چکی ہے تو شاید قریشی صاحب کے غم کا اندازہ نہ لگایا جا سکے لیکن اپنی ذاتی لائبریری سے محرومی کا درد قریشی صاحب کے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہا اور اس کا ذکر انہوں نے ہمیشہ گہرے غم سے کیا۔

ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے اپنی زندگی کے آخری چونتیس سال ایک سچے پاکستانی کی حیثیت میں گزارے۔ وہ مؤرخ تھے اور انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا تجزیہ بڑی بالغ نظری اور کشادہ ظرفی سے کیا اور اس سے نئے نتائج اخذ کیے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تاریخ سے قومی شعور کو بیدار کرنے اور تاریخ ماضی سے اس شعور کے دھارے کو تسلسل کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا

کام کیا۔"

چنانچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انہیں اشنگلر اور ٹائن بی کے برابر شمار کیا جو اس صدی کے عظیم مورخ ہیں اور جنہوں نے تاریخی عمل سے ایک مربوط فلسفہ بھی دریافت کیا تھا۔ ڈاکٹر قریشی کی انفرادیت کی مثالیں بہت سی ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف ایک مثال پر ہی اکتفا کروں گا۔

مراد چودھری نے کانٹی نینٹ آف سرسے " میں ہند و تہذیب کے امتزاجی عمل کو اس سرزمین کے جادو سے تعبیر کیا ہے لیکن اس سے بہت عرصہ قبل ڈاکٹر اشتیاق قریشی اس عمل کو ہندوستان کی تاریخ سے دریافت کر چکے تھے اور وہ اس حقیقت پر حیرت زدہ تھے کہ

" ایک مذہب جو بہت قدیم بھی ہے اور قیاسی فلسفہ اور ترقی یافتہ مابعد الطبعیات بھی رکھتا ہے وہ دوسرے مذاہب کی قدروں کو تسلیم کرنے میں مستعد ہی نہیں بلکہ خلوص بھی برت رہا ہے۔"

چنانچہ انہوں نے سوال اٹھایا کہ

" کیا بھگت کبیر کی آواز میں اسلام کی آواز بول رہی تھی یا وہ ہندو مت کی آواز تھی ؟"

اور جب انہوں نے اسلامی قدروں کی قبولیت میں ہندو مت کے امتزاجی رجحان کا سراغ لگایا تو انہوں نے فرمایا۔

" بھگتی کا وعظ کہنے والے اپنے اس اعلان کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں اور یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو تبدیلِ مذہب بے معنی ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر قریشی صاحب کا یہ تجزیہ بھگتی تحریک کے "پیغام محبت" پر کاری ضرب لگاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دوقومی نظریے کے جملہ پہلوان پر اسی تجزیے کی وساطت سے آشکار ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ ان کی ایمانیات کا جزو بن گیا اور مسلمانوں کی بقائے انفرادیت کے جذبے کو وہ عمر بھر پروان چڑھاتے رہے۔ چنانچہ انہیں بجا طور پر مفکر مورخ کہنا اور انہیں برصغیر کے عظیم مورخوں میں جگہ دینی چاہیے

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی انفرادیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی مفکرانہ صلاحیتوں کو اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے ساتھ ہمیشہ منسلک رکھا اصولوں پر کسی صاحبِ اقتدار سے مفاہمت نہیں کی اور علمی نزعات کے مقابلے میں عہدے اور منصب کو ہمیشہ غیر اہم تصور کیا۔ چنانچہ ان کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب پورے ملک پر پہلا مارشل لاء لگ گیا تو ڈاکٹر قریشی اس وقت ملک سے باہر تھے اور واپس آنے اور کسی عہدۂ جلیلہ کو حاصل کرنے کے بجائے وہ امریکہ میں ہی رک گئے اور اپنی معطر تنہائی میں تالیف و تصنیف کا کام شروع کر دیا۔

ان کے وائس چانسلری کے زمانے میں کراچی میں کالجوں کے انتخابات کی ایک ہی تاریخ مقرر کی جاتی تھی۔ ایک معروف سیاسی جماعت کے دورِ اقتدار میں یونیورسٹی کے انتخابات کا التوا سیاسی ضرورت بن گیا۔ اس پارٹی کے ایک رکن انھیں سبز باغ دکھانے کے لیے تشریف لائے اور کہنے لگے کہ

" ہماری پارٹی کو آپ جیسا وائس چانسلر کہاں ملے گا ؟"

قریشی صاحب ان کا مطلب بھانپ گئے۔ بولے۔

" یہ آپ اس سے کہیں جسے تمنا ہو۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ اس عہدے کو چھوڑ دوں گا۔ میں کسی وجہ کے بغیر صرف آپ کی پارٹی کو خوش کرنے کے لیے قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ رہا میرے بنیادی سیاسی رجحانات کا معاملہ تو وہ واضح ہیں۔

اوّل۔ اسلام کی سربلندی

دوم۔ پاکستان کا استحکام

اسلام کی سربلندی کے لیے انہوں نے اسلامیات کے موضوع پر اعلیٰ معیار کا تحقیقاتی کام سرانجام دینا ضروری سمجھا اور اس کے لیے مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی قائم کیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لکھا ہے کہ

" اتنے قلیل عرصہ میں ایسے اچھے طریقہ پر ادارہ کو منظم کرنا اور چلانا ایک نہایت قابلِ قدر کارنامہ ہے۔"

پاکستان کے استحکام کے سلسلے میں ان کی بڑی خدمت ان کے تصورِ قوم اور تصورِ وطن کی صورت میں سامنے آئی۔ چنانچہ انہوں نے یہ آواز بروقت اٹھائی۔

" ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ اقوام کس لیے اور کس طرح زندہ رہتی ہیں۔ کیا محض نام اور جغرافیائی حدود کسی قوم کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہیں یا افراد کے پراگندہ اجزاء میں روح دوڑانے اور انہیں لافانی بنانے کے لیے ان میں افتخار و اعتماد کو نشو و نما دینا ضروری ہے۔"

افتخار و اعتماد کے لیے قریشی صاحب نے تاریخ اور ماضی کی روایات اور ثقافتی اقدار کو بنیادی حیثیت دی اور ان سب کے فروغ کے لیے انہوں نے قومی زبان اُردو کو ایک اہم وسیلے کے طور پر قبول کیا۔ ان کی ایک مضبوط دلیل یہ تھی کہ۔

انگریز اپنی ترقی کی ابتدا اس دن سے شمار کرتے ہیں جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ

ہوا تھا اور لاطینی زبان سے انہیں نجات مل تھی۔"

انہیں نجات مل تھی۔

انہیں احساس تھا کہ

"شروع میں جب انگریزوں کو جدید تعلیم رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے دہلی کالج کے ذریعے سے اُردو ہی میں ابتدا کی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کا پورا پورا تجربہ ہو چکا ہے اور جامعہ کراچی نے بھی اس کا تجربہ کر کے دیکھا ہے۔" قریشی صاحب کو ملال تھا تو یہ کہ

"ہم بار بار تجربے کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی ناکامی سے سبق نہیں لیتے"
چنانچہ انہوں نے نفاذِ اُردو کو ہمیشہ استحکامِ پاکستان کے ساتھ وابستہ کیا

اور اس کے عملی اقدام کے لیے انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کی بنیاد رکھی۔ ان کی زندگی کا آخری دور ضعفِ پیری، نقاہت اور جسمانی ناتوانی کا دور تھا۔ لیکن مقتدرہ کا کام ہونا توان کے جانِ ناتواں میں ولولہ پیدا ہو جاتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی کا آخری ڈیڑھ سال مقتدرہ کی تنظیم میں صرف کیا اور جب ہاتف نے انہیں آواز دی تو اس وقت بھی ڈاکٹر قریشی اسلام آباد میں مقتدرہ کے امور ہی سرانجام دے رہے تھے۔

میں نے انہیں آخری مرتبہ اہلِ قلم کانفرنس میں دیکھا۔ اکادمی ادبیات کے اساسی رکن کی حیثیت میں انہیں ڈائس پر تشریف لانے کی دعوت دی گئی تو ان میں سیڑھیوں کو عبور کرنے کی سکت نہیں تھی۔ چنانچہ اہلِ قلم نے دیکھا کہ وہ جن کے ہاتھ ملک کے فنانِ اقتدار پر تھے دوڑ کر آیا اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ کر انہیں مسندِ فضیلت تک لے گیا اس وقت اقتدارِ عقلی علم کی عظمت کے سامنے سربخم تھا اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ضعف سراپا کے گرد نور کا ایک ہالہ گردش کر رہا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

یہ چند معروضات میں نے اس لیے پیش کی ہیں کہ مجھے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے قالب میں ہمیشہ ایک دردمند قوم کی روح موجزن نظر آئی۔ وہ تاریخ کی مشعل لے کر عمر بھر ان اندھیروں کو کاٹنے کی کوشش کرتے رہے جو ہمارے قلوب پر سو برس کی غلامی نے مسلط کر دیے تھے ان کی فکر کے سب زاویے اسلام اور پاکستان کی بقا سے وابستہ تھے لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ان کے تصورات اور نظریات کی مناسب ترویج و اشاعت نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے اس سمت میں کچھ پیش رفت کی ہے۔ اور ان کا پہلا یادگاری مجلہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر شفیق الرحمان، ہلال زبیری صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضامین قریشی صاحب کی زندگی، ان کے فنِ تاریخ نگاری، اور ان کی تعلیمی اور تحقیقی خدمات کے آئینہ دار ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ مضامین قدرے اجمالی ہیں اور سیراب کرنے کے بجائے تشنگی کا احساس بڑھا دیے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصّہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی تجزیاتی جہت کا آئینہ دار ہے۔ جسٹس تدیرالدین احمد، سید صباح الدین عبدالرحمن، شریف المجاہد اور متعدد دوسرے اصحاب نے تاریخ، تعلیم، ادب اور قانون کے بعض نئے موضوعات پاکم روشن مضامین پر نظر ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان مضامین کی اشاعت سے ڈاکٹر قریشی صاحب کی روح کو مزید تسکین حاصل ہوئی ہوگی

ان کی روح کے لیے یہ امر بھی باعثِ اطمینان ہوگا کہ انھوں نے نفاذِ اُردو کے لیے مقتدرہ قومی زبان کا جو پودا لگایا تھا اس کی مزید آبیاری ان کے قبیلے ہی کے ایک فردِ ڈاکٹر وحید قریشی کر رہے ہیں۔ انگریزی کی بالادستی کے دور میں وحید قریشی صاحب نے نفاذِ اُردو کا عمل آسان بنانے کی سعی کی ہے اور حوالے اور وسیلے کی کتابوں کا اتنا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اب آپ آنِ واحد میں نفاذِ اُردو کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر وحید قریشی اپنے عمل کی مستعدی، انہماک اور تندہی کی وجہ سے اعتراضات کی زد میں بھی آ گئے ہیں۔

نفاذِ اُردو کے سلسلے میں جو مشکلات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو درپیش تھیں وہ آج بھی موجود ہیں۔ لہٰذا نفاذِ اُردو کے لیے ان مشکلات کو رفع کرنا اور استحکامِ پاکستان کے لیے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے تصوراتِ زبان کو قبول کرنا ضروری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مقتدرہ قومی زبان اشتیاق قریشی کے وضع کردہ خطوط پر کام کر رہا ہے۔ مقتدرہ سے میری ایک ذاتی گزارش یہ بھی ہے کہ وہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے فکر و نظر کی تحقیق اور فروغ تصورات کو صرف ڈاکٹر اشتیاق اکادمی تک محدود نہ کرے بلکہ اس میں اپنا حصہ مزید شامل کرے میری تجویز ہے کہ ایک نشست ان کے نام پر قائم کی جائے اور اس کام کو جس کا بیڑا اشتیاق حسین قریشی اکادمی نے اٹھایا ہے اس میں مقتدرہ بھی عملی طور پر شریک ہو جائے۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ڈرامہ نگار

کسی دانش ور کی شخصیت کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کا سیاسی زاویہ نگاہ، اس کا تہذیبی و ثقافتی ادراک اور اس کی تنقیدی و تخلیقی صلاحیتیں اس کے تاریخی شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے قومی اور بین الاقوامی فکر سے منسلک پاتا ہے اس کی تحریریں ان ہی قدروں کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور ان تحریروں میں عصرِ حاضر کی دانش اور احساس سمٹ آتا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بلاشبہ ایک ایسی ریگانہ روزگار شخصیت تھے جو اپنے عہد کی صداقتوں کے ساتھ ہم رشتہ رہنے کی فکری جدوجہد میں مصروف رہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پاکستان اور پاکستان سے باہر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک غیر معمولی اور نادر شخصیت کے مالک تھے اُن کی علمی اور تحقیقی سرگرمیاں کسی ایک شعبہ زندگی تک محدود نہ تھیں بلکہ ان کے دائرہ علم و تحقیق مختلف علمی میدانوں پر محیط تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک بلند پایہ مصنف، خوش بیان مقرر، ماہر تعلیم اور مخلص سیاست دان تھے۔ استاد اور ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ وہ ایک مایہ ناز مورخ تھے۔ خصوصاً جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ اور پاکستانیت پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ ایک اچھے ادیب اور کامیاب ڈرامہ نگار بھی تھے۔

ادب کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے جس رُخ پر اپنی معروضات پیش کرنا چاہوں گی وہ اُن کی ڈرامہ نگاری ہے۔ اُردو ڈرامے کی تاریخ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جدید دور کے ڈرامہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت و اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں کے موضوعات اور خام مواد اپنے اردگرد بکھری زندگی سے حاصل کیے۔

شاعری ہو یا ڈرامہ ہر صنفِ ادب زندگی ہی کا ترجمان اور آئینہ دار ہوتا ہے۔ عہد جدید نے فن کار کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتے ہوئے زندگی کی ترجمانی سے آگے بڑھ کر زندگی کو بہتر بنانے کا کام بھی فن کار کے سپرد کر دیا جس میں تغیر و تبدیلی زندگی کے بڑھتے ہوئے شعور کا لازمی نتیجہ ہے۔ ادب اور فن کی دنیا میں بھی کئی بت بنتے اور ٹوٹتے رہے ہیں۔ عقائد، تصورات، خیالات اور نظریات انسانی ذہن و احساس میں برسات کے گھنیرے بادلوں کی طرح شکلیں بناتے اور بگاڑتے رہے لیکن فکرِ انسانی کا کارواں شکست و تعمیر میں مصروف رواں دواں رہا۔ جہاں بیسویں صدی نے تصورات و عقائد کے بہت سے پرانے بت توڑے اور اُن کی جگہ نئے صنم کدے آباد کیے۔ وہاں ڈرامے کی تاریخ میں بھی کئی ادوار آئے۔ کتنی ہی تحریکیں اُبھریں، مروج ہوئیں اور وقت کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئیں۔ ہمارے ہاں اُردو ڈرامے کی روایت اودھا کنہیا اور اندر سبھا سے کر تھیٹریکل کمپنیوں تک پھیلی ہوئی تھی لیکن ڈرامے کے اصلاحی اور جدید دور نے برسوں کی پرانی روایات کی بنیادیں ہلا دیں۔ آرائش مونسونات اور مصنوعی رنگ و روپ کی جگہ سماجی مسائل کی نشان دہی ہونے لگی اور ڈرامہ زندگی سے قریب ہو کر، زندگی کے متنوع پہلوؤں کی داستان بنتا گیا۔ نئی روایتوں کے زیر اثر ہر قسم کی تہذیبی اور سماجی مسائل کا اظہار، پرانی قدروں کے خلاف اور انقلاب کی حمایت میں ڈرامے لکھے جانے لگے غرض پہلی بار ڈرامے میں بھی وہ آوازیں سنائی دینے لگیں جو اس دور کی دوسری اصنافِ ادب میں گونج رہی تھیں۔ نفسیات انسانی کے نباض اور ادبی اقدار کے امین ادیبوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی میں ڈرامے کو سماجی اصلاح اور معاشرتی تبدیلی کا نقیب بنانے کی کوشش کی۔ موضوع کو اہمیت دے کر اُس میں ادبیت کا رنگ نکھارا۔ ان فن کاروں کی بدولت ادبی ڈرامے کی روایت کی ایسی بنیاد پڑی جس پر آگے چل کر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور محمد مجیب وغیرہ نے ادبی علمی ڈرامے کی بلند پایہ عمارت تعمیر کی اور اس کو استحکام بخشا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ڈراموں کے ذریعے قومی ترقی و اصلاحِ معاشرے کا کام لینا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں "تمثیل ایک افسانہ ہے جسے زندہ کر کے دکھایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اچھا تمثیل نگار

اجتماعی ذمہ داریوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کا خاکہ کھینچ کر پیش کرتا ہے تاکہ سماجی ناہمواریوں اور اونچ نیچ کو دور کیا جا سکے[1]۔"

ڈاکٹر صاحب کا جدید ڈرامہ نگاری اور اسٹیج کا مطالعہ وسیع تھا۔ بیرونی ممالک کے تھیٹر کے مشاہدے کا عملی تجربہ بھی حاصل تھا۔ انھوں نے دلی کالج و یونیورسٹی کے اسٹیج پر پیش کرنے کی غرض سے اصلاح معاشرت و تربیت عامہ کے لیے کسی معرکے ڈرامے لکھے اور اپنی زیر ہدایت اسٹیج کرائے جو ان کی فنی مہارت اور زبان و بیان کی ندرت کی وجہ سے بہت کامیاب رہے۔

یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے جب ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب میں ایک تخلیقی مصنف کی حیثیت سے قدم رکھا۔ ان کے مضامین اردو کے مقتدر رسالے میں "قاضی اشتیاق حسین" کے نام سے چھپتے تھے۔ اس زمانے میں اردو ڈرامے نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ اس دور میں مقصدی اور اصلاحی ڈرامے لکھنے والوں میں اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نمایاں تھے قریشی صاحب کا ایک ڈرامہ جو خاص طور پر سرسید کی جدید تعلیمی تحریک کی تائید میں تھا بہت مقبول ہوا[2]۔"

نصر اللہ خان کہتے ہیں کہ "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو ملک کے نامور ڈرامہ نگار ہیں اور جنھوں نے بے شمار ڈرامے لکھے۔ دلی کے ان نوجوانوں (شاہد احمد دہلوی، فضل حق شیدا، جبار غازی اور حلیم اقبال حسین) کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کے لیے ڈرامے لکھتے اور ان ڈراموں کی ہدایت کاری[3] بھی کرتے۔"

فنِ تمثیل کے بارے میں خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں "میرا عقیدہ ہے کہ ڈرامے کو زندگی کی صحیح تصویر پیش کرنا چاہیے اور اگر مافوق العادت ضرورت درپیش نہ ہو تو اسے ایسا ہونا چاہیے کہ تمثیل کے وقت ناظرین محسوس کریں کہ اسی دنیا کے واقعات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ڈرامے کے تنزل کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ڈرامے بہت طویل ہوتے ہیں اور ان میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ تھیٹروں پر جاہلوں کی حکومت ہے۔ لہٰذا ہمارے ڈرامے نے کوئی ترقی نہ کی۔ میں ڈرامے کی ترقی کو قومی ترقی کا ایک اہم جزو تصور کرتا ہوں اور اس کا مدعی ہوں کہ ڈرامے سے قوم کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے[1]۔"

ڈاکٹر صاحب نے اسی ضرورت کے پیش نظر مختصر مدت کے مکمل ڈرامے لکھے جن میں تین ایکٹ سے لے کر پانچ ایکٹ تک کے ڈرامے شامل ہیں اور ان کے تمثیل کرنے کی مدت دو سے تین گھنٹے تک کی ہے۔ ان کے علاوہ ONE ACT PLAY اور نثری کھیل بھی لکھے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک جدید طرز کے ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں قومی ترقی و بیداری اور سماجی افادیت کے پہلو کو سامنے رکھا ڈاکٹر صاحب کے کل بارہ ڈرامے معلوم جن کے نام یہ ہیں: بہزاد، ایریزبول نقشِ آخرت، نفرت کا بیج، کٹھ پتلیاں، ملاء اعلیٰ، بند لفافہ، مٹھائی کی ٹوکری، حجرِ اسود، بت نراش، نیم شب اور گناہ کی دیوار۔

ڈاکٹر صاحب کا ڈرامہ نقش آخر بہت مقبول ہوا۔ اسے نصاب میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس میں انیسویں صدی کے تغیرات کی ایک انقلابی داستان پیش کی گئی ہے کہ شاہی مصور دلی میں غدر کی اطلاع سن کر گھبرا جاتا ہے اور اپنے خاندان کو لے کر سونی پت چلا جاتا ہے لیکن اپنے بیٹے کو رائے بریلی جانے کا حکم دیتا ہے۔ دلی لُٹتی ہے، گرفتاریوں اور سزاؤں کا سلسلہ مہینوں جاری رہتا ہے محسن اور اس کے خاندان کے افراد دلی واپس آتے ہیں لیکن ان کی عزت و عظمت دولت و شہرت کا دور ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ محسن اپنے باپ کی بنائی ہوئی آخری شہنشاہ ہند کی تصویر نکالتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر خاص و عام مصور کی چابک دستی کی تعریف کرتے ہیں۔

اس نیم تاریخی ڈرامے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دہلی اور حیدرآباد میں کئی بار اسٹیج کیا جا چکا تھا۔ یہ ڈرامہ اب تک کئی ایڈیشنوں میں جامعہ ملیہ سے شائع ہو چکا ہے۔" اس ڈرامے کو ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر کے سٹی سوزو کی (سابق طالب علم جامعہ کراچی) نے جاپانی زبان میں ترجمہ کر کے اسٹیج کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے تمام ڈراموں کے پلاٹ، تاریخی واقعات کے علاوہ اصلاح معاشرت اور درس اخلاق کے اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ معاشرتی ڈراموں

۱۔ ڈاکٹر اشتیاق قریشی برہان، دہلی دسمبر ۱۹۴۲ء
۲۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ روزنامہ جسارت کراچی ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء
۳۔ نصر اللہ خان، کچھ یادیں کچھ باتیں (دلی کے ادیب اور دلی کا ادبی حلقہ) حریت ۱۲ اگست ۱۹۷۵ء

نمبر ۱۔ اشتیاق حسین قریشی بحوالہ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند

ہیں پرانی اور نئی تہذیب کا تصادم اُن کا خاص موضوع تھا جن میں بے جا رسوم اور توہم پرستی کے خلاف احتجاج کر کے صحت مند اور ترقی یافتہ معاشرے کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے جو ڈرامے تخلیق کیے وہ روزمرہ زندگی سے قریب ہیں معاشرتی ڈراموں میں ہمزاد، صید زبوں، نفرت کا بیج، کٹھ پتلیاں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان ڈراموں میں ہمیں معاشرے کی تصویر کشی ملتی ہے اور زندگی کے مسائل بھی نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں ان مسائل کے حل کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔

ڈرامہ " مٹھائی کی ٹوکری " کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے۔ گجراتی اور اس کی بیوی ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔ بیوی کو شکایت ہے کہ گجراتی محلے والوں کی بھیجی ہوئی چیزیں تو قبول کر لیتا ہے لیکن خود کبھی کسی کو کوئی چیز نہیں بھیجتا۔ آخر کار گجراتی اس بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ دہلی سے واپسی پر مٹھائی اپنے ہمراہ لیتا آئے گا۔ چنانچہ وہ پانچ روپے کی مٹھائی خریدتا ہے۔ دورانِ سفر چند نوجوان مٹھائی کھا جاتے ہیں۔ گجراتی گھر پہنچ کر چوری کا الزام بیوی پر لگاتا ہے اور بیوی کو شکایت ہے کہ وہ مٹھائی کی خریداری کے سلسلے میں جھوٹ بول رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے تمام ڈرامے فنی مہارت اور زبان و بیان کی قدرت کی وجہ سے مختصر تمثیلی ڈراموں میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ڈراموں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ اسٹیج کیے جا سکتے ہیں لیکن بعض مواقع پر خشک نصیحتیں اور وعظ کا ناصحانہ انداز نمایاں ہو جاتا ہے، جس سے ڈرامائی دلآویزی میں قدرے فرق واقع ہو جاتا ہے، اس کے باوجود یہ ڈرامے بحیثیت کامیاب اور دلکش نمونے ہیں جن میں سماجی زندگی کی کشمکش نمایاں ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ڈرامے اردو میں ڈرامانگاری کے ایک مخصوص صنف کے آئینہ دار ہیں جن میں مقصدیت کا عنصر نمایاں ہے۔

بعض تصانیف کی مقبولیت ان کی خوبیوں سے زیادہ قارئینِ ادب کی فکری سطح اور سماجی مسائل سے آگہی اور ان کے بارے میں COMITMENT کی سطح سے متعین ہوتی ہے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جدید ڈرامانگاری کی تاریخ کا ایک معتبر و منفرد نام ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بلاشبہ ادبیات کی مایہ ناز بزرگ شخصیت تھے۔

پاکستان میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں

میانوالی ۸ مارچ (نامہ نگار) پاکستان میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں محب وطن افراد کی اکثریت قومی زبان کی حامی ہے مگر انگریزی کے حامی افراد کا ایک مخصوص طبقہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے انگریزی کو دفتری زبان بنانے پر تلا ہوا ہے جبکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ملکی یکجہتی کو مضبوط بنانے کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اشد ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقتدرہ قومی زبان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی نے کینال ریسٹ ہاؤس میانوالی میں صحافیوں سے ایک ملاقات کے دوران کیا۔ انہوں نے کہا مقتدرہ نے اردو کو مکمل دفتری زبان بنانے کے لئے اپنے فرائض احسن طریقے سے ادا کئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ۳ ہزار الفاظ پر مشتمل لغت مکمل دفتری زبان کے لئے تیار کی گئی ہے جو ۳۰ مارچ تک پنجاب حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔ علاوہ ازیں اردو کی ترویج کے لئے اس ادارے نے ۱۲۸ کتابیں ۹۰ کتابچے شائع کئے دس ہزار صفحات پر مشتمل دیگر موضوعات پر کام کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ملک میں صرف ایک فیصد عوامی خط و کتابت انگریزی میں ہوتی ہے جبکہ ملک کی تمام اکثریت اردو میں خط و کتابت کرتی ہے جس سے اردو کی عوام میں مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۸-۳-۱۹۸۷ء

محسن بھوپالی کی تصنیف کی تقریب رونمائی

اسلام آباد (نامہ نگار) انجمن اہل قلم خواتین کے زیر اہتمام ممتاز دانشور محسن بھوپالی کی تصنیف "قومی یکجہتی میں ادب کا کردار" کی تقریب رونمائی ۹ مارچ سوموار چار بجے شام پاکستان ہوٹل سنٹر اسلام آباد میں منعقد ہوگی۔ وفاقی وزیر قیصر امین الحاج محمد حنیف طیب مہمان خصوصی ہوں گے۔ محترمہ بیگم ور کشور ہزاری رکن قومی اسمبلی صدارت کریں گی۔ پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی غلام ربانی آگرو، ضیغم صدیقی جمیل یوسف الرحمان اور محترم حکیم اکرام الحق کتاب پر تبصرہ کریں گے۔ تقریب کے آخر میں انجمن کی سیکرٹری بیگم ذی فرمان و فرکاء کے اعزاز میں عصرانہ دیں گی۔ تقریب کے انتظامات کیلئے آج انجمن کی صدر بیگم انور رضا کی رہائش گاہ پر اجلاس ہوا۔ جس میں پروگرام کو حتمی شکل دی گئی۔ محسن بھوپالی ۹ مارچ کی صبح کراچی سے اسلام آباد پہنچیں گے۔

روزنامہ جنگ پنڈی ۹-۳-۱۹۸۷ء

اردو میں پروگرام پیش کرنے کا مطالبہ

کراچی (پ ر) عوامی ویلفیئر کونسل کراچی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات غلام حسین نے کہا کہ ۱۵ کی شب رات ۸ بجے تا ۹ بجے اردو پروگرام کی بجائے انگریزی پروگرام پیش کرنے سے اردو پروگراموں کے ناظرین کو مایوسی ہوئی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۱۷ مارچ ۱۹۸۷ء

محکمہ تعلیم کے انتظامی عہدوں پر سی ایس پی افسروں کی تعیناتی کی کوئی سکیم نہیں: آہیر

راولپنڈی ۱۴ مارچ (نمائندہ خصوصی) وفاقی وزیر تعلیم ملک نسیم احمد آہیر نے محکمہ تعلیم کی انتظامی اسامیوں پر سی ایس پی حضرات تعینات کرنے کی خبر کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسی کوئی سکیم حکومت کے زیر غور نہیں تھی۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت صرف ایجوکیشن سروس آف پاکستان کے قیام پر سوچ بچار کر رہی ہے اور اس ضمن میں صوبائی حکومتوں سے رائے طلب کی گئی ہے اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ پرنسپلوں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں اور دوسرے انتظامی عہدوں پر ایسے اساتذہ تعینات کیے جائیں جنہیں انتظامی امور کا بھی وسیع تجربہ حاصل ہو لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ ان اسامیوں پر محکمہ تعلیم سے باہر کے افراد و تعینات کیا جائے گا ایسا ہرگز نہیں حکومت صرف یہ چاہتی ہے کہ جس طرح سی ایس پی اور پی سی ایس دوسرے انتظامی عہدوں کے لیے انتظامی امور کی تربیت دی جاتی ہے اسی طرح اساتذہ کو بھی تعلیمی انتظامی امور کی تربیت دی جائے انہوں نے کہا کہ اس بارے میں بھی ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا اس سکیم پر صرف غور کیا جا رہا ہے البتہ یہ طے ہے کہ حکومت محکمہ تعلیم کے انتظامی عہدوں پر اساتذہ کو تعینات کرے گی سی ایس پی افسروں کو تعینات کرنے کا تاثر غلط ہے۔

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۱۵-۳-۱۹۸۷ء

فارقلیط

مقتدرہ نے اشتیاق حسین قریشی کی یاد منائی

فارقلیط گذشتہ دنوں راولپنڈی میں تھا۔ ایک شام وہ ٹھنڈی سڑک پر چا ہنے والوں کی بے رخی دیکھ رہا تھا، کہ اس نے یہ عجیب مشاہدہ کیا کہ پنڈی مال سے گزرنے والی ہر کار شالیمار ہوٹل کی طرف لپکتی چلی جا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہاں مقتدرہ قومی زبان نے ایک شام ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام کر رکھی ہے۔

کراچی سے ڈاکٹر جمیل جالبی اور ہلال احمد زبیری آئے ہیں اور لاہور سے انور سدید کو بلایا گیا ہے۔ اسلام آباد سے ڈاکٹر سلطانہ بخش اور ڈاکٹر یوسف عباسی تشریف فرما ہیں۔ یہ سب اپنے انداز میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ذکر کریں گے ڈاکٹر اعجاز حسین راہی تقریب کے معلن ہیں۔ محمد سعید شیخ صدر ادیر پریشان خٹک مہمان خصوصی ہیں مقتدرہ کے موجودہ صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی تقریب کے میزبان ہیں۔ فارقلیط نے سوچا کہ مقتدرہ بھی کیسا ادارہ ہے کہ موجودہ صدر کی ستائش کرنے کے بجائے مرحوم بانی صدر کو یاد کر رہا ہے محض یاد ہی نہیں کر رہا بلکہ اس مجلہ کی رونمائی بھی کر رہا ہے جو اشتیاق قریشی اکادمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ سو اس نے مال روڈ پر وقت ضائع کرنا غیر مناسب سمجھا اور اس جلسے کی پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر ذکر قریشی میں شرکت کی۔

صاحبو! ہم لاہور کے رہنے والے ہیں۔ تماشہ پسندی ہمارا مزاج ہے ہنگامہ مرگ ہو یا جشن شادی، ہر ملاقات جو تقریب بھی ہو ہم اس میں سے نشاط کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

لیکن راولپنڈی اسلام آباد کا مزاج ابھی مرتب نہیں ہوا۔ وہاں اگلی شرافتوں کے کچھ نمونے ضرور موجود ہیں کہ قوم کے محسنوں کو یاد کرتے ہیں۔ سو مقتدرہ کا یہ جلسہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس میں شریک ہو کر فارقلیط نے بہت کچھ پا لیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی جامعہ کراچی کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس یادگاری مجلس میں ان کا مقالہ سجاد حیدر پڑھ رہے تھے۔ جالبی صاحب نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر اشتیاق قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے۔ ملت مسلمان کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیا ہوا تھا۔ مجسم علم۔ سراپا عمل، تحریر پر قدرت، تقریر پر قادر تھے۔ مشفق بھی اور مخلص بھی ایک اچھا انسان، ایک معتمد دوست، ایک شفیق استاد، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک مستند تاریخ دان۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش کا موضوع قریشی صاحب کا ڈرامہ تھا لیکن انہوں نے اشتیاق قریشی صاحب کو بطور انسان بھی دریافت کیا اور کہا کہ وہ ایک غیر معمولی اور نادر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیاں کسی ایک شعبہ زندگی تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ ان کا دائرہ علم و تحقیق مختلف علمی میدان پر محیط تھا۔ جنوب ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ اور پاکستانیت پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔

انور سدید نے کہا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو صرف پاکستانی کہنا ان کے ساتھ انصاف نہیں وہ سچے پاکستانی تھے اور وہ نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک ایسی علیحدہ نسل ہے۔ جو ہمارے ملک میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ انہوں نے کیمبرج میں پاکستان نیشنل موومنٹ میں چودھری رحمت علی کے ساتھ کام کیا۔ اور اس تحریک کے وفد سے مل کر حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "تمہارے دلائل اس قدر قائل کرنے والے ہیں کہ میں اپنے آپ کو تبدیل شدہ انسان محسوس کرتا ہوں۔ اور اشتیاق قریشی کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں کیمبرج میں پاکستانی بنے۔ اور ان لوگوں کی بہ نسبت جو پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد پاکستانی کہلائے۔ قدیم پاکستانی تھے ڈاکٹر یوسف عباسی نے انہیں برصغیر کے عظیم مورخوں میں جگہ دی اور ان کے

تجزیاتی عمل کو تاریخ نگاری کا ایک کامیاب تجزیہ قرار دیا۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ ٹائن بی، اور سپنگلر کی طرح انہوں نے تاریخ کا نیا نظریہ مرتب نہیں کیا۔

ہلال احمد زبیری ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے دیرینہ رفیق کار رہ چکے ہیں۔ انہوں نے یاد دلایا کہ قریشی صاحب سادگی پسند، منکسر المزاج اور حلیم طبع انسان تھے۔ اپنے تبحر علمی تفاخر یا تعلی سے قطعاً عاری تھے۔ ایک مستند عالم اور ایک مدبر منتظم کی حیثیت میں انہیں ہمیشہ قابل احترام سمجھا گیا۔ پروفیسر پریشان خٹک نے اشتیاق قریشی کی راست عملی کو سراہا اور انہیں ایک ایسی مثالی شخصیت قرار دیا جن کی تقلید سے پاکستان کا مستقبل روشن ہو سکتا تھا۔

صدر جلسہ جناب محمد سعید صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے مشنری جذبے ان کے عمل پیہم اور ان کی ولولہ انگیز جرأت کی داد دی، ڈاکٹر صاحب کی پاکستانیت اسلام دوستی اور تاریخ نگاری کے زاویوں سے ان کی منفرد شخصیت کا نقش تیار مرتب ہوا۔ اور اسی نے ہمیں روشنی اور تجزیاتی قوت عطا کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مقتدرہ کے قیام کو ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ اور بقائے آزادی کا وسیلہ قرار دیا۔ پاکستان کو ڈاکٹر قریشی نے اردو کے فروغ کے ساتھ منسلک کیا۔ اور اس زاویے سے اشتیاق قریشی صاحب کی دور رس نظر کی داد دی۔ اس محفل سے یہ آواز بھی اٹھی کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان خطوط پر کام کیا ہے، جو ڈاکٹر اشتیاق صاحب نے مرتب کیے تھے۔ انہوں نے انگریزی کی بالادستی کے عہد میں نفاذ اردو کی راہ آسان کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ چنانچہ مقتدرہ کی صورت میں ڈاکٹر اشتیاق صاحب نے پودا لگایا تھا۔ اس کی آبیاری اب ان کے قبیلے کا ایک اور فرد ڈاکٹر وحید قریشی کر رہا ہے

[illegible] مقتدرہ قومی زبان [illegible] ملاقات

راولپنڈی ۸ مارچ (نمائندہ [illegible]) اردو ہماری قومی زبان ہے اور اس کی ترویج کے لئے ضروری ہے کہ اسے ہر شعبۂ زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اصطلاحات کے تراجم مشکل اور آسان ہوتے ہیں [illegible] مقتدرہ کی [illegible] کوشش ہے کہ اصطلاحات کے ایسے تراجم پیش کئے جائیں جو ہر طبقۂ فکر کے لئے قابل قبول ہوں۔ یہ بات مقتدرہ کے صدرنشین ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے دفتر میں [illegible] سے متعلق خواتین کے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کہی۔ [illegible] اس وفد میں [illegible] شامل تھیں۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۹-۳-۸۷ء

تعلیمی اداروں میں طبقاتی نظام تعلیم ختم کیا جائے

اسلام آباد (رپورٹر) اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ [illegible] نے طبقاتی نظام تعلیم ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ نظام ہمارے تعلیمی [illegible] کو تبدیل کر سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ [illegible] پرائیویٹ [illegible] ملک کے دیگر پرائیویٹ تعلیمی ادارے غریب طبقوں کا استحصال کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں [illegible] اسلامی [illegible] کے اجتماع عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جمعیت کا اولین مقصد اس نظام تعلیم کو تبدیل کرنا ہے تاکہ ملک کے تمام طبقات ایک جیسے تعلیمی اداروں میں یکساں تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہوں۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۵ جون ۸۷ء

اردو عربی کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی زبان ہے: جسٹس قدیر

[illegible]

کراچی ۱۶ اپریل (اسٹاف رپورٹر) جسٹس قدیر الدین احمد نے کہا ہے کہ اردو اپنی آسان تراکیب اور عام فہم ہونے کے باعث عربی کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی زبان بن گئی ہے وہ آج شعبۂ قومی زبان کراچی کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ سے خطاب کر رہے تھے اپنے صدارتی خطاب میں انہوں نے کہا کہ قرآنی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان اردو قیام پاکستان سے قبل اور آج بھی برصغیر کے مسلمانوں کی پسندیدہ اور متفقہ زبان ہے انہوں نے کہا کہ اردو سے انگریزی یا کسی علاقائی زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف اردو ہی ملک کے اندرونی و بیرونی معاملات میں ملک کی زبان بن سکتی ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ اردو کو [illegible] کئے جائیں اور علاقائی زبانوں کے [illegible] کے بجائے [illegible] انہوں نے کہا کہ ملک میں [illegible] اردو [illegible] انگریزی [illegible] سیکھنے کی کیا ضرورت نہیں ممتاز [illegible] ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے اپنے خطاب میں مقتدرہ کے اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مقتدرہ قومی زبان نے فروغ اردو کو ایک چیلنج سمجھا [illegible] اردو کے کام میں مصروف ہے۔ انہوں نے اردو کے فروغ کی خاطر [illegible] کی کوششوں کو سراہا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر [illegible] نے کہا کہ اردو قومی تہذیب کی علامت ہے۔ اور یہی قومی شعور کو مضبوط کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مختلف [illegible] کے درمیان وحدت فکر ضروری ہے اور یہ قومی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ [illegible] نے اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ مقابلے کے امتحانوں میں اردو کو متبادل زبان کے طور پر رائج کرنا نہایت ضروری ہے۔ مقتدرہ کے [illegible] انہوں نے مطالبہ کیا کہ قومی زبان کو اس کا جائز مقام دینا قوم کا حق ہے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۷ اپریل ۸۷ء

اردو سفرنامہ

مشہور نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ایک کتابچہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ یہ کتابچہ ۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۹-۳-۸۷ء

سید سردار احمد پیرزادہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد میں ایک نشست

مقتدرہ نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی برسی کے موقع پر ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری جناب سعید احمد قریشی نے کی اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین پروفیسر پریشان خٹک مہمان خصوصی تھے۔ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب بلال احمد زبیری، جناب پروفیسر سعید الدین ڈار، جناب ڈاکٹر یوسف عباسی، جناب ڈاکٹر انور سدید اور محترمہ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے مقالات پیش کیے۔ جناب سعید احمد قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا مجھے سب سے پہلے اربابِ مقتدرہ کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے آج کی اس تقریب کے لئے مجھے بلایا اور اسلام آباد، راولپنڈی اور باہر سے آنے والے دانشوروں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ مقتدرہ اس لحاظ سے بھی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے مقتدرہ کے پہلے صدر نشین ماہر تعلیم اور ممتاز سکالر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ آج کا جلسہ منعقد کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کر کے ایک اچھی روایت قائم کی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی زندگی کا جائزہ لینے کے لیے کئی انداز فکر اپنائے جا سکتے ہیں مثلاً

۱۔ وہ کس طرح ایک سکول ٹیچر سے ترقی کرتے ہوئے وزیرِ تعلیم کے منصب اور دیگر اہم منصب تک پہنچے۔

۲۔ مورخ اور عالم کی حیثیت سے اپنے لیے کیسے بلند مقام اور [illegible] کرنے میں کامیاب ہوئے۔

۳۔ تحریک پاکستان میں ایک بے باک شخصیت کا کردار بڑے فعال طریقے سے کیسے انجام دیا۔

۴۔ تحریک پاکستان سے تعمیر پاکستان تک استاد، منتظم اور مقتدرہ کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو زیرِ بحث آ سکتے ہیں۔

۵۔ اردو زبان کی ترویج کے لئے ان کا کردار مثالی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام امور پر الگ الگ گفتگو کرنے کے بجائے ان کی زندگی کے جس پہلو پر موثر انداز میں گفتگو کی جا سکتی ہے وہ ان کے کردار کی مضبوطی اور شخصیت کا پختہ پن تھا۔ میری ذاتی رائے میں یہ سارا کریڈٹ ان کے کردار کی تعمیر کو ملتا ہے۔ انہوں نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ استاد کی حیثیت سے ملازمت کر لی وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن ایک بار پھر امتحان کی صورت بنی انہوں نے یہاں پر بھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اور تحریک ترک موالات میں شریک ہو کر نہ صرف ملازمت ترک کر دی بلکہ تعلیم کے حصول کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب سٹیفن کالج میں داخلے کے لیے انہوں نے کسی قسم کا جھوٹ بولنے کی بجائے اس کا اعتراف کر لیا کہ وہ تحریک موالات میں بھرپور کردار ادا کرتے رہے تھے۔ وہ ایک استاد سے ترقی کرتے ہوئے وزیر کے اعلیٰ منصب تک پہنچے یہ ان کے کردار کا نتیجہ تھا۔

قوموں کی تعمیر باکردار لوگوں سے ہوتی ہے۔ صاحب عمل لوگوں کے افکار و نظریات ہی قوموں کی تعمیر اور ترقی کے ستون ہوتے ہیں۔ قوموں کی تعمیر میں مادی ترقی کے ساتھ ساتھ فکر اور افکار تازہ بھی رہے ان کی روشنی میں قوم کی وحدت کے لیے منصوبہ بندی اور سوچنے کی ضرورت ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین پروفیسر پریشان خٹک نے کہا ہے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بنیادی طور پر ایک اچھے استاد، مستند مورخ اور اعلیٰ پائے کے منتظم تھے۔ جب یہ ساری چیزیں ایک شخص ہی میں جمع ہو جائیں تو بہت بڑی شخصیت بنتی ہے وہ وزیر بھی رہے، کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی، ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے سربراہ بھی اور مقتدرہ کے صدر نشین بھی، لیکن سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اس وقت تحریک پاکستان کے حامی تھے، جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ ترک موالات کی تحریک سے تشکیل پاکستان کی تحریک تک انہوں نے ایک باعمل سپاہی کا کردار ادا کیا۔ ان کی بصیرت اس بات کی گواہ ہے کہ پاکستان بننا چاہئے جب تک وہ زندہ رہے

انہوں نے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا ان کا تعلق ان دانشوروں میں سے نہیں
تھا جو حالات کے دھارے کے ساتھ چلتے بلکہ وہ حالات کے دھارے کو
اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیا کرتے تھے یہ شخصیت کا وہ پہلو ہے جو بہت کم
لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں جناب سعید احمد
قریشی، جناب پریشان خٹک اور معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ
اس انتشار کے معاشرے میں متوازن ذہن کے مالک اب بھی
موجود ہیں اور شاید اس وجہ سے یہ گاڑی جو مسلسل زندگی کے دائرے میں لڑھکتی رہی
ہے اب تک گامزن ہے۔ میں اس جلسہ میں شامل مقالہ نگاروں کا بے حد ممنون
ہوں کہ انہوں نے تقدیمہ کی حوصلہ افزائی کی سوچنے اور غور کرنے کے نئے پہلوؤں
کی جانب اشارہ کیا۔ انہوں نے اس تقریب کو رونق بخشی اس کے لیے میں ان کا
تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقالے میں کہا۔
کہ ایسے لوگ جیسے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے روز روز کہاں پیدا ہوتے
ہیں؟ شائد میر تقی میر نے انہی کے لیے کہا تھا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے۔
ملت مسلمہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ ایسی دل سوزی
اور ایسی دردمندی کم کم دیکھنے میں آتی ہے مجسم علم، سراپا عمل، تحریر پہ قدرت
تقریر پر قادر، مشفق بھی اور مخلص بھی۔

جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشتیاق حسین قریشی کے نظریات و عمل کی
روشنی میں فرمایا ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا انداز فکر ایک ایسے محب وطن پاکستانی
کا تھا جو ایک طرف تحریک پاکستان کا سپاہی اور داعی تھا اور دوسری طرف فکر و نظر اور
تہذیب و ثقافت کی سطح پر ان عوامل کو فکر پاکستان میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ جو پاکستان
کی پہچان ہیں اور جن سے پاکستان صحیح معنی میں ایک ملک اور پاکستانی صحیح معنی میں
یک جہتی کے رشتے میں پیوست ایک متحد قوم بن سکتے ہیں۔

جناب ہلال احمد زبیری کی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے ۴۰ سالہ رفاقت تھی۔ انہوں نے اپنے طویل
مقالے میں کہا کہ اس سے قبل کہ میں آج کی اس تقریب کے موضوع بحث
پر کچھ عرض کروں۔ میرا اولین فرض یہ ہے کہ میں صدر نشین مقتدرہ قومی زبان
کا دلی شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے اپنے سابق صدر نشین اور ملک کے مایہ
ناز دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی برسی کے موقع پر اس سیمینار میں شرکت
کے لیے مجھے طلب کیا اور یہ حکم دیا کہ میں اس ذاتی تعلق کی بنا پر جو مجھے ڈاکٹر
صاحب مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک حاصل رہا۔ ان کی شخصیت،
خدمات اور علمی و ادبی تصانیف کے متعلق کچھ عرض کروں۔ میں اس کرم گستری
کے لیے ان کا انتہائی ممنون ہوں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک سادگی پسند، منکسر المزاج حلیم الطبع انسان
تھے۔ اپنی زندگی میں ہزار ہا طلبا کو تاریخ کا درس دیتے اور فارغ التحصیل
بنانے کے بڑے خلوص کے ساتھ ایک طالب علم ہی کہتے ہیں انہیں علم کی
بنیادی وحدت اور اس کے بے پایاں ہونے کا بہت گہرا شعور تھا آخر میں
انہوں نے کہا۔ مقتدرہ قومی زبان ایک ایسا ادارہ ہے جو ان کی تمناؤں
اور آرزوؤں کا آخری مرکز تھا۔ ان کا یہ پکا عقیدہ تھا کہ قومی زبان کا نفاذ
صرف سرکاری دفاتر میں ہونے سے تعلیمی اداروں میں بھی اس کے ذریعہ تعلیم
بننے اور روزمرہ کے کاروبار میں اس کے رائج ہونے پر پاکستان کی بقا اور
اس کے استحکام کا بڑی حد تک دار و مدار ہے جس طرح انہوں نے اپنی وہ
تصانیف جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اپنے ورثہ میں چھوڑی ہیں اس طرح
مقتدرہ قومی زبان کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے اس ادارہ کی وسعت
و ترقی اور اس کے مقاصد کی کامیابی کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے گا۔ وہ
ان کی روح کے لیے باعث مسرت ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید نے کئی اہم باتیں کیں انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر اشتیاق
حسین قریشی کا بچپن مسلمانوں کی بقائے انفرادیت کے دور میں گزرا۔

ڈاکٹر یوسف عباسی نے فرمایا۔
ہر عالم اور مورخ اپنے زمانے کے علمی ماحول اور نفسیاتی فضا میں معاشی و سیاسی
عوامل کی پیداوار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے مستشرق مغربی امپیریلزم کے
آئینہ دار تھے اسی طرح سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مسلمانوں کے مدافعتی
دور کی علامت ہیں

محترمہ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے ڈاکٹر صاحب کی ڈرامہ نگاری کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا کہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جدید دور کے ڈرامہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت و اہمیت کے حامل ہیں انہوں نے اپنے ڈراموں کے موضوعات اور خام مواد اپنے اردگرد بکھری زندگی سے حاصل کیے ۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے مزید کہا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ڈراموں کے ذریعے قومی ترقی و اصلاح معاشرے کا کام لینا چاہتے تھے ان کے خیال میں تمثیل ایک انسانہ ہے جسے زندہ کرکے دکھایا جاتا ہے ان کے نزدیک اچھا تمثیل نگار اجتماعی ذمہ داریوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتا وہ زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کا خاکہ کھینچ کر پیش کرتا ہے تاکہ سماجی ناہمواریوں اور اونچ نیچ کو دور کیا جا سکے ۔

اُردو زبان ہماری

اُردو زباں ہماری
لگتی ہے سب کو پیاری

لفظوں میں جس کے خوشبو
لہجے میں جس کے جادُو
چرچا ہے جس کا ہر سُو
ہے جس کی شان نیاری
اُردو زباں ہماری

لب جو بھی کھولتا ہے
جو کوئی بولتا ہے
گلقند تولتا ہے
پھولوں کی ہے یہ کیاری
اُردو زباں ہماری

آؤ چلیں بڑھیں ہم
افلاک پر چڑھیں ہم
اُردو لکھیں پڑھیں ہم
ہے جان سے بھی پیاری
اُردو زباں ہماری

عورت کی آزادی کی بات کرنے کی کسی کو فرصت نہیں

پنجابی اپنی زبان کی خود ہی دھجیاں اڑا دیتے ہیں

وہ ہر زبان سلیقے سے بولتے ہیں اپنی زبان کیساتھ انصاف نہیں

عجیب اتفاق ہے جب بھی تقریر کرتی ہوں اذان ہو جاتی ہے : بشریٰ رحمان

لاہور (نامہ نگار) پنجاب اسمبلی کی رکن بشریٰ رحمن نے کہا کہ جب میں بولنے لگتی ہوں تو اذان ہو جاتی ہے۔ پنجابیوں نے ہر زبان کو سلیقے سے بولا لیکن اپنی زبان کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کیا۔ دوسرے ممالک میں آزادی کا مفہوم درست نہیں سمجھا جاتا۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے گذشتہ روز گورنمنٹ کالج برائے خواتین گلبرگ میں منعقدہ پنجابی مباحثہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کیا۔ پنجابی مباحثہ کا موضوع "عورت دی آزادی ملکی ترقی دا وجا نال اے" تھا بشریٰ رحمن نے کہا کہ میرے ساتھ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب بھی مجھے تقریر کرنے کیلئے ڈائس پر بلایا جاتا ہے اور جونہی میں اظہار خیال کرنے لگتی ہوں تو اذان ہو جاتی ہے انہوں نے کہا کہ تاریخ گواہ ہے کہ پنجابیوں نے ہمیشہ ہر زبان کو سلیقے اور اچھے طریقے سے بولا۔ لیکن جب یہ اپنی زبان بولنے پر آتے ہیں تو اس کی خود ہی دھجیاں اڑانے لگتے ہیں جو سراسر زیادتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو ملک ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ تدریسی زبان کون سی ہونی چاہئے اور بول چال کی زبان کون سی ہونی چاہئے ان حالات میں عورت کی آزادی کی بات کرنے کی فرصت کس کے پاس ہے۔ اس پنجابی مباحثہ میں کل دو کالجوں کی تین تین طالبات نے حصہ لیا۔ گلبرگ کالج کی طرف سے قرارداد کی حمایت میں شہناز بانو نے اور مخالفت میں شازیہ ہاشمی نے تقریر کی۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق اول انعام زاہدہ گل، دوم ... علی، اور سوئم انعام نبیلہ سرور جوزانے حاصل کیا۔ منصفین کے فرائض والدہ ... جعلی، پروفیسر نسیم اختر نے انجام دیئے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض تبسم ... نے انجام دیئے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ء

تمام سرکاری دفاتر کو اردو ٹائپ رائٹر فراہم کئے جائیں گے

خانیوال (ا ا مارچ) نمائندہ جسارت ضلعی مجلس زبان دفتری خانیوال کے اجلاس میں تجویز پیش کی گئی کہ محکمہ تعلقات عامہ کے تمام ضلعی دفاتر میں اردو ٹائپ رائٹر فراہم کئے جائیں تاکہ ان دفاتر میں اردو ٹائپ کاری کا کام بہتر طریقے سے انجام پا سکے۔ ضلعی مجلس زبان دفتری کا اجلاس جو مجلس کے صدر مرتضیٰ بیگ برلاس ڈپٹی کمشنر خانیوال کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں کئی اور اہم نوعیت کے فیصلے بھی کئے گئے اور خانیوال میں کل پاکستان اردو کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں کئی تجاویز پر غور کیا گیا خانیوال کچہری بازار کا نام اردو معاشرے ... دوکت سنگلاخ ڈاکٹر ... کے نام سے موسوم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کو اہل قلم میں ایک مقبول علمی شخصیت تھے۔ وہ مقتدرہ قومی زبان کے پہلے صدر نشین بھی تھے مقتدرہ قومی زبان کا مرکزی دفتر آج کل اسلام آباد میں ہے اس نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی یاد میں تقریب بھی راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ صدارت سید قریشی نعمانی کتھید وزارت تعلیم نے کی۔ مہمان خصوصی پریذیڈنٹ خلف صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان تھے۔ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر اعجاز راہی پر تھی سلطانہ بخش، ڈاکٹر انور سدید پروفیسر سعید الدین ڈار و ڈاکٹر یوسف عباسی اور بلال احمد زبیری نے مرحوم کی علمی خدمات پر مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مقالہ آغا سجاد نے پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر اعجاز راہی کی کوششوں اور مختلف ادبی حلقوں میں ان کی مقبولیت کی وجہ سے تقریب میں حاضرین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔

روزنامہ امروز لاہور ۲۰ – ۲ – ۱۹۸۸ء

اردو ٹائپ کاری کورس، ہزاروں ملازمین کو تربیت

راولپنڈی (پی ایس کے) سیکرٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے زیر اہتمام شروع ہونے والا اردو ٹائپ کاری کا دو سراسہ ماہی (جزوقتی) کورس مکمل ہونے پر ادارے کی جانب سے الوداعی تقریب منعقد کی گئی۔ جس میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر معین الدین صدیقی نے شرکاء کورس میں اسناد تقسیم کیں انہوں نے اپنی تقریر میں ادارے کی تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ادارے کی جانب سے سرکاری ملازمین (گریڈ ۵ تا ۲۰) کی حسن کارکردگی کو نکھارنے کے سلسلے میں ۱۹۸۶ء تک ۵۳۸

باقی صفحہ (۶) کالم (۱) پر

کورسز منعقد کئے جا چکے ہیں۔ جن میں ۱۴۰۵۵۹ سرکاری ملازمین نے شرکت کی انہوں نے کہا کہ ہماری کوشش ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ اہلکاروں کو اردو مختصر نویسی ٹائپ کاری کی تربیت دیں۔ کلاس انچارج نور الستار نے شرکاء کورس کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شروع کئے گئے اردو ٹائپ کاری کورس سے نفاذ اردو کے سلسلے میں مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲ اپریل ۱۹۸۸ء

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلّہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پاکستان کے وہ مایہ ناز اہلِ قلم تھے جو ایک نادر اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بلند پایہ مصنف مایہ ناز مورخ، خوش بیان مقرر، ماہرِ تعلیم، مخلص سیاستدان اور تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن رہنما تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیک وقت علم و فضل کے متنوع میدانوں میں اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ آپ نے تصنیفات، تالیفات اور تحقیقی علمی اور فکری مقالوں کا ایک وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا دائرہ تحقیق مختلف میدانوں پر محیط ہے وہ ایک اعلیٰ پائے کے بین الاقوامی شہرت کے تاریخ دان تھے ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات "سلطنت دہلی کا نظم حکومت" "سلطنت مغلیہ کا نظم و نسق" "مغل سلطنت کا بانی اکبر" یہ کتابیں اپنے موضوع پر چند اہم اور مستند تصانیف میں سے ایک سمجھی جاتی ہیں ان سے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی اکثر و بیشتر تحریریں "نظریۂ پاکستان" "تحریک پاکستان کے ارتقائی مراحل، پاکستانی ثقافت اور پاکستان کے لیے جد و جہد" وہ مستند اور معتبر تصانیف ہیں جو تاریخ پاکستان کے طالب علم اور محققین حوالے کے لیے استعمال کرتے ہیں ایک محقق اور مؤرخ کی حیثیت سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی کراچی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم جیسی ہمہ گیر ہستی کی علم دوستی اور علمی خدمات کے اعتراف میں آپ کے علمی کارناموں کو احسن طریقے سے متعارف کرانے اور دورِ حاضر کے سکالروں اور طلبا میں یہ ذوق پیدا کرنے کے لیے بلند پایہ مقالات کا یہ مجموعہ نہایت سلیقے سے مرتب کر کے شائع کیا یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا انفرادی مجموعہ ہے جس میں ان مقالات کے علاوہ جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت، ان کی علمی، دینی، سیاسی اور سماجی خدمات پر ملک کے معروف اہلِ قلم نے تحریر کیے، وہ خصوصی مقالات بھی ہیں جو مقالہ نگار حضرات نے اپنی پسند کے مطابق ایسے موضوعات پر تحریر فرمائے جن کا تعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم کے زیرِ تحقیق علمی میدانوں سے ہے۔ ان مقالات کے موضوعات میں ڈاکٹر قریشی اور قراردادِ مقاصد کا ایک جائزہ' دہلی کی بادشاہت کا تجزیہ' قرونِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے سبق آموز واقعات' اسلامی سیاسی فکر میں شریعت کی اہمیت' تصوفِ عمر، تصوف کا اثر ہندو سماج پر اقبال کے افکار میں نیشنلزم اور پان اسلامزم کا امتزاج۔ اردو ہندی تنازع میں علی گڑھ کا کردار۔ تہذیبِ جدید کا فکری بحران اردو ادب کے آئینے میں' جاپان میں اردو تعلیم کی تاریخ۔ زبان کے دو مقاصد جیسے فکر انگیز تحقیقی مقالات شامل ہیں۔

پیش لفظ جناب قدیر الدین احمد نے تحریر کیا۔ کتاب کے آغاز میں مقالہ نگاروں کے کوائف درج ہیں مجلدہ کے آخری صفحات پر ایک مبسوط اشاریہ قارئین کی رہنمائی کے لیے درج ہے۔

یہ یادگاری مجلدہ اکادمی کی قابلِ تحسین پیشکش ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب مرحوم کے شاگردوں اور مداحوں کے لیے عموماً اور اہلِ علم حضرات کے لیے خصوصاً دلچسپی کا باعث ہوگی اور اہلِ علم میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی چار سو صفحات پر مشتمل یہ مجلدہ آفسٹ پیپر پر نہایت خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اس کے لیے اکادمی قابلِ مبارکباد ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلدہ تحقیقی و علمی سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

——— ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

مقتدرہ کے زیرِ اہتمام

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یاد میں منعقدہ سیمینار کی تصویری جھلکیاں

معتمد برائے تعلیم سید احمد قریشی سیمینار سے خطاب کر رہے ہیں

صدر نشین مقتدرہ ڈاکٹر وحید قریشی سیمینار سے خطاب کر رہے ہیں

پروفیسر سعید الدین ڈار سیمینار سے خطاب کر رہے ہیں

ڈاکٹر [illegible] عباس اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں

انور سدید سیمینار میں اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں

سیمینار کے حاضرین کا ایک منظر

اس شمارے کے اہم مضامین

- اردو میں سرکاری زبان بننے کی پوری صلاحیت ہے
- اردو ذریعہ تعلیم وقت کا اہم تقاضا
- دفاتر میں اردو کا نفاذ
- خاتون ملاوٹ کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے خود اردو میں انگریزی کی ملاوٹ کا ارتکاب کر رہی تھیں
- اردو قومی زبان کب بنے گی؟
- پاکستان میں اردو دوعملی کا شکار ہے
- پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں کے درمیان مشترکہ زبان اردو ہے
- قومی زبان اُردو اپنے ہی گھر میں اجنبی
- ڈاکٹر وحید قریشی ملک میں اردو کا نفاذ
- نصاب اور معیار تعلیم کی جانچ پڑتال کی جائے

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ۰ اسلام آباد

جون

جلد: ۴

سید افتخار حسین شاہ

اُردو میں سرکاری زبان بننے کی پوری صلاحیّت ہے

ہمیں شرم آتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک غیر زبان گھر کی رانی بنی بیٹھی ہے اور ہماری اپنی زبان کی حیثیت اس کے سامنے ایک پیش دست سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ تاثر اردو زبان کے کسی طالب علم یا معلم کا نہیں ہے۔ انگریزی ادبیات کے ماہر اور کہنہ مشق استاد جناب پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کا ہے اور "ہماری اپنی زبان" سے ان کی مراد اردو زبان ہے۔ وہ اردو زبان جو آج سے پانچ سو سال پہلے دکھنی کے نام سے گھر کی رانی بنی بیٹھی تھی لیکن اغیار کے غلبے کی وجہ سے اس اعزاز سے محروم ہوتی رہی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اردو زبان کے سب محقق اور مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ترویج و فروغ کے لیے سب سے پہلے بہمنی قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے جنوبی ہند یعنی دکن کے علاقے میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ ان خاندانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اردو کا دامن علمی اور ادبی تحریروں سے مالا مال کرنے کے علاوہ اسے سرکاری زبان ہونے کا شرف بھی بخشا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی مشہور تصنیف اردو ادب کی مختصر تاریخ میں اس کا سہرا بالخصوص عادل شاہی خاندان کے سر باندھا ہے جس کے دورِ حکومت کا آغاز ۸۹۸ھ بمطابق ۱۴۹۰ء میں ہوا تھا اور جس کے بیشتر بادشاہوں نے اردو کو جو اس وقت دکھنی کہلاتی تھی، سرکاری زبان مقرر کیا۔ اس طرح آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے ایک غیر ملکی حکمران نے زبان فارسی کے مقابلے میں اردو کو سرکار اور دربار تک رسائی حاصل ہوئی تھی۔

یہی دکن کا وہ علاقہ ہے جو برطانوی دور میں ریاست عثمانیہ کے نام سے مشہور ہوا اور جہاں انگریز کے سیاسی غلبے کے باوجود اردو زبان کو صرف سرکاری حیثیت ہی حاصل نہ رہی بلکہ ایم اے اور ایم ایس سی کی سطح تک تمام مضامین کی تدریس کا ذریعہ بھی اردو بنی۔

جنوبی ہند کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں بھی جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی تو مرکز کی سرکاری زبان فارسی کی گرفت بھی ڈھیلی پڑتی گئی اور مقامی زبان اردو کا زور بڑھتا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام کے ساتھ اردو کو انگریزوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اس دور میں اردو میں انگریزوں کی دلچسپی صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین تک محدود نہ رہی۔ برصغیر پر کامیابی سے حکو[مت] کرنے کی خواہاں برطانوی ملکہ بھی مولوی برکت اللہ اور حافظ منشی عبدالکریم سے ا[ردو] پڑھنے لگی اور اپنے ہاتھ سے وکٹوریہ قیصرۂ ہند لکھنے لگی۔ ۱۸۳۵ء تک اردو کا اث[ر] بڑھا کہ کمپنی نے اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا۔ بعض ریاستوں میں بھی ا[سے] یہی مقام حاصل ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مغلیہ خاندان کی ناکامی کے ساتھ فارسی زبان کا اقتدار بھی غروب ہو گیا اور انگریزوں کے ساتھ انگریزی کی حکمرانی کا دور شروع ہ[وا۔ اس] دور میں انگریزی کے بعد جس زبان کو زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہوئی، وہ بلاشبہ [اردو] تھی۔ برطانوی دور کے دفتری ریکارڈ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ضلع کی سطح تک محکموں کا کام اردو میں ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۸۵۳ء میں ایک عدالتی مثل کو درج ذیل حکم کے مطابق داخل دفتر کر دیا گیا:

"این جانب اس مقدمہ میں کچھ دست اندازی نہیں کر سکتے ہیں عرضی داخل د[فتر] ہووے۔ سائل کو سمجھایا گیا اور نقل روبکار کی بذریعہ چٹھی معمولی اطلاعاً بمحکمہ کمشنری مک[ان] محفوظ حسب ضابطہ مرسل ہووے۔"

یہی نہیں انتظامی اور عدالتی عہدوں کے لیے جو امتحان ہوتا تھا اس کا ذریعہ اردو زبان تھی۔ سرسید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد ایسے ہی امتحان میں کامیاب ہو کر منصف اور ڈپٹی کلکٹر بنے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا بھی یہ کارنامہ قابل ذکر ہے کہ انہوں نے قا[نون] کی سب سے زیادہ اہم اور دقیق کتاب کا ترجمہ "تعزیرات ہند" کے نام سے ۱۸۶۱ء میں مکمل کر دیا تھا۔ اس کے چند سال بعد ۱۸۶۷ء میں جب ہندوؤں نے بنارس میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو سرسید احمد خان اسلام اور اردو کی بنا پر دو قومی نظریہ کے مبلغ بن گئے۔ بقول مولانا حالی:

"سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال

ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہی دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے
جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور
وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں
نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی
کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل
سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد
ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے
گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے میں نے کہا
مجھے بھی افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔

برصغیر کی تاریخ شاہد ہے کہ سرسید کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ ہندوؤں کی معاندانہ
اور متعصبانہ پالیسی سے تنگ آ کر مسلمانوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۳۰ء
میں حکیم الامت علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا جو قائد اعظم کی مساعی جمیلہ کی بدولت
۱۹۴۷ء میں ایک حقیقت بن کر دنیا کے نقشے پر ابھر آیا۔ منزل پر پہنچ کر قائد اعظم نے اردو کی
دیرینہ اور شاندار روایات کے پیش نظر بجا طور پر یہ فرمان صادر فرمایا کہ

"میں واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور
صرف اردو ہوگی۔ ایک مشترک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے
اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

افسوس ہے کہ پاکستان کے بعد قائد اعظم کی زندگی میں ان کے اس فرمان کی تعمیل کی
صورت پیدا نہ ہو سکی کیونکہ انہیں اپنے نقشے میں رنگ بھرنے کی ایک سال سے زیادہ مہلت
ہی نہ مل سکی۔ ان کی حیات پرور قیادت سے وطن عزیز بھی محروم ہوا اور قومی زبان اردو بھی۔
دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ قائد اعظم کے بعد ان کے چند جانشینوں اور ہم نشینوں نے ترویج
اردو کے لیے بعض اقدامات ضرور کیے لیکن سردار عبدالرب نشتر مرحوم کے سوا کسی دوسری شخصیت
کا کام قابل ذکر اور قابل ستائش نہیں ملتا۔ جب نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر بنے ان کی ذاتی دلچسپی
کی بنا پر حکومت پنجاب کے ہر محکمہ میں اردو کو رائج کرنے کے لیے منظم اور کوشش کی گئی
۱۹۴۹ء میں قائم شدہ مجلس دفتری زبان پنجاب نے وضع اصطلاحات کے سلسلے میں اپنی کوششیں
تیز تر کر دیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی بعد ازاں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ایسے ادارے قائم
کیے گئے جن کا مقصد اردو کی ترویج و ترقی تھا۔ مرکزی حکومت کے زیر اثر مقتدرہ قومی زبان کے
نام سے بھی ایک ادارہ مذکورہ اغراض کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
۱۹۷۹ء سے دفتری اردو کورس شروع کر چکی ہے لیکن ان اداروں کی سب کوششوں کے
باوجود بقول ریٹائرڈ کرنل محمد ایوب خان:

"جب تک انگریزی زبان کا غلبہ قائم ہے اور ملک کے بڑے مناصب پر میکالے پرست
سیاہ فام انگریز فائز ہیں۔ اردو کبھی سرکاری زبان نہیں بن سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بار بار
کے وعدوں کے باوجود اردو دفتروں کی دہلیز پر بھی نہیں پہنچنے دی گئی"۔

محسن اردو ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی رائے بھی سابق فوجی افسر سے کچھ مختلف نہیں۔
فرماتے ہیں۔

"مقام افسوس و اندوہ سہی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان میں اردو کا معاملہ ایک ایسے
بے کس کا ہے۔

ع غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

قیام پاکستان کے بعد اردو سے یاران شہر نے آنکھیں پھیر لیں اور دفاع کی ذمہ داری
چند فقرا کے کندھوں پر آ پڑی"۔

جن فقراء کی طرف محسن اردو اردو نے اشارہ کیا ہے، ان میں بابائے اردو مولوی
عبدالحق مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جسٹس ایس اے رحمن، جسٹس
شمیم حسین قادری، جسٹس اے آر کارنیلیس، ایس ایم اکرام، ایس ایم شریف، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر
ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، حکیم احمد شجاع صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی،
سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر محمود احمد خان،
ڈاکٹر بشارت علی، ڈاکٹر وحید قریشی، میجر آفتاب حسن، حنیف رامے، شہرت بخاری، سید قاسم محمود
اور پروفیسر منور مرزا جیسے نامور اہل قلم شامل ہیں۔ خدام اردو کی یہ فہرست مکمل نہیں بلاشبہ
اس میں کئی اور نام شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس فہرست سے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا
ہے کہ ان فقراء کے کندھے کتنے مضبوط تھے۔ افسوس ہے کہ کندھے مضبوط ہونے
کے باوجود فقراء کی فوج ظفر موج اب تک اردو کا دفاع نہیں کر سکی۔ دشمنان اردو اب
بھی ملی تقاضوں کو بین الاقوامی تقاضوں کے تابع سمجھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انگریزی کی برتری
برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اردو کو دفاتر میں ہر سطح پر رائج کرنے کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ ایسے
معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ قائد اعظم بھی بین الاقوامی تقاضوں سے باخبر تھے لیکن انہوں نے
ملی تقاضوں کو ترجیح دیتے ہوئے قومی زبان کو قومی اتحاد کی علامت قرار دیا اور قومی تشخص
کے احیا کے لیے اردو کا نفاذ ضروری سمجھا۔ معترضین کا اردو زبان کی کم مائیگی کے متعلق اعتراض
بھی حقیقت حال سے بے خبری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اردو میں دفتری

پروفیسر رشید خاں

اُردو ذریعۂ تعلیم ۔ وقت کا اہم تقاضا

جدید ماہرینِ معاشیات کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کے کروڑوں عوام کو بھوک اور غربت کے عفریت سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ اس وقت مغربی یورپ، جاپان، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے سوا دنیا کا بڑا حصہ غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہا ہے یہاں کے عوام تعلیم، صحت و صفائی، رہائش اور تفریح کی معمولی اور روایتی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ غربت، پسماندگی، گرانی، افراطِ زر، کثرتِ آبادی اور بے روزگاری اس دنیا کے عام مسائل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کی کل آبادی کا ۶۶ فیصد حصہ پسماندہ ممالک میں آباد ہے۔ عالمی ادارے کی رپورٹ کے مطابق صنعتی انقلاب کے دو سو سال بعد بھی اس آبادی کا تقریباً ۴۰ فیصد حصہ مطلق غربت سے دوچار ہے۔ غربت کا یہ عالم کہ امریکہ میں پاکستان کے مقابلہ میں فی کس آمدنی کا تناسب چالیس گنا سے بھی زائد ہے یعنی پاکستان کے چار سو ڈالر کے مقابلہ میں امریکہ کی فی کس آمدنی تقریباً ۱۶ ہزار ڈالر سالانہ ہے۔ امریکہ میں دنیا کی کل آبادی کا چھ فیصد حصہ آباد ہے لیکن اس کے حصے میں عالمی دولت کا ایک چوتھائی آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکی ممالک میں دنیا کی آبادی کا ساٹھ فی صد حصہ آباد ہے لیکن اس حصے کی آمدنی دنیا کی آمدنی کا صرف چھ فیصد ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں سالانہ شرحِ ترقی کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں لاطینی امریکہ میں یہ شرح دو فیصد سے بھی کم تھی جبکہ امریکہ میں ایک فیصد، مشرقی ایشیا میں دو فیصد اور جنوبی ایشیا میں نصف فیصد سے کم تھی۔ اگر سالانہ ترقی کی یہ شرح قائم رہے تو صرف فی کس آمدنی دوگنا ہونے میں لاطینی امریکہ میں چالیس سال، مشرقی ایشیا میں ۳۵ سال، افریقہ میں ستر سال اور جنوبی ایشیا میں ڈیڑھ صدی کا عرصہ لگے گا۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق آبادی کے جس حصے کی فی کس آمدنی ۵۰ ڈالر سے کم ہو وہ غریب کہلاتی ہے اور ترقی پذیر ممالک کی نصف سے زائد آبادی کی فی کس آمدنی اس حد سے کم ہے اور آبادی کے تیسرے حصے کی فی کس آمدنی ۵۰ ڈالر سے بھی کم ہے۔ اس سے ان ملکوں کے عوام کے پست معیارِ زندگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ عالمی ادارے کی ۱۹۸۵ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی ساڑھے چار ارب کی آبادی میں سے نصف فاقہ کشی سے دوچار ہے۔ اس صورتِ حال نے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے عوام اور حکومتوں میں معاشی ترقی کا شدید ترین جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر مائر اور بالڈون کے مطابق "معاشی ترقی سے مراد ایسا پراسیس ہے جس کی بدولت کسی ملک کی حقیقی قومی آمدنی ایک طویل عرصۂ وقت میں بڑھ جائے اور اگر ترقی کی شرح افزائشِ آبادی کی شرح سے زیادہ ہو تو فی کس آمدنی بڑھ جاتی ہے۔"

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں معاشی ترقی کا انحصار سرمایہ کی تشکیل اور دیگر عوامل کے علاوہ تعلیم، فنی تعلیم اور ٹیکنالوجی پر بھی ہے۔ پروفیسر اسے کیرن کراس کے مطابق بین الاقوامی غربت بظاہر ایک معاشی مسئلہ ہے جبکہ گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ ایک تعلیمی مسئلہ ہے، جس غربت کو دور کرنے کی ضرورت ہے وہ جدید صنعتی اثاثوں کی کمی کی غربت سے زیادہ روحانی قوتوں کی کمی والی غربت ہے..... کوئی ملک اس وقت تک ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک اس میں تعلیم و تربیت کا نظام ترقی یافتہ ملکوں جیسا قائم نہیں ہو جاتا اس لیے پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم بالخصوص فنی تعلیم کے ذریعے یہاں کے لوگوں کی قوتِ کارکردگی میں معتدبہ اضافہ کیا جائے۔ اقتصادی ترقی اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک میں ایک ایسا مربوط اور مبسوط نظامِ تعلیم وضع کیا جائے جو ملک کو کم سے کم عرصہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید دور میں داخل کرائے اور ہماری سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو۔

منصوبہ بندی کمیشن کی رائے میں "قومی نشوونما کا پیچیدہ عمل بڑی حد تک انسانی وسائل پر انحصار رکھتا ہے اور اس میں تعلیم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیمی نظام ایک سماجی ادارے اور انسانی وسائل کی تشکیل اور ترقی کے عامل کی حیثیت سے کسی قوم کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی ترقی کے لیے ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے جدید ماہرینِ اقتصادیات اس امر پر متفق ہیں کہ تعلیم پر خرچ کی جانے والی رقم صرف دولت کی بجائے سرمایہ کاری کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف انسانی ٹیلنٹ کی دریافت ہوتی ہے بلکہ اسے جلا بھی ملتی ہے۔

معاشی ترقی میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت کے تناظر میں اگر پاکستان کی موجودہ کاوشوں کو دیکھا جائے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ۱۹۸۵ء تک تعلیمی ترقی پر قومی آمدنی کا ایک فیصد سے زائد حصہ کبھی بھی خرچ نہ کیا گیا۔ موجودہ سال کے دوران اقرا ٹیکس کی بدولت یہ تناسب ۲ء۴ فیصد تک پہنچ سکا ہے جو تیسری دنیا اور ترقی پذیر ممالک میں غالباً سب سے اہم شرح ہے اگرچہ بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش معاشی ترقی کی رفتار میں پاکستان سے پیچھے ہیں لیکن وہاں پر قومی

آمدنی کا دس سے پچیس فیصد تک تعلیمی ترقی پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک کے مقابلے میں پاکستان میں خواندگی کا گراف بہت نیچا ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں خواندگی کا تناسب ۲۷ فیصد ہے جبکہ بعض ذرائع کے مطابق یہ تناسب صرف گیارہ بارہ فیصد تک ہے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صرف دستخط کرنا جانتے ہیں۔ پاکستان میں پست معیار تعلیم کی وجوہات میں مالیاتی وسائل کی کمی کے علاوہ خود موجودہ نظام تعلیم بھی ہے جس کی اساس ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے اس خطے میں انگریزوں کے مخصوص سامراجی عزائم کی تکمیل اور تحفظ کے لیے رکھی تھی۔ موجودہ نظام تعلیم کی خرابیاں اور ان کے حل کے بارے میں ہم نوائے وقت کے ان صفحات کے حوالے سے حکومت تک اپنی گزارشات اور تجاویز ان مضامین کے ذریعے پہلے ہی پہنچا چکے ہیں حکومت نے ان تجاویز کو نئے سال کی تعلیمی پالیسی کا حصہ بنا لیا ہے یعنی پرائمری سطح تک بچوں کے پاس صرف دو کتابیں ہوں گی۔ ایک حساب کی اور دوسری اردو کی جس میں دیگر علوم کے بارے میں بھی معلوماتی مضامین شامل ہوں گے اور دوسرے یہ کہ انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے گا۔ ان دو اقدامات اور تبدیلیوں سے پرائمری کی سطح پر بچوں پر زیادہ کتابوں کا بوجھ نہیں پڑے گا اور پانچ سال کی مدت میں انہیں حساب کے بنیادی قواعد کے علاوہ اردو لکھنا پڑھنا بھی آئے گا جس کی وجہ سے اگلی کلاسوں میں دیگر مضامین کے سمجھنے میں انہیں آسانی رہے گی۔ انگریزی مضمون کے اختیاری ہونے سے اسے صرف وہ طالبعلم ایک زبان کی حیثیت سے پڑھیں گے جنھیں واقعی اس سے لگاؤ ہو گا اور دوسرے طلبا جو اس سے شغف نہ رکھتے ہوں گے انہیں دیگر علوم اور زبانوں میں ترقی کے زیادہ مواقع فراہم ہوں گے۔

اگر وفاقی وزیر اس ضمن میں ذریعہ تعلیم کے بارے میں بھی ہماری تجویز سے اتفاق کرتے تو اس سے پوری قوم کا بھلا ہوتا کیونکہ انگریزی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے ہمارے طلبا کو علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی پڑھنی پڑتی ہے جبکہ زیادہ حصہ انگریزی سمجھنے پر ہی صرف ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا طالب علم نہ تو انگریزی کا ماہر بن پاتا ہے اور نہ ہی متعلقہ علم کی شاخ کا۔ اس طرح قوم کا ٹیلنٹ نظام تعلیم کی اساسی خرابی کی وجہ سے ضائع ہو رہا ہے۔

گزشتہ چالیس برسوں سے ہر حکومت یہ مژدہ سناتی آئی ہے کہ قومی زبان اردو کو جلد ہی اس کا جائز مقام دیا جائے گا اور اسے سرکاری انتظامیہ اور ذریعہ تعلیم کی زبان بنایا جائے گا لیکن بیوروکریسی نے ان سیاسی فیصلوں کو کبھی بھی عملی شکل میں نہ آنے دیا کیونکہ اگر ایسا ہو جائے پھر عام آدمی کے لیے ترقی کے دروازے کھل جائیں گے جس سے ان کی چالیس سالوں پر محیط غلامی، کنٹرولنگ اتھارٹی کمزور پڑ جائے گی۔ یہ بھی انگریزی ذریعہ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم اس طبقہ کے سوا عوامی چین، جاپان، روس، فرانس اور اٹلی جیسا عالمی شہرت کا حامل سوائے ڈاکٹر عبدالسلام کے کوئی سائنسدان اور ماہر پیدا نہ کر سکے۔ ان ملکوں میں انگریزی کی بجائے ذریعہ تعلیم ان کی اپنی زبانیں ہیں لیکن ان کا شمار آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنانے کا ایک یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا دامن ابھی اتنا وسیع نہیں کہ جدید علوم کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ یہ رویہ اردو زبان بلکہ قوم کے ساتھ سراسر ایک دھوکہ اور فراڈ کے مترادف ہے کیونکہ جس زبان میں ڈاکٹر عبدالسلام کے سائنسی مضامین اور مقالہ جات کا ترجمہ ہو سکتا ہے کیا اس کے بارے میں کم مائیگی کا گلا کیا جا سکتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ بالخصوص تعلیمی شعبے میں اس کے نفاذ کی عملی اور انقلابی کوششیں کی جائیں۔ ملک کی تمام جامعات، کالجوں اور سکولوں میں جن میں پیشہ ورانہ ادارے بھی شامل ہیں۔ فی الفور اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے اور انگریزی کو کسی بھی شکل میں پورے ملک میں ذریعہ تعلیم نہ بننے دیا جائے کیونکہ اس کی موجودگی یعنی دوسرے ذریعہ تعلیم کے نظام سے نہ صرف اردو کو نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ ملکی آبادی کا ایک طبقہ اس کمپلیکس میں مبتلا ہے کہ ٹیلنٹ ہمیشہ انگریزی سکولوں میں پیدا ہوتا ہے اور اردو سکولوں میں صرف کمزور بچے ہیں بلکہ اس کمپلیکس سے پوری قوم متاثر ہو رہی ہے اور یہ ایسی بھیڑ چال ہے کہ ہر شخص اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس کے بچے کو انگریزی سکول میں داخلہ مل جائے۔ اس سے ہمارے ملک میں طبقاتی کشمکش بھی شروع ہے جس نے ملک کے لیے بہت سی سیاسی، سماجی، معاشی معاشرتی اور اخلاقی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف ملک میں موجود تمام تعلیمی اداروں میں اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کیا جائے بلکہ ایسے ادارے بھی ختم کیے جائیں جن کے الحاق نظام اور تدریس کا سلیبس بیرونی ملکوں کے تعلیمی ادارے سے منسلک ہو کیونکہ اگر یہ صورت حال باقی رہی تو اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے باوجود بھی طبقاتی کشمکش ختم نہیں ہوگی اور اردو ذریعہ تعلیم کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوں گے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق انگریزی اور چینی زبان کے بعد اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے جو دنیا کی آبادی کے غالب حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہ بات ہمارے لیے قومی افتخار کا باعث ہونی چاہیے۔ اردو ذریعہ تعلیم پر قیام پاکستان سے قبل بھی بڑا کام ہوا ہے۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں درس و تدریس کا ذریعہ ہی اردو تھا جس میں اس وقت کے تمام جدید ترین مضامین کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ ہم اس کام کو آگے بڑھاتے کیونکہ اس سلسلے میں بنیاد ہمارے پاس پہلے سے موجود تھی لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔

(بشکریہ "نوائے وقت" کراچی ۹-۳-۸۷)

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

دفاتر میں اُردو کا نفاذ

دفتروں میں اردو کا نفاذ ایک اہم مگر نازک قومی مسئلہ ہے ہمارے دوسرے مسائل کی طرح اسے بھی وسیع تر قومی تناظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں پاکستان یکے بعد دیگرے جن بحرانوں سے گزرا اور ان پر قابو پانے کے لیے جو کچھ کیا گیا اس کے نتیجے میں ہمارا ملک اور قومی احساس دونوں عدم استحکام کا شکار ہوئے۔ بد قسمتی سے قومی شعائر کے احترام اور ان کے فروغ کا سوال ہماری ترجیحات میں مناسب مقام نہیں پا سکا اس لیے قومی زبان بھی کے بارے میں ایک قسم کی بے تعلقی بلکہ بے حسی کو روا رکھا گیا ہم اب تک اسے اپنی زندگی میں وہ اہمیت نہیں دے سکے جو اس کا حق ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہم نے انگریز سے تو آزادی حاصل کر لی مگر انگریزی کی غلامی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ معمولی سے معمولی کام کے لیے عام آدمی کا ذہن بھی انگریزی ہی کی طرف جاتا ہے۔ انگلش میڈیم ہماری کمزوری بن چکا ہے۔ بیشتر تعلیم یافتہ لوگ جس بے جواز انگریزی آمیز اردو میں گفتگو کرتے ہیں قومی زبان کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے جب ہم اردو کو اپنی عام زندگی میں نافذ نہیں کر سکے تو دفتروں میں اس کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمارا یہ ذہنی رویہ بھی نفاذ اردو کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

اس رویے کی تشکیل میں انگریزی کی برتری سے قطع نظر زبان کے بارے میں ہمارا غیر محتاط عمل اور ردعمل بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی سے پہلے برصغیر کی لسانی صورتحال نسبتاً واضح تھی اردو کو متحدہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی اور ہندی کو تمام ہندوؤں کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی لیکن آزادی کے بعد یہ صورت حال برقرار نہ رہی اس حمایت میں کمی آئی اردو اور ہندی کو تقریباً ایک جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجتاً اردو اب تک پاکستان کی اور ہندی بھارت کی سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ اصل بات یہ ہے کہ آزادی کے جوش و خروش میں بعض مسائل کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی لیکن حصول آزادی کے بعد جب یہ جوش و خروش دھیما پڑ جاتا ہے تو وہ مسائل سر اٹھاتے ہیں اس طرح نو آزاد ملکوں میں بعض اوقات سماجی اور سیاسی حالات، قومی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اردو اور ہندی اپنے اپنے ملک میں انہی رکاوٹوں سے دوچار ہیں تحریک پاکستان کے دوران اردو کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس سے یقین ہو گیا تھا کہ اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن قانون ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس ہی سے واضح ہو گیا کہ بات اب اتنی آسان نہیں رہی۔

مشرقی بنگال میں لسانی تحریک کے نتیجے میں بنگال کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا اس طرح اردو کی مسلمہ اور متفقہ حیثیت کو دھچکا لگا۔

یہ لسانی فیصلہ بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا۔ مغربی پاکستان میں اردو کی قومی حیثیت کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہاں بھی بعض عناصر نے صوبائی زبانوں کو قومی زبان کے مقابل لانے کی کوشش کی۔ پاکستان کو دولخت کرنے میں لسانی مسئلے نے جو کردار انجام دیا اس کے پیش نظر حکومت اور عوام دونوں اس مسئلے پر جرأت مندانہ موقف اختیار کرنے میں تذبذب کا شکار ہو گئے اس طرح افسر شاہی حالات کو جوں کا توں رکھنے میں کامیاب رہی اور اردو دفتروں میں بار نہ پا سکی۔

۱۹۷۲ء میں سرحد اور بلوچستان میں جو صوبائی حکومتیں برسر اقتدار آئیں انھوں نے اپنے اپنے صوبے میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا لیکن ان حکومتوں کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا مارشل لا کی حکومت نے اردو کے نفاذ کے لیے بہت سے اقدامات کیے لیکن ان اقدامات کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے اور نفاذ اردو کی منزل ابھی نہیں آئی۔

موجودہ نظام تعلیم سے بھی اردو کو وہ مدد نہیں مل سکی جو اسے ملنی چاہیئے تھی جس زبان کو زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہونا ہے اس کی تدریس کا معیار بہتر اور نصاب میں اس کا مقام بلند ہونا چاہیئے لیکن اردو کی تدریس اس نہج پر ہو ہی نہیں رہی جس سے وہ قومی زندگی میں اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو سکے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ تدریس اردو انتہائی ناقص انداز سے ہو رہی ہے ہمارے ماہرین تعلیم ابھی تک یہ بنیادی مسئلہ نہیں طے کر پائے کہ اردو ہماری اولین زبان ہے یا ثانوی یہی وجہ ہے کہ تعلیمی تقاضوں کے مطابق درست طریقہ تدریس نہیں اختیار کیا جا سکا۔ زبان کے عملی اور افادی پہلو کی بجائے ادب کی تدریس پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ و طالبات روزمرہ زندگی میں زبان سے کام نہیں لے سکتے کیونکہ انھیں اس بات کی تربیت ہی نہیں دی جاتی ادب بھی پڑھایا جانا چاہیئے لیکن اس کی مقدار اور ہر مرحلے کا تعین ضروری ہے۔ اردو کو انٹرمیڈیٹ کی سطح تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت دیکر مطمئن ہو جانا کافی نہیں سنا ہے نئی سکیم میں سائنس کے طلبہ کے لیے اردو کا بوجھ ہلکا کیا جا رہا ہے لیکن اتنی سی اردو پڑھ کر طلبہ و طالبات کو قومی ذمہ داریوں کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کے نصاب اور طریقہ تدریس

دونوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس طرح اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ بھی ہونا چاہیئے اس سے جہاں طلبہ کو سہولت رہے گی وہاں ان کی اردو کو بھی تقویت ملے گی۔ موجودہ حالات میں اردو کی اس محدود تعلیم کے ساتھ ساتھ دفتری کاروبار اردو میں چلایا نہیں جا سکتا اس طرح موجودہ نظام تعلیم دفتروں میں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں مؤثر ثابت نہیں ہو سکا۔

پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے کچھ بنیادی کام کرنے کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی۔ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اردو کے نفاذ کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مرکزی ادارے کا قیام بہت ضروری تھا یہ ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے نام سے قائم تو ہوا لیکن اس کا قیام ۱۹۷۹ء سے پہلے عمل میں نہ آ سکا دراصل نفاذ اردو کے لیے ٹھوس کام اس ادارے کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اس سے قبل پنجاب میں مجلس زبان دفتری ۱۹۴۹ء سے کام کر رہی تھی ۲۷ سال کی مسلسل محنت کے بعد اس ادارے کی طرف سے دفتری اصطلاحات کا لغت ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا یہ لغت دفتری اصطلاحات و محاورات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے جنوری ۱۹۸۰ء میں نفاذ اردو کا تین مرحلوں پر مشتمل ایک تدریجی پروگرام پیش کیا۔ اس منصوبے کی حتمی سفارشات مارچ ۱۹۸۱ء میں کابینہ ڈویژن کو ارسال کی گئیں اس کے مطابق ۱۹۸۲ء تک سرکاری دفاتر میں اردو کا نفاذ مکمل ہونا تھا یہ منصوبہ ابھی تک حکومت کے زیر غور چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں وفاقی حکومت کے دفاتر میں کچھ کام اردو میں کرنے کی بھی ہدایات جاری کی گئی ہیں لیکن ان پر پوری طرح عملدرآمد نہیں کیا جا رہا ہے۔

نفاذ اردو کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ ہماری افسر شاہی ہے ان کے لیے اردو کا انگریزی کی جگہ لینا صرف ایک انتظامی نہیں نفسیاتی مسئلہ ہے۔ استعماری دور کی باقیات اس افسر شاہی کی برتری کا انحصار جن چیزوں پر ہے انگریزی ان میں سب سے اہم ہے اگر انگریزی کی جگہ اردو لے لے تو ان کی انفرادیت اور عظمت کا ستون گر جائے گا صاحب لوگوں کو یہ گوارا نہیں کہ وہ عوام کی سطح پر اتر کر ان کی زبان میں بولیں۔ اگر دفتروں میں اردو نافذ ہو جائے تو افسر شاہی کی اکثریت اپنی مہارت تخصیص کھو بیٹھے کیونکہ انگریزی ہی سے اس کا بھرم قائم ہے اس لیے کبھی اردو کے نفاذ کی منزل قریب آتی ہے تو یہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے دور کر دیتے ہیں خوفناک نتائج سے ڈراتے ہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی مثال دے کر خوفزدہ کرتے ہیں اتنی احتیاط کے مشورے دیتے ہیں کہ معقول لوگ بھی قومی زبان کے مسئلے پر اپنے مؤقف سے دستبردار ہونے پر آمادہ نظر آتے ہیں افسر شاہی کے اس رویے کو دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پوری قوم کو اس کا عملی تجربہ ہے اس رویے میں تبدیلی کے امکانات بظاہر بہت کم نظر آتے ہیں لیکن قوم کے عزم کے سامنے یہ بالآخر بے بس ہو کر اپنی روش ترک کر دیں گے۔

نفاذ اردو کے ضمن میں آزاد کشمیر کی مثال کا ذکر بے محل نہ ہوگا جہاں پاکستان میں اس کے راستے میں اتنی رکاوٹیں آئیں یا کھڑی کی گئیں وہاں یہ مسئلہ آزاد کشمیر میں بڑی آسانی سے حل ہو گیا اس کے لیے راستہ عوام نے ہموار کیا۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں حکومت آزاد جموں و کشمیر نے اردو کے نفاذ کا پہلا حکمنامہ جاری کیا اس حکمنامے سے پہلے عملی طور پر کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ اردو ٹائپ مشینیں تھیں اور نہ تربیت یافتہ عملہ موجود تھا۔ دفتری اصطلاحات کے ترجمے مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا گیا لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکومت نفاذ اردو کے سلسلے میں مخلص اور سنجیدہ تھی اور حکومت کے اہلکاروں میں قربانی کا جذبہ موجود تھا اس لیے وہاں دفتروں میں اردو مکمل طور پر نافذ ہو گئی اور یہ تجربہ پوری طرح کامیاب ہوا۔

(بشکریہ "جنگ" راولپنڈی - ۱۱-۳-۸۷ء)

سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے

عوامی نمائندے اردو کو دفتری زبان بنانے کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ ڈاکٹر وحید قریشی

[illegible]

روزنامہ پکار اسلام آباد ۴ مارچ ۸۷ء

محب وطن افراد کی اکثریت قومی زبان کی حامی ہے

اردو کی ترویج کے لیے دس ہزار صفحات پر مشتمل مسودات پر کام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی

میانوالی (نامہ نگار) پاکستان میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے ملک کی بڑی اکثریت قومی زبان کی حامی ہے مگر انگریزی سے کام لینے والی افسر شاہی ایک مخصوص طبقے کی برتری قائم رکھنے کے لئے انگریزی کو دفتری زبان بنائے رکھنا چاہتی ہے [illegible] اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا انتہائی ضروری ہے ان خیالات کا اظہار مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے گزشتہ روز [illegible] صحافیوں سے ایک ملاقات کے دوران کیا انہوں نے کہا مقتدرہ نے اردو کو مکمل دفتری زبان بنانے کے لئے [illegible] انہوں نے بتایا کہ ۲۷ ہزار الفاظ پر مشتمل لغت مجلس دفتری زبان کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو ۳۰ مارچ تک پنجاب حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔ علاوہ ازیں اردو کی ترویج کے لئے اس ادارے نے ۲۸ کتابیں [illegible] شائع کئے اور دس ہزار صفحات پر مشتمل دیگر مسودات پر کام کیا گیا ہے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ملک میں صرف ایک فیصد لوگ خط و کتابت انگریزی میں کرتے ہیں جبکہ ملک کی تمام اکثریت اردو میں خط و کتابت کرتی ہے۔ جس سے اردو کی عوام میں مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے انہوں نے صحافیوں سے اپیل کی کہ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں اپنا قلم وقف کر دیں۔ کیونکہ اس عمل کے بغیر ملک سائنس اور [illegible] کے میدان میں [illegible] نہیں ہو سکتا اور ملک کے [illegible] اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا

روزنامہ پکار اسلام آباد ۵ مارچ ۱۹۸۷ء

نسیم شاہد

خاتون ملاوٹ کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے ــــ خود اُردو میں انگریزی کی ملاوٹ کا ارتکاب کر رہی تھیں

کچھ عرصہ پہلے ٹی وی پر ایک مذاکرہ ہو رہا تھا موضوع زیرِ بحث تھا ملاوٹ کا اور ٹی وی والوں نے راولپنڈی کی ایک خاتون وکیل کو اظہارِ خیال کی دعوت دینے کے لیے بلایا ہوا تھا لیکن مزیداری کی بات یہ تھی کہ خاتون ملاوٹ کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے خود بھی ملاوٹ کی مرتکب ہو رہی تھی۔ آپ پوچھیں گے وہ کیسے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ انہیں اردو میں اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی اور وہ اپنے ارشادات کو بیان کرنے کے لیے اپنے تئیں زبان بھی اردو ہی استعمال کر رہی تھیں لیکن ملاوٹ کی عادت انہیں بار بار انگریزی کی طرف دھکیل رہی تھی یوں مشرق و مغرب کی یک جائی ان کی زبان سے کچھ اس قسم کے جملے نکلوا رہی تھی۔

"اس کے لیے میری سجیشن یہ ہے کہ وی شُڈ ٹیک کو ئیک ڈیسِزن انصاف میں ڈیلے کرنے سے لا بریکر بل کروا لیتے ہیں اور وُنس اگین اپنے بزنس میں بزی ہو جاتے ہیں۔ بحیثیت لائیر آئی نو اٹ ویری ویل تو۔۔۔۔۔"

کہا تو ان محترمہ نے اور بھی بہت کچھ تھا لیکن وہ میں سب کچھ یہاں لکھ کر آپ کے صبر کا امتحان نہیں لینا چاہتا۔ صبر سے یاد آیا کہ محترمہ کی باتیں سن کر کم از کم میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوا جاتا تھا اور دل میں خواہش ابھر رہی تھی کہ اے کاش اس وقت ہم بھی محترمہ کے ساتھ پروگرام میں شریک ہوتے اور موصوفہ کو اس ملاوٹ پر ٹوکتے اور کہتے۔ محترمہ یہ آپ کا لا ر چیمبر نہیں ٹی وی کا اسٹوڈیو ہے اور اس ٹی وی بے چارے کے چاہنے والوں میں اسی فیصد لوگ ایسے ہیں جو خواندہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ پاسپورٹ سے بھی محروم ہو چکے ہیں ان لوگوں کو انگریزی کے چیکتے دمکتے لفظ بول کر نا امید تو کیا جا سکتا ہے مستفید نہیں۔ ملاوٹ چونکہ ایک عام آدمی کا مسئلہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ عام آدمی کی ہی زبان میں بات کریں جنہیں انگریزی آتی ہے یا جو انگریزی کے لیے آتے ہیں انہیں تو ہوا بھی خالص اور فرحت بخش ملتی ہے ان کے لیے ہوا میں تو ملاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم ٹی وی پر چونکہ ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہے اور ٹی وی کی چھوٹی سی سکرین پر آنے کے لیے ٹی وی پروڈیوسروں کی (خوشامد!) کرنا پڑتی ہے اس لیے ہم یہ اپنی خواہش بوجوہ پوری نہ کر سکے۔

اس ساری سمع خراشی کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا اور اکڑی گردن والا طبقہ بُری طرح انگریزی کے بخار میں مبتلا ہے اور شاید رشوت کے بعد یہ ہمارے ملک کا واحد بخار ہے جس سے "مریض" چھٹکارا پانا نہیں چاہتا۔ انگریزی ہی کا ایک لفظ ہے "فارن" یہ لفظ ہم میں سے بیشتر کے سروں پر بُری طرح سوار ہے کیونکہ اس کا موقع بے موقع استعمال سماجی مرتبے میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے۔ دکاندار پر رعب ڈالنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے "کوئی فارن کا آئیٹم دکھائیے نا" اور کسی تقریب میں اگر فارن کا کپڑا، فارن کا عطر، فارن کا کھانا اور فارن کے برتن استعمال نہ کیے جائیں اور آپ اس تقریب کے میزبان ہوں تو آپ کو اُجڈ گنوار اور پینڈو بننے سے کوئی طاقت محفوظ نہیں رکھ سکتی اور دوسری طرف اگر یہ تمام چیزیں آپ کی دسترس میں ہوں تو چاہے تو آپ کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول یا ہاتھوں میں پھول ڈال کر آئے ہیں آپ کو معزز شہری کہلوانے سے کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ مشاہدے میں تو ایسے لوگ بھی آتے ہیں کہ اگر انہیں فارن کا نام لے کر زہر بھی دیا جائے تو ان کی پھر بھی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ فارن کے اسی گردن توڑ بخار بلکہ احساسِ کمتری سے فائدہ اٹھا کر دکاندار حضرات کوڑیوں کا مال اشرفیوں کے بھاؤ بیچتے ہیں اور فخر سے بھی دکھاتے ہیں۔ مال بیچنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی آزمودہ جملہ ہے "بی بی جی جاپان کا بنا ہوا ہے" یا "میڈ ان فرانس ہے"۔ یہ جملہ سُن کر ہمارے گاہکوں کے نتھنے پھول جاتے ہیں اور وہ اسی بھلاہٹ میں دو کی چیز کے دو سو دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ گاہکوں کے اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والی دو خواتین ایک محفل میں اکٹھی ہوئیں تو اتفاق سے دونوں نے ایک ہی کپڑے کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور دونوں میں یہ بحث جاری تھی کہ یہ کپڑا جاپانی ہے یا امریکی۔ ایک کہہ رہی تھی "میں نے خود اس پر جاپان کی مہر دیکھی ہے" دوسری بضد تھی "جھوٹ ہے۔ مجھے خود دکاندار نے کہا ہے کہ امریکی کپڑا ہے اور مجھے اس نے یو ایس اے کی مہر بھی دکھائی تھی"۔ ان کی بحث جب فسادِ خلق میں ڈھلنے لگی تو ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ معزز خواتین! لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ کپڑا امریکی

ہے اور نہ جاپانی بلکہ پاکستانی ہے اور میری مل میں تیار ہوتا ہے۔" یہ سُن کر وہ دونوں خواتین اپنے لباسوں کو ایسے دیکھنے لگیں جیسے کوئی دیوار پر چلتی ہوئی چھپکلی کو دیکھتا ہے۔ باتیں تو فارن کی محبت میں مبتلا مریضوں کے ضمن میں اور بھی بہت سی کی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف زبان کے مسئلے کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں۔

ہمارے ہاں انگریزی کی برتری اور اردو کو نظر انداز کرنے کا مسئلہ نہایت سنجیدہ نوعیت کا ہے لیکن یہ موج میلہ میگزین والے سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ اور ہلکے پھلکے انداز میں کہنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کا طریق کار اس حکیم جیسا ہے جو کڑوی گولی گل قند میں لپیٹ کر کھلاتا ہے اگر ان کی طرف سے یہ پابندی نہ ہوتی تو میں کہتا کہ قوم کی پہچان دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ زبان اور کلچر تو گویا ہماری پہچان کا ایک لازمی جزو اردو زبان ہے لیکن ہم نے اس جزو کو صرف کاغذات کی حد تک عزیز رکھا ہوا ہے عملی طور پر صورت کچھ دوسری ہے اپنی زبان میں آپ اعلٰے عہدوں کے امتحان نہیں دے سکتے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے بول کر آپ اپنی علمیت کی دھاک نہیں بٹھا سکتے۔ ان سب باتوں کو زیرِ دام لانے کے لیے آپ کو ٹیڑھا منہ کر کے انگریزی بولنی پڑے گی۔ یہ ساری سنجیدہ باتیں ہیں مگر موج میلہ میگزین ایسی ثقیل باتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال معاملہ چونکہ اردو کا ہے اس لیے تھوڑی بہت سنجیدگی طاری کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بس فی الحال آپ "موج میلہ میگزین" کو صرف میگزین سمجھیے۔ میرا مقصود یہاں یہ کھوج لگانا نہیں ہے کہ انگریزی کی تعلیمی افادیت کیا ہے؟ یا یہ بین الاقوامی طور پر کون سے سرخاب کے پر لگاتی ہے؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ معاشرے کے افراد کو محبتوں کے رشتے میں اپنی زبان ہی پروئے رکھتی ہے مگر ہم نے معاشرے میں بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ زبان کے معاملے میں دو عملی اختیار کر رکھی ہے۔ شاید یہ دو عملی بھی قابلِ قبول ہوتی اگر انگریزی کے شیدائی اردو کو نیچا دکھانے کے لیے دولتیاں نہ مارتے۔ ہمارے ہاں انگریزی کی اہمیت نہ تو اس وجہ سے ہے کہ اس کے ذریعے بین الاقوامی رابطے استوار ہو سکتے ہیں بلکہ انگریزی اس لیے برتری کی علامت ہے کہ یہ ہمارے "افسروں" کی زبان ہے۔ انگریزی کو اعلٰے عہدوں کے امتحانات کا ذریعہ بنانا دو دھاری تلوار کی مانند ہے۔ مثلاً جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ بڑا افسر (بڑا بندہ نہیں) بننے کے لیے انگریزی شرطِ اولین ہے تو ان کا دماغ خراب ہے کہ وہ اردو سے عشق کرتے پھریں۔ دوسری طرف جو لوگ انگریزی کا قلزم خون پار کر کے آئیں گے اور افسری کے فضل و کرم کے قائل ہو جائیں گے کیا ان سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اردو پر نگاہِ التفات ڈالیں گے؟ ہرگز نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی کا شترِ بے مہار آج بھی جھومتا ہوا آگے ہی بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ زبان کے اس فرق نے معاشرے کو دو حصّوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک حصّے میں وہ لوگ ہیں جن کے پاس کالا چِٹا دھن ہے اور جو سیاہ کو چشم ابرو کے اشارے سے سفید یا لال یا ہرا کرنا جانتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو کانونٹ سکولوں میں پڑھا کر الہ دین آف انگریزی کے جن کو قابو میں کر لیتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے وسائل انہیں بمشکل اردو میڈیم سکولوں کے دروازے کھٹکھٹانے کی اجازت دیتے ہیں۔ اب آپ ہی کہیں زبان کا یہ فرق کسی کو افسر بناتا ہے اور کسی کو کلرک۔ کیا یہ فاؤل پلے نہیں ہے؟ انگریزی ایک ذریعۂ اظہار ہے ذہانت کی علامت قطعی نہیں اگر انگریزی ہی ذہانت کی علامت ہے تو کسی برطانوی ریستوران کا بیرا بھی ہمارے کرمانوالے سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر سے زیادہ ذہین اور ہو سکتا ہے؟ لیکن سبھی جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اردو میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے بچے ذہانت کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتے لیکن انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ انگریزی میں اپنی ذہانت کو ثابت کریں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ تم نے بھارت میں بھارت سے کرکٹ ٹیسٹ میچ جیتا ہے لیکن ایمپائر بھارتی ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انگریزی کو مقابلے کے امتحان سے یکسر خارج کر دیا جائے بلکہ اسے ایک لازمی مضمون کا درجہ دے کر فقط ایک مضمون کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے اور باقی مضامین کے پرچے اردو میں بھی حل کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس وقت معاشرے کی سب سے بڑی کمزوری افسر بننا ہے اس لیے ہم جب تک اردو کے ذریعے بھی "افسر" پیدا کرنے کا آغاز نہیں کریں گے تب تک یہ انگریزی "چلے کو چلاؤ گوری" کا گیت ہی گاتی رہے گی۔

مقتدرہ قومی زبان" اردو زبان کی "بازیابی" کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی اپنی تمام تر توانائیوں سے اس مشن کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہیں بہت سی اصطلاحات اور کلیے قاعدوں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ یہ سب باتیں بجا لیکن میں بڑے ادب سے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اردو کو رائج کرنے کے لیے اصطلاحات سے زیادہ لوگوں کی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ میں نے شروع میں ایک خاتون کے ارشادات کا ذکر کیا ہے کہ ان محترمہ نے انگریزی الفاظ اس لیے استعمال نہ کیے کہ خدانخواستہ ان کا اردو ترجمہ ابھی نہیں ہوا بلکہ صرف اس لیے ناظرین کے کانوں میں یہ پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا کہ وہ لوگوں کو اپنی علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتی تھیں اور اس کے لیے انگریزی کا استعمال ضروری تھا۔ خیر بہت ہو چکی سنجیدہ باتیں۔ ہمارا چالیس سالہ قومی تجربہ بتاتا ہے کہ ایسی باتوں کا اثر ان پر الٹا ہی اثر پڑتا ہے اس لیے اس سنجیدگی سے نکل آئیں اور ایک لطیفہ نما واقعہ سنیئے۔

عشرت رحمانی

اُردو قومی زبان کب بنے گی؟

کچھ عرصہ پیشتر مینجرز اینڈ پرنسپلز کانفرنس منعقدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سابق وائس چانسلر برادر مکرم سید محمد حامد نے اپنے خطبۂ صدارت میں بالکل بجا فرمایا تھا کہ اس زبان سے دور یا محروم ہو جانا جس کا تعلق مسلمانوں کے تمدن تاریخ و روایات اور تہذیب سے ہو بہت بڑا ذہنی جذباتی اور روحانی افلاس ہے اگر یہ محرومی ایک جیتی جاگتی زبان سے ہو تو اس سے زیادہ کربناک المیہ اور مفلسی تصور میں نہیں آسکتی بلکہ ایسی زبان سے بھی قطع تعلق جو بظاہر زندہ نہیں ہے جواب کہیں بولی نہیں جاتی دور ہو جانا بھی ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ۔ ۔

امریکہ کے شہر کنعان نو میں لاطینی زبان کی ایک معلمہ نے جس کا نام کیتھلین کانڈرن ہے اپنے شاگردوں سے کہا کہ عالمی شخصیتوں کو خط لکھ کر یہ دریافت کریں کہ آیا اس زمانے میں لاطینی زبان پڑھنے سے کچھ حاصل ہوگا تلامذہ نے تعمیل کی اور خط لکھے۔

ساتویں جماعت کے ایک طالب علم کیمسٹن ڈن کو ڈاکٹر کارٹیلی گیا ماسائی کی جانب سے یہ جواب موصول ہوا۔

عزیزم مسٹر ڈن!

آپ ہم سے یہ نہ پوچھیے کہ ہم ایک مردہ زبان کیوں پڑھتے ہیں لاطینی زبان مردہ نہیں ہے یہ جنوبی یورپ کی کئی زبانوں اطالوی، ہسپانوی، فرانسیسی کے روپ میں زندہ ہے خود انگریزی زبان بھی ایک حد تک اسی پر مبنی ہے۔ یہ کلیسا کی زندگی میں جاری وساری ہے اور مغربی دنیا کی رگوں میں دوڑ رہی ہے یہ ان اکابر کی تصانیف میں سانس لے رہی ہے جنھوں نے قدیم زمانہ سے بادیسہ تک اپنے خیالات و احساسات کا اظہار اس میں کیا ہے۔ یہ زبان ہمارے دو ہزار سالہ تمدن میں سانس لے رہی ہے ہم لاطینی زبان اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس کے بغیر ہم اپنی تاریخ اور اپنے ورثہ سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور اسے جانے بغیر ہم خود کو بھی شناخت نہیں کر سکتے۔ ہم لاطینی زبان اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں لاطینی زبان کے ذریعہ ہم قواعد بھی سیکھتے ہیں قواعد بیک وقت وہ دیرینہ فن اور لسانی سائنس ہے جو ہمیں اپنے خیالات اور اس کے نتیجہ میں اپنی حیات کو صفائی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترتیب دینا سکھاتی ہے۔ ۔ ۔

اپنے والدین کو میرا سلام کہیے اور مسز کینڈرن اور خود آپ کو دعائیں ہی دعائیں۔ ۔ ۔

ظاہر ہے کہ مسز کینڈرن بہت اچھی استانی ہیں اس پر تعجب بھی ہونا نہیں چاہیے آخر ان کا نام لاطینی ہے جیسا کہ آپ سے خطاب کرنے والے اور آپ کی قدر کرنے والے مکتوب نویس کا ہے۔"

انگریزی کے سابق پروفیسر حال وائس چانسلر ییل یونیورسٹی کا مندرجہ بالا خط زبان کی اہمیت کے بارے میں ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ زبان ہمیں سوچنے اور بولنے سمجھنے اور اسلوب اظہار ہی نہیں سکھاتی بلکہ محسوس کرنے کے آداب بھی۔ دراصل مادری زبان اور قومی زبان خون کی طرح ہمارے رگ وپے میں جاری وساری ہے۔ زندگی ماحول سے جو کچھ حاصل کرتی ہے انسانی وجود کا پیچیدہ نظام جو خبریں جو پیغام دماغ تک پہنچاتا ہے وہ سب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں انسانی نظر کا ارتقا ساری ترقی تمام ذہنی تسخیرات ایک حد تک زبان ہی کی بخشش ہے۔ ہمارے شدید ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات زبان کے ساتھ پیوست ہوئے نظر آتے ہیں زبان نے کام کرنا شروع کیا زبان سرگرم عمل ہوگئی کہ ترجمانی تعبیر اور توضیح پر دہ مامور ہے ٹیلی کمیونیکیشن جدید ذرائع ابلاغ کا سارا کاروبار دھرا رہ جائے اگر زبان کام نہ کرے۔

مسٹر کارٹیلی کا مذکورہ بالا خط جو مکرمی سید حامد نے اپنی تقریر میں پیش کیا ہم پاکستانیوں کے لیے بڑی حد تک چشم کشا ہے اور قابل عبرت بھی۔ آیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادبیات اور قدیم ترین شعر وسخن اور جملہ موضوعات علم وادب کا سارا سرمایہ اردو زبان میں محفوظ ہے اور لاطینی کی مثل ہمارے اسلاف کے تمام ادبی اخلاقی و روحانی افکار و خیالات غرضیکہ کل برصغیر کا ادب عالیہ اردو زبان میں زندہ و تابندہ ہے۔ اردو زبان سے نفرت اور مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے ہندوؤں کے سیاسی و روحانی مہاتما مسٹر گاندھی نے جو بیان دیا تھا ہمارے (مسلمانوں کے لیے) باعث عبرت و تنبیہہ تھا انھوں نے کہا تھا کہ "اردو چونکہ مسلمان بادشاہوں کی زبان ہے ہمارا اس سے کوئی واسطہ و تعلق نہیں۔ ہم آزادی حاصل کر کے اپنی قومی اور دفتری زبان ہندی کو اختیار کریں گے"۔ چنانچہ تقسیم ہند کے بعد کانگریس کی حکومت قائم ہوتے ہی مسٹر گاندھی کی پیشگوئی اور ان کا قول جلد ہی عملی جامہ پہننے میں کامیاب ہو گیا یہی نہیں بلکہ ملک بھر کے لیے ذریعۂ تعلیم بھی ہندی ہو گیا اردو زبان کو دوسرا درجہ بھی نہیں دیا گیا بلکہ انگریزی اختیاری زبان ہو گئی اس کا نتیجہ یہ کہ موجودہ زمانے میں بھارتی مسلمانوں کی نئی نسل بھی ہندی پڑھتی لکھتی اور بولتی ہے اردو صرف معدودے چند بچے اور نوجوان جانتے ہیں جنھیں ان کے والدین اور سرپرستوں نے گھریلو تعلیم کے ذریعہ سکھائی ہے وہ بھی بہت معمولی درجہ کی ہے البتہ چند ادباء وشعرا اردو زبان کی بقا کی ساعی میں

مصروف ہیں۔

سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد وغیرہ ہم نے اپنے دور میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سعی بلیغ کی اور بعد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو قائم کرکے باقاعدہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ملک گیر تحریک جاری کی۔

۱۸۵۷ء سے پیشتر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں دفتری زبان سلطنت مغلیہ کے مثل فارسی اور عوام کے لیے عدالتی زبان اردو تھی ہندوؤں نے مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں کمپنی کے حکام سے احتجاج نہیں کیا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کے زمانہ میں انگریزی حکومت کا تسلط ہوتے ہی اردو زبان کی بجائے ہندی کو عدالتی زبان بنانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی گئی حتیٰ کہ اردو ہندی کے مسئلہ میں ہندو مسلم فسادات برپا ہونے لگے چنانچہ سرسید نے اسی بنا پر دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا اور انگریز حکام سے کہا کہ

"ہندو مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں دونوں کے مسلک اور مذہب اور قومی تصور جداگانہ ہے ہندو قومیت کی بنیاد وطن پر ہے اور مسلم قومیت کی بنیاد دین پر ہے یہ دونوں قومیں کبھی متحد و متفق ہوکر نہیں رہ سکیں" یہ بات سرسید نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے سامنے کہی تھی جب کمشنر نے اس پر اختلاف کیا تو انھوں نے کہا کہ

"آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہندو اس قدر متعصب اور مسلمانوں سے متنفر ہیں کہ اردو جو برسہا برس سے ایک مشترکہ زبان ہے مگر مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی انھوں نے اردو ہندی کا تنازعہ شروع کردیا اور ملک میں جا بجا زبان کے معاملے میں فسادات اور خون خرابے کر رہے ہیں مغلوں کے زمانہ میں یہ اس قسم کی بات کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔"

مختصر یہ کہ اردو زبان کی بقا و ترقی کی خاطر قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے ہر طرح جدوجہد کی اور قربانیاں دیں۔ سرسید کی وفات کے بعد اردو زبان کی بقا کے لیے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اور دیگر حضرات نے مسلسل جدوجہد کی اور ہندوؤں کی یہ مساعی کامیاب نہ ہونے دیں کہ "عدالتی زبان اردو کی بجائے ہندی ہو" اردو زبان کی ترقی و بقا کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی وغیرہ ہم حضرات بھی پیش پیش رہے۔ اردو زبان اب بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی ہے اس کے ذریعہ سے آج ہم ہر ملک کے بسنے والے سے بات کرسکتے ہیں دراصل اردو زبان ایک ایسا لسانی گلدستہ ہے جو اپنے اندر بین الاقوامی زبانوں کے پھول سجائے ہوئے ہے جن کی مہک تمام عالم میں محسوس کر رہے ہیں جبکہ بیرونی ممالک میں ہندی اور سنسکرت کا کوئی فرد ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا اور نہ بول سکتا ہے۔ معروف مفکر و مورخ گارساں دتاسی نے بھی اردو کی روز افزوں مقبولیت پر اس کی نشاندہی کی تھی انھوں نے کہا تھا کہ

"انگلستان کی قدیم یونیورسٹیوں میں نیز لندن میں اردو زبان کی تعلیم ناگزیر سمجھ کر شروع کی گئی ہے مجھے یقین ہے کہ ڈبلن یونیورسٹی، اسکاچستان کی یونیورسٹیوں اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی طرف جلد توجہ کی جائے گی۔۔۔۔

چنانچہ امریکہ اور کناڈا کی یونیورسٹیوں میں اردو عرصہ دراز سے بیشتر رائج ہوچکی ہے انقرہ یونیورسٹی اور کئی مسلم ممالک میں اردو رائج ہے۔

قائد اعظم نے پاکستان کے مطالبہ کے لیے جن اہم وجوہ کا ذکر کیا تھا ابتدا سے لے کر آخر تک انھوں نے دیگر وجوہ و اسباب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی اہمیت کو ناگزیر تصور کیا اور ابتدا سے ان کا فیصلہ تھا کہ پاکستان کی قومی اور دفتری زبان اردو ہوگی۔ قائد اعظم نے بار بار پاکستان کی سرکاری زبان کو اردو زبان قرار دیا اور جہاں مطالبہ پاکستان کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کی تہذیب اور مذہب و روایات اور ثقافت کا ذکر کیا وہیں اردو کا نام ضرور لیا۔ ذیل میں قائد اعظم کی دو تقریروں کے حوالے سے ان کے فیصلہ کن بیان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم نے اساتذہ و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔۔۔

"اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہوکر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اردو اور صرف اردو ہے جو مملکت کے مختلف صوبوں کو اتحاد و یگانگت کے رشتہ میں منسلک کرتی ہے اور انہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں جو سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرسکتی ہو البتہ ہر صوبہ کے باشندے اگر چاہیں تو اپنی علاقائی زبان استعمال کرسکتے ہیں۔"

اردو زبان کی اہمیت یہ ہے کہ اسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں، مسلم سلاطین، نوابین اور صوفیائے کرام نے پرورش کیا ہے اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے دوسرے ملکوں میں بھی اگر عام طور پر بولا نہیں جاتا تو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اردو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دوسری علاقائی اور صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں کے قریب ترین ہے پھر اردو زبان میں دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ بھی موجود ہے اسی لیے مغربی ممالک کے لوگ بھی اس کو سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں کرتے یہ بات بھی اس کے حق میں جاتی ہے اور یہ بہت اہم ہے کہ بھارت نے اردو کو دیس نکالا دے دیا ہے یاد رہے کہ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ترقی کرسکتی ہے دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے جو پاکستانی فرد عام یا خاص سرکاری اہل کار اور عہدیدار اردو زبان کے خلاف بات کرتا یا اس مسئلہ میں تساہل یا رخنہ اندازی کرتا ہے وہ گمراہ ہے

اور ملک کے عوام کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے پس ملک کی سرکاری زبان اردو کو قرار دیے جانے کے لیے ہمیں اپنی کوششوں کو تیز تر کرنا ہمارا آئینی اخلاقی اور قومی فریضہ ہے اور ہمارا ذریعہ تعلیم اردو ہونا بھی لازمی ہے۔ مذکورہ بیانات اور خصوصاً قائد اعظم کی خواہشات وارشادات کی روشنی میں جس قدر ضروری تھا کہ پاکستان کا ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان جلد از جلد اردو کو قرار دیا ہے اسی قدر اردو کی اہمیت کو شروع سے اب تک غیر ضروری سمجھا اور دونوں باتوں سے گریز کیا جاتا رہا ہے قیام پاکستان کو چالیس سال کی مدت گزری مگر ابھی تک تمام حکومتیں اپنے ادوار میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی ہیں اور اس اہم مسئلہ کو صرف اعلانات تک محدود رکھا گیا ہے کبھی تین سال کی مدت مقرر کی جاتی ہے مگر یہ مدت ختم ہونے پر پھر آئندہ چند سال بعد کے لیے ٹل جاتا ہے جزوی طور پر کسی سرکاری محکمہ میں اردو رائج کی بھی گئی ہے مگر مکمل اور حتمی طور پر ابھی تک ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان اردو نہیں ہے اور بظاہر ہونے کے امکانات بھی ابھی نظر نہیں آتے۔

ایسے انسان کی جو قومی زبان سے لاپروا ہو جاتے ہیں ان کی آبرو باقی نہیں رہتی۔ دنیا بھر کی قومیں اور ان کے حکمران وعوام موجودہ دور میں غیر ملکوں میں جاکر بھی اپنی قومی زبان میں ہی گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا سمجھ میں آتا ہے مگر انسان کا اپنی قومی مادری زبان سے جدا ہونا اسے قومی زبان کا مرتبہ نہ دینا اور اپنے آپ کو زندہ اور غیرت مند قوم کا فرد سمجھنا تصور میں آنے والی بات نہیں۔ قومی وجود کے برقرار رکھنے اور اسے ترقی اور استحکام اور حیات آمیز وحیات آموز بنانے کے لیے جملہ کاروبار حیات اور سرکاری ودفتری امور انجام دینے کے لیے واحد قومی زبان اردو کو فروغ دینا اور بلا تاخیر تساہل اختیار کرنا بقول قائد اعظم محمد علی جناحؒ ہمارا آئینی اخلاقی اور قومی فریضہ ہے۔

ہمارے اکثر اعلیٰ حکام وافسران بالا کو عام طور پر اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے یہ عذر اور مجبوری ظاہر کرتے ہیں کہ اردو میں ابھی تک مکمل طور پر دفتری اصطلاحات موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ابھی اس میں سرکاری زبان بننے کی پوری صلاحیت نہیں ہے حالانکہ خود ان اصحاب میں اپنی زبان کو سمجھنے اور اس پر عبور کی پوری صلاحیت نہیں ہے۔ ورنہ گزشتہ چالیس سال سے مستند اردو ادیبوں اور اردو داں حضرات پر ایک کمیٹی دفتری اصطلاحات تیار کرنے کے لیے متعین ہے اور ان حضرات کے بیان کے مطابق تمام ضروری اصطلاحات مکمل ہو چکی ہیں۔ بعض حکام اردو زبان کو دفتری زبان بننے کے ناقابل بھی کہتے ہیں جبکہ ریاست حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ کی مرتب کی ہوئی دفتری اصطلاحات اور مستند کتب اسی مذکورہ کمیٹی میں حیدر آباد سے حاصل کی ہوئی موجود ہیں جو جملہ مروجہ علوم کی معتبر تالیفات انگریزی کا مستند ترجمہ ہیں ان میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی بعض اہم ومعتبر کتب بھی ہیں۔ لہٰذا کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا اور نصابی کتب کا فراہم کیا جانا قطعاً دشوار نہیں بلکہ نہایت آسان ہے۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے پانچ نکات میں پہلا اور بنیادی منصوبہ پاکستان کو نظریاتی بنیادوں پر اسلامی فلاحی مملکت بنانا اور اس مقصد کے لیے نظام اسلام مکمل طور پر نافذ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بھی یہ امر لازمی ولابدی ہے کہ اردو زبان کو سرکاری زبان بنانا نظریہ پاکستان میں شامل ہونے کے اعتبار سے یقین ہے کہ وزیر اعظم موثر اقدامات کے ذریعے ایسی عملی تدابیر بروئے کار لائیں گے اور اپنے وزراء اور حکام بالا کو ہدایت فرمائیں گے کہ بلا تاخیر اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے جلد از جلد رائج کیا جائے تاکہ قائد اعظم اور قومی نظر و نظریہ پاکستان کی تکمیل ہو اور پاکستان کا قومی وقار بلند ہو

(بشکریہ "امروز" لاہور ۱۲-۳-۱۹۸۷ء)

پریس کلب میانوالی کے صحافیوں کی قیادت میں ایک وفد [illegible] کر رہا ہے

رپورٹ : الطاف آزاد

مکتوب
خوشاب

مقتدرہ قومی زبان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی ڈپٹی کمشنر ناصر بریگیڈیئر گلزار احمد اور پروفیسر مظفر حسن ... سے خطاب کر رہے ہیں

ڈاکٹر وحید قریشی کا دورہ

تمام مضامین کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دینے کی تجویز

انگریزی تعلیم سے صلاحیتیں مفلوج ہو رہی ہیں

خوشاب میں اردو کانفرنس سے مقررین کا خطاب

مقتدرہ قومی زبان اردو پاکستان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی اور بریگیڈیئر گلزار احمد بات چیت کر رہے ہیں

پرنسپل پروفیسر چودھری اعجاز حسین

پاکستان میں خواندگی کا تناسب ۲۶ فی صد ہے اس میں ۹۵ فیصد لوگ اردو زبان لکھنا اور پڑھنا جانتے ہیں جبکہ ... نے جو سکیم نئی روشنی کے نام سے جاری کی ہے اس کے تحت بھی تعلیم اردو میں دی جائے گی لیکن مقام ... ہے کہ پانچ فی صد لوگوں کی سمجھ میں آنے والی زبان ... قوم پر مسلط ہے ۱۹۷۳ کے آئین میں ۱۹۸۸ تک اردو کو قومی زبان کا رتبہ مل جانا چاہئے تھا لیکن ہنوز "دلی دور است" کے مصداق ۱۹۸۸ سر پر آن پہنچا ہے جبکہ اردو کو ابھی تک اپنا رتبہ ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس بات کی شہادت مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کے دورہ جوہر آباد سے بھی ملتا ہے انہوں نے پریس مجلس اردو

گورنمنٹ کالج کے زیر اہتمام منعقدہ اردو کانفرنس اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے اجلاس سے خطاب کیا سرور شہید ڈسٹرکٹ بار ہال میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا گیا تو وطن عزیز میں احساس محرومی بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے گا اور بالآخر ہم اپنی قوم کی کشتی ڈبو بیٹھیں گے انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۰ کے بعد سائنس کے میدان میں دھماکہ خیز ترقی ہوئی ہے اور اب انگریزی تمام علوم کا سرچشمہ نہیں رہی اب یہ بات بھی حقیقت سے دور ہو گئی ہے کہ سائنسی ترقی کے لئے صرف انگریزی پر انحصار کیا جا سکتا ہے چونکہ سائنسی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے جرمن فرانسیسی روسی جاپانی اور چینی زبانیں بھی سیکھنا پڑتی ہیں پھر کیوں نہ انگریزی کو بھی اسی طرح سیکھا جائے اور اس کی حیثیت دوسرے ثانوی ذریعہ تعلیم کی طرح کر دی جائے ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ انگریزی زبان کی بدولت ایک خاص طبقہ ہماری حکومت کے ایوانوں پر چھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے ہماری آبادی کی اکثریت احساس محرومی کا شکار ہو چکی ہے اگر ہم نے مستقبل میں ۵ کروڑ بچوں کے مفاد کو عزیز رکھ کر اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا تو ہم المناک انجام سے دوچار ہوں گے

انہوں نے کہا کہ دوسرے نظام تعلیم کے مقابلے کے امتحانات کے لئے انگریزی میڈیم ہونے کے سبب ہمارے جو طلبہ انگریزی کالجوں میں پڑھتے ہیں وہ افسر بن جاتے ہیں یہ صورت حال بدلنا ہوگی اور ذریعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مقابلہ کے امتحانات میں اردو کو ترجیح دی جانی چاہئے انہوں نے بتایا کہ ۱۹۷۳ کے آئین کے مطابق ۱۹۸۸ تک اردو تک اردو ہر سطح پر قومی زبان کا رتبہ مل جانا چاہئے انہوں نے کہا کہ ہمارا ادارہ اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے تین مقاصد ہیں دفتری نظام کو اردو ڈھالنا ذریعہ تعلیم اردو اختیار کرنے کی راہ میں دشواریوں کو دور کرنا اور اردو میں مقابلہ جات کے امتحانات کرانا انہوں نے نے بتایا کہ اردو زبان کو بطور میڈیم اپنا لینے سے ہمارے ملک کے اخبارات کا معیار بھی بہتر ہو جائے گا انہوں نے بتایا کہ موجودہ حکومت اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں مخلص نہیں ہے کیونکہ وفاقی وزیر تعلیم کو اپنے مطالبات کے ذریعے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا تھا لیکن ان کے جواب نے ہمیں سخت مایوس کیا اور انہوں نے کہا کہ اگر اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے اور انگریزی کو ثانوی حیثیت دی جائے تو اس طرح پوری قوم بالخصوص نئی پود کلرک اور چپڑاسی بن جائے گی حالانکہ ہم نے یہ امر واضح کر دیا تھا کہ ہم انگریزی علم کے خلاف نہیں لیکن حکومت کے عزائم وفاقی وزیر تعلیم

باقی اگلے صفحے پر

ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن خوشاب کے زیر اہتمام تقریب سے ڈاکٹر وحید قریشی اور بریگیڈیئر گلزار احمد خطاب کر رہے ہیں

ملک نسیم احمد آہیر کے ریمارکس سے واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں جو کہ مایوس کن ہیں

گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں منعقدہ اردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے ہمارے طلبا کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے ہمارا ملک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا اسے لئے تعلیمی مصائب کو ختم کرنے کے لئے مکمل طور پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ قومی مقتدرہ انگریزی علم حاصل کرنے کے خلاف نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ملک کا ذریعہ تعلیم اردو ہو اور انگریزی زبان کو لازمی ثانوی حیثیت دی جائے انگریزی سے صرف پچاس فیصد علم حاصل ہو سکتا ہے جبکہ باقی علم دیگر غیر ملکی زبانوں کے علم سے حاصل ہو سکے گا اس لئے ہمیں ان تمام علوم سے مستفید ہونے کے لئے اردو کو ہی ذریعہ تعلیم بنا کر دیگر تمام زبانوں کے ترجمے اردو میں کر کے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کرنے کے قابل بنانا ہوگا انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک کے طلبہ کی اکثریت انگریزی میں فیل ہو جاتی ہے اور وہ اعلیٰ ملازمتوں کے حصول میں ناکام ہو جاتے ہیں دوسری طرف امراء کا ایک طبقہ جو انگلش تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتا ہے وہ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر کلیدی عہدوں پر فائز ہو جاتا ہے جس سے طبقاتی تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور ملک کے لئے کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں انہوں نے لوگوں پر زور دیا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے عملی طور پر بھی کاوشیں کریں اور اپنے رہن سہن و دیگر معمولات زندگی میں قومی زبان کے طور پر اردو کو استعمال کریں

ڈپٹی کمشنر خوشاب چوہدری ناصر جاوید بسرا نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی بقا کا انحصار اسلام اور اردو میں ہے پاکستان اسلام اور اردو نظام تعلیم کی وجہ سے ہی معرض وجود میں آیا تھا انہوں نے کہا کہ قائداعظم نے اردو کو سرکاری اور رابطہ زبان قرار دینے کا اعلان کیا تھا انہوں نے کہا خوشاب میں تمام خط کتابت اردو ر بانہیں ہوں ہے اور زبان کے فروغ پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے اس موقع پر انہوں نے کالج کے اردو سیکشن میں کتابوں کے لئے دس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا قبل ازیں کالج کے پرنسپل چوہدری اعجاز حسین نے مہمان خصوصی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر وحید قریشی جیسی شخصیت کا ہماری دعوت قبول کر کے یہاں آنا ہمارے لئے قابل فخر ہے انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد مسلسل تحریک پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو استوار کرنے کی بے لوث انتھک کوششیں کی ہیں آپ کی خدمات جہاں استاد ادبیات بے شمار ہیں وہاں ہر میدان اور ہر شعبے میں حب الوطنی کے پاکیزہ جذبے کے اظہار کنندہ رہے آپ کی جدوجہد پیش رواں اور رواں دواں ہے خصوصی طور پر اردو زبان کے ساتھ جو ان کی محبت اور عقیدت ہے وہ ان کی موجودہ اس مساعی جمیلہ سے عیاں ہے ہم وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کی حیثیت سے سرانجام دے رہے ہیں اگر میں اس محفل میں یہ دعویٰ کروں کہ ڈاکٹر سید سید عبداللہ مرحوم کے بعد اس وقت کوئی اردو زبان کی ترویج و ترقی کے کام میں صحیح معنوں میں مخلص ہے تو ڈاکٹر وحید قریشی ہیں انشاء اللہ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہو رہی ہیں اور بات نظریات سے بڑھ کر عملیات تک پہنچ گئی ہے اور وہ دن دور نہیں جب اردو زبان ہمارے تعلیمی اداروں دفتروں عدالتوں اور دوسرے ملی شعبوں میں بطور قومی زبان پڑھی لکھی اور بولی جائے گی ہمارے کالج میں دفتری زبان پنجاب اردو نام اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کا اردو ملازمت آتے ہیں جن کی روشنی میں ہم نے اپنے کار ہر قدم پر دفتری خط کتابت میں اردو کو کافی حد تک اپنا اس کالج کی اردو مجلس بھی مکمل طور پر اس کام کو بڑھانے میں شب و روز کوشاں ہے انہوں نے کہا کہ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان قائم کیا لیکن پاکستانی قوم کی اور اس کا تشخص نہ قائم ہو سکا کسی بھی قوم کی ترقی اس کی قومی زبان میں مضمر ہوتا ہے ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم پر صد سالہ انگریزی استعمار آج بھی ہم پر فکری طور پر تسلط جمائے ہوئے ہے اور ذہنی طور پر آج بھی ہم ہیں دوسری قومیں اپنی قومی زبان بولنے اور پڑھنے پر فخر محسوس کرتی ہیں اور اپنے انگریزی کے مقابلے غیر معیاری سمجھ کر در خود احساس کمتری

آخر میں انہوں نے کہا کہ بغیر قومی زبان اردو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا بریگیڈیئر گلزار نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۷۳ کے آئین میں امر کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ آئندہ پندرہ سال ملک بھر میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے گا لیکن اب سالوں میں سے صرف ایک سال باقی ہے لیکن اس پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ حکومت کی پالیسی سے اردو طلبہ کو بے حد مایوسی ہو رہی ہے کانفرنس سے پروفیسر حسین پروفیسر مشتاق شوکت اور پروفیسر مظفر حسن اردو قومی زبان کے موضوع پر مقالے پڑھے جن میں کہ اردو کو قومی زبان کے طور پر عملی طور پر رائج کرنا ضروری ہے اس لئے حکومت کو اس مقصد کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں ڈاکٹر وحید قریشی اور دیگر نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک خصوصی اجلاس سے بھی خطاب کیا ●

روزنامہ مشرق لاہور ۱۹-۳-۱۹۸۷ء

FEDERAL BOARD OF INTERMEDIATE AND SECONDARY EDUCATION
P.O.BOX NO. 1225, ISLAMABAD:

No.1-47/FBISE/Rech/87/________ Dated: 07-04-1987.

To

All Heads of educational institutions,
within the jurisdiction of
Federal Board:

Subject:- POLICY REGARDING THE MEDIUM OF INSTRUCTION/EXAMINATIONS AT SSC LEVEL:

Dear sir/madam,

Queries are pouring in from institutions, teachers, students and their parents about the medium of instruction/examinations in science subjects at SSC level.

2. It is clarified for the information of all concerned that unless the Federal Government and the Ministry of Education abrogate or amend the National Education Policy, 1979 in writing the Federal Board is duty bound to implement the decision contained in it.

3. As no instructions regarding its abrogation or amendment have been received from the Government to-date therefore the candidates appearing in SSC Annual Examination 1989, will be required to use only Urdu or approved provincial language as the medium of instruction/examination.

4. If there is any change, in the policy, in future, the institutions will be informed accordingly.

(NIAZ M. ERFAN)
SECRETARY

Copy to:-
1. JEA (Federal Institutions Wing), Ministry of Education, Sitara Market, Islamabad.
2. JEA (Curriculum Wing), Ministry of Education, Sector H-9, Islamabad.
3. Secretary, National Education Council, Islamabad.
4. Secretary, Inter Board Committee of Chairmen, Islamabad.
5. Director General of Education, FGEI, Islamabad.
6. Director of Education, FGEI (C&C), GHQ, Rawalpindi.
7. Director of Education, PAF, Rear H.Q, Peshawar.
8. Director of Education, Northern Areas, Gilgit.
9. Controller of Examination, FBISE, Islamabad.
10. Deputy Controller of Examination (Strong Room), FBISE, Islamabad.

(Waheed Anwar)
Assistant Director (Research)

پروفیسر فتح خان

پاکستان میں اُردو دو عملی کا شکار ہے

اردو ہماری قومی زبان ہے۔ یہ ہمارے قومی تشخص کی پہچان، ثقافتی ورثے کی آن اور مستقبل کے خوابوں کی جان ہے۔ اردو ہماری ملی غیرت اور قومی خودداری کا آئینہ ہے یہ زبان ہماری تہذیبی میراث کی امین ہے۔ یہ ہمارے چراغ زندگی کا روغن ہے۔ رابطے کا ذریعہ اور وسیلۂ اظہار ہے۔ ہماری سوچوں کا محور اور تمناؤں کا مرکز ہے۔ یہ ہماری قومی یکجہتی اور ملی بقا کا زینہ ہے۔ امور زندگی کاروبار مراسلت اور باہمی معاملات کے لئے ترجمانی اردو کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ واحد زبان ہے جو خیبر سے لے کر کراچی تک بولی اور سمجھی جاتی ہے پاکستان کیا بھارت میں بسنے والے لوگوں کی زیادہ تعداد اسی زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے اور خدا گواہ ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک میں اردو نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مسجد کے منبر سے واعظ شعلہ بیان نے اسے اپنا ترجمان بنایا۔ سیاسی قائدین نے اپنے خطاب کا ذریعہ بنایا۔ کارکنوں نے جب بھی پرچم آزادی لہرایا۔ آزادی کے متوالوں نے نعرہ لگایا "بن کے رہے گا پاکستان لے کے رہیں گے پاکستان" تو اس کی گونج اردو میں سنائی دی۔ اردو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے حیات و ممات کا مسئلہ بنی رہی ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے پہلے معمار سر سید احمد خان نے بنارس میں رونما ہونے والے اردو ہندی جھگڑے کو مسلمانوں کی بقاء کا مسئلہ قرار دیا تھا اور اردو کی سربلندی کے لئے انگریز گورنر سے ٹکر لی تھی۔ آپ نے علی گڑھ کالج سے جہاں مسلمانوں میں علیحدہ قومیت کا شعور پیدا کیا وہاں اپنی ذاتی اور رفقاء کی انمول تحریروں سے اردو کے لسانی ادب میں بھی گراں بہا اضافہ کیا اردو کے عناصر خمسہ کی تحریریں اردو زبان کا عظیم سرمایہ ہے سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور ادب کی ترقی کے لیے تہذیب الاخلاق جیسے وقیع ادبی جریدے کا آغاز ہوا۔ سیاسی پلیٹ فارم پر اردو ہر زمانے میں مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں کا مظہر رہی ہے۔ یوپی کے سٹیج سے تحریک پاکستان کا جلسہ منعقد ہو یا ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کی قیادت میں مسلم لیگ کا قیام ہو تکلم کا شرف اردو کو حاصل رہا ہے آزادی کے سفر کی داستان دلنواز بھی ہے اور دلخراش بھی، آزاد خطۂ پاکستان کے حصول کے لیے ارض وطن جوانوں کے خون سے لالہ زار رہی، آزادی کے متوالے سر کٹاتے رہے۔ جان و مال لٹاتے رہے۔ ایک دریائے خون کو عبور کرنے کے بعد ہمیں آزادی کی نعمت میسر آزادی جو دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں میں اک متاع بے بہا ہے۔ آزادی کی قدر و قیمت شیر میسور سلطان ٹیپو شہید کی روح سے پوچھیئے جس نے آزادی کی اک سانس کو محکومی کی صد سالہ زندگی سے افضل قرار دیا تھا۔ عشاقان آزادی کا ہمدم و دمساز ہونے کا شرف صرف اردو کو حاصل ہے اردو کو ہمارے نجات دہندہ کی حیثیت حاصل ہے اردو تو آزادی کے سفر کی حدی خوانی اور سار بانی کا فریضہ ادا کرتی رہی ہے یہ ہماری تہذیب و تمدن کی آن ہے۔ ملی یگانگت اور اتحاد کا ذریعہ ہے خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہوں یا حضرت قائد اعظم، نواب بہادر یار جنگ اپنی خطابت کے جوہر دکھائیں یا مولانا محمد علی جوہر آزادی ہند کا نغمہ سنائیں سب نے اردو زبان میں گل افشانی کی ہے۔

خطۂ پاکستان جنت نشان حضرت قائداعظم کے تدبر اور فراست کا ثمر ہے۔ پاکستان ہماری عظمتوں کا نشان ہے۔ ہم اس کے نگہبان ہیں۔ بانئ پاکستان نے اردو کو قومی زبان قرار دیا تھا لیکن ہماری کتنی بدقسمتی ہے کہ چالیس برس گزرنے کے باوجود ہم اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ نہ کر سکے۔ دنیا کی کئی قوموں کو ہمارے بعد آزادی نصیب ہوئی لیکن وہ ترقی کی دوڑ میں ہم سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ انھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی قومی زبان کو رائج کیا اور عملی شکل دی۔ چین، جاپان، روس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ گراں خواب چینیوں نے انگڑائی لے کر ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ چینی اپنی زبان میں غیر ممالک کے سفارتکاروں اور وفود سے گفتگو کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے کاروبار مملکت چینی زبان میں سرانجام پاتے ہیں۔ جاپان کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کرنے والوں کو اپنا مقالہ جاپانی زبان میں تحریر کرنا پڑتا ہے۔ روس دنیا کی ایک عظیم ترین قوت کے روپ میں ساری انسانیت سے اپنی برتری منوا چکا ہے۔ سائنسی، علمی، خلائی تحقیق کے شعبوں میں روس کو ساری دنیا پر سبقت حاصل ہے لیکن روسیوں کی گفتگو ہمیشہ روسی زبان میں ہوتی ہے۔ پاکستان میں اردو دو عملی کا شکار ہے۔ انگریزی کی حاکمیت اور بالادستی قائم و دائم ہے۔ ماہرین تعلیم دانشوروں، علمائے کرام اور سیاسی قائدین سبھی نے اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن عملی طور پر لاگو کرنے کی کوئی واضح صورت منظرِ عام پر نہیں آئی۔ آج بھی مقابلہ کے امتحانات میں انگریزی کی بالادستی ہے۔ سرکاری خط و کتابت عدالتی فیصلے زیادہ تر انگریزی

میں تحریر کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بی اے کی سطح تک انگریزی لازمی ہے جب کہ قومی زبان اردو کی حیثیت ثانوی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کے نفاذ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ناخدائے اردو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے سرکاری زبان کا رتبہ دلانے کے لیے محضر نامے بھجوائے حکمرانوں کی توجہ دلائی لیکن ابھی تک پورے طور پر نافذ نہیں کیا جا سکا۔ یہ ہماری ملی پستی کی انتہا ہے حالانکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس بات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ پندرہ سال کے عرصے میں اردو کو پورے ملک میں نافذ کر دیا جائے گا لیکن ابھی تک اس قسم کے آثار نظر نہیں آ رہے بلکہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق وزارت تعلیم انٹرمیڈیٹ میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت کو اختیاری قرار دینے پر غور کر رہی ہے کیا یہی ہماری قومی سوچ ہے؟ آج وادئ خیبر سے لے کر کراچی کی بندرگاہ تک بلکہ بھارت میں رابطے کا واحد ذریعہ اردو زبان ہے آج اردو میں اتنی صلاحیت ہے کہ ہر قسم کے دقیق مضامین اور مطالب احسن طریق سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ سائنسی علوم کو اردو میں پڑھانے کا کافی عرصہ پہلے جامعہ عثمانیہ دکن میں تجربہ کامیاب رہا تھا۔ آج ہمارے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھی سائنسی علوم کو اردو میں پڑھایا جا سکتا ہے یہ کام صرف ملی جذبے اور وطنیت کے ذوق سے سرشار ہو کر کیا جا سکتا ہے۔ آج ارض پاکستان میں شرپسند عناصر صوبائی عصبیت اور گروہی اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں اردو کے ابتدائی قاعدے جلائے جا رہے ہیں اور مادری زبانوں میں ابتدائی تعلیم دینے کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ مادری زبانوں کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں لیکن پاکستان کی سالمیت، وحدت اور بقائے باہمی کے لیے اردو کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ ارض وطن کے نکھار کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہ ریاضت صحیح پاکستانی قومیت کا شعور زندہ کرنے میں ہماری مددگار ثابت ہو سکتی ہے قومیت کی تشکیل میں زبان بہت نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اردو کے معروف مزاحیہ شاعر اکبر نے بجا فرمایا تھا۔ ؎

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں

اکبر کا یہ شعر آج بھی پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ نظریۂ پاکستان کا خالق اردو زبان ہے آج اس زبان کی حفاظت بھی ہمارا قومی فریضہ ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ناخدائے اردو نے عدم آباد کی راہ لی لیکن اردو کے نفاذ کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی اور نفاذ کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ ارض پاکستان میں بسنے والے ہر غیرت مند پاکستانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو پڑھے، لکھے اور بولے۔ ہم کب تک غیروں کی زبان میں گفتگو کرتے رہیں گے جذبۂ دل کی عکاس اپنی زبان ہوتی ہے۔ ہمارے اتحاد اور قومی یک جہتی کی علامت اردو زبان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ارباب اقتدار اسے کب حیثیت سے ہر شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کرتے ہیں؟ یہ غلش ساری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اردو کا نفاذ خوشیوں کا نقیب اور عظمتوں کا پیامبر ثابت ہوگا۔ ہماری سربلندی اردو کے نفاذ میں ہے۔

(بشکریہ "پکار" اسلام آباد، ۲۶-۲-۸۷ء)

[illegible] توقعات سے خطاب

[illegible] مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین ڈاکٹر [illegible] کے اراکین سے خطاب کر رہے ہیں

روزنامہ جنگ لاہور یکم مارچ ۱۹۸۷ء

جوہر آباد۔ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی بار ایسوسی ایشن جوہر آباد سے خطاب کر رہے ہیں (فوٹو امروز)

روزنامہ امروز لاہور ۱۰ مارچ ۱۹۸۷ء

اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا گیا تو محرومی کا احساس بڑھتا چلا جائے گا

[illegible] سال تک اردو کو [illegible] قومی زبان کا [illegible] ڈاکٹر وحید قریشی

خوشاب یکم مارچ (نامہ نگار) اگر اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا گیا تو وطن عزیز میں احساس محرومی بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے گا اور بالآخر ہم اپنی قوم کی کشتی [illegible] کا فیصلہ صدر مقتدرہ قومی زبان ڈاکٹر وحید قریشی نے سرور شہید لائبریری ہال جوہر آباد میں ایک پبلک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۶۰ء کے بعد سائنس کے میدان میں دھماکہ خیز ترقی ہوئی ہے جبکہ اب انگریزی تمام علوم کا سرچشمہ نہیں رہی۔ اب یہ بات بھی حقیقت سے دور ہو گئی ہے کہ سائنسی ترقی کے لئے صرف انگریزی پر انحصار کیا جا سکتا ہے کیونکہ سائنسی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانیں بھی سیکھنا پڑتی ہیں پھر کیوں نہ انگریزی کو بھی اسی طرح سیکھا جائے اور اس کی حیثیت دوسرے ثانوی ذریعہ تعلیم کی طرح کر دی جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ انگریزی زبان کی بدولت ایک خاص طبقہ ہماری حکومت کے ایوانوں پر چھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے ہماری آبادی کی اکثریت احساس محرومی کا شکار ہو چکی ہے۔ اگر ہم پہلے مستقبل میں ۵ کروڑ بچوں کے مفاد کو عزیز رکھ کر اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا تو ہم المناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے عام تعلیم کے مقابلے کے امتحانات کے لئے انگریزی میڈیم ہونے کے سبب ہمارے جو طلبہ صرف اردو پر انحصار کرتے ہیں وہ صرف کلرک بنتے ہیں اور جو انگریزی کالجوں میں پڑھتے ہیں وہ افسر بن جاتے ہیں یہ صورت حال بدلنا ہوگی اور ذریعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مقابلہ کے امتحانات میں اردو کو ترجیح دی جانی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء تک [illegible] زبان کا رتبہ مل جانا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ادارہ [illegible] کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے اہم مقاصد ہیں دفتری [illegible] میں اعانت اور ذریعہ تعلیم اردو اختیار کرنے کی راہ میں [illegible] اردو میں مقابلہ جات کے انعقاد کرانا انہوں [illegible] اردو زبان کو بطور میڈیم اپنا لینے سے ہمارے ملک کے [illegible] معیار بھی بہتر ہو جائے گا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲ مارچ ۱۹۸۷ء

کلیم اختر

پاکستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں کے درمیان مُشترکہ زبان اُردو ہے

پاکستان اردو اکادمی نے اپنے ایک حالیہ اجلاس میں حکومت پاکستان سے اپیل کی ہے کہ اردو کو جلد از جلد ذریعہ زبان بنادیا جائے اس سے پاکستان کے ہر حصہ کے بسنے والے قومی یک جہتی کے دھارے میں شامل ہوجائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں سب سے زیادہ اہم کام قوم میں اتفاق و اشتراک پیدا کرنا ہے اور تمام فروعی قسم کے اختلاف کو صرف نظر کرتے ہوئے ایک زندہ اور مضبوط قوم کی مانند عالمی سیاسیات میں شایان شان کردار سرانجام دینا ہے۔

بالحمد پاکستانی قوم اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اس کی اکثریت سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ہے اور دین مبین پر مکمل اعتقاد و ایمان رکھتی ہے لہٰذا کوئی مانے یا نہ مانے یہ صداقت مسلمہ ہے کہ پاکستانی قوم کی سب سے بڑی قدر مشترک اس کی دینی وحدت ہے اور اس کے بعد پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے انسانوں کے درمیان روابط قائم کرنے والی زبان صرف اردو ہے جس نے پاکستانیوں کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے اور ہر ملک میں اس کی ترقی و ترویج بلکہ درس و تدریس کے لیے انتظامات ہیں اور پاکستان سے اردو زبان کے ممتاز سکالرز دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ممبر پاکستان قومی اسمبلی خواجہ محمد صفدر کے اس بیان کے بعد کہ جب وہ برطانوی دارالعلوم (لندن) کے سپیکر سے ملاقات کر کے ان کے ایوان سے باہر نکلنے لگے تو دارالعلوم کے سپیکر بھی ان کے ساتھ ہو لیے پاکستانی وفد نے کہا کہ حضرت آپ کیوں زحمت کرتے ہیں اس پر برطانوی دارالعلوم کے سپیکر نے نہایت شستہ اردو میں جواب دیا

"آپ ہمارے بھائی بند ہیں میں آپ کو دروازے تک چھوڑنے جاؤں گا۔"

اردو کی مقبولیت اور انانیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ حکومت پاکستان اردو کو سرکاری زبان بنانے کے عملی امور و معاملات کی طرف توجہ دے رہی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس ضمن میں جتنا کام جنرل محمد ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ہوا ہے اس سے پہلے کام کی رفتار اتنی تیز نہ تھی پھر جب سے مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی ڈاکٹر وحید قریشی نے سنبھالی ہے اس وقت سے اس ادارے کی کارکردگی میں سو فیصد زیادہ اضافہ ہوا ہے حالانکہ اس ادارے کو ملنے والی گرانٹ نہ صرف ناکافی ہے بلکہ اس کی ضروریات سے بہت کم ہے پھر مقتدرہ نے کئی توسیعی منصوبے بنائے ہیں جن میں سے بعض پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب تک فنڈز نہ مہیا ہوں گے یہ منصوبے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکیں گے اس لیے اس کی گرانٹ میں اضافہ ضروری ہے پھر حکومت پاکستان کی کابینہ ڈویژن نے اس سلسلے میں کئی مثبت کام شروع کیے ہیں جن میں سرفہرس افسروں کی تربیت کاری ہے اور وہ ایک ایسی کھیپ تیار کررہی ہے جو باقی ماندہ آفیسروں کو بھی تربیت دے سکے گی۔

ہماری دانست میں اگر اس کمیٹی میں مقتدرہ قومی زبان کو بھی نمائندگی دی جاتی تو کارکردگی بہتر ہوسکتی تھی کیونکہ مقتدرہ نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ہوا ہے یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مقتدرہ نے دو سال کی قلیل مدت میں عربی، انگریزی، فارسی، طبی، سائنسی اور دیگر علوم کی اصطلاحات کو زبان اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے اس کے علاوہ زبان اردو کی ترقی و ترویج کے لیے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اس موضوع پر یعنی تراجم کے میدان میں شاندار کام کیا ہے مثال کے طور پر سلسلہ قاموس الکتب کافی ہے۔

اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں ہمارے منتخب نمائندوں کا کردار بھی قابل تعریف ہے چنانچہ یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں بھی زیر غور آیا اور ایوان کو یہ یقین دلایا گیا کہ حکومت اگلے سال اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ایسا کرنا ایک آئینی ضرورت بھی ہے۔ ایوان میں مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے پیش کردہ سفارش پڑھ کر سنائی گئی۔

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان کو اب اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اس طویل المدت قومی مسئلے کو جلد از جلد حل کر لیا جائے حقیقت یہ ہے کہ

ہمیں زبان اردو کے مسئلہ پر نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی معذرت خواہانہ انداز اپنانے کی کیونکہ اردو تو عظیم زبان ہے حال ہی میں نئی دہلی (بھارت) میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی صدر ذیل سنگھ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اردو ہی قوم کی یک جہتی کا سبب ہے اور اردو زبان کی وسعت اور شوکت کی تعریف کی۔

ہم اس لیے اردو کو فوری طور پر رائج کرنے کی استدعا کرتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کی حریف قوتوں نے ملک میں گڑبڑ کرانے اور پاکستانی قوم میں انتشار اور خلفشار پیدا کرنے کے لیے لسانی جھگڑے پیدا کرنے کی مذموم کوششیں جاری کر رکھی ہیں حالانکہ اردو خواں طبقہ علاقائی زبانوں سے اتنا ہی پیار کرتا ہے جتنا کہ وہ اردو زبان سے کرتا ہے۔ علاقائی زبانیں اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں ان کا اپنا حسن ہے اپنا خلوص ہے اپنی محبت و عقیدت ہے مگر جب آپ قومی دھارے سے شامل ہوں تو اردو اپنانے سے یہ محبت اور گہری اور مضبوط ہوتی ہے اسی طرح جب آپ ملی دھارے میں شامل ہوں تو زبان عربی کا اپنا حسن و جمال ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی سرکاری زبان کی ضرورت ہے جو سندھی، بلوچی، پنجابی، پختون، کشمیری اور مہاجر کی دل دھڑکنوں کو یکساں طور پر سمجھ اور محسوس کر سکے اس غرض کے لیے اردو کو قومی تعلیم کا ذریعہ بنانا بے حد ضروری ہے اس وقت ہماری تعلیمی پالیسی کے باعث ہماری قوم دو حصوں میں منقسم ہے ایک انگریزی خواں طبقہ ہے اور ایک اردو پڑھتا ہے دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذہنی افق الگ الگ ہوتے ہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک کا انداز فکر دیگر ہوتا ہے اور دوسرے کا اس سے الگ۔

اس بعد کی وجہ سے دوریاں بڑھتی ہیں ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کی عدم توجہگی کے باعث اردو کے لیے جتنا کام ہونا چاہیے تھا وہ ابھی نہیں ہو سکا مثال کے طور پر اردو سٹینو گرافروں کی کمی ہے حالانکہ ٹیلی فون انڈسٹریز آف پاکستان والوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ ہر سال ڈھائی ہزار اردو ٹائپ رائٹر تیار کرتے ہیں چونکہ ٹائپسٹوں کے لیے باقاعدہ تربیتی کورس کا مؤثر انتظام نہیں اس لیے کوئی تسلی بخش کام نہیں ہوا چند سال پیشتر اردو مرکزی بورڈ جسے اب اردو سائنس بورڈ کا نام دیا گیا ہے ایسی تربیت کا بندوبست کرتا تھا لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس ٹریننگ کو ختم کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سامراجی یا حاکم قوم کی زبان کے تابع نہ ہو بدقسمتی سے برصغیر ہند و پاک کے عوام پوری صدی تک فرنگی سامراج کے زیر نگیں رہے اور انگریزی زبان کا غلبہ رہا جو کہ محکومی اور غلامی کی سب سے بڑی مجبوری تھی لیکن اب ہم آزاد ہیں اور خود مختار ہیں اگر ہم نے ابھی اس غلبہ کو جاری رکھا تو ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی ذہنیت غلامانہ ہو جائے گی اس لیے قوم کو اپنی زبان نوازنے سے حکومت اس کے ایک نفسیاتی دباؤ کو ختم کر دے گی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزیر اعظم پاکستان کے پانچ نکاتی پروگرام میں ایک مسئلہ تعلیم کا ہے اور ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے کئی کارآمد امور سرانجام دیے ہیں اگر حکومت ملک میں ناخواندگی کو دور کرنا چاہتی ہے تو اسے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہوگا اور اس سلسلے میں ہمارے سیاسی اکابرین کو عوام میں اردو زبان کے فروغ کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہوگا جب تک اردو کو ایک عوامی تحریک کی صورت میں پیش نہیں کیا جائے گا یہ زبان اپنی حیثیت نہیں منوا سکے گی۔

ہماری دانست میں حکومت پاکستان کو اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ دینا چاہیے کیونکہ اردو ہی کی وساطت سے اس وقت قوم کو یکجا کیا جا سکتا ہے اور اس وقت علاقہ کے حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ قوم یک جان و یک قالب ہو کر اپنے اندرونی اور خارجی معاملات کا مقابلہ کرے کیونکہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ملک اور قوم کی ترقی و خوشحالی کے لیے اردو کا ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے اور اس میں نکتہ یہی پوشیدہ ہے کہ جو قوم یک جا ہوگی وہ ترقی بھی کرے گی اور خوشحال بھی ہوگی۔

(بشکریہ "مشرق" لاہور ۵-۳-۸۷ء)

نذیر حق

قومی زبان اُردو ——— اپنے ہی گھر میں اجنبی کیوں؟

"اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے"۔

"اُردو ہی بالآخر پاکستان کی قومی زبان بنے گی"۔

"پاکستان میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہی کو قرار دیا جا رہا ہے"۔

ہم یہ باتیں روز کرتے اور روز سُنتے ہیں۔ ایک عام آدمی سے لے کر صدرِ مملکت، وزیرِاعظم اور مختلف وزرا و اعلیٰ حکام تک سبھی یہ بات کہتے نہیں تھکتے کہ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اسے اس کا جائز مقام ملنا چاہیے لیکن عملی طور پر اُردو کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ المناک ہی نہیں تشویش انگیز بھی ہے۔ خود ہماری حکومت اور اس کے ذمہ داران اُردو کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں اس کا اندازہ ایک خط سے اور اساتذہ کو تربیت دینے والے کالجوں کے نئے نصاب سے ہو سکتا ہے۔

...... پہلے مشرق کے ایک قاری اور اُردو کے حامی کا خط ملاحظہ فرمائیے (خلاصہ)

آج سے تین سال پہلے سابقہ حکومت کی نظریۂ پاکستان کے خلاف ایک خطرناک تعلیمی سکیم برائے انٹرمیڈیٹ نافذ ہونے والی تھی جسے انجمن تحفظِ اُردو، اس کے معاونین، مدیران جرائد، ماہرین تعلیم اور ملک و قوم کے بہی خواہوں کی مسلسل جدوجہد اور کوشش کے بعد واپس لے لیا گیا۔ اس کے لیے ہم اس وقت بھی حکومت کے شکرگزار ہوئے تھے اور اب بھی ہیں۔

...... لیکن اب پھر صوبائی وزرائے تعلیم کی کوئٹہ میں منعقدہ کانفرنس میں منظور کی جانے والی ایک تجویز وفاقی وزارت تعلیم نے اپنے ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ء کے نوٹیفکیشن کے ذریعے صوبائی محکمہ ہائے تعلیم کو ارسال کی ہے شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر صوبائی تعلیمی وزارتوں کی طرف سے "ہم خیال" جواب موصول ہو جائے تو اس سکیم کو نافذ کیا جا سکے

...... اس تجویز کا انگریزی متن یہ ہے۔

n the 9th inter-provincial education ministers' conference held at Quetta on 18th October, 1986, the current scheme of studies for classes XI XII was discussed. It was pointed out that in the present scheme too much Weightaqe was given to the subjects which are not directly productive or conductive to employment. It was also observed that training in Mathematics has become essential because it is increasingly used as a tool of analysis in basic and social sciences. It was therefore suggested that Urdu, Pakistan Studies and Islamiat should continue to be taught as elective subjects while Mathematics should become compulsory at Intermediate level. It was finally decided that:

"The Provinces should study the proposal to keep Urdu, Pakistan Studies and Islamiat as elective subjects and adopt English and Math, as compulsory subjects"

...... اس تجویز کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نہایت تشویش انگیز مطالب سامنے آتے ہیں چنانچہ تجویز کا اُردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں

نویں بین الصوبائی وزرائے تعلیم کانفرنس کے دوران جو کوئٹہ میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوئی، گیارہویں اور بارہویں جماعت کے نصاب پر غور کیا گیا۔ یہ

اُردو کو تعلیمی نصاب سے دیس نکالا دیا جا رہا ہے ....

بات سامنے لائی گئی کہ موجودہ نصاب میں ایسے مضامین کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو ملازمتوں کے حصول میں زیادہ مدد، منافع بخش اور مفید نہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ ریاضی کی تربیت ناگزیر ہو گئی ہے کیونکہ بنیادی اور سوشل سائنسز میں تجزیے کے لیے ریاضی کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے چنانچہ تجویز

کیا گیا کہ اُردو، مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کو اختیاری (الیکٹو) مضمون کے طور پر پڑھایا جانا جاری رکھا جائے جب کہ ریاضی کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ۔

"صوبوں کو اس تجویز کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے کہ اُردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو اختیاری مضامین کے طور پر پڑھایا جائے اور انگریزی اور ریاضی کو لازمی مضمون رکھا جائے"

. . . . . اس تجویز کے ضمن میں عرض ہے کہ قومی زبان کو (جو نظریہ پاکستان کے دو ستونوں "اسلام" اور "اُردو" میں سے ایک بنیادی ستون ہے) غیر منافع بخش اور غیر مفید کہنا بذات خود نظریہ پاکستان پر حملے کے مترادف ہے۔ مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کو بھی اس ضمن میں لانا نوجوان نسل کو پاکستان اور اسلام سے دور رکھنے کا ایک حربہ ہے۔

وفاقی محکمہ تعلیم کے نوٹیفکیشن کی عبارت کا یہ حصہ (ترجمہ)

. . . . "چنانچہ تجویز کیا گیا کہ اُردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھایا جانا جاری رکھا جائے جب کہ ریاضی کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے"۔

ظاہر کرتا ہے کہ گویا اُردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات ایسے مضمون ہیں جو پہلے ہی "اختیاری" حیثیت سے پڑھائے جا رہے ہیں گویا کوئی طالب علم چاہے تو انٹر میں یہ مضامین رکھ لے یا نہ رکھے اُسے اختیار ہے۔ حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس وقت ان تینوں مضامین کی تدریس بطور لازمی مضامین جاری ہے۔ ہر طالب علم یا طالبہ کو یہ مضامین ضرور پڑھنے اور پاس کرنے ہوتے ہیں بلکہ اُردو زبان تو ۱۹۶۱ء سے ہر صوبے کی انٹر کلاسز میں دو سو نمبر کے لازمی مضمون کی حیثیت سے اب تک پڑھائی جا رہی ہے۔

. . . . . سوال یہ ہے کہ اتنے ذمہ دار اصحاب نے جو حکومت کے وزیر بھی ہیں اور مشیر بھی، کوئٹہ کانفرنس میں اُردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی مضامین کی فہرست سے نکال کر اختیاری مضامین کی فہرست میں جو ثانوی حیثیت کی حامل ہے، کیوں شامل کرنے کی تجویز منظور کی؟

. . . . . کیا حکومت اس ضمن میں اپنی پوزیشن کی وضاحت قوم کے سامنے پیش کرے گی؟

(ڈاکٹر ایف۔ ڈی نسیم صدر انجمن ترقی اُردو ۱۷۸۔ عالی روڈ ساہیوال)

اس مراسلے سے جو حالات سامنے آئے ہیں یقیناً تشویش انگیز اور الم ناک ہیں۔ ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی بالائی سطح پر اُردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کے حق میں جتنی باتیں کہی جاتی ہیں نچلی سطح پر عمل اسی قدر کم تر بلکہ پریشان کن حد تک ان باتوں کے برعکس ہوتا ہے۔ صوبائی وزرائے تعلیم نے تو ابھی اردو، اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو اختیاری مضامین قرار دینے کی تجویز ہی کی ہے اور اس سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ منظر عام پر نہیں آیا مگر پنجاب

صدرِ مملکت اور وزیر اعظم قومی زبان کو بے آبرو ہونے سے بچائیں

میں بیوروکریسی میں موجود مخصوص ذہن نے اُردو کو "دیس نکالا" دینے کے اقدامات کا آغاز کر دیا ہے۔

مجھے جب ساہیوال کے صدر انجمن ترقی اُردو ڈاکٹر نسیم صاحب کا مراسلہ ملا تو میں نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے بعض صاحبانِ علم اور اساتذہ سے رابطہ پیدا کیا تو مجھ پر کھلا کہ اساتذہ کی تربیت کے کالجوں میں اُردو کی تدریس کو ختم کرنے کے اقدامات کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

. . . . ٹریننگ کالجز کے نصاب سے اُردو زبان کو تو گویا ختم کر دیا گیا ہے۔ ان کالجوں میں ان اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے جو ہائی سکولوں میں طلبا کو پڑھاتے ہیں اور تدریس کا موثر فریضہ ادا کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء یعنی قیام پاکستان کے بعد سے ان کالجوں میں اُردو کی تدریس کا مضمون لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا لیکن ۱۹۸۷ء کے لیے جو نصاب تیار کیا گیا ہے اور جس کا اندراج گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن (سابقہ سنٹرل ٹریننگ کالج) لوئر مال لاہور کی پراسپکٹس (معلومات نامہ) میں کیا گیا ہے اس میں تدریس اُردو کو ایک اختیاری مضمون قرار دیا گیا ہے۔

پراسپکٹس کے مطابق آرٹس گروپ کے لیے آٹھواں پرچہ پہلا اختیاری مضمون درج ذیل زبانوں میں سے ایک ہوگا۔

. . . تدریس اُردو، تدریس عربی، تدریس فارسی اور تدریس انگریزی

اس میں شرط یہ ہے کہ ان چاروں زبانوں میں سے طالب علم اس زبان کی تدریس

بطور اختیاری مضمون اختیار کر سکے گا جو اس نے بی۔ اے سطح تک بطور لازمی یا اختیاری مضمون پڑھی ہو۔

لاہور کے دو ٹریننگ کالجوں کے اساتذہ اور خواتین اساتذہ نے اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ نصاب میں اُردو کی تدریس حسب سابق لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل رہے لیکن انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ یونیورسٹی کے بورڈ آف سٹڈیز میں ٹریننگ کالجوں کی طرف سے جو سفارشات نصاب کے ضمن میں ارسال کی گئیں وہ سب مسترد کر دی گئیں۔ یہ افسوسناک بات بھی سامنے آئی ہے کہ اُردو کو ٹریننگ کالجوں کے نصاب میں قانونی حیثیت دینے اور پس پشت ڈالنے کی کوششوں میں "ایجوکیشن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے ناخدا پیش پیش رہے

بی ایڈ کے نصاب میں اُردو کی جو حیثیت بنا دی گئی ہے قومی زندگی کا دھارا اس سے یقیناً متاثر ہوگا۔ تدریس اُردو، تدریس عربی، تدریس فارسی اور تدریس انگریزی کا مضمون وہ بھی اختیاری حیثیت میں حاصل کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ طالب علم نے بی۔ اے میں بھی یہ مضمون پڑھا ہو اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بیشتر طلبا انگریزی کی تدریس کا مضمون رکھیں گے کیونکہ بی۔ اے میں ان تینوں زبانوں سے امتحان پاس کرنے والے طلبا کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس سے تینوں زبانوں اردو، عربی اور فارسی کی تدریس کو نقصان پہنچے گا۔ دسویں جماعت تک اُردو لازمی ہے، عربی مڈل تک لازمی کی جا چکی ہے اور صدر مملکت اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ میٹرک کی سطح تک عربی کو لازمی قرار دیا جائے گا لیکن اساتذہ کا نصاب تیار کرنے والے اُردو اور عربی کے لیے اساتذہ تیار کرنے سے "انکاری" ہیں اور انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ اب ان دونوں زبانوں کے اساتذہ ہی دستیاب نہ ہو سکیں گے۔

لاہور میں خاتون اساتذہ کی تربیت کا کالج "لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج" ہے۔ اس کالج میں ہر سال پانچ سو کے لگ بھگ طالبات داخل ہوتی ہیں۔ جب تک "تدریس اردو" کا مضمون لینے کے لیے بی۔ اے میں اس مضمون کو پڑھنے کی پابندی نہ تھی، ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طالبات تدریس اُردو کا مضمون لیا کرتی تھیں۔ اس پابندی کے بعد نصف درجن سے زائد طالبات "تدریس اُردو" کے مضمون کو میسر آئی ہیں۔ یہی حال گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن لوئر مال میں ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ اس سال جو داخلے ہوں گے ان میں شاید تدریس اُردو کے لیے کوئی امیدوار ہی نہ ہو۔

...... سوال یہ ہے کہ

...... کیا ہم اُردو زبان کو واقعی قومی زبان تصور کرتے ہیں؟

...... کیا ہم اُردو کی ترقی کے خواہاں ہیں اور بالآخر قومی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنانا چاہتے ہیں؟

...... یا ہم انگریزی کو اپنی قوم پر مسلط رکھنا چاہتے ہیں اور دورِ غلامی کی اس یادگار کو سینے سے لگائے بغیر ہمیں چین نہیں آتا؟

.... ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہے تو کیا صدر مملکت اور وزیر اعظم اُردو کی زبوں حالی پر توجہ مبذول فرمائیں گے اور ایسے اقدامات کرنے والوں کا محاسبہ کیا جائے گا جنھوں نے اُردو کو اپنے ہی گھر میں اجنبی بنا دیا ہے۔

.... اے صاحبانِ اقتدار!...... اے حکام والاجاہ!..... اے کہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ قوم کی بھلائی کر سکیں۔

قومی زبان کو بے مایہ تصور کرنا چھوڑ دو۔

قومی زبان کو دیس نکالا دینے کی کوششوں سے باز رہو۔

اُردو کو اس کا جائز مقام دو کہ قومی تشخص کے لیے اپنی زبان بے حد ضروری ہے۔

قومی زبان کو بی۔ اے تک لازمی مضمون کی حیثیت سے پورے ملک میں لازماً پڑھایا جائے۔

انٹر میں اُردو کی موجودہ لازمی حیثیت کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کا دوسرا نمبر کا پرچہ قائم رکھا جائے۔

.... یاد رکھیں اگر ہم نے اپنے ملک میں اپنی قومی زبان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جس کا آغاز کر دیا گیا ہے تو بیرون ملک ہمارا وقار متاثر ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ یہ کیسی قوم ہے جو ۴۰ سال گزر جانے کے باوجود اپنی قومی زبان کو اس کی جائز حیثیت نہیں دے سکی۔

اساتذہ کے تربیتی کالجوں میں "تدریسی اُردو" کو اختیاری مضمون قرار دے دیا گیا،

.... قومی زبان کے ساتھ بدسلوکی کا خمیازہ ہم ۱۹۷۱ء میں بھگت چکے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں نہیں کھلیں۔

غلامانہ ذہنیت کا حامل طبقہ اُردو کو ختم کرنے کے در پے ہے۔

...... لیکن اگر ہم نے ایسا کیا۔ قومی زبان کو جبی اپنے ہی گھر میں اپنے ہی ملک میں بنا کر رکھ دیا تو یاد رکھو ایک دن آئے گا کہ

؎ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اُردو کے عاشق اور اُردو کے بل پر اعزازات یافتہ کہلانے والے کہاں ہیں؟

...... اور اے اردو کے نام لیواؤ! اے اُردو کے عاشقو! اے اُردو کے باعث عزت پانے والو! کہاں ہو؟

اے احمد ندیم قاسمی! اے منو بھائی! اے انتظار حسین! اے عبدالسلام خورشید! اے امجد الطاف! اے نذیر ناجی! اے ظفر علی راجا! اے متنفر حسین تارڑ! اے وحید قریشی! اے پریشان خٹک! اے منیر نیازی! اے جمیل جالبی! اے مشفق خواجہ! اے ضمیر جعفری! اور نہ جانے کون کون جو اُردو کے بل پر زندہ تابندہ ہو، اُردو کے بل پر زندگی کے عیش و عشرت سے بہرہ ور ہو، کیا کیا نہ ہو، اعزازات یافتہ ہو۔ اُردو کی کسمپرسی سے بھی باخبر ہو یا اپنے آپ میں ہی مگن ہو؟ اٹھو! اُردو کے دفاع کے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہو تو آؤ! اُردو کے جنازے میں ہی شریک ہو جاؤ۔

(بشکریہ۔ روزنامہ مشرق لاہور۔ ۲۲ مارچ ۸۷ء)

انگریزی تعلیم کی وجہ سے طلباء کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو رہی ہیں

اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے اقدامات کئے جائیں

[illegible]

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۱ مارچ ۱۹۸۷ء)

شمیم اختر

ڈاکٹر وحید قریشی ــــــــ ملک میں اُردو کا نفاذ چاہتے ہیں

ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں یٰسین رضوی صاحب کہتے ہیں "ہم نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جو وقت گزارا ہے چاہے اس کا دورانیہ پانچ منٹ ہی کیوں نہ ہو ان کی ذات سے ہم مستفید ہو کر ہی اُٹھے ہم جب بھی ان کے پاس بیٹھے ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ میں یٰسین رضوی صاحب کے بیان میں اتنا اضافہ کرتی ہوں کہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین اور تاریخ کے طالب علم اور معلم ڈاکٹر وحید قریشی اپنے ملنے والوں اور کارکن ساتھیوں کے ساتھ شفقت کا اظہار الفاظ کے ذریعے نہیں کرتے لیکن ان کی محفل میں ان کی شفقت کا احساس ہر وقت رہتا ہے۔ میں ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکی ہوں اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک مہربان میزبان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے موضوع اور کام پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ممکنہ آواز اٹھاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے دن رات کام میں مصروف ہیں۔ سائنسی علوم اور دفتری زبان کے لیے اردو میں انگریزی کی متبادل اصطلاحات پیش کرتے ہیں اور اس ضمن میں کتابیں شائع کرتے ہیں۔ مگر یقین نہیں رکھتے کہ ان کی دی گئی اصطلاحات اور بتی ویز رائج کی جائیں گی۔ اس لیے کہ مقتدرہ قومی زبان کے ادارے کی اپنی حیثیت یہ ہے کہ ادارہ محض کابینہ کی ایک قرارداد کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ فی الحال اس کا کوئی آرڈیننس یا ایکٹ پاس نہیں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس صورت حال کے بارے میں کہتے ہیں کہ "نتیجہ یہ کہ ہماری حدود اور دائرہ کار کے مطابق حیثیت ابھی تک متعین نہیں ہے حالانکہ قومی زبان کا کام کرنے کے لیے اختیارات اور وسائل کے بارے میں بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اب اگر اس ادارے کو محض ایک سرکاری محکمہ بنا دیا گیا تو پھر یہ چل نہیں سکے گا۔ عوام اور حکومت اردو کی ترویج کے لیے جو تیز رفتاری چاہتے ہیں وہ شاید پیدا ہی نہ ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ اسے ایک بڑی حد تک آزاد اور خود مختار ادارے کے طور پر لایا جائے، اس پہلو پر حکومت کی خصوصی توجہ درکار ہے۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ میں پچاس ہزار روپے کا کاغذ بھی یکمشت نہیں خرید سکتا۔ حکومت کے حکم کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا خریدنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہماری کتابیں مہنگی ہوتی جا رہی ہیں"۔

مقتدرہ قومی زبان کے قیام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ کابینہ کی ایک قرارداد کے نتیجے میں چھ برس پہلے یہ ادارہ قائم ہوا تھا۔ پاکستان کے آئین میں یہ درج ہے کہ پندرہ برس کے اندر سارے ملکی نظام کو اردو میں منتقل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا۔ مختصر طور پر اس کے بنیادی مقاصد یہ ہیں کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینے کے لیے ذرائع اور وسائل پر غور کرنا اور اقدامات کرنا۔ اس کے علاوہ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر، عدالتوں اور دوسرے اداروں میں کام کرنے والے عملے کی تربیت کے لیے خواندگی کا مواد تیار کرنا۔ اردو کے لیے جو ترقیاتی ادارے کام کر رہے ہیں ان میں باہمی ربط پیدا کرنا، وفاقی اور صوبائی ملازمتوں کے کمیشنوں کے تعاون سے قومی زبان کو مقابلے کے امتحانات میں ذریعہ امتحان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے مناسب اقدامات کرنا۔ ان امور پر عمل درآمد کے لیے ہم نے اس بات کا جائزہ لیا کہ وہ کون سا سیکٹر ہو سکتا ہے جس میں ہمیں زیادہ آسانی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ہمارے سامنے تین سیکٹر تھے (۱) دفتری امور و نظام (۲) تعلیم کا شعبہ (۳) مقابلے کے امتحانات۔

ہم نے پہلے اپنی ترجیحات متعین کیں اور کام کا آغاز دفتری امور سے کیا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اسکیل سولہ یا سترہ تک کے ملازمین عموماً یونیورسٹیوں سے آتے ہیں۔ ان کے ہاں اردو کی شنوائی زیادہ ہے۔ ان میں قومی زبان کو خوش آمدید کہنے کا جذبہ بھی زیادہ ہے دفتری ضروریات کے تحت اب تک ہم تقریباً دس کتب شائع کر چکے ہیں۔ ہم نے حال ہی میں دفتری مراسلت کے سلسلے میں آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک لغت بھی شائع کی ہے۔ کتاب چھپ چکی ہے۔ آج کل ہم اس کی طباعتی غلطیاں درست کر رہے ہیں اس کے بعد اسے عام استعمال کے لیے مارکیٹ میں لے آئیں گے۔

دوسرے سیکٹر یعنی درسی کتابوں کی تیاری اور تراجم کا آغاز ہم نے موجودہ سال سے کر دیا ہے۔ ابتدائی منصوبہ بندی کی جا چکی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ترجیحات کا تعین، کتب کا انتخاب اور ترجمہ کرنے والوں کی فہرست تیار کر رہا ہے۔

دفتری اصطلاحات کی معیار بندی کے لیے اختیار کیے گئے طرز عمل کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ پنجاب کی مجلس زبان دفتری صوبائی نوعیت کا ادارہ ہے۔ اس ادارے نے دفتری اصطلاحات کی ایک لغت تیار کی اور اسے چھاپ دیا۔ اب ہم نے یہ کیا کہ اس میں جو الفاظ زیادہ استعمال کے ہیں ان کو منتخب کر کے دفتری اصطلاحات کی ایک چھوٹی سی لغت تیار کر دی اور پہلے پہل اسی کو استعمال کیا۔ اسی دوران ہمیں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ اکثر یہ صورت حال سامنے آئی کہ بعض اصطلاحات نامانوس تھیں۔ دوسرے اس ادارے کا دائرۂ کار صوبہ پنجاب تک محدود تھا۔ اس کی معیار بندی پورے پاکستان کی سطح پر نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے مجلس زبان دفتری پنجاب سے کہا کہ وہ حتمی نظرثانی کے لیے لغت ہمارے حوالے کریں گے تاکہ اسے پورے پاکستان کے لیے معیار بند کیا جا سکے۔ وہ مان گئے انھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے خود وضع اصطلاحات کا کام بھی شروع کیا تھا۔ ترجمے کے لیے زیادہ مواد ہمارے پاس محکمہ مالیات سے پہنچا۔ ہم نے اصطلاحات سازی کا آغاز اسی سے کیا۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں تین آدمی مالیات سے لیے گئے اور دو اسکالر بھی کمیٹی میں شامل تھے۔ یہ اصطلاحات ہم نے شائع کر دیں۔ اس کے علاوہ محکموں اور عہدوں کے ناموں کے اردو ترجموں پر مشتمل دو کتابیں چھاپ دیں۔

مذکورہ کام خاص مشکل نہیں ہے۔ اصل مسئلہ جدید علوم کے ترجمے کا ہے۔ جدید علوم میں نئی نئی اصطلاحات پیدا ہو رہی ہیں اس پورے سرمائے کو اردو میں منتقل کرنا مقتدرہ کی طاقت سے باہر ہے اس لیے جب تک براہ راست سائنس دان اور ریاضی دان حضرات کو شریک نہیں کیا جائے گا ترجمے کا عمل ارتقا پذیر نہیں ہو گا۔ بڑی بات یہ ہے کہ جب تک براہ راست قومی زبان میں طبع زاد علوم سامنے نہیں آئیں گے ہم مقلد ہی رہیں گے اور یہ بھی کہ علوم کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ جب تک ہم ترجمے سے چھٹکارا پائیں گے علوم بہت آگے نکل چکے ہوں گے۔ اس پیچیدگی کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ چیز ہمارے لیے مستقل الجھن کا باعث رہی ہے۔ یہ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ تعلیم کے سیکٹر میں اور علوم و فنون کی جو ترقی ہو رہی ہے، اس سمت میں بھی ہم کچھ کام کریں۔ چنانچہ ہم نے اس فن کے بعض ماہرین کو اس میں شریک کیا۔ متبادلات کی لغت تیار کر کے ان کے تسویدی اڈیشن شائع کیے ہیں کہ ان پر اہل علم کی رائے معلوم ہو جائے اور اس کی روشنی میں ہم معیار بندی کر سکیں۔ چنانچہ مقتدرہ نے نفسیات کی لغت شائع کر دی ہے۔ ریاضی کی اصطلاحات بھی چھپ گئی ہیں۔

"یہ تو ہوا ترجمے کا عمل۔ ہمارے ہاں ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ علم کا سرچشمہ صرف انگریزی زبان ہے۔ دنیا میں جب سے علوم کا لاوہ پھیلا ہے لوگ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ علوم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ انگریزی نہیں رہی۔ کیونکہ پچاس فیصد علم ہمیں انگریزی سے حاصل ہوتا ہے اور بقیہ پچاس فیصد جرمن، فرانسیسی، روسی، چینی اور جاپانی زبانوں سے چنانچہ انگلستان اور امریکہ کے دارالترجمے سرعت سے ان زبانوں کے علوم انگریزی میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے لیے انگریزی واحد سرچشمہ ہے۔ میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ جب ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بات کرتے ہیں تو ہم زور دیتے ہیں کہ انگریزی کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ ہم تو انگریزی کو لازمی ثانوی زبان کے طور پر زندہ رکھنے کے حق میں ہیں۔ لیکن لوگ ان دونوں باتوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے ہیں اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے مسئلے سے الجھا دیتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ فطری ذہانت اپنی زبان میں علم کو سمو سکتی ہے اسے تحریک دینا دانشوروں اور قوم کے رہنماؤں کی ذمہ داری ہے۔ جب تک مناسب ماحول پیدا نہیں ہو گا قومی زبان میں اعلیٰ سطح کا علمی سرمایہ ممکن نہیں ہے۔ اپنے راستے کی ان رکاوٹوں کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ جب تک کسی خاص سیکٹر میں زبان استعمال نہ کی جائے اس کی صلاحیت نہیں بڑھتی۔ ہم پچاس ہزار کتابیں ترجمے کر کے رکھ لیں وہ مفید نہیں ہوں گی۔ ضرورت عملی نفاذ کی۔ اگر ہم ذریعہ تعلیم تبدیل کر دیں تو کتابیں خود بخود مارکیٹ میں آنا شروع ہو جائیں گی جب تک اردو کی آزمائش اس سیکٹر میں نہیں ہوتی، بات نہیں بنے گی۔ جو کام ہم کر رہے ہیں اس کی صحت کی جانچ استعمال سے ہی ہو گی۔ پھر اس پر نظرثانی ہوتی رہے گی۔

ہمارے ہاں لسانی مسئلہ شروع ہی سے تحریک پاکستان کے ساتھ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ سیاسی مسئلوں کے حل سیاسی ہوتے ہیں اور علمی مسئلوں کے حل علمی۔ ہمارے ہاں غلط تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ہم لسانی سطح پر کوئی سمجھوتہ کر لیں گے تو وہ آخری اور قطعی اور اس سے ہمارے دلدر دور ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ زبان بیماری نہ بیماری کی علامت ہے۔ اصل علاج بیماری کا ہونا چاہیے نہ کہ علامت کا۔ ہمیں سمجھوتہ کی بجائے اصل مسائل کو حل کرنے پر توجہ دینی چاہیئے۔

کیا مقتدرہ کی کوششوں سے کسی دفتر یا محکمے میں واقعی عملاً اردو رائج ہوئی۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جہاں تک ہماری کوششوں کا تعلق ہم نے یہ کام تین طرح کیا۔ افسروں کو اردو سکھانے کا پروگرام حکومت نے بنایا۔ ان کی تربیت ہمارے ذمے تھی۔ بنیادی طور پر یہ کام ہمارے مقاصد میں شامل نہیں تھا

نے از خود کیا۔ طے ہوا تھا کہ ہر سال دس ہزار افسروں کو تربیت دی جائے گی۔ عملی صورت یہ ہے کہ دس ہزار کے مقابلے میں پہلے دور میں سات سو، دوسرے میں گیارہ سو اور تیسرے میں تقریباً آٹھ سو افسر شریک ہوئے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ صرف افسروں کی تربیت کے لیے چھ برس اور لگیں گے۔ دوسرا اسیکٹر دفتروں میں ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافروں کی تربیت تھا۔ اس کے لیے ٹائپنگ سنٹر قائم ہیں۔ تربیت کار ہمارے ادارے کی طرف سے تنخواہ پا رہے ہیں اور اس پر انتظامی کنٹرول کابینہ کا ہے۔ یہ دو عملی نتیجہ خیز نہیں ہے۔

اس وقت وزارت مذہبی امور میں اسی فیصد کام اردو میں ہو رہا ہے۔ البتہ اطلاعات کے محکمے میں رفتار میرے نزدیک سست ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی میں اردو کا بہت کچھ چلن نظر آتا ہے۔ اس سے میں مایوس نہیں ہوں سست رفتاری کا گلہ گزار ضرور ہوں لیکن بددل نہیں ہوں۔ میرے خیال میں لوگوں کو نفسیاتی طور پر قومی زبان کا عادی بنانے کے لیے بھی تھوڑے بہت صبر و تحمل کا ثبوت دینا پڑے گا۔

ٹائپ رائٹر کا کلیدی تختہ مقتدرہ کا ہی طے کردہ ہے۔ حکومت نے اس کا اور ٹیلی پرنٹر دونوں کے تختے منظور کیے ہیں اور اس منظور شدہ کلیدی تختے پر تربیت کا کام ہو رہا ہے۔ مقتدرہ نے آزمائشی طور پر راولپنڈی اور اسلام آباد میں ان مراکز کو اردو ٹائپ مشینیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ مقتدرہ کے ذیلی دفاتر میں بھی اردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کی مشق کے سنٹر قائم ہیں۔ کراچی کا مرکز چل رہا ہے۔ دوسرے ذیلی دفاتر میں اس سال سے تربیت کے مراکز جاری ہو جائیں گے۔ صدر دفتر میں بھی اسے جاری کرنے کا پروگرام ہے۔ فی الوقت کراچی میں ستر آدمی زیر تربیت ہیں۔ مقتدرہ نے ایک کام یہ بھی کیا ہے کہ پانچ دن کا مختصر دفتری کورس بنایا ہے۔ یہ تربیتی ورکشاپ کامیاب تجربے کر چکا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ ہمارے نزدیک نفاذ اردو پہلے ہے اور اصلاح اردو بعد میں ہے۔ انگریزی کے کچھ الفاظ کے ساتھ سطوت کی قدر وابستہ ہے۔ مثلاً باربر کو حجام کہیں تو برا مانتا ہے اس لیے ایسے الفاظ کو ہم ترجمہ کے ذریعے نہیں چھیڑتے۔ باربر کو باربر ہی کہتے ہیں۔ ہم دو انتہاؤں سے بچ کر چلتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ "ہے اور تھا" اردو میں لکھ کر باقی انگریزی میں رہنے دیں اور یہ بھی نہیں کہ انگریزی کے عام فہم مروجہ الفاظ نکال کر عربی اور فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ ترجمے کی صورت میں ٹھونس دیں۔ ترجمے کے سلسلے میں ہمارا معیار عام لوگ ہیں، سرکاری افسر نہیں۔ اصطلاحات مشکل یا آسان نہیں ہوتیں، مانوس یا غیر مانوس ہوتی ہیں۔ فزکس، کیمسٹری اور دیگر سائنسی علوم انگریزی میں بھی اتنے ہی خشک ہوتے ہیں جتنے کہ اردو میں۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ بین الاقوامی اصطلاحات کو جوں کا توں رہنے دیا جائے یا ان کا ترجمہ کریں۔ ہم نے یہ فیصلہ سائنس دانوں کے سپرد کر دیا ہے۔ ہم ان کو ترجمے کے کام میں شریک کر کے کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ آپ کیجیے۔ اس مسئلے پر سائنس دانوں میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ ہر اصطلاح کا ترجمہ چاہتا ہے جبکہ دوسرا گروہ ان کو جوں کا توں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ دونوں گروہ آپس میں متفق نہیں اس لیے میں نے ترجمے کے لیے سوشل سائنس کو پہلے لیا ہے اور سائنس کو مؤخر کر دیا ہے۔

(بشکریہ اخبار خواتین) ۲۵-۳۱، ۳، ۸۷

واحد سرکاری زبان

مکرمی! حال ہی میں مرکزی وزیر تعلیم نسیم آہیر اور مقتدرہ قومی زبان کے ڈاکٹر وحید قریشی کے بیانات اردو زبان کو قومی سطح پر مروج کرنے کے بارے میں نظر سے گزرے۔ قومی مفاد کو اہمیت دینے والی بہت سی شخصیات جن میں صدر مملکت بھی شامل ہیں اردو زبان کو اس کی حقیقی حیثیت دینے کے بارے میں اپنے مثبت خیالات اور کوششوں کا اظہار کرتی رہی ہیں مگر خود مختار اور آزاد قوم ہونے اور ایک انتہائی ترقی یافتہ زبان رکھنے کے باوجود عملی طور پر ہم انگریزی زبان کو اردو زبان کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیے جا رہے ہیں اس کی اصل وجہ وہ مخصوص مفاد یافتہ طبقہ ہے کہ جو انگریزی زبان کو اپنی سیاسی بالادستی معاشی برتری اور اپنے بچوں کے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھتا ہے انگریزوں کی تقلید میں آج بھی یہ مخصوص مفاد پرست گروہ "حاکم کے لئے انگریزی اور محکوم کے لئے اردو" کے دو متوازی خطوط پر نظام کی تعلیم کی استواری اور سرکاری کاموں کی انجام دہی کا طالب ہے اور ملکی و قومی یکجہتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ پاکستان کے مخصوص معاشرتی حالات میں قومی یکجہتی اور استحکام پاکستان کے لئے اردو زبان کو اس کا حقیقی مقام دینا بے حد ضروری ہے۔ انگریزی طرز تدریس نے طلبہ کے فکر و فہم اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی زنگ آلود کر دیا ہے۔ چنانچہ حکومتی سطح پر فوری طور پر چند اقدامات کی ضرورت ہے جن میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں۔ ہر سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم و تدریس بنایا جائے تاکہ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکے۔ مقابلے کے تمام امتحانات میں تحریری امتحان اور انٹرویوز اردو میں لئے جائیں۔ اردو کو واحد سرکاری زبان تسلیم کیا جائے یاد رہے کہ آزاد کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان بنائے جانے کا تجربہ بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اردو کو اختیاری زبان بنائے جانے کی موشگافیوں کا نوٹس لیا جائے۔ انگریزی میڈیم سکولوں پر پابندی لگائی جائے اور ملک کے تمام سکولوں کو تعلیمی پالیسی کا یکساں طور پر پابند کیا جائے کیا متعلقہ حکام اس سلسلہ میں غور کریں گے؟ - چاوید علی چودھری سیکرٹری نشرواشاعت پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن لاہور۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۳ اپریل ۸۷ء

اصطلاحات کی معیار بندی کا کام مکمل ہو گیا

اسلام آباد، ۷ اپریل (نیوز ڈیسک) مقتدرہ قومی زبان نے مجلس زبان دفتری پنجاب کی اصطلاحات کی معیار بندی پر کام سات ماہ کی قلیل مدت میں مکمل کر لیا ہے۔ بیان محمد اسلم ڈائریکٹر دستاویزات، پنجاب کی زیر صدارت معیار بندی کرنے والی کمیٹی نے تقریباً ۲ ہزار اصطلاحات معیار بند کی ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۸ اپریل ۸۷ء

قومی زبان اور پنجاب

ڈاکٹر الٰہی سدید ان دنوں قومی زبان و ادب کے علمی تحقیقی پنجاب کا حصہ کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھ رہے ہیں اس کتاب میں اردو زبان کے قومی زبان بننے کی داستان اور اس پورے عمل میں پنجاب کے عمل حصے کا بھی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ الٰہی سدید نے حال ہی میں ہندی اور اردو کا تقابلی مطالعہ بھی مکمل کی ہے اور ان کا یہ مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

روزنامہ نوائے وقت پنڈی ۱۳ اپریل ۸۷ء

ایک پی۔ ٹی۔ سی ٹیچر

نصاب اور معیارِ تعلیم کی جانچ پڑتال کی جائے

موجودہ حکومت معیارِ تعلیم بلند کرنے ۔ شرحِ خواندگی بڑھانے اور نئی پود کو زیادہ سے زیادہ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے سلسلے میں خلوص دل سے کوشاں ہے اور یہ قدم بجا طور پر قابل تعریف بھی ہے ۔ مذکورہ موضوع پر آئے دن اخبارات و جرائد میں نئی اور مربوط تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کے لیے اہلِ قلم اور اہلِ دانش اپنی بیش بہا آرا اور تجاویز سے اربابِ اختیار کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں ان کی یہ قیمتی تجاویز بجائے خود انمول اور تعلیمی پالیسی سازوں کے لیے مشعلِ راہ بھی ہوتی ہیں ۔

تاہم یہ حقیقت عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ زبانی دلائل جتنے آسان ہوتے ہیں میدانِ عمل میں ان پر عمل کرنا اور کرانا اتنا ہی مشکل ۔

دلائل اور تجاویز کے ساتھ ساتھ حقائق سے فرار بہت بڑے فریب کے مترادف ہے اور اس دھوکے سے تب ہی بچا جا سکتا ہے کہ تصویر کے روشن رخ پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ تاریک پہلو بھی پیشِ نظر رہے ۔ اگر ہم تاریک پہلو پر نگاہ ٹھہرائیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہمارا ملک اور حکومت ان تجاویز پر عمل کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں اور اگر اس قابل ہے تو کس حد تک ۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات ہمیں وطنِ عزیز کی اقتصادی حالت پر ایک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ نظر ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں اور ایک اور سوال وسوسہ بن کر سر ابھارنے لگا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی اندھا دھند تقلید کے نتائج کہیں رہی سہی کسر تو نہیں نکال دیں گے ۔ ترقی یافتہ ممالک کی دوڑ میں شامل ہونے سے قبل اپنی حالت پر ناقدانہ نگاہ ڈال کر اپنی خامیوں کا جائزہ لے لینے سے مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے ۔

خدانخواستہ اس نازک دور میں ہم مثبت تعلیمی پالیسی مرتب نہ کر سکے تو خدشہ ہے کہ ملک تعلیمی میدان میں بہت حد تک پیچھے نہ رہ جائے اور کسی زخم کے مندمل ہونے کے امکانات معدوم نہ ہو جائیں ۔ اس میں شک نہیں کہ وقت کی ضرورت اور تقاضے ہمیں ہر قسم کی جدید تعلیم کی طرف قدم بڑھانے پر مجبور کرتے ہیں اور ہمیں یہ قدم اٹھانا بھی چاہیئے لیکن انتہائی سوجھ بوجھ اور سنبھل سنبھل کر اور ہر اٹھتے قدم کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ اگر ہم نے اندھی دوڑ شروع کر دی تو منزل مراد پر پہنچ پانے کی بجائے گر جانے کے امکانات زیادہ ہیں ۔

ملک کی اقتصادی حالت کے لامحدود مسائل اور محدود وسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ تعلیمی پالیسی ہوش مندی سے مرتب کی جائے جو وقت کی رفتار کے تقاضے پورے کرے اور ملکی گاڑی کے پیچ پرزے بھی ڈھیلے نہ ہونے دے ۔ ایک پرائمری مدرس کی حیثیت سے کسی رائے کا اظہار اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے تاہم اپنی کم فہمی، کم علمی اور کم دانی کے باوجود ضرور گزارش کروں گا کہ اگر موجودہ تعلیمی پالیسی مرتب کرتے وقت پرائمری کے نصاب کی حد تک درج ذیل تجاویز پر نظر ڈال لی جائے تو ممکن ہے کچھ مدد مل سکے ۔

۱۔ پہلی جماعت کا موجودہ نصاب ناچیز کی رائے میں انتہائی موزوں ہے اگر ایک بچہ زبان دانی کی خاطر پڑھائی جانے والی کتابوں پر عبور حاصل کرے تو اسے اگلی جماعت میں اردو پڑھنے کے لیے قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی ۔

۲۔ دوسری جماعت کے لیے صرف اردو اور حساب کی دو کتابیں جو وقت کے تقاضوں کے مطابق مرتب کی گئی ہوں کافی ہیں ۔

۳۔ تیسری جماعت کے نصاب میں اردو اور حساب کے ساتھ ساتھ دینیات کی مستند کتاب شامل کر لی جائے ۔

۴۔ چوتھی جماعت کا نصاب مرتب کرتے وقت اردو، حساب اور دینیات کے ساتھ ساتھ تاریخ پاکستان کے حقائق پر مبنی مستند کتاب شامل کر لی جائے ۔

۵۔ پانچویں جماعت کے نصاب میں اردو، حساب، دینیات اور تاریخ پاکستان کے ساتھ سائنس یا فنی تعلیم کی کتاب شامل کر لی جائے ۔

۶۔ نصاب مرتب کرتے وقت پیش نظر رہے کہ غیر ضروری اور مبہم قسم کا مواد شامل نصاب نہ ہو اور ہر جماعت کے نصاب میں کڑی کڑی اور سیڑھی سیڑھی ربط اور تسلسل بھی موجود ہو ۔ ناہموار تعلیمی نصاب بچوں کے لیے ذہنی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کرتا ہے اور اس کی بے ربطی کے باعث بچے سے بارگراں سمجھ کر فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں نصاب میں جہاں تک ہو سکے کشش اور دلچسپی پیدا کی جائے تاکہ بچہ اس میں خود بخود دلچسپی لیتا چلا جائے ۔

(بشکریہ "پکار" اسلام آباد ۔ ۱۰۔۳۔۸۷)

مقتدرہ کے آڈیٹوریم کی رسمِ افتتاح کی تصویری جھلکیاں

صدر نشین مقتدرہ کے آڈیٹوریم کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔

وفاقی وزیر حاجی محمد حنیف طیب آڈیٹوریم کے افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں

وفاقی وزیر حاجی محمد حنیف طیب کو نائب ناظم دارالترجمہ
کی کتابیں پیش کر رہے ہیں

دائیں سے بائیں ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر وحید قریشی، حاجی محمد حنیف طیب، ڈاکٹر
تصدق حسین راجا اور ڈاکٹر اعجاز راہی مقتدرہ کے آڈیٹوریم کی افتتاحی تقریب میں

مطبوعات مقتدرہ

دفتری امور

اصطلاحات

کشاف اصطلاحات

لغات

کتابیات

کتب حوالہ

سیمینار

متفرق مواد خواندگی

درسی کتب

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

جلد ۴

- لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر
- ترکی میں مطالعۂ اردو
- فنِ ترجمہ کی تدریس اور کتب خانوں کا کردار
- یوسف رضا گیلانی سے انٹرویو
- اصطلاحات اراضی و پٹوار
- شپلے کی فرہنگ اصطلاحاتِ ادبی

معروضات

اخبار اردو کا موجودہ شمارہ سال رواں کے نصف آخر کا پہلا شمارہ ہے جو ہمیں یاد دلا رہا ہے کہ ۱۹۸۷ء چند ماہ میں رخصت ہونے والا ہے اور ۱۹۸۸ء انشاء اللہ ملک میں نفاذ اردو کے خواب کی تعبیر بن کر طلوع ہوگا ان منفی رویوں کے باوجود جن کا بعض جانب سے بوجوہ تاخیر پسندانہ اظہار کیا جا رہا ہے ہمیں امید ہے کہ موجودہ حکومت اس اعزاز کو اپنے نام لکھے جانے کے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گی، بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہوگا اور جس کو بھی نصیب ہوا مستقبل کا مورخ اسے جلی سنہری حرفوں میں لکھے گا۔ ہماری دعا بھی ہے اور آرزو بھی کہ موجودہ حکومت ہی کے سر اس کا سہرا بندھے اور محترم وزیر اعظم اسے اپنے پانچ نکاتی پروگرام کا حصہ سمجھ کر اس کی تکمیل میں ذاتی دلچسپی لیں اور سرکاری و غیر سرکاری اجتماعوں میں ان کا یہ اصرار بھی کہ ان کے رفقائے کار اردو ہی کو ذریعے خطاب و کلام بنائیں اسی کی غمازی کرتا ہے۔ خدا کرے کہ ہماری توقعات درست ثابت ہوں اور مسلم لیگ اپنی اردو نوازی کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچا سکے۔

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد مقتدرہ قومی زبان، شمالی اعوان پلازہ، ۱۲۔ ڈی (اے بی)
بلیو ایریا، الف ۶، اسلام آباد — طابع: برق پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

فہرست

لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر
ڈاکٹر ایرکان ترکمان ۱

ترکی میں مطالعۂ اردو
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۳

فن ترجمہ کی تدریس اور کتب خانوں کا کردار
عطش درانی ۶

وفاقی وزیر برائے ریلوے یوسف رضا گیلانی سے انٹرویو
نفیرا اعظم ۹

اصطلاحات اراضی و پٹوار
ڈاکٹر گوہر نوشاہی ۱۱

شبلی کی فرہنگ اصطلاحات ادبی
جابر علی سید ۱۸

تعارف و تبصرہ
ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ۲۳

اخبار اردو کے نام ۲۶

ڈاکٹر ایرکان ترکمان*

لفظ اُردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر

سنہ ۱۹۸۳ میں جب چھ مہینے کے لیے بھارت گیا تو وہاں کے مسلمانوں کی گذارش پر میں نے "اردو پر ترکی کے تاثرات" پر تقریریں کیں جو انہیں بہت پسند آئیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو ترکوں اور مسلمانانِ ہند کی مشترکہ پیداوار ہے۔ ترکی النسل شاعر امیر خسرو نے اس کی بنیاد ڈالی اور ترکمان قلی قطب شاہ اور اسداللہ خان غالب جیسے ترک شاعروں نے اس زبان کی خدمت کر کے اسے چار چاند لگائے۔ اس لیے ترکی ادب کی تحقیق بھی ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس ادب اور زبان سے کون سے عناصر اردو میں داخل ہوئے۔ میں یہاں سب سے پہلے لفظ اردو پر ہی جو پاکستانیوں کی زبان کا نام ہے تبصرہ کرنا چاہتا ہوں (۱)

زبان ترکی کے تین بڑے مراحل ہیں ۱۔ اسلام سے پہلے والی زبان ۲۔ اسلام کے بعد کی زبان جو فارسی اور عربی سے بہت متاثر ہوئی ۳۔ جدید ترکی جو ترکی کی اب رسمی زبان ہے۔ اسلام سے پہلے کے جو متون ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ تر بدھ مت کے بارے میں ہیں دوسرے متون ترکوں کے پرانے بادشاہوں کے فرمانوں کے متعلق ہیں جو ۸ ویں صدی عیسوی میں لاٹھوں پر کندہ کیے گئے۔ کل تگین بادشاہ نے چینیوں کے خلاف جو متن کندہ کروایا وہ سنہ ۷۳٤ میلادی کا ہے۔ کل تگین کے کتبے ترکی زبان کے قدیم ترین نمونے ہیں جو آج تک دستیاب ہوئے ہیں۔ ان متون میں "اردو" کا لفظ ملتا ہے یہاں یہ لفظ "اوردو" (Ordu) کی شکل میں ہے جس کا مطلب "مرکزِ حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی" تھا (۲)

ترکوں کے مسلمان ہونے کے بعد سنہ ۱۰۷۲ میلادی میں یوسف خاص حاجب نے ایک "قوتادغو بیلیک" کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا مطلب ہے "مبارک علم یا علم دولت"۔ اس ضخیم کتاب میں جگہ جگہ "اردو" کا لفظ آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی میں اس لفظ کے معنی یہ تھے :۔

"محل یا شہر" (۳) یوسف فرماتے ہیں "ہر شہر، ملک اور محل (اردو) میں اس کتاب کا نام دوسرا تھا" (٤) اور "کوز اردو نامی ایک شہر کے رہنے والے تھے" (۵) ایک اور جگہ کہتے ہیں "دنیا ایک جیل خانہ ہے اس سے دل نہ لگا۔ تُو بڑے محل (اردو) اور ملک کی آرزو رکھ (یعنی جنت) تاکہ آرام اور سکون ملے" (٦) اور پھر کہتے ہیں "موت نے بہت سے شہروں (اردو) اور ملکوں کو تباہ کر دیا۔ موت نے بہت سے گھروں کو برباد کر ڈالا۔" (۷)

ترکی کے پرانے لہجے "اویغوری" (۸) میں اردو کا لفظ "محل اور لشکر گاہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا اس کا تلفظ "اورتو" کی شکل میں بھی مستعمل تھا (۹)

گیارہویں صدی عیسوی میں محمود کاشغری نے عربی پر ترکی کی فوقیت دکھانے کے لیے ایک لغت لکھی تھی جس کا نام "دیوان لغات الترک" ہے اس میں ۷۵۰۰ کے لگ بھگ الفاظ اور ان کے معانی ملتے ہیں لفظ اردو کے بارے میں جو کچھ اس میں ہے پیش کرتا ہوں :۔

اردو : وہ شہر جس میں خاقان (بادشاہ) مقیم ہوتا ہے، اس طرح کاشغر میں کیونکہ بادشاہ رہتے تھے اس لیے اسے بھی "اردو کند" کہا جاتا تھا" (۱۰)

اردو : "بالاساغون کے نزدیک ایک شہر کا نام ہے، بالاساغون شہر کو "قوز اردو" کہتے ہیں۔

اردو باشی (Ordu Basi) وہ شخص جو خاقان کا بستر بناتا ہے۔

کلاڈزن صاحب اپنی لغت میں (۱۱) ایسے ہی معنی دیتے ہوئے لکھتے ہیں "اردو (Ordu) یا اوردو (Ordo) بادشاہ کے رہنے کا محل" "بادشاہ کا خیمہ" منگولی میں یہ لفظ "اوردو" (Ordo) کی شکل میں ترکی سے لیا گیا ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ جب منگولین فوج نے نظام پایا اور ترکی کی عسکری طرز کو اپنایا تو یہ لفظ چنگیز خان کے بعد یعنی ۱۳ صدی عیسوی میں منگولی سے یورپ کی زبانوں میں Horde کی شکل اختیار کر گیا۔ لاطینی میں Hordo اور چینی میں Ao-t'ot (۱۲) کی شکل ہوگئی۔ ترکی کے چغتائی لہجے میں اردو سے مراد "قیام گاہ لشکر، لشکر، حرم، سلاطین، محل" ہے (۱۳)

جب ترک وسط ایشیا سے نکل کر اناطولیہ آئے تو اپنے ساتھ وہ داستانیں بھی لائے جو وسط ایشیا کے ہیروؤں کی بہادری کی سچی کہانیاں تھیں۔ یہ کہانیاں ۱۳ صدی عیسوی کے بعد قلمبند ہونے لگیں ان میں سے سب سے مشہور داستان "ددہ قورقود" کی ہے (۱٤) اس داستان میں بھی اردو کا لفظ آتا ہے اس داستان میں اردو کے معنی یہ ہیں:

اردو: "قیام گاہ لشکر، قیام گاہ سردار (بیگ) مرکز حکومت، سردار کی رعایا اور ملک، قبیلہ، سردار کا خیمہ" (۱۵)

دولت عثمانی کے زمانے کے بعد یہ لفظ اپنے اصلی معانی سے ذرا ہٹنے لگا اور ترکی عثمانی کی مشہور لغت میں جو شمس الدین سامی کی تصنیف ہے (۱٦) اردو کے معنی یوں ملتے ہیں۔

اردو! صحیح املا' اوردو' ہے ۱۔ عسکر، جُند، جَیش، لشکر، سپاہ "اردوے ہمایون = اوردوے عثمانی ۲۔ ایک ملک کے وہ حصے جو لینڈ فورس کے مطابق تقسیم کیے جاتے ہیں مثلاً پہلی اردو، دوسری اردو وغیرہ، اردوی خاصہ = مرکز عساکر"

جدید ترکی کی سرکاری لغت میں (۱۷) اردو کا مطلب اس طرح درج کیا گیا ہے:

اردو: "ایک ملک کی ساری فوج مثلاً ترک اُردوسی" "ترکوں کی فوج" ۲۔ فوج کے شعبے یا ڈویژن ۳۔ آدمیوں کا گروہ جو ایک ہی مقصد رکھتا ہو، بھیڑ ٤۔ اُردوایوی = فوجی گھر (Officer's Club) ۵۔ اردوگاہ = قیام گاہ فوج (Headquarters) ٦۔ اردو بازاری = فوجی بازار، اردو بازار جو آج بھی ترکی کے ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ ترکی میں اردو نامی ایک شہر بھی ہے جو بحر اسود کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہیے ہند و پاک کے لغات اس لفظ کے بارے میں کیا کہتے ہیں:۔

فرہنگ آصفیہ میں یہ تشریح ملتی ہے:

"اردو (ت) : لشکر، فوج، کیمپ، لشکرگاہ ۲۔ لشکری بولی اور ہندوستانی وہ زبان جو عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ سے مل کر بنی ہے جسے اردوئے معلیٰ بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک اور فصیح اردو، دھلی اور اہلِ لکھنو کی خیال کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ زبان شاہ جہان کے لشکر میں ایجاد ہوئی تھی اس لیے یہی نام پڑ گیا" (فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۱٤۳ - ۱٤٤)

پاکستان کی فیروز اللغات اردو میں ذیل کی معلومات ملتی ہیں:۔

اردو۔ (ت۔ ا۔ مذکر) "لشکر۔ لشکرگاہ" ۲۔ (مونث) پاک و ہند کی وہ زبان جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ لشکری زبان" (فیروز اللغات اردو ۱۹۷۵ ص ۸۰)

خلاصہ یہ کہ "اردو" ترکی کا لفظ ہے چونکہ یہ لفظ منگولی سے یورپین زبانوں میں داخل ہوا ہے یورپ والے اس کو منگولین لفظ سمجھتے رہے جب شاہجہان نے دہلی میں اردوے معلیٰ (اردوے ہمایون) کی تنظیم کی تو شائستہ ہندوستانی اور ترک سپاہیوں کی مشترکہ زبان یہی ٹھہری جس کا نام اردو ہو کر رہ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ریختہ کی بنیاد ترکوں، ہندوستانی اور فارسی گو افغانوں کی طرف سے بہت پہلے ڈالی گئی تھی اب نتیجہ کے طور پر لفظ اردو کا پورا مفہوم یہ نکلتا ہے:۔

۱۔ مرکز حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی۔
۲۔ بادشاہ کا محل یا وہ شہر یا خیمہ جہاں بادشاہ مقیم ہوتا ہو
۳۔ لشکرگاہ
٤۔ لشکر، حرم، محل سلاطین
۵۔ سردار (بیگ) کی رعایا یا اُس کا ملک
٦۔ لشکر، ملک کی ساری فوج (Army)

کتابیات

۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مضمون:

Erkan Turkmen, The Turkish Elements in Urdu, The Journal of Ottoman Studies, VI, Istanbul p. I-30.

2. Huseyin Namık Orkun, Eski Turk Yazıtları (ترکی کے پرانے کتبے) TKD, 1987, p.50.

3. Yusuf Has Hajib, Kutadgu Bilig (Index), Rashid Rahmeti Arat, Turk Kulturu Arastırmaları Institusu, Istanbul 1979, p. 345.

4. Kutadgu Bilig (Metin = the Text), TDK, p.6

5. Ibid p. 9

6. Ibid p. 316

7. Ibid p. 483

۸۔ یہ بولی وسط ایشیا میں ۸ ویں صدی عیسوی میں استعمال ہوتی تھی۔

9. A.Jaferoglu, Eski Uygur Turkoesi Sozlugu پرانی ایغور ترکی کی لغت TDK; Ankara 1968 p. 142.

10. Kashgarli Mahmud, Besim Atalay, Divan u Lugat it Turk, TDK Ankara Vol. I,p.124.

11. Sir Gerard Clauson, An Etymological Dictionary of Pre-Thirteenth Century Turkish, Oxford, 1972 p. 203.

12. Ibrahim Kafesoglu, Turk Milli Kulturu, Ankara 1977 p.231.

۱۳۔ یاد رہے کہ بھارت کے مقیم ترکان وسط ایشیا فارسی ہی بولتے تھے، جسے تورانی فارسی کہا جاتا تھا۔

۱۴۔ ددہ وہی لفظ ہے جس کو اردو میں دادہ کہتے ہیں۔

15. Muharrem Ergin, Dede Korkut Kitabı, Ebru Yayınları, Istanbul 1986. p. 163.

۱۶۔ قاموس ترکی، شمس سامی، درسعادت، استنبول ص ۸۹

17. Turkce Sozluk, TDK, Ankara 1983, p. 902.

18. Radloff, Versuch eines Worterbuches der Turk . Dialecte, 1960, Vol, 1, p. 1072.

Note: TDK = Turkish Republ. , Board of the Turkish Language, Ankara.

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ترکی میں مطالعۂ اردو

ہمارے ہاں کسی بے خبر دانا " کا یہ قول ضرب المثل بنا رہا ہے کہ:

"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم!"

ترکیہ و پاکستان کی دوستی بھی اسی روایتی انداز میں مثالی کہی جاتی رہی ہے مگر اردو اور ترکی زبانوں کے براہِ راست مطالعے اور تقابل پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ان زبانوں کا مطالعہ کچھ ہوا بھی ہے تو انگریزی زبان کے ذریعے یعنی پاکستان میں ترکی انگریزی کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔ کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں حتیٰ کہ مشترکہ ذخیرۂ الفاظ کے معنی بھی انگریزی میں سمجھائے جاتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ قواعد کے لحاظ سے ترکی انگریزی کے مقابلے میں اردو کے زیادہ قریب ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو فارسی سے بھی زیادہ ترکی اردو کے نزدیک آجاتی ہے۔ عثمانی دور کی ترکی تو عربی اور فارسی ذخیرۂ لفظی کو زیادہ سے زیادہ جذب کر لینے کی وجہ سے اور مشترکہ رسم الخط کی بدولت اردو سمیت مشرق وسطیٰ کی زبانوں کے قریب رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس خطے کی اور باتوں پر زیادہ زور دیا گیا مگر لسانی اشتراک کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہ دی گئی اب کچھ اس سلسلے کی چیزیں سامنے آرہی ہیں جو انشاء اللہ مزید کاوشوں کے لیے زمین ہموار کریں گی۔

انقرہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ بیس پچیس سال پہلے قائم ہو گیا تھا۔ استانبول یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ انقرہ اور استانبول میں حکومتِ پاکستان نے اردو اور مطالعۂ پاکستان کی چیئرز قائم کی ہیں اسے " دیر آید درست آید" ہی کہا جا سکتا ہے ورنہ آر۔سی۔ڈی کی اکثر مطبوعات کو دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا رہا ہے کہ جہاں ایران کی قومی زبان فارسی ہے اور ترکیہ کی قومی زبان ترکی ہے وہاں پاکستان کی قومی زبان انگریزی ہے۔ یہ ہمارے بعض صاحب لوگوں کی کرشمہ سازی تھی جن کا اوڑھنا بچھونا انگریزی رہی ہے اور جو یہ بھی اندازہ نہ کر سکے کہ جس مقصد (آر۔سی۔ڈی) کی تقویت کی خاطر وہ یہ لٹریچر چھپواتے ہیں اس سے کئی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، کیونکہ ایران اور ترکی کے لوگ اپنی اپنی قومی زبانوں کے بارے میں بڑے حساس ہیں اور یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ہر ملک اپنی اجتماعی قومی زندگی میں اپنی قومی زبان کو وہی حیثیت دیتا ہے جو انہوں نے اپنے ملکی، دفتری، تعلیمی اور نجی معاملات میں فارسی اور ترکی کو دے رکھی ہے مگر پاکستان کی قومی زبان کون سی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا اظہار دبی زبان سے (بربنائے دوستی) یہاں کے لوگ کرتے ہیں۔ استانبول میں میرا پہلا سیمینار لسانی مسئلے پر تھا اور بھری مجلس میں تو نہیں مگر بعد میں چائے کے موقع پر کچھ اسکالروں نے یہ "راز کی بات" پوچھ ہی لی کہ پاکستان کی سرکاری زبان کون سی ہے؟ مجھے ایک سال کے دوران اکثر محفلوں میں اس استفسار سے سابقہ پڑا تو حیرت ہوئی کہ جن ملکوں سے ہمارے تعلقات انتہائی خوشگوار کہے جا سکتے ہیں وہاں بھی ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کچھ کم نہیں۔ اس کا باعث بعض موثر افراد کی روایتی سہل انگاری سے زیادہ انگریزی اور انگریزیت کی پرستش رہی ہے۔ یہ تو نہیں کہ ایران اور ترکی کے لوگ یورپی زبانوں سے نفرت کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ترکی یونیورسٹیوں میں کئی یورپی زبانوں کے شعبے ہیں۔ خصوصاً جرمن اور فرانسیسی کے شعبے مقبول ہیں اور اب انگریزی کی طرف بھی زیادہ توجہ دی جا رہی ہے مگر یہ مطالعہ ان زبانوں سے محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ افادیت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ پاکستان میں بھی صاحبِ فہم لوگ اس افادیت کے منکر نہیں اور اسی لیے انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کی موثر تدریس پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اپنی قومی زبان کے جلد از جلد نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے ہیں جس کی معقولیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شریف تعلیمی کمیشن (۱۹۵۹ء) اور نور خان تعلیمی کمیشن (۱۹۶۹ء) کی سفارشات میں بھی اسی موقف کو اختیار کیا گیا تھا مگر افسوس کہ ہم اپنی قومی زبان کو ملکی معاملات

میں وہ مقام نہ دے سکے جس کی آرزو قائد اعظم کو تھی۔ چالیس برس گزر گئے اور ابھی قومی زبان اپنے نفاذ کے لیے "تختِ طاؤس" کی طرف دیکھ رہی ہے۔ تاہم ملک سے زیادہ بیرونِ ملک میں اردو زبان و ادب کی مقبولیت پر نظر جاتی ہے تو تعجب انگیز مسرت ہوتی ہے۔

مجھے ایشیائے کوچک کے تاریخی شہر قونیہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی زیارت کے لیے جانا نصیب ہوا تو وہاں جاکر سلجوق یونیورسٹی کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ سلجوق یونیورسٹی ترکیہ کی نئی یونیورسٹی ہے جس کی عمر ابھی دس سال ہے۔ ابھی اس کا نیا کیمپس بن رہا ہے مگر اپنے محدود وسائل کے اندر یہ یونیورسٹی مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کے فروغ و ترقی کا پروگرام شروع کر چکی ہے اس میں عربی اور فارسی کے شعبوں کے ساتھ اردو کا شعبہ بھی قائم ہو چکا جس کی ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ سلجوق یونیورسٹی کئی لحاظ سے ترکیہ کے نظام تعلیم میں اہم مقام حاصل کر سکے گی۔ ایک تو قونیہ کا قدرتی محلِ وقوع ہے کہ یہ ایک پرسکون خطۂ ارضی ہے اس کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہے کہ سلجوقی دور میں قونیہ ایک بڑی سلطنت کا مرکز رہا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی زیارت یہاں ہے جن کا علمی اور وجدانی فیض مشرق کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ یونیورسٹی کے ریکٹر خلیل حبن اور ڈین فیکلٹی فن و ادبیات خالوق آتل سے میری گفتگو ہوئی اور ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ صاحبان اپنی یونیورسٹی کے اس تاریخی علمی ماحول کی پوری بصیرت رکھتے ہیں اور اس کے حوالے سے سلجوق یونیورسٹی کو مشرقی اور مغربی علوم کی اعلیٰ تحقیق کا مرکز بنانے کے آرزو مند ہیں۔ مولانا رومؒ سے علامہ اقبالؒ کے ذہنی و قلبی تعلق کی بنا پر عربی و فارسی کے ساتھ یہاں اردو زبان کے مطالعے کو بھی خاص اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ مئی ۱۹۸۷ء میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے سلسلے میں ایک کانفرنس کا پروگرام بن رہا ہے پاکستان کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے، شعبہ اُردو کے فروغ کے لیے بھی انہیں توقع ہے کہ اس بارے میں انہیں پاکستان کا تعاون حاصل ہو جائے گا۔

عربی، فارسی اور اردو کے شعبے ابھی نئے ہیں اور ان کی سربراہی ڈاکٹر اربکان ترکمان کر رہے ہیں جو ترکی، فارسی، انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی وسیع درک رکھتے ہیں۔ ترکی میں اُردو زبان و ادب پر اُن کے کئی مقالات چھپ چکے ہیں۔ مجھے ان کے بعض مقالات دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اردو ادب (خصوصاً غالب، اقبال اور سجاد حیدر یلدرم) پر ان کے تحقیقی مقالات سے بہت متاثر ہوا۔ ان کی سربراہی میں سلجوق یونیورسٹی کا شعبہ اُردو انشاءاللہ پھلے پھولے گا۔

ترکی میں اردو زبان کے مطالعے کا سلسلہ انقرہ، استانبول اور قونیہ میں پائیدار بنیادوں پر استوار ہو جائے اور اردو و مطالعۂ پاکستان کو اختیاری مضمون کے طور پر مقبولیت حاصل ہو تو یہ امر ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کے استحکام کے لیے ذہنی و فکری غذا مہیا کرے گا، انشاءاللہ۔

پہلی سے تیسری جماعت تک کیلئے تجرباتی طور پر نیا نصاب ترتیب دیا گیا ہے

اسلام آباد (نمائندہ نوائے وقت) باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی ہدایت پر تعلیمی پالیسی میں اہم تبدیلیاں کی جا رہی ہیں اس سلسلے میں ابتدائی طور پر قومی ادارہ نصاب نے تجرباتی طور پر نیا نصاب ترتیب دیا ہے جو ۱۹۸۸ء تک تجرباتی طور پر دیہاتی علاقے کے اسکولوں میں پڑھایا جائے گا نئے نصاب کے مطابق پہلی جماعت سے تیسری جماعت تک کے نصاب کو صرف دو کتابوں تک محدود کر دیا گیا ہے جو اردو اور حساب پر مشتمل ہوں گی نیز دوسرے مضامین جیسے اسلامیات جغرافیہ اور سوشل اسٹڈیز کو ایک ہی کتاب میں ضم کر دیا گیا ہے جبکہ وزارت تعلیم نے تمام صوبائی تعلیمی اداروں سے درخواست کی ہے کہ اسکولوں میں تختی اور سلیٹ کو دوبارہ اپنایا جائے اور پہلی سے تیسری جماعت تک کاپی کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی جائے قومی ادارہ نصاب کے ذرائع کا کہنا ہے کہ دیہاتی علاقے میں نئے نصاب کی کامیابی کے بعد یہ نصاب پورے ملک میں رائج کر دیا جائے گا۔

نوائے وقت کراچی ۱۲-۵-۸۶ء

نصابی کتب کی فراہمی کے انتظامات

راولپنڈی (پی ایل آئی) پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے سیکرٹری نے راولپنڈی اسلام آباد کے دورہ کی رپورٹ پیش کی پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے کتب کی وافر تعداد مہیا کرنے کے انتظامات کئے ہیں۔ جسکے نتیجہ میں نصابی کتب بچوں کو آسانی سے ملنا شروع ہو گئی ہیں۔

جنگ پنڈی ۳-۵-۸۶ء

مقتدرہ قومی زبان کے لئے ٹائپ رائٹر کا عطیہ

اسلام آباد ۲ مئی (سٹاف رپورٹر) ممتاز تجارتی ادارے آئی بی ایم کے جنرل منیجر یوسف احمد نے گزشتہ روز اپنی کمپنی کا تیار کردہ ... ٹائپ رائٹر مقتدرہ قومی زبان کو پیش کیا۔ مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے اس موقع پر کہا کہ تجارتی اداروں کی اردو ٹائپ رائٹرز میں دلچسپی دفتروں میں اردو کے فروغ کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوگی

نوائے وقت پنڈی ۳-۵-۸۶ء

اردو ٹیلیگرام بھیجنے کا انتظام کیا جائے

سکردو (نامہ نگار) بلتستان کے عوامی نمائندوں، علماء، طلباء اور صحافی برادری نے پاکستان ٹیلی گراف اینڈ ٹیلیفون کے ڈائریکٹر جنرل سے پر زور مطالبہ کیا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح سکردو کو بھی دوسرے شہروں کے ساتھ اردو کے ذریعے ٹیلیگرام کے نظام سے منسلک کیا جائے۔ انہوں نے سکردو سے اسلام آباد براہ راست ٹیلی پرنٹر کا نظام قائم کرنے اور ڈائریکٹ ڈائیلنگ کا نظام جلد از جلد مکمل کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی تاروں کو زمین دوز کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے تاکہ ٹیلیفون کا نظام درست ہو سکے۔

نوائے وقت پنڈی ۱۷-۵-۸۶ء

دانشوروں کے اعزاز میں چینی سفیر کا عشائیہ

اسلام آباد ۲۲ مئی (سٹاف رپورٹر) چین کے دورہ سے واپس آنے والے پاکستانی دانشوروں کے وفد کے اعزاز میں گزشتہ شب پاکستان میں چین کے سفیر نے اس وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔

نوائے وقت پنڈی ۲۳-۵-۸۶ء

عطش درانی

مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز (۵)

فنِ ترجمہ کی تدریس اور کتب خانوں کا کردار

امریکہ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرنے کے لیے تجربے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے خواہ یہ تجربہ جز وقتی طور پر حاصل کیا گیا ہو یا شوقیہ جز وقتی ملازمت عموماً سرکاری اور کاروباری اداروں میں حاصل ہوتی ہے۔ ترجمے کی کوئی ڈگری یا سند ملازمت کے حصول کی فوری ضمانت تو نہیں بنتی لیکن ایک بنیادی حوالے کا کام ضرور دیتی ہے مترجمین کو ملازم رکھنے کے خواہاں ادارے خواہش مند ہوتے ہیں کہ مترجم پہلے سے فنِ ترجمہ کے اصولوں اور باریکیوں سے آگاہ ہو تاہم اس کی اہلیت اور ساکھ اس کی کارکردگی ہی سے طے ہوتی ہے۔ امریکہ میں کئی اداروں نے اپنے امتحانات اور ٹیسٹ مقرر کر رکھے جن سے امیدوار کی ترجمے میں صلاحیت کا اندازہ ہو سکے۔ مثلاً انٹرنیشنل کارپوریشن، لوڑز پبلک کورٹس' اقوامِ متحدہ وغیرہ وہ ادارے ہیں جو باقاعدگی سے امتحان لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی فنِ ترجمہ کی تربیت کا اہتمام ہے۔

۱۹۷۵ء میں امریکی انجمن برائے مترجمین '(ATA) نے سات صفحات کی ایک ڈائریکٹری

United States Colleges and Universities Offering Training for Translation کے نام سے شائع کی تھی۔ اس میں امریکہ کے ۱۲۶ اور کینیڈا کے ۶ اداروں کے نام اور پتے درج تھے جہاں فنِ ترجمہ کی باقاعدہ تدریس کا بندوبست ہے۔

کئی امریکی یونیورسٹیوں میں ادبی ترجمے کی تربیت بھی ہوتی ہے خصوصاً شعری ادب کو انگریزی میں منتقل کرنے کا رجحان عام ہے۔

اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں (خصوصاً کیلیفورنیا اور نیویارک سٹی بزنس کالجوں میں) ہسپانوی سے انگریزی میں تجارتی امور کے ترجمے کے کئی کورس ہو چکے ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی سانتا باربرا اور اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک بنگھمٹن میں فنِ ترجمہ میں سرٹیفکیٹ اور ڈگری کی سطح کے کورس جاری ہیں۔ کئی یونیورسٹیوں کے فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، جرمن اور پرتگالی زبان کے شعبوں میں بھی ترجمے کے کورس پوسٹ گریجویٹ سطح پر ہوتے ہیں۔

امریکہ میں فنِ ترجمہ کا نصاب ترجمے کے بنیادی اصولوں، اعلیٰ سطحی فنِ ترجمہ ترجمانی اصولوں، کانفرنسوں کی ترجمانی، تجارتی مواد کی تیاری و ترجمہ وغیرہ پر مبنی ہے۔

ہر ایک طالب علم سے کسی ایک زبان اور شعبے میں تخصیص کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں عموماً حیاتیاتی سائنس اور اقتصادیات اور جرمن زبان میں علم کیمیا اور سیاسیات اور ہسپانوی اور پرتگالی میں ماحولیات اور سماجیات، روسی اور جاپانی میں علم کیمیا اور انجنیئری وغیرہ پر زیادہ زور ہے۔

۱۹۶۹ء کے ایک سروے کے مطابق انگریزی میں علم کیمیا کے بارے میں کام صرف ۵۵،۹ فی صد شائع ہوا ۲۲،۶ فی صد روسی زبان میں ۵،۴ فی صد جرمن میں، ۳،۳ فی صد جاپانی میں، ۴،۶ فی صد فرانسیسی میں، ۱،۶ فی صد کام اطالوی زبان میں اور صرف ایک فی صد کام چینی زبان میں ہوا۔

برطانیہ کی باتھ یونیورسٹی مطالعہ لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما دیتی ہے اس میں فنِ ترجمہ اور فنِ ترجمانی کا تین چوتھائی حصہ ہے

سوئٹزرلینڈ کی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف کانفرنس انٹرپریٹرز جنیوا کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق مترجمین اور ترجمانوں کو صرف وہی کام کرنا چاہیئے جس کے وہ اہل ہوں۔ یہ اہلیت ان کی اسناد اور تجربے سے متعین ہوتی ہے۔ فن ترجمہ کے کورس انہیں اہلیت سازی تک بنیادی مدد دیتے ہیں۔

اسلیب لندن کی طرف سے ۱۹۷۱ء میں فن ترجمہ کی ایک درسی کتاب Technical Translator's Manual بھی شائع ہوئی۔ اسے فن ترجمہ کے کئی ماہرین نے مل کر لکھا ہے اس کے اہم ابواب، "اصول ترجمہ"، "فری لانس کام"، "حوالہ جوئی"، "لسانی تعلقات"، "پیٹنٹ" اور ٹریڈ مارک جیسے خصوصی امور کا ترجمہ"، "پروف خوانی"، "اشاریہ سازی" اور مترجمین اور تراجم کی ڈائرکٹری" ہیں۔

فن ترجمہ کی تدریس میں کتب خانے اہم کردار ادا کرتے ہیں اصول ترجمہ کے بارے میں معلومات، کتابیات اور دیگر مواد فراہم کرنا کتب خانے کے بنیادی فرائض میں شامل ہوتا جا رہا ہے کتب خانوں سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ ان کے ہاں دنیا بھر کے تراجم، مراکز، اداروں، مترجمین، انجمنوں، ڈائرکٹریوں اور ناشروں کے بارے میں بارے میں معلومات مہیا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ ترجموں کی تلخیص، حوالہ جاتی اور کتابیاتی خدمات انجام دینے والا باقاعدہ عملہ بھی رکھا جائے۔

ترجمے پر کتابیاتی کنٹرول اب قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم کتب خانے سے یہ توقع اب بھی رکھی جاتی ہے کہ وہ ممکنہ حد تک ترجموں کی مطبوعہ کتابیات اور مآخذ یکجا کرے اور ترجموں کی اپنی کتابیات بھی تیار کرے۔ خلاصوں اور اشاریہ سازی میں نقل حرفی کے عالمی اصول وضع کرنے اور ان کی معیار بندی کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ لائبریری آف کانگریس کا ایک نظام تو پہلے سے موجود ہے۔ برطانیہ نے بھی اپنی معیار بندی کر رکھی ہے عالمی سطح پر امریکہ میں انٹرنیشنل سٹینڈرڈائزیشن آرگنائزیشن نے بھی معیار بندی کرنے کی کوشش کی ہے اس کے مطابق کتب خانے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں انگریزی میں موجود ہر ترجمے پر مندرجہ ذیل معلومات ضرور درج ہوں:۔

۱۔ اصل زبان میں مضمون کا پورا نام۔
۲۔ مآخذ کا پورا حوالہ۔
۳۔ مضمون کے تمام مندرجات (صفحاتی حوالوں کے ساتھ)۔
۴۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں ترک کیے گئے امور۔
۵۔ یہ بیان کہ ترجمہ لفظ بلفظ ہے۔ خلاصہ یا تلخیص ہے۔

علم کتاب داری میں ترجمے کی کتابیاتی خدمات کے لیے بعض کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً فان آسٹرمین کی کتاب Manual of Foreign Language، سنٹرل بک کمپنی، نیویارک کی طرف سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دنیا کی ۱۳۰ زبانوں کے حروف تہجی، مخصوص ذخیرہ الفاظ اور ان کی نقل حرفی کے اصول، قواعد اور تلفظ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۴۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

امریکی قومی ادارہ صحت کی لائبریری برانچ نے ۱۹۶۴ء میں Library Translation Index واشنگٹن سے شائع کی۔ میونخ جرمنی سے بھی ایک کتاب International Bibliography of Translation از ہنری فان ہوف ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ ۵۹۱ صفحات کی اس کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن میں ترجموں کے ۴۷۰۰ اندراجات ہیں۔ مصنفین اور جرائد کے اشاریے بھی ہیں۔

لندن سے ۱۹۶۷ء میں پونڈ باب کی کتاب International Directory of Translators and Interpreters شائع ہو چکی ہے جس میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں دنیا بھر کے دو ہزار مترجمین کی فہرست وطن اور موضوع کے اعتبار سے پیش کی گئی ہے۔

کتب خانے کی خدمات کے سلسلے میں امریکی عوام میں چینی، عربی، فارسی، ترکی اور اردو سے ترجموں کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ سماجی علوم اور ادبیات کے میدانوں میں ان زبانوں میں بہت کام ہوا ہے۔ جان کریرار لائبریری نے ان امور کے ضمن میں ۱۹۷۷ء میں ایک سروے کرایا تھا جس میں ۹۴ فی صد اہل علم اور ناشرین نے اس خواہش کا اظہار کیا۔ سروے کے نتیجے میں ایک عالمی مرکز خدمات کے قیام پر زور دیا گیا جہاں سماجی اور ادبی علوم میں تمام دنیا سے انگریزی

میں ترجموں، خلاصوں، اشاریوں اور کتابیات کی خدمات مہیا ہو سکیں تجویز ہے کہ یہ مرکز ایک سہ ماہی جریدہ بھی شائع کرے جس میں نئے تراجم کے بارے میں معلومات درج ہوں اور پھر سالانہ اور جامع اشاریہ بھی شائع ہوا کرے۔ چنانچہ آرلنگٹن ریاست ورجینیا میں ERIC کلیرنگ ہاؤس برائے زبان و لسانیات قائم کیا گیا ہے جو یہی خدمات انجام دیتا ہے۔

BIBLIOGRAPHY

1. Anderson, James D. "Ad hoc English Language Translations A Preliminary Assessment of Their Influence on Citations in English Language Journal Literature "Translation News (Delft), 5(4), P.19 (December) 1975.

2. Coveney, J."School of Modern Languages: The Bath University Post graduate Diploma in Language Studies". Babel (Frankfurt - am - Main)17(2) PP.21 25(1971).

3. Encyclopaedia of Library and Information Science, Vol.31, Toronto, 1981. PP 105-133.

4. Engelbert, Heinz "The Terminological Barrier to the Understanding of Scientific and Technological Literature," Translation News (Delft), 6(2), PP.6 - 9, Passim (June 1976).

5. Himmelsbach, Carl J. and Grace E. Broemer, "Translations An Un-coordinated Jungle" Translation News(Delft) 5(1), PP.1, 3 March 1974

6. Kertesz, Francois "How to Cope with the Foreign Language Problem; Experience Gained at a Multidisciplinary Laboratory" "J. Amer. Soc. Infor. Science, 25(2), P.88 (March April, 1974)

7. Knul, Menno M.A. "Need for Translations from Japanese" Translation News (News(Delft), 4(4), P.14, (December) 1974

8. Reid, E.E., Chemistry Through the Language Barrier, Johns Hoppins press, Baltimore, 1970, P.2.

9. University of California Santa Barbara, Translation and Interpretation program, Santa Barbara, n.d.,

10. Viernisel, K H. and W S. Budington, The Need for the Feasibility of Establishing an Information Clearinghouse on Translation in the Humanities, John Crerer Library, May 31, 1977, PP.86-88.

11. Zalar, Charles "United States Special Foreign Currency Science Information program," in Expanded Communication in a Shrinking World, Washington, D.C., Chapter, Special Libraries Association, Washington D.C., April 1968, PP. 50-54.

نصیر اعظم

وفاقی وزیر برائے ریلوے

یوسف رضا گیلانی سے انٹرویو

میں صوبائی وزیر تعلیم کا انٹرویو کر کے ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہی تھی۔ "سنو کل شام سرکٹ ہاؤس میں ایک تقریب ہے آنا ضرور" باتیں کرتے کرتے انہوں نے اچانک کہا "کل ..... مشکل ہے ... شام میں ایک انٹرویو کرنا ہے۔ مگر تقریب کس سلسلے میں ہے؟ ..." میں نے پوچھا۔ "وہ یوسف رضا گیلانی آ رہے ہیں، انہی کے اعزاز میں"۔ انہوں نے بتایا اور میرے ذہن میں ایک دم جیسے لپکا سا کوند گیا ... سوچا اسلام آباد میں تو ان سے ملاقات ہو نہیں پاتی چنانچہ یہ موقع ضائع نہ کیا جائے۔ تقریب میں تو نہیں گئی مگر سرکٹ ہاؤس میں مقیم وفاقی وزیر ریلوے یوسف رضا گیلانی سے آدھ گھنٹے کی ملاقات ضرور ہو گئی۔

(س) آپ نہ صرف وفاقی وزیر ہیں بلکہ کابینہ کے اہم رکن بھی ہیں، مقتدرہ قومی زبان جو قومی زبان کی ترویج اور نفاذ کے لیے کابینہ ہی کے ایک اعلان کے ذریعہ قائم ہوا اس کے لیے ۱۹۸۸ء کا یہ ہدف مقرر کیا گیا یعنی اس عرصہ تک پورے ملک میں اردو کا نفاذ ہو جائے گا تو کابینہ کے رکن کی حیثیت سے اور وزیر ریلوے کی حیثیت سے آپ یہ فرمائیے کہ کیا آپ کے اپنے ادارے میں دفتری امور اردو میں سرانجام دیے جانے لگے ہیں؟

(ج) اسمبلی کی تمام روداد اردو ہی میں ہوتی ہے بلکہ اب تو باقاعدہ نوٹنگ وغیرہ اردو میں آتی ہیں ممبر حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ ایجنڈے کی نقل اور دوسری لفقول ہمیں اردو میں ملنا چاہیے اس میں تھوڑا وقت لگے گا اور ہم مختلف ادوار میں اس طرف توجہ کر رہے ہیں مگر جس وقت کابینہ نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت میں وزارت میں نہیں تھا ویسے ہمارا فرض بنتا ہے کہ اپنی قومی زبان کے لیے کام کریں اور اس طرف توجہ دی جا رہی ہے۔

(س) اردو یکجہتی اور قومی زبان ہونے کے ناطے بہ حیثیت ایک سیاستدان آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں میں ان کے لیے احساس محرومی تو پیدا نہیں ہوگا؟

(ج) میری اپنی زبان سرائیکی ہے مگر اس کے باوجود میری یہ خواہش ہے کہ اپنی تہذیب و تمدن کو قائم رکھتے ہوئے اگر ایک متحدہ زبان ہو تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہ احساس محرومی پیدا ہو۔

(س) آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے پڑھا اور اس وقت اس کا ذریعہ تعلیم انگریزی یا اردو؟

(ج) جی ..... دونوں تھے اور میں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی تھی۔

(س) یہ بتائیے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے سے انگریزی کے ذریعے جو علم ہم تک پہنچ رہا ہے کہیں ہم اس سے محروم تو نہیں ہو جائیں گے یا کسی اور مشکل کا سامنا ہو۔

(ج) مقصد یہ نہیں ہے کہ انگریزی کو بالکل ختم کر دیا جائے بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ وہ بھی ایک مضمون کی حیثیت سے برقرار رہے، انگریزی بین الاقوامی طور پر مانی ہوئی زبان ہے چنانچہ یہ خدشہ یا محرومی نہیں ہونا چاہیے کہ اردو کی آمد سے انگریزی بالکل ختم ہو جائے اب یہ دیکھیے کہ جہاں انگلش اسکول ہیں وہاں اردو بطور ایک مضمون بھی پڑھائی جا رہی ہے اور جہاں اردو اسکول ہوں گے ساتھ انگلش بھی بطور لازمی ثانوی زبان ہوگی۔ بہرحال اب جو ہماری نئی پالیسی بنے گی اس میں سرفہرست تعلیم ہے ہمیں خواندگی کی شرح کو بڑھانا ہے اور موجودہ حکومت کا جو پانچ نکاتی پروگرام ہے اس کے تحت نہ صرف خواندگی کو بڑھانا ہے بلکہ دوگنا کرنا ہے۔ عنقریب وزیر تعلیم

پارلیمنٹ کو اپنے اعتماد میں لے کر ایک جامع منصوبہ تیار کریں گے۔

(س) مقابلے کے امتحان انگریزی میں ہوتے ہیں اس کی زبان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

(ج) دیکھیں جب تک پورا میڈیم تبدیل نہیں ہوتا یہ جھگڑا رہے گا جب میڈیم تبدیل ہو گا اور اس کے بعد اگر انگریزی میں یہ امتحانات ہوتے تب تو آپ اعتراض کر سکتے ہیں مگر ابھی تو یہ پرانا نظام رائج ہے۔

(س) کسی وزیر کی قومی مقاصد پر کوئی اپنی ذاتی رائے بھی ہوتی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

(ج) مجھے اپنے سکول کا زمانہ یاد ہے کہ جب ہم اردو بولتے تھے تو ہمیں پانچ روپے جرمانہ ہو جاتا تھا۔ انگریزی نہ بولنے کی وجہ سے۔ لازمی بات ہے کہ حالات کا اثر ہوتا ہے۔

(س) حکومتی سطح پر ترویج اردو کے لیے کام ہو رہا ہے کیا اس کی رفتار سے مطمئن ہیں؟

(ج) جی.....

(س) اس رفتار سے آپ سمجھتے ہیں ۱۹۸۸ء تک ذریعۂ تعلیم اردو میں ہو جائے گا۔ امکان ہے؟ عوامی نمائندے اس ضمن میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

(ج) میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ ہر سطح پر انگریزی کی حوصلہ شکنی ہو رہی ہے مثلاً ہمارے اسمبلی کے اجلاس میں انگریزی کی تقاریر کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے آپ تو خود وہاں ہوتی ہیں، اس لحاظ سے عوامی نمائندوں کا بہت بڑا عمل دخل ہے اور وہ جتنا اس طرف توجہ دیں گے اتنی ہی جلدی آپ کا ٹارگٹ حاصل ہو گا۔

(س) آپ خود کابینہ کے رکن ہیں اور وہاں بہر کیف یہ بات اٹھے گی؟

(ج) جب اٹھے گی تو دیکھا جائے گا اور سب سے پہلے تو تعصب مجھے ہونا چاہیے تھا کہ میں خود سرائیکی بولنے والا ہوں مگر اردو کی حوصلہ افزائی کر رہا ہوں اس سے زیادہ آپ مجھ سے اور کیا توقع کر سکتی ہیں؟

(س) بہرحال کابینہ سے ایسے اداروں کی توقعات زیادہ ہوتی ہیں۔

(ج) یہ حکومت کی ذمہ داری ہے ان کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(س) آپ کے دفتر میں اردو شروع ہوگئی یا ؟؟؟

(ج) ابھی پرانا نظام ہی چل رہا ہے۔

(س) کوئی امید ہے؟ کوئی عملی اقدام؟

(ج) ہاں..... وقت کے ساتھ ہو گا ابھی تک ٹائپ رائٹر کے حصول وغیرہ کا مسئلہ بھی ہے؟

(س) افسران کے لیے ضروری ہے کہ وہ قومی زبان میں مراسلت، نوٹنگ وغیرہ کی تربیت حاصل کریں؟

(ج) افسران بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ بنیادی طور پہ اردو اسکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ انگریزی اسکولوں کے پڑھے ہوئے نہیں ہیں وہ اردو میں زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں

(س) اگر آپ کچھ ایسی ہدایات جاری کر دیں کہ افسران علامہ اقبال فاصلاتی یونیورسٹی اور مقتدرہ کے تعاون سے دیے جانے والے تربیتی کورسوں میں شرکت کریں تو؟

(ج) جی..... میں کہہ رہا تھا کہ یہ کام عملدرآمد ڈویژن کا ہے اور جب بھی وہ کوئی جامع منصوبہ بنائیں گے ہم ان پر عمل درآمد کریں گے۔

(س) صوبائی زبانوں نے کس حد تک قومی زبان کو وسعت دی ہے؟

(ج) اردو کا مقصد لشکر ہے جس میں ہر زبان کے الفاظ شامل ہیں وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف غیر ملکی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں بلکہ دوسری پاکستانی زبانوں کے الفاظ آ رہے ہیں اور خود بخود آ رہے ہیں اور آتے رہیں گے۔

ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس

اسلام آباد ۲۳ مئی (پ پ ا) ادیبوں اور شاعروں کی علاقائی کانفرنسیں جلد ہی بلوچستان اور سندھ میں منعقد ہوں گی تاکہ ان کی علاقائی زبانوں میں ادب پاروں کو اجاگر کیا جا سکے ان کانفرنسوں میں شرکت کے لئے دوسرے صوبوں کے مندوبین کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں اس قسم کی کانفرنسیں دیگر صوبوں میں بھی منعقد کی جائیں گی۔

[illegible] ۲۳-۵-۸۷ء

اردو زبان جلد مقام حاصل کر لیگی

چکوال (نامہ نگار، جنگ) ضلعی مجلس زبان دفتری چکوال نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے اس بیان کو جس میں انہوں نے اعلیٰ سطحوں کے اجلاسوں میں اردو زبان کے استعمال پر زور دیا ہے کو اردو زبان کے فروغ کیلئے ایک احسن قدم قرار دیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر چکوال چوہدری ریاض احمد کی صدارت میں ہونے والے مجلس کے ماہانہ اجلاس میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور توقع ظاہر کی گئی کہ اعلیٰ سطح پر حوصلہ افزائی سے اردو زبان جلد ہی اپنا مقام حاصل کر لے گی اجلاس کو بتایا گیا کہ مجلس زبان دفتری کے زیر اہتمام منعقدہ اردو ٹائپ کا پہلا کورس مکمل ہو چکا ہے جس میں ۱۶ اہلکاروں نے کامیابی حاصل کی اجلاس نے متعلقہ محکمہ جات سے سفارش کی کہ تربیتی کورس مکمل کرنے والے اہلکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور وہ اہلکار جو نامزدگی کے باوجود کورس مکمل نہیں کر سکے ان کے خلاف مناسب کورس ستمبر میں شروع ہو گا جس کیلئے محکمہ جات اپنے اہلکار نامزد کریں گے اجلاس میں اے ای سی ارشاد اللہ تارڑ، جناب جمیل خان، پروفیسر خواجہ محسن، پروفیسر محبت یاب خان، چوہدری ظفر اللہ اور دوسرے ارکان نے شرکت کی۔

جنگ پنڈی ۱۳-۵-۸۷ء

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

اصطلاحات اراضی و پٹوار

اردو میں اصطلاح سازی کا عمل نیا نہیں اس کی تاریخ اس زبان کے نفوذ اور نشو و نما کے ساتھ وابستہ ہے ہر دور میں جہاں بھی اردو نے رواج اور ارتقاء پایا اردو اصطلاح سازی کا عمل بھی جاری رہا۔ انیسویں صدی یعنی آج سے ایک سو سال پہلے اردو ہر شعبہ زندگی میں نافذ تھی اور آج بھی اس کی لسانی اور علمی قوت کسی طرح سے کم نہیں ہوئی۔

آج سے ایک صدی پہلے جہاں دیگر بے شمار سرکاری اور نجی شعبوں میں اردو کا نفاذ موجود تھا وہاں محکمہ مال میں اردو اپنی تمام تر روانی اور وسعت کے ساتھ نظر آتی ہے اس وقت کی انگریزی حکومت کے ایک ذمہ دار افسر رابرٹ کسٹ نے محکمہ مال کے لیے اردو میں کچھ کتابیں مرتب کیں جن میں سے ایک کتاب "دستور العمل پٹواریاں" ہے جو ۱۸۴۷ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ محکمہ مال کی نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک دلچسپ کتابچہ ہے جس کے مطالب ایسے قواعد پر مبنی ہیں جن کی بنا پر محکمہ مال کے عمال اور طالب علموں کے لیے امتحانی پرچے تیار کیے جاتے تھے اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ۱۱۶ سوال اور ان کے جواب مرتب کیے گئے ہیں۔ ان سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رابرٹ کسٹ نے محکمہ مال کے پٹواریوں کے لیے انتظام اراضی کی کچھ مخصوص اصطلاحات اردو میں وضع کی تھیں جنھیں اس کتاب کے ابتدائی حصے میں سوالوں کی صورت میں کیا ہے اور کتاب کے دیگر مندرجات میں ان اصطلاحات و الفاظ میں سے بعض کی مجمل اور بعض کی مفصل وضاحت پیش کی ہے۔

اس کتاب کے مطالب سے اندازہ ہوتا ہے کہ محکمہ مال کے طالب علموں کے لیے رابرٹ کسٹ کے علاوہ اور بھی کچھ لوگوں نے اردو میں کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک مصنف رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کا حوالہ زیرِ مطالعہ کتاب میں موجود ہے ذیل میں رابرٹ کسٹ کی درج کردہ اصطلاحات اور ان کے معانی کی فہرست پیش کی جاتی ہے ان میں سے بعض الفاظ جن کے معانی رابرٹ کسٹ نے واضح نہیں کیے تھے "نور اللغات" اور "لغات فیروزی" کی مدد سے لکھے گئے۔

۱۔ آبی : وہ زمین جو تالاب یا ندی کے پانی سے بذریعہ جھلار سیراب ہو۔

۲۔ اسامی : کاشتکار

۳۔ اسامی موروثی: جدی اسامی جس کا حق قدیم سے چلا آتا ایک شخص تو مالک نہیں لیکن جب تک مقررہ لگان ادا کرتا رہے بے دخل نہ کیا جائے۔

۴۔ انتقال رہن : رہن کا انتقال، رہن در رہن، گرو در گرو۔

۵۔ انتقال ملکیت : مقبوضہ اور مشترکہ زمین کی تبدیلی۔ داخل خارج کرانا۔

۶۔ بانگر : اونچی زمین۔ وہ زمین جس پر دریا کا بہاؤ نہ گزرا ہو۔

۷۔ بٹائی : زمیندار اور کاشتکار کے درمیان جنس کی تقسیم۔

۸۔ بٹائی دار : کاشتکار جو جنس کی بٹائی میں زمیندار کا حصہ دار ہوتا ہے۔

۹۔ بسوا : ایک بیگھہ زمین کا بیسواں حصہ

۱۰۔ بسوانی : اراضی کا پیمانہ۔ ایک بسوے کا بیسواں حصہ۔

۱۱۔ بنجر خارج الجمع : وہ افتادہ زمین جس کا معاملہ نہ لیا جاتا ہے اراضی غیر مزروعہ

۱۲۔ بنجر جدید : وہ زمین جس میں چار فصل تک لگاتار کوئی جنس پیدا نہ ہو اور میوہ دار درخت بھی نہ ہوں۔

۱۳۔ بنکر آمدنی : جنگلی زمین کی پیداوار جیسے شہد، گوند وغیرہ جنگل کی آمدنی

۱۴۔ بھری : زراعت کا اتنا گٹھا جو ایک آدمی اٹھا سکے۔

۱۵۔ بہی : روزنامچہ

۱۶۔ بھیاچاری موضع : زمین گاؤں

۱۷۔ باہی کاشتکار : وہ کسان جو اور گاؤں میں رہے اور دوسرے گاؤں میں کاشت کرے۔

۱۸۔ بٹی : زمین یا گاؤں یا مشترکہ جائیداد کا بڑا حصہ جس میں اور بھی حصے شامل ہوں۔ گاؤں کا ایک حصہ۔

۱۹۔ بٹے داری کل: مشترکہ ورثے کا حصہ

۲۰۔ پٹی غیر کمل : وہ پٹی داری جس میں کچھ اراضی بٹی ہوئی اور کچھ مشترکہ ہو

۲۱۔ پٹہ : وہ تحریر جس کے ذریعے جائیداد منقولہ لگان یا کرائے پر دی جاتی ہے۔

۲۲۔ پٹی دار : گاؤں یا جائداد کا حصہ دار۔

۲۳۔ برجوت : مکانات کی زمین کا محصول۔

۲۴۔ پرگنہ : قابل خراج و مالگزاری زمین۔

۲۵۔ پھلکرآمدنی : ثمری پیدار، جاگیر کی آمدنی۔

۲۶۔ تصرف : قبضہ۔

۲۷۔ تغلب : کسی زمین پر ناجائز قبضہ یا تصرف بیجا۔

۲۸۔ تقاوی : وہ روپیہ جو زراعت کی امداد کے لیے سرکار کی طرف سے مفلس زمینداروں کو دیا جاتا ہے۔

۲۹۔ توکھ : برجی، ٹھڈ، نشان۔

۳۰۔ تھوک : ڈھیر، یکمشت روکڑ، وہ مقام جہاں پر سرحدیں ملیں۔

۳۱۔ ٹھیکہ دار : اجارہ دار۔

۳۲۔ جریب : ایک خاص پیمانہ جس سے زمین ناپی جاتی ہے۔ ساٹھ گز یا پچپن میٹر کی زنجیر، جو بیس گٹھے کی ہوتی ہے۔

۳۳۔ جمع : بہی کے صفحے کا وہ حصہ جس میں آمدنی کی رقم لکھی جاتی ہے۔

۳۴۔ جمع بندی : فرد لگان جس میں کاشتکار، ملکیت کی حالت اور نرخ وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے۔

۳۵۔ جمع خرچ آمدنی و مصارف۔

۳۶۔ چک بندی: زمین کی حد بندی۔

۳۷۔ چک نامہ: وہ نقشہ جو اصل اور کامل ہوتا ہے اور ہر طرف کی حدود ظاہر کرتا ہے۔

۳۸۔ چکوتہ : نرخ کا تصفیہ۔ بیباقی۔

۳۹۔ خریف : اساڑھ سے کاتک تک کا زمانہ، وہ فصل جس میں جوار، مکئی پیدا ہوتی ہے۔

۴۰۔ خسرہ : گاؤں کے کھیتوں کی فہرست جس میں ہر نمبر کے مقابلے میں کھیت کا رقبہ، کاشتکار کا نام، قسم زمین اور جنس درج کی جاتی ہے۔

۴۱۔ داخل خارج : ایک شخص کا نام ملکیت سے خارج ہو کر دوسرے شخص کا نام سرکاری دفتر میں درج ہو۔ پہلے شخص کی جگہ دوسرا مالک قرار دیا جاتے۔

۴۲۔ داخلہ : مالگذاری کی رسید۔

۴۳۔ دھر : سید حا رستہ۔

۴۴۔ ڈھوں : وہ نشان جو کھیتوں اور زمین کی سرحد بنانے کے لیے بناتے ہیں۔

۴۵۔ ربیع : وہ فصل جو اکتوبر، نومبر میں بوئی اور مارچ، اپریل اور مئی میں کاٹی جائے۔

۴۶۔ زمینداری موضع : دیہات کا مالکانہ حق۔

۴۷۔ ساڑھی : فصل ربیع جس میں گیہوں، چنا، مٹر، مسور، ارہر وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

۴۸۔ سانی : کھیتی باڑی اور باغ کا کام کرنے والا، کاشتکار۔

۴۹۔ سرخط : قبالہ۔ کرایہ نامہ

۵۰۔ سزاول : سرکاری روپیہ وصول کرنے والا، داروغہ۔

۵۱۔ شاملات : وہ ملکیت و جائیداد جو بہت سے لوگوں میں مشترک ہو، تمام گاؤں والوں کی ملکیت۔

۵۲۔ شجرہ : ایک نقشہ جس میں کل مالکوں کی معہ کھیوٹ یا رجسٹری کی ملکیت کی عذرداری درج ہو۔

۵۳۔ شرح بندی: میزان، نرخ کا نقشہ۔

۵۴۔ شورزمین: وہ زمین جو کھاری یا شورے کے سبب قابل کاشت نہ ہو۔

۵۵۔ ضبطی: زمین یا جائیداد کا بحق سرکار ضبط ہو جانا۔

۵۶۔ عرضی ارسال: وہ کاغذ جس کے ذریعے شعبہ مالگذاری کسی کارندے یا پیادے کے ہاتھ زر نقد تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے۔

۵۷۔ غیرآبی: غیر مزروعہ۔

۵۸۔ غیر موروثی: وہ زمین جو ورثے میں نہ آتی ہو، ایک قسم کا کاشتکار۔

۵۹۔ قرق تحصیل: وہ قرقی جو مالگزاری وصول کرنے کے لیے ہو۔

۶۰۔ کارندہ: مختار، گماشتہ۔

۶۱۔ کاشتکار: اسامی موروثی۔ اسامی مستقل۔

۶۲۔ کٹکنہ دار: زمینداری یا ٹھیکہ رکھنے والا۔

۶۳۔ کنکوت: اناج، غلہ۔

۶۴۔ کھاتہ بندی: جدا جدا حساب رکھنا۔

۶۵۔ کھادر: نشیب کی زمین جس میں بلندی سے آکر پانی جمع ہوتا ہو۔

۶۶۔ کھتونی: منتخب اسامی دار۔

۶۷۔ لگان: زر آمدنی جو زمین سے وصول ہو۔

۶۸۔ لمبردار: نمبردار۔

۶۹۔ مالکانہ: زمین داری کا حق، زمین جو کاشتکار سالانہ یا ماہوار نقد یا جنس کی صورت میں زمیندار کو ادا کرتا ہے۔

۷۰۔ محال: وہ رقبہ اراضی جس میں متعدد پٹیاں ہوں اور جس پر مالگذاری الگ تشخیص ہو۔

۷۱۔ مزروعہ: بویا ہوا کھیت۔

۷۲۔ مذکوری: سمن وغیرہ تعمیل کرانے والے عدالت کے سپاہی کی آمدنی۔

۷۳۔ مستاجر: زمینداری، کاشتکاری۔

۷۴۔ معافی دار: معاف شدہ زمین کا مالک۔

۷۵۔ مقدمہ: وہ معاملہ جو فیصلے کے لیے عدالت میں پیش ہو۔

۷۶۔ موروثی: ورثے میں ملی ہوئی جائیداد یا زمین۔

۷۷۔ موضع: گاؤں۔

۷۸۔ نجکاری: ذاتی کام

۷۹۔ واصلباقی: جو باقی رہے، بقایا حساب جس سے جمع اور بقایا معلوم ہو۔

۸۰۔ واصلباقی کی تحصیل: بقایا حساب یا رقم کی وصولی۔

اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے سلسلے میں بیشتر کام مکمل کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی

کراچی (اپنے رپورٹر) ملک میں ابھی حال تک اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کیلئے جو ... کیا گیا ہے مقتدرہ قومی زبان نے اس سلسلے میں بیشتر کام مکمل کر لیا ہے یہ بات مقتدرہ کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی نے ... [illegible]

جنگ کراچی ۱۲-۵-۸۷

انگریزی کو مخصوص طبقے کی بالادستی قائم رکھنے کیلئے ہتھیار بنانے پر ہر پاکستانی مخالف ہے

وفاقی وزیر تعلیم کے بیان پر تنظیم اساتذہ پاکستان کے صدر حافظ وحید اللہ خان کا رد عمل

کراچی، ۲۰ مئی (رپورٹر) تنظیم اساتذہ پاکستان کے صدر حافظ وحید اللہ خان نے ذریعہ تعلیم کے بارے میں ٹی وی پروگرام دوبدو میں وفاقی وزیر تعلیم کے حالیہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ہمارے حکمرانوں کی وہ ذہنیت واضح ہو گئی ہے جو پاکستان میں قومی مقاصد کو پس پشت ڈالنے میں نمایاں کردار ادا کرتی رہی ہے انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۹ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں اردو کو بتدریج بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کا جو فیصلہ [illegible] کیا گیا تھا۔ اسے گذشتہ برسوں میں ناکام کرنے کی سرکاری سطح پر تمام تدابیر کی گئیں اور اب اصل فیصلے پر مکمل طور پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے حافظ صاحب نے کہا کہ پاکستانی قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ ایسے مفادات یافتہ حکمران طبقہ کی سازشوں کا شکار ہے۔ جو ملک کو قومی مقاصد کو الٹتے ہیں۔ لیکن پالیسیاں اپنے طبقہ کی بالادستی کے تحفظ کے لیے تشکیل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زندہ قوم کی طرح قومی زبان کو ہر شعبہ حیات میں نافذ نہ کرنے کی بجائے وہ آج تک غلامی کی سوچ سے باہر نہیں نکل سکے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ لیکن اسے ایک مخصوص طبقہ کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہتھیار بنانے پر ہر سچا پاکستانی مخالف ہے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۲۱-۵-۸۷ء

جنرل محمد موسیٰ خان گورنر بلوچستان ، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ڈاکٹر تصدق حسین راجا ، عطش درانی ، ڈاکٹر طاہر تونسوی

سرکاری ملازمین کو طبی اخراجات

شہروں میں کرایہ مکان ۴۵ فیصد سے بڑھا کر ...

نچلے درجے کے ملازمین کے راشننگ الاؤنس میں اضا...

اسلام آباد ، ۲۱ مئی (نامہ نگار) معلوم ہوا ہے کہ تنخواہ کمیٹی ... اور
کی رپورٹ کا جائزہ لینے کے لئے قائم کردہ سب کمیٹی نے اپنی ... لے آ
رپورٹ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو پیش کر دی ہے جس میں ... وہ
یہ سفارش کی گئی ہے کہ سرکاری ملازمین کو آئندہ مالی سال سے ... میں ر
۱۰۰ روپے ماہانہ مقررہ شرح سے میڈیکل الاؤنس دیا جائے

یونیفارم بھی یکدم تبدیل کر دیا گیا

ایبٹ آباد ، ۱۷ مئی (نامہ نگار)
ہزارہ ڈویژن کے عہدیداران
فیڈرل بورڈ کے زیر اہتمام چلنے وا
ذریعہ تعلیم یکدم اردو سے انگریز
احتجاج کیا ہے جس سے غریب والد
پڑا ہے کیونکہ اس سے پہلے فیڈرل
سے ذریعہ تعلیم اردو میں تبدیل کیا

حریت ۵

جنرل محمد موسیٰ خان، گورنر بلوچستان اردو کانفرنس کوئٹہ کے موقع پر منعقدہ کی مطبوعات کی نمائش کے افتتاح کے موقع پر کتابیں دیکھ رہے ہیں

پرائمری جماعتوں کیلئے نیا نصاب تعلیم

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت طلبار بالخصوص ابتدائی جماعتوں کے طلبا پر کتابوں کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے پہلی جماعت کے لئے صرف ایک کتاب کے نصاب پر غور کر رہی ہے۔ اس ضمن میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ اور تعلیمی تحقیق کے قومی مرکز کے تعاون سے تیار کی جانے والی نصابی کتاب پنجاب کے ایک سو بیس سکولوں میں آزمائشی بنیادوں پر رائج کی گئی ہے۔ اور ان اسکولوں کے اساتذہ کو اس کتاب کی تدریس کی تربیت بھی دی گئی ہے۔ طلبار پر کتابوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے نئے نصاب کی تیاری کے بارے میں یہ اطلاعات اطمینان بخش ہیں کیونکہ فی الوقت ابتدائی جماعتوں کے بچوں کو جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اور ننھے ننھے بچوں پر جس حساب سے کتابوں کا بوجھ لادا جا رہا ہے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں پرائمری جماعتوں کے نصاب کا جائزہ لیا جائے اور ان ہی کی طرز پر اپنی ضروریات کے مطابق ایسا مختصر اور جامع نصاب تعلیم رائج کیا جائے کہ بچوں کا ذہن اسے آسانی سے قبول کرلے اور اس سے تمام تعلیمی تقاضے بھی پورے ہو جائیں، ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابوں کی تعداد کم کرنے اور پہلی جماعت میں صرف ایک کتاب رائج کرنے کا تجربہ اگرچہ بہت دل خوش کن ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے پر پوری طرح غور و خوض نہیں کیا گیا اور نہ ہی ماہرین تعلیم کی آرار حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اگر اس پر تجرباتی طور پر عملدرآمد شروع کرنے سے قبل پورے ملک کے ماہرین تعلیم سے مشورے طلب کئے جاتے اور ان کی سفارشات کو بھی مدنظر رکھا جاتا تو یقیناً یہ منصوبہ زیادہ بہتر طور پر اور پورے ملک میں ایک ساتھ شروع کیا جا سکتا تھا، اب جبکہ اس منصوبے پر تجرباتی بنیاد پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ماہانہ بنیاد پر اس کی رپورٹیں تیار کی جائیں اور ماہرین سے ان رپورٹوں کی روشنی میں اس نصاب کی خامیوں کو دور کرنے اور خوبیوں کو دوچند کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ موجودہ تعلیمی سال کے دوران ہی اس کو آخری شکل دے کر پورے ملک میں اس پر عملدرآمد کرانا ممکن ہو سکتا ہے۔ نئے نصاب کو پورے ملک میں رائج کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے تمام پرائمری اساتذہ کو نئے نصاب سے آگاہ کیا جائے اور اس کی تدریس کے لئے ان کی خصوصی تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ اس نصاب پر بیک وقت پورے ملک میں عملدرآمد کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

روزنامہ حریت کراچی ۱۸-۵-۸۲

اُردو میں تاروں کی ترسیل

محکمہ تار و ٹیلیفون نے قومی زبان کی ترویج و ترقی کے پیش نظر درج شدہ ۱۳ شہروں میں اُردو میں تاروں کی ترسیل کا اہتمام کیا ہے

راولپنڈی
لاہور
پشاور
مظفرآباد
کراچی
حیدرآباد
ایبٹ آباد
کوئٹہ
ڈیرہ اسماعیل خان
ملتان
فیصل آباد
گوجرانوالہ
سرگودھا
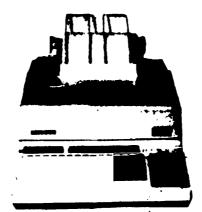
عوام سے درخواست ہے کہ وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو میں تاریں بک کروائیں اور قومی زبان کو رائج کرنے میں حکومت کا ساتھ دیں

ڈائرکٹر جنرل محکمہ تار و ٹیلیفون اسلام آباد

روزنامہ جنگ راولپنڈی یکم مئی ۸۲ء

قومی زبان اپنائیے

وفاقی وزیر تعلیم جناب نسیم احمد آہیر نے گزشتہ روز ایک ٹی وی پروگرام میں یہ انکشاف فرما کر قوم کو حیرت زدہ کر دیا ہے کہ اردو ابھی تک دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی انگریزی کا ذریعۂ تعلیم رہنا ترقی کے لئے ضروری ہے اور ۱۹۸۹ء تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ ہی عجلت میں کیا گیا تھا۔ گویا وہ فیصلہ قابلِ عمل نہیں، حالانکہ خود اسی برصغیر میں قیام پاکستان سے بہت قبل ریاست حیدرآباد دکن نے اردو میں تمام علوم و فنون کی تعلیم کا کامیاب تجربہ کر کے اس قسم کے لچر پوچ اعتراضات کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اسی "بے مایہ" اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر ادبی و سائنسی علوم میں ممتاز شخصیتیں پیدا کر کے اس مفروضہ بلکہ مغالطہ کو یکسر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے کہ اردو عہد جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اگر ۷۰-۸۰ سال پہلے اردو یہ معجزہ کر کے دکھا سکتی ہے تو آج آزادی کے حصول کے بعد اور ۴۰ سال سے پاکستان کو چلانے کے بعد کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں کہ اردو میں یہ اہلیت و صلاحیت نہیں۔ یہ دعویٰ اس کے سوا کسی حقیقت کو ثابت نہیں کرتا کہ اب جو لوگ نظام حکومت چلا رہے ہیں وہ اہلیت و صلاحیت، کارکردگی اور قومی اہمیت کے معاملات میں معیارِ فکر کے اعتبار سے بہت پیچھے چلے گئے ہیں اور اپنے ہی کئے ہوئے فیصلوں کو غلط قرار دینے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے۔

دنیا کے مختلف ممالک مثلاً جاپان، روس، فرانس، جرمنی اور بہت سے دیگر ممالک اپنی قومی زبانوں میں ہر قسم کی تعلیم دیتے ہیں اور کوئی ملک اس کے لئے انگریزی تعلیم کے حصول کو ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انگریزی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ ممالک سائنس، ریاضی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بہت ممالک ٹیکنالوجی اور سائنس کے میدان میں انگریزی زبان بولنے والے ممالک سے آگے ہیں۔

وفاقی وزیر تعلیم ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں روبرو میں شریک ہوتے جہاں انھوں نے کہا کہ ملک میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ قومی اہمیت کا حامل ہے اور اس مسئلے پر قومی سطح پر مفاہمت کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۹ء میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۸۹ء تک ذریعہ تعلیم اردو بنا دیا جائے گا۔ بقول وفاقی وزیر تعلیم سابقہ حکومت نے یہ فیصلہ بڑی عجلت میں کیا تھا۔ دانشوروں کا خیال ہے کہ انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم ملکی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ ہم وزیر تعلیم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کونسے دانشور ہیں جنہوں نے وزیر تعلیم کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم ملکی ترقی کے لئے ضروری ہے، جبکہ پاکستان کے ماہرینِ تعلیم اور دانشور برسوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ملکی ترقی و تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم قومی اور صرف قومی زبان ہو۔ قومی زبان نہ صرف تعلیم کے لئے ضروری ہے بلکہ اس سے قومی تشخص میں اضافہ ہوگا، قوم کی عزت نفس بڑھے گی، قوموں کی برادری میں ہم سربلند کر کے کھڑے ہو سکیں گے کہ ہماری بھی اپنی قومی زبان ہے اور ہم بولنے کے لئے کسی غیر ملکی زبان کے محتاج اور دست نگر نہیں ہیں۔

اس ملک میں احساس کمتری کے شکار اور انگریزی دورِ حکومت کے پروردہ ذہنیت رکھنے والے لوگ ابتدا ہی سے قومی زبان کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں تاکہ ملک پر ان کی بالادستی قائم رہے اور وہ ایک مخصوص حکمران طبقے کی حیثیت سے عوام پر اپنی فوقیت جتلاتے رہیں کاروبار مملکت میں انگریزی نہ جاننے والے عوام شریک نہ ہو سکیں اور انگریزی خواندہ مخصوص طبقے کی بالادستی اور اقتدار قائم رہے۔ خود وزیر تعلیم بھی اس پروپیگنڈے کا شکار نظر آتے ہیں گو کہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو قومی زبان ہے اور ملک میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو ابھی تک اس سطح تک نہیں پہنچی جہاں وہ جدید دور سے ہم آہنگ ہو سکے۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے ساتھ ساتھ سائنس و ٹیکنالوجی کے مطالعہ کے لئے انگریزی بھی پڑھائی جانی چاہئے۔ اگر ذریعۂ تعلیم کا موجودہ نظام مسلسل رائج رہا تو یہ قوم کو منقسم کر دے گا۔ جناب وزیر تعلیم کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنا، چیزوں کو سمجھنا اور جاننا جس قدر آسان ہوتا ہے غیر ملکی زبان میں اس قدر سہل نہیں ہوتا، غیر ملکی زبان کے حصول میں طلبا کی آدھی عمر گزر جاتی ہے تب وہ یہ صلاحیت حاصل کرتے ہیں کہ انہیں غیر ملکی زبان پر عبور حاصل ہو، پھر وہ کب سائنس، ریاضی اور ٹیکنالوجی کا علم حاصل کریں گے۔ انھوں نے ٹھیک کہا کہ اگر ذریعۂ تعلیم کا موجودہ نظام قائم رہا تو قوم منقسم ہو جائے گی۔ کیونکہ ملک میں دو طرح کے نظامِ تعلیم اس وقت رائج ہیں۔ بڑا طبقہ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہا ہے اور چھوٹا با اثر اور مالدار طبقہ اپنے بچوں کو انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلاتا ہے۔ یوں قوم تقسیم ہو رہی ہے اور وزیر تعلیم انگریزی تعلیم کو جاری رکھ کر اس تقسیم کو مستقل کرنے کی رائے دے رہے ہیں۔

پتہ نہیں کہ جناب وزیر تعلیم نے کن دانشوروں سے مشورہ کیا اور انہیں کن ماہرینِ لسانیات نے یہ رائے دی ہے کہ انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم ملکی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق دانشور اور ماہرینِ لسانیات ابتدا سے اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ ذریعۂ تعلیم ملکی اور قومی زبان ہونی چاہئے تاکہ قومی تشخص اجاگر ہو، یکجہتی میں اضافہ ہو، طلبا تیزی سے اپنی قومی زبان میں علوم و فنون حاصل کریں اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ ہم جناب وفاقی وزیر تعلیم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ملک میں موجود دو عملی اور دوہرے نظامِ تعلیم کو ختم کریں اور قومی یکجہتی کے لئے یکساں نصابِ تعلیم رائج کریں اور آئندہ نسل کو ان کی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا بندوبست کریں، البتہ بین الاقوامی ضروریات کی تکمیل کے لئے انگریزی کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے جاری رہنے دیں۔ باقی تمام علوم و فنون اردو زبان میں پڑھائے جائیں تاکہ قومی یکجہتی کے ساتھ ساتھ طلبا تیزی اور دلچسپی کے ساتھ اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں اور اپنا قیمتی وقت غیر ملکی زبان سیکھنے میں ضائع نہ کریں۔

(روزنامہ جسارت کراچی ۲۰-۵-۸۷ء)

جابر علی سید

شپلے کی فرہنگِ اصطلاحاتِ ادبی

جوزف .ٹی. شپلے کی شہرۂ آفاق عالمی ادبی فرہنگ موسوم بہ
A Dictionary of World Literary Terms
کی مترادف اردو لغت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے راقم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ شپلے کی لغت میں ادبی تصورات، تیکنیک اور اصناف ادب شامل ہیں۔ راقم نے ادبی تصورات، رومانویت، کلاسیکیت وغیرہ کو خارج کرتے ہوئے بقیہ دو نوع کی اصطلاحات کا اردو بدل تیار کیا ہے۔ اس تیاری میں علوم شعری سے علم بیان، علم بدیع، علم عروض اور علم قافیہ کے علاوہ ادبی تنقید کو بھی شامل کر لیا ہے اس بنا پر کہ تنقیدی اصطلاحات اصلاً ادبی اصطلاحات ہی ہیں از نوع نظم، نثر، وزن، بیت، مصرع، رباعی وغیرہ۔ جن کتب حوالہ سے مدد لی گئی ہے ان کا ذکر اصطلاحات کے تجزیے کے دوران کر دیا گیا ہے اور ذیلی نوٹوں سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ مترادفات اور معادلات کے ضمن میں ایراد، اضافہ اور حذف تین بڑے عمل ہیں جو تنقیدی اور ترمیمی نوعیت کے حامل ہیں۔ پیشِ نظر شپلے کا ۱۹۷۹ء کا ایڈیشن ہے جو لندن، بوسٹن اور سڈنی سے شائع ہوا ہے۔

(۸)

۱۔ Absolutism (ترجمہ: مطلقیت، مطلق پسندی، جمالیاتی عمومیت)۔
یہ نظریہ کہ ہر فن پارے کے اندر کچھ مخصوص فنی اقدار موجود ہوتی ہیں مخصوص فنی اقدار سے مراد منطقی خصوصیت کا حامل ہونا نہیں بلکہ وسیع تر مفہوم میں ان کی عمومیت ہے۔ ان اقدار میں تعمیر، وحدت، آہنگ، توازن، لفظگی، ہیئت، کردار، پلاٹ وغیرہ اہم ہیں (یہ اصطلاح امریکی ماہر جمالیات بیئرڈزلے Beardsley کی وضع کردہ ہے دیکھیے ان کی کتاب AESTHETICS ۱۹۵۸ء طبع امریکہ) مطلقیت فلسفے خصوصاً ہیگلی فلسفے اور سیاسیات سے بھی متعلق ہے جہاں اس کا مفہوم متضادات کا وحدت میں پرونا ہے۔

۲۔ Abstract

ترجمہ: (۱) روح، مغز، جوہر، خلاصہ، ملخص، ماحصل۔
(۲) ذہنی، خیالی، دقیق، باریک، پیچیدہ، نازک، مشکل، مجرد (عبدالحق)

اضافہ: Abstraction اس کا ترجمہ تجرید کیا گیا ہے۔ تجرید کے لغوی معنی علیحدہ کرنا اور تجرد کے علیحدہ ہونا ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد کسی کتاب وغیرہ کی تلخیص یا انتخاب [تجرید البخاری] ہے یا کسی مادی شے سے اس کی صفات کا استخراج ہے جیسے تجریدی مصوری اور تجریدی افسانے جس میں اشخاص سے زیادہ ذہنی علامات پر زور دیا جاتا ہے اسے علامتی افسانہ بھی کہتے ہیں جو جدید عہد کی چیز ہے۔ افلاطون اور برکلے کی عینیت پسندی میں بھی صفاتِ اشیاء و اشخاص کو عملی فوقیت ہے۔ غیر مادی تصورات کے مترادفات اعیانِ ثابتہ، امثال وغیرہ بھی ہیں۔

۳۔ Absurd, Theatre of

لایعنویت کا تھیٹر: زندگی اور آفرینش کائنات کے عبث اور بے سروپا ہونے کے نظریے کا ڈرامائی اظہار۔ لایعنویت کا تصور دوسری جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے فلسفہ، وجودیت سے وابستہ ہے۔ لایعنویت نگار ژاں ژینے (بالکونی)، ایڈورڈ ایلبی (سینڈ باکس امریکی خواب)، یوجین آئی نیسکو (Rdenoceros) اور سیموئل بیکٹ (Kyapps Las't Tape) کو زندگی میں کوئی منطق نظر نہیں آتی ان کی نظر میں صرف لایعنویت ہی بامعنی بات ہے۔ اس نوع کے تھیٹر یا تمثیلوں میں محدود کردار بے معنی یا نیم معنی مکالمات بولتے نظر آتے ہیں ان میں بیکٹ کا ڈرامہ "گوڈو کے انتظار میں" خاص طور پر معروف ہے اس ڈرامے کو ANTI DRAMA کہا جاتا ہے۔ بیکٹ کے ڈرامے

The Chairs میں ایک فاتر العقل جوڑا ہال میں کرسیاں رکھتے ہیں لیکن صرف خیالی ناظرین کے لیے ہیرالڈ پنٹر کے ڈرامے برتھ ڈے پارٹی میں واحد کردار کو منحوس اشارات کے بعد تباہی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ڈراموں میں ناظرین کی تعداد انتہائی محدود ہوتی تھی۔ البرٹ کامیو نے لایعنویت کے فلسفے کا ملخص تیار کیا ہے اس کے خیال میں "کائنات بے مقصد اور غیر معقول چیز ہے۔ ایک لفظ ایسا ہے جس کا مفہوم میرے فہم سے باہر ہے "گناہ"۔ لیکن بعد میں اس نے اپنے خیالات میں قدرے توازن پیدا کیا اور زندگی کے بے معنی ہونے کے اعتراف کے باوصف انسانوں کی بربریت کے خلاف اور ذمہ داری کی حمایت میں اعلان شائع کیا۔ سارتر کے خیال میں خدا کے بغیر کائنات بے معنی ہے۔ یہ تصور لایعنویت کے عام تصور کا عکس ہے اور تخریبی سے علی الرغم تعمیری ہے۔ لایعنویت کے عقب میں یہ تصور بھی کارفرما ہے کہ اس رویے کا محرک تجرید اکثریہ با اختیار شخصیت ہے۔ تیسری صدی کے رومن فلسفی ٹرٹیولین نے کہا تھا کہ میں اس لیے خدا پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ فہم سے زیادہ بالاتر حقیقت ہے۔ والٹ وٹمن Walt Whitman کی سوچ کا معاشرتی فنون لطیفہ اور عام روش زندگی میں بھی دخل ہے۔ نیز ارنسٹ ہیمنگ وے جیسے عظیم امریکی ادیب کے طویل افسانے A Farewell to Arms اور نارمن میلر کے ناول عریاں اور مردہ کے مرکزی تصور کے مابین جذبات کی نوعیت مختلف ہے۔ مختصراً یہ کہ لایعنویت نے عینیت کی جگہ سنبھال لی ہے۔ اس طرح کہ مذکورہ ناولوں میں اختلاف جذبہ کے باوجود غصیلا پن نمایاں احساس ہے۔ لایعنویت کا ڈرامہ اور ناول فوق الحقیقت نگاری Sur-Realism کے مماثل ہے مگر جزوی طور پر حاصل مطالعہ یہ ہے کہ ایسا تھیٹر اور ناول وغیرہ غیر مقبول اصناف ادب ہیں لیکن کسی حد تک اور توازن کے ساتھ لکھے گئے ڈرامے تاثر انگیز ثابت ہوئے ہیں۔

۴- Abuse

گالی سب و شتم، بدگوئی ہجو۔ شدید افریقی قبائل میں مقبول اور متداول رہی ہے اور اب بھی ہے، احتجاجی اور نفرت پروردہ جنگی نعروں سے وابستہ

جن میں دشمنوں کی فصلیں تباہ ہو جانے اور ان کی عورتوں کے بانجھ رہ جانے کی استدعا کی جاتی تھی ابتدائی انگریزی کی نظموں کا عنوان Flytings ہوتا تھا ان میں معروف ترین ولیم ڈنبر کی ہجو ڈنبر اور کینیڈی کی ہجو ہے۔ اس نوع کے ہاجی آج بھی جنگی نعروں کا حصہ ہیں۔ عربی شاعری میں شدید ترین ہاجی ابن الرومی سے یادگار رہے فارسی میں عبید زاکانی اور اردو میں سودا اور انشا اپنی ہجوگوئی کے لیے مشہور ہیں۔

۵- Academy, Academic

۱- افلاطون کی اکادمی سے منسوب۔
۲- عالمانہ لیکن تحقیر آمیز رویے کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔
۳- قواعد فنون و علوم پر بیشتر مشتمل اور ادبی تخلیق سے کمتر سروکار رکھنے والا۔
۴- عملی نتائج سے معرّا۔

اردو زبان و ادب کی ترقی کے جذبے سے معرض وجود میں آنے والی انجمنیں اکادمی کے نام سے موسوم و معروف ہیں۔ مولانا صلاح الدین کی قائم کردہ اکادمی اسد و اولین اکادمی تھی اور تازہ ترین اکادمی اکادمی ادبیات پاکستان ہے جس کا دفتر اسلام آباد ہے۔ عالمی شہرت اور وقعت کی مالک فرنچ اکیڈمی ہے جس کے ارکان بڑے بڑے ادیب اور علما ہیں۔

۶- Acatalectic

شاعری میں کسی بحر کی سالمیت یا اس کا مصرعے یا نظم میں زحاف سے عاری ہونا

مصرعے کا مزاحف ہونا، مزاحف مصرع Catalectic

وہ مصرعے جس میں دو ہجا کم ہوں Brachy Catalectic

وہ مصرعے جس میں ایک ہجا زائد ہو Hyper Catalectic

ہجا یا مقطع Syllable

عربی شاعری میں زحافات کی کثرت ہے ان کی کل تعداد چوالیس ہے اور اکثر مصاریع میں زحافات کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ آہنگ بگڑ جاتا ہے اور مصاریع کی تقطیع امر دشوار ہو جاتی ہے۔

زحاف لغت میں تیر کے ہدف سے ہٹ جانے کو کہتے ہیں ظاہر ہے کہ جو تیر اپنے مخصوص نشانے

کس قدر ناقص ہوگی. مرکب زحافات کا عمل اور ان کے عمل کا نتیجہ پیچیدہ اور ناخوشگوار ہوتا ہے اور سالم بحور ہی خوش آہنگ اور رواں دواں ہوسکتی ہیں۔ فارسی شاعری میں زحافات کمتر اور اردو میں اور بھی کم استعمال ہوئے ہیں اور جن اشعار میں ان کی کثرت ہے وہ اشعار اپنے معانی کو لے ڈوبتے ہیں اور ان کی گہرائی یا عظمت متاثر ہوتی ہے مثلاً غالب کی وہ غزل جس کا مطلع ہے

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

انتہائی بدآہنگ واقع ہوئی ہے اور اس آہنگ کا پورا نام بھی کیفی دہلوی کے الفاظ میں جناتی ہے [کیفیہ انجمن ترقیٔ اردو ۱۹۵۱ رباب اردو کے عروضی ارکان]

Accent -۲
زور، بل، تاکید، لہجہ، بم، زیر کا متضاد

کسی مصرعے کے کسی ہجا یا مقطع پر زور ہی پر مصرعے کے آہنگ کی بنیاد ہے اور اس کی خاطر بعض الفاظ کے ہجاؤں کے زور یا تاکید کو مصرعے کے آہنگ کے لیے بدل سکتے ہیں جس کے خلاف شعراء نے احتجاج کیا ہے مثلاً الزبتھی عہد میں گیبریئل ہاروے کے مکتوب بنام سپنسر میں یہ تبدلِ تاکید غفلت کا نتیجہ ہے۔ زیر بحث لفظ Carpenter میں زور کو منتقل کرکے پہلے ہجا Car سے دوسرے پر رکھ دیا ہے اور اس کی صورت یہ ہوگئی ہے

Carpenter - تاہم شعراء نے ارادۂ آہنگ یا وزن [قدیم اصطلاح] کی یکسانی دور کرنے کی خاطر ایسی تبدیلی بم روا رکھی ہے مثلاً Kunitz کے ان تین مصرعوں میں

Within the City of the Burning Cloud
Dragging my Life behind me in a Sack
Naked I Prowl

بحرِ مقصور آئمبی خماسی الامکان ہے [مؤلف نے پوری تشریح نہیں کی اسے یہ بتانا چاہیے تھا کہ زیرِ نظر مصرعوں میں تبدیلیٔ بحر روا رکھی گئی ہے۔ یعنی پہلا مصرع تو آئمبی بحر میں ہے [۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔] لیکن دوسرا اور تیسرا مصرع آئمبی کی بجائے ٹروکائی میں ہے [ٹروکائی بحر (Trochee) میں برعکس آئمبی کے پہلا ہجا بلند اور دوسرا پست واقع ہوتا ہے اس کی صورت ۔ ۔ ہوتی ہے اور تیسرے مصرعے کی تقطیع Scansion اس نہج پر ہوگی

Nakĕd I Prowl

ہمارے عربی، فارسی اور اردو عروض میں ایک ہی نظم یا غزل میں بحر کا بدل دینا ' رجز میں رمل ڈال کے چلنا کہلاتا ہے [دیکھیے انشا کی ہجوِ عظیم بیگ در 'آبحیات' محمد حسین آزاد] جو یکسر ناجائز عمل ہے۔

آہنگ کے زور اور لفظی زور کے علاوہ معنیاتی زور شاعر کے ارادے کے تحت تلفظ پر اثر انداز ہوسکتا ہے مثلاً اس جملے میں We have our work done کا مطلب ہے" ہم اپنا کام کسی دوسرے شخص سے کرا سکتے ہیں" اور اس جملے میں We have our work done کا مفہوم ہے کہ ہمارا کام مکمل ہوچکا ہے۔ ڈبلیو۔ ایس گلبرٹ نے بتایا کہ کس طرح جملہ مختلف مواقع پر واقع زور چار مختلف مفاہیم پیدا کرسکتا ہے۔ اس جملے میں یہ عمل آزمایا جاسکتا ہے He was a little Boy

مصرعے یا جملے کے اندر جس لفظ پر زور جس قدر ہوگا اتنا ہی اس کا لہجہ بلند ہوگا

Accentuate: V. I Accent (Oxford)
But used more than it in Fig. Sense

شبلیؔ نے اس لفظ کا مفہوم جو آکسفورڈ لغت کی تقلید میں درج کیا ہے یہ نکلتا ہے کہ Accetuate بہ نسبت Accent کے زیادہ تر مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی مثلاً اس کا جو استعمال بمعنی نمایاں کرنا To make prominent ہے اس سے مراد مطلقاً کسی امر پر زور دینا ہے نہ کہ مخصوصاً کسی ہجا کو مؤکد بنانا ہے [جو صوتیاتی لہجے سے تعلق رکھتا ہے] مثال کے طور پر کسی شخص کی سخاوت یا مثلاً اس کی وسیع المشربی پر زور دے کر اسے نمایاں حیثیت دینا [کسی تقریر کے دوران یا تحریر کے اندر] مولوی عبدالحق صاحب کو اس سلسلے میں قدرے تسامح ہوا ہے وہ یقیناً اس کا مفہوم سمجھتے ہوں گے لیکن جو الفاظ ادائے مفہوم کے لیے انہوں نے استعمال کیے ہیں ان سے صحیح مفہوم متبادر نہیں ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں Accenuate دیکھو Accent لیکن اس

کا استعمال استعارے میں زیادہ ہوتا ہے" اس ترجمہ شدہ جملے کا مفہوم بالکل مبہم رہ گیا ہے بلکہ ترجمہ بھی غلط فہمی پیدا کرتا ہے کیونکہ Figurative Sense کا صحیح اردو ترجمہ مجازی معنی' ہونا چاہیے نہ کہ استعارے میں محقق پوچھ سکتا ہے کہ کون سے اور کس نوع کے استعارے میں، پھر اس کی مثال بھی پیش نہیں کی جب کہ آکسفورڈ لغت نے پیش کی ہے یعنی نمایاں کرنا۔ علم بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقیقت اور مجاز کے ضمن میں مجاز عقلی اور مجاز مرسل کی قسمیں سامنے آتی ہیں اور مجاز مرسل کے ساتھ استعارہ، کنایہ، تعریض وغیرہ زیر بحث آتے ہیں۔ مولوی صاحب کو تسامح یہ ہوا ہے کہ مجازاً' کہنے کی بجائے جیسا کہ عربی فارسی اور اردو لغت نگاروں کا دستور ہے انہوں نے استعارے کے حوالے سے مفہوم کو واضح کرنا چاہا ہے جو اور بھی الجھ گیا ہے۔ [اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے اردو ترجمہ بدائق البلاغت امام بخش صہبائی دہلوی طبع نولکشور ۱۹۲۷ء۔ اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ Accentuate بجائے خود استعارہ ہے نہ یہ کہ اس کا استعمال زیادہ تر استعارے میں ہوتا ہے] واضح رہے کہ استعارہ مجاز کے متعدد پیرایوں میں سے ایک ہے۔

مولوی عبدالحق اگر اس طرح بھی لکھتے کہ "لیکن اس کا زیادہ استعمال بطور استعارے کے ہوتا ہے" تو بھی مفہوم ادا ہو جاتا

ڈاکٹر گیان چند صاحب نے "اُردو زبان میں زور اور بُل" کے عنوان سے قیمتی مقالہ لکھا ہے جو پمفلٹ کی شکل میں چھپ چکا ہے (دیکھیے نوائے ادب بمبئی ۱۹۶۶ء) اس میں انہوں نے مغربی زبانوں کی نہج پر اردو الفاظ کے مقطعات پر بل لگا کر اردو کی صوتیاتی نوعیت کو منقلب کر دیا ہے اس سے بیشتر ہماری زبان کے مقطعات حرف حرکات وسکنات متشکل ہوتے ہیں اور اب بھی درسیات میں یہی روش ہے۔ دوسری کوشش ممتاز احمد عباسی صاحب کی تالیف 'حسنِ تلفظ' ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ مستشرقین کا دستور ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی سہولت کی خاطر اور اشعار کی تقطیع یونانی عروضی نظام کے تحت کرتے ہیں یعنی پست و بلند مقطعات بناتے ہیں مثلاً ہمارے وتد مجموعے کو جس میں پہلے دو حرف متحرک اور تیسرا ساکن ہوتا ہے آئمبی رکن میں بدل دیتے ہیں اس طرح کہ مثلاً نظر، خبر، ادھر، اُدھر جیسے لفظوں کو مندرجہ ذیل نظام کے تحت لے آتے ہیں

Năzar, Khăbar, Ĭdhar, Ŭdhar

لیکن ادھار، مہار جیسے الفاظ کو بھی وہ وتد مجموع میں تصور کرتے ہیں یعنی وہ بھی آئمبی رکن ہی متصور ہے حالانکہ اس کا وزن نظر وغیرہ سے مختلف ہے۔

ادھار، مہار Ŭdhar Mŭhar

۷ پست اور بلند یا طویل سلیبل [مقطع] ہے

اس کے باوجود کہ یہ اردو میں مغربی نظام تاکید کا تعارف ہے اکثریت نے اسے قبول نہیں کیا بسبب ایک علمی 'بدعت' ہونے کے۔

۹۔ Acrostic

توشیح، موشح نظم، موشحہ

اندلس کی عربی شاعری کی معروف صنف موشحہ کی ہیئت اور آہنگ مختلف ہے اور صنعتِ توشیح سے جو فارسی اور اردو شاعری کے بدیعی شعبے میں شامل ہے اندلسی موشحہ [لفظی معنی رنگا رنگ موتیوں کا ہار کہ پے بہ پے قوافی Para Rhyme [ترصیع کی صنعت بھی بنیادی طور پر یہی ہے، اس میں لائے جاتے ہیں اس کی ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

بدر اتم + شمس ضحیٰ + غصن + نقا + مسک اشم

ماأتم + ما اوضحا + ما اورقا + ماأتم

لا جرم + من لمحا + قد عشقا + قد حرم

موشحہ یک رکنی شعر کی توسیعی صورت ہے جسے شعرِ مجزّا سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن موشحہ سے قبل عربوں میں اس کا رواج کم تھا اسے موسیقی سے قریبی مناسبت تھی اور آج بھی ہے۔

اردو میں صنعتِ توشیح عبارت ہے کسی نظم یا غزل کے ہر اولیں مصرعے کے اولیں حروف کے ایسے مجموعے سے جس میں کوئی نام یا لفظ تلمیح مضمر ہو جبکہ Acrostic میں بھی یہی صورت ہے مگر Acrostic میں علامتی نام مستخرج ہوتا ہے مثلاً لفظ Ichthy [معنی مچھلی] حضرت عیسیٰ کے یونانی مترادف الفاظ کے پہلے حروف کا مجموعہ ہے اور وہ نام یا لقب Christ کے پہلے

حروف کا مجموعہ ہے۔ اگر ایسے حروف مل کر کوئی لفظ بنائیں تو یہ توشیح اصلی ہے۔ اگر درمیانی حروف ملیں تو Meso stich اگر آخری حروف جمع ہوں تو Telestich اور اگر پہلے مصرعے یا سطر کا پہلا حرف اور دوسرے لفظ کا پہلا یا دوسرا حرف ملیں تو اس کا نام Cross Acrostic ہے۔ [توشیح متقابلی] جیسے پو کا بنایا ہوا لفظ Valentine قدیم ترین قسم کا نام ABCE Darian جو Lamentations ۱-۴ ہیں اور Proverbs ۳۱ ۱۰۔ ۳۰ اور بارہ نغمات Psalms [اردو ء نغماتِ داؤد] ان غزلیات یا نغمات میں مخفی صوفیانہ اشارات مضمر متصور ہیں۔ لکرو رومن رکن مجلس آئین Cicero کہتا ہے کہ یہ سلیبی اشعار میں بھی ہیں اگرچہ اس صنعت کا اصل مقصد یادگیرانہ ہی ہے پلاطس کے طربیوں کے حق میں دیے گئے دلائل بھی توشیحی ہیں۔ سرجان ڈیوس نے چھبیس حمدیں اسطریا کی شان میں لکھیں جن میں سے ہر ایک میں "الزبتھی، ریجینا" کا نام مضمر ہے۔ ایڈیسن کی نظر میں موشح ناقص ذکاوت کا نمونہ ہے۔

اردو شاعری میں صنعتِ توشیح عربی اور فارسی شاعری سے داخل ہوئی ہے۔ سودا کے ان اشعارِ مقیدہ میں توشیح ہے

شمہ جو بیاں کیجے انصاف کا اس کے
جو خوبی میں دنیا میں لگے اس کے نہ پاسنگ
الطاف و کرم کا جو شمار اس کے کروں میں
عاری رہیں امواج کو کنکر بر لبِ گنگ
انصاف یہ اب عہد میں اُس کے ہے کہ فریاد
لایا نہ لبوں پر کوئی غیر از جرس و زنگ
دیکھا نہ میں یہ حوصلہ جز اس کے بشر کا
وسعت بھی زمانے کی حضور اس کے ہے کچھ تنگ
لعل اس کے تئیں بیچے کنکر سے ہیں کمتر
ہمت کا بھلا پیچ جہاں کس کے ہے یہ ڈھنگ

ہر مصرعے کے اولیں حروف لیے جائیں تو شجاع الدولہ ممدوح سودا کا نام نکلتا ہے۔

۱۰۔ Act

ایکٹ: کسی ڈرامے یا تمثیل کا بڑا حصہ

ارسطو اور یونانی کورسوں کی حرکات میں کل پانچ ایکٹ کا تصور موجود ہے یہ تصور عام طور پر انیسویں صدی کے اواخر تک مسلم رہا جبکہ ابسن کے ہاتھوں میں اور آخری ایکٹ خفیف ہو کر صرف چار ایکٹ باقی رہ گئے۔ بیسویں صدی میں یہ گھٹ گھٹا کر صرف تین تک محدود ہو گئے اور گزشتہ دس سال میں صرف ون ایکٹ مختصر ڈرامے کو اکثر ایک بابی [ایکانکی] ڈرامہ کہا جاتا ہے کبھی کبھی ڈرامے کے واقعات کو بغیر چھوٹی تقسیم کے مناظر میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

۱۱۔ Action

(۱) عمل (۲) کار (۳) کہانی کا بڑا حصہ بمقابل اس کے کسی حصے کے (۳) وہ سلسلۂ واقعات جن سے کسی ڈرامے یا بیانیے کا پلاٹ بنتا ہے۔ کسی ڈرامے کے عمل کو جسمانی حرکات، مکالماتی تصادم یا بیانِ واقعات سے ظاہر کیا جاتا ہے جو مفروضہ طور پر سانحہ پذیر ہوتے ہیں [یونانی المیوں میں مار دھاڑ سے]۔ ارسطو کی نظر میں عمل کی اہمیت ڈرامے میں بنیادی ہے جب کہ وانٹ برد تصادم کی وضاحت اس طرح کرتا ہے " میرا خیال ہے کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ لطف اندوزی کا انحصار کردار اور اسلوب پر زیادہ ہے بہ نسبت واقعات کے" یہ بحث اس طرح سمیٹی جا سکتی ہے کہ یہ دیکھا جائے عملِ تمثیل میں اعضا میں سے کون سا عضو اپنی حرکات سے اہم ترین ہے۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ڈرامے یا ناول میں ایک بڑی واحد عمل کی لائن [خطِ عمل] ہونی چاہیے۔ جدید ناول اور ڈرامے میں [اینٹی ناول، اینٹی ڈراما] کا ہے ان پابندیوں سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں اور صرف ایسا عمل دکھاتے ہیں جس میں تسلسل نہ ہو اور وہ عمل سرسری یا اتفاقی ہو۔

۱۲۔ Activism

عملیت، حرکیت، عمل پسندی، عمل پیرائی

وہ رویہ یا پالیسی جو جرمنی میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد اثر پذیر ہوئی۔ فرانز پمفرٹ نے ہفت روزہ Die Action شائع کیا اور کرٹ ہلر نے سالنامہ The Aim نیز لڈوگ روبنر نے ایک کتاب شائع کی بنام Man in the Mudle ان کا مطالبہ تھا کہ انسان کو زندگی میں عملی جد و جہد کرنی چاہیے اور جیسا کہ ہلر نے اپنے مجلہ پمفرٹ میں لکھا " اگرچہ دنیا کی حقیقت ہمارے فہم سے بالاتر ہے لیکن ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اس کو بہتر

سے بہتر بنایا جائے لیکن تبدیلی روحانی ہونی چاہیے نہ کہ جسمانی پیکار کی صورت میں۔ اس تحریک میں ٹامس مان، کارل سٹرن ہیم، ارنسٹ ٹولر اور ڈبلیو ہاسن شریک تھے۔ اردو میں بعض عمل پسند سیاسی آزادی کی تحریکیں اس تحریک کی ہم مقصد اٹھتی رہی ہیں۔

۱۳۔ Acyrology

حد سے زیادہ نرم اور بھدر ردانہ لفظ یا اسلوب وکٹورین دور میں مقبول۔

۱۴۔ Addisonian

ایڈی سونی [جوزف ایڈیسن ۱۶۷۲ - ۱۷۱۹] -

(۱) اسلوب میں متوازن، منصفانہ اور غیر مضطرب۔ مجلہ Spectator میں وعدہ کیا گیا تھا کہ کسی خاص پر حملہ نہ کیا جائے بلکہ مجموعی طور پر انسانوں کو ہدف طعن بنایا جائے۔ سر راجر دی کا ورلے کو یہ فقرہ لکھنا مرغوب تھا" بحث میں دونوں جانب بہت کچھ کہا جا سکتا ہے" (۲) ایڈیسونی اختتام جملہ [بشپ ہرڈ] آخر جملہ میں حرف جار لایا جائے۔

۱۵۔ Address

خطاب، مخاطب، تقریر

"کلام میں متکلم کی مخاطب سے کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مخاطب اپنی ذات یا کسی اور شخص یا گروہ سے مخاطب ہو سکتا ہے" اردو فارسی غزل میں اس سے آگے ایک اور قدم ہے یعنی مقطع میں شاعر خود کو غیر ذات تصور کر کے اس سے متعلق غائبانہ صیغہ میں اظہار خیال کرتا ہے اور ساتھ ہی محبوب سے بھی مخاطب ہے۔ غالب

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ تنوع جو تکلم کی شخصیت کو کئی شخصیتوں بانٹ دیتا ہے غزل سے مخصوص ہے اور متن دتو کی بوقلمونی کا باب ہے۔ اقبال کی غزل متن د تو [بانگ درا] کا مخاطب کون ہے یہ فیصلہ کرنا قطعی طور پر دشوار سا ہے۔ کیا کوئی راز داں مراد ہے یا نوجوان مسلم جو تلقین کی خاطر منتخب کیا گیا ہے اور جو شاعر کے آئیڈیلز کے پیش نظر خطاب کا مورد ہے۔

۱۶۔ A..yt... [illegible]

صنعت مبالغہ کی ایک صورت جو عقلاً محال ہو [غلو] مثلاً بی۔ ٹیلر اپنی نظم 'بدوی نغمۂ محبت' میں کہتا ہے" میری محبت اس وقت تک رہے گی جب سورج بوڑھا ہو جائے گا اور ستارے ٹھنڈے پڑ جائیں گے" اردو علم بدیع میں مبالغہ کی صنعت کا انگریزی بدل Hyperbole سے موسوم ہے۔

میر انیس کے اس بند میں غلو تو نہیں ہے سوائے آخری بیت کے

گر آنکھ سے نکل کر ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

لیکن سودا کے ان اشعار میں صراحتہً موجود ہے۔ شعروں میں ممدوح کے گھوڑے کی تیز رفتاری کا بیان ہے۔

دو برو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو
پھینک دے لے کے کبھی شرق سے تا غرب تلک
اتنے عرصے میں پھر آئے تو اسے با در کر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

۱۷۔ Affectation

[اسلوب یا ترتیب لفظی میں]

تصنع جو متکلم یا کسی ڈرامائی کردار کو زیب نہ دے اور اس کی فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ یہ بھی صنعت مبالغہ سے منسلک ہے لیکن فصاحت اور بلاغت خاص طور پر اس کے موضوع لہٰ ہیں۔ بلاغت کے لیے فصاحت شرط مقدم ہے اور خود بلاغت جس کا جدید ترین مفہوم Perfect Communication ہے کلام کے مقتضائے حال ہونے کی صفت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: اشاراتِ تنقید
مصنف: ڈاکٹر سید عبداللہ
ضخامت: ۳۳۸
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: مقتدرہ قومی زبان۔ شمائلہ اعوان پلازہ۔ ۱۶۔ ڈی (ویسٹ) بلیو ایریا۔ اسلام آباد۔

محسنِ اردو ڈاکٹر سید عبداللہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ زیرِ نظر کتاب "اشاراتِ تنقید" ڈاکٹر صاحب کی ایسی تصنیف ہے جس میں فاضل مصنف نے ادب و تنقید کو معرکہ کارزار بنانے کی بجائے اسے ادب شناسی کا کاروبار اور معاملۂ امن و محبت بنا کر ادبی تنقید کے اصولوں پر بحث کی ہے۔ ادب انفرادی جذبات کے علاوہ تہذیبی جذبوں کا ترجمان بھی ہوتا ہے پر ساری قوم کے جذبہ و ادراک اور شعور و احساس کا مظہر ہے۔ ادب پاروں کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں متعدد اہم موضوعات زیرِ بحث رہے کہ تنقید کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں، تجربے اور تنقید کا رشتہ، تخلیق کار اور نقاد کا فریضہ کیا ہے؟ کلاسیک کیا ہے؟ ادب میں روایت کی کیا اہمیت ہے؟ انفرادیت اور روایت کی رشتہ بندی، شاعری میں موسیقیت کے کیا معنی ہیں؟ ادب اور کلچر کا باہمی تعلق، ادیب کا سماجی منصب، مذہب اور ادب کا باہمی تعلق اور ادیب کے وسیلۂ اظہار (میڈیم) کی بحث وغیرہ۔ جن پر مختلف ادوار میں مغرب و مشرق کے مختلف اہلِ فکر نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ پیش کیے جس سے فکر کی نئی راہیں اور سچائیاں دریافت ہوئیں۔ کسی نے ادب پارے میں اصولِ بلاغت اور اسالیب کی پابندی پر زور دیا اور کہیں ادب کی ماہیت، اس کے منصب اور اس کی تاثیر کے بارے میں تاثر اور جذبے کو اہمیت دی گئی۔ کہیں ادب کا مقصد حسن کا ادراک قرار دیا گیا اور کبھی بلاغت کے خطیبانہ وسائل اور شاعری کی جذباتی اساس کو باہم ملا کر ادب اور ادبی مطالعہ کا ایک نیا راستہ دریافت کیا گیا۔ کہیں تو کلاسیکی طرزِ فکر کو اور کبھی رومانی اندازِ نظر کو اختیار کیا گیا کبھی تنقید کو علم کی ان شاخوں سے وابستہ کیا گیا جن میں سائنسی طریق کار استعمال ہو سکتا ہو اور کہیں تنقیدی فکر میں روایت، تاریخی شعور، ماضی کے ورثے اور تہذیبی تاریخ کو ترجیح دی گئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان تمام نظریات و افکار کا عہد بر عہد جائزہ لیا اور ان کے اثرات پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب تین بڑے موضوعات' مغربی تنقید کی تاریخ۔ تنقید کی تاریخ (اسلامی دور) اور تنقید کے دورِ جدید پر مشتمل ہے۔

مغربی تنقید کے تاریخی جائزے میں افلاطون اور ارسطو کے مطالعہ فن، مطالعہ اخلاق اور جمالیاتی اصولوں سے لے کر آئی۔ اے رچرڈز کی علم نفسیات سے وابستگی اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تنقیدی دبستان تک کے مختلف رویوں اور افکار کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

اسلامی دور کی تنقید کے دورِ قدیم کے اجمالی جائزے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے چند اہم نکات کی طرف مورخین و محققین کی توجہ مبذول کروائی ہے کہ اسلام کی پہلی صدیوں میں تنقید بھی قرآن مجید سے فیض یاب ہو کر ایک رُخ اختیار کرتی رہی۔ نظام حکومت، ایرانی عجمی اثرات یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے اور بلاغت کے نظریے بھی اس کی تشکیل میں حصہ لیتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کی کوئی ایسی جمالیاتی یا تنقیدی تاریخ نہیں جس میں ان سب تہذیبی

اور تاریخی و سیاسی عوامل کا سراغ لگایا گیا ہو۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے مشہور عرب نقاد جاحظ، ابن قتیبہ، باقلانی، قدامہ بن جعفر، ابن رشیق، ابن المعتز اور ابن خلدون اور فارسی ادب کے ناقدین میں رشید وطواط، شمس قیس، امیر خسرو، دولت شاہ سمرقندی، ابوالفضل فیضی، غلام علی آزاد، خان آرزو اور غالب کے افکار و اشارات، نقد و نظر اور نظریۂ فن و شعر پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو کے مشاہیر ادب اور ناقدانِ فن محمد حسین آزاد سے لے کر ڈاکٹر زور، نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عبدالحق کے نظریات و افکار سے بحث کی ہے اور اس دور میں تنقید کے مختلف رجحانات کی بھی نشان دہی کی۔

دورِ جدید میں تنقیدی نظریات کا خالصتاً اصولی، عقلی اور بڑی حد تک سائنسی ضابطوں کے تابع ہونے کے ساتھ ساتھ اردو تنقید پر ترقی پسند ادب کی تحریک کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے اس دور کی تنقید پر علمی، سیاسی اور معاشی نظریوں کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں "کیا ادبی تنقید ایک سائنس ہے" "کیا تنقید ذہنی روداد نگاری ہے"؟ ادب کا قدیم تصور" ادب کی جدید تعبیریں" اور ادب شناسی جیسے اہم موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کے مباحث اور بصیرت افروز مقالے ہیں اور آخر میں حوالے کی انگریزی اور اردو کتابوں کی فہرست بھی ہے۔

"اشاراتِ تنقید" طالب علموں کے لیے ایک گراں بہا اور اہم اضافی کتاب ہے۔ اس نادر و نایاب کتاب کی اشاعت کے لیے مقتدرہ قومی زبان مبارکباد کا مستحق ہے جس نے اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبا کی سہولت کے لیے اعلیٰ سطح پر درسی کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب آفسٹ پر شائع کی گئی ہے۔ گیٹ اپ خوبصورت اور قیمت مناسب ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مقتدرہ قومی زبان کے نائب ناظم ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی اہلیہ ڈاکٹر ثمانہ گوہر ۲۵ مئی ۱۹۸۷ء کو ایک طویل علالت کے بعد وفات پا گئیں۔ ادارہ ڈاکٹر صاحب کے اس غم میں ان کا شریک ہے اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

اردو کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کیا جائے

کراچی (پ ر) تنظیم بہبود مستورات کی رہنماؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک کو مضبوط بنیادوں پر قائم رکھنے کے لئے اردو کو ملک کے ہر شعبہ ہائے زندگی میں جلد سے جلد نافذ کیا جائے تاکہ ملک کے ۹۸ فیصد لوگوں کا یہ مطالبہ پورا ہو سکے۔ جو لوگ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم و ترقی سمجھتے ہیں وہ احساس کمتری کا شکار ہیں اور ذاتی مفادات کے تحت قومی زبان اردو کے رائج ہونے میں ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کرتے رہے ہیں انہوں نے سوال کیا کہ کیا جن ملکوں میں انکی اپنی زبان رائج ہے وہ ترقی نہیں کر رہے؟ آخر ہم ہی کیوں انگریزی زبان کو اپنی ترقی و تعمیر میں ذریعہ استعمال کر رہے ہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ مٹھی بھر لوگ اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے بیجا کوشش کے مفادات سے کھیلتے رہے ہیں اس بیان پر بیگم قریشی، مسز افتخار، مس رخسانہ نفیس، اسلمی بیگم قمیر، بیگم حمید، بیگم علیم، مس فرزانہ یاسمین، مس گل شازی، مس فوزیہ افتخار، بیگم طاہر حسین، بیگم عزیز، بیگم شریف، بیگم کہکشاں سلطانہ، مس ثریا، بیگم سراج الحق خان، بیگم انعام الدین، بیگم ظہیر الدین نے اس بیان کی تائید کی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۱۸ مئی ۸۷ء

اردو جائز مقام دیا جائے

ہالا (نامہ نگار) مہاجر اتحاد تحریک ہالا کے آرگنائزر محمد انور ملک، سلمان بھٹی، اعجاز راجپوت، طالب علی، عبدالغفار قائم خانی، عبدالقدیر راجپوت، فاروق احمد بھٹی، ایم۔ آئی ملک، ارشد حسین قائم خانی، عارف رانا، غلام رسول نے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ قومی زبان اردو کو سندھ میں اس کا جائز مقام دیا جائے سندھ کے محکمہ تعلیم میں قومی زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا جا رہا ہے اندرون سندھ پرائمری سے ہائی اسکول و کالج میں اردو اساتذہ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ صوبہ سندھ میں قائم کئے گئے نئی روشنی اسکول میں اردو اساتذہ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے اردو اساتذہ میں احساس محرومی پیدا ہو رہا ہے اور بے روزگار اردو بولنے والے نوجوانوں میں شدید بے چینی پھیل گئی ہے بیان میں حکومت اور محکمہ تعلیم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو میڈیم پرائمری اسکولوں و کالج میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ اردو بے روزگار نوجوانوں میں پھیلی ہوئی بے چینی دور کی جا سکے اور قومی زبان کو اس کا جائز مقام مل سکے۔

جنگ کراچی ۱۶ مئی ۱۹۸۷ء

ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی میں تبدیل کرنے پر احتجاج!

ایبٹ آباد (نمائندہ جنگ) انجمن طلبہ اسلام ہزارہ ڈویژن کے ناظم مصباح الرحمن ہاشمی اور دوسرے عہدیداروں شاہد مصطفےٰ طاہر، مہر اعوان طارق رشید ہاشمی اور ماجد خان نے ایک مشترکہ بیان میں فیڈرل بورڈ کے زیر اہتمام سکولوں میں ذریعہ تعلیم یکدم اردو سے انگریزی میں تبدیل کرنے پر سخت احتجاج کیا ہے جس سے غریب والدین پر شدید بوجھ پڑا ہے کیونکہ اس سے پہلے فیڈرل بورڈ نے انگریزی سے ذریعہ تعلیم اردو میں تبدیل کیا تھا جس کے تحت نویں جماعت تک طلبہ تمام مضامین اردو میں پڑھ رہے تھے مگر یکدم حساب سائنس اور دوسرے مضامین کو انگریزی میں تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ یونیفارم کو بھی شلوار قمیض کے بجائے کوٹ پتلون میں تبدیل کر دیا ہے طلبہ اور ان کے والدین کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

جنگ پنڈی ۱۸-۵-۸۷ء

ذریعہ تعلیم اردو کیا جائے

راولپنڈی ۱۳ مئی (نیوز ڈیسک) فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کے زیر انتظام تمام اداروں کا ذریعہ تعلیم صرف اردو کیا جائے۔ یہ بات ایک بیان میں کہی گئی ہے کہ عوام کی جانب سے ذریعہ تعلیم کے بارے میں شک کا اظہار کیا گیا ہے جبکہ ۱۹۷۹ء کے حکومت کے فیصلے کے مطابق فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کے تحت تعلیمی اداروں کا ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا ہے اور کوئی نیا حکم نامہ جاری کر کے اس پر سختی سے عملدرآمد کیا جائے۔

نوائے وقت پنڈی ۱۴ مئی ۸۷ء

تسلیم آمیز ترمذی مشاعرہ میں مہمان خصوصی ہونگے

اسلام آباد (اپ پ) وفاقی وزیر تعلیم سید تسلیم احمد صابر کے حلقہ کی پاکستان نیشنل ڈیبیٹ مشاعرہ میں مہمان خصوصی ہوں گے یہ مشاعرہ ... منعقدہ قومی نشریاتی رابطے پر دکھایا جائے گا۔ اس مشاعرہ میں ... شرکا میں ... غلام محمد شامل ہیں۔

روزنامہ مشرق ... ۱۸ مئی ۸۷ء

اخبارِ اردو کے نام

مکرمی جناب وحید قریشی صاحب

محبت

"اخبارِ اُردو" مل رہا ہے۔ شکریہ میں اس کے ہر شمارے کو پڑھتا ہوں اس کے مضامین عموماً نہایت محنت سے لکھے جاتے ہیں لیکن چند ایسے مضامین بھی ہوتے ہیں جن کو معیاری یا سنجیدہ قرار دینا مشکل ہے مثلاً پچھلے چند شماروں سے جناب اسرار اشفاق کا ایک مضمون "انگریزی الفاظ جو اردو تحریر و تقریر کا حصہ بن چکے ہیں" چھپ رہا ہے اس میں شک نہیں کہ اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں انگریزی کے بے شمار الفاظ داخل ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے جن الفاظ کا استعمال دکھایا ہے وہ سب کے سب الفاظ اردو میں عام نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو میں اس طرح داخل ہو چکے ہیں کہ ہم ان کو اردو کا "حصہ" تسلیم کر لیں۔ چند لوگ خاص انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ یا انگریزی الفاظ کو بطور فیشن استعمال کرنے والے ایسے ضرور ہیں جو ہر جملے میں ایک دو انگریزی الفاظ استعمال کرنے کو اپنی بڑھائی سمجھتے ہیں لیکن ان چند لوگوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انگریزی الفاظ اردو کا حصہ بن چکے ہیں"۔ "حصہ" کا لفظ تو ہم صرف ان الفاظ کے لیے کہہ سکتے ہیں جو عوام میں رچ بس گئے ہیں یعنی زبان پر چڑھ چکے ہیں اور جن کا بدل ہماری زبان میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر زبان کا اپنا لسانی اصول ہے اور جب کوئی زبان کسی اور زبان سے الفاظ قبول کرتا ہے تو اسے اپنے ڈھنگ پر، اپنے لہجے میں اپنے تلفظ میں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتا ہے اس طرح انگریزی کے کئی الفاظ کو اردو نے اپنے طور پر قبول کیا ہے۔ مثلاً انگریزی میں TOBACCO (ٹوباکو) اردو میں "تمباکو" بن چکا ہے اور TOMATO انگریزی ہے تو "ٹماٹر" اردو ہے۔ جناب اسرار اشفاق صاحب نے اپنے فہرست الفاظ میں کئی اسم خاص کو بھی شامل کیا ہے۔ صاف بات ہے کہ "اسم خاص" ہر زبان میں یکساں ہی رہے گا اگر شہر کراچی کا نام لینا ہو تو ہر زبان میں کراچی ہی کہنا یا لکھنا ہوگا۔ اس لیے انگریزی میں شہر کراچی کا نام کہیں لیا جائے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے انگریزی نے اس لفظ کو قبول کر لیا ہے لیکن اسرار اشفاق صاحب نے جو کئی اسم خاص کو شامل کر لیا ہے وہ درست نہیں۔ مثلاً آکسفورڈ، نومبر، اکتوبر وغیرہ۔ بعض وقت زبانیں اپنی مزاج کے مطابق "اسم خاص" میں بھی ہلکی سی ترمیم کر لیا کرتی ہیں جب تک مخصوص آواز اس زبان میں نہ ہو، مثلاً انگریزی میں "ت" نہ ہونے کی بنا پر الفاظ "ٹ" سے بدل جائیں گے یا ہندی اور بنگلہ زبانوں میں "ع" کی آواز نہ ہونے سے ایسے الفاظ "گ" سے بدل جاتے ہیں۔ لہذا مضمون نگار کو چاہیے تھا کہ تمام "اسم خاص" کو وہ اپنی فہرست الفاظ سے نکال دیں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ایک زبان میں کسی لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں لیکن جب وہ لفظ کسی اور زبان میں داخل ہو جاتا ہے تو ان تمام معنوں کے بدلے کسی ایک معنی کو لے کر ہی داخل ہوتا ہے۔ مضمون نگار نے اس پر بھی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ اردو میں یہ جو انگریزی الفاظ ہیں کیا وہ مکمل طور پر انگریزی کے تمام معنوں کے ساتھ رائج ہیں یا کسی ایک معنی میں آتے ہیں مثلاً WRITER کا لفظ ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس لفظ کو "اردو کا حصہ قرار" نہیں دیا جا سکتا پھر WRITER کا لفظ منشی، محرر، کلرک لکھنے والا انشا پرداز، ادیب، مولف، مصنف ان تمام معنوں میں رائج ہے تو سوال پیدا ہوتا کہ اگر یہ لفظ اردو کا حصہ بن چکا ہے تو کس معنی میں وہ اردو کے رائٹر ہیں اس کے بجائے ہم یہی کہتے ہیں کہ "وہ اردو کے ادیب ہیں" لہذا ایسے الفاظ کو بھی اس فہرست سے نکال دینا چاہیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے کسی انگریزی لغت کو سامنے رکھ کر یہ دیکھا کہ ان انگریزی الفاظ میں سے کون کون سے الفاظ کا (کسی نہ کسی طور پر) اردو میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا کسی نے کر لیا ہے اور بس انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا

کہ یہ الفاظ" اردو کا حصہ بن چکے ہیں"۔

جلد ۳ شمارہ ۹ میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا مضمون "دکنیات پر اردو کتابیں" ایک اہم مضمون ہے موصوف نے کئی تصانیف کا ذکر کیا ہے میرے ذاتی کتب خانے میں بھی پچھلے دس، بارہ سال میں شائع شدہ دکنیات کے سلسلے میں کئی کتابیں ہیں ہو سکتا ہے یہ کتابیں ڈاکٹر ہاشمی کی نظر سے گزری ہیں۔ چند کتابیں یہ ہیں۔

(۱) صورت گران دکن۔ ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۹۷۹ء
(۲) دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات، مجید بیدار، حیدرآباد ۱۹۸۰ء
(۳) ملا وجہی، جاوید وششٹ، دہلی ۱۹۸۴ء
(۴) بگھی کے پیچھے کچوکر ا۔ مخدوم محی الدین حیدرآباد ۱۹۸۰ء
(۵) داستان ادب حیدرآباد۔ گولڈن جوبلی ایڈیشن۔ ڈاکٹر زور ۱۹۸۲ء
(۶) ریاست میسور میں اردو۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون ۱۹۶۰ء
(۷) نقد و نظر۔ اختر حسن۔ حیدرآباد ۱۹۸۴ء
(۸) دیوان لطف۔ مرتب ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ حیدرآباد ۱۹۸۳ء
(۹) شاعر کے کرشمے۔ مولانا جلال الدین کامل روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۹۸۵ء
(۱۰) نادرالشعراء۔ مرتبہ زاہد علی خان حیدرآباد ۱۹۸۴ء
(۱۱) باقیات حبیب۔ مرزا حبیب علی حیدرآباد ۱۹۸۳
(۱۲) بزم توحید، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، نظامی پریس بدایون ۱۳۴۰ھ
(۱۳) حیدرآباد کی داستان۔ ناشر روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۹۸۶ء
(۱۴) ذکر رضا عابد حسین عابد گلبرگہ ۱۹۸۱ء
(۱۵) حیدرآباد۔ رضیہ سلطانہ حیدرآباد ۱۹۴۴
(۱۶) تاریخ دکن۔ مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ حیدرآباد ۱۹۴۷ء
(۱۷) قدیم شہر (حیدرآباد) کا معاشی سروے، روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۹۸۴ء۔
(۱۸) حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب۔ اقبال جہان قدیر حیدرآباد ۱۹۸۵ء
(۱۹) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد ۱۹۸۲ء خطبہ استقبالیہ
(۲۰) گلمرگ سے گلبرگہ تک (سفرنامہ) طیب انصاری حیدرآباد ۱۹۸۲ء
(۲۱) حیدرآباد میں اردو صحافت۔ طیب انصاری حیدرآباد ۱۹۸۰ء
(۲۲) اردو کے مسائل ڈاکٹر سید عبدالمنان، انجمن ترقی اردو آندھراپردیش حیدرآباد ۱۹۷۷ء وغیرہ وغیرہ

مقتدرہ قومی زبان نے جو پمفلٹ شائع کیے ہیں ان میں سے آپ نے حسب ذیل کتابچے روانہ کیے تھے۔

(۱) مجلس زبان دفتری پنجاب ایک تعارف
(۲) پاکستان میں نفاذ اردو کی داستان
(۳) ہند سے اوراق کی تاریخ
(۴) قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں
(۵) قومی زبان کے بارے میں چند انٹرویو حصہ اول
(۶) مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز
(۷) قطر میں اردو

یعنی صرف ۷ پمفلٹ جب کہ اب تک آپ ۳۴ پمفلٹ شائع کر چکے ہیں اس کے علاوہ بہت سی کار آمد کتابیں بھی شائع کی ہیں، کیا مجھے ان تصانیف کا مکمل سیٹ مل سکتا ہے قیمت تو ادا نہیں کر سکتا ہاں بدلے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ مغربی بنگال اردو اکادمی نے جو کتابیں اب تک شائع کی ہیں اس کا ایک سیٹ روانہ کردوں، مغربی بنگال اردو اکادمی نے حسب ذیل ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔

(۱) بنگالی شعراء تعارف و ترجمہ۔ از نصر غزالی
(۲) ہیرباقر مخلص مرشد آبادی۔ ڈاکٹر عبدالرؤف
(۳) مضامین وحشت۔ مرتبہ۔ جمال احمد صدیقی
(۴) صلیبیں میرے دریچے میں۔ فیض احمد فیض
(۵) سبزہ و گل۔ رئیس الدین آفریدی
(۶) میزان۔ فیض احمد فیض
(۷) اردو ادب اور بنگالی کلچر۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ
(۸) سطح آتش، سہیل واسطی وغیرہ

میں نے ایک کتاب "مغربی بنگال میں اردو کے مسائل" بذریعہ رجسٹری ڈاک روانہ کی تھی۔ وہ ملی یا نہیں۔؟

خیر طلب
شانتی رنجن بھٹاچاریہ
نومبر ۱۹۸۶ء

۱۶ اپریل ۸۷ء

جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

تسلیمات

اخبارِ اُردو کے تازہ (اپریل ۸۷ء کے) شمارے میں آپ کے نام جناب سید جابر علی کا خط نظر سے گزرا۔ اردو کو اس وقت بڑے اہم مسائل درپیش ہیں جن میں سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ اس کے نفاذ کا ہے۔ ان سب سے قطع نظر کرکے جناب مراسلہ نگار کا اسکول اور سکول کی بحث کو اٹھانا اور ایسے الفاظ کے املا میں الف کے سقوط کو "بہت بڑا المیہ" قرار دینا میری فہم ناقص سے بالاتر ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ سکون اول ہماری لسانی عادات کے خلاف تھا اس لیے انگریزی الفاظ میں جو حرف ی ساکن سے شروع ہوتے تھے کہیں ابتدا میں الف کی آواز در آئی۔ کہیں س کو حرکت دے گئی ہے مگر اضافہ الف صرف ی کے ساتھ ہوا۔ دوسرے حروف ساکن جو اسی طرح ابتدا میں آئے جیسے ٹرین، کلین، پلینر، پلیٹ ڈرم وغیرہ میں الف کا اضافہ نہیں ہوا۔ الٹرین اکلین نہیں بولا گیا سنسکرت میں سکون اول موجود تھا، چنانچہ سنسکرت الفاظ میں بھی یہی تصرف روا رکھا گیا۔ حرف اول کو حرکت دے دی گئی شری سے شری بن گیا کہیں الف کا اضافہ کیا گیا جیسے شکندے اِسکندے اور کہیں س ہی کو ساقط کر دیا گیا جیسے شکندھ سے کندھا بن گیا ستنبھ سے تھم۔

عادات لسانی عہد بعہد بدلتی بھی ہیں۔ ہمارے ہاں پڑھا لکھا طبقہ اب سکون اول پر خاصی قدرت حاصل کر چکا ہے۔ یہ ایک ترقی کی صورت ہے یعنی اب ہم اس امر میں معذور نہیں رہے۔ لہٰذا املا میں بالالتزام الف کا اضافہ کوری زبردستی ہوگی۔ آپ سپیشل اور سپرنٹ لکھیں اور یہاں س پر جزم تصور کیا جائے گا جو لوگ اس تلفظ کو ادا کرنے پر قادر نہ ہوں وہ شوق سے اسپیشل۔ اسپوتنک یا سپیشل سپوتنک مکبر ڈس پڑھا کریں۔

اردو کا تو امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کا نظام اصوات، مصمّتے اور مصوّتے دوسری زبانوں سے بڑھ کر ہیں۔ کتنی ہی آوازیں ہیں جو انگریزی یا عربی یا فارسی یا ہندی میں نہیں اردو میں یکجا موجود ہیں۔ انگریزی میں ٹوٹ اور ڈ تک کی آواز نہیں صد ڈر مکٹٹر رہ ہی لکھا اور بولا جا سکتا ہے۔ پھر اپنی زبان یا اس کے رسم الخط کو ناقص بتانا اور ایک معذوری کو جو اب دور ہوتی جا رہی ہے دائمی بنانا کیا فائدہ رکھتا ہے؟ ہم یہ تاثر کیوں دینا چاہتے ہیں کہ اردو سپیشل یا سٹاپ کو ضبط تحریر میں لانے کے قابل نہیں ہے۔

آپ کا نیازمند

شان الحق حقی

بدسلوکی کے باوجود اردو یتیم نہیں ہوگی حنیف طیب

ووٹ لینے سے ... نہیں اردو میں ... بات کرنی پڑتی ہے

اسلام آباد ۱۰ مئی (اسٹاف رپورٹر) وفاقی وزیر صنعتی پیداوار حنیف طیب نے کہا ہے کہ ہم اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اردو سے جو سلوک کر رہے ہیں اس بے توجہی سے اردو ختم نہیں ہوگی بلکہ ہم اردو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ بات انہوں نے مقتدرہ قومی زبان کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ محدود لوگوں اور چند کمروں میں ممکن ہے ہم اردو سے بے اعتنائی برت لیں لیکن جب ہمیں ووٹ کی ضرورت ہوتی ہے تو اردو میں ہی بات کرنا پڑتی ہے اردو ایک رابطے کی زبان ہے اور ملک کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ اپنی اپنی سطح پر قومی زبان کے فروغ کے لیے کام کریں۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ میں بعض اوقات بڑی تعداد میں لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ تقاریر اردو میں ہوں۔ اس وقت فنی سہارا لے کر رد کر دیا جاتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے اراکین اور سامعین کو اردو ہی کی بات سمجھ آتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مقتدرہ کی کاوشوں کو سراہا۔ قبل ازیں مقتدرہ کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ نوائے وقت ۱۲ مئی ۸۷ء

وفاقی تعلیمی اداروں میں یونیفارم تبدیل کرنے پر تشویش

راولپنڈی (رپورٹر) جامعہ مسجد ضیاء الاسلام ملت آباد میں جمعہ کے تعلیم الشان اجتماع میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کیبنٹ ایریا کے تعلیمی اداروں میں ... رائج کرنے کی سرکاری پالیسی پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا حکومت سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ... شدہ پالیسی بحال رہنے دیا جائے۔

روزنامہ پاکستان (اسلام آباد) ۱۳ مئی ۸۷ء

کنٹونمنٹ بورڈ سکولوں میں داخلوں کا مسئلہ

نسیم آہیر اتوار کو ایکشن کمیٹی سے مذاکرات کریں گے

اسلام آباد (اسٹاف رپورٹر) تعلیم کے وفاقی وزیر ملک نسیم آہیر نے کنٹونمنٹ بورڈ کے سکولوں میں بچوں کے داخلے کے بارے میں پیدا شدہ مسائل پر بات چیت کے لئے ایکشن کمیٹی کے نمائندوں کو اتوار کو صبح ۱۰ بجے اپنے دفتر میں بلایا ہے۔ نمائندہ جنگ سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت عوامی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرے گی اور اس بارے میں تمام تضادات کا ازالہ ... گا۔ انہوں نے کہا کہ وفاقی حکومت پہلے ہی متعلقہ حکام کو ہدایت جاری کر چکی ہے کہ کوئی بچہ داخلے سے محروم نہ رہے اور اس ضمن میں تمام بچوں کے داخلے کو یقینی بنانے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

بھارت میں مسلم طلبہ کی اردو سے عدم دلچسپی

کراچی (فارن ڈیسک) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان طلبہ اردو زبان میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔ بھارتی جریدے بلٹز کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک تعلیمی سمینار کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ مقابلے کے امتحانات میں مسلم طلبہ اردو کو بطور مضمون لینے کی سہولت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو اردو میں دلچسپی لینی چاہیے۔ جریدے کے مطابق ڈاکٹر خسرو نے بتایا کہ بھارت میں مسلم تعلیمی اداروں کی فلاح و بہبود اور ان کے فروغ کیلئے اسلامی ڈیولپمنٹ بینک نے ۳۳ کروڑ ڈالر اور آغا خان فاؤنڈیشن نے ۲ کروڑ روپے مختص کئے ہیں۔

اخبار اردو

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

اس شمارے کے اہم مضامین

* مذاکرہ میانوالی
* مذاکرہ لاہور
* مذاکرہ پشاور
* مذاکرہ کوئٹہ
* مذاکرہ ایبٹ آباد
* مذاکرہ کراچی
* تبصرے

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

قومی یکجہتی نمبر

اگست ۱۹۸۷ء

جلد ۴ شمارہ ۸

سید انجم جعفری

قومی یکجہتی میں اردو کا کردار

خطبۂ استقبالیہ

صدر ذی وقار خدمت گارِ اردو جناب شہزصہبائی صدر تحریک فروغ اردو، معزز مہمانِ خصوصی عالی مرتبت جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب صدر نشین مقتدرہ قومی زبان پاکستان و معزز مہمانان گرامی، میں تحریک فروغِ اردو کے عہدیداران اور اراکین کی جانب سے معزز مہمانِ خصوصی اور ان کے رفقائے کار کا تہہِ دل سے شکرگزار ہوں کہ وہ تحریک فروغِ اردو کی دعوت پر تشریف لائے اور ہمیں شرفِ میزبانی بخشا۔

جنابِ والا! آپ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ اس پیرانہ سالی کے باوجود جس ولولہ انگیزی اور ان تھک محنتِ شاقہ سے کام سے کر قومی زبان کی آبیاری کر رہے ہیں۔ قوم انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ہمارے معزز مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وحید قریشی کی ہمہ گیر شخصیت ایک شجرِ سایہ دار کی طرح ہے جس کے خنک سائے میں راہروان اردو نہ صرف آسودگی محسوس کرتے ہیں بلکہ توانائیاں حاصل کر کے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

جناب والا! میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ محسن اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کی رحلت سے خدمت گزاران اردو کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ اس قافلۂ سخت جان کے قافلہ سالار ہیں جو کہ ملک میں لسانی عصبیتوں کے خلاف ملّی وحدت کا عَلم اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ربِ جلیل آپ کو صحتِ کاملہ کے ساتھ ساتھ طویل عرصہ تک قومی زبان کی خدمت کے مواقع عطا کرے۔

(آمین ثم آمین)

جنابِ صدر! میں وابستگانِ اردو کو محسنِ اردو کے اس نعرۂ مستانہ کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جس میں انہوں نے فرمایا تھا۔ ”میری زندگی میں اردو قومی زبان نہ بن سکی تو مر کر بھی چین نہ پا سکوں گا۔“ یہ خواہش کسی لکھنوی یا دہلوی کی نہیں تھی بلکہ یہ آواز صوبہ سرحد کے ایک مخلص غیور بظاہر نحیف و ناتواں لیکن عزم و استقلال میں سب سے توانا شخص کی تھی جسے عرفِ عام میں محسنِ اردو کہا جاتا ہے۔ یہ اس عظیم قوم کا فرزند تھا۔ جس نے انگریز کی حکومت قبول کی اور نہ انگریزی کی بالادستی، خادمانِ اردو پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی روح کی ابدی آسودگی کے لیے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس ملک میں انگریزی کی بلا جواز بالادستی کو ختم کر کے بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق اردو زبان کو جاری و ساری کریں۔ بابائے قوم نے کھلے الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔ ”میں واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ جو شخص آپ کو اس سلسلے میں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کرے وہ پاکستان کا پکا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔“

ارشادِ قائداعظم کے مطابق ہمارے اتحاد اور ترقی کا دار و مدار قومی زبان پر ہے اور قومی زبان ہی قومی یکجہتی کی ضمانت۔

جناب والا! ان تمام تر حقائق کے باوجود انگریزی پرست طبقہ جو حکومت کے ایوانوں میں حکمرانی کے مزے لوٹ رہا ہے اپنی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لیے وطنِ عزیز میں انگریزی کی بالادستی برقرار رکھنا چاہتا ہے کہ ان کے نزدیک انگریزی

زبان ہی بندہ آقا میں تمیز کر سکتی ہے۔ اس طبقے نے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے انگریزی کی گرفت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نیا جال ڈال دیا ہے کہ انہوں نے نام نہاد دانشوروں اور کرائے کے ایجنٹوں کے ذریعے علاقائی زبانوں کو اردو کا مدِمقابل بنانے کی کوششیں تیز تر کر دی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سرزمین پاکستان میں سندھی، پنجابی، بلوچی اور براہوی زبانوں کا ہوا دکھا کر اردو کی طاقت کو ختم کیا جائے اور انگریزی کی بالادستی برقرار رکھنے کا جواز پیش کیا جائے۔

جنابِ والا! یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اردو زبان مختلف زبانوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ جس میں رنگ برنگے پھول اپنی اپنی مہک سے ملک کے طول و عرض کو مہکا رہے ہیں۔ علاقائی زبانیں اردو کی اپنی شاخیں ہیں اور انہی کے ساتھ سے اردو کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اردو کسی صورت بھی علاقائی زبانوں کی حریف نہیں ہے بلکہ ان کی حلیف ہے۔ میں واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ علاقائی زبانوں کو قومی زبان کے مدمقابل لا کر اپنے مذموم مقاصد پورے کرنا چاہتے ہیں انہیں اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

جنابِ والا! ۱۹۷۳ء کے آئین میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ۱۹۸۸ء تک اردو کو ملک کے تمام دفاتر میں مکمل طور پر جاری و ساری کر دیا جائے گا۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ مقتدرہ قومی زبان نے اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ قومی اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں وفاقی وزیرِ تعلیم نے واضح الفاظ میں معزز ایوان کو اس بات کی یقین دہانی کرائی ہے کہ دستور کے مطابق ۱۹۸۸ء تک اردو کو انگریزی زبان کی جگہ مکمل طور پر رائج کر دیا جائے گا۔

جنابِ والا! میں اپنی اور اپنے رفقا کار کی طرف سے معزز مہمان خصوصی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے صحیح موقع پر صحیح سمت میں نشاندہی فرما کر وابستگانِ اردو کی دلی ترجمانی کی ہے۔

صدر ذی وقار! ہمیں تمام تر اعلانات کے باوجود اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ انگریزی پرست طبقہ جو حکومت کے ایوانوں میں مؤثر اور توانا صورت میں موجود ہے، آخری لمحات تک اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وابستگانِ اردو کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

جنابِ والا! میں آج کی اس تقریب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مطالبہ کرتا ہوں کہ سرکاری سطح پر ۱۹۸۸ء کو اردو کا سال قرار دے دیا جائے اور ۱۹۸۸ء میں دستور کے مطابق انگریزی کی جگہ اردو رائج کرنے کے انتظامات کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد رکھی جائے۔

معزز مہمانِ گرامی! تحریک فروغ اردو میانوالی اگست ۱۹۸۰ء سے اپنے محدود وسائل اور بے مائیگی کے باوجود نفاذِ اردو کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ تحریک کے مالی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کارکنوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جبکہ دشمن قوتیں بھرپور مالی وسائل سے لیس اور کرائے کے ایجنٹوں کی فوج ظفر موج لئے ہمارے راستے میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈال رہی ہے۔ تحریک فروغِ اردو کے یہ سخت جان حوصلہ مند کارکن تمام مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے اردو کا پرچم بلند کیے ہوئے منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں تحریک فروغِ اردو منزل کے حصول کے لیے مقتدرہ قومی زبان سے بھرپور تعاون کرتی رہے گی۔

جنابِ والا! اس موقع پر میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میانوالی تخلیقی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اردو کی توانا آوازیں میں تلوک چند محروم کا نام نامی سرِفہرست ہے۔ ملک منظور حسین منظور کے نامِ نامی سے کون ناواقف ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد میانوالی میں شررِ صہبائی کی "بے نام" اجمل نیازی کی "جل تھل" مشتاق گھمالوی کی "چٹکیاں" محمد فیروز شاہ کا "دریچہ" مقبول سیلے خیلوی کی "گل دشت"، "شہرِ سخن" اور "رشتہ درد" ظفر خان نیازی کی "چوکور پہیئے" سردار ممتاز کی "گوہر تابدار" اور "گلدستہ حجاز" ڈاکٹر سلطان کندی کی "الکندی" منشی محمد رمضان انصاری کی "میانوالی تاریخ کے آئینے میں" ایم ایچ ہاشمی کی "نوائے پاک" ندیم حیدر بلوچ کی "صدمات" اور "سحر ستارہ" اور خاکسار کی "تعارف شعرائے فکر و شعور"، خوشبو حسین کی "دستورِ حیات" و رفعنا لک ذکرک، اسوۂ جس کا نام "کربلا کے پھول"، میرِ کارواں، ادعونی اور ندیم نیازی کی نکہت گل و سندھ، قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ جن سے اردو ادب کی آبیاری ہوئی ہے۔

جنابِ صدر! میں آپ کی وساطت سے ایک بار پھر معزز مہمانِ گرامی عالی مرتبت ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، ان کے رفقائے کار ڈاکٹر انعام الحق جاوید، جناب ڈاکٹر بشیر سیفی، جناب عطش درانی اور معزز شرکاء محفل کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے تحریک کی دعوت پر شرکت فرما کر تحریک کو شکریے کا موقع عطا فرمایا۔ خدا ہمارا حامی و ناصر ہو

ابوالمعانی عصری

قومی یک جہتی میں اُردو کی اہمیّت

سرزمین میانوالی معاشی و اقتصادی اعتبار سے پسماندہ سہی، لیکن علمی و ادبی اعتبار سے خاصی زرخیز واقع ہوئی ہے۔ اردو کے نامور محقق و نقاد، شاعر و ادیب اور قومی یک جہتی کے سفیر عالی مرتبت ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی ولادت با سعادت اسی ضلع میں ہوئی۔ آپ کے نانا بزرگوار ۱۹۳۴ء تک بسلسلۂ ملازمت میانوالی شہر میں قیام پذیر رہے۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی پیدائش ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی شہر میں ایک ہندو کے مکان میں ہوئی جو آپ کے نانا بزرگوار نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ آپ نے چوتھی جماعت تک یہاں تعلیم پائی۔ جس مکان میں آپ کے نانا بزرگوار قیام پذیر رہے اس مکان کا جغرافیائی محل وقوع طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے موصوف کو صحیح طور پر یاد نہیں رہا۔

ڈاکٹر موصوف میانوالی کے لوگوں سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ والہانہ وارفتگی و اخلاص سرزمین میانوالی کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ اعجاز و افتخار موصوف کو بھی فطرتاً وافر مقدار میں ودیعت ہوا ہے۔

سرزمین میانوالی کا سپوت اخلاص و محبت میں بے بدل، بہادری و جرأت میں خاصا نمایاں، عجز و نیاز میں بے پناہ استقامت پسند ثابت ہوتا ہے۔ مہمان نوازی یہاں کے لوگوں کے دل و دماغ اور فعل و عمل میں اس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ یہاں کا مہمان نواز طبقہ بالخصوص اور عوام بالعموم اس سعادت کو وجۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر وحید قریشی کم و بیش اٹھاون کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ بیک وقت انگریزی زبان کے، فارسی زبان کے اور قومی زبان اردو کے مسلّمہ سکالر ہیں۔ آپ کی تبحر علمی طویل المدت انتھک جدوجہد اور متواتر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ یہ مقام مستقل ریاضت مطالعہ کے بغیر میسّر ہی نہیں ہوتا۔

مَیں ۵ جنوری ۱۹۸۷ء کو شمائلہ اعوان پلازہ ۱۶۔ ڈی (غربی) بلیو ایریا اسلام آباد میں موصوف کی خدمت میں بہرِ ملاقات حاضر ہوا۔ آپ صدر نشین مقتدرہ قومی زبان کی مسندِ فضیلت پر جلوہ افروز تھے۔ مجھے اذنِ باریابی میں لمحہ بھر بھی دقت درپیش نہ آئی۔ مَیں جونہی موصوف کے کمرے کے اندر داخل ہوا تو آپ کا چہرہ فرطِ انبساط سے تمتما اٹھا۔ آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔

آیئے جناب، تشریف لایئے!

اگرچہ میری موصوف سے پہلی ملاقات تھی۔ لیکن مجھے لمحہ بھر بھی اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ تین گھنٹے کی طویل ملاقات کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے تھے۔

میرا تعلق حضرت ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے اُن عقیدت مندوں سے ہے جو اپنی کم مائیگی و بے بضاعتی کے باوجود نفاذ اردو تحریک کا علَم بلند کیے ہوئے ہیں۔ مَیں حضرت احسان دانش مرحوم کا ایک ادنیٰ سا تلمذ ہوں اور حضرت ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی تحریک نفاذ اردو کا معمولی سا رکن بھی۔ یہ دونوں کلاسیکل شخصیتیں اگرچہ آج ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کے افکار و نظریات ہمارے لیے اور آئندہ نسلوں کے لیے راہنمائی کرتے رہیں گے۔

مَیں نے ان عظیم ہستیوں سے ایسی فکری راہنمائی حاصل کی جس کا بدل سیم و زر اور جواہرات کے انبار بھی نہیں ہو سکتے۔

مَیں نے دورانِ گفتگو جناب ڈاکٹر وحید قریشی سے عرض کیا کہ آپ تحریک فروغ اردو میانوالی کی دعوت پر میانوالی تشریف لا کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں تو ہم "قومی یک جہتی میں اردو کا کردار" کے موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کر لیں گے۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے میری پیش کش قبول فرمائی۔ مَیں جناب حاجی محمد ارشد قریشی معتمد مقتدرہ قومی زبان کے کمرے میں تاریخ کے تعین کے لیے حاضر ہوا۔ ہم نے ۲۰ فروری ۱۹۸۷ء کا دن مقرر کیا۔ وقت اور مقام کا حتمی تعین کرنا باقی تھا۔ مَیں وہاں سے فارغ ہو کر میانوالی آ گیا اور متذکرہ موضوع پر مذاکرہ منعقد کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ڈپٹی کمشنر میانوالی جناب علی طاہر زیدی صاحب جو ایک علمی شخصیت ہیں۔

وف نے پروگرام میں ایک دن مزید اضافہ کر دیا کہ دوسرے دن تمام ضلعی افسران
۔نفاذ اردو کے موضوع پر خطاب ہوگا۔

جناب شرر صہبائی تحریک فروغ اردو میانوالی نے سید انجم جعفری کو بطورِ خاص
ع کر پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے اسلام آباد روانہ کر دیا۔
پروگرام دو دن کا طے کیا گیا۔ لیکن ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۸۷ء ضلع کونسل میانوالی کے
سلہ مویشیاں" کی تاریخیں متصادم ہونے کی وجہ سے یہ دو دن کا پروگرام ایک
تہ مزید مؤخر کرنا پڑا۔

۲۷، ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء تحریک اردو میانوالی کے لیے امتحان و آزمائش کے
ت بن کر سر پر منڈلانے لگے۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے مزید ایک دن
تشریف آوری کی اطلاع ٹیلیفون پر دے کر پروگرام میں توسیع کر دی۔

جناب ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
تی سیکرٹری کے مساوی منصب رکھتے ہیں۔ آپ کے ہمراہ تین چار سکالر
تشریف لا رہے تھے۔

تحریک فروغ اردو میانوالی بحمداللہ ایسی علمی و ادبی تنظیم ہے جسے مخلصین
رکا ہمہ وقت عملی تعاون حاصل ہے۔ ناظمین و مخلصین شہر نے اس مذاکرے کو
یاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انتظامات ہر طرح سے تسلی بخش ترتیب
چکے تھے۔ معزز مہمان کے ساتھ جناب بریگیڈیئر گلزار احمد بھی ۱۲۴۱ء۔ پی کے
پروازے تشریف لا رہے تھے۔

بتاریخ ۲۶ فروری ۱۹۸۷ء کو ایک بجے کے قریب معززین شہر اپنے معزز
نوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے اپنی کاروں کے ساتھ استقبال کے لیے چشم براہ
۔ طیارہ ایک بج کر پندرہ منٹ پر اترا۔

استقبال کرنے والوں میں جناب ڈپٹی کمشنر سید علی طاہر زیدی۔ ایڈیشنل کمشنر چوہدری
دت علی۔ جناب کلیم اللہ ملک۔ جناب اعجاز حیدر زیدی۔ جناب سعداللہ خان رئیس آف
خیل اور صدر تحریک فروغ اردو میانوالی اور اراکین تحریک ہوائی اڈے پر
دیتے۔

معزز مہمان بریگیڈیئر جناب گلزار احمد کے ساتھ طیارے سے برآمد ہوئے تو
تحریک جناب شرر صہبائی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے مصافحہ کیا اور
بال کے لیے تشریف لانے والے احباب کا تعارف کرایا۔ پھر معزز مہمان وی آئی پی
لاؤنج میں چند منٹ توقف کرنے کے بعد اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

کینال ریسٹ ہاؤس معزز مہمانوں کے لیے مختص ہو چکا تھا۔

جن شخصیتوں نے شرفِ میزبانی حاصل کیا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب
کلیم اللہ ملک، جناب اعجاز حیدر زیدی، جناب چوہدری سعادت علی ایڈیشنل کمشنر
ضلع میانوالی، جناب سعداللہ خان رئیس آف عیسیٰ خیل۔

اب ذرا جناح ہال میانوالی چلیئے!

۲۷ فروری ۱۹۸۷ء بوقت ۳ بجے بعد نماز جمعۃ المبارک مذاکرہ شروع ہونا تھا۔ تمام
ہال میں نہایت سلیقے سے نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ سٹیج پر پانچ نشستیں لگا دی گئیں
معزز مہمان خصوصی کی دائیں جانب جناب بریگیڈیئر گلزار احمد اور ان کے ساتھ جناب
عطش درانی، معزز مہمان خصوصی کی بائیں جانب صدر تحریک فروغ اردو میانوالی
جناب شرر صہبائی اور معتمدِ اعلیٰ جناب اسلم ظفر سنبل۔ سٹیج کے عقب میں پانچ فٹ
کی بلندی پر مذاکرے کے موضوع کا بینر آویزاں تھا۔ ہال کی شرقی و غربی دیواروں پر
دو بینر لگے ہوئے تھے۔ نشستوں کے درمیان میں گذرگاہ تھی۔ سامعین و مدعوئین
بعد نماز جمعہ تشریف لا کر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے گئے۔ ساڑھے تین بجے تک
تمام ضروری انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ اب معزز مہمانوں کا انتظار شدت سے
بڑھنے لگا۔

تین بج کر چالیس منٹوں پر معزز مہمانوں کی آمد ہوئی۔ ہم تمام ناظمین مہمانوں کے
لیے چشم براہ تھے۔ معزز مہمان اپنی اپنی کاروں سے برآمد ہو کر ہال کی سیڑھیوں پر چڑھنے
لگے تو ہال میں تشریف فرما سامعین کے چہرے فرطِ انبساط سے چمک اٹھے اور تمام
لوگ دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ جوں ہی مہمانوں نے دروازے کے اندر قدم رنجہ
فرمایا تو تمام حاضرین فرطِ مسرت اور جوشِ عقیدت سے احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔
ہال استقبالیہ تالیوں سے گونج اٹھا۔ فرطِ انبساط سے میری آنکھوں میں اشک نمودار ہوئے۔
یہ آنسو خوشی و شادمانی کے آنسو تھے۔ میں نے اپنے احساسات چھپانے چاہے لیکن میرے
ضبط کے آنسو پلکوں کے حصار سے نکل چکے تھے۔

بحمداللہ میانوالی کے جرأت مند و غیور عوام کی آرزوؤں کا پرچم چشمِ بصیرت کے
سامنے لہرانے لگا۔ پھر کیا تھا!

آئی ہوائے عنبریں سانسیں لیے ہوئے :

دریچہ کے مصنف محمد فیروز شاہ نے اپنی مخصوص زبان سے معزز مہمانوں کو اپنی

مسندوں پر تشریف لانے کے لیے دعوت دی اور اسٹیج اسلم ظفر سنبل کے حوالے کردیا۔

تلاوتِ کلامِ پاک کے لیے جناب پروفیسر غلام حیدر تشریف لائے۔ نعت رسول مقبولؐ کے لیے تین نوخیز طالب علم اسٹیج پر آئے۔ خطبہ استقبالیہ جناب سید انجم جعفری نے پیش کیا۔ مقالہ افتتاحیہ جناب فیروز شاہ نے پڑھا۔ جناب نعمان انصاری نے نظم پڑھی۔

ایک شاعر اور ایک مقالہ نگار، یکے بعد دیگرے تشریف لاکر سامعین کو مستفید فرماتے رہے۔ فریداللہ ناصر، ظفر اقبال خان نیازی نے نظمیں پڑھیں، جناب پروفیسر اقبال حسین کاظمی نے مضمون پڑھا۔ پھر راقم الحروف کو اسٹیج پر حاضر ہونے کی دعوت دی گئی۔

خاکسار نے ایک نظم بعنوان "اردو" پڑھی۔ یہ نظم فریم شدہ تھی جو بعد میں صدر نشین کی خدمت میں پیش کی گئی تاکہ اسے صدر نشین کی مسند عالیہ کے عقب میں دیوار پر آویزاں کیا جا سکے۔ جناب ڈاکٹر غلام سرور خان، جناب ڈاکٹر بشیر سیفی، جناب عطش درانی نے مقالات پڑھے۔

صدر تحریک نے صدارتی کلمات کہے۔

عزت مآب جناب ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے اپنا فکر انگیز خطاب فرمایا۔ تمام سامعین اپنی نشستوں پر نہایت اطمینان سے بیٹھ کر خطاب سے محفوظ و مستفید ہوتے رہے۔ اصلاحِ فکر و عمل کا خطاب اختتام پذیر ہونے کے بعد حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی۔

جناب پیرزادہ سید سردار احمد پی آر۔ او صاحب نے ادارہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے مختلف کتابچوں کے سیٹ حاضرین میں تقسیم کیے۔

اور اسی گہما گہمی میں سامعین خراماں خراماں اپنے گھروں کو چل دیے۔

اردو کا استعمال

وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ نے خیرپور سیشن کورٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا کہ ہمیں پورے ملک میں ہر سطح پر قومی زبان اردو کا استعمال کرکے ایک قوم بن جانا چاہئے۔ قومی زبان اردو کے استعمال کے بارے میں وزیر اعلیٰ کی تلقین اور اپیل بحیثیت القوم ہماری اس بنیادی ضرورت کی نشاندہی کرتی ہے جس کی طرف بانئ قوم سے لیکر آج تک قومی سطح کا ہر اہم رہنما واضح طور پر اشارہ کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں اردو نے ہر سطح پر نمایاں اپنی استعداد اور صلاحیت کا لوہا منوا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس زبان میں دور جدید کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ طورخم سے لیکر کراچی تک اور کوہ تفتان سے لیکر واہگے تک پاکستان کے ہر حصہ میں بسنے والے زن و مرد اور پیر و جواں یکساں طور پر اردو کے والا و شیدا نظر آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ اس زبان کو اپنی متاع عزیز سمجھ کر اس کی حفاظت اور سرپرستی کرتے نظر آتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آچکا ہے جو پاکستان کے عام آدمی سے بلند اور جداگانہ حیثیت منوانے کیلئے انگریزی کو حرز جاں بنائے ہوئے ہے۔ اب عوام کی جانب سے اردو کی غیر مشروط حمایت کے علی الرغم امور مملکت میں اپنے بے پناہ اثر و رسوخ کی بناء پر اردو کو ایک کم مایہ، تہی دامن اور نامکمل زبان ثابت کرکے اسے اس کے صحیح مقام سے محروم رکھنے میں کامیاب چلا آرہا ہے۔ حقائق و حالات کے اس تناظر میں جب وزیر اعلیٰ سندھ، اور اسی طرح صدر مملکت اور وزیر اعظم کی اس تلقین و ہدایت کا جائزہ لیا جائے جو یہ اصحاب اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں تو اس پر سوائے کف افسوس ملنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ کسی کام میں زبردستی یقیناً درست نہیں ہوتی لیکن اردو کے نفاذ میں کسی حتمی اقدام کو زبردستی اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس ملک کے نو کروڑ عوام کی غالب ترین اکثریت کی دلی و دیرینہ خواہش ہے۔ اور اگر جمہوری اصولوں کے مطابق .... انچاس کے مقابلہ میں اکیاون افراد کی رائے پر عملدرآمد زبردستی نہیں تو ایک کے مقابلہ میں ننانوے کی خواہشات کا احترام تو جمہوریت کی اعلیٰ ترین مثال قرار پا سکتا ہے۔ بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ ایسے کام اپیلوں سے نہیں ہوا کرتے اور پاکستان میں تو انگریزی کا دلدادہ مراعات یافتہ طبقہ قیامت تک عوام الناس کی زبان اختیار کرکے اپنے خود ساختہ بلند مقام سے اترنا پسند نہیں کرے گا۔

جنگ کراچی ۸ جون ۸۷ء

آج کی تقریبیں

● ۔۔۔ مشہور شاعر رفعت سلطان کے شعری مجموعہ "آفاق" کی تعارفی تقریب کا اہتمام آج ۲۴ ۔۔۔ تقریب کی صدارت پروفیسر پریشان خٹک چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کریں گے جبکہ ڈاکٹر وحید قریشی چیئرمین مقتدرہ قومی زبان، اور میاں نذیر اظہر ڈائریکٹر جنرل کمیونیکیشن، تقریب کے مہمان خصوصی ہوں گے۔ تقریب سے اظہار خیال کے لئے پروفیسر مرزا حامد بیگ، پروفیسر احسان اکبر، سلطان رشک، پروفیسر شریف کنجاہی، سید عارف، بشارت علی سید، محترمہ زینت فاطمہ، نسیم یاور اور علی اصغر شمر کو دعوت دی گئی ہے۔ اجلاس کے معروف موسیقار ۔۔۔ کلام رفعت پیش کریں گے

● فصلات خریف کی پیداوار بڑھانے کے بارے میں زرعی ضلع اٹک کا ایک روزہ تربیتی کورس زیر صدارت عبداللطیف ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت راولپنڈی ریجن راولپنڈی ۱۱ جون ۱۹۸۷ء کو بوقت ۹ بجے صبح زراعت فارم اٹک پر منعقد ہو رہا ہے

نوائے وقت پنڈی ۱۰ جون ۸۷ء

ذریعہ تعلیم انگریزی میں تبدیل کرنے پر تشویش

ایبٹ آباد (نمائندہ پکار) انجمن طلبا اسلام ہزارہ ڈویژن کے ناظم عطاء الرحمن اور ضلع ایبٹ آباد کے ناظم شاہد مصطفے ایبٹ آباد شہر کے سابق ناظم اور سرائے صالح ونگ کے طالب علم رہنما طاہر منور اعوان ایبٹ آباد کے ناظم خورشید رباد اور حویلیاں کالج کے ناظم ماجد خان نے ایک مشترکہ بیان میں فیڈرل بورڈ کے زیر اہتمام چلنے والے سکولوں میں ذریعہ تعلیم بدوم اردو سے انگریزی میں تبدیل کرنے پر شدید احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے غریب والدین پر شدید بوجھ پڑا ہے کیونکہ اس سے پہلے فیڈرل بورڈ نے انگریزی سے ذریعہ تعلیم اردو میں تبدیل کیا تھا جس کے تحت نویں جماعت تک طلبا تمام مضامین اردو میں پڑھ رہے تھے اور علم حساب سائنس اور دوسرے مضامین کو انگریزی میں تبدیل کرنے سے اور یونیفارم نظام تعلیم کو گورنمنٹ سکولوں میں تبدیل کرنے سے طلبا اور ان کے والدین کو شدید پریشانی کا سامنا ہے۔

روزنامہ پکار اسلام آباد ۱۷ مئی ۸۷ء

عطش درّانی

قومی یک جہتی اور نفاذِ اُردو

فرمان خداوندی ہے " اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو"۔ بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم سب اللہ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اردو کے بارے میں کہا کہ یہ ہماری قومی زبان ہے اپنے دساتیر میں اس بات کا واضح اعتراف کرتے رہے لیکن اس کے نفاذ کے سلسلے میں ہم لیت و لعل سے کام لیتے رہے ہیں اور اس اقدام کو ٹلاتے جا رہے ہیں یعنی ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور یوں ہم اللہ کے نافرمان ٹھہرتے ہیں۔

جہاں تک قومی یک جہتی میں اردو کے کردار کا تعلق ہے، بادی النظر میں اس کے چار پہلو ہیں :۔

۱۔ زبان قومی ہوگی۔

۲۔ زبان معاشرتی اور ثقافتی رابطوں کی ہوگی۔

۳۔ زبان علمی اور تعلیمی ہوگی

۴۔ زبان دفتری ہوگی۔

اگر کوئی زبان ہر چار مقاصد پورے کرتی ہوگی تو وہ قوم کو متحد اور یک جا رکھ سکے گی، وہ قومی یک جہتی میں اپنا کردار ادا کر سکے گی۔

آیئے! اردو کے حوالے سے ہم علی الترتیب ان چاروں مقاصد کا جائزہ لیں کہ اردو انھیں کہاں تک پورا کرتی ہے۔

اردو کی پہلی حیثیت بطور قومی زبان کی ہے۔ یہ حیثیت کسی بھی بحث اور مناظرے کی محتاج نہیں ہے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے تحریک پاکستان میں اسلام کے بعد اردو کو جو حیثیت حاصل تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس کے بارے میں قائداعظم نے بھی بڑے واضح الفاظ میں فرما دیا تھا اور ہمارے آئین میں بھی اردو کو قومی زبان ٹھہرایا گیا ہے اور کچھ نہیں تو ہم کم از کم آئین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے چنانچہ اس حیثیت پر بحث کا باب ہمیں بند کر دینا چاہیے کہ جہاں تک دوسرے عنصر کا تعلق ہے کہ قومی زبان کو ثقافتی اور سماجی رابطے کی زبان ہونا چاہیئے اردو ہمارا یہ تقاضا بھی پورا کرتی ہے کسی پاکستانی کو اگر پاکستان کے کسی صوبے، کسی علاقے میں جانا پڑتا ہے تو اسے اپنے رابطے اور ابلاغ و تفہیم کے لیے جس زبان سے واسطہ پڑتا ہے، وہ اردو ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک پاکستانی متعدد زبانوں پنجابی، ہندکو، سرائیکی، بلتی، شینا، چترالی، کشمیری، پشتو، براہوی، سندھی جیسی زبانوں پر ایک ساتھ عبور نہیں رکھ سکتا۔ ان تمام زبانوں کے امتزاج سے جو زبان بنتی ہے، وہی رابطے کی زبان ٹھہر سکتی ہے۔ اس آمیزے میں ان زبانوں کا تناسب کم و بیش ہو سکتا ہے اسے آپ کوئی بھی نام دے لیں۔ سماجی اور ثقافتی رابطے کی زبان ایک ہی ہو سکتی ہے۔ کثرت میں وحدت رکھنے والی اس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں۔

ہم اس اردو کی بات کرتے ہیں جو کوہاٹ کا پٹھان، بلتستان کا بلتی اور کراچی کا مارواڑی بولتا ہے۔ رابطے کی زبان کے لیے ہمیں ادبی شستگی اور لسانی و قواعدی صحت درکار نہیں، ابلاغ درکار رہے اور اردو میں اتنی لچک ہے کہ مختلف علاقائی لہجے رکھنے والے اسے جتنا چاہیں توڑ مروڑ لیں، یہ اردو ہی رہتی ہے۔ چنانچہ جب ہمارے پاس ان تمام زبانوں کا مرکب، ایک خوبصورت گلدستہ اردو کی صورت میں موجود ہے جسے ہم دکانوں پر سودا لینے کے لیے، بسوں میں سفر کرتے وقت، دوسرے علاقوں میں اور دیگر روزمرہ گفت گو میں استعمال کرتے ہیں تو یقیناً اردو کی اس دوسری حیثیت پر مہر ثبت کرتے ہیں کہ Urdu is our lingua Franca

اس باب میں بھی اب ہمارے پاس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تیسرا عنصر تعلیمی اور علمی زبان کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی ایسی زبان ہے کہ اگر ہم نے اس کی کھڑکی بند کر دی تو ترقی یافتہ قوموں کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔

اب تو وہ ممالک جن کی اپنی زبان انگریزی ہے، ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہنے لگے ہیں، صرف اس بنا پر کہ ان کی زبان انگریزی ہے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ یونیسکو کو زبان کا سب سے بڑا یہ مسئلہ درپیش ہے کہ عالمی زبان کون سی ہو۔ انگریزی اپنا کردار ادا کر چکی، بالکل اسی طرح جیسے لاطینی نے ادا کیا تھا۔ اب دوسری زبانوں نے انگریزی کی جگہ لینی شروع کر دی ہے۔ ان میں جاپانی اور روسی سرفہرست ہیں۔ فرانسیسی اور جرمن بھی اسی دوڑ میں شامل ہیں۔ ان زبانوں نے انگریزی کو پچھاڑ دیا ہے۔ اس وقت بچاس فی صد علمی سرمایہ انگریزی کی دسترس سے نکل چکا ہے یہ دوسری زبانوں میں موجود ہے اسے انگریزی کی گرفت میں رکھنے کے لیے یعنی ترجمہ کرنے کے لیے امریکہ برطانیہ اور دیگر انگریزی ممالک نے بڑے بڑے دارالترجمے قائم کر رکھے ہیں۔ نیدرلینڈ میں ایک بہت بڑا عالمی مرکزِ ترجمہ قائم ہے پھر بھی یہ ممالک اس غیر انگریزی علمی سرمائے سے چار پانچ سال پیچھے ہوتے ہیں اسے انگریزی میں منتقل کرنے میں بھی خاصا وقت لگ جاتا ہے جو فرمائشیں ان دارالترجموں کو آتی ہیں ان کا بھی صرف ایک چوتھائی پورا ہو پاتا ہے۔ یعنی غیر انگریزی مواد کا صرف ۲۵ فی صد۔ انجینئری اور کیمیا کے میدان میں جاپانی، روسی اور چینی زبانیں بہت آگے ہیں۔ ٹیکنالوجی اور تجارتی زبان میں جاپانی سب سے آگے ہے تو کیا علم کی کھڑکی کھولنے کے لیے ہمیں صرف انگریزی کا سہارا کافی ہوگا؟ سوچنے کی بات ہے کہ ہم جاپانی، روسی، چینی، جرمن، فرانسیسی کھڑکیاں کیوں نہ کھولیں؟ انگریزی بھی ان کے ساتھ بہت سی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی ہے۔ لیکن یہ صرف ان لوگوں کے لیے درکار ہے جنھوں نے اعلیٰ علمی منازل طے کرنا ہیں۔ پوری قوم کو انگریزی کے لیے کیوں باندھ دیا جائے۔ صرف جسے علمی دنیا میں آگے بڑھنا ہے اسے علم کا براہ راست ذریعہ سمجھایا جائے۔ وہ جاپانی اور چینی علوم انگریزی کے واسطے سے کیوں سیکھے۔ آپ اسے جاپانی سکھائیے، فرانسیسی سکھائیے، جرمن پڑھائیے۔ صرف جاپان کی مثال لے لیجیے۔ ہمارے ان کے ساتھ ٹیکنالوجی اور تجارتی رابطے ہیں مگر تعلق اردو اور جاپانی کے واسطے سے نہیں، انگریزی کے واسطے سے ہے۔ موٹر گاڑیاں بنانے کے کارخانے ہم ان کے تعاون سے لگا رہے ہیں لیکن جاپانی زبان کی تدریس سرے سے ہے ہی نہیں۔

عالمی زبان کی صورت حال کا جو مسئلہ یونیسکو کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر وہ کون سی زبان ہے، جو عالمی تقاضے پورے کرے اور ان مسائل سے ہمیں نکال لے۔ تمام رائج الوقت زبانوں سے مایوس ہو کر ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہے، ایک ہی زبان ہے اور یہ زبان کسی علاقے، انجمن یا ملک کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہے ترجمے کی زبان۔ زیادہ آسانی کے لیے ہم اسے "میکانکی زبان" کہہ سکتے ہیں یہ کمپیوٹر کی زبان ہے، ترجمہ کرنے والے کمپیوٹر کی زبان۔ یونیسکو کی رپورٹ موجود ہے کہ "میکانکی ترجمہ ہی اب بین الاقوامی زبان ہوگا۔" گویا اگر کسی ملک کو آگے بڑھنا ہے تو اسے دارالترجمے قائم کرنے پڑیں گے۔ ترجمہ اب میکانکی ہوتا جا رہا ہے مترجم کمپیوٹر سامنے آ چکے ہیں اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے، وہ ضرور ہی کسی عالمی زبان کو اختیار کریں۔ صرف چند افراد اور کمپیوٹر ترجمے کے لیے وقف کر دیجیے۔ ان زبانوں کے علمی سرمایے کا نچوڑ اپنی زبان میں آ جائے گا۔ آپ شوق سے اسے استعمال کریں اور تخلیق کی کھیتیوں کی آبیاری کریں۔

اب رہا چوتھا مسئلہ سرکاری اور دفتری زبان ہونے کا۔ یہی ایک پہلو ہے جس پر ہم سوچ سکتے ہیں اس پر بحث کر سکتے ہیں اس کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جناب ہم اسے دفتری زبان کیسے بنائیں، اس میں تو ابھی تک بہت سے محاورے نہیں ہیں، بہت گھسے گھسائے، پٹے پٹائے وہ الفاظ وہ جملے، وہ ترکیبیں نہیں جو صاحب بہادر اپنے سے بڑے صاحب بہادر کی پرانی فائل سے نکال کر من و عن نقل کر کے دفتری کارروائی کے لیے چلایا کرتے تھے اور یہ "سرکاری دفتری نوٹ" صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ انگریزوں نے ہمیں اس پٹڑی پر لگایا اور ہمارے دفتری معاون اسے رٹتے رہے اور صاحبوں کے سامنے 'سرکاری دفتری نوٹ' کی صورت میں پیش کرتے رہے۔

بریگیڈیئر گلزار احمد صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں ایک جگہ دفتر میں گیا تو ایک صاحب پریشانی کے عالم میں پرانی فائلوں کی جلدی جلدی ورق گردانی کر رہے تھے۔ یہ داخل ہوئے تو پوچھا 'گلزار یار وہ فلاں موضوع پر تمہارا ایک نوٹ تھا، وہ کس فائل میں ملے گا، میں بھی ایسے ہی ایک موضوع پر نوٹ لکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارا نوٹ اس معاملے کے لیے سب سے موزوں ہے، اس سے بہتر نوٹ نہیں لکھا جا سکتا۔"

ہمارے افسران جو انگریزی ذریعہ تعلیم سے پڑھ کر آتے ہیں، انتظامی تربیتی اداروں میں انگریزی کورس مکمل کرتے ہیں اور صاحب بہادروں کے ساتھ کھانے کی میز سے لے کر ٹینس کے میدانوں تک انگریزی کا سیلاب رواں ہوتا ہے،

ان کی حالت دفتری انگریزی میں یہ ہوتی ہے، جس کا ذکر بریگیڈیئر صاحب نے کیا ہے۔

مقتدرہ نے تو ان اعتراضات کا بھی جواب دے دیا ہے۔ مجلس زبان دفتری نے سب سے پہلے دفتری اردو کی لغت مرتب کر دی تھی جس کی معیار بندی مقتدرہ نے کر دی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ انگریزی محاوروں کی لغت بھی شائع کر دی ہے۔ دفتری خط و کتابت کے نمونے پیش کر دیے ہیں جو کئی جلدوں میں موجود ہیں۔ پچھلے تین برسوں میں ساڑھے تین لاکھ اصطلاحیں شائع کی ہیں۔

اگر اسی رفتار سے کام ہوتا رہا تو اگلے دس بیس برس میں انگریزی تو کیا کوئی میکانکی زبان بھی اردو کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ دفتری اور سرکاری زبان کے سلسلے میں جہاں تک اعتراضات کا تعلق ہے، مقتدرہ نے ان سب کا جواب دیا ہے۔ اب اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسئلہ صرف نیتوں کا ہے۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ دفتری سرکاری زبان کے سلسلے میں مسئلہ صرف نیتوں کا ہے۔ ہماری نیتیں ہمارے اعمال کے مطابق نہیں ہیں ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اللہ ہمیں اپنی نیتیں درست کرنے اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

کردار کی تشکیل اور تعلیم

ارباب اقتدار کی زبان سے اکثر تعلیم و تعلم کے حوالے سے تشکیل کردار کی باتیں سننے میں آتی رہتی ہیں اور اس سلسلہ کا تازہ ترین بیان ہاؤسنگ و تعمیرات کے وفاقی وزیر حاجی حنیف طیب کے ارشاد طلبہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی تعلیم کسی کام کی نہیں جو انسان کے کردار کی صحیح خطوط پر تشکیل و تعمیر کا کام نہ دے سکے۔ طلبہ کے کردار میں تعلیم سے بڑھ کر سیاست بازی کشاکش حتیٰ کہ مسلح تصادم اور قتل و خون جیسے تشویشناک رجحانات کے عملی شواہد ہماری درسگاہوں میں ایک عرصہ سے دیکھے جا رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طلبہ کے کردار کی تشکیل کے ذمہ دار افراد اور ادارے تاحال اس مسئلے کا کوئی شافی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مسلمان معاشرہ کا فرد ہونے کی حیثیت سے یہ بات پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر ہم اپنے طلبہ کو صحیح اسلامی خطوط پر تربیت دینے کا سامان کر سکیں تو کم از کم اس کے مستقبل کے بارے میں ہماری پریشانیاں ضرور ختم ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایسے کام چونکہ محض زبانی وعظ و نصیحت سے انجام نہیں پا سکتے بلکہ انکے لئے عملی مثالیں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اسلئے ہمیں اب تک اپنے طلبہ کو صحیح خطوط پر تربیت دینے میں بھی کامیابی نہیں ہو سکی۔ کہنے کو تو اس سلسلہ میں والدین اور اساتذہ کا کردار سب سے زیادہ اہم قرار پاتا ہے لیکن ایک قابل لحاظ حد تک طلبہ کے کردار کی تشکیل میں ارباب اقتدار کی زندگی بھی بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر یہ لوگ اختیارات کے صحیح استعمال، عمل غیر جانبداری، بے لوث فرض شناسی، دیانت، سادگی اور کفایت شعاری جیسی اسلامی اقدار کے عملی نمونے بن کر طلبہ کے سامنے آئیں تو انکی زندگیوں میں لاشعوری طور پر ایک ایسا خاموش انقلاب جگہ پا سکتا ہے جس کی اکثر ہمارے ارباب اقتدار تمنا کرتے نظر آتے ہیں۔

جنگ کراچی ۲۰ اپریل ۸۷ء

اردو کمنٹری پروڈیوسروں سے کروائی جائے گی

ریڈیو پاکستان کا فیصلہ

کراچی (نمائندہ جنگ) معلوم ہوا ہے کہ ریڈیو پاکستان کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی ہدایت پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کرکٹ ٹیم کے دورہ انگلینڈ کے موقع پر کمنٹیٹروں کی بجائے اردو کمنٹری ان پروڈیوسروں سے کروائی جائے جو ٹیسٹ میچ لائن چیک کرتے اور کمنٹری کے معیاری نگرانی کے لئے کمنٹیٹروں کے ساتھ جاتے ہیں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اردو کمنٹری کے لئے پروڈیوسروں کا نہ تو کرکٹ کو جاننا ضروری ہے اور نہ ہی کمنٹری کے کسی تجربے کی قید رکھی گئی ہے اس قسم کا ایک تجربہ ریڈیو پاکستان حال ہی میں شارجہ کپ میں بھی کر چکا ہے جس کے خلاف قومی اخبارات میں شدید ردعمل ظاہر ہوا تھا کرکٹ شائقین نے ریڈیو پاکستان کے اس فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

جنگ لاہور ۲۵ اپریل ۸۷ء

سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا جائے

راولپنڈی ۱۳ مارچ (نیوز ڈیسک) پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن یونین (سی بی اے) کے مرکزی ڈپٹی سیکرٹری جنرل ممتاز احمد نے ایک بیان میں کہا ہے کہ پے کمیشن نے تنخواہ دار طبقے کے لیے مراعات دینے کی جو سفارشات مرتب کی ہیں وہ سرکاری ملازمین کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ یہ سفارشات سرکاری طور پر شائع نہیں کی گئی ہیں تاہم پے کمیشن کے حوالے سے ایسی خبریں آ رہی ہیں جو تنخواہ دار طبقے میں بے چینی کا باعث ہیں کیونکہ ان کی سفارشات کے مطابق جو سکیل مرتب کیے گئے ہیں ان سے گریڈ نمبرا تا گریڈ نمبر ۱۵ تک کے ملازمین کی تنخواہوں میں تہائی فیصد اضافہ ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ تنخواہ دار طبقے کی معاشی بدحالی کا حل تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافے کے ساتھ مارکیٹ میں گرانی کے رجحانات پر مکمل کنٹرول میں مضمر ہے انہوں نے کہا کہ تجویز کردہ سکیلز میں سالانہ ترقی کی شرح خاصی کم رکھی گئی ہے اور ہر سکیل کو ۲۰ سال کے عرصے کے لیے مقرر کیا گیا ہے جبکہ آخری سکیلوں میں عرصہ ۸ سال تک رکھا گیا ہے انہوں نے کہا کہ گریڈ نمبرا تا ۱۵ تک کے ملازمین سے امتیازی سلوک ملازمین میں بے اطمینانی کا باعث بنے گا۔ انہوں نے وزیراعظم پاکستان سے اپیل کی کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا جائے تاکہ یہ طبقہ بھی سکھ سے گزارا کر سکے۔

نوائے وقت پنڈی ۱۴ اپریل ۸۷

لاہور کا مطالبات کا دورہ راولپنڈی

اسلام آباد واشافہ رپورٹر) پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ … علوم کی سال دوم کی طالبات کا ایک وفد راولپنڈی اسلام آباد کے مطالعاتی دورے پر آیا ہوا ہے جس کے انچارج پروفیسر … مغیث الدین شیخ ہیں یہ وفد محتسب اعلیٰ کے دفتر، پاکستان ٹیلی ویژن، ریڈیو پاکستان اور مقتدرہ قومی زبان کے دفتر کے علاوہ دوسرے تاریخی مقامات کا دورہ کرے گا۔

روزنامہ پکار اسلام آباد ۱۶ اپریل ۸۷ء

اردو ٹیلی گرام

ایک اطلاع کے مطابق محکمہ ڈاک و تار اب انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ٹیلی گرام بھیجنے کی سہولت کا آغاز کر رہا ہے۔ اگرچہ فی الحال یہ سہولت ملک کے چند بڑے بڑے شہروں کے لئے فراہم کی جائے گی لیکن اس کے دائرہ کار میں مزید وسعت کا بھی امکان ہے۔ ٹیلیگرام جیسی بنیادی ضرورت کے لئے اپنی قومی زبان کے استعمال کی سہولت ہمارے ملک کے عام شہریوں کا ایک دیرینہ مطالبہ رہا ہے ماضی میں بھی بعض موقعوں پر اردو میں ٹیلیگرام بھیجنے کی سہولت دینے کے اشارے کئے جاتے رہے ہیں لیکن اس پر عمل کی نوبت ابھی تک نہیں آ سکی۔ ہمارے خیال میں اب جبکہ بہت سے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اردو کی باقاعدہ ترویج کا کام ہو رہا ہے اردو میں ٹیلیگرام بھیجنے کا کام بھی اب شروع کر دینا چاہئے کیونکہ ضروری مشینری اور آلات کی تیاری کے بعد اب اس اہم عوامی خدمت کو مزید معرض التواء میں ڈالے رکھنا کسی بھی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اردو میں ٹیلیگرام کی سہولت فراہم کر دینے سے محکمہ ڈاک کی آمدنی میں اضافہ بھی یقینی نظر آتا ہے۔

جنگ لاہور ۲۳ اپریل ۸۷ء

پروفیسر ڈاکٹر غلام سرور خان نیازی

قومی یکجہتی اور اردو

ہم مسلمانوں کی، ہم پاکستانیوں کی۔

اردو ہماری قومی زبان ہے — یہ زبان ہم باہر سے نہیں لائے تھے۔ اسی برصغیر میں پیدا ہوئی۔ پروان چڑھی۔ بہت سی زبانوں کے صدیوں کے باہمی اختلاط نے اسے توانائی بخشی اور سارے ہندوستان میں یہ رابطہ کی زبان بن گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ اردو اور مسلمان لازم و ملزوم بن کر رہ گئے۔

اس زبان کا اصل ڈھانچہ ہندی الاصل تھا۔ بے شمار ہندو مصنفین نے اردو میں کتب تصنیف کی تھیں۔ پورے ملک میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی اور مغل دربار کی زبان فارسی کے برعکس عوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ لیکن انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوؤں نے اردو کی مخالفت شروع کر دی اور اردو کی بجائے ہندی کو رائج کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس دشمنی کا سبب فرانسیسی مستشرق گارساں نے اس طرح بیان کیا ہے ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔

دوراندیش برطانوی جو مسلمانوں کو ازلی باغی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس تحریک کی سرپرستی کرنا شروع کر دی Divid and rule تقسیم کرو اور حکومت کرو، کی پالیسی رکھنے والے ان حکمرانوں کو یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں مشترکہ زبان ان دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب نہ کر دے اور آج کل بھی پاکستان کے بعض حصوں میں بعض لوگ اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ نہ ایک قومی مشترکہ زبان ہوگی اور نہ یہ سب اکٹھے ہو سکیں گے۔ انگریز بیوروکریسی جن میں اکثریت مسلم دشمنی کے جذبات رکھتی تھی۔ اس تحریک کی سرپرست بن بیٹھی۔

سرسید نے ان کوششوں کو تشویش کی نظر سے دیکھا۔ اس تنازعہ نے واضح کر دیا کہ اس ملک میں بسنے والی دونوں قوموں کی مستقبل کی راہیں الگ الگ ہیں۔ نیز اسی تنازعہ کے سلسلے میں مسلمانوں کو اپنی سیاسی تنظیم کے قیام کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن وسیع تر اور مضبوط تر بنیادوں پر ایک سیاسی تنظیم کی شدید ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ جو بالآخر آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے پوری ہوئی۔ مسلمانوں پر یہ بات واضح تھی کہ ہندوؤں کو اردو سے کوئی دشمنی نہیں۔ اصل دشمنی مسلمانوں سے ہے۔ جن کی حکومت میں اردو زبان کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس تنازعہ نے ہی مسلمانوں کو اپنی مدافعت کے لیے تیار کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو معلوم تھا کہ اگر مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر نقصان پہنچانا ہے تو اردو کو نقصان پہنچاؤ اور ان کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اس پر آل انڈیا مسلم لیگ اردو کے دفاع کے لیے سینہ سپر ہو گئی اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ، مسلمان، اردو اور تحریک پاکستان ایک ہی سلسلے کی کڑیاں بن گئے۔

۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت فروری، مارچ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں انتخابات منعقد ہوئے۔ جن میں مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے حصہ لیا۔ دونوں کے منشور میں کوئی فرق خاص نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اشتراک کے اشارے بھی دیے تھے۔ لیکن باہمی تعاون پیدا نہ ہو سکا۔ اختلاف صرف دو امور پر تھا یعنی منشور کی شق نمبر ۲، اور ۱۱ پر۔ ایک میں مسلم لیگ نے جداگانہ انتخابات کی حمایت کی تھی اور دوسرے میں اردو اور اس کے رسم الخط کے تحفظ اور فروغ کے لیے اقدامات کرنے کا وعدہ۔

جداگانہ انتخاب ایسا مسئلہ تھا کہ کانگرس ایک دفعہ پہلے بھی مان چکی تھی اور اس میں ہندوؤں کو کوئی خاص سیاسی نقصان بھی نہیں تھا۔ اختلافی مسئلہ صرف اردو تھا کیونکہ کانگرس نے اردو زبان کے بارے میں کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ واضح ہے کہ پاکستان میں کانگرس کے پرانے

ست گارا بھی تک اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

کانگرسی وزارتوں کے رام راج میں مسلم آزاد پالیسی (جس کا سب سے زیادہ انہوں نے اردو پر ہی لگایا) مطالبہ پاکستان کی فوری محرک ثابت ہوئی۔ کانگرسی کی یہ زحمت مسلمانوں کی قومی زندگی کی بقا کے لیے رحمت ثابت ہوئی اور وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

اب بفضل خدا پاکستان بن گیا ہے اور وہ اردو بھی پاکستان میں آگئی ہے جسے نوں کی مذہبی زبان کہا جاتا ہے اور جو بقول مسٹر گاندھی قرآنی رسم الخط میں لکھی ہے اور جو مسلمانوں کی صدیوں کی دینی، روحانی، علمی و ادبی ورثے کی امین ہے۔

بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی بھی ایک لشکری زبان ہے۔ زبان نہیں بنی ہے اور حد تو یہ ہے کہ پاکستان کی کئی مقامی زبانوں کو بھی اس اپنی بقا کا خدشہ پیدا ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ دنیا کی واحد زبان ہے جس کی قوت انجذاب کا کوئی ثانی نہیں اور جو کبھی کسی مقامی زبان کے باعث خطرہ نہیں بنی۔ یہ مقامی زبانوں کی حلیف تو ہے حریف نہیں۔ آپ اپنی قومی زبان کو ترقی دیں۔ ان پر فخر کریں۔ یہ آپ کا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن خدارا اردو کو اس کے اس مقام سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں ورنہ ہم سب اپنے مرکز ثقل سے ہٹ کر رہ جائیں گے۔

آج کل اپنے ملک میں کچھ لوگ اردو دوست ہیں اور کچھ اردو دوست نہیں ہیں۔ چند لوگ بزعم خود اہل زبان بن بیٹھے ہیں اور کچھ فرزندان وطن، حالانکہ ہم سب اہل زبان ہیں اور سب ہی فرزندان وطن۔

اگر ہم اردو کی طرح اپنے دامن کو وسیع کر لیں اور ہر لہجہ اور ہر تلفظ کو اپنے میں سموتے جائیں۔ تو سب سکھی رہیں گے اور ہم سب کی ملی جلی کوششوں سے وطن عزیز کو ترقی بھی ملے گی اور شادمانی بھی نصیب ہوگی۔ یہ ہمارے اتحاد کی علامت ہے اور انشاءاللہ یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گی۔

اسکولوں میں دو متوازی ذرائع تعلیم سے عوام دو طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے

ملکی زبان بطور ذریعہ تعلیم اپنانے سے تخلیقی خیالات کی نشوونما نہیں ہوتی: پروفیسر زبیری

کراچی ۲۷ اپریل (اپ پ) سوسائٹی آف ایکسیلینس [illegible] ایگزیکٹیو کا ایک اجلاس آج یہاں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر [illegible] اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں ذریعہ تعلیم [illegible]

انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مختلف اسکولوں میں انگریزی اور اردو ذریعہ تعلیم ہونے کے سبب عوام کے دو طبقات پیدا ہو جائیں گے جس سے ملک میں [illegible] پروفیسر [illegible] زبیری [illegible] ذریعہ تعلیم کے بارے میں [illegible] پروفیسر زبیری نے کہا کسی دوسری زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اپنانے سے تخلیقی خیالات کی نشوونما نہیں ہوتی اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ جاپان، چین اور دوسرے یورپین ممالک میں مقامی زبانوں میں تعلیم اپنانے سے نئے خیالات کی ترویج ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی رو سے ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء تک اردو ملک کی دفتری زبان قرار پانی تھی چند نیشنلسٹ علماء نے کہا کہ انگریزی کی ٹیکنیکل اصطلاحات کے باوجود اردو ذریعہ تعلیم کو استعمال کیا جا سکتا ہے مقررین نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ جاپان اور چین میں آج بھی سکالرز اور سائنسدان ترجمے سے سمجھنے کے بجائے انگریزی کتابوں کے مطالعے کی استعداد بڑھا رہے ہیں اس اجلاس میں پروفیسر زکریا ساجد بیگم حمید جہاں [illegible] انصاری، قیوم خان، پروفیسر ذوالفقار [illegible] اور افضل احمد نے بھی شرکت کی۔

نوائے وقت کراچی ۲۸ اپریل ۸۷ء

درسی کتب کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے گا

[illegible]

اسلام آباد (نامہ نگار) اسلام آباد آرٹس اینڈ ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام فیڈرل گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر ۲ اسلام آباد میں ایک تقریب ہوئی جس میں ضلع اسلام آباد کے مختلف سکولوں کے تقریباً چار سو طلباء و طالبات میں درسی کتب مفت تقسیم کی گئیں [illegible] مہمان خصوصی وفاقی سیکرٹری برائے تعلیم سید احمد قریشی تھے صدارت حاجی محمد اسحاق صنی نے کی سوسائٹی کے صدر سیف اللہ تارا نے استقبالیہ پیش کیا سوسائٹی کے سیکرٹری جنرل صوفی محمد نواز نے سوسائٹی کی [illegible] کراچی کی ہائی سکول [illegible] کی طالبات نے [illegible] پیش کیے [illegible] سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایسے نیک کاموں میں دل کھول کر تعاون کریں انہوں نے کہا کہ بعض درسی کتب مارکیٹ میں نہ ملنے کی وجہ سے طالب علموں اور ان کے والدین کو بہت پریشانی ہوتی ہے انہوں نے محکمہ تعلیم سے اپیل کی کہ درسی کتب کی ترسیل کو یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدامات کئے جائیں مہمان خصوصی نے سوسائٹی کے اس نیک مقصد کو سراہتے ہوئے محکمہ تعلیم کی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلایا انہوں نے کہا کہ سوسائٹی کا یہ اقدام وزیراعظم کے پانچ نکاتی پروگرام کے تحت تعلیم عام کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے انہوں نے یقین دلایا کہ آئندہ سال مارکیٹ میں درسی کتب کی فراہمی عام کرنے کیلئے مناسب اقدامات [illegible]

National language

One can hardly disagree with Mr. Sultan Ahmad Chowdhry (P.T 23.5.1987) when he says that we should not give up the study of English after the introduction of Urdu as official language. The teaching of English is essential for acquiring advanced scientific know-how and general knowledge.

If the result of the Intermediate and B.A. examinations held in Pakistan in the last 10 years is analysed, it would be seen that the pass percentage ranges between 30 and 35%. In most of the cases, the cause of failure is the candidates' inability to pass in English. Up to the secondary level, the standard of teaching is low, but at higher secondary and graduation levels it becomes high which most of the students cannot grasp and so they resort to cramming the notes.

To remedy the situation, English may be taught up to the secondary level. But at the higher secondary and graduation stages, it may be taught as a functional language and not as literature. The syllabus may be so drawn as to enable the arts, science and commerce students to understand written and spoken English. English literature may be made an optional subject at these levels for those who want to specialise in it. In this way, good teachers of English language would emerge.

If the teaching of English as functional language is introduced, it would enhance the knowledge of the students and decrease the percentage of failures in B.A. and

محمد فیروز شاہ

وحدتِ پاکستان اور قومی زبان

قوم افرادِ ملت کے نظم و اتحاد سے ترتیب پاتی ہے۔ اس لیے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ یک جہتی قوم کے اجزائے ترکیبی کا اساسی اثاثہ ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم الامت نے کہا تھا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقوام و ملل کی تاریخ اس صداقت کی ناقابلِ تردید شہادت دیتی ہے کہ قوم اپنے افراد کے اتحاد سے ہی زندہ ہوتی ہے جاوداں حیات کی بشارتیں کبھی کسی منتشر تسبیح کے دانوں کو نہیں ملیں۔ آج ہم انتشار و افتراق کی جس بے سمت اور بے جہت آندھی کی لپیٹ میں آتے جا رہے ہیں اس امر کی ضرورت شدید ہو گئی کہ ہم محبت و اخوت، اتحاد اور بھائی چارے کی فضا کو عام کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ دانش ور سوچیں قلم کار لکھیں۔ موسیقار اتحاد کے نغمے الاپیں اور اربابِ فکر و فہم عمل کی فکری رہنمائی کریں آج کی محفل اسی سعی کا ایک عکس ہے۔

ہمیں سوچنا یہ ہے کہ قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جانا چاہیے، میں سمجھتا ہوں ہماری قومی یک جہتی کا بنیادی لازمہ مذہب ہے یہ وہ بنیاد ہے جس پر اتحاد کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے اور یہی وہ قوت ہے جو اہلِ وطن کے سینوں میں محبتوں کے دفینوں کی بازیافت کر سکتی ہے ہم نے الگ وطن اسی لیے تو حاصل کیا تھا۔ ہمارا ملی تشخص اسلام کے حوالے سے ہی تو متعین ہوا ہے۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

سو ہمارے جذبِ باہم کا مرکز و محور مذہب ہے اور پھر ہم میں یک جہتی برقرار رکھنے والا دوسرا اہم عنصر ہے اردو ـــ بلکہ مذہبی حوالے سے بھی اردو کی اہمیت مسلمہ ہے کہ یہ مسلم تہذیب کی امین ہے۔ مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کی محافظ ہے۔ مسلم قومیت کی علامت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا۔

حکیم رشید اشرف ندوی نے مقتدرہ قومی زبان کے کتابچے "قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں" میں اردو اور ملتِ اسلامی کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پاکستان کے ایک نظریاتی ملک ہونے سے مراد یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد ایک مخصوص نظریہ حیات پر ہے اور وہ نظریہ ہے ملتِ اسلامی کا، اخوتِ اسلامی کا اور وحدتِ فکر و نظر ـــ اردو اس نظریے کی تکمیل کرتی ہے اور پوری قوم کو ایک وحدت میں تبدیل کرتی ہے۔"

یوسف جمال انصاری اپنے مضمون "اردو زبان کا مستقبل" (مطبوعہ "نیرنگِ خیال" راولپنڈی اردو کانفرنس ایڈیشن ۱۹۷۵ء) میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا اردو کے ساتھ ایک خاص علاقہ ہے نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہبی لٹریچر عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا ہے بلکہ شاہ عبدالقادر کے زمانے سے تو ہمارا مذہبی لٹریچر اردو میں تخلیق ہو رہا ہے۔"

مذہب کے اس معتبر ترین حوالے کے ساتھ ساتھ ہماری ملی یک جہتی کے فروغ میں اردو کا سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی حوالہ بھی نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کی سیاسی تحریکوں میں تحریکِ پاکستان سب سے اہم سیاسی تحریک تھی اس تحریک کو اردو ادب سے جو زبردست تقویت ملی اس کا واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی اسے پاکستان کی قومی زبان تسلیم کر لیا گیا مسلم لیگ نے ۱۹۰۶ء میں شملہ میں جو یادداشت پیش کی اس میں ایک اہم مطالبہ اردو زبان کے تحفظ کا تھا اس لیے میرا موقف ہے کہ اردو بحیثیت مسلم ہی ہمارا نقطہ اتحاد ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے

کہ تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بھی اردو اہل پاکستان کی یک جہتی کی علامت ہے
میری اس بات کی تشریح ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ الفاظ غالباً زیادہ بہتر انداز میں کرسکیں گے۔

"جس طرح پاکستان کی علاقائی ثقافتوں کے پس پشت پاکستان کی قومی ثقافت کے نقوش واضح ہیں بالکل اسی طرح پاکستان کی علاقائی زبانوں کے پس پشت پاکستان کی قومی زبان یعنی اردو کا لسانی ڈھانچہ اور تہذیبی سرمایہ ایک منضبط اکائی کے طور پر موجود ہے یوں قومی کلچر اور اردو زبان ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں اور ہم چاہیں تو قومی کلچر کو اردو زبان اور اردو زبان کو قومی کلچر کہہ کر پکار سکتے ہیں۔"

("قومی زبان اور قومی کلچر" ڈاکٹر وزیر آغا۔ "نیرنگ خیال" اردو کانفرنس ایڈیشن ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر سلیم فارانی کہتے ہیں:۔

"کسی قوم کا ذہنی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی معیار جانچنا مقصود ہو تو نقاد و مبصر کی نگاہ تنقید اس کی قومی زبان پر ہی پڑتی ہے۔"

(اردو زبان اور اس کی تعلیم)

مذہب، تہذیب اور ثقافت کے آئینوں میں اردو کا عکس دیکھنے کے بعد اب آیئے اس کی لسانی اہمیت کی طرف ـــ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنے مضمون "زبانوں کا عاد اعظم مشترک" میں لکھتے ہیں:۔

"بلوچستان میں رہ کر میں نے دیکھا کہ پشتو، بلوچی، براہوی اور فارسی بولنے والے ملتے ہیں تو اردو ہی بولتے ہیں۔ پھر پاکستان کے مختلف علاقوں میں خالی سڑک پر سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ سڑک اور بجلی کے تار کے ساتھ اردو پھیلتی جا رہی ہے۔ بس اور لاری میں مختلف زبانوں والے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور جب وہ باتیں کرنے لگتے ہیں تو ان کی زبان کسی نہ کسی طرح اردو ہی ہوتی ہے۔"

(نیرنگ خیال اردو کانفرنس)

گویا پاکستان کے مختلف علاقوں میں رابطے کی زبان اردو ٹھہری اور یہی رابطہ قلبی ربط کو جنم دیتا ہے اور دلوں کا تعلق اتحاد اور محبت کا ایسا خوب صورت ماحول پیدا کرتا ہے جہاں ہر طرف روشنی اور خوشیوں کا راج ہوتا ہے۔

یہ ربط و رابطے کی زبان علاقائیت کو ایک وحدت میں پرونے کا فریضہ نہایت سلیقے سے سرانجام دیتی ہے اور یوں اعتبار کا ایک ایسا اٹوٹ رشتہ قائم کرتی ہے جو بقول پروفیسر جیلانی کامران "وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت" کی نشان دہی کرتا ہے۔ (قومی زبان اور علاقائی زبانوں کا رشتہ، مقتدرہ قومی زبان)

اور اس ضمن میں ایک آخری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اردو مذہبی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور لسانی حوالے سے ہمارے اتحاد کی علامت ہے اور اسی لیے ہماری قومی زبان ہے اس کی نشو و نما ہمارے قومی ارتقا کے لیے بے حد ضروری ہے اور اس کی پرورش و پرداخت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی علاقائی زبانوں سے اردو کا رابطہ مضبوط تر کریں۔

اسے اس مٹی کا سنہرا پن اور اس دھرتی کی کشادہ فضاؤں کی تازگی سے کمک پہنچائیں۔ اردو کا رابطہ علاقائی زبانوں سے جس قدر قریبی ہوگا اتنا ہی ہمارے عوام میں اس سے تعلق خاطر زیادہ پیدا ہوگا۔ علاقائی زبانوں کے جتنے زیادہ الفاظ اردو میں شامل ہوں گے۔ ہمارے لوگ اردو سے اتنا ہی زیادہ انس اور اپنائیت محسوس کریں گے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ نہال اردو کی شجر کاری خلا کی بستیوں میں کرنے کی بجائے اس سرزمین، اس خطہ پاک کے لہلہاتے کھیتوں اور شادابی بانٹتی سرسبزیوں کی دھرتی سے اسے غذا دی جائے تاکہ اس کی جڑیں اس پاک سرزمین میں ہوں تبھی اس کی شاخیں عظمتوں، رفعتوں کے افلاک چھو سکیں گی۔

حرف آخر کے طور پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو یک جہتی کے سب سے بڑے وسیلے یعنی مذہب کی علمی متاع کی امین بھی ہے اور مذہب تو ہماری مرکزیت کی ضمانت ہے جیسا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کہا تھا۔

"چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹنا چھوڑ دو۔ سرداروں کی بات رہنے دو اور سرداروں کے سردار ہاشمی سردار کا دامن مضبوطی سے پکڑ لو۔"

یہی بات علامہ اقبال نے یوں فرمائی تھی:۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ڈاکٹر بشیر سیفی

قومی یک جہتی میں اُردو کا کردار

قومی یکجہتی میں اردو کے کردار سے بحث کرتے ہوئے یہ بات مدِنظر رہنی چاہیے کہ قومی یکجہتی کے ضمن میں مذہب، جغرافیہ، تاریخ، ثقافت اور زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو جو چیز ایک لڑی میں پروتی ہے۔ ان میں سب سے اہم مذہب ہے۔ اگرچہ مذہب کے حوالے سے ہمارے رشتے دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں سے بھی قائم ہیں جسے اقبال نے ملّی وحدت کا نام دیا ہے مگر جغرافیائی طور پر ہم اپنے ملّی بھائیوں سے خاصے دُور ہیں جب کہ پاکستانی قوم مذہب کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حوالے سے بھی ایک وحدت ہے۔ قومی یک جہتی کے سلسلے میں مذہب و جغرافیہ کے علاوہ تاریخ و ثقافت اور زبان کا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ ہماری تاریخ کے ایک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ ثقافت میں بھی جزوی اختلافات کے باوجود اشتراک پایا جاتا ہے۔ مختلف صوبوں کے رسم ورواج، رہن سہن کے طریقوں اور لباس میں بظاہر جو فرق نظر آتا ہے اسے ذیلی ثقافت کا اظہار قرار دیا جاسکتا۔ پاکستانی ثقافت دراصل انہی ذیلی ثقافتوں کے اشتراک سے وجود پذیر ہوتی ہے علاقائی ثقافتوں کا اختلاف ویسا ہی ہے جیسا مختلف اسلامی ممالک کے درمیان ہے۔ جس طرح سعودی عرب، بنگلہ دیش اور پاکستان کی زبان، لباس اور رہن سہن کے طریقوں اور رسم ورواج میں بین اختلاف ہے مگر ثقافتی و لسانی اختلاف کے باوجود یہ تینوں ممالک اسلام کے وسیع تر رشتے سے منسلک ہونے کے سبب برادر ممالک ہیں بعینہٖ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان لسانی اختلاف کے باوجود ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں بناوٹ کے جزوی اختلاف کے ساتھ شلوار اور قمیض رائج ہے جو خارجی سطح کی ہم آہنگی کو پیش کرتی ہے۔ رہا لسانی اختلاف تو یہ کس ملک میں نہیں ہوتا۔ ماہرین زبان کا کہنا ہے کہ ہر پچیس میل کے بعد زبان تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں صرف چار بڑی زبانیں ہیں جب کہ بھارت میں ہندی کے علاوہ ۱۳ بڑی زبانیں موجود ہیں بعض ایسے صوبے بھی ہیں جہاں ہندی بالکل نہیں سمجھی جاتی مگر اس کے باوجود ہندی بھارت کی قومی اور سرکاری زبان ہے جب کہ اردو پاکستان کے تمام صوبوں میں کسی نہ کسی حد تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی قومی حیثیت کو تسلیم کرنے سے صوبائی زبانوں پر بھی کوئی آنچ نہیں آتی۔ صوبائی زبانوں کی اہمیت مسلّم ہے اور وہ اپنے صوبوں میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہیں بلکہ اپنا مخصوص ادبی اور تہذیبی پس منظر بھی رکھتی ہیں۔ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو اپنے اپنے علاقوں کی حد تک ہر لحاظ سے فعال اور ترقی پذیر ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام صوبائی زبانیں اپنے اپنے صوبوں کی حدود میں محدود و محصور ہیں۔ بسااوقات صوبوں کے اندر بھی اتنے لسانی تغیرات موجود ہیں کہ ایک شہر کے لوگوں کے لیے دوسرے شہر کی زبان سمجھنا محال ہو جاتا ہے مثال کے طور پر جھنگ پنجاب ہی کا حصہ ہے مگر جھنگ کی پنجابی لاہور کی پنجابی سے اس حد تک مختلف ہے کہ اہلِ لاہور کے لیے اسے سمجھنا دشوار ہے اسی طرح پشاور کی پشتو کوہاٹ کی پشتو سے خاصی مختلف ہے مگر اردو کسی صوبے کی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی کراچی سے پشاور تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے قیام پاکستان سے قبل ہی مسلم لیگ نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اردو ہی واحد زبان تھی جو پاکستان کے تمام صوبوں میں رابطے کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور مسلمانوں کے افکار کی سب سے زیادہ امانت دار بھی تھی۔ اردو اس لیے بھی بین الصوبائی زبان ہے کہ یہ مقامی اور صوبائی زبانوں کے اشتراک ہی سے نمو پذیر ہوئی ہے۔ اردو میں عربی اور فارسی کے علاوہ پنجابی سندھی، پشتو اور بلوچی کے بے شمار الفاظ مستعمل ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو کی جڑیں تمام علاقوں میں پیوست ہیں اور صوبائی زبانوں سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ سرحد، بلوچستان، پنجاب اور سندھ کے لوگ جب ایک صوبے سے دوسرے

ہے میں جاتے ہیں تو مقامی زبان کے بجائے اردو ہی میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے
شش کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا علاقائی زبانوں سے لسانی رشتہ
ا مضبوط ہے ۔ اردو زبان میں مختلف علاقوں کے الفاظ کی موجودگی ہی کے سبب
ہے کہ ماہر لسانیات نے اردو کے آغاز کو اپنے اپنے علاقے سے منسوب کیا
۔ سندھ میں اردو ، پنجاب میں اردو ، دکن میں اردو اور سرحد میں اردو نامی کتابیں
حقیقت کی غماز ہیں کہ اردو کی لسانی تشکیل میں یہ تمام علاقے کسی نہ کسی صورت
شریک رہے ہیں چنانچہ اردو کی ترویج سے علاقائی زبانوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ اس
ت بھی اردو علاقائی زبانوں سے اور علاقائی زبانیں اردو سے متاثر ہو رہی ہیں۔
وجہ ہے کہ ان علاقوں کے لوگ جب دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں تو اردو ہی کو
یعہ اظہار بناتے میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ بنا بریں یہ کہنا غلط نہیں کہ
دو ہی قومی یک جہتی کی آئینہ دار ہے۔ اردو کے سوا کوئی زبان ایسی نہیں جو تمام
بوں کے درمیان رابطے اور اتحاد و سیلہ بن سکے مگر اردو کو علاقائی زبانوں کا
یف نہیں سمجھنا چاہیے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری " اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ
اصل ایک ہی رنگ و نسل ، ایک ہی خون ، ایک ہی آسمان ایک ہی زمین ، ایک
انداز فکر ، اور ایک ہی طرز ادا کا رشتہ ہے ...... اردو اور علاقائی زبانیں
ب دوسرے کی حریف و رقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں ...... اردو ، بلوچی ،
ندھی ، پنجابی ، پشتو ، سرائیکی سب ایک ہی قسم کے تہذیبی زندگی ایک ہی قسم کی معاشرت
اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا کی زائیدہ و پروردہ ہیں ۔ ان کے خدوخال ایک دوسرے
سے کچھ الگ ہیں لیکن بباطن وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں ان سب کی
روحوں پر اسلامی تہذیب و تمدن اور صوفیائے کرام کے احساس کا سایہ ہے ۔"
شاید اس لیے پروفیسر جیلانی کامران نے بھی کہا ہے کہ قومی زبانیں علاقائی زبانوں کے
محل وقوع میں آباد ہوتی ہیں اور علاقائی زبانیں قومی زبان کے افق پر اپنا مزاج تلاش
کرتی ہیں ۔" ان آراء کی روشنی میں قومی یک جہتی میں اردو کا کردار نہایت واضح اور مثبت
ہے ۔ اردو نہ صرف تمام صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے بلکہ ادبی و صحافتی سطح
پر بھی اس کی قومی حیثیت مسلم ہے ۔ تمام صوبوں سے اردو اخبارات و رسائل باقاعدگی
سے شائع ہوتے اور پڑھے جاتے ہیں ۔ عوامی سطح پر بین الصوبائی خط و کتابت بھی
اردو ہی میں ہوتی ہے ۔ ہر صوبے میں ایسے قدآور ادیب اور شاعر موجود ہیں جن کی
شناخت اردو کے حوالے سے ہے ۔ اردو کسی صوبے کی زبان نہیں مگر اردو زبان و ادب
کے ارتقا میں تمام صوبوں کے مصنفین کی کاوشیں تاریخ ادب کا روشن ترین حصہ ہیں ۔
اردو اور صوبائی زبانوں کے ادبا میں جو تھوڑی بہت مغائرت پائی جاتی ہے اسے صوبائی
زبانوں کے ادب کو اردو اور اردو زبان کے ادب کو صوبائی زبانوں میں منتقل کرنے
دور کیا جا سکتا ہے اور بعض سطحوں پر یہ کام ہو بھی رہا ہے ۔ لہٰذا اس میں شک و شبہ
کی کوئی گنجائش نہیں کہ اردو پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان وحدت و یک جہتی
اور مشترک تہذیبی روایات اور اسلامی اقدار و رجحانات کی علامت ہے ۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی خدمات کا اعتراف

قارئین اخبار اردو کے لیے یہ خبر یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ مقتدرہ
قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو ان کی علمی ادبی خدمات
کا اعتراف کرتے ہوئے طفیل ایوارڈ دیا گیا ہے یہ ایوارڈ ۱۴ جولائی کو
طفیل صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے
صدر مملکت سے وصول کیا۔ اسی طرح مجلس ادبیات مشرق (کراچی)
کے زیر اہتمام ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ارمغان
علمی مرتب کیا جا رہا ہے ۔ مجلس ادارت و مشاورت میں برصغیر کے
نامور ادیب ، شعرا اور نقاد شامل ہیں ۔

ارمغان علمی میں مختلف عنوانات کے تحت ڈاکٹر وحید قریشی اور
ان کی دلچسپی کے موضوعات پر ارباب قلم کی نگارشات شامل ہوں
گی ۔

رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران کے مجلہ دانش
کا ایک خصوصی نمبر بھی شائع ہو رہا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی
فارسی زبان و ادب کے حوالے سے خدمات کا تذکرہ ہوگا اور ان کی
تخلیقات اور شخصیت کے بارے میں مضامین زینت قرطاس
بنیں گے ۔

اقبال کاظمی

قومی یک جہتی اور قومی زبان

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدالاولین والآخرین خاتم الانبیا والمرسلین محمد وآلہ واصحابہ الطیبین الطاہرین ۔

میں چند باتیں کرنے کی اجازت چاہتا ہوں. یہ تمام باتیں میری نہیں بلکہ ان مہانوں کی ہیں جو عرصہ دراز سے اردو زبان کی خدمت کرنے میں کمربستہ ہیں. ان لوگوں کی تخلیقات سے چیدہ چیدہ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں. یہی باتیں میں پڑھ رہا ہوں اور سنا رہا ہوں آج کے اس دور میں جب ملک مختلف لسانی طبقات میں تقسیم ہوتا جارہا ہے ضرورت ہے ہم اس قومی زبان اردو کے دفاع کے لیے پوری کوشش کریں جو ہمارے درمیان رابطہ کی واحد زبان ہے ۔

ہماری قومی زبان اردو دنیا کی مکمل ترین اور ترقی یافتہ زبانوں کی آغوش میں پل کر اپنے شباب کی منزل کو پہنچ چکی ہے. اس کی ابتدا کے متعلق کوئی تاریخ مقرر نہیں کی جاسکی. کیونکہ زبانیں اچانک وجود میں نہیں آتی ہیں بلکہ انہیں ایک لمبے ارتقائی عمل سے گزرنا پڑتا ہے جس کا احاطہ سینکڑوں برس تک جا پہنچتا ہے. اس ضمن میں محققین کی تعداد بے شمار ہے. محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، نصیرالدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین زور، حکیم شمس اللہ قادری سب نے اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے جس سے اردو کیوں اور کہاں پیدا ہوئی کے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ اردو کا آغاز اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے برصغیر میں قدم رکھے اور مقامی لوگوں سے ان کا میل جول ہوا. یہی زبان ہند کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکاری جانے لگی. اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا فوج کے ہیں بظاہر یہ زبان حملہ آوروں کی ضرورت کا نتیجہ تھی لیکن اس کی بنیادیں زیادہ پائیدار تھیں اس میں مختلف تہذیبوں کا حصہ تھا دنیا کی مختلف زبانوں نے اسے مواد دیا. پرتگازی نے اس کی آبیاری کی، فارسی کے پروں سے اڑی. عربی نے اس پر سایہ کیا انگریزی نے اسے طاقت دی موجودہ دور میں اس کی صورت یہ ہے اس کے بولنے والے دنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں. یونیسکو کی ایک رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں کے جائزہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے. جہاں تک تاریخی صداقت کا تعلق ہے یہ زبان برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی ہزار سالہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظیم الشان روایات کی حامل ہے. ہمارے ملی افکار اس کی مدد سے عروج تک پہنچے. اسلامی تعلیمات کی ترقی کا وسیلہ یہی زبان رہی ہے. ہمارا بیشتر علمی اور فکری سرمایہ اسی میں محفوظ ہے بلکہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اردو کے مقابلے میں اسلام سے متعلق کتب سرمایہ یا مواد موجود نہیں ۔

سرسید کے دور سے لے کر قائداعظم تک یہی زبان تھی جس کے ذریعے ہمارے قائدین شاعروں، ادیبوں اور مفکرین نے ملت تک اپنے خیالات پہنچائے اور ملت کو خواب غفلت سے جگایا. ہماری جنگ آزادی میں جہاں اسلام ایک نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا گیا وہاں اردو ایک مخلص رفیق کی طرح قدم قدم پر مصروف عمل رہی. آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی سعادت ایک لحاظ سے اردو زبان کا عطیہ ہے مگر قیام پاکستان کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے اس کے خلاف سازشوں کا آغاز ہوا. بابائے قوم کو علالت کے باوجود ۲۴ مارچ ۱۹۴۸، ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر زبان کے مسئلہ کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرنا پڑا ۔

" اپنے روزمرہ کے کاروبار کو چلانے والے ہر صوبہ کے عوام کو اپنی کسی بھی صوبائی یا علاقائی زبان کو اپنانے کا حق حاصل ہے اور اس سلسلہ میں علم و ادب کی ترقی، تہذیب و ثقافت کی ترقی اور اسے عام کرنے کے لیے تمام علاقائی زبانوں کو پورے پورے مواقع وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق فراہم کیے جائیں گے لیکن جہاں تک قومی، ملکی نقطۂ نگاہ سے کسی زبان کو اپنانے یا رائج کرنے کا تعلق ہے وہ قومی سطح پر آپ کی زبان صرف اردو ہوگی جو کہ پاکستان کی عظیم مملکت کے صوبوں کے درمیان اور پاکستان کی قومی مجموعی اتحاد کے لیے رابطہ کی زبان کا کام دے گی اس کے علاوہ اردو زبان وہ واحد زبان ہے جس سے ہزاروں سال قبل مسلمانوں کی خالص اسلامی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر پرورش پاکر برصغیر میں اپنی مقبولیت کا لوہا منوایا ہے اور وسعت کے لحاظ سے کوئی دوسری زبان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی "

" میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی. کوئی دوسری نہیں. ہر وہ شخص جو اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یقیناً پاکستان

ادشمن ہے۔"

مگر افسوس کی بات ہے کہ قائداعظم کے اس واضح فرمان اور روشن ہدایت کو فراموش کر یا گیا صرف زبانی جمع خرچ تک قومی زبان کے متعلق نعرے ضرور لگتے رہے اور انگریزی زبان ربرابر تحفظ ملتا رہا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک تو ملکی سطح پر اردو کی قومی زبان کی حیثیت سے ئین میں مسلم ہوتے ہوئے انگریزی بحیثیت زبان دفتری کے محفوظ رہی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین ےانگریزی کو ۲۰ سال اور ضمانت دی۔ ۱۹۶۲ء کے آئین نے طے کیا کہ پندرہ سال بعد اردو رملک میں دفتری زبان کی حیثیت دی جاسکے گی اور جب ۱۹۷۳ء میں آئین بنا تو انگریزی کو ہر ۱۹۸۸ء تک کا تحفظ مل گیا اور طے پایا کہ اردو کے نفاذ کے مکمل اقدامات ۱۹۸۸ء میں کیے ائیں گے۔ سنا ہے کہ پھر یہ مدت بڑھائی جا رہی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان کو مختلف اوقات میں طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ آزادی کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی پوری کوشش کی۔ ہندو مسلمانوں سے سابقہ غلامی کا بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اردو نے اس جنگ میں حصہ لیا ہندوؤں نے اسے مسلمانوں کی زبان لہا ۱۷۰۰ء میں ایک مستشرق گارساں دتاسی نے یہی رائے دی۔ "ہندو اردو کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ اس سے مسلمانوں کے اقتدار کی بو آتی ہے۔ اس کے باوجود اردو کو ہندوستان میں وہی مقام حاصل ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو زیادہ استعمال میں آتی ہے۔"

۱۹۳۱ء کے ایک اجلاس میں مہاتما گاندھی نے اس قسم کے خیالات پیش کیے تھے۔ "کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے اپنایا ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں یا بھلا دیں۔"

رئیس احمد جعفری اپنی کتاب کارواں گم گشتہ میں لکھتے ہیں۔

"اردو برصغیر میں صدیوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے جس کی آبیاری، پرداخت اور نشوونما میں دونوں قوموں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اردو انگریزی دور حکومت میں دفتری عدالتی زبان بن چکی تھی۔ اسے ایک درپردہ منصوبہ کے ذریعہ صرف مٹایا ہی نہیں جا رہا تھا بلکہ مسلمانوں میں عصبیت پیدا کرنے کے لیے علاقائی زبانوں کو اردو کے مدمقابل لانے کی مذموم کوشش کی جا رہی تھی"

لمحہ فکریہ یہ ہے۔ اب پھر ایسا ہو رہا ہے

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۰ء بمقام ناگ پور جو تجاویز منظور ہوئیں ان میں ایک تجویز یہ بھی تھی "پنجاب میں ہندی اور پنجابی کو اردو کے مقابلے میں لانے کی جدوجہد کے خلاف احتجاج"۔ اگر کانگریس واردھا سکیم، بندے ماترم کے ذریعہ مسلمانوں کے دینی، تمدنی تعلیمی حقوق کو اپنی مرضی کے مطابق تابع کرنے کی کوشش [illegible] کرتی تو قائداعظم جیسے ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار کو کانگریس سے دل برداشتہ ہو کر نہ نکلنا پڑتا۔ یہ ایک ایسی تعلیمی سکیم کا احیا تھا جس کا منشا ہندوؤں کے ویدک دور کے کلچر کو زندہ کرنا تھا۔ ماہ جون ۱۹۳۶ء مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں جو انتخابی منشور منظور کیا اس کے چودہ نکات میں ایک نکتہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کا تحفظ بھی تھا۔

اردو قائداعظم کی مادری زبان نہ تھی اور نہ ہی اس وقت کے مشہور سیاسی راہنماؤں کی زبان تھی مگر ان کی دور اندیش دوربین نگاہیں اس بات پر مرتکز تھیں کہ صرف اردو ہی قومی اتحاد کا واحد ذریعہ ہے۔ قائداعظم نے اپنی تقاریر میں اسی زبان کا سہارا لیا۔ قوم کی خاطر آپ نے یہ زبان سیکھی بقول ایک مفکر کے وہ انگریزی میں چرچل کے ہم پایہ تھے۔ برک سے کسی طرح کم نہ تھے وقت گزرتا گیا۔ قائداعظم کی اردو تقاریر میں نکھار آتا گیا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق تقسیم ملک سے پہلے مسلم لیگ کے ایک اجلاس کا ذکر کرتے ہیں "فیروز خان نون کی تقریر کے دوران مجمع نے بار بار مداخلت کی کہ آپ انگریزی کی بجائے اردو میں خیالات کا اظہار کریں تو وہ کہنے لگے کہ مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں قائداعظم موجود تھے تاب نہ لا سکے۔ اٹھے۔ فرمایا۔ فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ ڈھونڈی ہے میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔

وطن عزیز میں بہت سی مقامی بولیاں ہیں، پشتو، سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی یہ سب اپنی جگہ سرگرم عمل ہیں ان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے۔ علم لسانیات کی رو سے کوئی زبان کسی سے کم تر نہیں ہوتی۔ ہم ان علاقائی بولیوں سے اردو زبان کے سرمایۂ محاورات و الفاظ میں اضافہ کر سکتے ہیں اس سے اردو سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگا۔ نئے نئے خیالات اور پیرایہ اظہار میں وسعت پیدا ہوگی۔ اہل وطن میں جذبات محبت کی فراوانی ہوگی اخوت میں اضافہ ہوگا۔ اتحاد مستحکم ہوگا۔ اردو زبان دیگر زبانوں کی حلیف ہے، حریف نہیں۔

اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دلانے کی غرض و غایت صرف اس قدر ہے کہ اردو کے لیے وہی مقام ہو جو اب تک انگریزی زبان کو حاصل ہے۔ انگریزی کی جگہ اردو۔ کاروباری، معاشرتی، دفتری، تعلیمی ادبی معاملات میں خاص مقام حاصل کرے۔ مگر یہ کام تب ہو سکتا ہے جب ہماری ذہنیت میں تبدیلی ہوگی، انقلاب ہوگا۔ ہم احساس کمتری کے بھنور سے نکلیں گے غلامی نے ابھی تک ذہنوں کو مفلوج کر رکھا ہے۔ ہمارا دانشور طبقہ اردو میں نام لکھنا، دستخط کرنا بھی گوارا نہیں کرتا ہم اپنے پیارے نام نور محمد خان کو این ایم خان لکھتے ہیں۔ فروغ اردو انجمنوں کی کوششوں کے باوجود ناموں کی تختیاں، دکانوں کے نام انگریزی میں موجود ہیں شائستگی کی علامت صرف انگریزی بولنا اور لکھنا ہے اعلیٰ گفتگو کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

"میری پرسنل اوپنین یہ ہے۔ شاید آپ ایگری کریں گے کہ اردو لینگویج کا پرابلم

کوئی آرڈی نری پرابلم نہیں ہے۔ اردو میں ہائر ایجوکیشن کا انتظام ہماری ینگ جنریشن کے لیے ایسنشل ہے، مگر اس میٹر میں میرے تھاٹس اپنے کولیگز کے اینٹائرلی اگینسٹ ہیں"۔

اس قومی بے حسی کے خلاف آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی حمایت کا مطلب انگریزی کی مخالفت نہیں بلکہ اس بات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ ہم اسے ذریعہ تعلیم بنائیں بات دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ علم ترقی اس وقت کرتا ہے جب لوگوں کو ان کی زبان میں دیا جائے۔

ایک یورپین کلرک نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سے کہا تھا " اپنی زبان میں تعلیم حاصل کیے بغیر یسوع کی قسم تم ہزار برس میں بھی ترقی نہیں کرسکتے "۔ یہ بات یقینی ہے کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا زیادہ وقت سبق کو رٹنے میں گزر جاتا ہے۔ صدیوں تک انگریزی ہمارا اوڑھنا بچھونا رہی مگر ہم علم میں جاپان کا مقابلہ نہیں کرسکے نہ ہم چین کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتے ہیں کیا روس کی ترقی انگریزی کی وجہ سے ہے۔

قومی تعلیمی کمیشن کا یہی مشورہ تھا کہ قومی زبان احساس قومیت کو اجاگر کرنے کی بڑی قوت رکھتی ہے یہ اتفاق و اتحاد کا جزو اعظم ہے۔ طبقاتی امتیازات کو ختم کرنے کا خاص ذریعہ ہے۔ ذہنی صلاحیتوں کو اس سے جلا ملتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم اردو کا سہارا لے سکتے ہیں مگر اس ضمن میں ہم جس زبان کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں وہ عام فہم ہونی چاہیے۔ ثقیل الفاظ سے پاک ہو۔ روزمرہ محاورہ کے مطابق ہو۔ عربی، فارسی کے مشکل الفاظ تراکیب کا اس میں غلبہ نہ ہو۔ کسی دور میں رجب علی بیگ سرور کی اردو اعلیٰ نمونہ تھی اور مسجع مقفیٰ فقرے ادب کا حصہ تھے۔ اسی دور کی بات ہے جب ایک مسافر رات گئے سرائے کے دروازے پر پہنچا۔ قیام کی اجازت طلب کی۔ دروازہ بند تھا اندر سے بازپرس ہوئی تو مسافر نے فرمایا " سلطان العارفین، زبدۃ السالکین، عمدۃ الواعظین حضرت حکیم حاجی مولوی ابوالفضل شیخ غلام محی الدین چشتی صابری لکھنوی ثم وانک پوری تشریف لائے ہیں "۔ سرائے کا مالک سیدھا سادا آدمی تھا۔ پکار اٹھا صاحب یہاں تو ایک پلنگ خالی ہے۔ میرے لیے اتنے صاحبان کے قیام کا انتظام اس وقت مشکل ہے۔

اسی دور کے ایک اور صاحب اپنی پریشانیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں " آج کل سقف اطاق کمترین میں ناہنجار اصاغر متعدد نے بنائے آشیاں رکھ دی ہے۔ اصوات متواتر و مسلسل کی معصیت کے باعث نوم مردمک دیدہ میں عنقا ہوکر رہ گئی ہے"۔ مگر اب اس قسم کی اردو کی کوئی گنجائش نہیں اب آسان جملے، چھوٹے فقرے، موزوں، مانوس الفاظ پسند کیے جاتے ہیں۔

کچھ فکرمند دوست اردو میں ذخیرۂ الفاظ، دفتری اصطلاحات کی کمی کی شکایت کرتے ہیں اب ۳۸ ہزار دفتری الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل لغت پر مقتدرہ قومی زبان کے زیر نگرانی نظرثانی کی جارہی ہے تاکہ اردو کو دفتری کام کے لیے ناکافی سمجھنے والوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے۔ دفتری امور کو سمجھانے کے لیے مقتدرہ قومی زبان نے مختلف جلدوں میں ہدایات کا وسیع مواد مہیا کیا ہے تاکہ اس پہ چلنے والوں کے لیے کوئی مشکل نہ ہو۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۲ صدی تک اردو ذریعۂ تعلیم رہی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی پہلی درس گاہ دہلی کالج تھا جہاں ۱۸۳۵ء میں اردو کے ذریعہ سائنس، قانون، طبیعات، علم ہیئت، ڈرائنگ ریاضی، تاریخ جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی رہی۔ اسی ادارہ کے پرنسپل سی۔ ایف اینڈریوز نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ طلبہ زیادہ کامیاب ہیں جن کو اردو میں پڑھایا گیا۔ اسی کالج کے پڑھے ہوئے ایک طالب علم منشی ذکاء اللہ نے ۱۵۰ کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ۸۷ کتابیں ریاضی سے متعلق ہیں۔ بابائے اردو نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے طلبا انگریزی کے شعبۂ تعلیم سے ہر لحاظ سے اعلیٰ ہیں اگرچہ اس دور میں اردو کا دامن علمی ذخائر سے خالی تھا مگر اساتذہ کی محنت نے یہ کمی پوری کردی تھی۔

دکن کے مدرسہ فخریہ کی کوششیں بھی کسی سے کم نہیں۔ اس ادارہ نے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۴ء تک تعلیم اردو میں دی۔ انجینئرنگ کالج رڑکی نے علم میں ایسی کتابیں پیش کیں جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی نے ۴۰ کے قریب نادر کتابوں کے ترجمے کیے اور مغربی علوم و فنون کو اردو میں پیش کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے اس میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اردو کے فروغ میں اردو کالج کراچی کا حصہ بھی کسی سے کم نہیں۔ سرسید مرحوم کے لگائے ہوئے پودے کو بابائے اردو نے پالا، محسن اردو سید عبداللہ نے اس کی آبیاری کی، ڈاکٹر وحید قریشی نے سایہ دار شجر میں تبدیل کیا اب اس پر پھل بھی ہیں اور پھول بھی۔ یہ پودا کیسے خشک ہوسکتا ہے اس میں پرخلوص لوگوں کا خون جگر شامل ہے۔

اردو کے فروغ کے سلسلہ میں موجودہ حکومت کا احساس قابل قدر ہے اور شدید بھی ہے۔ حالات میں تبدیلی نظر آرہی ہے۔ دفاتر میں اردو کو مقام مل رہا ہے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے دفتری اردو کورس کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی رہنمائی میں بہترین سلیبس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہزاروں افراد تربیت مکمل کرچکے ہیں۔ اردو مختصر نویسی اردو ٹائپ کاری سکھانے کا انتظام ہر ضلع میں موجود ہے۔ انگریزی طرز کے مدارس میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی کوشش ہورہی ہے۔

موجودہ دور کا تقاضا یہی ہے۔ نظریاتی محاذ اور قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے کے لیے قومی زبان کو اپنا فرض ادا کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ ہمارے شعراء، ادیب، مفکرین ان حقائق کو اردو میں عام کریں۔ جس سے ہم تحریک پاکستان، تصور پاکستان کو لوگوں کے دلوں میں بنیادی حیثیت دلاسکیں۔

مذاکرہ لاہور

ڈاکٹر محمد حامد

اُردو ہمارے دفتروں کی زبان کیوں نہ بن سکی

ہمیں انگریز سے ورثے میں جو نظام ملا تھا ہم نے اسے چند جزوی تبدیلیوں کے ساتھ جوں کا توں اپنا لیا تھا سو ہماری سرکاری زبان یعنی دفتری زبان کا معاملہ بھی اسی نوع کا تھا۔ صورت حال کو جوں کا توں رہنے دیا جائے جسے لغت فرہنگ میں 'جیسا کہ تھا' کا اصول کہا جاتا ہے ہمارے قومی شعار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب بھی مشکل مسائل کا حل 'جیسا کہ تھا' کا اصول ہے۔ سو اگر اردو ۱۹۴۷ء میں دفتروں کی زبان ہوتی تو انگریز کے جانے کے بعد ہم بھی اردو کو ویسے ہی رہنے دیتے۔

اب ایک اور پہلو کی طرف آئیے تعلیمی نظام کا دفتروں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارے عام تعلیمی ادارے بابوؤں کی ایک بڑی کھیپ ہر سال دفتروں میں پہنچا دیتے ہیں ان اداروں کے نسبتاً ذہین طالب علم اپنی محنت خاندانوں کی وجاہت آگے بڑھنے کے جذبے اور کچھ اور عوامل کو جلو میں لیے دفتروں میں بہتر درجہ بندیوں کے نظام میں جا پہنچتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ طالب علم بھی ہوتے ہیں جو ایسے سکولوں میں پڑھتے ہیں جہاں کے اخراجات اور انہیں آئندہ زندگی میں ملنے والے مشاہرے میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ان طالب علموں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہو رہی ہے اور ایسے تعلیمی ادارے بھی بڑھ رہے ہیں جو غیر ملکی امتحانات کے نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ ان سکولوں سے نکلنے والے طالب علم انگریزی زبان کو محض زبان کے طور پر نہیں بلکہ طریق بود و باش اور تہذیبی رویّے کے طور پر اپناتے ہیں اور اردو سیکھ بھی لیں تو اسے حقیر سی زبان سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں مثبت رویّہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں تحریری و تقریری دونوں اعتبار سے کور ذوق ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اردو کو دفتری زبان بننے کی راہ میں ممد و معاون ثابت ہوں گے ایک فضول امید رکھنے کے مترادف ہوگا۔

اب دفتروں کے افسرانِ بالا کے تعلیمی اور دفتری امتیازات اور کورسوں پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ان کی خاصی بڑی تعداد دو تین بار یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ بیرون ملک نصابی یا غیر نصابی سرگرمیوں کے سلسلے میں جا چکی ہے۔ بیرونی تعلیم گاہوں میں صرف تعلیم حاصل کرنے کا معاملہ نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ان کی تہذیبی و علمی برتری کا ایک طلسم یا ایک سحر ہے جو ان پر طاری ہے۔ ان کے نزدیک اردو کا محض یہ مصرف ہے کہ یہ ضلع کچہری اور پٹواری کی سطح پر کام آتی رہے امور جہانبانی یا امورِ مملکت تو ان کے بارے میں رموز مملکت جاننے والوں کا یہ خیال ہے کہ اردو میں یہ استعداد کہاں کہ دفتر کے باریک نکات اس کی گرفت میں آسکیں۔ مقتدرہ قومی زبان تراجم کا سمندر فراہم کر دے اگر گھوڑا پانی پینا نہیں چاہتا تو اسے سمندر کے پاس لے جائیں یہ تشنہ کام ہی لوٹے گا۔

اس میں شک نہیں کہ تراجم کا کام خاصا اہم ہے۔ نصابی کتب، سائنس، دفتری امور ہر موضوع پر بے شمار کتب سامنے آ چکی ہیں، کورس ترتیب دیے جا چکے ہیں اور نہایت مستعدی اور ہنرمندی سے کام کیے جا رہے ہیں لیکن دفتروں کی زبان کا مسئلہ ہنوز روزِ اوّل ہی کا ہے اس معاملے میں ہمیں مزید سوچ بچار کرنا ہوگی۔ دوررس نتائج کے حصول کے لیے ملک میں کسی بھی غیر ملکی طریق امتحان کا چور دروازہ جو آنے والے سالوں میں بڑا ہوتا چلا جائے گا بالکل بند کرنا ہوگا۔ 'او' لیول، جونیئر کیمبرج سینئر کیمبرج جیسے امتحانات جو عرصے سے ختم ہو چکے تھے ان کا احیا ہو رہا ہے۔ ۲۰۰۰ء تک ہر سال ایسے طالب علموں کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں میں جا پہنچے گی جو ان غیر ملکی امتحانات کے ذریعے ملک کے دفاتر میں مختلف اسامیوں کے امیدوار ہی نہیں ان پر بیٹھے نظر آئیں گے اگر یہ صورت حال بدستور رہی اور اس کا ازالہ نہ کیا گیا تو ہمیں ۲۰۸۰ء میں بھی اردو کے دفتری زبان بننے کی توقع نہ ہونا چاہیئے۔ ملک کے تعلیمی نظام میں یہ بہت بڑی تبدیلی بڑے چپکے سے اور دبے پاؤں لائی جا رہی ہے مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات بھی نصاب سے شاید اسی طرح خارج ہو جائے جیسے تاریخ اور جغرافیہ جیسے اہم مضامین خارج کر دیے گئے اور ان کی جگہ معاشرتی علوم نے لے لی تھی۔

ہمارا فہمیدہ طبقہ نہ معلوم کیوں ہماری آئندہ نسلوں کے بارے میں فیصلوں سے اس قدر لاتعلقی کا رویّہ اپنائے ہوئے ہے شاید فوری نوعیت کے معاشی مسائل اور دیگر

دلچسپیوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اردو کا سورج جس افق سے طلوع ہونے کی امید ہے وہاں انگریزی زبان کا اندھیرا مزید گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ علامہ بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔

ع ترا ناداں امید غم گساری ہا ز افرنگ است
دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

عملاً اس وقت یہ صورت حال ہے کہ ضلعی سطح پر اردو زبان کسی حد تک رائج ہو چکی ہے جبکہ صوبائی اور مرکزی سطح پر انگریزی اچھی طرح مستحکم ہے اور بظاہر مقتدرہ قومی زبان کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کی جگہ اردو کے رائج ہونے کے مواقع بہت زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آتے۔ اس کے لیے بنیادی کام خاطر خواہ انداز سے ہو رہا ہے لیکن جب تک نقطہ نظر نہ بدلے آپ کی تمام تر کوششیں بے سود ثابت ہوں گی۔ پھر یہ سب کچھ اس توقع پر کیا جا رہا ہے کہ دفتروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سطح کے ملازمین سرکار اردو سے کچھ نہ کچھ ضرور آگاہی رکھتے ہیں۔ مقتدرہ نے یقیناً جائزہ لیا ہوگا اور یہ بات اس کے علم میں ہوگی کہ اردو کی استعداد کا کیا حال ہے ایسے لوگ بھی کم نہ ہوں گے جنھیں اردو ابجد اور قاعدے سے شروع کروانا ہوگی۔ اس میں قصور کس کا ہے اور کس کا نہیں۔ اسے رہنے دیا جائے صرف یہ دیکھا جائے کہ عملاً اس وقت صورتحال ہے کیا۔ پھر ایسے افراد کم تعداد میں بھی ہوں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اردو کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں یا انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اردو کو دفتروں کی زبان بننے کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کا جائزہ اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے کہ تمام منفی عوامل کو سامنے رکھا جائے اور مخالف قوتوں کا تعصب آمیز انداز میں جائزہ لینے کی بجائے کھلے دل سے بے لاگ طریقے سے ان کو جانچا جائے پھر خود اپنے یہاں کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے اور ان کی اصلاح کی جائے۔

مصرعہ یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

اسی صورت میں ہم اردو کو دفتروں کی زبان بنانے کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ایسے اصحاب علم و فضل سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حوالے کی کتابوں کے معاملے میں ہمیں جو پیش رفت کرنا چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ صرف دائرہ معارف اسلامیہ سے بات نہیں بنے گی۔ اردو کا ایک ایسا دائرۃ المعارف جو اپنی ضخامت اور اپنے مضامین کی علمی سطح کے اعتبار سے بریٹانیکا سے بڑھ کر ہو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس میں کئی سال لگیں گے لیکن یہ کام جس قدر جلد شروع کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ اسی طرح حوالے کی دوسری اہم کتب کو ترجمے کی بجائے خود طبع زاد لکھوانے کا کام بھی ہمیں اپنے ذمے لینا ہوگا۔

ترجموں کے فوائد اپنی جگہ لیکن معاف کیجیے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہم اپنی جگہ کوئی نیا کام کرنے کی اہلیت ہی سرے سے نہیں رکھتے پھر ترجموں میں بالخصوص معاشرتی علوم کے معاملے میں صورت یہ ہوتی ہے کہ مغرب اپنے تمام تر فلسفے اور سوچ سمیت ان کے ہر فقرے اور ہر پیرا میں موجود ہوتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ جہاں تک ممکن ہو طبع زاد کاموں کی حوصلہ افزائی ہو اور تراجم میں بھی مغرب کی فکر کے کانٹوں کو نکالا جائے۔ ہم خود اپنے معاشرے سے مثالیں لے سکتے ہیں پھر کئی موضوعات خالصتاً مغرب ہی کی ضرورت ہیں۔ ہمیں آزادانہ فکر کو اپنانا ہوگا خود اپنے معاشرے کے مسائل کا تجزیہ کر کے علوم کی تشکیل نو کرنا ہوگی صرف اسی انداز فکر سے وہ اعتماد جنم لے گا جو انگریزی میں نوشت و خواند پر اکتفا کرنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت پیدا کر سکے گا۔

مغرب کی اقوام نے گزشتہ دو صدیوں میں علم کے میدان میں جو پیش رفت کی ہے اور جس کا ایک حصہ انگریزی زبان میں منتقل ہوا ہے۔ جب تک ہم اسی انداز یعنی جارحانہ انداز کو نہیں اپنائیں گے اس وقت تک ہم اردو کی صحیح خدمت نہیں کر سکیں گے۔ اردو کا لغوی مفہوم بھی لشکر کا ہے اور اب بھی افغانستان، ترکستان اور ترکی میں اردو لشکر کو کہا جاتا ہے۔ اردوئے زریں جسے انگریزی میں گولڈن ہورڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مسلمانوں کا وہ لشکر تھا جس نے دو بار ماسکو کو تاخت و تاراج کیا تھا اور موجودہ دور کے روس کے علاوہ تمام مشرقی یورپ پر حکومت کی تھی۔ ماسکو کے حکمران اردوئے زریں کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ اردو کی دہشت اس قدر تھی کہ ریاستوں کے والی تک اس کے نام سے تھرتھراتے تھے۔ تاریخ آج بھی اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے اگر ہم اردو کو اردوئے زریں بنا دیں۔

مصرعہ ہے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اردو کا دفتروں میں رائج ہونا صرف اس بات پر موقوف ہے کہ اسے ایک حکم نامے یعنی آرڈیننس کی صورت میں نافذ کر دیا جائے۔ اردو بیک جنبش قلم ملک کی سرکاری و درباری زبان بن جائے گی۔ افسر جو اپنی سالانہ رپورٹ کی فرشتوں کے لکھے نامۂ اعمال سے بھی زیادہ پرواہ کرتا ہے اور سب کچھ سہہ سکتا ہے۔ ایک نکما اور نالائق افسر ہونے کا طعنہ اپنی رپورٹ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بڑے سے بڑا صحیح النسب انگریزی پرست بھی اردو سیکھے گا اور اپنی افسری کی شان برقرار رکھنے کے لیے صحیح بامحاورہ اور شستہ اردو سیکھے گا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔

وما علینا الا البلاغ

(ڈاکٹر محمد حامد ۴۲ اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ۱۲ چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے [illegible] کا عربی ترجمہ ہو چکا ہے جو دمشق، بیروت اور ابوظہبی سے چھپ چکی ہیں۔ اقبالیات کے موضوع پر دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جی ایچ کیو میں ٹرانسلیشن آفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ فوجی انگریزی اردو ڈکشنری کے کام میں منسلک رہے ہیں۔ سیاسیات میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔)

سراج منیر

اُردو زبان کا نفاذ اور قومی یک جہتی

اردو تنقید میں بعض بزرگ ایسے بھی ہیں کہ ہر معاملے پر گفتگو کا آغاز ہبوطِ آدم سے کرتے ہیں لہٰذا جب تک سلسلۂ کلام اصل موضوع یعنی کسی نومولود یا نامولود شاعر کے کمالات کے بیان تک پہنچتا ہے، نقاد کا سانس اکھڑ جاتا ہے اور قاری کے ہاتھ صرف ہبوطِ آدم کی تفصیلی وجوہات ہی آتی ہیں بار بار اس امر کے مشاہدے سے طبیعت میں اتنی عبرت پیدا ہو چکی ہے کہ اگر کسی موضوع کے سلسلے میں تاریخی سیاق و سباق کا جائزہ لینے کے لیے دو چار صدی پہلے دیکھنا پڑے تو جی ڈرتا ہے کہ موضوع گفتگو ہبوطِ آدم کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی طرح کی ایک اور پیچیدگی اصطلاحات کے سلسلے میں ہے مثلاً قومی یک جہتی کا ہی معاملہ لے لیجیے۔ سیاست دانوں اور اہلِ حکومت نے اس لفظ کا اتنی کثرت سے استعمال کیا ہے جتنی کثرت سے سیلاب کے زمانے میں ریلیف کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب تک کوئی لفظ اس طرح سکۂ رائج الوقت بن جائے تو اس میں یوں بھی سکۂ رائج الوقت کی بو آنے لگتی ہے۔ یہ شاید اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر اسی معنی کو [illegible]TEGRATION کے لفظ سے بیان کیا جائے تو بات میں زیادہ وزن اور نیت پر زیادہ اعتبار پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ انگریزی بلند اقبال زبان ہے۔ اس میں تو جہالت بھی اردو فارسی وغیرہ کے علم سے کچھ زیادہ معزز معلوم ہوتی ہے۔ اگر زبان بلند اقبالی نہ ہو تو آپ لاکھ اقبال پیدا کرلیں وفاقی وزارتوں اور صوبائی شعبوں میں [illegible] بولنے والے NA[illegible] لوگوں سے بات اس طرح سنی جاتی ہے جیسے مشاعرے کا شعر۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ مشاعرے کی عزت اور معاشرے کی عزت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مشاعرے کی عزت کا کیا ہے، شبیہ مانند، شبیہ دیگر نمی ماند، اور معاشرے کی عزت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر قبر کا کتبہ بھی رومن حروف تہجی میں درج ہو تو لگتا ہے کہ جنت الفردوس کا N.O.C لگا ہے لیکن مقتدرہ نے اردو کے نفاذ کا وہ قصہ شروع کیا ہے جس سے غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے پہلے تو یہ قباحت تھی کہ بقول اربابِ اختیار اردو میں دفتری اصطلاحات اور اسالیبِ نگارش ہی دستیاب نہیں تھے، مگر اب تو ہر روز ایک نئی کتاب، لغت، فرہنگ دفتر میں نازل ہو جاتی ہے لہٰذا اب صرف ایک مسکت دلیل باقی رہ گئی ہے اور اس کا توڑ مقتدرہ کے پاس بھی نہیں ہے کہ اگر حکم انگریزی میں دیا جائے تو زیادہ واجب التعمیل محسوس ہوتا ہے، چنانچہ موضوع میں اگر INTEGRAIION کا لفظ رکھ دیا جاتا تو داد تحقیق دینے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی، ہر شخص اپنے آپ کو قائل محسوس کرتا۔ مگر اب تو یک جہتی اور قومی زبان کا تعلق ثابت کرنے کے لیے بہت تحقیق کرنے اور کثرت سے حوالہ جات وغیرہ درج کرنے کی ضرورت ہے، یعنی بات پھر ہبوطِ آدم سے شروع ہونی چاہیئے۔

ہیگل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کلام کی کائنات فی الاصل کائنات کا کلام ہے یعنی جو آپ کا تصورِ کائنات ہوگا وہی آپ کے کلام میں ظاہر ہوگا۔ یہ تصورِ کائنات کا لفظ ہم فلسفے کے اعتبار سے استعمال کر سکتے ہیں، مذہبی اصطلاح میں اسی کو تصورِ خلق کہیں گے اور اسی لیے عیسائیت کے علاوہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں زبان اور بیان کا مسئلہ براہِ راست عقائد کے ساتھ وابستہ ہے، عیسائیت میں چونکہ مختلف اوقات میں مختلف زبانیں مذہبی مقاصد یعنی مناجات و دعا اور بیان عقائد کے لیے استعمال ہوتی ہیں اس لیے اس میں عقیدے کا براہ راست زبان اور اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا۔ آرامی اور سریانی سے یونان تک، یونان سے پھر آگے چل کر لاطینی اور احیائے علوم کے بعد ہر یورپی اور غیر یورپی زبان تک عیسوی تصورات بیان ہوتے اور ہر زبان کے مخصوص تصورِ کائنات کے مطابق ڈھلتے رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت میں بنیادی عقائد کی تعبیر میں زبان کے عنصر نے اتنا بڑا کردار ادا کیا ہے کہ پورے مذہب اور اس سے وابستہ تہذیب کا مزاج اور اس کا نظام ہی تبدیل ہو گیا اب یہیں سے ایک اور فرق دیکھیے۔ عیسائی دنیا میں جہاں بھی گئے، انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انجیل کا اس زبان میں ترجمہ کرکے انجیل اس کے بولنے والوں تک پہنچا دی۔ اس کے برعکس مسلمان جہاں بھی پہنچے، انھوں نے سب سے پہلے اس قوم کو عربی سکھائی چاہے ناظرہ تلاوت کے لیے کیوں نہ ہو۔ پھر اس قوم کی زبان کو متاثر کیا قواعد و ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے اور رسم الخط کے اعتبار سے عیسوی تصورِ کائنات مرکز گریز ہے اور اسلامی تصور مرکز جو، یہ فوقیت کی بات نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے دائرے میں رسم الخط کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی اور آج بھی جب اسلامی تہذیب کے مرکزی مظاہر کی تلاش ہوتی ہے تو اس کا علاقہ وہی قرار پاتا ہے جو تحریری زبان کے عامی تصور کے تحت متشکل ہوا ہے عرب دنیا میں مختلف لسانی مزودتیں اور عربی زبان

سکے ہی مختلف علاقائی اوضاع سے پوری ہوتی ہیں لیکن برصغیر کا معاملہ ذرا مختلف ہے ۔ فرِتھجوف شوآن نے لکھا ہے کہ برصغیر دنیا بھر میں تہذیبی تعامل کے لیے مثالی حیثیت رکھتا ہے یہاں دنیا کے قدیم ترین مذہب اور جدید ترین مذہب کی پیدا کردہ تہذیبوں کے درمیان تعامل واقع ہوا اور اس طرح انسانی تہذیب کا دائرہ اپنے نقطۂ توازن تک پہنچا۔ اس بات کو آگے بڑھائیے تو اس کے مظاہر فنون میں برصغیر کی نستعلیق اور تاج محل کی شکل میں نظر آئیں گے۔

زبان و بیان میں اسی توازن کی پیداوار اردو زبان ہے اور سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کے مظہر کی حیثیت سے پاکستان۔ برصغیر میں مسلم قومیت کے شعور کا اظہار بنیادی طور پر انہیں تین دائروں میں ہوا ہے۔ جس طرح مسلم قومیت کا شعور کوئی وقتی سیاسی نظریہ نہیں بلکہ اس سرزمین پر مختلف عناصر کے تعامل سے پیدا ہونے والا ایک خاص تصورِ تشخص ہے اسی طرح اردو زبان بھی اس علاقے میں ایک ایسا مرکزی لسانی وجود ہے جس کے اردگرد عربی اور فارسی آفاقی جہت کی اور علاقائی زبانیں گہری جذباتی اور انفرادی جہت کی نمائندگی کرتی ہیں، لیکن رسم الخط کے واسطے سے ان کے اندر ایک ایسی وحدت پائی جاتی ہے جو انھیں ایک ہی تاریخی طرزِ احساس کے تابع رکھتی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مابعدالطبیعاتی اعتبار سے مکان اصولِ کثرت اور زمان اصولِ وحدت ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کی تاریخ میں وحدت اور اس کے تحت تہذیبی دائروں میں کثرت پائی جاتی ہے۔ اگر اس جہت سے غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان سے ایک صدی پہلے ہی برصغیر میں اردو کیوں مسلم قومیت کی مرکزی علامت بن کر ابھری تھی اس کی وجہ ظاہر ہے صرف یہی تھی کہ اردو اسی مخصوص تاریخِ عمل کی پیداوار ہے جس کا آگے چل کر ثمر پاکستان ہے۔

کسی نے فنِ تعمیر کے ضمن میں کہا ہے کہ جب قومیں اپنی عمارتیں تعمیر کرتی ہیں تو وہ دراصل اپنے تصورِ کائنات کو سنگ و خشت میں ڈھالتی ہیں۔ ظاہر ہے اس بات کا اطلاق تعمیرِ عمارات سے کہیں زیادہ مملکت کی تعمیر پر ہوگا۔ پاکستان معاشی ضرورتوں کے تحت سرحدی حدبندیوں کا شاخسانہ نہیں بلکہ ایک پورے تصورِ کائنات کی تاریخی اور جغرافیائی تشکیل نو ہے یہ تصورِ کائنات انسانی تجربوں کے ایک طویل سلسلے سے گزرتا، اپنی اوضاع اور صورتیں تراشتا، موجودہ صورت تک پہنچا ہے اور اس کے مختلف مراحل تاریخ کی کتابوں میں نہیں بلکہ زبانِ اردو کے تشکیلی عمل اور اس کے اظہاری سانچوں کی یکتا نوعیت میں محفوظ ہیں، انہی میں اس تصور کا ماضی سے تعلق اور مستقبل کا خاکہ دونوں پوشیدہ ہیں۔ یہاں تک میں نے اجمالاً یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کا مسلم قومیت کے شعور اور پاکستان سے کیا تعلق ہے۔ مسلم قومیت کا شعور اس مملکت سے باہر بھی موجود ہے لیکن اس صورت میں اسے ایک ثقافتی حیثیت حاصل ہے اقتدارِ اعلیٰ حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح ان علاقوں میں اردو کی ایک ثقافتی قدر موجود ہے ، انتظامی مصرف موجود نہیں ہے۔ مسلم قومیت کے تصور کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو جانے کا منطقی لزوم یہ ہے کہ اس کے بنیادی اظہار یعنی اردو کو انتظامی جہت بھی حاصل ہو جائے تاکہ مملکت کی تاریخ اور اس کے مقاصد جس تصورِ کائنات سے وابستہ ہیں، اس کی انتظامی صورتیں بھی اسی تصورِ کائنات سے منسلک رہیں۔ آج پاکستان کا بنیادی بحران یہی ہے کہ اس کے مقاصد کا تعین ایک لسانی، مذہبی شعور سے ہوتا ہے اور اس کی انتظامی جہت کسی اور تصورِ کائنات کے تحت تشکیل پاتی ہے۔ سیدھی بات ہے کہ دائرہ علم کی وحدت دائرہ عمل میں وحدت پیدا کرتی ہے چونکہ ہم لسانی جہت میں یکساں دائرہ عمل تشکیل نہیں دے سکے لہٰذا دائرہ عمل میں یک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہ ساری گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ایک بہت نازک موضوع ، جسے سیاسی مصلحتوں نے نازک تر بنا دیا ہے زیرِ بحث نہ آئے۔ قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا دوسری پاکستانی زبانوں سے کیا تعلق ہے یا ہونا چاہیے۔ جس طرح انسانی فطرت کے تقاضے متنوع ہیں اور انہیں پورا کرنے کے اسباب کثیر ہیں، اسی طرح معاملاتِ اظہار کے تقاضے بھی بہت ہیں اور کوئی ایک زبان خصوصاً ان علاقوں میں جہاں مختلف درجاتِ شعور کی ایک بڑی تالیف واقع ہوئی ہے، اظہار کے سارے تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔ جس طرح عربی زبان کی تمام تقدیسی جہتوں کے باوجود اسے پاکستان میں انتظامی زبان کے طور پر نافذ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح پاکستانی زبانوں کا پھیلا ہوا نظام شخصیت کی تعمیر و تنظیم کرتا ہے، اس میں گہرائی پیدا کرتا ہے لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے انتظامی ضرورتوں کو کفایت نہیں کر سکتا۔ ان زبانوں کی اسی جہت سے اردو کی تشکیل ہوئی ہے اور اس کا مزاج متعین ہوا ہے۔ اردو انہی زبانوں سے اکتسابِ حیات کرتی ہے اور انہی زبانوں کے اثرات کے تحت تغیر آشنا رہتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے طور پر برصغیر میں اردو زبان مسلم زبانوں کی متفقہ جہت وحدت ہے اور اسی لیے میراث مشترک ہے انا کا ترجمان بنا لیا جاتا ہے۔ اس مزاج کا آغاز بھی "اردو والوں" کی طرف سے ہوا تھا لیکن خرابی اس ذہنیت سے پیدا ہوتی ہے جہاں زبان کو روح کا ترجمان بنانے کی بجائے پاکستان میں یہ زبان ایک نئی تقدیر کی حامل ہے اور وہ تقدیر یہ کہ جن عناصر سے پاکستان کی ترکیب ہوئی ہے اور جن سے اس کا مزاج متعین ہو رہا ہے، ان کو سمیٹ کر اردو قومی وسعتِ قلب اور وحدتِ خیال کی نمائندہ ہے یہی یک جہتی کی اصل راہ ہے۔

پاکستان بننے سے کچھ پہلے جب پورا برصغیر ابوالکلام آزاد کی فصاحت سے مسحور ہو رہا تھا تو پشاور کے ایک جلسے میں ایک شخص نے ذرا شرما کے کہا تھا۔ میری اردو تو تانگے والے کی اردو ہے ۔ کسے خبر تھی کہ لغات صفحۂ کائنات کے بہتے ہوئے دریا میں یہ فقرہ اردو کی تقدیر بن جائے گا اور اب یہی تقدیر مقتدرہ کے ہاتھ ہے یعنی تانگے والے سے لے کر ایوانِ حکومت تک ایک لسانی یک جہتی پیدا کرنا جو شعوری اور قومی یک جہتی کی اصل بنیاد ہے اور پاکستان اردو اور تانگے والے [illegible] محافظ ۔

کلیم اختر

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ

صدرِ گرامیٔ قدر، جناب مہمان خصوصی وخواتین وحضرات ۔ السلام علیکم

میں مقتدرہ قومی زبان لاہور کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے ایک ایسی مجلس مذاکرہ کو خطاب کرنے کا موقع بخشا ہے جو پاکستان کے عالی دماغ افراد پر مشتمل ہے اور یہ امر میرے لیے باعثِ سعادت بھی ہے اور موجبِ مسرت وافتخار بھی۔

"قومی یک جہتی اور قومی زبان" ایسے موضوع کے سامنے آتے ہی جو دو لفظ ذہن پر ابھرتے ہیں وہ پاکستان اور اردو ہیں اور پھر ان لفظوں میں جو تیسرا لفظ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ علامہ محمد اقبالؒ کا نام ہے جو بلا شک وشبہ تصورِ پاکستان کے خالق اور اردو کے عظیم المرتبت شاعر ومفکر تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ حق بین کے سامنے قوم مسلم کا ایک خاص تشخص بھی تھا جس کا اظہار انھوں نے اجمالاً اور تفصیلاً اپنے اشعار وافکار میں کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

"قرآن کریم میں مسلمانوں کے لیے امت کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ نہیں آیا۔ قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اختلاف ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی۔ وہ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔ پھر فرماتے ہیں کہ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی کیونکہ دونوں صورتیں اسلام کے مطابق ہیں۔"

علامہ اقبالؒ کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ دین اسلام ہی پوری عالم انسانیت کے لیے مکمل ضابطہ حیات رکھتا ہے جو نسل، رنگ اور وطن کی حدود وقیود سے بالاتر ہے۔ فرماتے ہیں

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیتِ آدم

علامہ اقبال کا یہ تصور صرف سیاست، معاشرت یا معاشیات تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ ادبیات میں بھی اسی اصول کے قائل تھے اور ان دانش وروں کے مداح تھے جن کی فکر وتخیل علاقائی حد بندیوں سے بالاتر تھی۔ اپنی ڈائری اسٹرے ریفلیکشنز میں لکھتے ہیں۔

"میری دانست میں اسلامی ادبیات میں ہندوستان کے مسلمانوں کا اگر کچھ قابل لحاظ حصہ ہے تو وہ مرزا غالب کی بدولت ہے۔ وہ ان شاعروں میں سے تھے جن کی فکر وتخیل انہیں مذہب وقومیت کی حد بندیوں سے بالاتر کر دیتی ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ابھی ہونا باقی ہے۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اردو کلام کی اولین کتاب "بانگ درا" میں جس شاعر کو سب سے پہلے نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ مرزا غالب ہی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

اور یہ مشہور شعر اسی نظم کا ہے کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خالق تصورِ پاکستان نے اگر یہ کہا کہ برصغیر میں مسلمان ہندوؤں کے بعد سب سے بڑی اکثریت ہیں اور جغرافیائی لحاظ سے کئی علاقوں میں انھیں دوسری اقوام پر عددی برتری حاصل ہے اس لیے ان خطوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اپنی زندگی کو اپنے نظریات کے مطابق بسر کرنے کا آئینی حق حاصل ہے، وہاں انھوں نے اپنی مجوزہ اسلامی ریاست کے لیے جس زبان کو پسند کیا اور قومی یک جہتی کی علامت قرار دیا وہ زبان اردو ہی ہے اور یہی دیکھا گیا ہے کہ نظریاتی اساس کے بعد زبان ہی قومی یک جہتی کا وسیلہ ہوتی ہے چنانچہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے غیر مسلم باشندے فخر یہ خود کو اس ملک کا باسی کہتے ہیں کیونکہ مشترکہ زبان کے باعث ان کے درمیان دوریاں نہیں ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ ہمارے سامنے ریاست جموں وکشمیر کی مثال ہے۔ ۸۴،۴۷۱ مربع میل پر مشتمل یہ ریاست چار بڑے خطوں میں منقسم ہے۔ صوبہ جموں، صوبہ کشمیر، صوبہ لداخ اور گلگت وبلتستان۔ صوبہ جموں کے رہنے والے بلا امتیاز مذہب وملت

پنجابی، ڈوگری اور گوجری زبانیں بولتے ہیں۔ صوبہ کشمیر والے کشمیری زبان بولتے ہیں۔ پھر چلاوں علاقوں کے بسنے والوں کا طرز معاشرت اور بود و باش بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ لداخ میں بدھ مت کے پیروکاروں کی آبادی ۸۰ فیصد ہے۔ اس وقت جموں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور یہ ۲۰ فیصد ہیں۔ صوبہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو نوے فیصد ہیں جبکہ گلگت و بلتستان میں سو فیصد دین مبین کے ماننے والے ہیں۔ ان سب میں کوئی مذہبی، معاشرتی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے یگانگت نہیں ہے اور آج تک ریاست کے کسی حصے کے باشندے نے علاقائی خودمختاری کے لیے نہ آواز بلند کی ہے اور نہ ہی اپنی علاقائی زبان کے لیے تحریک چلائی ہے ان کی اگر کوئی چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے تو وہ ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے جس نے "کشمیری قومیت" کی یک جہتی کو قائم و دائم رکھا ہوا ہے جو گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے وہاں رائج ہے اس سے پیشتر وہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی حالانکہ ریاست جموں و کشمیر کا کوئی گوشہ ہمدان یا شیراز نہ تھا۔ یہ صرف غیر ملکی حکمرانوں کی زبان تھی جیسے ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے باعث انگریزی کا دور دورہ تھا لیکن یہاں پر نکتہ یہ ہے کہ زبان اردو ڈوگروں کی بھی زبان نہ تھی اور نہ ریاست میں کوئی لکھنؤ یا دہلی تھا اور نہ ہی وہاں کوئی کراچی تھا جہاں مہاجر اپنی زبان لاکر بس گئے ہوں۔ یہ صرف اردو کا اعجاز۔ اس کا پیار اور کشش تھی کہ اس نے جموں و کشمیر کے بسنے والوں کو قومی یک جہتی کی لڑی میں پرو دیا اور ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت نے دوسری اقلیتوں کو اسی وسیلے سے جذب کر لیا۔ یعنی ریاستی مسلمان، کسی دوسری قوم میں جاذب نہ ہوا اور نہ ہی ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت، مسلمانوں کو اپنی قومی وحدت میں نہ پرو سکی۔ کیونکہ ہندو قوم کا تصور قومیت۔۔۔ اسلام کے تصورات سے دیگر ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں علامہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ

"خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی"

مگر آج ہمارے ہاں جہاں یہ دعویٰ بھی ہے کہ اردو زبان لکھنؤ، دہلی اور دکن سے بھی پہلے موجود تھی اور حافظ محمود شیرانی نے تو یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس خطہ ارضی کا اردو سے قدیم تعلق ہے۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ زبان بدیسی ہے اجنبی ہے اور ملک کے کسی حصے میں بطور مادری زبان کے نہیں بولی جاتی۔ غالباً مولانا حالی نے ایسے ہی کسی موقعہ کے لیے کہا تھا کہ ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

افسوس اس بات کا ہے کہ قومی یک جہتی کا جواز ایک غیر مسلم جابر و ظالم ڈوگرہ حکمران پا گیا تھا۔ ہمارے اسلامی اقدار کے علمبردار اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ صداقت یہ ہے کہ اردو زبان کا نفاذ ہی قومی یک جہتی کی قوت کو مضبوط ترین بنا سکتا ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں درحقیقت ان عناصر کا بائیں بازو ہیں جو مسلمانوں میں تفرقہ بازی اور فرقہ پرستی پھیلا رہے ہیں اور یہی وہ گروہ ہیں جو قومی یک جہتی کے حریف اور قومی زبان کے نفا کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں پھر بعض دانشوروں اور مغرب زدہ لوگوں نے جدیدیت کی آڑ میں اردو کی مخالفت کو اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے بلکہ اب تو اردو اخبارات میں انگریزی کے صفحات بھی چھپنے لگے ہیں اور وزارت دفاع کی جانب سے کمیشن کے لیے اردو اخبارات کو انگریزی زبان میں اشتہار دیے جاتے ہیں علامہ اقبال نے کیا خوب بات کہی ہے۔

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

حضرات! پنجابی، بلوچی، سندھی، پٹھان، مہاجر اور کشمیری یہ سب پاکستانی قوم کے جزو ہیں اور اسی اعتبار سے یہ خوش قسمت ہیں کہ ان کی قدر مشترک اسلام ہے اور یہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں اور ان کو قدرت کی جانب سے ایک ایسی زبان میسر آئی ہے جو نہ صرف ملک کے گوشہ گوشہ میں با آسانی سمجھی اور بولی جاتی ہے بلکہ ایک بین الاقوامی زبان بھی بن چکی ہے اور اس ٹھوس حقیقت کو ملک کا با اختیار طبقہ بھی اچھی طرح سمجھتا ہے لیکن وہ اس کے نفاذ کے لیے ٹھوس اور عملی کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہماری اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے سبب مشرقی پاکستان میں سیاسی اور وطن دشمن عناصر نے زبان کا مسئلہ پیدا کیا تھا اور آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے یعنی ہم وطن عزیز کا ایک حصہ گنوا چکے ہیں اور قائد اعظم محمد علی جناح کی بات نہ مان کر شکست خوردہ اقوام کی صف میں گنے جانے لگے ہیں۔ یہاں پر مجھے شیخ سعدی کی ایک حکایت یاد آ رہی ہے کہ ایک بادشاہ کسی خوفناک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اطبائے یونان کے ایک گروہ نے متفقہ فتویٰ دیا کہ اس بیماری کی کوئی دوا نہیں ہے البتہ چند خاص صفات رکھنے والے آدمی کے پتہ سے علاج ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے اس کے لانے کا حکم دیا۔ ایک دہقان کا لڑکا ویسا ہی مل گیا جیسا کہ طبیبوں نے بتایا تھا۔ بادشاہ نے اس کے ماں باپ کو بلایا اور بہت سی دولت دے کر خوش کر دیا یعنی وہ اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ ان کا بیٹا بادشاہ پر قربان کر دیا جائے ادھر قاضی نے فتویٰ دے دیا کہ رعیت سے کسی آدمی کا خون بہانا بادشاہ کی جان کی سلامتی کے لیے جائز ہے۔ جب جلاد نے اس لڑکے کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور مسکرانے لگا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ہنسی کا کون سا موقعہ ہے۔ لڑکا نے کہا۔ اولاد کا ناز ماں باپ پر ہوتا ہے جو قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کرتے اور انصاف بادشاہ سے چاہتے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ ماں باپ نے دنیا کی مال کی لالچ میں مجھے قتل ہونے

کے لیے سونپ دیا ہے۔ قاضی نے میرے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے اور بادشاہ اپنی سلامتی میری ہلاکت میں دیکھتا ہے۔ اب سوائے خدائے بزرگ و برتر کے میں کوئی پناہ نہیں دیکھتا اسے بادشاہ تیرے ہی سامنے انصاف چاہتا ہوں۔ لڑکے کی باتیں سن کر بادشاہ کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا کہ اس بے گناہ بچے کے خون بہانے سے میرا مر جانا بہتر ہے۔ یہ کہہ کر اس کا سر چوما اور گود میں اٹھا لیا۔ بہت سا مال و دولت دے کر آزاد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی ہفتے کے اندر بادشاہ صحت یاب ہو گیا۔

حضرات۔ قومی یکجہتی اور قومی زبان ایک ہی چیز ہے مگر آزادی کی حالت اس بچہ کی مانند ہو گئی ہے جس کو بادشاہ کی جان بچانے کے لیے قاضی نے قتل کر دینے کا فتویٰ دے دیا تھا اور لالچی والدین نے اس کی زندگی کا سودا کر لیا تھا۔ محسن اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم فرماتے تھے۔ اردو مکمل زبان ہے اور اس میں ہر مضمون کی اصطلاحات موجود ہیں۔ وہ ڈاکٹر عسکری اور ڈاکٹر سی نے قادر کو اپنے مقدمہ میں بطور گواہ کٹہرے میں کھڑا کرتے تھے۔ اب ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مختصر ترین مدت میں لاتعداد کتب اور پمفلٹ شائع کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اردو تہی دامن نہیں ہے۔ خدا کرے ان کے اس ریکارڈ کام کو کسی کی نظر نہ لگے کیونکہ ہمارے ہاں یہ ریت ہے کہ جو کام کرتا ہے اس کے رقیب پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں علامہ اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے یہ جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

بات ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کی کر رہا تھا جو فرماتے تھے اردو زبان تو ٹھیک ہے مگر نوکر شاہی .....؟

اساتذہ پنشن کا حق دے دیا جائے گا، وزیر تعلیم

لاہور۔ ۲۸ مارچ۔ (اسٹاف رپورٹر) نیشنلائزڈ اساتذہ کو تاریخ تقرری سے پنشن، سلیکشن گریڈ اور گریڈ الحاق کی اسامیاں جلد دے دی جائیں گی اس بات کا یقین صوبائی وزیر تعلیم و خزانہ چوہدری ممتاز حسین نے آل پاکستان پرائیویٹ ٹیچرز فیڈریشن کے وفد کو دلایا جو انہیں اساتذہ کی پنشن کمیٹی کی رپورٹ سے آگاہ کرنے گیا تھا۔ صوبائی وزیر نے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ طلبا کو نظریہ پاکستان کے مناسب اہتمام کریں۔ تاکہ طلبا تعلیم پر خصوصی توجہ دیں اور تعلیم کا معیار بلند ہو سکے

امروز لاہور ۲۹-۵-۸۷ء

اردو سے یہ زیادتی کیوں؟

اخباری اطلاعات کے مطابق لاہور میں ٹریفک پولیس نے ایسی گاڑیوں کے چالان شروع کر دیئے ہیں جن کی نمبر پلیٹیں اردو میں ہیں پولیس کا موقف ہے کہ قانونی طور پر گاڑیوں کی نمبر پلیٹ صرف انگریزی میں ہونی چاہئے۔ پاکستان کی قومی زبان کے طور پر اردو جس احترام اور خصوصی سلوک کی مستحق ہے اس کا تذکرہ حکمرانوں کی تقریروں اور اصحاب سیاست کے بیانات میں تو تواتر سے ہوتا ہے لیکن عملاً اردو زبان کی کسمپرسی اور بیچارگی کا وہی عالم ہے جو قیام پاکستان سے قبل انگریزی عہد میں تھا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اردو کے مکمل نفاذ کے لئے دس سال کا عرصہ مقرر کیا گیا تھا مگر چودہ سال گزر جانے اور مارشل لاء دور میں اردو کے نفاذ کے لئے بلند بانگ دعووں کے باوجود اردو پاکستان میں اسی طرح اجنبی زبان ہے۔ اس قوم میں انگریزی دان اور انگریزی کے دلدادہ طبقے کی شرح پانچ فیصد سے زیادہ نہیں جبکہ اردو قومی رابطے کی زبان بھی ہے اور قومی جذبات کی عکاس بھی۔ چنانچہ اردو نمبر پلیٹوں والی گاڑیوں کا چالان دراصل اردو دشمنی کی علامت ہے۔ اس لئے ہمارے قانون ساز اداروں کو پہلی فرصت میں اردو کے وقار کو بحال رکھنے کے لئے اس ضمن میں قانون سازی کرنی چاہئے اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو فی الفور ٹریفک پولیس کے لئے یہ ہدایت جاری کرنی چاہئے کہ وہ ایسے محبان اردو سے زیادتی نہ کریں جنہوں نے اپنی گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں اردو میں لکھوا کر اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے اور صرف اس بنیاد پر جو چالان ہوئے ہیں انہیں کالعدم قرار دے کر گاڑیوں کے کاغذات ان کے مالکان کو واپس کرنے چاہئیں۔

نوائے وقت پنڈی ۲-۷-۸۷ء

اردو ٹائپ کاری کورس کے شرکاء میں اسناد کی تقسیم

راولپنڈی (پی پی اے) سیکرٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے زیر اہتمام شروع ہونے والا اردو ٹائپ کاری کا دو سراسالہ (جزوقتی) کورس مکمل ہونے پر ادارے کی جانب سے الوداعی تقریب منعقد کی گئی۔ جس میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر معین الدین صدیقی نے شرکاء کورس میں اسناد تقسیم کیں انہوں نے اپنی تقریر میں ادارے کی تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ادارے کی جانب سے سرکاری ملازمین (گریڈ ۵ تا ۲۰) کی حسن کارکردگی کو [illegible] کورس منعقد کئے جا چکے ہیں۔ جن میں ۵۰۰ سے زائد سرکاری ملازمین نے شرکت کی انہوں نے کہا کہ ہماری کوشش ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ اہلکاروں کو اردو شارٹ ہینڈ ٹائپ کاری کی تربیت دیں۔ کلاس انچارج عبدالستار نے شرکاء کورس کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شروع کئے گئے اردو ٹائپ کاری کورس سے طلباء اردو کے سلسلے میں بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

جنگ پنڈی ۱۲ اپریل ۸۷ء

آئی آر آئی لائبریری کا نام تبدیل کر کے ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری رکھ دیا گیا

راولپنڈی ۳۰ جون (نمائندہ) [illegible] پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ہجرہ کونسل کی افتتاحی تقریب میں عالم اسلام کے ممتاز محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی اسلامی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی لائبریری کا نام آئندہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری ہو گا۔ صدر پاکستان نے یہ اعلان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے گزشتہ سال ہجرہ ایوارڈ کی دس لاکھ روپے کی خطیر رقم ادارہ تحقیقات اسلامی کی لائبریری کو عطیہ کر دی تھی۔ اب یہ فیصلہ ان کی اس بے مثال [illegible] کے اعتراف کے طور پر کیا گیا ہے۔

نوائے وقت پنڈی ۱-۷-۸۷ء

مرزا ادیب

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ

آج جب میں نے "قومی یک جہتی اور قومی زبان" کے باہمی ربط و ضبط کے اہم اور قومی موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو معاً میرے ذہن میں ایک صحبت رفتہ کی یاد تازہ ہو گئی جو سالہا سال پیشتر انعقاد پذیر ہوئی تھی۔ ایک ادبی تقریب اختتام کو پہنچی تھی اور چائے کی میز کے گرد شرکائے تقریب جمع ہو گئے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میں اپنے محترم استاد پروفیسر حمید احمد خان کے پہلو میں کھڑا تھا اور ان کے قریب جسٹس ایس۔ اے رحمان اپنے کسی عقیدت مند کو آٹوگراف دے رہے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش میں، اُردو دشمنی اور اردو کی مخالفت کے سلسلے میں ناروا سلوک کیا گیا تھا اور مولوی صاحب بڑی مایوس حالت میں وہاں سے لوٹے تھے۔

واقعہ نیا نیا تھا اس لیے تہذیبی تقریبات میں اس کا ذکر عموماً ہوتا رہتا تھا۔ اس تقریب میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہوا تھا تو پروفیسر حمید احمد خان نے دکھ بھری آواز میں کہا تھا۔

"مشرقی پاکستان میں قومی زبان کی مخالفت کوئی عام اور معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ایک بڑا قومی المیہ ہے۔ اگر یہ مخالفت بڑھ گئی تو اس سے قومی یک جہتی کو سخت نقصان پہنچے گا کیونکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو مذہب کے علاوہ ایک مشترکہ زبان ہی ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہو سکتی ہے یہ رشتہ ٹوٹا تو خدانخواستہ ہم ایک دوسرے سے ٹوٹ جائیں گے۔"

میرے مرحوم و مغفور استاد نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اور بھی کچھ اسباب ہوں گے مگر یہ بھی مسلمہ ایک حقیقت ہے کہ ان علیحدگی ساز عناصر میں مشرقی پاکستان میں اردو کی بطور ایک مشترکہ اور قومی زبان کی مخالفت بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت قائداعظم نے علالت کے ایک بڑے خطرناک مرحلے پر ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی۔ میرے نقطۂ نظر سے قومی اور سرکاری زبان کے بارے میں قائداعظم کے ملفوظات ایک ایسے قومی راہنما کی بصیرت، حقیقت پسندی اور دور بینی پر دلالت کرتے ہیں جسے اپنی قوم سے زیادہ دنیا میں کسی چیز سے بھی محبت نہیں تھی وہ ایک ایسا صاحب بصیرت انسان تھا جو صدیوں کی گردش کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اپنی معجزہ نما کارکردگی سے ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی تقریروں کے دو نہایت اہم اقتباس پیش کروں کہ ان کی اہمیت پہلے بھی تھی اور بدستور آج بھی ہے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام سے آپ نے خطاب کیا تھا اور فرمایا تھا۔

"میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے۔ اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر کوئی غلط یا پریشان کن اثر پڑنے والا ہے۔ بالآخر اس صوبے کے لوگوں ہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اس صوبے کی زبان کیا ہوگی لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو اور اردو کے سوا کوئی زبان نہیں۔"

قائداعظم نے بڑے یقین سے اپنے مخاطبین کو اطلاع دی تھی۔

"جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ اردو ہی ہوگی۔"

جلسۂ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کی آواز فضا میں گونجی تھی۔

"اردو وہ زبان ہے جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اسے پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب ترین ہے۔"

اس موقع پر انھوں نے یہ بھی کہا تھا۔

"اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہو سکتی ہے۔ اردو میری ذاتی رائے میں اردو اور صرف اردو ہوگی۔"

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر کسی زبان کی بنیادی حیثیت یا اس کا اساسی مقصد واضح کرنا ہوگا تو کہا جائے گا کہ زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کوئی انسان اظہار جذبات کا کام لیتا ہے۔ ایک شخص اپنا ما فی الضمیر دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے تو وہ لازماً ایک زبان کے الفاظ

کو وسیلۂ ابلاغ بناتا ہے۔ یہ وسیلہ تقریری ہو یا تحریری، بہر صورت ابلاغ کا ذریعہ زبان ہی ہوتی ہے اور یہ ابلاغ اسی صورت میں ممکن ہے جب دو آدمی مکالمے کے توسط سے اظہار خیال اس زبان میں کریں جس سے دونوں واقف ہیں۔ ورنہ مینارِ بابل کا نقشہ سامنے آ جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مینار بابل کی تعمیر میں حصہ لینے والوں کو قدرت نے یہ سزا دی کہ ان کی زبانیں الگ الگ ہو گئیں۔ ایک بات جو کچھ لوگ کہتے تھے دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور یوں وہ ایک دوسرے کے لیے ایک طرح کے گونگے ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس زبان کو سمجھنے سے قاصر نہ رہے جو دونوں کے درمیان لسانی رابطے کا کام کر سکتی ہے۔

اردو پاکستان کے کسی بھی علاقے کی زبان نہیں ہے۔ اس پر علاقیت، صوبائیت کی مہر نہیں لگائی جا سکتی اسے فقط ایک علاقے، ایک صوبے، پاکستان کے صرف ایک حصے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زبان سارے پاکستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا اور یہ سمجھنا بالکل درست ہوگا کہ اردو ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جب پاکستان کے ایک علاقے، حصے اور صوبے کا رہنے والا کسی دوسری جگہ جائے گا تو وہ اسی زبان کو ذریعہ اظہار و ابلاغ بنائے گا۔ غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو کی وجہ سے ہماری بہت بڑی دقت دور ہوئی ہے۔ ہمیں اردو نے بہت بڑی سہولت فراہم کر دی ہے۔

اپنی پچھلی قومی تاریخ کا مطالعہ کیجیے جب پاکستان کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا تھا اور برصغیر کے کروڑوں انسانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو کر متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" تو اس وقت کس زبان نے انسانوں کے اس جمِ غفیر کے دلوں کو باہمی افہام و تفہیم کی وساطت سے ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ کیا ان کے لیے یک جہتی کا ذریعہ اردو نہیں بنی تھی؟

ہماری جنگ آزادی کی تحریک یہ تحریک ۱۸۵۷ء کی ہو یا ۱۹۴۷ء کی۔ اردو زبان ہی میں چلائی گئی تھی ذرا تصور کیجیے اگر آزادی کے متحدہ محاذ کے ساتھ ساتھ لسانی محاذ بھی قائم ہو جاتا تو یہ دونوں تحریکیں بروئے کار آ سکتی تھیں؟ ان تحریکوں میں اردو ہی یک جہتی کا جذبۂ اظہار تھا۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قومی مسئلے کو، جذبات سے الگ ہو کر مرکزِ توجہ بنانا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی مسئلہ جذبات سے کلیتاً الگ ہو بھی سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایسے مسئلے کو حل کرتے وقت جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ایک سائنسی اندازِ فکر اپنانا چاہیے عقلیت کو بطور ایک راہبر اصول کے ماننا چاہیے اور اس غور و فکر کے دوران متعلقہ حقیقتوں اور دشواریوں کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

اردو یک جہتی کی کئی جہتیں پیدا کر سکتی ہے مثلاً یہی دیکھیے کہ ہمارے دینی، ثقافتی اور عمرانی سرمائے کا بہت بڑا حصہ اردو میں محفوظ ہے یہ سرمایہ ہم سب کا ہے کسی ایک گروہ کا نہیں۔ یہ سرمایہ جب سب کا ہے تو یہ سب اس سرمائے کے وسیلے سے ایک نہیں ہو سکتے؟ کیا یہ اردو کا ایک بڑا اہم قومی معدل نہیں ہے؟

اردو پاکستانی قوم کے لیے ایک پہچان کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ قومی تشخص، قومی زبان ہی سے بنتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی نہایت ایک اہم تحریر قومی زبان اردو ہمارا قومی تشخص میں واضح کیا ہے۔ یہاں یہ بات بہت اہم ہے، بہت ضروری ہے کہ صوبائی اکائیاں قومی تشخص کے عظیم مقصد کی خاطر ایک اکائی اختیار کر لیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ پاکستان کے چاروں صوبے یہ اکائی اپنی لسانی اکائیوں کو مٹا کر کریں۔ ایسا ممکن نہیں عقلی اعتبار سے بھی، منطقی طور پر بھی اور ایک فطری اصول کے اعتبار سے بھی! میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اردو کسی بھی صوبے کی زبان نہیں یہ پاکستان کے ہر ہر حصے، ہر ہر علاقے اور ہر ہر جغرافیائی اکائی میں بسہولت تمام سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اس کی حیثیت قومی زبان کی ہے اور قومی زبان کی حیثیت سے یہ پاکستان میں ہر مقام پر قومی یکجہتی کے تصور کو عملاً قائم کرتی ہے، ابھارتی ہے، مستحکم کرتی ہے۔

پاکستان کو قومی یک جہتی کے لیے ایک قومی زبان کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی بصیرت افروز کتاب "پاکستان میں اردو کا مسئلہ" میں بجا طور پر لکھا ہے۔

"اردو مختلف صوبوں کے درمیان رابطۂ مودت قائم کرنے کے لیے بہترین وسیلہ ثابت ہوگی۔"

اس سے متصل فرمایا ہے۔

"پاکستان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ان بکھرے ہوئے صوبوں کو کم از کم لسانی طور پر ایک رشتۂ وحدت میں پرو دے۔ یہ زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔ سرکاری زبان بننے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔"

جو زبان بقول محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان رشتہ مودت قائم کرنے کا بہترین وسیلہ ثابت ہو سکتی ہے وہ قومی یک جہتی کے معاملے میں کیسے پیچھے رہ سکتی ہے؟ صوبوں میں ایک ناقابل شکست رشتہ مودت و محبت پیدا کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اسے لازماً بہر صورت اور بہر حال حل ہونا چاہیے تو قومی یک جہتی کا مسئلہ ناقابل حل مسئلہ نہیں رہتا۔

اردو ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہمارے سارے صوبوں کو لسانی طور پر ایک رشتۂ وحدت میں پرو سکتی ہے۔ اس رشتۂ وحدت سے لسانی وحدت کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوگا۔ ہماری قوم کو قومی یک جہتی کے سفر میں بہت آگے بڑھ جانے کا موقع بھی مل جائے گا۔

اگر ہمیں اپنے درمیان قومی یک جہتی کے عمل کو مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھانا ہے تو ہمیں کھلے دل سے، اپنے دل سے ساری تعصب پذیر فروعات نکال کر قومی سطح پر غور کرنا ہوگا اور جب ہمارے قلوب صوبائی عصبیتوں کے زہر سے پاک ہو کر اس قومی مسئلے کو قومی دردمندی کے ساتھ سوچیں گے اور اس بات پر غور کریں گے کہ قومی یک جہتی کا مسئلہ کس طرح حل ہو تو سب سے نمایاں چیز جو ہمارے سامنے آئے گی وہ اردو اور صرف اردو ہوگی۔

اشفاق احمد

مقابلے کے امتحان اور قومی زبان

جناب والا! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر "مقابلے" اور Competition کے سخت مخالف ہوں اور اسے نسل انسانی کے خلاف ایک مہلک ہتھیار تصور کرتا ہوں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کمپی ٹیشن ہمیشہ انسانوں کے درمیان ہوتا ہے اور کمپی ٹیشن میں انسان بہ مقابلہ پتھر، کھمبا، درخت، مینار، گورخر اور کبک دری وغیرہ نہیں ہوتا بلکہ انسان بہ مقابلہ انسان ہوتا ہے۔ اس میں بازی جیت لینے اور جھنڈی لے جانے والا تو بڑا محترم ٹھہرتا ہے اور شکست خوردہ گروہ، پائمال وخوار، پریشان و دردمند رہ کر بقیہ زندگی بسر کرتا ہے اور ساری عمر محجوب سا رہ کر بالآخر گمنامی کے گہرے غار میں اُتر جاتا ہے ــــ لیکن کمپی ٹیشن اور اس کے اجتماعی اور انفرادی نقصانات پر ہم کسی اگلے سیمینار میں بات کریں گے اس وقت مسئلہ قومی زبان کا ہے۔

(۱) کمپی ٹیشن کے امتحانات ایسے ببر بچوں اور شاہین زادوں کو منتخب کرنے کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں جو آگے چل کر مفلوک الحال، بے عقل، بے نوا اور ہارے ہوئے لوگوں کے غول کو اپنی دانش مندی سے اپنی پسندیدہ روش پر چلا سکیں۔

اگر آپ نے امریکن فلمیں دیکھی ہیں تو آپ کو یہ حقیقت سمجھنے میں ذرا آسانی ہوگی کہ بڑے بڑے Ranches پر، موٹی موٹی گیلیوں اور پرانی پرانی شہتیریوں سے گھرے چوڑے چوڑے باڑوں میں ممیانے اور بلبلانے والی جو بھیڑیں اور بچھیائیں ہوتی ہیں ان کے درمیان گھوڑے پر سوار ایک "کاؤبوائے" ہوتا ہے۔ اس کاؤبوائے کے ہاتھ میں رسّے کا ایک پھندا ہوتا ہے جسے وہاں کی مقامی بولی میں Lasso کہتے ہیں۔ یہ کاؤبوائے اس کو اپنے سر کے اوپر لہرا کر اور گھما کر جس گائے یا جس بچھیا یا جس بھیڑ کے گلے میں وہ پھندا ڈالنا چاہے آسانی سے ڈال سکتا ہے۔ دوسرے سارے جانور اس گھومتے ہوئے رسّے کے نیچے تھر تھر کانپتے سارے باڑے میں اس طرح سے بھاگتے ہیں جس طرح زلزلے کی گڑگڑاہٹ سن کر چرند پرند، وحوش وطیور، درندے اور چوپائے سراسیمگی کے عالم میں افتاں وخیزاں جان بچانے کو پُرسکون مقام تلاش کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر جان دیتے ہیں۔ ان چرندوں پرندوں اور وحوش وطیور کی موت نما گھبراہٹ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ زلزلے کی بولی اور اس کی گڑگڑاہٹ کی زبان نہیں سمجھتے۔ باڑے کے اندر بھاگ بھاگ کر ہلکان ہونے والی گاؤں اور بچھیاؤں کے اوسان بھی اس وجہ سے خطا ہوتے ہیں کہ وہ کاؤبوائے کی بولی نہیں سمجھتیں۔ یا یہ کہہ لیجیے ان کی اور کاؤبوائے کی زبان ایک نہیں ہوتی۔ کاؤبوائے کے پاس خوفزدہ کرنے کے لیے کچھ آوازیں ہوتی ہیں جو زلزلے کی گڑگڑاہٹ سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے معصوم غول کانپ کانپ کر باڑے کے اندر گھومتے ہیں اور بہت سے کمزور ان جھڑکیوں اور پٹاخوں اور Lasso کی گھومتی ہوئی شوکر کے سامنے بے حال ہو کر گرتے ہیں اور پھڑک کر مر جاتے ہیں۔

کمپی ٹیشن کا کامیاب افسر کاؤبوائے ہوتا ہے جو اپنے ہنٹر کی چٹخ اپنے پھندے کی شوکر اور اپنی بولی کی ناآشنائی کی وجہ سے اپنے علاقے کے لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی بولی کے مختلف ہونے کی بنا پر من و تو کے درمیان فاصلہ قائم رکھتا ہے اور اسی فرق کی بدولت انتظامی امور حسن اور سلیقے کے ساتھ طے کرتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے گزٹیوں میں لکھا ہے کہ اگر حاکم اور محکوم کی بولی ایک ہو جائے تو حاکم اور محکوم ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جب وہ قریب آجاتے ہیں تو ان میں بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے جب بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے تو ڈسپلن قائم نہیں رہتا۔ جب ڈسپلن قائم نہیں رہتا تو کاروبار سلطنت ٹھپ ہو جاتا ہے اور جب کاروبار سلطنت

ثبت ہو جاتا ہے تو اس سے مخلوقِ خدا کو تکلیف پہنچتی ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ حاکم اور محکوم افسر اور ماتحت اور حکومت اور عوام کے درمیان زبان اور بولی ایک سی نہ ہو۔ ان کے درمیان افہام و تفہیم کی راہیں اتنی واضح اور ایسی آسان نہ ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گلگشتیاں کرتے پھریں اور ان کے درمیان کوئی حدِ ادب باقی نہ رہے۔

جناب والا مجھے آپ کے موضوع اور موضوع کے عنوان سے ہی بنیادی اختلاف ہے مقابلے کے امتحانوں میں اگر قومی زبان کو ذریعہ اظہار رکھا جائے گا تو وہ مقابلے کے امتحان نہیں رہیں گے اور اگر ملک کی بہتری اور فلاح کے لیے مقابلے بازوں اور افسروں کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو پھر قومی زبان کو ان سے اور ان کو قومی زبان سے کم از کم اتنی دور رکھا جانا چاہیے جتنی دور کلاشنکوف کی گولی مار کرتی ہے۔

(۲) اس وقت پاکستان میں دو کلچر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ایک کلچر راہنماؤں کا دوسرا پیروؤں کا ایک LEADERS کا دوسرا LEAD کا۔ راہنماؤں کے گروہ نے بڑی دیر سے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے گھر میں پیدا ہونے والے چھوٹے راہنماؤں یعنی رہنمازادوں کو اس کلچر سے دور رکھیں گے جو کلچر پیروؤں کا ہے۔ دوسرے کلچر یعنی راہنماؤں کے کلچر کی مضبوط اساس اس بات پر قائم ہے کہ اس کے اظہار اور اس کے اعلان اور اس کے کلام کے لیے ایک ایسی زبان استعمال کی جائے جس کا پیروؤں کو علم نہ ہو ایک ایسی بولی اختیار کی جائے جس کا علم صرف برہمنوں کو ہو شودروں کو نہ ہو۔ چنانچہ اس راہنمائی کلچر کی توانائی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قیام پاکستان سے پہلے اس شہر میں کل پانچ انگلش میڈیم سکول تھے اور اس وقت ۲۶۳ انگلش میڈیم سکول ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اس لیے نہیں کہ وہاں کی تعلیم بہتر ہے بلکہ یہ کہ ان کا تکبر اور گھمنڈ بہتر ہے جس کی بنا پر عمومی چوڑا اینٹھی تنکرا بنایا جا سکتا ہے۔

مسئلہ کمیشن کے امتحانوں میں ذریعۂ اظہار کی تبدیلی کا نہیں، مسئلہ اس ارادے میں تبدیلی کا ہے جس سے ایسی سوچ پیدا ہوئی، پھر یہ سوچ بھی ہماری اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ جب چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کے بارہ بجے گوری ایسٹ انڈیا کمپنی نے پاکستان کی چابیاں کالی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کیں تو اس نے کہا کالو! اچھی، مضبوط، مستحکم اور پائیدار حکومت قائم رکھنے کے لیے پانچ باتوں کا خیال رکھنا۔

(۱) ایک تو مقامی باشندوں کو زیادہ منہ نہ لگانا اور ان سے بے تکلف نہ ہونا۔
(۲) دوسرے پولیس اور پٹواری کے ذریعے رعایا کی گردن میں مسلسل انگوٹھا دیے رکھنا وہ قابو میں رہیں گے۔
(۳) تیسرے رومن لا کے مقابلے میں کوئی دوسرا قانون اپنے ملک میں رائج نہ ہونے دینا۔
(۴) چوتھے ہمارے والے کلچر کو نیٹوز کے کلچر پر حاوی کر کے رکھنا اور اس کی برتری کا لوہا ہر وقت منواتے رہنا۔
(۵) اور پانچویں۔ اور یہ سولہ تھو رستہ اور سرے پہ گانٹھ والی بات ہے کہ رعایا کی زبان کو اپنی، سرکاری، خزانے کی اور عدالت کی زبان نہ بننے دینا۔ اس سے وہ بے تکلف ہو جائیں گے اور خواہی نہ خواہی امور مملکت کے کاموں میں دخل دینے لگیں گے اور یوں حکومت کی باگ ڈور پر تمہاری گرفت کمزور کر دیں گے۔ ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے لیکن جسمانی طور پر تم سے بہت دور ہونے کی وجہ سے ہمارے واسطے کافی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم ہمارے والی زبان کو ہمارے ہی محاورے میں ہمارے بنائے فارموں کے اندر ہمارے ہی فارمیٹ کے مطابق چلاتے جانا کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ گوری ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے کہا ہم نے یہ راز دو سو سال کی ریاضت اور سارے دریاؤں کے تنوں پر تپ کر کے حاصل کیا ہے اس کو ضائع نہ ہونے دینا یہی تمہارے طویل قیام حکومت کا راز بنے گا اور یہی تمہاری برتری کی وجہ قرار دیا جائے گا۔

اب جب تک کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہو جائے اور اس دنیا میں حق حقدار کی طرف رجوع کرنے کی کوئی نئی اور بڑی سبیل پیدا نہ ہو اس وقت تک سیمینار کر کے یا مقالے لکھ کے یا محض خواہش کر کے غصب شدہ حق واپس نہیں لیا جا سکتا اور وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی سے۔ توبہ توبہ۔ یہ کمپنی بڑی ڈاھڈی ہے۔ گوری ہو یا کالی ایسٹ انڈیا کمپنی پھر کمپنی ہے۔ کمپنی بہادر ہے۔

اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے قانونی تقاضے پورے کئے جائیں گے

بیگم تابش الوری کی تحریک پر وزیر قانون کی یقین دہانی۔ ریاض حشمت جنجوعہ نے بھی تحریک پیش کی۔

لاہور ۵ اپریل (اپنے نامہ نگار سے) آج پنجاب اسمبلی میں وزیر قانون راجہ ظلیق اللہ نے اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ پنجاب میں قومی زبان اردو زبان کو دفتری اور عمومی زبان بنانے اور اسے دفتروں میں رائج کرنے کے لئے ضروری قانونی اقدامات کئے جائیں گے۔ یہ یقین دہانی وزیر قانون کو پہلے سے پنجاب اسمبلی کی رکن بیگم تابش الوری کی تحریک استحقاق پر کرائی گئی جس میں اردو کو عملی طور پر بطور قومی زبان رائج کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ آئین ۱۹۷۳ء میں واضح طور پر درج ہے کہ اردو کو قومی زبان بنایا جائے گا۔ اور اس کے لئے ۱۵ برس کی مدت بھی مقرر کی گئی ہے۔ مگر [illegible] ہاں سرکاری طور پر سرکاری افسروں میں [illegible] کوشش نہیں کی گئی۔ جب کہ آئین کو نافذ ہوئے ۱۴ برس ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک انگریزی زبان کی حکمرانی قائم ہے اور اردو کو اس کا جائز مقام نہ دیا جا سکا۔ نہ صرف قومی زبان کی توہین بلکہ آئین کی بھی خلاف ورزی ہے۔ اس طرح اس ایوان کا اجتماعی اور انفرادی حق مجروح ہوا ہے۔ اس پر وزیر قانون نے بتایا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے کے لئے ضروری قانونی تقاضے پورے کئے جائیں ان کی اس یقین دہانی پر بیگم تابش الوری نے اپنی تحریک پر زور نہیں دیا۔ آج ایوان میں جھنگ کے پنجاب اسمبلی کے رکن ریاض حشمت جنجوعہ نے بھی تحریک استحقاق پیش کی۔ انہوں نے بھی وزیر تعلیم راجہ ظلیق اللہ کی یقین دہانی پر اپنی تحریک استحقاق پر زور نہیں دیا۔

نوائے وقت لاہور ۱۶-۴-۸۸ء

ڈاکٹر وزیر آغا

مقابلے کے امتحان اور قومی زبان

خواتین و حضرات! مقابلے کے امتحانات کے سلسلے میں قومی زبان سے جو بے اعتنائی روا رکھی گئی ہے اس کا ایک پس منظر بھی ہے وہ یہ کہ مقابلے کے امتحانات کو انگریز بہادر نے محض اس لیے رواج دیا کہ وہ اس کے ذریعے ایک خاص وضع کی افسر شاہی کو وجود میں لانے کا خواہاں تھا۔ ایک ایسی افسر شاہی جو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی انگریز کی تہذیب، زبان اور مقاصد کے لیے بروئے کار لائی جا سکے۔ خود انگریز انگلستان میں رہتے ہوئے بلکہ بمبئی کی بندرگاہ پر اترنے سے پہلے تک ایک عام سا انسان دکھائی دیتا تھا مگر جیسے وہ ہندوستان کی دھرتی پر اپنا قدم رکھتا تو ایک "عظیم انسان" بلکہ سپرمین بن جاتا اور یہ سب کچھ ایک خاص منصوبے کے تحت ہوتا تھا تاکہ فاتح اور مفتوح میں مناسب فاصلہ برقرار رہے چونکہ زبان اس قسم کے فاصلے کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ معاون ہے لہٰذا انگریز کی یہ پالیسی تھی کہ اس کے اعلیٰ افسر اپنے اور عوام کے درمیان زبان کی دیوار کھڑی رکھیں تاکہ انگریز کی عملداری نیز اس کی تہذیبی اور لسانی برتری کا ایک گہرا احساس ہندوستانیوں کو اپنی گرفت میں لے سکے اور وہ بھیڑوں کے ایک گلے کی طرح لاٹھی کے اشارے پر چلنے اور رکنے کے وظائف بخوبی ادا کرتے چلے جائیں۔

قیام پاکستان سے ذرا پہلے کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مشہور انگریز جج نے پنجاب کے ایک کالج میں کانووکیشن ایڈریس دیتے ہوئے جب یہ کہا کہ "میں دو قومی نظریے کا حامی ہوں" تو پورا ماحول فی الفور دو متحارب گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہال میں موجود ہندی مسلمانوں نے تو اس اعلان کا تالیوں سے سواگت کیا جبکہ ہندی ہندوؤں نے مکمل چپ سادھ لی مگر جب دوسرے ہی لمحے اس انگریز جج نے کہا کہ "میں دو قومی نظریے کا حامی ہوں۔ ایک قوم ظالم کی، دوسری مظلوموں کی" تو پورا ہال زعفران زار میں تبدیل ہو گیا کیونکہ انگریز بہادر نے قطعاً غیر شعوری طور پر معاشرے کو ظالم اور مظلوم میں تقسیم کر کے اذہان کو غربت اور امارت کے اس بُعد القطبین کی طرف متوجہ نہیں کیا تھا جن کا اظہار اشتراکی ذہن رکھنے کی بنا پر اس انگریز جج کا منتہائے مقصود تھا بلکہ حاکم اور محکوم کی تقسیم کو اجاگر کر دیا تھا اور یوں انگریز کی حکومت کے خلاف ہندوستانی عوام کی شدید نفرت مزید متحرک ہو گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب قدرت اللہ شہاب مرحوم نے سول لائن کلچر کا ذکر چھیڑا تو یہ بھی حاکم اور محکوم کے فرق ہی کو اجاگر کرنے کی ایک کاوش تھی۔ بیوروکریسی کا لائینفک ہونے کے باوجود شہاب صاحب حاکم اور محکوم کے فرق کو کلچر کی سطح پر نشان زد کر رہے تھے مگر اس وقت بھی اور آج بھی اکثر لوگ اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ کلچر کا فرق زبان کے بُعد ہی سے پھوٹتا ہے وجہ یہ کہ زبان وہ پل ہے جو دو ثقافتوں اور دو قوموں کو ایک دوسری سے ملاتا ہے جب یہ پل ٹوٹ جائے تو درمیان میں دریا کا کشادہ پاٹ حائل ہو جائے گا اور پھر قومی یک جہتی کا سارا تصور محض ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔

مقابلے کے امتحانات کا مقصد اعلیٰ افسروں کا ایک خاص طبقہ پیدا کرنا ہے تاکہ حکومت کا کاروبار چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ طبقہ انگریز کی حکومت کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھائے یا پاکستان کی تہذیب اور ثقافت اس کے خوابوں اور آدرشوں کی تکمیل کے لیے کام کرے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے اس ادارے کا وہ بلیو پرنٹ تاحال تبدیل نہیں ہوا جو انگریز نے رائج کیا تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ مقابلے کے امتحانات میں انگریزی زبان کا تو بول بالا ہے جبکہ قومی زبان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک روا رکھا گیا ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ مقابلے کے امتحانات قومی زبان اردو میں ہوتے مگر ہوا یہ کہ قومی زبان کو محض ایک پرچے تک محدود کر دیا گیا بعد ازاں اس ایک پرچے کی حد تک بھی اس کی کارکردگی پر کاری ضرب لگا دی گئی یعنی اسے قومی سطح کی بجائے صوبائی زبانوں کی سطح تفویض کر دی گئی۔ شیکسپیئر کے کردار کے الفاظ میں یہ The most unkindest cut of all تھا کیونکہ اس سے قومی زبان پوری طرح پس منظر میں دھکیل دی گئی۔ میری ناچیز رائے میں وطن عزیز میں کلچر کی جو دو لہریں پیدا ہوئی ہیں اور جن کی نشاندہی قدرت اللہ شہاب مرحوم نے کی تھی وہ مقابلے کے امتحانات کی خاص وضع اور قومی زبان کے سلسلے میں برتی گئی بے اعتنائی ہی کا شاخسانہ ہیں۔ انگریزی کو اعلیٰ ملازمتوں کے سلسلے میں اتنی زیادہ اہمیت تفویض کرنے کا ایک یہ نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے کہ وطن عزیز میں انگریزی میڈیم سکولوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے ان تمام سکولوں کا مقصد ایک ایسے طبقے کو پیدا کرنا ہے جو انگریزی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر خود کو مقابلے کے امتحان کے لیے تیار کر سکے اور پھر اس امتحان سے گزر کر حاکموں کی ایک الگ قوم میں تبدیل ہو جائے حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کا تصور تو دو قومی نظریے کی اساس پر استوار تھا لیکن مقابلے کے امتحانات میں اردو کے سلسلے میں غلط پالیسی اختیار کرنے کے باعث پاکستانی قوم بتدریج دو قوموں میں تقسیم ہوتی چلی گئی ہے مگر پانی ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے۔ اس سے قبل

ڈاکٹر صفدر محمود

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ

جناب صدر

معزز خواتین و حضرات!

میں روزنامہ جنگ اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کو قومی زبان کے موضوع پر سیمینار منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اردو زبان کا تحریک پاکستان سے جو گہرا رشتہ ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو سے ہمارا تعلق صدیوں کی ثقافتی، تاریخی، سیاسی اور دیگر کئی جہتوں سے رہا ہے کیونکہ جن وجوہ کی بنا پر ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی ان میں زبان بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اسی جداگانہ قومی تشخص نے اپنی تہذیبی ضرورتوں کے لیے پاکستان کے مطالبے کی شکل اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ بانئ پاکستان حضرت قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں اپنے تاریخی خطبے میں اردو کے بارے میں دو ٹوک لفظوں میں یہ بتایا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی۔ اس تقریر کے حوالے سے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کئی بار متنازعہ بحثیں بھی ہوئی ہیں لیکن آج اگر ہم بانئ پاکستان کی تقریر پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ قومی یک جہتی کے لیے ایک قومی زبان کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔

میں نے دوسرے ممالک میں کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور مجھے یہ بتلاتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے کہ پاکستان شاید واحد ملک ہے جس کے مندوبین دوسرے ملکوں میں جا کر اپنی زبان میں بات کرنے سے شرماتے ہیں اور انگریزی میں اظہار کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح عام دفاتر میں بھی سرکاری اجلاسوں کے دوران انگریزی بولنا قابلیت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور اردو بولنے والوں کو رجعت پسند اور کم درجے کے لوگ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم پوری فضا نہیں بدلیں گے اور سارے جالے صاف نہیں کریں گے اس وقت تک قومی زبان کو دفتری زبان بنانا مشکل ہے۔

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب پاکستان میں کئی ادارے بالخصوص مقتدرہ قومی زبان نفاذ و ترویج اردو کے لیے کوشاں ہے اور اس راستے میں جو مشکلات ہیں انہیں دور کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ مولوی عبدالحق سے نفاذ اردو کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب ڈاکٹر وحید قریشی تک آ پہنچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب یہ قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گا اور اردو دفتروں میں اپنا منصب پالے گی۔ اس لیے کہ یہی مسلمانان پاکستان کے دل کی آواز ہے اور یہی اس ملک کے مستقبل کی ضمانتوں میں سے ایک ہے جس کے بغیر معمار مستقبل اندھیروں سے نہیں بچ سکتا۔

اگر قومی زندگی میں یہ رشتہ ختم ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو اس کے نتائج کس قدر بھیانک ہوں گے اس کا تجربہ ہمیں ۱۹۷۱ء میں ہو چکا ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علاقائی زبانوں کا بھی ایک اپنا مقام ہے اور انھیں بھی پھلنا پھولنا چاہیے لیکن خاص حدود میں رہ کر۔ کیونکہ دریا اسی وقت دریا رہتا ہے جب تک یہ کناروں کے درمیان بہتا ہے۔ بین الصوبائی رابطے کے لیے یقیناً ہمیں ایک مشترک قومی زبان کے سہارے کی ضرورت ہے جسے ہم اکائی کی زبان قرار دے سکیں اور جس کے ذریعے پٹھان، بلوچی، سندھی، پنجابی اور دیگر علاقائی زبانیں بولنے والے افراد بھی قومی سطح پر ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو سمجھ سکیں۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اردو اسلامی ثقافتی ورثے کی امین ہے اسلامی ممالک کی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے اس کا رشتہ اس قدر گہرا ہے کہ اردو کا وجود ان زبانوں سے قائم ہوتا ہے اور اردو کے کچھ نہ کچھ الفاظ بھی ان زبانوں میں مل جاتے ہیں میں جب بھی اپنے ملک سے باہر تاشقند، ترکی یا عربی بولنے والے کسی ملک میں گیا ہوں اردو جاننے کی وجہ سے مجھے ان کا مدعا سمجھنے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوئی گویا اردو ہمیں اسلامی ممالک سے ملانے کا ذریعہ بھی ہے۔

اب کچھ باتیں آج کے بارے میں، یعنی اردو ہمارے دفتروں کی زبان کیوں نہ بن سکی۔ میرے نزدیک اس کی دو وجوہات سامنے آتی ہیں۔

پہلی یہ کہ قیامِ پاکستان کے وقت اردو کے ایسے ادارے بہت کم تھے۔ جہاں انگریزی اصطلاحات محاورات اور فقرات کا فوری طور پر اردو ترجمہ کیا جا سکتا اور جو حکومتی مشینری تھی وہ انگریزی کے سو سالہ دور کی بھٹی سے نکل کر آئی تھی اور ان لوگوں کے لیے اردو کی بجائے انگریزی کے گھڑے گھڑائے فقرے لکھنا زیادہ آسان تھا۔ اس وقت انھیں یہ باور نہیں کرایا جا سکا کہ دفتروں میں استعمال کے لیے اردو، انگریزی کی نسبت کہیں آسان ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو سرکاری زبان تھی وہی چلتی رہی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہماری ساری انتظامیہ یعنی سی ایس ایس، فیڈرل سروس کمشن اور مقابلے کے سب امتحانات میں قابلیت کا معیار صرف انگریزی ہے اور کامیاب ہونے والے بیشتر اصحاب انگریزی سکولوں سے ہی پڑھ کر آتے ہیں چنانچہ ان کے کچھ ذہنی تحفظات ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ اردو کی مخالفت کرتے ہیں۔

Two systems of education

PROF. M. SIDDIQ KALIM

Recently, the Federal Minister for Education enlarged upon the two parallel systems of education working in this country and their deleterious effect on national development. These were noble sentiments but one wonders how he is going to sort all this out.

The declared policy of the Government is to fully replace English by Urdu as the medium of instruction and that the Matriculation examination by the year 1990 will be an entirely through the Urdu medium. Together with this, another stream of education runs with the full approval and permission of the Government. This is the Senior Cambridge Certificate examination for which some few English medium and European type schools prepared the candidates previously. Most of these schools were affiliated to the University of London or of Cambridge.

The previous regime had for reasons of its own exempted these schools from nationalization. With the privatization policy pursued by the present regime, there took place a mushroom growth of private English medium or European type schools, with a view to preparing students for the Senior Cambridge Certificate examination or equivalent O level examination of foreign universities. They are affiliated to one or the other British or American University. Now two questions arise: should there exist two streams of education in the Country? And should some institutions be allowed to affiliate themselves with foreign universities or institutions?

As regards the first question, although one could hold a plea for special schools, which have always existed in one or the other country, standardisation of school education has been the policy of the developed nations. It is in Pakistan and such the Third World countries that there exists a great variation of standards to the extent of presenting contrasts. The concept of good education aiming at strengthening democratic institutions of a country, consists in creating schools for each residential area, and of the same standard in terms of facilities, that is, the qualifications and ability of the teachers, school building, apparatus and equipment. This concept also involves employment of local teachers as far as possible. This is in the final analysis linked to the concept of school management by a local council. This more or less applies to the privatization of schools which are not given absolute freedom in regard to the fees realized from the students.

The Federal or the Provincial Government has to place its nominees on the Boards of Management, if these schools have any or insist on the creation of such governing bodies. Whereas the Education Departments and Boards of Intermediate and Secondary Education prescribe conditions for the recruitment of the teaching staff as well as the creation of facilities as those of libraries, laboratories and playgrounds, etc., which may or may not be strictly observed while granting recognition or affiliation to various institutions, they have no powers to fix the amount of fees realizable from the students. The Government must move in to fix the maximum limits. Most of these institutions are commercially organized and earn huge profits which enable them to proliferate and thus earn more profits. This is rooted in the class system and thus economic exploitation in an extremely accentuated and exaggerated form, since we are not applying even the 20th Century capitalism to our institutions but that of the early Industrial era in Europe.

There are no doubt special schools which contribute a good deal in various countries to the development of a country. There are agricultural high schools which train students to become better farmers, there are industrial schools in cities preparing students to enter skilful industrial employment. The schools have to become activity oriented so that the students can enter into diversified fields of employment as well as develop an initiative for self employment. The present educational policies do stress these requirements but without insisting on their implementation. The implementational side suffers for lack of proper inspection and vigilance. The students too are not attracted towards these streams as such since the hierarchical system of Grades and the free for all market in terms of prices and even black-marketing and smuggling confuse them, if not attitudinize them.

The second important question which I raised earlier in this article is more serious. The affiliation of Pakistani institutions and schools to foreign universities gives a wrong orientation to students right from the beginning. They are not likely to identify themselves with the Pakistani society. The extra territorial loyalty established at an impressionistic stage of these children, boys and girls, may prove extremely harmful as the said Minister rightly pointed out. Most of the bureaucracy and the professional expertise comes from this class and the results could be well imagined. But why not do away with it? Cannot we ask our Boards of Intermediate and Secondary Education to organize the Senior Cambridge, O level and A level examinations? If we have teachers and examiners for our M.A./M.Sc. examinations, why cannot we find examiners for these levels.

Some of these schools have recruited foreign advisers and teachers at fabulous rates, just to boost the sale since it is on purely commercial lines that they are running their schools. A survey of the qualifications of teachers in Pakistan will reveal that we have foreign trained teachers of all types and varieties who are not gainfully employed and whose expertise is going waste even when they are in employment. It is they who should be made responsible for the further training of teachers in various fields and specialities.

Despite all types of schools, government and private, the educational standards have by and large fallen. It is said that the greatest failure occurs in the general scheme which the Government is itself managing directly. It is already analysed in terms of large classes, teacher apathy, student indifference and parental insouciance etc. But why we cannot overcome these difficulties? It is again rooted in the class system which also gives rise to corruption and thus unpardonable indifference to duty. The bureaucracy often shields such officials and teachers.

The delagation of authority, which is experimented in this country in this or that manner, has resulted in the accumulation in the hands of District Education Officers who behave as great bureaucrats and have no idea of being educationists. This attitude is being acquired by the teachers themselves, who are, though bureaucratic in their attitude, are in no way proud of being teachers. What has happened is that the idea of enlightening the minds of students no longer exists in the teaching scheme. Even the information and what may be called imparting education (in a very restricted sense) grievously suffer between the two poles of education, the teacher and the taught, and in the present situation, both being at fault, in their own ways.

A homogeneous improvement of education and of society on egalitarian lines demands a system of school education which should be characterized by a more or less uniformity of standards. The existing two systems or multi systems of education are not only unjust and amusingly contrastive but also detrimental to the well-being of the country, not to talk of its development on egalitarian lines.

عبدالرحمٰن قریشی

یکساں ذریعہ تعلیم

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس میں اختلاف کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کہ ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک میں ذریعۂ تعلیم ایک ہی ہونا چاہیئے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سرکاری درباری زبان اردو نہ ہو جائے یہاں اس اہم پہلو کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اگر زندگی میں ترقی کرنے اور بلندیوں تک پہنچنے کی کنجی اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کے ہاتھ میں رہی تو پھر اردو کبھی ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکتی. یہاں سب سے اہم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے ملک میں اب تک ایسا کیوں نہیں ہو سکا ۔؟ پھر اس کے امکانات کیا ہیں ؟ ۔ اور اس کے فروغ کے لیے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے ؛

میرے خیال میں پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیے کہ ہر درس گاہ میں سائنس اور حساب اردو زبان میں ہو اور ان دونوں مضامین کو اس زبان میں پڑھانے کا ٹھوس انتظام ہو جائے یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ محض چند تکنیکی یا سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ کر دینا ہی اردو کی افادیت میں اضافے کے لیے کافی نہیں ہے اور نہ ہی یکساں ذریعہ تعلیم اس کی اہمیت اور افادیت کو آگے بڑھا سکتا ہے. مذکورہ علوم میں چونکہ بیشتر اصطلاحیں عربی یا فارسی سے مستعار لی گئی ہیں اس لیے ان میں اجنبیت اور بیگانگی کا رنگ موجود ہے اور یہی رنگ ہماری اصل سوچوں اور نظریات اور ہماری راہ فکر میں بالکل اسی طرح حائل ہے جیسے کوئی دوسری غیر زبان. اور پھر، صرف زبانیں پڑھنے سے سائنس یا دورِ جدید کی ایجادات سے پورا استفادہ حاصل کرنے کی اہلیت نہیں بڑھتی بلکہ سائنس کے میدان میں نئی دریافتوں اور نئے خیالات اور نظریات معلوم کرنے کے لیے زبان کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان کی وکالت کی جاتی ہے، کیونکہ جدید علوم تک رسائی اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انگریزی زبان سے کسی حد تک واقفیت حاصل نہ کی جائے .

یہ درست ہے کہ جاپان. چین ، روس ،اسکنڈے نیویا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک نے اپنی ہی زبان میں ترقی کی راہیں کھولی ہیں، اور یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ ان کے ہاں تجسس دریافت، تحقیق. ایجاد، غور و فکر اور جدت کی روایت شعر و شاعری کے علاوہ زندگی کے عملی پہلوؤں میں بھی نمایاں ہے. زبان جب تک عملی شکل میں زندگی کا اہم جز نہیں بن جاتی اس وقت تک کوئی بھی قوم ترقی نہیں کر سکتی. جب تک کوئی قوم اپنی زبان کے ساتھ مخلص نہیں ہوتی اس وقت تک زبان بے زبان ہی رہتی ہے اور اس کی مخفی قوتوں اور اس کے زور پرواز کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک اسے پورے خلوص اور محبت سے استعمال نہ کیا جائے .

ان عوامل سے قطع نظر جنھوں نے ہمارے ملک میں اردو کو پنپنے نہ دیا، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دورِ حاضر میں کسی اہل زبان نے کوئی ایسی ایجاد یا نیا اور اچھوتا نظریہ پیش نہیں کیا کہ غیر اقوام اس کی جانب متوجہ ہوتیں اور ان میں اردو سیکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہوتا پھر ہمارے ہاں تراجم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے کہ ہم فوری طور پر دوسری زبانوں کے علوم سے واقفیت حاصل کر سکیں. اس کے برعکس جاپان میں ترجمے کا اتنا مؤثر اور تیز انتظام موجود ہے کہ ان کی ہر یونیورسٹی کے ہر شعبے میں جدید سائنس، اس کی تراکیب، نت نئی ایجادات اور ان ایجادات سے متعلق وہ تمام لٹریچر جو روز جنم لے رہا ہے، فوری طور پر ترجمہ ہو کر ان کے اپنے سائنس دانوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے مفکر اور سائنس دان نہ صرف جاپانی بلکہ انگریزی زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں. انھوں نے اپنی ترقی کے ابتدائی دور میں انگریزی زبان کو بڑی محنت اور جانفشانی سے سیکھا اور انگریزی علوم کا نچوڑ حاصل کر کے عملی طور پر اس سے استفادہ کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے علم و عمل کا ایسا امتزاج پیش کیا کہ انہیں جہاں جہاں سے نئے نظریات ملے. انھوں نے نہ صرف ان نظریات سے اپنے علمی خزانے کو وسعت بخشی بلکہ ان نظریات کو عملی صورت میں ڈھالا اور اس طرح بہت کامیاب تجربے کیے. بعد میں یہی تجربات ان کا علمی سرمایہ بنے اور اس اطلاق سے انھوں نے جدت اور ایجاد کی روایت کو خود اپنی جاپانی زبان میں جنم دے کر اسے اور آگے بڑھایا.

جب تک کسی زبان میں یہ اہلیت نہ آجائے اس وقت تک محض ترجمے کے ذریعے دوسروں کی سائنسی اور تحقیقی ایجادات کو پڑھ کر اتنا ہی استفادہ کیا جا سکتا ہے جتنا کہ عام لوگ اخبار پڑھ

کو مستفید ہوتے ہیں ۔ یہ معلوم کرنا کہ گاڑی کیسے چلتی ہے کچھ مشکل نہیں ۔ مگر آگہی کی اس منزل پر پہنچنا کہ انسان نہ صرف گاڑی چلا سکے بلکہ گاڑی کو خود بنا سکے بلکہ اس کے سارے میکانکی عمل میں مزید اختراع کر کے اسے اور بھی خوبصورت بنا سکے ۔ اس منزل تک پہنچنا صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہماری فکر اور اس کے ذریعۂ اظہار میں مکمل ہم آہنگی ہو ، ورنہ تخیلات اور تصورات اگر اپنے اظہار کے لیے الفاظ کی تلاش میں بھٹکتے رہیں تو وہ قیمتی تخیلات مکمل طور پر اپنی زبان میں منتقل نہیں ہو پاتے اور ان کا بہتر حصہ عموماً ضائع ہو جاتا ہے ۔

زبان اور اہل زبان کی سوچوں کے رویے کو بھی کسی قوم کے آگے بڑھنے میں بڑا دخل ہے ہمارے ہاں ایک بچے کو مجبوراً کئی زبانیں بیک وقت سیکھنی پڑتی ہیں مثلاً میری مادری زبان پنجابی ہے ، عبادت کی زبان عربی ہے ۔ کبھی کبھی فارسی کا استعمال بھی کرتا ہوں جبکہ میری قومی اور میرے تشخص کی زبان اردو ہے مگر بدقسمتی سے علم اور روزگار کی زبان انگریزی رہی ہے اس صورت حال کی ذمہ داری آپ سب جانتے ہیں کہ کس پر ہے ۔ آپ پر ، مجھ پر ، تاریخ پر ، دور حاضر کے رویوں پر اور مستقبل کے تقاضوں پر ۔ میں اس بات اور حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اگر میرا ذریعۂ تعلیم ، میرا ذریعۂ روزگار اور میری علمیت اردو میں ہوتی تو یقیناً میں ایک مختلف انسان ہوتا ۔ ایک ایسا انسان جو تمام جدید علوم اور ایجادات سے مکمل طور پر آگاہ ہوتا ۔ لیکن یہ المیہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ قوم کے ہر فرد کا ہے اور کم و بیش سبھی اس سے دوچار ہیں ہمارے ہاں یہ مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت اس لیے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے کہ ہمارے ہاں ہر پچیس تیس میل کے بعد زبان بدل جاتی ہے اور ہم مختلف زبانوں اور مختلف لب و لہجوں میں کچھ یوں بٹے رہتے ہیں کہ ایک قوم ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہوتے ہیں ، کیونکہ سارے ملک کی مادری زبان ایک نہیں ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک کی مادری اور قومی زبان ایک ہی ہے ۔ چنانچہ یہ مادری اور قومی زبان کی ہم آہنگی انھیں ایک رکھتی ہے اور وہ زبان کی ڈور میں تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے رہتے ہیں ۔ بکھرتے نہیں ۔ اس کے برعکس ہم قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ اب فرض کیجیے کہ ہم اس شخص کو تمام علوم اردو میں سکھانا شروع کر دیں جس کی مادری زبان پشتو ، سندھی ، ہندکو یا بلوچی ہے تو کیا وہ اردو زبان میں ان علوم کو اسی آسانی کے ساتھ سیکھ سکے گا جس طرح اپنی مادری زبان میں سیکھ سکتا ہے ؟ ۔ ہرگز نہیں ۔ اس کے لیے تو اردو بھی اسی طرح غیر زبان ہی بنی رہے گی جس طرح ہمارے لیے انگریزی ۔

میری ان باتوں سے یہ تاثر ہرگز نہ لیجیے گا کہ میں انگریزی کی وکالت کر رہا ہوں ! محض اس لیے اس زبان کی حمایت کر رہا ہوں کہ میں خود ایک ایسے ادارے سے وابستہ ہوں جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی کا ہے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ میں ایک سچا اور کھرا پاکستانی ہوں ، سوٹ اور ٹائی کے باوجود پاکستانی ہوں اور بہت سے پاکستانیوں سے بہتر پاکستانی ہوں کیونکہ میں خود تحریک پاکستان کا ایک سرگرم رکن رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ یہ ملک ہم نے کتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ۔ میں بھی آگ کے اسی دریا سے گزرا ہوں جس سے میرے دوسرے ساتھی گزرے ہیں چنانچہ مجھے اپنے ملک اور اپنی قومی زبان سے وہی محبت ہے جو ایک سچے پاکستانی کو ہونی چاہیے ۔ اگرچہ یہ بات کہنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں تھی مگر مجھے یہ بات اس لیے کہنی پڑی کہ میرے سلسلے میں آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں اور غلط فہمی کا شکار ہم لوگ فوراً ہی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم لوگ ابھی تک اختلاف کے آداب سے بھی مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں ، ہم بہت جذباتی ہو کر سوچتے ہیں اور نظریاتی اختلاف کو شخصی اختلاف بنا کر ایک دوسرے سے متنفر ہو جاتے ہیں ۔ یہ بڑا خوف ناک رویہ ہے ۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں جذبات سے قطع نظر ایک قوم کی حیثیت سے سوچنا چاہیے کہ آخر قوم کی بھلائی کے لیے کون سی بات زیادہ سودمند اور بہتر ہے ۔

میں سمجھتا ہوں اور یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ بیک جنبش قلم انگریزی کو حرف غلط کی طرح ہرگز نہیں مٹایا جا سکتا اور راتوں رات اردو کو ذریعۂ تعلیم بھی نہیں بنایا جا سکتا اس کے لیے وقت درکار تھا ، اور ہے اور جب تک ہم مکمل طور پر اردو میں خودکفیل نہیں ہو جاتے ہمیں انگریزی کو درآمد کرنا ہی پڑے گا پھر یہ درآمد محض چالیس سال کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہم دو سو سال کے طویل عرصے سے اس زبان سے استفادہ کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسی لیے اب یہ زبان رشتے کی حدود سے بہت آگے نکل آئی ہے اور باہمی رابطے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ پورے ملک میں یہ زبان تعلیم یافتہ افراد کے درمیان سمجھی اور بولی جاتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کے علاوہ بہت سے فنی و تکنیکی شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کا یہی واحد ذریعہ ہے اور مسلم ممالک نے جو ترقی اب تک زندگی کے مختلف شعبوں میں کی ہے اس کی وجہ یہی انگریزی زبان سے واقفیت اور اس کا ادراک ہے ۔ اس اہم ضرورت کو سرسید احمد خان نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور اس ضمن میں انہیں جن انتہا پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا اسے یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔

ان حالات اور واقعات کی روشنی میں ہمارا رویہ جذباتی نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ یہ سوچنا چاہیے کہ ہماری قوم کی مجموعی فلاح کے لیے اور اس ملک کے مستقبل کے لیے کون سی راہ بہتر ہے ۔ آج کی دنیا میں ہم غیر ممالک سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتے اور اس کے لیے سائنسی شعبے میں ہمیں قدم قدم پر انگریزی زبان سے سابقہ پڑے گا ورنہ ہم ترقی یافتہ ممالک سے اور بھی پیچھے رہ جائیں گے ۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی بحث میں نہ خود الجھنا چاہتا ہوں اور نہ اس مسئلے کو

ایک متنازع مسئلہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں دل و جان سے اردو زبان کے حق میں ہوں لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جن دریچوں سے علم کی تازہ ہوا آئے انہیں ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے۔

پھر ہماری ایک اور بہت بڑی مجبوری یہ ہے کہ ہمارے وہ ہم وطن مسلمان جو غیر ممالک میں ایک طویل عرصے تک آباد رہے مگر اب وطن واپس آنے کے خواہش مند ہیں، ان کے بچوں کے لیے یہاں کوئی ایسی درس گاہ ضرور ہونی چاہیے جہاں وہ بین الاقوامی سطح پر علم حاصل کر سکیں اور کیمبرج یا لندن یونیورسٹی کے امتحانات اپنے وطن میں بیٹھ کر پاس کر سکیں۔ میرے پاس آئے دن بے شمار عرضیاں آتی ہیں مگر چونکہ بورڈنگ ہاؤسز میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ میں سب کو داخلہ دے سکوں اس لیے مجھے معذرت کرنی پڑتی ہے اور مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کے کام آنے سے معذور ہوں۔ ان حالات میں ایسے اداروں کا قائم رہنا اور چلتے رہنا بہت ضروری ہے جو نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ ہمیں اندازہ یہ کرنا چاہیے کہ ہماری ملکی ضروریات کیا ہیں اور اگر ان ضروریات کا تقاضا یہ ہو کہ کچھ ادارے کسی اور زبان میں بھی چلتے رہنے چاہییں تو ہمیں ان کے وجود اور ان کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک ہم اردو زبان کو بین الاقوامی سطح اور معیار کی زبان نہیں بنا لیتے اس وقت تک دونوں زبانوں کو اہمیت دینا چاہیے اور انھیں ایک ساتھ چلنا چاہیے پھر بیشتر یورپی ممالک ایسے موجود ہیں جہاں BILINGUAL اور MULTILINGUAL نظام رائج ہے۔ دور کیوں جائیں ہمسایہ ملک بھارت کو دیکھ لیں کہ ہندی کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی زبان سے بھی برابر کا استفادہ کر رہے ہیں اور سائنس اور دیگر شعبوں میں انھوں نے جو ترقی کی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

میں نے ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک اپنے شعبے یعنی طبیعات میں متعدد مضامین کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے اور یہ مضامین بہت پہلے سے "قندیل" اور دیگر رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے مجھے دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ اردو زبان میں متبادل الفاظ کو تلاش کرنا اور خود سے ایجاد کرنا بہت مشکل مرحلہ ہے چونکہ میں خود عملی طور پر ان مراحل سے گزرا ہوں اس لیے عمل کی راہ میں جو دشواریاں حائل ہیں ان سے میں بخوبی واقف ہوں۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کا حل عمل میں ہے، حل عقل میں ہے، حل حکمت میں ہے، دوراندیشی میں ہے اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر عقل کی روشنی میں قدم اٹھانے میں ہے۔

میرے نزدیک فی الوقت اس کا مؤثر حل یہی ہے کہ ہم روزِ اول ہی سے یکساں ذریعۂ تعلیم اپنائیں اور اردو میں سوچ کی، بیان کی اور افکار کی وسعت پیدا کریں۔ یونیورسٹی کی سطح پر خصوصی شعبے قائم کیے جائیں جہاں اردو دان تحقیق کریں، ترجمے کریں، لسانیات پر کام کریں، ذخیرۂ الفاظ کو بڑھائیں اور تمام سائنسی اختراعات کو اردو زبان میں منتقل کریں۔ نہ صرف سائنسی بلکہ فنی اور خصوصیت کے ساتھ فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں بھی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی جائے تب ہی یہ وطن، یہ مٹی، یہ لوگ اور یہ زندگی حسین سے حسین تر ہو سکے گی پھر جیسے جیسے زبان ترقی کرتی جائے ویسے ویسے درجہ بدرجہ اعلیٰ علوم کو بھی اردو میں منتقل کرتے جائیں۔ اگر ایسا ہو تو ایک وقت آئے گا جب ہمیں اعلیٰ سطح پر بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں صرف ذریعہ تعلیم ہی تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ طریقۂ تعلیم میں بھی تبدیلیاں لائیں جو انقلابی ہونے کے باوجود آسان ہوں تاکہ رٹنے کی چکی میں پسنے والے نوعمر طالب علم سوچوں کی کھلی فضا میں اپنی ہی شخصیت اور بو باس میں کھل سکیں۔ یہی ندرتِ خیال آگے چل کر عمل کی نئی راہیں کھولے گی اور اردو ذریعۂ تعلیم از خود مؤثر ثابت ہوگا ورنہ تو عرب اور عجم سارا مادری زبان پڑھ رہا ہے لیکن ایجادات کے لیے جدید دور کے تقاضوں کے سامنے مجبور اور بے بس نظر آتا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں محض ذریعۂ تعلیم ہی پر زور دیتے رہنے اور طریقۂ تعلیم کو یکسر نظر انداز کر دینا ہرگز مفید ثابت نہ ہوگا جتنا ہم کہتے رہتے ہیں۔ پھر اگر اپنی زبان میں یہ اہلیت موجود نہیں تو کم از کم سردست سائنس اور حساب کے مضامین میں انگریزی کو اپنانے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔

ساتھ ہی ساتھ اگر ہماری قوم کے "صاحب بہادر" اور ان کے دفاتر کی زبان بھی اردو ہو جائے تو بھی یہ چیز یکساں ذریعۂ تعلیم اپنانے میں بڑی معاون اور مددگار ثابت ہوگی کیونکہ اس حقیقت سے تو کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری قوم کا وہ رٹنے باز ہمارے امتحانوں میں اچھے نمبر حاصل کرنے کی اہلیت اسی لیے حاصل کر لیتا ہے کہ وہ دوسروں کے افکار اور تحریروں کو بڑی خوبصورتی سے منعکس کر دیتا ہے۔ وہی اعلیٰ سول سروس میں آ جاتا ہے، قوم میں اقتدار کے راستے صرف اسی کے لیے کھلے ہیں، سارے مواقع اسی کو حاصل ہیں کیونکہ امتحان کی جس منزل سے وہ گزرا ہے، وہ امتحان اس کے حافظے کا امتحان ہے، اس کی اصلیت کا امتحان ہرگز نہیں ہے۔

اردو سے اجتناب اور انگریزی کی جانب جو رجحان ہے وہ اسی لیے ہے کہ یہی انگریزی انھیں معاشرے میں اعلیٰ و ارفع مقام دلاتی ہے، یہی انگریزی انہیں بلند تر منازل کی طرف لے جاتی ہے چنانچہ وہ اردو کو انگریزی کے مقابلے میں کمتر اور حقیر تصور کرنے لگتے ہیں پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فنی تعلیم مثلاً انجینئرنگ اور میڈیکل وغیرہ میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اس میں انگریزی زبان کا ایک اہم کردار ہے اور چونکہ یہ خزانے غیر زبانوں ہی میں موجود اور محفوظ ہیں تو فطری طور پر لوگ انہی کی جانب کھنچتے ہیں لہٰذا اردو

زبان میں جو یکساں ذریعۂ تعلیم بننے کا موجب بن سکتی ہے اس میں ہمیں پہلے یہ اہلیت پیدا کرنا ہوگی کہ لوگ خود بخود اس کی جانب کھنچیں، اور اس کے لیے ہمیں جذبات سے ہٹ کر واقعاتی حالات کا جائزہ بھی لینا ہوگا اور وہ تمام اقدام کرنے ہوں گے جو فروغ اردو کے سلسلے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔

ہمیں نہ صرف یہ کہ یکساں ذریعۂ تعلیم اپنانا ہوگا بلکہ یکساں طریقۂ تعلیم اور یکساں طریقۂ امتحان کو بھی خلوص دل کے ساتھ اپنانا ہوگا کیونکہ امتحان ہی نظام تعلیم کے ڈھانچے کو صحیح اور صحت مند خطوط پر استوار کرتا ہے اور اسے قومی تقاضوں کے عین مطابق ڈھالتا ہے جب تک نظام امتحان درست نہیں ہوگا اس وقت تک یکساں ذریعۂ تعلیم ہونے کے باوجود ہماری تعلیمی حیثیت دگرگوں اور انحطاط پذیر رہے گی۔ یکساں ذریعۂ تعلیم اپنانے کے سلسلے میں کوئی اختلاف ممکن ہی نہیں البتہ اس کو اپنانے کے انداز اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں میں اہلیت حاصل کرنے کی کاوشوں کو روک دینے کا نظریہ میری نظر میں سراسر غلط ہے۔ جب تک یہ بنیادی اور اہم کام جن کی جانب میں نے نشاندہی کی ہے، ساتھ ساتھ نہیں چلیں گے، اس وقت تک یکساں ذریعۂ تعلیم وہ نتائج مرتب نہیں کر سکے گی جن کی توقع ہمیں ہے اور جس کے بارے میں ہم بہت جذباتی بھی ہیں۔

Minister favours Cambridge system

Dawn Islamabad Bureau

MAY 12: Education Minister Nasim Aheer on Tuesday said that he was in favour of having English as the country's second language

The Education Minister speaking in English told *Dawn* in an exclusive interview that almost all the Third World countries had made English as their second language which he said was a wise move Pleading for promotion of English in Pakistan he said he was not against Urdu which he said was the national language He said there was no rivalry between English and Urdu and it must not be thought that total abolition of English would help promote Urdu.

He said the Government wished the Cambridge system to flourish but not at the cost of Urdu. Both the languages he said were necessary and therefore both would continue to be used as medium of instruction.

The Education Minister strongly pleaded for continuation of Cambridge system in the absence of which he said students would not be able to keep themselve abreast with latest research in medical, engineering and other sciences. What he said he failed to comprehend was that why was there so much hue and cry against the Cambridge system Fliminating the Cambridge system and switching over to another system he said was not a measure of one's patriotism. Those who dubbed English as Urdu's rival language were not rational, he added.

Immediate abolition of Cambridge system would mean closure of 5000 prestigious institution which would ruin the career of 1 3 million students, the Minister said Fven in the case of maths and science subjects, English would be treated as optional subject, he said

The sad truth, the Minister said, was that even parents of those students enrolled at English-medium schools were dissatisfied by the type of education their children were receiving there. These students were found to have little or no knowledge of their own religion and socio-cultural background which was a "tragedy". The Government, he said, could not and would not make parents to get their childres enrolled at any particular school. Affluent parents, he said, wished their children to study under Cambridge system while parents with low income preferred state-owned institutions where medium of instruction was Urdu, he said.

The Government, he said, had taken upon itself to remove disparity between English-medium and Urdu-medium students by promoting English in public-sector schools also The Minister hoped a time would come when the trend of getting children enrolled in costly institutions would decline.

The Education Minister declared that drastic changes in country's existing setup would be introduced to make it future oriented and in accordance with aspiration of all sections of the society

To a question the Minister said the number of institutions granted permission to continue the Cambridge system was 5,000 where 1.3 million students were enrolled. The permission was given in 1983 only to those institutions having reputation of offering the students excellent education

The Education Minister made it clear that so far not a single institution in public sector was permitted to opt for the Cambridge system.

The only solution to this escalating "medium" controversy the Minister said was that in all state-owned schools English should be introduced from Class VI as compulsory subject, while Urdu should remain as compulsory medium of instruction for all the other subjects

Asked about the progress of work in respect of translating textbooks in Urdu and other regional languages, the Minister said adequate work has been done in this connection. However, since the job was not of an ordinary nature, it will take time and concentration. The Minister hopefully said that by 1989 all matric examinations in government schools should be taken in Urdu.

ڈان کراچی ۱۳ مئی ۸۶ء

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

دفاتر میں اُردو کا نفاذ

دفتروں میں اردو کا نفاذ ایک اہم مگر نازک قومی مسئلہ ہے ہمارے دوسرے مسائل کی طرح اسے بھی وسیع تر قومی تناظر میں دیکھا جانا چاہیئے. گزشتہ چالیس برسوں میں پاکستان یکے بعد دیگرے جن بحرانوں سے گزرا اور ان پر قابو پانے کے لیے جو کچھ کیا گیا اس کے نتیجے میں ہمارا ملک اور قومی احساس دونوں عدم استحکام کا شکار ہوئے. بدقسمتی سے قومی شعائر کے احترام اور ان کے فروغ کا سوال ہماری ترجیحات میں مناسب مقام نہیں پاسکا اس لیے قومی زبان بھی کے بارے میں ایک قسم کی بے تعلقی. بلکہ بے حسی کو روا رکھا گیا ہم اب تک اسے اپنی زندگی میں وہ اہمیت نہیں دے سکے جو اس کا حق ہے ۱۹۴۷ء میں ہم نے انگریز سے تو آزادی حاصل کر لی مگر انگریزی کی غلامی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے. معمولی سے معمولی نام کے لیے عام آدمی کا ذہن بھی انگریزی ہی کی طرف جاتا ہے. انگلش میڈیم ہماری کمزوری بن چکا ہے. بیشتر تعلیم یافتہ لوگ جس بے جواز انگریزی آمیز اردو میں گفتگو کرتے ہیں قومی زبان کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے جب ہم اردو کو اپنی عام زندگی میں نافذ نہیں کر سکے تو دفتروں میں اس کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے. ہمارا یہ ذہنی رویہ بھی نفاذ اردو کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے.

اس رویے کی تشکیل میں انگریزی کی برتری سے قطع نظر زبان کے بارے میں ہمارا غیر محتاط عمل اور ردعمل بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے. آزادی سے پہلے برصغیر کی لسانی صورتحال نسبتاً واضح تھی اردو کو متحدہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی اور ہندی کو تمام ہندوؤں کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی لیکن آزادی کے بعد یہ صورت حال برقرار نہ رہی اس حمایت میں کمی آئی اردو اور ہندی کو تقریباً ایک جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا اور نتیجتاً اردو اب تک پاکستان کی اور ہندی بھارت کی سرکاری زبان نہیں بن سکی دراصل جدوجہد آزادی کے جوش و خروش میں بعض مسائل کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی لیکن حصول آزادی کے بعد جب یہ جوش و خروش دھیما پڑ جاتا ہے تو وہ مسائل سر اٹھاتے ہیں اس طرح نو آزاد ملکوں میں بعض اوقات سماجی اور سیاسی حالات، قومی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اردو اور ہندی اپنے اپنے ملک میں ایسی رکاوٹوں سے دوچار ہیں تحریک پاکستان کے دوران اردو کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس سے یقین ہو گیا تھا کہ اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن قانون ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس ہی سے واضح ہو گیا کہ بات اب اتنی آسان نہیں رہی،

مشرقی بنگال میں لسانی تحریک کے نتیجے میں بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا اس طرح اردو کی مسلمہ اور متفقہ حیثیت کو دھچکا لگا.

یہ لسانی فیصلہ بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا. مغربی پاکستان میں اردو کی قومی حیثیت کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہاں بھی بعض عناصر نے صوبائی زبانوں کو قومی زبان کے مقابل لانے کی کوشش کی. پاکستان کو دولخت کرنے میں لسانی مسئلے نے جو کردار انجام دیا اس کے پیش نظر حکومت اور عوام دونوں اس مسئلے پر جرأت مندانہ مؤقف اختیار کرنے میں تذبذب کا شکار ہو گئے اس طرح افسر شاہی حالات کو جوں کا توں رکھنے میں کامیاب رہی اور اردو دفتروں میں بار نہ پا سکی.

۱۹۷۲ء میں سرحد اور بلوچستان میں جو صوبائی حکومتیں برسر اقتدار آئیں انھوں نے اپنے اپنے صوبے میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا لیکن ان حکومتوں کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا مارشل لا کی حکومت نے اردو کے نفاذ کے لیے بہت سے اقدامات کیے لیکن ان اقدامات کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے اور نفاذ اردو کی منزل ابھی نہیں آئی.

موجودہ نظام تعلیم سے بھی اردو کو وہ مدد نہیں مل سکی جو اسے ملنی چاہیئے تھی جس زبان کو زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہونا ہے اس کی تدریس کا معیار بہتر اور نصاب میں اس کا مقام بلند ہونا چاہیئے لیکن اردو کی تدریس اس نہج پر ہو ہی نہیں رہی جس سے وہ قومی زندگی میں اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو سکے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ تدریس اردو انتہائی ناقص انداز سے ہو رہی ہے ہمارے ماہرین تعلیم ابھی تک یہ بنیادی مسئلہ نہیں طے کر پائے کہ اردو ہماری اولین زبان ہے یا ثانوی یہی وجہ ہے کہ تعلیمی تقاضوں کے مطابق درست طریقۂ تدریس نہیں اختیار کیا جا سکا. زبان کے عملی اور افادی پہلو کی بجائے ادب کی تدریس پر زور دیا جا رہا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ و طالبات روزمرہ زندگی میں زبان سے کام نہیں لے سکتے کیونکہ انھیں اس بات کی تربیت ہی نہیں دی جاتی ادب بھی پڑھایا جانا چاہیئے لیکن اس کی مقدار اور مرحلے کا تعین ضروری ہے. اردو کو انٹرمیڈیٹ کی سطح تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت دیکر مطمئن ہو جانا کافی نہیں سنا ہے نئی سکیم میں سائنس کے طلبہ کے لیے اردو کا بوجھ ہلکا کیا جا رہا ہے لیکن اتنی سی اردو پڑھا کر طلبہ و طالبات کو قومی ذمہ داریوں کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا. اردو کے نصاب اور طریقۂ تدریس

دونوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس طرح اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ بھی ہونا چاہیئے اس سے جہاں طلبہ کو سہولت رہے گی وہاں ان کی اردو کو بھی تقویت ملے گی موجودہ حالات میں اردو کی اس محدود تعلیم کے ساتھ ساتھ دفتری کاروبار اردو میں چلایا نہیں جا سکتا اس طرح موجودہ نظامِ تعلیم دفتروں میں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں مؤثر ثابت نہیں ہو سکا۔

پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے کچھ بنیادی کام کرنے کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی۔ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اردو کے نفاذ کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مرکزی ادارے کا قیام بہت ضروری تھا یہ ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے نام سے قائم تو ہوا لیکن اس کا قیام ۱۹۷۹ء سے پہلے عمل میں نہ آ سکا دراصل نفاذِ اردو کے لیے ٹھوس کام اس ادارے کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اس سے قبل پنجاب میں مجلس زبان دفتری ۱۹۴۹ء سے کام کر رہی تھی ۲۸ سال کی مسلسل محنت کے بعد اس ادارے کی طرف سے دفتری اصطلاحات کا لغت ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ یہ لغت دفتری اصطلاحات و محاورات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے جنوری ۱۹۸۰ء میں نفاذِ اردو کا تین مرحلوں پر مشتمل ایک تدریجی پروگرام پیش کیا۔ اس منصوبے کی چھپی سفارشات مارچ ۱۹۸۱ء میں کابینہ ڈویژن کو ارسال کی گئیں اس کے مطابق ۱۹۸۳ء تک سرکاری دفاتر میں اردو کا نفاذ مکمل ہونا تھا یہ منصوبہ ابھی تک حکومت کے زیرِ غور چلا آ رہا ہے ۱۹۸۴ء میں وفاقی حکومت کے دفاتر میں کچھ کام اردو میں کرنے کی بھی ہدایات جاری کی گئی ہیں لیکن ان پر پوری طرح عملدرآمد نہیں کیا جا رہا ہے۔

نفاذِ اردو کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ ہماری افسر شاہی ہے ان کے لیے اردو کا انگریزی کی جگہ لینا صرف ایک انتظامی نہیں نفسیاتی مسئلہ ہے۔ استعماری دور کی باقیات اس افسر شاہی کی برتری کا انحصار جن چیزوں پر ہے انگریزی ان میں سب سے اہم ہے اگر انگریزی کی جگہ اردو لے لے تو ان کی انفرادیت اور عظمت کا ستون گر جائے گا صاحب لوگوں کو یہ گوارا نہیں کہ وہ عوام کی سطح پر اتر کر ان کی زبان میں بولیں۔ اگر دفتروں میں اردو نافذ ہو جائے تو افسر شاہی کی اکثریت اپنی مہارت تخصیص کھو بیٹھے کیونکہ انگریزی ہی سے اس کا بھرم قائم ہے اس لیے کبھی اردو کے نفاذ کی منزل قریب آتی ہے تو یہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے دور کر دیتے ہیں خوفناک نتائج سے ڈراتے ہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی مثال دے کر خوفزدہ کرتے ہیں اتنی احتیاط کے مشورے دیتے ہیں کہ معقول لوگ بھی قومی زبان کے مسئلے پر اپنے مؤقف سے دستبردار ہونے پر آمادہ نظر آتے ہیں افسر شاہی کے اس رویے کو دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پوری قوم کو اس کا عملی تجربہ ہے اس رویے میں تبدیلی کے امکانات بظاہر بہت کم نظر آتے ہیں لیکن قوم کے عزم کے سامنے یہ بالآخر بے بس ہو کر اپنی روش ترک کر دیں گے۔

نفاذِ اردو کے ضمن میں آزاد کشمیر کی مثال کا ذکر بے محل نہ ہو گا جہاں پاکستان میں اس کے راستے میں اتنی رکاوٹیں آئیں یا کھڑی کی گئیں وہاں یہ مسئلہ آزاد کشمیر میں بڑی آسانی سے حل ہو گیا اس کے لیے راستہ عوام نے ہموار کیا۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں حکومت آزاد جموں و کشمیر نے اردو کے نفاذ کا پہلا حکمنامہ جاری کیا اس حکمنامے سے پہلے عملی طور پر کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ اردو ٹائپ مشینیں تھیں اور نہ تربیت یافتہ عملہ موجود تھا۔ دفتری اصطلاحات کے ترجمے مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا گیا لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکومت نفاذِ اردو کے سلسلے میں مخلص اور سنجیدہ تھی اور حکومت کے اہلکاروں میں قربانی کا جذبہ موجود تھا اس لیے وہاں دفتروں میں اردو مکمل طور پر نافذ ہو گئی اور یہ تجربہ پوری طرح کامیاب ہوا۔

طالبات کے وفد کی ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات

راولپنڈی (ا پ پ) شعبہ اطلاعات جامعہ پنجاب کی طالبات کے ایک وفد نے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات کی جس کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی نے طالبات کو مقتدرہ کی کارکردگی سے آگاہ کیا اور انہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جانے والی دفتری اصطلاحات کی تفصیل بتائی۔

اردو ان اپیل کی ضرورتیں اردو [illegible] کے مطابق ترتیب دی جائیں گی، منظور الٰہی

[illegible]

نوائے وقت پنڈی ۱۹-۴-۸۷ء

اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے کے لئے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں: راجہ ظفر الحق

لاہور ۱۵ جون (اے پی پی) پنجاب کے وزیر قانون، پارلیمانی امور اور تعلیم راجہ ملک اللہ نے آج صوبائی اسمبلی کو یقین دلایا کہ حکومت اپنی آئینی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کے سلسلے میں بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ وہ بیگم [illegible] ایک تحریک التواء کا جواب دے رہے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت پندرہ سال کے عرصہ میں ہر سطح پر اردو رائج ہو جانی چاہئے لیکن چودہ سال گزرنے کے باوجود اس ضمن میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے جس سے تشویش پیدا ہوئی ہے۔ راجہ [illegible] نے اس راہ میں حائل مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کے باوجود وفاقی اور صوبائی حکومتیں مقررہ مدت میں اردو کو ہر سطح پر رائج کرنے کے انتظامات کر رہی ہیں حکومت پنجاب نے آئندہ صوبائی بجٹ بھی اردو میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کی یقین دہانی کے بعد محرک نے اپنی تحریک پر اصرار نہیں کیا۔

جسارت کراچی ۱۶-۶-۸۷ء

روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد ۱۷ اپریل ۸۷ء

[illegible] اخلاقی درس کی ضرورت ہے: ڈاکٹر وحید قریشی

راولپنڈی (نامہ نگار) بچوں کا ادب ایسا ہونا چاہئے کہ [illegible]

[illegible]

جنگ پنڈی ۲۹ اپریل ۸۷ء

قطب الدین عزیز

سرکاری دفاتر اور اُردو زبان

اردو زبان نے پاکستانی قومیت کو مستحکم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان بنانے کی جدوجہد میں اردو مسلم لیگ کے منشور کا جزو تھی اور پاکستان کے قیام کے بعد اس کی اہمیت قومی تشخص کو اجاگر کرنے میں مسلمہ بن گئی۔ اس کے باوجود کہ اردو کو ۱۹۷۳ء سے پہلے سرکاری اہمیت پوری طرح حاصل نہ ہوئی لیکن پھر بھی اردو کراچی اور لاہور سے پھیل کر پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک پہنچ گئی اور اگر پاکستان میں کوئی زبان ہے جس کو کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے سکردو اور گلگت تک اب سمجھا جاتا ہے اور کافی حد تک بولا جاتا ہے وہ اردو ہے۔ لہٰذا قومیت کے ارتقا میں اردو زبان کی کلیدی حیثیت سے انکار کرنا حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ۱۹۷۳ء کے پاکستان کے دستور کے مطابق اردو قومی زبان قرار دی گئی اور اس کے سرکاری استعمال کے لیے آئینی تحفظ موجود ہے۔ آئین میں اس دفعہ کے باوجود اردو زبان کا سرکاری دفتروں میں استعمال زیادہ نہ بڑھ سکا اور اس کی چند وجوہات حسب ذیل ہیں۔

- اچھے اردو ٹائپ رائٹروں کی کمیابی اور ان کی کثیر قیمت۔
- اردو ٹائپ کرنے والوں اور اردو شارٹ ہینڈ جاننے والوں کی کمیابی۔ اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی کتابوں کی کمی۔
- زیادہ تر سرکاری افسروں کے ذہن انگریزی سے روشناس ہیں جس کے باعث وہ اردو سے اتنے آشنا نہ ہو سکے جتنا ان کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ان کی جانب سے اردو کو دفتری زبان بنانے میں کوئی مؤثر کوشش نہ ہو پائی۔
- اردو ڈکشنریاں جن میں انگریزی اصطلاحات کا جو دفتری زبان میں استعمال ہوتی ہیں ترجمہ موجود ہے۔ ۱۹۷۰ء تک بہت کم تھیں اور گذشتہ پانچ چھ سال میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے انگریزی میں لکھی دستاویزات کا اردو میں ترجمہ کافی مشکل بنا رہا۔ فنی اور سائنسی اصطلاحات کے اردو ترجمے بھی زبان زد عام نہ ہو سکے۔
- سرکاری دفتروں میں ایک ایسا عنصر بھی ہے جو اردو زبان کے استعمال سے دانستہ یا غیر دانستہ طور سے گریز کرتا ہے اور انگریزی کے استعمال کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ عنصر اردو کو سرکاری دفتروں میں داخل کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورِ حکومت میں اردو کی بڑی خدمت کی تاکہ وہ قومی رابطے کا ذریعہ بن سکے لیکن بعض محکموں میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے میں افسروں نے کافی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔
- اردو ٹائپ رائٹر کے کلیدی تختہ میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہو پائی جس کی وجہ سے اس کی عام مقبولیت میں مشکلات حائل ہوئی ہیں۔
- نستعلیق اور نسخ میں اب تک تنازعہ ہے۔ ہمیں جلد فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کون سا ٹائپ چاہتے ہیں۔
- عربی رسم الخط جو بعض کتابوں میں استعمال ہوا ہے اُسے وہ بچے بڑی مشکل سے سمجھ پاتے ہیں جن کی آنکھیں فارسی رسم الخط سے آشنا ہیں جو اخباروں میں استعمال ہوتا ہے اور جو عام طور سے انفرادی طور پر مستعمل ہے۔

اسلام آباد میں پروگرام تھا کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سرکاری اہل کاروں کے لیے تربیتی کورس منعقد کرے گی تاکہ ان کو اردو زبان میں سرکاری خط و کتابت کرنے کی تعلیم دی جائے لیکن وہ منصوبہ بھی کچھ آگے نہ بڑھ پایا۔

گورنمنٹ نے فیصلہ ضرور کیا ہے کہ آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء تک اردو تمام سرکاری محکموں میں رائج کر دی جائے مگر اس پر عمل کرنے میں وہ مشکلات حائل ہیں جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے۔

۱۹۷۳ء کے آئین اور ۱۹۸۵ء میں اس میں جو ترمیم ہوئی اس کی دفعہ ۲۵۱ کے تحت یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور یہ کہ ۱۵ سال میں یعنی ۱۹۸۸ء میں اس کو تمام سرکاری دفتروں میں رائج کیا جائے گا۔ حکومت کی مقتدرہ قومی زبان نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ اردو کے کلیدی تختہ میں یکسانیت پیدا کی جائے اسی طرح سے مقتدرہ کی یہ سفارش کہ اردو کو سرکاری مقابلے کے امتحانوں میں ذریعہ تعلیم بنایا جائے کابینہ کی ایک کمیٹی کے سامنے زیر غور ہے۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں متعدد سرکاری دفتروں میں اور بلدیاتی اداروں میں اردو کا استعمال ہو رہا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ قبل اس کے کہ سرکاری مقابلے کے امتحانوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ مقابلے میں شریک ہونے والوں کو اردو کے استعمال میں مشکلات پیش نہ آئیں اور ایسی کتابیں جو اُن کو اردو میں مقابلے کے لیے تیار کر سکیں وافر تعداد میں دستیاب ہونی چاہییں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عمل کو ملتوی کر دیا جائے یا اس کو خیرباد کیا جائے اس کے لیے تیاری ضروری ہے اور اس تیاری میں جن جن لوازمات کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنا حکومت اور اس کے اداروں کا فرض ہے کیونکہ آئین کی دفعات کو پورا کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے اس کے لیے بتدریج عمل زیادہ مناسب ہے۔ بعض وہ عناصر جو قومی زبان کے بارے میں دستور کی دفعات بدلنا چاہیے وہ آئین سے روگردانی کریں گے۔ اردو زبان نے پاکستان بننے میں اور اس کو مستحکم کرنے میں اور قومیت کے ارتقا میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم بحیثیت ایک قوم کے اس زبان کو پروان چڑھائیں تاکہ یہ انفرادی، اجتماعی اور دفتری ماحول میں زیادہ کارآمد بن جائے۔

اردو کے ساتھ ہی ساتھ علاقائی زبانیں بھی پروان چڑھ سکتی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج پاکستان کے ۲۱۱ روزناموں میں ۸۵ فی صد سے زیادہ روزنامے اردو زبان میں ہیں اور انہیں کی سب سے زیادہ اشاعت ہے اس سے یہ امر ثابت ہے کہ پاکستان میں اردو کی قومی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور ہمارے قومی تشخص کو مستحکم کرنے کے لیے اور قومی ربط کے لیے سب سے زیادہ اردو زبان ہمارے کام آ سکتی ہے۔ گذشتہ چالیس سال میں اردو ایک طبقہ کی زبان ہونے کی منزل سے گزر کر پاکستانی قوم کی اکثریت کی زبان بن چکی ہے اور اب وہ پاکستانی اردو کا روپ اختیار کر چکی ہے۔

امتحانات میں ناکام رہنے والے طلبہ کو دوبارہ داخلہ نہیں دیا جائے گا

محکمہ تعلیم اور سرکاری تعلیمی اداروں کے نئے قواعد — گرتے ہوئے تعلیمی معیار پر والدین میں تشویش ہے

روزنامہ مرکز اسلام آباد ۳ اپریل ۸۸ء

مذاکرہ پشاور

فدا محمد خان۔ گورنر صوبہ سرحد

خطبۂ صدارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب صدر نشین مقتدرہ قومی زبان

جناب پریشان خٹک صاحب صدر نشین اکیڈمی ادبیات،

مہمانانِ گرامی اور معزز خواتین و حضرات!

السلام علیکم! سب سے پہلے میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور اس کے ذیلی دفتر پشاور کے کارکنوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے ایک ایسی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنے کی دعوت دی جو میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

خواتین و حضرات!

اس تقریب کا انعقاد ہماری قومی زبان اُردو کے حوالے سے کیا گیا ہے لہٰذا اس تقریب کی اہمیت یقیناً قومی نوعیت کی ہے۔ اس کے پیشِ نظر میں تقریب کے منتظمین کو دلی مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ ایسی تقاریب کا آئندہ انعقاد بھی اسی جوش و جذبہ کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اردو زبان کی خدمت کے ساتھ یہ اُن کی طرف سے ایک عظیم قومی خدمت بھی ہوگی۔

مجھ سے پہلے کئی مقررین نے اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر ادیبانہ اور پُرمغز مقالے پیش کئے۔ جن کو سُن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے ملک میں صاحبانِ فکر و دانش کی کمی نہیں ہے۔

معزز حضرات!

اُردو نہ صرف ہماری قومی زبان ہے بلکہ یہ ہماری قومی یک جہتی کی ایک زندہ علامت بھی ہے۔ تاریخی طور پر اگر عمیق نظروں سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اُردو کا ارتقا بذاتِ خود تخلیق پاکستان کا ایک لازمی جزو ہے۔ اُردو تاریخ برصغیر کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کی مذہبی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اور عسکری سرگرمیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

اگر مسلمان قدیم ہند میں اپنی سلطنتیں قائم نہ کرتے تو آج اردو کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا۔ اس زبان کی تعمیر میں محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک ہر مسلمان حکمران اور ان کے لشکروں کا بنیادی رول ہے۔ ان میں سے بعض کی زبان فارسی تھی اور بعضوں کی ترکی۔ ان کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام اور علمائے دین خانقاہوں اور مسجدوں میں عربی کی درس و تدریس میں بھی مصروف رہتے تھے۔ اس کے علاوہ قدیم ہند پر سُوری اور لودھی خاندانوں نے بھی حکومت کی ہے جن کی مادری زبان پشتو تھی۔ اور ان کے لشکروں میں اکثریت اُن کے ہم قبیلہ افغانوں کی تھی۔ لہٰذا ان مسلمان سیاسی سلطنتوں کے دوران جب عربی، فارسی، ترکی اور پشتو کا امتزاج ہند کی مقامی زبانوں یعنی سنسکرت، ہندی وغیرہ سے ہوا تو اس سیاسی اور معاشرتی عمل کے نتیجے میں ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی۔ حتیٰ کہ مغلوں کے سیاسی زوال کے زمانے میں اردو ایک نئی زبان کے طور پر اُبھری۔ بعض اوقات تاریخ ستم ظریفی بھی کرتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اردو زبان کے شباب کا زمانہ ہے۔ غالب جیسا شاعر اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ اُردو کے تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ غالب ایک عہد ساز شاعر تھا۔ اس کی شاعرانہ عظمت آج بھی مسلّم ہے۔ اسے آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ کسی قوم کے سیاسی زوال کے ساتھ اس قوم کی زبان کا عروج لازمی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہی مثال انگریزوں پر بھی صادق آتی ہے۔ انگریز آج کل بعض سُپر طاقتوں کے مقابلے میں سیاسی طور پر رُو بہ زوال ہیں لیکن ان کی زبان یعنی انگریزی بتدریج ترقی کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان کے زوال و عروج کا مسئلہ ہمیشہ اس کی تہذیبی ترقی سے وابستہ ہے۔ مغلوں کے آخری عہد میں گو مسلمان سیاسی طور پر رُو بہ زوال تھے لیکن تہذیبی طور پر وہ ہندوؤں اور دیگر اقوام کے مقابلے میں ترقی یافتہ تھے۔ ان کی تہذیبی ترقی کی وجہ سے اردو زبان کو زوال نہ آسکا۔ اسی طرح جب صحرائے گوبی کے وحشی منگولوں نے چنگیز خان اور اس کے خانوادے کی عسکری قیادت میں ساتویں صدی ہجری میں ایران و عراق سمیت پورے

وسط ایشیا میں مسلمانوں کی حکومتوں کا خاتمہ کر دیا تو اُن کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اُن کی مادری زبان مغولی کو ترقی نصیب نہ ہوئی بلکہ وہ ایرانیوں اور عربوں کی ترقی یافتہ تہذیبوں کے سامنے مکمل طور پر مٹ گئی۔ حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد ان منگول حکمرانوں نے ترکی یا فارسی کو اپنی مادری زبان کے طور پر اپنایا۔ ان تاریخی حقائق سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی زبان کے زوال یا عروج کا تعلق دراصل اُس قوم کے تہذیبی مدارج پر ہوتا ہے۔ پشتو اردو سے بہت قدیم زبان ہے لیکن اس کی قدامت اس کی ترقی یا جمود کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کا سبب پختونوں کے تہذیبی درجے میں ڈھونڈا جا سکتا ہے زبان کا مسئلہ کسی قوم کی تہذیب سے اس قدر بستہ و پیوستہ ہے کہ دونوں کو جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اگر تہذیب ہی کی ترقی سے زبان کی ترقی وابستہ ہے تو پھر تہذیب کی ترقی کا سبب کیا ہے؟ میں اس کا مختصر سا جواب دوں گا کہ تہذیب انسانی زندگی کی خوشبو ہے جو عدل و مساوات کی پیداوار ہے اور عدل کا دائرہ اخلاقیات سے لے کر سیاسیات و معاشیات سب پر محیط ہے۔ خدا کی کائنات قانونِ عدل کے تحت کام کر رہی ہے۔ اس میں ایک اعتدال یعنی توازن ہے۔ توازن اور تہذیب ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں عدل و توازن پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغل حکمرانوں نے عوام کی بجائے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقوں پر تکیہ کیا اس لیے زوال ان کا مقدر بنا۔ اردو کو اس لیے زوال نہ آیا کہ وہ اکثریت کی زبان تھی اور یہ اکثریت عوام پر مشتمل تھی۔ چنانچہ تہذیب اور زبانوں کے بنانے والے صرف عوام ہی ہوتے ہیں سرمایہ دار اور جاگیردار تو دیسی زبانوں سے اپنے گھروں میں بھی دور رہتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

اُردو سے عقیدت کے جذبے نے مجھے شاید اپنے موضوع سے کچھ ہٹا دیا ہے جس کے لیے میں معذرت خواہ بھی ہوں لیکن حقائق ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ایک کے انکشاف سے دوسری حقیقت فوراً سامنے آ جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔

بہرحال میری تمام تقریر کا مدعا یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی تخلیق کردہ زبان ہے یہ اُن کی سیاسی اور تہذیبی ترقی کی آئینہ دار ہے۔ بھارت میں اُردو زبان کی ترقی اس لیے رُک گئی کہ وہاں مسلمانوں پر تہذیبی ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئی ہیں۔ اُن کے ساتھ عدل کرنے والا کوئی نہیں۔ لہٰذا ان کی اسلامی تہذیب بھی جمود کا شکار ہو گئی ہے۔ ہم خُدا کے فضل سے ایک آزاد ملک کے شہری ہیں۔ اس لیے پاکستان میں اردو واحد زبان ہے جو چاروں صوبوں کے عوام کے مابین ایک مستقل رابطے اور ہم آہنگی کا باعث ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ رابطہ ٹوٹ گیا تو اس کے نتائج بد کا کوئی محبِ وطن تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اردو ہی تو ہے جس نے ہم سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اُردو جس کا لغوی مطلب "لشکر" ہے پاکستان کے حفاظتی لشکر کا کردار بھی ادا کر رہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم نے ہمیں بار بار تلقین کی کہ "اردو ہماری قومی زبان ہے۔" قائدِ اعظم اردو کی سیاسی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور اسی لیے اردو کی ترقی پر زور دیتے تھے۔ کاش کہ ہم قائد اعظم کی اس تلقین کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

خواتین و حضرات!

جس طرح کہ قدیم ہند میں اُردو کی ترقی کا دارومدار اس وقت کی مروّجہ زبانوں پر تھا۔ اسی طرح آج پاکستان میں اس کی ترقی ہماری علاقائی زبانوں سے وابستہ ہے۔ پشتو، پنجابی، بلوچی، سندھی و دیگر علاقائی زبانیں اردو کی ترقی میں بھی مؤثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ میں ان لوگوں سے متفق نہیں جو علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کو اردو کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اور ان سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جو اردو زبان سے بیر رکھتے ہیں۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر میرے نزدیک غلط ہیں۔ اردو اور علاقائی زبانوں کا تعلق ایسا ہے جیسا ذہن کا تعلق دیگر جسمانی اعضاء سے ہوتا ہے۔ جسمانی اعضا کے کاٹنے سے ذہن مفلوج ہو جاتا ہے اور ذہن کو خارج کرنے سے جسمانی اعضا ساکت و جامد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ پاکستان کے تمام ادیبوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اس تصور کو عام کریں۔

جہاں تک اردو زبان کے لیے حکومت صوبہ سرحد کی کوششوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ایک با اقتدار کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کی صدارت صوبائی حکومت کے ایک سینئر افسر جہانزیب خان کر رہے ہیں۔ اس کمیٹی کی سفارشات پر صوبائی حکومت نے فی الحال بعض وزارتوں میں اردو کو دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس پر مناسب سہولتیں فراہم ہوتے ہی عمل شروع کر دیا جائے گا۔ مزید وزارتوں میں بھی جلد از جلد اس قسم کے اقدامات کی توقع ہے۔ امید ہے کہ ان کوششوں کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں اردو کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔

میں آخر میں آپ تمام حضرات کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اُردو کی ترقی میں آپ کی نیک خواہشات کے لیے دست بدعا ہوں۔

پاکستان زندہ باد

پروفیسر محترم منور رؤف

مقتدرہ کے اقدامات اور نفاذ اُردو

عزت مآب جناب فدا محمد خان گورنر صوبہ سرحد

معزز خواتین و حضرات!

صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے جشن آزادی کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"قومی تشخص کے کئی نشان ہوتے ہیں اور انہیں قوم کی تاریخ میں مقام حاصل ہوتا ہے۔ ان نشانات میں قومی لباس، قومی زبان، قومی پرچم اور قومی ترانہ شامل ہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ قومی لباس پہنیں اور قومی زبان بولیں۔"

معزز سامعین!

صدر مملکت نے قوم کے اس تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں مقتدرہ قومی زبان کا ادارہ قائم کیا تھا جس کے صدر نشین ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مقرر کیے گئے تھے۔

صدر نشین کے الفاظ میں مقتدرہ قومی زبان کا مقصد اردو کی ہر جہت توسیع اور قومی زندگی کے تمام سرکاری اور نجی شعبوں میں اس کے عمل و نفاذ اور راہ میں حائل مشکلات دور کرکے قومی یک جہتی کی راہ ہموار کرنا تھا۔

سامعین کرام!

آپ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کے آئین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ پندرہ سال کے اندر اندر سارا ملکی نظام پاکستان کی قومی زبان میں منتقل کر دیا جائے گا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک ادارہ بھی وجود میں آیا تھا اس لیے صدر نشین اول نے تین امور بنیادی طور پر اپنے فرائض میں شامل کیے۔

اول اردو کو قومی زبان کی حیثیت دینے کے لیے ذرائع وسائل پر غور کرنا۔ اس سلسلہ میں ہر ممکن اقدام بروئے کار کرنا۔

دوم۔ سرکاری نیم سرکاری دفتروں، عدالتوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے اور عملے کو تربیت دینے کے لیے خواندگی کا خاطر خواہ مواد تیار کرنا۔

سوم۔ اردو زبان کے لیے جو ترقیاتی ادارے کام کر رہے ہیں ان میں باہمی ربط پیدا کرنا۔

حاضرین کرام!

میرا موضوع نفاذ اردو میں مقتدرہ کے اقدامات ہے۔ اس لیے اب میں موضوع کی طرف آتا ہوں۔

مذکورہ بالا امور کا جائزہ لیتے ہوئے مقتدرہ قومی زبان کے ادارے نے سب سے پہلے اپنی ترجیحات کا تعین کیا۔ اس کے بعد نفاذ اردو کے سلسلے میں متعدد موضوعات پر کتب کی اشاعت کا آغاز کیا چنانچہ

۱۹۸۱ء میں مقتدرہ کی زیر نگرانی تین کتب شائع ہوئیں۔

۱. اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ۔
۲. اردو رسم الخط
۳. افکار و اذکار۔

اس کے علاوہ عوام کو اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کے لیے اخبار اردو کا اجرا بھی کیا گیا اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تو جلد ہی ۱۹۸۲ء میں مزید تین کتب منظر عام پر آگئیں۔

۱. جدید اردو ٹائپ کاری۔
۲. مختصر اصطلاحات دفتری۔
۳. فہرست اصطلاحات و محاورات قانون۔ تیسری کتاب جامعہ کراچی کے تعاون سے پیش کی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں جامعہ کراچی کے اشتراک سے دو کتابیں اور تیار کی گئیں۔

۱۔ فرہنگ اصطلاحات علم کتب خانہ
۲۔ فرہنگ اسماء العلوم۔

اپریل ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان کے صدرنشین ڈاکٹر وحید قریشی قرار پائے۔ اور اسی سال یہ ادارہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ادارے کو مزید فعال بنانے اور اس کی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لیے بہت سے نئے اقدامات بھی کیے۔ انہوں نے مقتدرہ کے مقاصد کے حصول میں صوبوں کو بھی شامل کر لیا اور اسلام آباد کے صدر دفتر کے علاوہ لاہور، پشاور اور سکھر اور کراچی میں ذیلی دفاتر قائم کیے۔

ڈاکٹر صاحب کی زیر نگرانی اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ مقتدرہ کو کن سیکٹروں میں کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تین موزوں و مناسب سیکٹر معلوم کیے گئے۔

دفتری امور کا سیکٹر۔
تعلیمی شعبے کا سیکٹر۔
مقابلے کے امتحانات کا سیکٹر۔

دفتری ضروریات کے تحت مقتدرہ نے ایسی دس کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جن سے دفتروں میں کام کرنے والے ملازمین کو اردو اصطلاحات استعمال کرنے کی سہولت ہو جائے۔ مراسلت کے سلسلے میں چار جلدوں پر مشتمل سلسلۂ کتب کی اشاعت کا بندوبست کیا تاکہ دفتری خط وکتابت بھی اردو میں کرنا ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ مقتدرہ نے اردو کے جملوں اور ترکیبوں کی ایک لغت شائع کرائی جس میں دفتروں میں استعمال ہونے والی ترکیبیں اور جملے انگریزی کی ترکیبوں اور جملوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

حاضرین!

۴۰۰ صفحات کی یہ اردو انگریزی لغت مقتدرہ کا قابل ستائش کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ نفاذ اردو کے سلسلے میں محکموں اور ان کے عہدوں اور دوسرے اداروں کے ناموں کی اردو تراجم پر مشتمل دو کتب اور بھی شائع کی گئی ہیں۔ نفسیات کی لغت، اصطلاحات برائے آڈٹ اور اکاؤنٹس کی اصطلاحات اور کسٹم پر بھی کام ہو چکا ہے۔

اس طرح مقتدرہ قومی زبان نے مختلف محکموں کی ضروریات کے مطابق ان کی دفتری اصطلاحات کی لغات علیحدہ علیحدہ تیار کرائی ہیں تاکہ ہر محکمہ میں بتدریج اردو کا نفاذ عمل میں لایا جا سکے۔ علاوہ ازیں مبادلات کی لغت تیار کر کے ان کے تسویدی ایڈیشن شائع کیے ہیں تاکہ ان پر اہل علم کی آرا لے کر ان کی معیار بندی بھی کی جا سکے۔

دوسرے سیکٹر یعنی تعلیم کے شعبے کا آغاز ۱۹۸۵ء میں ہی ہو گیا تھا یونیورسٹی کی سطح پر نفاذ اردو کے لیے مقتدرہ نے ایک جامع منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت اصطلاحات کے اردو تراجم، اصطلاحات کی تشریحی فرہنگیں اور یونیورسٹی کی سطح پر درسی کتب کے اردو تراجم کرانے کا پروگرام ہے۔ اس کے پہلے مرحلے میں معاشرتی علوم اور انسانی علوم کی کتب رکھی گئی ہیں۔ دوسرے مرحلے میں سائنسی کتب اور تیسرے مرحلے میں طبی اور دیگر پیشوں سے متعلق کتب شامل ہیں۔

یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح پر نئی نصابی کتب کی تدوین بھی اس مرحلے میں کی جائے گی۔ یاد رہے کہ ان تمام منصوبوں میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا تعاون مقتدرہ کو حاصل رہے گا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کراچی نے مختلف مضامین پر فرہنگ اصطلاحات شائع کرنے میں مقتدرہ کے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے فلسفہ، شماریات، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، جغرافیہ وارضیات، تاریخ و سیاسیات، مساحت وطبیعات اور کیمیا وغیرہ کی اصطلاحات وضع کر کے مع ان کی فرہنگ کے شائع کی ہیں۔

گذشتہ سال جون ۱۹۸۶ء میں بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی اور مقتدرہ قومی زبان کے درمیان نصابی کتب مرتب کرنے کا معاہدہ ہوا ہے اس کے تحت فی الحال کیمسٹری کی دو کتب شائع کی جائیں گی۔

تیسرے سیکٹر یعنی مقابلہ امتحانات میں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں کے کمیشنوں کے تعاون سے قومی زبان کو امتحانات مقابلہ کی زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

سامعین!

مقتدرہ نے ترقی اردو کے دوسرے اداروں مثلاً انجمن ترقی اردو پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، اردو سائنس بورڈ لاہور، سندھی ادبی بورڈ اور دیگر اداروں سے بھی رابطہ رکھا ہوا ہے۔ ان تمام اداروں کے باہمی تعاون سے مقتدرہ نے نفاذ اردو کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان میں سرفہرست تو وہ تمام مطبوعات ہیں جو مختلف سرکاری و نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کے تعاون سے منظر عام پر آئیں لیکن قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں مقتدرہ کی جدوجہد کی آئینہ دار ضرور ہیں۔

ان کے علاوہ مقتدرہ کے وہ کتابچے ہیں جو مختلف اوقات میں ضرورت کے تحت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی پچاس سے زیادہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مقتدرہ نے اپنے منصوبوں کی تکمیل

کے لیے حوالہ جاتی لائبریری، ایک دارالترجمہ اور دارالتصنیف بھی قائم کیے ہیں۔

دارالترجمہ کا کام یہ ہے کہ جس محکمہ کے دفاتر میں نفاذ اردو کی مہم شروع ہوتی ہے وہ فارم اور مسلیں وغیرہ ترجمہ کے لیے دارالترجمہ کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ فوری طور پر اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں وزارت اطلاعات و نشریات اور مذہبی امور کے تمام تراجم یہیں سے ہو کر گئے۔

دارالتصنیف کو باقاعدہ سائنسی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف و تالیف کا شعبہ ہے جو کشاف اصطلاحات، نصابی کتب کی تدوین، کتابیات سازی، امور لسانی اور اس قسم کے دیگر متفرق مسائل سے متعلق امور پر مشتمل ہے۔

۱۹۸۵ء میں دارالتصنیف کے تحت پورے ملک میں ایک مطالعاتی سروے بھی کرایا گیا تھا جس میں ذریعہ تعلیم، ذریعہ اظہار، مقابلے کے امتحانات اور ملازمتوں کے سلسلے میں پاکستان کے ہر صوبے اور علاقے کے نمائندہ نوجوانوں کی آراء کا جائزہ لیا گیا۔ دارالتصنیف کے تحت کل ۱۵ منصوبے ہیں جن میں سے کچھ مکمل ہو چکے ہیں اور کچھ تکمیلی مراحل میں ہیں۔

دفتروں میں نفاذ اردو کا مسئلہ ہمیشہ مقتدرہ کے پیش نظر رہا ہے اس عمل کو تیز کرنے کے لیے مقتدرہ نے امدادی کتب، دفتری مواد کی فراہمی، ترکیبات و جملوں کی لغت اور دفتری دستاویزات کے تراجم اور اس کی معیار بندی کے لیے مجالس استناد بھی قائم کر دی گئی ہیں ان کی وجہ سے اس جانب سے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے مقتدرہ نے دفتری تربیتی یعنی ورکشاپ اور ٹائپ کاروں اور زود نویسوں کے تربیتی کورس کا بھی اہتمام کیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ نے اسلام آباد اور پنڈی کے انگریزی کے ٹائپ مرکزوں کو آزمائشی طور پر اردو ٹائپ مشین دی تھیں۔ اردو ٹائپ کاری کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ چاروں صوبوں میں اردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کی مشین کے مراکز کام کر رہے ہیں۔ پہلے ذیلی دفاتر میں یہ کام شروع ہوا اور اب صدر دفتر میں بھی رواج پا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مقتدرہ نے ایک پانچ روزہ مختصر دفتری کورس بھی کرایا ہے اس تربیتی ورکشاپ میں سب سے پہلے آزمائش کے طور پر ادارہ ثقافت پاکستان اور اسے جی پی آر کے ملازمین کو دفتری اردو کی مشق کرائی گئی۔ پھر سی ڈی اے کے مرکزی دفتر میں یہ ورکشاپ منعقد ہوئی جس میں سی ڈی اے کے گریڈ گیارہ سے انیس تک کے افسروں نے شرکت کی۔ ان لوگوں کو اردو میں نوٹنگ، ڈرافٹنگ، مسل داری مختصر نویسی اور دفتر کے تحریری امور کے بارے میں لیکچر دیے گئے اور عملی کام کی مشق کرائی گئی۔ یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔

حکومت نے افسروں کی تربیت کے لیے جو پروگرام شروع کیا ہے اس کی نصابی کتب بھی مقتدرہ نے نظر ثانی کی اور اساتذہ صاحبان میں بھی مقتدرہ کے معاون بطور ٹیوٹر کے شامل ہیں۔

جون ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ نے ادارہ تحقیقات اسلامی کے اشتراک سے اردو میں فنی تدوین کے موضوع پر ایک اور ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا۔

حاضرین کرام!

نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ کے ان اقدامات کی وجہ سے آج مذہبی امور کی وزارت میں تقریباً اسی فیصد کام اردو میں ہو رہا ہے۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ایس ایم زمان کے بیان کے مطابق ان کے انسٹی ٹیوٹ میں بھی ساٹھ فیصد کام اردو میں ہو رہا ہے اور وزارت دفاع میں تیس فیصد کام اردو میں ہو رہا ہے۔

اب ذرائع ابلاغ کی تیکنیکی اصطلاحات کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اردو دفتری کورس شروع کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔

وفاقی حکومت نے افسروں کے لیے اردو کے تربیتی کورس اور دفتروں میں ٹائپ کاروں اور سٹینوگرافروں (زود نویسوں) کی تربیت کے لیے جو مراکز قائم کیے ہیں ان سے لیے انسٹرکٹر یعنی تربیت کار مقتدرہ کی جانب سے مقرر کیے گئے ہیں اور مقتدرہ کے ادارے سے ہی وہ لوگ تنخواہیں پاتے ہیں۔

مقتدرہ کے صدر نشین مختلف ادبی اجتماعات، مذاکرات، کانفرنسوں اور نشریاتی پروگراموں میں شریک ہونے اور فروغ اردو اور نفاذ اردو کے سلسلے میں عوام الناس کو مقتدرہ کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اخبار اردو اور کتابچوں کے ذریعے بھی لوگوں کو مقتدرہ کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

مقتدرہ نے پاکستان میں قومی زبان کے مسئلے کو سلجھانے اور اسے فروغ دینے کے لیے دوسرے ممالک کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح بعض دوسرے ممالک میں قومی زبان کے مسئلہ کو حل کیا گیا۔ اس کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہو سکیں ان کے مختصر مطالعے شائع کیے گئے ہیں خصوصاً بھارت جس کے ہم سے

لیتے چلتے مسائل میں وہاں سے قومی زبان کے نفاذ کے تجربے کی مفصل رپورٹ مقتدرہ نے شائع کرائی ہے۔

اس کے علاوہ مقتدرہ کے زیر اہتمام نفاذ اردو کے متعلق ہر سال سیمینار، مجالس، مذاکرات اور دیگر خصوصی نشستوں کے پروگرام باقاعدگی سے ہوتے رہے ہیں۔ ان پروگراموں کی وجہ سے قومی زبان سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں موضوع گفتگو بنی رہتی ہے۔

نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے اس ملک میں وہ مقام حاصل ہوگیا ہے کہ اب نہ صرف اپنے ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم و دانشور اس ادارے کی کارکردگی دیکھنے کے لیے آتے ہیں بلکہ دوسرے ممالک کے وفود بھی جب پاکستان کے دورے پر آتے ہیں تو مقتدرہ کا دورہ ضرور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں چینی اشاعت گھر کے وفود، جاپانی، ہندوستانی اور اسلامی ممالک کے مہمان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مقتدرہ کے منصوبوں کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے بعض ذیلی مجالس بھی قائم کی گئیں۔ مثلاً سائنسی اصطلاحات سے متعلق ذیلی مجلس، مالیاتی منصوبہ بندی کی ذیلی مجلس اور ذیلی مجلس برائے منصوبہ جات وغیرہ مقتدرہ کی معاونت کر رہی ہیں۔

اس کے علاوہ مقتدرہ کو مختلف اداروں کے لیے ترجموں کا کام بھی ملتا رہتا ہے اور اس طرح یہ ادارہ ایک قومی مرکز بنتا جا رہا ہے جس کی طرف تمام سرکاری محکمے اور غیر سرکاری ادارے بوقت ضرورت رجوع کرتے ہیں۔ ترجموں کے ان کاموں کے علاوہ بھی مقتدرہ قومی زبان نے تصنیف و تالیف کے بہت سے منصوبے شروع کیے ہوئے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ کی کوشش و مساعی بار آور ہوں تاکہ قومی زندگی میں قومی زبان کو اس کا جائز مقام حاصل ہو۔

تعلیمی بائیکاٹ کا اعلان

ملتان لیکچرار یونین نے اپنے مطالبات کے حق میں ۱۵ اپریل سے تعلیمی بائیکاٹ کا اعلان کیا ہے اس سلسلے میں لاہور اور راولپنڈی میں پرامن احتجاجی مظاہروں کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ ۱۰ اپریل سے سکولوں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے داخلوں کا کٹھن مرحلہ شروع ہو گا اس موقع پر اساتذہ کی طرف سے تعلیمی بائیکاٹ ہوا الجھن پیدا کر سکتا ہے حکومت کو اس کا احساس کرنا چاہئے اگر حکومت اساتذہ کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کیلئے کوئی نہ کوئی تاریخ مقرر کر دے تو اساتذہ کو بائیکاٹ ملتوی کرنے کا معاملہ اہم ہو سکتا ہے۔

جنگ پنڈی ۸ اپریل ۸۷ء

C.S.S. exam

According to a news item published in P.T. dated May 27, 1987, it has been decided that all candidates who have appeared in the B.A. and B.Sc. examinations can take the C.S.S. examination this year.

The decision is unprecedented and surprising because it has also been clarified that this concession shall not be applicable to the competitive examinations to be held in 1988 and onwards.

What are the factors because of which the Government and the Vice-Chancellors of Universities of Karachi and Hyderabad have taken a step which will multiply the number of candidates abnormally? A candidate, however, will be declared successful subject to his passing the B.A./B.Sc. examination.

The concession might prove to be an exercise in futility because even M.As. having one or two years' experience of teaching find it difficult to qualify or obtain good marks to get into a topmost service. So it should better be withdrawn.—SYED SHAMIM AHMED PIRZADA, Advocate, Islamabad.

پاکستان ٹائمز ۱۰ جون ۸۷ء

[illegible] کے مطابق نہیں ڈاکٹر جالبی

نوجوان تلاش روزگار میں ڈگریاں لیے پھر رہے ہیں ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ جشن کی افتتاحی تقریب

کراچی ۲۰ اپریل (سٹی ڈیسک) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ جشن تاسیس کے افتتاحی اور مقالاتی اجلاس ہوئے افتتاح ڈاکٹر جمیل جالبی شیخ الجامعہ کراچی اور مقالاتی اجلاس کی صدارت ریئر ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایم آئی ارشد نے کی افتتاحی خطبہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے موجودہ نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی افادیت کھو چکا ہے اور ہماری ضرورت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہماری مشکل دس فیصد آبادی کی ضرورت پوری ہوتی ہے ڈاکٹر جالبی نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ نظام تعلیم تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ان ہی سطور پر چل رہا ہے جو انگریزوں نے کلرک پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے اس وقت نوجوانوں کی معاشی حالت بہت خراب ہے اور وہ تلاشِ روزگار میں ڈگریاں لئے پھر رہے ہیں۔

جناب جالبی نے کانفرنس کی جانب سے پیش کردہ سپاسنامے کے جواب میں کہا کہ انہیں کراچی میں ایک امتحانی جامعہ قائم کرنے کے خیال سے کامل اتفاق ہے تاکہ جامعہ کراچی میں تعلیم و تدریس احسن طریقے سے ہو سکے۔ بہتر ڈویژن اور سپلیمنٹری امتحانات میں پاس ہونے والے طلبہ و طالبات کی بہتر تعلیم اور داخلوں کے مسئلہ سے بھی انہوں نے اتفاق کیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں بھی نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے ڈاکٹر جالبی نے بانی سیکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سید الطاف علی بریلوی مرحوم کی اعلیٰ تعلیمی خدمات پر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ سید مصطفیٰ علی بریلوی نے کانفرنس کی مختصر تاریخ اور گزشتہ ۳۶ سال میں سید الطاف علی مرحوم کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی کانفرنس کے مقالاتی سیشن میں جن کے مقالے آغا حسین ہمدانی (اسلام آباد) پروفیسر رحمت فرخ آبادی (سکھر) پروفیسر عبدالرشید خان، ڈاکٹر وقار احمد رضوی (جامعہ کراچی)، ادیب نیاز کے پڑھے جاسکے۔ جامعہ میں ایک استاد (علیگ)، پروفیسر اسد علی (کراچی)، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، پروفیسر شجاع احمد زیبا نے حصہ لیا ریئر ایڈمرل ارشد نے اپنی مختصر تقریر میں ایجوکیشنل کانفرنس کے کام کو سراہا اور اپنی جانب سے ہر قسم کی امداد و اعانت کا وعدہ کیا ڈاکٹر فرید الدین بقائی صدر کانفرنس نے مہمانانِ گرامی خصوصاً ملک بھر سے آئے ہوئے مندوبین کا شکریہ ادا کیا اس موقع پر جمیل جالبی اور ایم آئی ارشد کی خدمت میں کانفرنس کی چھپی ہوئی کتب پیش کی گئیں۔

نوائے وقت کراچی ۲۱ اپریل ۸۷ء

یوسف رجا چشتی

مقابلے کے امتحانات میں اُردو بحیثیت متبادل زبان

مسئلہ زیرِ غور یہ ہے کہ مقابلے کے امتحانوں میں اردو بحیثیت متبادل زبان کس اہمیت کی حامل ہے یا حامل ہو سکتی ہے اور اگر اسے یہ حیثیت حاصل ہو جائے تو اس کے کیا منفی اور مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ اس مسئلے کا تجزیہ کرنے کے لیے پہلے مقابلے کے امتحانوں کی اہمیت کو جانچنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مقابلے کے امتحانوں کی ضرورت کیا ہے یہ ریاست کے نظم و نسق کے مستقبل کو پائیدار اور بے استقام و نقائص بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آئندہ کے منتظمین، معتمدین اور حاکم یعنی اربابِ اقتدار بہترین صلاحیتوں کے حامل ہوں ایسے افراد کی تلاش اور ان کے انتخاب کے لیے سامنے آنے والوں کی صلاحیتوں کا امتحان لینا ضروری ہے تاکہ جوہرِ قابل کا انتخاب ہو سکے اور امیدواروں کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد بہتر صلاحیتوں والے افراد منتخب قرار پا سکیں۔ افراد کی صلاحیتوں کا موازنہ کرنے کے بعد ہنر مند اصحاب کو ملک کے مستقبل کی ذمہ داری سونپی جا سکے۔ اب صلاحیتوں کا جائزہ کیسے ہو۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے

تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یعنی جب تک کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلے تو اس کے عیب و ہنر مخفی رہتے ہیں۔

لیکن کسی کی بات سننے کے بعد بھی اس کے عیب و ہنر اُس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک ہم اُس کی بات کو سمجھ نہ سکیں اور بات تب سمجھ میں آئے گی جب ہم اُس کی زبان سمجھتے ہوں اور وہ ہماری زبان سمجھ سکے۔ یعنی سوال کی زبان بھی سریع الفہم ہو اور جواب کی زبان بھی سوال کنندہ اس حد تک سمجھ سکے کہ الفاظ کی روح تک پہنچ سکے۔ جواب کی صورت میں صلاحیت کا اظہار تب باور ہوگا جب اُس کا ابلاغ بھی ہو۔ ہمارے ہاں ابلاغ کا یہ مرحلہ انگریزی ذریعہ امتحان ہونے کی صورت میں دو مرحلوں میں ہوتا ہے یعنی پہلے ہم مادری زبان میں یا قومی زبان میں سمجھتے ہیں اور پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔

مقابلے کے امتحانات میں چونکہ پورے ملک سے امیدوار حصہ لے سکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ زبان ایسی ہو جسے ملک بھر کے افراد لکھ پڑھ، سمجھ اور بول سکیں۔ امتحانات چاہے کسی سطح کے ہوں معیار جانچنے کے لیے ایسی زبان کا استعمال ضروری اور مقتضائے انصاف ہے جسے ہر امیدوار آسانی سے سمجھتا اور بولتا بھی ہو لکھ بھی سکے اور پڑھ بھی سکے تاکہ کسی کی صلاحیت زبان کے اشکال میں دب نہ جائے۔ اُس زبان کا رسم الخط آسان، رواں، معروف ہو اور سہل ہو۔ انگریزی ہمارے ملک کی حد تک ان سب صفات سے عاری ہے اور یہ تمام خصوصیات اگر کسی زبان میں ہیں تو وہ صرف اردو ہے۔

سرحد میں پشتو اور ہندکو بولی جاتی ہے لیکن یہاں کے کسی گاؤں کا ان پڑھ باشندہ جب شہر میں کسی دکاندار سے بات کرتا ہے تو بلا تکلف اور بغیر کسی غیر ضروری حجاب کے بلکہ بغیر کوشش کے پشتو ہندکو کے بجائے اردو میں بات کر لیتا ہے۔ تذکیر و تانیث کے باہمی تبادلے کا جواز زبان کے فرق سے ہی جانا چاہیئے (اگر محفل کو مذکر کہہ دیا جائے تو اسے معاف کر دینا چاہیئے کہ اس سے کوئی عائلی مقدمہ کھڑا ہونے کا کوئی خدشہ نہیں) اردو کی فلمیں دیہاتی نوجوان کی سمجھ میں آجاتی ہیں اور ٹیلی ویژن کے اردو پروگرام بھی اب دیہات تک میں دیکھے جاتے ہیں۔

جن علاقوں میں اردو بول چال کی زبان نہیں وہاں بھی اظہار و ابلاغ کی بڑی زبان اردو ہی ہے پورے ملک میں خط و کتابت کی زبان اردو ہے۔

امتحانات کے علاوہ بھی اردو زبان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رابطے کی زبان ہونے کے ناتے قومی یک جہتی باہمی اشتراک عمل اور اظہار مودت کا ذریعہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی بات قابلِ غور ہے وہ کہتے ہیں:

"اردو کو محض کاروبارِ حیات اور تخلیقِ ادب کے امور ہی سرانجام نہیں دینے تھے بلکہ اسے قومی یک جہتی، صوبائی ہم آہنگی اور باہمی اشتراک پیدا کرنے کا ذریعہ بھی تفویض ہو گیا تھا۔ اس کے مدمقابل ایسی متمول زبان تھی، جس نے طویل عرصے تک برصغیر پر مطلق العنان حکمرانی کی تھی لارڈ میکالے

کی حکمت عملی کے عین مطابق اس ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کو مغرب کے تہذیبی
سانچوں میں ڈھال لینا تھا۔"

دراصل ہمارے ہاں ایک طبقے میں اظہار برتری کی کوشش یا خواہش نے احساسِ کمتری
پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو علاقے کے اردو میڈیم سکول کے بجائے ۲۰ کلومیٹر دور
کیڈٹ مالبن سکول میں داخل کر کے پانچ سو روپے ماہوار فیس دے کر اپنے آپ کو اس نئے
بورژوائی طبقے کا فرد ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو شاید اُن کے خوابوں کا مرکز رہا ہے کیوں
معاشرے پر ایک طرح ان کی طبقاتی حیثیت کا رعب بیٹھتا ہے۔ اسی طرح انگریزی کو
اپنی طبقاتی حیثیت کے بیرومیٹر کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے آپ بدقسمتی کہہ سکتے ہیں
اور بے حسی بھی۔ موجودہ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں پر انگریزوں کا تسلط ایک سو سال تک
رہا لیکن نظریاتی سرحدوں پر جن کی ترتیب و تحفظ میں زبان ایک اہم کردار ادا کرتی ہے آج
تک ان کا نظریاتی اور نفسیاتی تسلط ہے۔ ہم آج بھی تشخص کی برتری اور وقتی رعب قائم
کرنے کے لیے انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں، غصے کا اظہار انگریزی میں کرتے
ہیں شاید اس لیے کہ غصہ حرام ہے اور اس کے لیے انگریزی بولنا ہی مناسب ہے۔

جب ۱۹۳۵ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں طے ہوا کہ آزادی
کے بعد برِ عظیم کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسوم الخط میں
لکھی جائے گی اور مسلمانوں نے بھی اصولی طور اس تجویز کو منظور کر لیا تھا تو دو سال
بعد ۱۹۳۷ء میں مسٹر گاندھی نے ایک توضیحی مضمون میں لکھا۔

"ہندوستان کی ساری زبانوں کے لیے صرف ایک رسم الخط ہونا چاہیئے
اور اس کے لیے موزوں رسم الخط دیوناگری ہے۔" خطبات عبدالحق صہ ۵۲-۵۱

بھارت ساہتیہ پریشد کے نام سے ۲۴-۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں مختلف
زبانوں کے ادیبوں کے ایک بڑے اجلاس میں مسٹر گاندھی کے دل کا چور اُن کی زبان
کے آئینے میں آ ظاہر ہوا جب ان کے منہ سے بے اختیار نکلا:

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی
جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا پھیلایا۔ مسلمان چاہیں
تو اسے رکھیں پھیلائیں۔" نگار جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۰

عظیم مورخ مفکر اور دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے افکار و اذکار کے صفحہ ۳۸
پر ان خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ یقیناً دعوت غور و فکر ہی نہیں تلقین عمل بھی
ہے۔ فرماتے ہیں:

"جو قومیں اپنی زبان سے واقف نہیں ہوتیں وہ کوئی قابلِ فخر علمی
ورثہ اور سرمایۂ ادبی نہیں چھوڑتیں۔ تمام ایسے ممالک جہاں اپنی زبان
کو استعمال نہیں کیا جاتا وہاں دماغی پستی ہوتی ہے ان کی ترقی محدود در محدود
ہوتی ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ لوگ اپنی زبان میں کام کرتے
ہیں اور اپنی زبان استعمال کرنے میں احساس کمتری محسوس نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر قریشی کے خیال کی تصدیق کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
پاکستان کی تخلیق سے صرف دو سال پہلے جاپانی قوم ایک شکست خوردہ، بکھری،
ٹوٹی پھوٹی اور تباہ شدہ قوم تھی۔ لیکن جب اس قوم نے اپنی تعمیرِ نو پر کمر باندھی
تو آج سائنسی ایجادات اور آلات میں امریکہ برطانیہ اور جرمنی کی مارکیٹ ختم کر
کے انہیں اپنا دستِ نگر بنا دیا ہے۔ آپ سڑکوں پر آٹو موبائیل اور موٹر سائیکل سے
لے کر سکائی لیب گاڑیوں تک جاپان کے علم و فضل کا علم لہراتا پاتے ہیں۔ ہنڈا
سوزوکی، اسوزو، ٹیوٹا، دائی ہتسو، مزدا، شراڈ کے علاوہ کون سی گاڑیاں آپ کو
نظر آتی ہیں سوائے مرسڈیز کے ایک بھی نہیں۔ ٹیلی ویژن، وی سی آر، کیمرے سب
جاپان کی کمپنیوں کے نظر آتے ہیں۔ لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو کے اجرا سے سائنسی
اصطلاحات اور سائنسی علم جو انگریزی زبان میں ہے ہم ان سے محروم ہو جائیں گے۔
ان سے پوچھیے کہ کیا جاپان نے انگریزی پر انحصار کیا۔ دوسرے درجے پر بھی جرمنی
فرانس اور روس میں سائنسی ترقی کیا انگریزی کی مرہونِ منت ہے اور پھر اردو میں
اصطلاحات کے ترجمے سے آپ اس لیے گھبراتے ہیں کہ ان میں فارسی زدہ اور عربی زدہ
الفاظ ہوں گے جنھیں آپ کا طبقاتی غرور قبول نہیں کرتا تو آئیے اردو اپنا دامن
کھولے آپ کے لیے موجود ہے۔ پہلے بھی اردو نے انگریزی کے لیے اپنا دامن کھلا
رکھا ہے۔ آپ آج کتنی آسانی سے ایکسرے، ٹریفک، لیس، کلینک، لیمپس،
مارکیٹ، سوسائٹی، پروگرام، ڈسمس، سٹور، پٹ اپ، ریکارڈنگ، آڈٹ، ہارٹ
اٹیک اور اس طرح کے سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں
اگر عربی فارسی سے الرجک ہیں تو اردو میں انگریزی کے الفاظ قبول کرنے کو تیار رہیں اور
پھر انگریزی میں اپنے اردو میں سوچے ہوئے خیالات کا ترجمہ کریں گے اور مذاق کا
سامان پیدا کریں گے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اسی سلسلے میں افکار و اذکار کے
صفحہ ۱۳ پر یہی بات کہی ہے:

"غیر زبان میں مافی الضمیر کو پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اجنبی
زبان بولنے میں لوگ مذاق اڑاتے ہیں مگر قومی زبان بولتے وقت کوئی مذاق
نہیں اڑا سکتا۔" صہ ۱۴

آئیے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے افکار و اذکار کے ایک دو صفحے اور پلٹ کر دیکھتے
ہیں۔ صہ ۴۴ پر آپ ارشاد فرماتے ہیں:

"قومی زبان ہی قوم کو متحد کرنے اور اس کے قومی تشخص کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بالخصوص پاکستان جہاں مختلف علاقائی زبانیں ہیں کوئی قوم اُس وقت تک ترقی کے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنی قومی زبان میں جملہ علوم حاصل نہ کرے۔ کوئی قوم کسی دوسرے ملک یا دوسری قوم کی زبان کا سہارا لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہوگی اور مفلوج ہو جائے گی اور دنیا کی بڑی اقوام میں اس کا شمار نہیں ہو سکتا۔ تعمیر ملت میں قومی زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

زبان کس طرح قوم کو متحد کرنے، ان کے سیاسی شعور کو پختہ کرنے اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں واضح کردار ادا کرتی ہے اُس کی مثال میں ماضی قریب کی تاریخ سے پیش کرنا چاہتا ہوں بلکہ اسے آپ اپنے زمانے کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ میرے ذاتی مطالعے اور مشاہدے کی کہانی ہے ـــ جو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں ایک واضح فرق کا ثبوت ہے۔ پہلی بار جب میں مشرقی پاکستان میں دو سال رہا تو بنگلہ سیکھنے کے لیے بنگلہ زبان کا قاعدہ خریدا اور ساتھ ہی میس کے بیروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ بنگلہ بولا کریں اور میری غلطیاں بتادیا کریں۔ ایک دن میں نے ٹھنڈا پانی مانگنے کے لیے بیرے سے کہا "شیتل جول نئے آشو" بیرے نے مجھے فوراً کہا "ناشاب ٹھنڈا پانی بولن۔ جول ہندو لوک بول چھے مسلماں پانی بول چھے" دو ایک دن کے بعد میں نے انڈا لانے کے لیے اُسے کہا "ڈیم آنو" تو بیرے نے مجھے پھر روکا اور کہا "ڈیم ہندو لوک بول چھے مسلمان انڈا بول چھے"۔

اب دس سال بعد ۱۹۷۰ء میں میں گھر کے سامنے دکان پر گیا اور پوچھا "انڈا کو تو پوشہ دیچھن" دکاندار نے کہا "پورا بنگلہ نہیں سیکھا" میرے پوچھنے پر بتایا "انڈا نہیں ڈیم بولا جائے" جب میں نے کہا "ہندو ڈیم بولتے ہیں" تو دکاندار نے کہا "شاب ہندو مسلمایز کو تھا نوئے۔ شوب بنگلہ ے ڈیم بول چھے" یہ وہ دن تھے جب اسلام علیکم کے بجائے "جوئے بنگلہ" بولا جانے لگا تھا۔

اور آخری واقعہ بھی قابل تفکر ہے ہم فوجی عموماً ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا رکھتے ہیں۔ ایک پروفیسر صاحبہ نے مجھ سے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ یہ وردی کا ایک حصہ اور سنت بھی ہے اور خطرے کے وقت کام آتا ہے یعنی اگر کوئی کتا حملہ کرے تو اپنی حفاظت کی جا سکے۔ "حملے" کی بنگلہ ذہن سے اتر گئی تھی۔ معاً میں نے سنسکرت کا لفظ استعمال کر دیا اور کہا "جو دی کونو کوکورا کرمان کورے" ابھی میں نے جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ پروفیسر صاحبہ تقریباً اچھل کر بول پڑیں "واہ کی شدھو بنگلہ شیکھے چھن" واہ آپ کتنی خوبصورت بنگلہ سیکھ گئے ہیں۔ میری ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں انہیں حسن سنسکرت کے لفظ سے ملا۔ یہ سب کن حالات کی غمازی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں سکول میں داخل ہونے والا بچہ اب ۱۹۷۰ء میں ۱۵ سال کا میٹریکولیٹ تھا اور اُس کی زبان دس سال پہلے کی زبان سے یکسر مختلف تھی اب سلہٹ کا مسلمان دوسرے مسلمان سے "اپنار اسم شریف" کے بجائے "اپنار شبھ نام کی" کہتا تھا۔ یعنی بنگلہ سے فارسی کے الفاظ نکال کر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ داخل کر دیے گئے۔

اور ۱۹۷۰ء کی بنگال وحدت اور قومی یک جہتی کا نظارہ پوری دنیا نے کیا جس کے سامنے ہمارا سر آج بھی شرم سے جھکا ہوا ہے اور یہ حقائق اس بات کا تاریخی ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ قومی زبان قومی یک جہتی کی کتنی مکمل ضمانت پیش کرتی ہے وہاں کا تو یہ حال تھا کہ ڈھاکہ کی بنگلہ اور چٹاگانگ کی بنگلہ میں اتنا فرق تھا جتنا پشاور کی ہندکو اور سکھر کی سندھی میں ہے لیکن وہاں رنگپور سے چٹاگانگ تک اور سلہٹ سے جیسور تک صرف ایک زبان تھی بنگلہ اور یہاں اردو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، پوٹھوہاری اور ہندکو ـــ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم بھی اپنی سوچ کو مثبت بنائیں اور ایک قومی زبان پر فخر کرنے کے قابل نبیں۔ وہ زبان جسے اردو کہتے ہیں جس میں سب صلاحیتیں موجود ہیں یعنی یہ زبان

۱۔ کراچی سے خیبر تک سمجھی جاتی ہے
۲۔ اس میں علم و ادب کا ذخیرہ موجود ہے
۳۔ اس میں ابلاغ کی صلاحیت ہے
۴۔ اس میں مافی الضمیر آسانی سے اور جلدی ادا کر سکتے ہیں
۵۔ اس کا دامن دوسری زبانوں کے الفاظ کے لیے کھلا ہے
۶۔ اصطلاحات کو بعینہٖ یا انتہائی معمولی تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیتی ہے
۷۔ اس کے رسم الخط میں روانی ہے
۸۔ اس میں ہر آواز کے لیے حرف موجود ہے اور ہر حرف کی مختلف آواز ہے۔
۹۔ مختصر ترین املا کی زبان ہے مثلاً پشاور میں پانچ حروف انگریزی کے PESHAWAR آٹھ حروف کے مقابلے میں یعنی انگریزی کے مقابلے میں اردو کی تحریر نسبتاً ۶۲½ فیصد محنت کی طالب ہے۔
۱۰۔ قومی یک جہتی کی ضامن ہے

تلك عشرة كاملة

اس لیے ہم اس مرحلے پر بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مقابلے کے امتحانات کے لیے اردو متبادل ہی نہیں نعم البدل حیثیت کی مستحق ہے۔

سید محمد تقویم الحق کاکاخیل

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدر محفل، محترم وحید قریشی صاحب

میرے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے یا مجھ کو جس موضوع کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس کا عنوان ہے "قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ" اس موضوع کے کئی پہلو ہیں :

قوم کی بنیاد اگر نسل اور جغرافیائی حدود پر نہ ہو، تو اس کے تین اساس ہوتے ہیں نظریہ ثقافت اور زبان۔ زبان ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ثقافت بے زبان نہ ابھر سکتی ہے نہ پنپ سکتی ہے۔ اس لیے ثقافت اور زبان دو ہم آہنگ وحدتیں ہیں جو مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی ملت کی قومی ثقافت بھی ہے۔ اور قومی زبان بھی ہے تو پھر وہ ملت مکمل طور پر ایک جہت ہے۔ مزید کسی یک جہتی کی ضرورت نہیں رہتی۔ رنگ و نسل کی گوناگونی سے قوم کی جہت نہیں بدلتی۔ اس سے تو اجتماعی زندگی میں رنگ بھر جاتا ہے اور منزل منزل منظر خوشگوار ہو جاتا ہے۔ قومی زبان قومی یک جہتی کی امین ہوتی ہے اور وہ نظریہ و ثقافت دونوں کو بہ حفاظت آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے۔

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جو شعور و احساس کے ساتھ جد و جہد آزادی کے تمام مراحل سے گزر چکے ہیں۔ میں نہایت وثوق سے گواہی دیتا ہوں کہ پاکستان بننے اور اس سے کچھ مدت بعد تک ہمارے ذہنوں میں دو باتیں واضح تھیں۔ پاکستان کا مقصد ہے لا الہ الا اللہ۔ اور پاکستان کی قومی زبان ہے اُردو۔ پھر موسم بدلتے رہے۔ گرد اٹھتے رہے۔ دھند پھیلتی رہی اور یہ دونوں واضح باتیں دھندلا گئیں۔ لیکن اہل فکر کو اب بھی اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ کہ ہم ایک قومی زبان کو فروغ دیں۔ ہمارے نظریے اور ثقافت کی امین ایک قومی زبان ہی ہو سکتی ہے اور یہ ورثہ قومی زبان کے ذریعے ہی آنے والے نسلوں تک پہنچ سکتا ہے۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی زبان نہ نظریے کی امانت سنبھال سکتی ہے نہ ثقافت کی۔ اس بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں نہ ہیں۔ اور موضوع کا یہ حصہ بحث طلب نہیں۔

موضوع کا دوسرا حصہ قومی زبان کا نفاذ ہے اور غالباً موضوع بحث قومی زبان کے نفاذ اور قومی یک جہتی کا باہمی رابطہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کہنے کے لیے اس میں کوئی بات نہیں۔ قومی زبان وہ ہوتی ہے جو پوری قوم میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اور جو زبان پوری قوم بولتی اور سمجھتی ہو وہ خود نافذ ہوتی ہے۔ صدیوں پہلے نافذ ہو چکی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نافذ رہتی ہے اور اس کے نفاذ کے لیے کسی قانون سازی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ نافذ کرنے کی بات ایک تاریخی الجھن کی پیداوار ہے اور اس الجھن کا منطقی تجزیہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو لوگ دور آزادی میں پیدا ہوئے ہیں اور ماشاءاللہ ان کی تعداد کافی نظر آتی ہے۔ ان کو میری بات سمجھنے میں دقت ہو گی۔ کالونیاں بنانے کا دور گزر چکا ہے۔ اور فاتح و مفتوح کے معنی بدل گئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب برصغیر پر ایک اجنبی قوم کی حکومت تھی۔ ان کے نظریے بھی ہم سے مختلف تھے۔ ان کی زبان بھی مختلف تھی اور ان کی ثقافت بھی۔ انہوں نے اپنی قوت اور ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر یہاں قدم جمائے تھے۔ اور جمائے رکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے قوم ان کی حکومت ماننے کے لیے تیار نہ تھی اور انہیں عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ رکھنے میں کئی خطرے پیش آ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنا حکومتی انتظام ایسا رکھا کہ قوت حاکمہ ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں رہے۔ اور وہ طبقہ حاکم و محکوم کے درمیان رابطے کا کام دے۔ اور کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے حاکموں کی زبان انگریزی کو دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کیا۔ تاکہ اس زبان اور ثقافت سے ہم آمیز ہونے والے دوسروں سے بالا و برتر سمجھے جائیں اور قوت حاکمہ کا امتیاز قائم رہے۔

پھر ان کو جانا پڑا تو اس نظم مملکت کے ساتھ وہ دفتری زبان بھی ہمیں ورثے میں ملی اور بد قسمتی سے اس کو نظام مملکت کا حصہ سمجھ لیا گیا۔ بے شک اس زمانے کی حکومت چلانے میں اس زبان کا ایک خاص حصہ تھا۔ اور ایک خاص مقصد کے لیے اس کی

ضرورت تھی۔ لیکن وہ ضرورت کیا اب بھی ہے؟ کیا اب بھی اس ثقافت اور زبان سے ہم آمیز ہونے والوں کو بالا و برتر سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یوں سوچیئے۔ کیا اب بھی قوت حاکمہ کا امتیاز قائم رکھنے کی ضرورت باقی ہے؟

میں خصوصی طور پر انگریزی کا ذکر کر رہا ہوں کہ اردو کا اصلی مقام انگریزی نے چھینا ہے۔ اور اس کا جھگڑا انگریزی سے ہے۔ پاکستانی زبانوں سے نہیں۔ پاکستانی زبانیں تو وہ چشمے ہیں جن سے یہ دریا بنتا ہے۔ اور جو اس دریا کو بہائے رکھتے ہیں۔ یہ نافذ کرنے کی بات انگریزی نے پیدا کی ہے۔ اور انگریزی یقیناً اب ہماری قومی ضرورت نہیں رہی۔

حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو اردو کو نافذ نہ کرنے کے لیے اب کوئی بہانہ بھی نہ رہا۔ وہ سارے بہانے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ جو اردو کو دفتری زبان نہ بنانے کے لیے کیے جاتے تھے۔ نچلی سطح پر عملاً اردو دفتری زبان ہے۔ تھانیدار کا دفتر اردو میں چلتا ہے۔ پٹواری کے دفاتر اردو میں ہیں۔ بلدیاتی ادارے اردو استعمال کر رہے ہیں۔ ماتحت عدالتوں میں گفتگو کی زبان اردو ہے۔ ان سب محکموں نے اپنے مصطلحات وضع کر رکھے ہیں اور عوام ان مصطلحات سے مانوس ہیں۔ بات عالم بالا میں جا کر اُلجھ جاتی ہے۔ ہم مقتدرہ قومی زبان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے عالم بالا کے لیے بھی تمام مصطلحات کے اردو متبادل مہیا کر دیے ہیں۔ اردو مختصر نویسی اور ٹائپ کاری کے لیے بھی تمام سہولتیں فراہم کر دی ہیں۔ اور صرف خلوص دل سے "ہاں" کہنے کی دیر ہے۔

انگریزی علمی زبان ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے۔ بے شک ہے دنیا میں بہت سارے اقوام رہتی ہیں۔ انہوں نے اس علمی زبان سے فیض حاصل کرنے کے جو راستے اختیار کیے ہیں۔ وہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ مان لیتے ہیں کہ اردو کو قومی سطح پر درسی زبان بنانے میں ابھی کچھ مشکلات ہیں لیکن اس کو دفتری زبان بنانے میں کیا تکلیف ہے؟ خدارا غور فرمائیے۔ ہم قانون کی خلاف ورزی پر لوگوں کو جیل بھیجتے ہیں اور ان کو تعزیرات پاکستان پڑھنے نہیں دیتے۔ ہم اسمبلی میں عوام کی بھلائی کے لیے قوانین بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے انگریزی سیکھو۔ ہم ایک سائل کی درخواست پر اس کے سامنے احکام صادر کرتے ہیں اور پھر وہ دنیا بھر سے ان کا مطلب پوچھتا پھرتا ہے۔ ہم مقدمے کے فریق بن کر عدالت میں جاتے ہیں اور پھر کچھ سمجھ نہیں پاتے کہ کون کس سے کیا کہہ رہا ہے۔ اور یہ انصاف ہم سے مخاطب کیوں نہیں ہوتا؟ کوئی جواز بھی ہے اس کا؟ کوئی وجہ بھی ہے اس کی؟

میرے بزرگو اور میرے دوستو!

قوم اور قومی حکومت کے درمیان رابطے کے لیے قوم کے پھیلے ہوئے خطوں کو باہم ملانے کے لیے، انصاف دینے اور انصاف کرنے کے لیے، قومی یک جہتی اور تحفظ کے لیے اور کچھ نہیں تو عقل و دانش کو مطمئن کرنے کے لیے قومی زبان کو نافذ کرنا ایک واضح ضرورت ہے اور ایسے افراد کی جو اجنبی ثقافت اور زبان کو بالا و برتر نہ سمجھتے ہوں اور اب بھی قوتِ حاکمہ کا امتیاز قائم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں۔

بنگلہ دیش میں انگریزی استعمال کرنیوالوں کو سزائیں

بنگلہ دیش نے برطانوی راج کی نشانی انگریزی زبان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ برطانوی روزنامے ٹائمز کے مطابق گذشتہ ماہ پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا تھا جس نے نوآبادیاتی دور کی زبان کے استعمال پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اب جو شخص انگریزی استعمال کرتا ہے اسے جرمانے اور قید کی سزا دی جاتی ہے۔ تمام بورڈوں وغیرہ پر انگریزی کی جگہ بنگالی زبان تحریر کرنے کی آخری تاریخ ۱۲ مئی تھی جس کی وجہ سے پینٹر دن رات بورڈ بدلنے میں مصروف تھے پینٹروں کی قلت کی وجہ سے جو دکاندار اپنے بورڈ بنگالی میں نہیں لکھوا سکے انہوں نے اپنے قیمتی سائن بورڈوں کی انگریزی تحریروں پر سفیدی پھیر دی ہے تین سرکاری افسروں کو جنہوں نے انگریزی میں خطوط لکھے تھے۔ سزا دی گئی ہے۔ عدالتوں نے انگریزی میں دلائل سننے سے انکار کر دیا ہے۔ بینک کے ایک پرجوش کلرک نے ایک ایسا چیک قبول کرنے سے انکار کر دیا جو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔

ہفت روزہ اخبارِ خواتین ۲۰ تا ۲۶ اپریل ۸۷

درسی کتابوں کی منگائی

والدین کی طرف سے نئے سال کی درسی کتابوں کی منگائی پر شدید اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ تعلیم کو عام کرنے کی پالیسی کی روشنی میں درسی کتابوں کو سستا کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی درسی کتابیں صوری اعتبار سے دلکش بنادی گئی ہیں اور اس رنگ و روغن کے سبب پروڈکشن کے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے تاہم کتابوں کی گرانی کی اصل وجہ کاغذ ہے جس پر حکومت قاعدے کے مطابق ایکسائز ڈیوٹی، امپورٹ سرچارج اور دیگر ٹیکس وصول کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کتابوں کو عام آدمی کی قوت خرید کے مطابق سستا بنانے کے لئے ان کے کاغذ کو ڈیوٹی فری قرار دیا جائے ٹیکسٹ بک بورڈ کوئی تجارتی ادارہ نہیں اس لئے اسے پہلے ہی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جا چکا ہے۔ اگر اس کے زیر استعمال کاغذ سے ڈیوٹی ہٹالی جائے تو کتابیں یقیناً سستی ہو سکتی ہیں۔

نوائے وقت لاہور ۲۹ اپریل ۸۷

سید عابد شاہ عابد

اردو اور پشتو کے روابط

ایک ہی خطے میں بولی جانے والی زبانوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا فطری عمل ہے اور یہی عمل زبانوں کی وسعت کا ضامن ہوا کرتا ہے اور انہیں حسن عطا کرتا ہے۔ ہمارے وطن میں کئی ایک زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ تمام کی تمام پاکستانی زبانیں ہیں ان کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اور انہیں سمجھنے کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی نہیں ہوا کرتا کہ یہ ہماری اپنی زبانیں ہیں اس لیے یہ ہمیں اچھی لگتی ہیں اور ہم انہیں سمجھتے ہیں بلکہ روزمرہ میں جب یہ زبانیں ایک دوسرے کے الفاظ اپنا لیتے ہیں اور اصطلاحات کو خود کو سمو لیتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں سے آشنا ہیں اور جب زبانوں سے آشنائی ہو جاتی ہے تو جگہ دلوں میں ملتی ہے کیونکہ زبان کا وسیلہ آشنائی کے لیے بہت ہی موثر ہوا کرتا ہے۔

اردو اور ان زبانوں کا جو ایک ہی معاشرہ میں بولی جاتی ہیں، قدیم ساتھ ہے پاکستان کے تمام خطوں میں بولی جانے والی زبانوں کا اردو کے ساتھ اتنا ہی پرانا رشتہ ہے جتنی کہ اردو کی اپنی طبعی اور لسانی عمر ہے۔ یہی پیمانہ ہم اردو اور پشتو کے تعلق کے لیے بھی روا سمجھتے ہیں۔ یہاں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فکر کبھی بھی زبانوں کی قید میں نہیں رہا کرتی بلکہ فکر کو ہم جب کوئی عملی اور تخلیقی جامہ پہناتے ہیں تو زبانوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہی وہ سہارے ہوا کرتے ہیں جو فکری لحاظ سے دو مختلف زبانوں کو پرکھنے کے لیے کام آتے ہیں اور پھر ایک ایسے پیمانے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ لسانی رشتوں اور ادبی روابط کو استحکام بخشتے ہیں۔

پشتو اور اردو کے لسانی اور ادبی رشتے اور رابطے جب زیر بحث لائے جاتے ہیں تو ان کے لیے کئی ایک دلائل دیے جاتے ہیں جن میں بنیادی طور پر قابل قبول دلائل کی تمام تر صداقت کا دار و مدار ہی لسانی اور ادبی روابط پر ہوا کرتا ہے۔ پشتو اور اردو کے درمیان یہ رابطے یقینی طور پر مستحکم ہیں، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں زبانوں پر لسانی اور ادبی دونوں صورتوں میں فارسی کا جامع اثر نظر آتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل الفاظ کا تجزیہ کرنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً

خیالات، اخلاص، خاطر، روزگار، روزی، بدل، وغیرہ، یہ تمام الفاظ اصلاً فارسی زبان کے ہیں اور فارسی ہی سے یہ پشتو اور اردو میں جگہ پا گئے ہیں۔ فارسی اور پشتو کا تعلق بہت ہی قدیم ہے اور ماہرینِ لسانیات کے مطابق ان کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے اور ان کا لسانی اور ادبی تعلق معاشرتی اعتبار سے بہت معتبر گردانا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ پشتو ماہرین لسانیات کے مطابق آرین زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی قدامت تحریری صورت میں کم و بیش پانچ ہزار سال ہے۔ ہیطلمرس کے مطابق یہ زبان پکتان قبائل کی تھی جو اسے پکتو کہتے تھے جو بعد میں پشتو کی صورت اختیار کر گئی۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو ماہرین لسانیات کے مطابق یہ زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور جہاں تک برج بھاشا پر دیگر زبانوں کے اثرات کا تعلق ہے تو فارسی زبان کے اثرات اس پر بہت ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

بھاشا، میں نا - بنا کو فارسی میں نہ اور نے کہتے ہیں اور یہی الفاظ پشتو میں اپنی صوتی اشکال کے ساتھ انہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں اور جب ہم اردو کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اردو میں بھی ان لفظوں کو انہی معنیٰ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ تھوڑی سی وضاحت ان لفظوں کے ذریعے بھی کرتا چلوں جو اردو اور پشتو کے تعلق سے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

(اردو)	(پشتو)	(اردو)	(پشتو)	(اردو)	(پشتو)
دو ۲	دوہ ۲	چہرہ	څہرہ	سودا	سودا
دس ۱۰	لس ۱۰	زبان	ژبہ	قوت	قوت
نوے ۹۰	نوی ۹۰	زمین	زمکہ	بد	بد

یوں تو اس ضمن میں کئی ایک اور مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن وقت کی کمی کے باعث اس پر اکتفا کرتے ہوئے اب اردو اور پشتو کے ادبی روابط کی طرف آپ کی توجہ مبذول

کرتا ہوں پشتو زبان کے ادب پر شروع ہی سے فارسی کے اثرات بہت ہی نمایاں طور پر موجود رہے ہیں۔ ان کی وجہ وہ دینی کتب ہیں جو عربی سے فارسی میں اور پھر فارسی سے پشتو میں ترجمہ ہوئے یا پھر ایک عرصہ تک چونکہ فارسی زبان کو دفتری زبان کی حیثیت بھی حاصل رہی اس وجہ سے فارسی کے اثرات کا ظہور پذیر ہونا، دوسری زبانوں پر لازمی تھا، سو، پشتو بھی اس کے زد میں رہی، یہی عمل اردو کے ساتھ بھی رہا اور تمام دینی اور درسی کتب کا شروع میں فارسی اور عربی سے اردو میں تراجم کیے گئے اور یوں اردو کو برصغیر میں دوسری اور پھر ہوتے ہوتے وہ وقت بھی آیا جب اردو کی وسعت کے سبب اردو سے دیگر زبانوں میں تراجم کیے گئے۔ جن میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری اور شبلی نعمانی کی تحریر کردہ سیرت پاک آغا حشر کے ڈرامے وغیرہ بہت ہی مقبول ہوئے۔ شاعری اور نثر کے حوالے سے جن اصناف نے اردو سے پشتو میں آکر اپنا اثر منوایا اُن میں نظم کی مختلف اقسام، افسانے، ڈرامے، خاکے وغیرہ بہت ہی زود اثر اور معروف ہوئے۔ یوں تو پشتو کے شعرا نے پشتو کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی اپنی محبت اور رواداری کا اظہار اردو زبان میں شعر کہنے سے کیا ہے جن میں ہم خوشحال خان خٹک کی مثال اس طرح دے سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ایک غزل میں ہندی یا اسے اس وقت کی اردو کہیں، کے الفاظ استعمال کیے تھے جن میں ماریا، سانوریا وغیرہ کے قافیے باندھے گئے تھے۔ اسی طرح رحمان بابا نے بھی اپنی غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جنھیں ہم اردو کے الفاظ کہہ سکتے ہیں ان میں بات، مات، ساتھ، رات وغیرہ کا استعمال پشتو کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے اور یہ اردو اور پشتو کی رفاقت کی ایک واضح مثال ہے لیکن اس کی بہت ہی واضح شکل ہمارے سامنے معز اللہ مہمند کی غزل کی صورت میں آتی ہے۔ زمانے کے اعتبار سے معز اللہ مہمند بھی اُسی دور کا شاعر ہے جس دور میں خوشحال و رحمان نے پشتو ادب کے گلستان کو مہکایا تھا، فرق صرف عمروں کا ہے ان میں ترتیب کے لحاظ سے خوشحال خان خٹک، رحمان بابا اور پھر معز اللہ خان افغان کے نام آتے ہیں۔ معز اللہ خان مہمند پشتو زبان کا ایک خوش فکر شاعر ہے اور صاحبِ دیوان ہیں۔ انہوں نے اردو زبان میں بھی شعر کہے ہیں۔ نمونتاً پیشِ خدمت ہیں:

جس نے جو دیکھا رُوئے تو دیوانہ ہو رہا
آئینہ خانہ تجھ سوں پریخانہ ہو رہا
تیری کٹاری پرَم (پریم) کی دل موں (میں) میرے لگ
پیتا لہو ہوں دل میرا میخانہ ہو رہا

پوشیدہ دل میرے موں (میں) جو تھا رازِ عاشقی
افغاں تمام خلق موں (میں) افسانہ ہو رہا

معز اللہ مہمند کی ایک اور غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں روتا بہت جو ہوں دونوں نینوں موں ناسور ہوا
یہی رونا تیری یاد سیٹں تب چلتا ہوں دستور ہوا
نے چین مجھے بن تیرے سوں یہ اُمید نہ کرنا میرے سوں
تیرا مکھ زلفوں کے اندھیرے سوں مجھ ظاہر شعلۂ طور ہوا

یہ زمانہ گیارویں اور بارہویں صدی ہجری کا ہے اور یہ صدی پشتو ادب کی درخشندہ صدی ہے۔ اس صدی نے خوشحال خان، رحمان بابا، معز اللہ مہمند، حمید بابا اور ایسے کئی اور نامور شاعر پشتو زبان کو دیے جو فکر کے لحاظ سے پشتو زبان و ادب کو معراج کی منزلوں سے شناسا کرا گئے، یہی فکر آج بھی پشتو زبان کی حسن کی تراش خراش میں کارفرما ہے اور آج بھی پشتو ادب میں خوشحال و رحمان اپنے ہمعصروں اور ان کے بعد آنے والوں کے ساتھ زندہ و تابندہ نظر آتے ہیں، جس طرح ہم اردو ادب میں میر و غالب کو اردو شاعری کے زندہ و تابندہ شاعر گردانتے ہیں۔ فکر کی ہم آہنگی کے ناتے، سوچ پر کسی قسم کا قدغن نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی سوچ کے دھاروں اور پہنچ کو کسی حصار کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ رحمان بابا نے جو بات آج سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کہی تھی، یعنی گیارویں بارہویں صدی ہجری میں کہی تھی:

د طفلا نو پہ څیر وا ہرہ خاک بازی کا
خرچی کاندی کاروبار دَ د سے دُنیا

وہی بات دو، سوا دو سو سال بعد یعنی چودہویں صدی ہجری میں میرزا اسد اللہ خان غالب نے یوں کہی۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

یہ تو رہی فکر کی ہم آہنگی وسعت اور رسائی کی بات جو نہ تو زمانوں کی قید میں آ سکتی ہے اور نہ ہی کسی زبان کے لیے وقف ہو سکتی ہے انہی بنیادوں پر زبانوں کی قرابت داری

ہوا کرتی ہے۔ جن میں لسانی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی تعلقات کا عمل دخل نمایاں ہوا کرتا ہے۔ تراجم کی بہتات سے یہ عمل کچھ اور جاندار اور تیز تر ہوا کرتا ہے۔ مختلف اصنافِ سخن کی ایک زبان سے دوسری زبان میں درایت سے زبانوں کے ادبی سرمائے میں اضافہ ہوا کرتا ہے اور یہ تمام اچھی باتیں پشتونوں کو بھی اچھی لگتی ہیں کیونکہ پشتو میں آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ بہت ہی خوب صورت اور بہت ہی معیاری ہے، ماحول پر نظر ڈالتے ہوئے اور مطالعے کی سہولتوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے پشتو زبان کے ادبا اور شعرا نے پشتو میں بھی اردو زبان کے حوالے سے نئے نئے ادبی تجربے کیے ہیں اس ضمن میں ہمارے ادیب اور شعرا کی ایک طویل فہرست موجود ہے جنھوں نے پشتو شاعروں میں معیار کو بالکل اسی طرح برقرار رکھا ہے جس طرح دیگر زبانوں میں نظر پڑتا ہے بلوچستان میں اس ضمن میں جو نام ذہن میں آتے ہیں ان میں وہ شعرا سرفہرست ہیں جنھوں نے پشتو کے علاوہ اردو میں کام کیا، شعر کہے، نثر لکھی، ایسے اصحاب میں عبدالحق زبور مرحوم جو اختر شیرانی مرحوم کے شاگرد بھی تھے سرفہرست ہیں اسی طرح رب نواز مائل، سرور سودائی، سعید گوہر، سید رفیق شاہ، محمود ایاز، سہیل خٹک اور فاروق سرور وغیرہ جیسے نوجوان بھی اردو اور پشتو کے روابط کو مستحکم کرنے کی سعی میں معروف ہیں۔ بلوچستان کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد میں پشتو اور اردو کے روابط میں استحکام بخشنے کا عمل مزید مستحکم ہو رہا ہے۔ صوبہ سرحد میں اردو اور پشتو نے ایک دوسرے پر بہت ہی واضح اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو کی شاعری پر پشتو لہجہ وضاحت کے ساتھ اثر پذیر ہے اور اسی طرح اردو کی ادبی اصناف جو معروف ہیں پشتو میں جگہ پا چکی ہیں۔ روزمرہ میں جو اردو بولی جاتی ہے اس میں پشتو اور اردو کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کی مہک پیدا ہوئی ہے جس سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا یہ لہجہ پشتو اور پشتونوں کی روائتی گھن گرج کی ترجمان ہے۔ صوبہ سرحد میں پشتو زبان کے ادیب اور شعرا نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے مولانا محمد اسرائیل سمندر خان سمندر، امیر حمزہ شنواری، شیر محمد مینوش ایسے نامی گرامی ادبا اور شعرا نے اردو سے پشتو میں جو تراجم کیے ان کے ذریعے شاعری میں اقبال کا انداز اور اس کا پیغام پشتونوں میں متعارف ہوا اور اسی کے سبب سید رسول رسا، حافظ محمد ادریس اور سمندر خان سمندر نے اقبال کے انداز کو اپنایا اور بھرپور شاعری کی۔ ڈرامہ، افسانہ، اور ناول بھی اردو ہی کے ذریعے متعارف ہوئے۔ اسلم خٹک، ماسٹر عبدالکریم مرحوم عبدالکافی ادیب اور اسلام اجمل کے علاوہ اور کئی ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو میں شعر کہے، افسانے لکھے، ڈرامے لکھے، میرے خیال میں یہ اردو کی اپنی سرشت میں پوشیدہ حُسن اور محبت ہے جو وسعت کے لحاظ سے حُسن اور محبت کی طرح کسی قید و بند، رنگ و نسل اور علاقے کی پابند نہیں شرط فقط اس قدر ہے کہ جو کچھ بھی لکھا جائے انسان کی تعظیم، محبت اور خوشحالی کے لیے لکھا جائے، جو کچھ بھی پڑھا جائے اس غرض سے پڑھا جائے کہ اس میں محبت، رواداری اور ایثار کی شرح پوشیدہ رہے، جو بولا جائے محبتوں کو میزان بنا کر بولا جائے تو یقیناً زبانوں کے یہ رشتے اور مضبوط ہوں گے۔ ان میں تحریر کیے جانے والے شہ پارے ایسے ہوں گے کہ ان کو قریباً تمام پاکستانی سمجھ سکیں گے اور کیوں نہ سمجھیں آخر یہ تمام زبانیں ہماری ہیں، ہم ہی انہیں بولتے ہیں، ہم ہی انہیں سمجھتے ہیں، چاہے یہ گھروں میں بولی جاتی ہوں، بازاروں میں بولی جاتی ہوں یا دفتروں اور مکتبوں میں بولی جاتی ہوں۔ ان کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی تشریح ہے اور وہ محبت، عزت اور رواداری، جس پر سب کا حق ہے اور جس کو برتنا سب کا فرض ہے۔

سرکاری سطح پر اردو کے نفاذ کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے

حصول اراضی کا ترمیمی بل متعلقہ قائمہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ پنجاب اسمبلی کی کارروائی

لاہور (اپ پ) پنجاب کے وزیر قانون و تعلیم راجہ خلیق احمد نے صوبائی اسمبلی کو یقین دلایا ہے کہ حکومت اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے تاکہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت اپنی قانونی ذمہ داری پوری کر سکے۔ وہ ایوان میں بیگم نجمہ نابش الوری کی ایک تحریک استحقاق پر اظہار خیال کر رہے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا اور اس کی رو سے ۱۵ سال کے عرصے میں ہر سطح پر اردو کو نافذ کیا جانا تھا آئین کو بنے ۱۴ برس گزر چکے ہیں مگر اردو کو صوبائی یا قومی سطح پر رائج کرنے کیلئے کچھ نہیں کیا گیا جس سے ان کا استحقاق مجروح ہوا ہے۔ صوبائی وزیر قانون نے کہا کہ اردو کو نافذ کرنے کی راہ میں بعض فنی مسائل حائل ہیں۔ تاہم وفاقی اور صوبائی حکومت مقررہ مدت میں تمام سطحوں پر اردو کے نفاذ کیلئے انتظامات کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں پنجاب حکومت نے آئندہ برس کا بجٹ اردو میں پیش کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے اور چونکہ آئین کے تحت ابھی ۱۵ برس پورے نہیں ہوئے اس لئے استحقاق مجروح نہیں ہوتا۔ اس وضاحت کے بعد محرک نے اپنی تحریک پر زور نہیں دیا میاں ریاض حشمت جنجوعہ نے بھی صوبائی وزیر تعلیم کی وضاحت کے بعد اپنی تحریک پر زور نہیں دیا جو گورنمنٹ کالج جھنگ میں ریاضی، شماریات اور نفسیات کی ایم اے کلاسوں کے اجراء کے بارے میں تھی۔ قبل ازیں وزیر قانون و پارلیمانی امور راجہ خلیق احمد نے ایوان میں حصول اراضی کا ترمیمی بل ۱۹۸۷ء پیش کیا جس کا مقصد حصول اراضی کے قانون مجریہ ۱۹۸۴ء میں مزید ترمیم کرنا ہے تاکہ سرکاری طور پر زمین کے حصول کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں طریق کار کو آسان بنایا جائے۔ ایوان نے اس بل کو متعلقہ مجلس قائمہ کے سپرد کر دیا جو ۱۸ جون تک اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

جنگ پنڈی ۱۶ - ۶ - ۸۷ء

سید وارث اقبال

اردو بحیثیت ایک قومی زبان

عزت مآب جناب جنرل محمد موسیٰ صاحب گورنر بلوچستان

معزز سامعین کرام! السلام علیکم:

قبل اس کے کہ میں اپنے مضمون کی ابتدا کروں میں مناسب خیال کرتا ہے کہ اس بات کا اشارہ کرتا چلوں کہ زبانوں کا تقابل ان کا موازنہ اور ان کا اصل مقام متعین کرنا ایک انتہائی دقت طلب امر ہے۔ یہ کہہ دینا کہ کسی ایک زبان کی دوسری زبان پر افضلیت ہے یا کسی ایک زبان میں کسی دوسری زبان کے مقابلے میں گہرائی زیادہ ہے ایک مکمل لسانی جھگڑے کی طرف اشارہ کرنا ہوگا۔

چنانچہ میرا قطعاً کوئی ارادہ اس قسم کا نہیں ہے کہ میں اس بحث میں وقت ضائع کروں میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ میں سامعین کی توجہ اس طرف مبذول کراسکوں کہ وہ کیا وجوہات ہیں کہ جن کے سبب انگریزی خاص کر پاکستان میں اور بصورت دیگر برصغیر ہندو پاک میں ایک عوامی زبان نہ بن سکی ساتھ ہی یہ بات واضح ہے کہ اردو برصغیر ہندو پاکستان میں ایک عوامی زبان کی حیثیت سے مروج ہے اور یہ کہ اس زبان میں سائنسی، تکنیکی الفاظ کے بہت سے موزوں اور متبادل الفاظ نہیں بن سکے مگر اس زبان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے امتزاج سے ان دشواریوں پر قابو پا سکتی ہے۔ ایک اور اہم بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے مضمون کا تمام تر استدلال صرف اردو اور اس کا ایک تقابل انگریزی سے ہے اس تمام گفتگو میں تمام باتیں مفروضی ہیں حتمی باتیں میرے دائرہ کار میں شامل نہیں۔

میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس چیز کا حوالہ دیتا چلوں کہ اس وقت دنیا میں ۲۷۹۶ زبانیں ایسی ہیں جو قومی اور علاقائی سطح پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں دیگر ڈائے لیکٹس (Dialects) ان میں شامل نہیں ہیں۔ ان زبانوں میں صرف تیرہ زبانیں ایسی ہیں جو کہ پانچ کروڑ یا ان سے زیادہ افراد دنیا کے مختلف ممالک میں بولتے ہیں یہ زبانیں چینی، انگریزی، اردو، روسی، ہسپانوی، جرمن، جاپانی، ہندی، ملائی، فرانسیسی پرتگالی، بنگالی، اطالوی اور عربی پر مشتمل ہیں۔ اس بین الاقوامی جائزے کے تحت یہ اعداد و شمار ملتے ہیں کہ دنیا میں جب انگریزی بولنے والے بیس کروڑ پچاس لاکھ ہیں تو اردو کے بولنے والے کم و بیش بیس کروڑ افراد کے لگ بھگ ہیں۔ میں یہ حوالہ ایک یورپی لسانی محقق کی کتاب دی لینگویجز فار دی ورلڈ کے مطالعے کے بعد پیش کر رہا ہوں یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی تو چنانچہ اب مزید تیرہ سال گزرنے کے بعد ان اعداد و شمار میں یقیناً کافی اضافہ ہوا ہوگا اور ۱۹۸۲ء میں اب اردو بولنے والے اور سمجھنے والے افراد کی تعداد بیس کروڑ سے کافی بڑھ چکی ہوگی۔

اس ضمن میں یہ مفروضہ بھی پیش کرنے کی جسارت کروں گا کہ ماہرین لسانیات کی تحقیق کے بعد جو بات کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان کلی طور پر مربوط اور مستحکم نہیں ہے۔ ہر ایک زبان میں مختلف نوعیت کی لسانی پیچیدگیاں شامل ہیں اور یہ کہ تلفظ سے لے کر جملے کی مکمل بناوٹ تک ایک قدرتی جھول ایسا رہتا ہے جس کو دور کرنا بڑے سے بڑے صاحب طرز ادیب کے دست قدرت سے بھی باہر رہا ہے چنانچہ یہ کہہ دینا کہ انگریزی زبان حتمی طور پر ایک مکمل زبان ہے اور اس میں لسانی پیچیدگیاں نہیں ہیں یہ ایک مہمل سی بات ہوگی کیونکہ یورپی ماہرین لسانیات انگریزی زبان کی خامیوں کی طرف بار بار اشارہ کرتے رہے ہیں اور اسی قسم کی خامیاں ان کو انگریزی گرامر میں بھی نظر آتی رہی ہیں۔ میں اس پہلو کی مزید بحث میں بھی نہیں جانا چاہتا لیکن یہ مسئلہ بھی ماہرین لسانیات کی بحث اور تحقیق سے تعلق رکھتا لیکن ایک طرف انگریزی زبان کے ماہرین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اگر کوئی آدمی انگریزی کے صرف آٹھ سو پچاس الفاظ سیکھ سکتا ہے تو اس کو انگریزی زبان کے بولنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

مگر پھر اس دعوے کے بعد ماہرین لسانیات کی آپس میں کافی بحث و مباحثے کے بعد معاملہ بھی سلجھ نہ ہو پایا کہ یہ دعویٰ کہاں تک علمی دائرہ کار میں لایا جاسکتا ہے اور کہاں تک نہیں یہ تو ایک اجمالی صورت انگریزی زبان اور دنیا کی دوسری زبانوں کے بارے میں سامنے آتی ہے ادھر تاریخی حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ۱۷۰۶ء میں یورپی زبانوں کے مشنری سکولوں کے قیام کا عمل شروع ہو چکا ہے یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں اورنگزیب کی حکومت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں ۱۷۰۶ء میں تامل زبان بولنے والے علاقوں میں ڈینش مشن قائم ہو چکے تھے اور ڈینش اور پرتگالی زبان ان علاقوں میں

بولنی شروع کی جا چکی تھی ساتھ ان باتوں کا بھی حوالہ ملتا ہے کہ دیگر یورپی مشنریز نے مدراس اور بنگال میں اپنے مشنری سکولوں کا قیام رفتہ رفتہ شروع کر دیا تھا مگر یہ تمام سکول ۱۷۹۳ء تک کوئی خاص ترقی نہیں کر سکے۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں یعنی اورنگزیب کے زمانے میں حالانکہ اردو زبان ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی مگر اس کی حیثیت ایک ورناکیولر سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۷۹۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی تجارت اور جوڑ توڑ میں کافی کامیاب ہو چکی تھی اور انگریزی مشنریز نے انگریزی زبان کو خاص کر مدراس اور بنگال میں مروج کرنے کی کوشش کی تو اس وقت ان کا اردو زبان سے کوئی مقابلہ نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کے نصاب تعلیم میں جو زبانیں افضلیت رکھتی تھیں وہ فارسی اور عربی تھیں یا پھر سنسکرت۔ ان مشنریز کو انگریزی زبان پڑھنے میں جو دشواریاں پیش آتی تھیں ان کا حل وہ مدارس کے نصاب تعلیم کے موازنے کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ایک کتاب مشنریز سکولز ان انڈیا (۱۸۳۷ - ۱۷۹۳) کے مطالعے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں تعلیم خود انگریز ماہرین تعلیم کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ۲۴.۵ فیصد تھی اور نصر اللہ در نائق اپنی کتاب ہسٹری آف ایجوکیشن ان انڈیا میں بہ حوالہ ایک انگریز مشنری ولیم آرمز کے توسط سے بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم ۳۳ فیصد زائد ہو گی نائق صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانے کے مسلمانوں کی تعلیم کے نصاب اور مدراس کے انتظامی امور کے بارے میں ریکارڈ غائب ہو جانے کے سبب حقیقی اعداد و شمار کا ملنا ایک دقت طلب امر ہے اسی دور میں برطانیہ میں تعلیم کی شرح ۴۵ فی صد تھی بہر صورت جب مشنری سکولز نے ہندوستان میں زبان کا پرچار شروع کیا تو ان کو کافی دشواریوں کا سامنا تھا۔

اور گو کہ اس چیز کا اعتراف ان کے ماہرین تعلیم نے کبھی بھی کھل کر نہ کیا کہ اس دور میں فارسی اور عربی بذات خود اتنی وسیع زبانیں تھیں کہ ان کے مقابلے میں انگریزی زبان ایک انتہائی ناقص اور کمزور زبان سمجھ کر رد کر دی جاتی تھی اس لئے ہندوستان کے مسلمان اپنے تعلیمی نصاب اور اپنی زبانوں پر فخر محسوس کرتے تھے اور دیگر یورپی زبانیں جو اس زمانے میں ہندوستان میں مروج تھیں ان کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے اس ضمن میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ اس دور کے مدارس بہت سی عملی تعلیم کے قائل تھے اور کسی بھی اعتبار سے ان کا نصاب تعلیم انگریزی نصاب تعلیم سے کمتر نہ تھا۔ رفتہ رفتہ مشنری سکولز قائم ہونا شروع ہوئے تو اس وقت ان لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشنری سکولز کی سرپرستی اور ان کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے درخواستیں کرنا شروع کر دیں۔

چنانچہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے کلکٹر حضرات کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ صوبوں میں تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹیں بھیجیں اور بعد ازاں ۱۸۱۳ء میں ہندوستان میں سرکاری سطح پر حکومت نے ہر ضلع میں گورنمنٹ سکولز اور گورنمنٹ کالج کھولنے شروع کیے۔ ابھی تک اس دور میں بھی اردو کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی اور ذریعہ تعلیم وہی فارسی اور عربی زبانیں تھیں اردو اس زمانے میں رفتہ رفتہ ایک مقبول عام زبان بنتی جا رہی تھی جس کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔

اردو بحیثیت ایک مستند اور مسلمہ زبان کے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد خود بخود تسلیم کر لی گئی اور جب سر سید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی نے مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کا جائزہ لینا شروع کیا تو یہ معلوم ہوا کہ ملازمتوں کے حصول میں وہ ہندوستان کی دیگر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اب ان کے لیے ناگزیر ہو چکا تھا چنانچہ باوجود کافی مخالفت کے سر سید تحریک انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے کوشاں رہی پھر بھی ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں نے کبھی اس زبان کو وہ اہمیت نہ دی جو فارسی اور عربی بعد ازاں اردو کو دی گئی۔

اردو میں وہ کون سے عناصر تھے جن کے سبب وہ خود بخود اپنا ایک مقام علمی سطح پر مرتب کرتی رہی اس کے اسباب معلوم کرنا ایک مشکل امر ہے ساتھ ہی یہ بات بھی قرین قیاس سے باہر ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کے سبب انگریزوں کی انتھک کوشش کے باوجود مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان ایک عوامی زبان نہ بن سکی۔ یہ بات بھی سمجھ سے باہر ہے کہ آج چالیس سال تک پاکستان میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ ہم لوگ انگریزی زبان پر تمام تر دسترس رکھنے کے بعد انگریزی کو اپنے ملک کی ایک عوامی زبان بنانے سے منحرف ہیں۔ ان مسائل کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ ہم قومی سطح پر وہ زبان اپنائیں جو عوامی زبان ہے نہ یہ کہ وہ زبان جس پر ہم کافی دسترس رکھنے کے بعد بھی اس کو اپنانے سے نفسیاتی طور پر گریزاں ہیں۔

ڈاکٹر تصدق حسین راجا

دفتری نظام اور قومی زبان

دفتری زبان سے مراد ہمارے ہاں کا وہ مروجہ دفتری ڈھانچہ ہے جس میں آزادی کے چالیس برس گزر جانے کے باوجود اب تک انگریزی دفتری نظام کے طور پر رائج ہے اور اردو ان واضح ذمودات بانیٔ پاکستان کی آس پر جو اسے پاکستان کی سرکاری و قومی زبان بنانے کے حق میں دیے گئے تھے۔ در سرکار پر کھڑی اذنِ باریابی کی منتظر ہے قومی زبان کی نارسی کے دیگر نقصانات کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ انگریزی کے چلن کے باعث دربار سرکار اور عامۃ الناس کے مابین ایک ایسی دیوار حائل ہے جو قومی یک جہتی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

اردو کی بات کوئی دس بیس سال پرانی نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال پرانی ہے اور نفاذِ اردو کا جو مسئلہ آج ہمیں درپیش ہے اس کی اصل ابتدا انگریزی دور حکومت کی تعلیمی پالیسی کے خالق لارڈ میکالے نے کی تھی جس کا کہنا یہ تھا کہ :

"ہم ایسی تعلیم چاہتے ہیں کہ جس کے فارغ التحصیل لوگ نسل اور رنگ میں دیسی ہوں مگر ذوق خیالات اور جملہ ذہنی میلانات کے لحاظ سے انگریز ہوں۔"

اور میکالے کی یہ تعلیم حاصل کرنے والا طبقہ آج بھی ہمارے معاشرے کا وہی مخصوص طبقہ ہے جو انگریزی کی طرفداری میں اس مقام پر کھڑا ہے جہاں اسے قوم، وطن اور آزادی سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آزاد جسم کے ساتھ غلام ذہن کے مالک یہی لوگ اس اردو سے متنفر ہیں جو ہماری ملی پہچان ہے۔

۱۸۳۷ء میں انگریزی حکومت نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر دفتروں اور عدالتوں میں رائج کر دیا تھا اسی طرح ۱۸۴۹ء میں پنجاب اور سرحد میں بھی دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی اور کسی طرف سے بھی اس کی مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھی تھی جب تک انگریزی دفتری زبان کے طور پر رائج نہیں ہوئی سارا کاروبار اردو میں نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔

ہم جب اردو زبان کے حوالے سے اپنی دفتری زبان، قومی زبان، ذریعہ تعلیم یا وسیع تر تناظر میں استحکام پاکستان اور قومی یک جہتی میں اردو کے کردار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ سب ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ ان میں کسی ایک کو بھی جدا کرنے سے سارا ملی و ملکی شیرازہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں کراچی میں منعقد ہونے والی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جس کی صدارت اس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن نے کی تھی۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ صرف اردو کو پاکستان کی لنگوا فرینکا کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور اس سے اگلے سال مارچ ۱۹۴۸ء کی لاہور میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں جہاں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اور بہت سی سفارشات کی گئی تھیں ان میں "دارالترجمہ" کے قیام کو بھی لازمی قرار دیا گیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد وقتاً فوقتاً جو تعلیمی پالیسیاں اور تعلیمی کمیشن بنے ان سب میں اردو کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کا ذکر باقاعدگی سے آتا رہا اور پاکستان کے دساتیر میں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی بات شامل رہی یہاں تک کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی شق ۲۵۱ میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ "اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اسے پندرہ سال کے اندر یعنی ۱۹۸۸ء میں سرکاری و غیر سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی خاطر انتظامات کیے جائیں گے"۔ وہ پندرہ سال گزر چکے ہیں اور ۱۹۸۸ء بڑی تیزی سے قریب آ رہا ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اردو بطور عدالتی، دفتری، علمی، تنقیدی، صحافتی اور تحقیقی زبان جزوی طور پر استعمال ہو رہی ہے مگر اسے سو فیصد دفاتر کی سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جا رہا۔ بیشتر دفاتر میں کام انگریزی زبان میں ہو رہا ہے اس لیے بجائے اس سارے مواد سے فائدہ اٹھانے کے جو مقتدرہ قومی زبان اور دوسرے اداروں نے تیار کیا ہے۔ دفاتر کے افسران اور دوسرا عملہ بدستور انگریزی میں اپنی استعداد بہتر بنانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

کسی بھی زبان کو دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "دفتری مضامین کا مواد" اس زبان میں مناسب حد تک موجود ہو اور دفاتر میں کام کرنے والے افسران و دیگر اہلکار اتنے تربیت یافتہ ہوں کہ وہ ان دفتری مضامین کو آسانی سے استعمال کر سکیں تاکہ روزمرہ کے معمولات میں تاخیر واقع نہ ہو اس بارے میں مذکورہ دونوں اہم پہلوؤں کے پیش نظر مقتدرہ نے ایک طرف علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے سرکاری افسران کو دفتری کام اردو میں سرانجام دینے کی تربیت کا آغاز کیا ہے اور دوسرے پہلو سے متعلق جو کام کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مقتدرہ کا شعبہ دارالترجمہ اب تک ۵۸۰۰ صفحات پر مشتمل سرکاری دستاویزات کا ترجمہ مکمل کر کے متعلقہ محکموں کو بھیج چکا ہے۔

۲۔ طبیعات، حیاتیات، کیمیا، ریاضیات، فلکیات، فلسفہ، قانون، سیاسیات، جغرافیہ

معاشیات، زراعت، تجارت، اقتصادیات، بیمہ کاری، بنک کاری، کسٹم اور بہت سے دوسرے شعبوں کی اصطلاحات کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔

۳۔ اردو انگریزی، انگریزی اردو، فارسی اردو، عربی اردو کی کئی معیاری لغات شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ اردو ٹیلیکس سروس کا اجراء ہو چکا ہے۔

۵۔ مختصر نویسی اور ٹائپ کاری کی تربیت کے لیے مقتدرہ نے اپنے ذیلی دفاتر واقع کراچی کوئٹہ، سکھر، لاہور اور پشاور میں کلاسوں کا انتظام کر رکھا ہے۔

۶۔ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے افسران و عملے کی رہنمائی اور مدد کے لیے سرکاری خط و کتابت کی مختلف اقسام پر مشتمل درج ذیل آٹھ جلدیں تیار کر لی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک جلد میں تقریباً ۳۰۰ نمونے شامل کیے گئے ہیں۔

جلد اول — سرکاری مراسلت
جلد دوم — نیم سرکاری مراسلت
جلد سوم — دفتری حکمنامے
جلد چہارم — یادداشتیں
جلد پنجم — غیر رسمی کیفیتیں
جلد ششم — اعلانات، قراردادیں اخباری اطلاعیے
جلد ہفتم — تشہیری و گشتی مراسلات
جلد ہشتم — ٹیلی گرام، ٹیلی پرنٹر، ٹیلیکس

مجلس زبان دفتری لاہور کی تیار کردہ اس دفتری لغت کی معیار بندی مقتدرہ نے ۲۹ مارچ کو مکمل کر لی ہے جس میں سینتیس ہزار (۳۷۰۰۰) الفاظ و تراکیب شامل ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی سب سے ضخیم اور پہلی انگریزی اردو لغت ہو گی جس سے دفاتر میں کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے افراد کے لیے دفتری زبان میں مراسلہ نگاری اور مسل داری کے ساتھ ساتھ دفتری زبان، دساتیر، قواعد قوانین، فارم اور ہدایت ناموں کا علم ضروری ہے اور قومی زبان کو فی الفور ملک میں دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کے حامی ادارے اور افراد آج یہ بات فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام امور میں اردو میں اس قدر کام مکمل ہو چکا ہے کہ اردو انگریزی کی جگہ دفتری زبان کے طور پر بلا کسی تاخیر کے نافذ کی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ جنھیں یہ خدشہ ہے کہ اردو میں کام کیسے چلے گا ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اڑھائی تین سو کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ہمارے دفاتر میں اور اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات میں جس طرح کی انگریزی لکھی جا رہی ہے اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اردو چند ماہ کے تجربے کے بعد لکھی جا سکے گی وقت کی کمی اس تفصیل میں جانے سے روکتی ہے تاہم ہم میں سے اکثریت کی انگریزی کی استعداد کی حقیقت ماضی قریب میں ایک سے زیادہ بار کھل چکی ہے مگر ہم نے اس سے سبق نہیں لیا۔

پاکستان میں ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت اردو زبان کی تضحیک و تحقیر کی مہم ایک طویل عرصے سے جاری ہے اور پس پردہ ایک ایسے مخصوص طبقے کا ہاتھ ہے جس نے انگریزی کو ذریعہ معاش بنا کر اسے اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھ لیا ہے اور اس طبقے کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ قومی اور دفتری زبان کے طور پر اردو کا نفاذ ہو گیا تو اس طبقے کے بچے جن کی حیثیت اب تک محکوم کی تھی اردو کے راستے ان ملازمتوں پر آنے لگیں گے جن پر ابھی انگریزی کے سہارے صرف اور صرف اس مخصوص طبقے کے بچوں کی رسائی ممکن تھی۔

صدر پاکستان کے ان الفاظ میں کہ "پاکستان اور اردو کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اردو پاکستانی قوم کی آواز ہے، اردو کی شناخت پاکستان سے ہے اور پاکستان کی شناخت اردو سے ہے۔" ہمیں اردو کے لیے ان کے پر خلوص جذبے کی مکمل جھلک دکھائی دیتی ہے کیونکہ ہمیں یاد ہے کہ ان کے اسی جذبے اور خواہش کے تحت ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں آیا تھا اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم اس ادارے کے پہلے صدر نشین مقرر کیے گئے تھے۔ آج کی تقریب کے اس پلیٹ فارم سے ہم ان سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے اسی جذبے کے تحت ۱۹۸۸ء سے اردو کے مکمل نفاذ کے عمل کو یقینی بنائیں تاکہ ملکی استحکام اور قومی یکجہتی کے خلاف کام کرنے والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔

آج مسئلہ اردو کی کم مائیگی یا تنگ دامنی کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ ہماری نیتوں کے فتور اور ہمارے قول و فعل کے تضاد کا ہے۔ اس تقریب کے شرکا، وطن دوست اداروں اور افراد سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس ملک کی سرکاری اور قومی زبان کے طور پر اردو کے مکمل نفاذ کے لیے اپنی سعی و کوشش جاری رکھیں گے جب کوئی شخص دفتری نظام کی بات کرتے ہوئے قومی زبان کی جگہ کسی غیر ملکی زبان کی وکالت کرے تو اس کی مخالفت کو دفتری نظام تک محدود نہ سمجھیں اس لیے کہ ہر زبان کسی قوم کی تہذیب و تمدن، روایات، تاریخ اور علمی ورثے کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یہ سارا سرمایہ اپنی زبان میں محفوظ ہونا چاہیئے، مانگے کی زبان میں نہیں اس طرح وہ شخص آپ کو اس سارے سرمائے سے جدا کرنے کی مذموم حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ اردو کو اپنی ملی پہچان اور ملی استحکام کا مضبوط رشتہ سمجھ کر دفاتر میں اور دفاتر سے باہر اپنے نجی معاملات میں نافذ کرانے پر زور دیجیے کہ یہ آپ کا اور ہم سب کا قومی فریضہ بنتا ہے۔

خلوص نیت اور جہد مسلسل ہی ہماری کامیابی کی ضمانت بن سکتے ہیں۔

فہرست کتب / مضامین جن سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ دفتری زبان کی تدریس جوانب و مناہج ڈاکٹر سلیم فارانی
۲۔ پاکستان میں اردو کا مسئلہ ڈاکٹر سید عبداللہ
۳۔ سالانہ رپورٹیں مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۳ء — ۱۹۸۷ء
۴۔ سرکاری دستاویزات، رکن تاجو [illegible] مقتدرہ [illegible]

امداد نظامی

اُردو قومی یک جہتی کی علامت

زبان کوئی بھی ہو اس کی اولین خصوصیت اور اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے۔ انسان اس کے ذریعے اپنے خیالات، نظریات، آرزوئیں، امنگیں اور اپنا علم دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن بات صرف سطحِ ابلاغ تک محدود نہیں، ہر زبان ایک مخصوص تہذیب اور ثقافت کی علامت ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان کا نام لیجیے، اس نام کے ساتھ ہی اس سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی اقدار، سماجی رویے، اجتماعی طرزِ عمل اور باہمی انسانی تعلقات کی بے شمار تفصیلات خود بخود ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اسی حوالے سے اردو کی بات کیجیے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اردو برصغیر میں مسلم تہذیب و ثقافت کی ترجمان و آئینہ دار ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ زبان علاقائی حدود و قیود کی پابند رہنے کے بجائے خوشبو کی طرح پھیلی اور اس خوشبو نے پورے جنوبی ایشیا کو ایک نئی تازگی عطا کردی۔

اردو کس طرح اور کہاں وجود میں آئی، میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا البتہ ایک تاریخی حقیقت آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایسے ادوار میں بھی جب کہ اسے ایک مکمل زبان کی حیثیت سے ہمہ گیر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی ہمارے قدیم صوفیائے کبار نے شریعت و طریقت کے درس کو عام کرنے کے لیے اس خطے میں جس لب و لہجہ کو ابلاغ کا ذریعہ بنایا، وہ اردو ہی کی ابتدائی شکل تھی۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ارشادات نظم و نثر کی بات کریں یا حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات کا جائزہ لیں، ان میں آپ کو اردو ہی دل کی طرح دھڑکتی محسوس ہوگی۔

جغرافیائی حوالوں کی بات کریں تو اردو کا اصل مسکن اور پرورش گاہ دہلی اور لکھنؤ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ نادر تاریخی حقائق بھی سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ برصغیر کے ان وسطی علاقوں میں پروان چڑھنے والی اس زبان کی اولین آبیاری جنوبی ہندوستان نے کی۔ نہ صرف اردو زبان کو ابتدائی فروغ دیا بلکہ اس کی اصناف نظم و نثر کے اولین نمونے بھی جنوبی ہند ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ قطب شاہی خاندان کے حکمرانوں کی غزلیات، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی تخلیقی نوادر کا تعلق جنوبی ہند سے ہے اور ان کا زمانہ دسویں صدی عیسوی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملا وجہی کی مشہور داستان "سب رس" یا "حسن و دل" کا تعلق بھی اسی عہد سے بتایا جاتا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اردو نثر کا قدیم ترین دستیاب نمونہ ہے جسے اب ہمارے کلاسیکی ادب میں اولین اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دہلی اور اودھ میں پروان چڑھنے والی اس زبان کا دوسرا سب سے بڑا گہوارہ پنجاب کی سرزمین بنی۔ اردو زبان و ادب کی آبیاری، ترقی اور توسیع کے سلسلے میں لاہور کو وہی اہمیت اور مرکزیت حاصل رہی جو دہلی، لکھنؤ اور دوسرے مراکز کو حاصل تھی۔ اردو ادبیات کی تخلیق کے عمل کو دیکھیں تو کسی مخصوص تحقیق و تجسس کے بغیر یہ صورت واضح ہوجاتی ہے کہ رانگاماٹی سے بحیرہ عرب اور تورخم سے راس کماری تک کوئی علاقہ ایسا نہیں ملتا جہاں اردو نظم و نثر کی تخلیق کا عمل جاری نہ رہا ہو۔ بلاشبہ جنوبی ایشیا نے بہت سے نامور غیر مسلم اردو شعرا اور ادیب بھی پیدا کیے۔ ہمارے اپنے عہد میں فراق گورکھپوری جیسے عظیم شاعر، کرشن چندر جیسے منفرد افسانہ نگار اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے محقق اور نقاد اردو ادبیات پر چھائے رہے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اعداد و شمار کی نظر سے جائزہ لیجیے تو پتہ چلے گا کہ ہر دور میں اردو اہلِ قلم کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل رہی ہے۔

یہ سارے حوالے اسی خیال کی توثیق و تصدیق کرتے ہیں جس کا ذکر میں اپنے ابتدائی کلمات میں کرچکا ہوں۔ اردو مسلم تہذیب و ثقافت کی ترجمان و آئینہ دار ہے اور جس طرح اسلام اور اس کے نظریات و شعائر برصغیر کے کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں رہے اسی طرح اردو بھی کسی مخصوص خطے یا صوبے تک محدود نہیں رہی، یہ پورے جنوبی ایشیا میں پھیلی اور اس طرح پھیلی کہ پورے جنوبی ایشیا کی مشترک زبان بن گئی۔ لہجے سب کے اپنے اپنے تھے، زبان ایک ہی تھی جو ایک خطے سے دوسرے خطے اور ایک قوم سے دوسری قوم تک پھیلی ہوئی تھی اور تمام اقوام میں ایک مشترک قدر اور ابلاغ کے واحد وسیلے کی حیثیت سے اپنی جڑیں مضبوط کرچکی تھی۔

اب آئیے تھوڑا سا جائزہ سیاسی منظر کا بھی لے لیں۔ میں تفصیل میں جانا نہیں

چاہتا، صرف دو باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جنوبی ایشیا کے مسلم اور غیر مسلم طبقوں میں جو عوامل تضاد و مخالفت کی بنیاد تھے ان میں اردو اور ہندی کا تنازعہ بھی شامل تھا، بلکہ سرفہرست تھا۔ ہندوؤں کو ویسے تو ہمارا وجود ہی سرے سے ناقابل قبول اور ناقابل برداشت تھا تاہم ہماری جداگانہ سیاسی جدوجہد میں جن تین چیزوں سے ان کو خصوصی مخاصمت تھی ان میں اسلام، اردو اور مسلم لیگ کے نام شامل تھے۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو ہمارا بیش قیمتی ورثہ ہے۔ یہ محض ایک زبان نہیں، ہمارے ملی وجود کی اساس، ہماری شناخت کا اہم حوالہ اور ہماری وحدت کی علامت ہے۔ اس سے رشتہ منقطع کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے اور اس کے بغیر قومی زندگی کا تصور بے معنی اور مہمل ہے۔

اس سے ہٹ کر اپنے وطن عزیز پر نظر ڈالیے۔ چلئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف کوئٹہ شہر کو دیکھ لیجیئے۔ اس شہر کی تہذیبی و ثقافتی رنگارنگی اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں سات زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر زبان کی اپنی اہمیت اور عظمت ہے لیکن سات مختلف زبانیں بولنے والے طبقات کے درمیان مشترک روح کی حیثیت سے کارفرما آٹھویں زبان اردو کو الگ کر لیجیئے، آن کی آن میں ہم سب خلاء میں معلق ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے سے ربط و تعلق کے سارے سلسلے ختم ہو جائیں گے اور اردو ہم سب کو زنجیر کی کڑیوں اور تسبیح کے دانوں کی طرح متحد اور مربوط بنائے ہوئے ہے۔ اردو کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ایسی زبان نہیں ہے جو ہمارے باہمی ربط و تعلق کا وسیلہ بن سکے۔ ہمیں ایک رکھ سکے، ہماری وحدت ملی، وحدت قومی اور اتحاد و یکجہتی کی بنیاد بن سکے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں، بنیادی حقیقت ہے۔ یہی حقیقت تھی جس کی بنا پر بلوچستان میں پندرہ سال بیشتر وجود میں آنے والی اولین جمہوری حکومت نے کسی تردد کے بغیر ملک بھر میں سب سے پہلے اردو کو بلوچستان کی سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ اس فیصلے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ منتخب حکومت بلوچی، براہوی، پشتو یا فارسی زبانوں کی عظمت و وسعت سے باخبر نہ تھی یا یہ کہ اسے اردو سے کوئی خصوصی محبت تھی۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ فیصلے جذبات کی بنیاد پر نہیں حقائق کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور حقیقت یہ تھی کہ صرف اور صرف اردو ہی اس ضرورت کی تکمیل کر سکتی ہے، کیونکہ یہ کسی ایک طبقے کی نہیں سب کی زبان ہے اسے سب بولتے ہیں، سب سمجھتے ہیں، سب لکھتے ہیں، سب پڑھتے ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اردو آخر پاکستان کے کس خطے کس علاقے اور کس صوبے کی زبان ہے۔ پنجاب میں پنجابی ہے، سرحد میں پشتو ہے، سندھ میں سندھی ہے، بلوچستان میں بلوچی ہے، پشتو ہے، براہوی ہے، فارسی ہے۔ یہ اردو کس صوبے کی زبان ہے؟

میرا خیال ہے کہ اب تک کی گفتگو میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ ایک بار پھر عرض کر دوں، اردو کسی صوبے اور خطے کی نہیں، سارے صوبوں اور خطوں کی زبان ہے۔ یہ قدرتی طور پر ہماری قومی زبان ہے، پورے پاکستان اور پوری پاکستانی قوم کی زبان ہے۔ اس کی پہچان صوبے اور خطے نہیں۔ یہ خود پورے پاکستان کی پہچان ہے۔

سرکاری اہلکار اردو کی ترویج کیلئے [illegible] میں اہم کردار ادا کریں

اردو ٹائپسٹ کے کورس کی اختتامی تقریب سے ڈپٹی کمشنر چکوال کا خطاب

چکوال سے ہم رشتہ [illegible] سرکاری اردو کی ترویج اور نفاذ کے عمل کو تیز کرنے کے [illegible] کردار ادا کریں۔ ان خیالات کا اظہار ڈپٹی کمشنر چکوال [illegible] احمد نے چکوال [illegible] زبان و دفتری [illegible] میں [illegible] ایک تقریب سے [illegible] کورس ۱۷ فروری سے ۳۰ اپریل [illegible] چکوال کے سرکاری دفاتر کے ۱۶ اہلکار [illegible] ڈپٹی کمشنر نے کورس مکمل کرنے والے [illegible]

[illegible] کی اس خاص تربیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے محنت جاری رکھیں۔ [illegible] احمد نے گورنمنٹ کالج کے شاف ممبران کی کورس کے سلسلہ میں رہنما کارانہ خدمات کو بھی سراہا کورس انچارج گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پروفیسر محمد [illegible] خان نے بتایا کہ آئندہ کورس میں صرف [illegible] سے سرکاری اہلکار شرکت کریں گے جو یکم اکتوبر سے شروع کیا جائے گا [illegible] دفتری [illegible]

نوائے وقت پنڈی ۵ مئی ۸۷ء

دوسری شفٹ کے انتظام کے باوجود [illegible] بچے داخلہ حاصل نہ کر سکے

آپ کے موقر جریدے روزنامہ نوائے وقت کے ذریعے [illegible] ہم یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ گزشتہ ۸ نومبر ۸۶ء [illegible] گورنمنٹ گرلز سکولوں میں سیکنڈ شفٹ کا اجراء [illegible] باوجود اس کے کہ سیکنڈ شفٹ شروع ہونے سکولوں [illegible] والدین اپنے [illegible] سکولوں میں داخل [illegible] سے بڑا ستم ظریفی [illegible]

نوائے وقت پنڈی ۲۶ اپریل ۸۷ء

[illegible] بچوں کو داخل کیا گیا [illegible] فیل شدہ بچوں کو سکول سے نکالا جا رہا ہے [illegible] وہ بے کار اور مفت کی [illegible] رہے ہیں۔

ہم حکومت کے نوٹس میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ ۲۰ ہزار سے زائد بچوں کو تعلیم دی جا رہی ہے [illegible] جنہوں نے اس ملک اور قوم کی قیادت کرنا ہے انہیں سکولوں میں داخلے سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

براہ کرم مہربانی فرما کر بچوں کو سکولوں میں داخلہ دے کر غریب والدین کی دعائیں لیں۔

(متعدد افراد کے دستخط)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

اُردو پاکستان کی دفتری زبان کیوں نہ بن سکی

بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح نے ۲۱ مارچ اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں دو تقریریں کیں۔ ۲۱ مارچ کی تقریر میں آپ نے فرمایا:

"...... لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو اور اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے ...... " اور پھر ۲۴ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا ......" پاکستان کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ...."

اسی موقع پر آپ نے ایک اور جگہ فرمایا:

"...... اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اردو اور صرف اردو ہے۔"

قائدِاعظم کی بصیرت شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن اس کے باوجود انتالیس سال کے عرصہ میں اردو کو سرکاری زبان نہ بنایا جا سکا۔ اس کی وجوہات اور اسباب و علل پر غور کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اردو کے نفاذ و ترویج کے لیے سرکاری اور عوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں اور اس کے سلسلے میں پیش آنے والی رکاوٹوں پر عہد بہ عہد ایک نظر ڈالی جائے تاکہ تمام پہلو سامنے آ سکیں اور کسی فیصلے تک رسائی کا امکان ہو۔

دستوری کوششیں

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِاعظم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے مشرقی پاکستان میں اردو کی مخالفت شروع ہوئی۔ فروری ۱۹۵۲ء میں "کل پاکستان تاریخ کانفرنس" کے صدارتی خطبے میں سید سلیمان ندوی نے جو کچھ بنگلہ زبان کے بارے میں کہہ دیا اُس سے پورا مشرقی پاکستان بھڑک اٹھا۔ فسادات سے خوفزدہ ہو کر مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان بنانے کا فیصلہ کر دیا۔

بعدازاں ۱۹۵۶ء کا دستور ترتیب دیا گیا۔ جس کے ذریعہ زبان کے ہنگامے کو ختم کرنے کے لیے انگریزی زبان کو تحفظات دینے کا اہتمام شروع ہوا۔ اس ضمن میں دستورِ اساسی میں جو باب شامل کیا گیا۔ اُس کی چند دفعات یہ ہیں:-

۱۔ جمہوریہ کی سرکاری زبان اردو اور بنگلہ اور ایسی دوسری سرکاری زبانیں ہوں گی جنہیں متعلقہ صوبائی اسمبلی کی سفارش پر صدرِ مملکت یہ حیثیت دینے کا اعلان کر دے۔

شق نمبر (۳) .... آئین کے نفاذ کے بیس سال کے عرصہ کے لیے انگریزی کو حسبِ سابق تمام سرکاری معاملات کے لیے استعمال کیا جائے۔

شق نمبر (۶) .... حکومت ایک مشترکہ قومی زبان کی ترقی و فروغ کے لیے تمام ضروری اقدام کرے گی۔

(۷) آئین کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی زبان کی جگہ متبادل انتظام کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔

میکلے نے بہت پہلے کہا تھا :

We must at present do out best to form a class of persons, Indian in blood and colour but English in taste in opinions, in morals and in intellucт.

متذکرہ صورتِ حال اسی کی غمازی کرتی نظر آرہی ہے ....

اسی دوران عوامی سطح پر بھی نفاذِ اردو کی کوششیں جاری رہیں۔ ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین نے ڈھاکہ کے ایک جلسے میں اردو کو قومی زبان بنانے کی حمایت کی۔ لیکن سیاسی مجبوریوں کے سامنے تنہا خواجہ صاحب بے بس ہوگئے۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیرِ اہتمام کراچی میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے اپنے خطبے میں فرمایا ..... " اگر پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو اس کی ایک قومی زبان بھی ہونی چاہیے اور یہ سوائے اردو کے دوسری نہیں ہو سکتی۔"

اسی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سردار عبدالرب نشتر نے کہا ہمارے سامنے مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ اس وقت انگریزی دفتروں پر مسلط ہے۔ سیاسی طور پر ہم آزاد ہوگئے ہیں مگر ذہنی طور پر اپنے آپ کو اُس وقت تک آزاد نہیں سمجھ سکتے جب تک ہمارے دفتروں پر انگریزی کا تفوق قائم ہے ....." ... میں کہتا ہوں کہ نہ یہ ہو سکتا ہے نہ کسی کی مجال ہے کہ اردو کے سوا کسی دوسری زبان کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنا سکے۔"

سردار نشتر نے اس ضمن میں ایک اور قدم اٹھایا اور اردو کو دفتری زبان بنانے کے لیے عملی تیاری کا آغاز کیا۔ دفتری اصطلاحات وضع کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دی۔

شریف تعلیمی کمشن

۱۹۵۶ء کا دستور کالعدم ہونے کے بعد ایوب خاں نے مختلف معاملات کا ازسرِ نو جائزہ لینے کے لیے کمشن تشکیل دیے۔ اُن میں ایک شریف تعلیمی کمشن بھی تھا۔ جس کی رپورٹ کے اکیسویں باب میں زبان یا زبانوں کے مسئلہ پر قومی نقطۂ نظر سے بڑے خلوص کے ساتھ غور کیا گیا۔ اس میں مغربی پاکستان میں (سوائے سرحد و سندھ) پہلی سے پانچویں تک ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا اور چھٹی سے دسویں تک (ماسوائے سندھ) اردو کو لازمی قرار دیا گیا۔ مگر ساتھ ہی چھٹی جماعت سے بی۔ اے تک انگریزی کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ جب ہم قومی زبانوں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم انگریزی کی اہمیت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کمشن کا واحد مقصد یہ ظاہر کیا گیا کہ جہاں انگریزی کو پوری اہمیت دی جائے وہاں قومی زبانوں کو بتدریج انگریزی کی جگہ ذریعۂ تعلیم بناتے جانا چاہیے۔

اس کمشن نے رسم الخط کی تبدیلی کی سفارش بھی کی۔ جس پر لاہور میں بہت لے دے ہوئی اور نتیجتاً یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

ایوب خاں کے دور میں عوامی جذبات کی پاسداری کے پیشِ نظر کمشن کی سفارشات کے مدِ نظر اردو کی تعلیم بارہویں تک لازمی ہوئی۔ مرکزی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن سرکاری زبان کے معاملے میں انگریزی کا تفوق برقرار رکھنے کے مسئلے کو ۱۹۷۲ء تک ملتوی کر کے ایک کمشن کا وعدہ کیا۔

حمود الرحمٰن کمشن

۱۹۶۲ء میں ہونے والے طلبا کے ہنگاموں اور تعلیمی اصطلاحات کے خلاف مظاہروں کے نتیجہ میں ایوب خاں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ایک اور کمشن جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں قائم کیا جس کا نام تھا :

Commision on students problems and welfare

اگرچہ اس کمشن کا کام شریف کمشن کے خلاف ہونے والے احتجاج اور مظاہروں کے اسباب معلوم کرنا تھا لیکن اس کا دائرہ کار بڑھتا گیا اور سیاسی عناصر بھی اس کے احاطے میں شامل ہوگئے۔ بہرکیف نفاذِ اردو کے سلسلے میں اس کمشن کی سفارشات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شریف کمشن کی نسبت اس نے انگریزی کو کہیں زیادہ تحفظ دیا اور پبلک اسکولوں کو جو حاکم ڈھالنے کی جگہ تصور کیے جاتے ہیں احتجاج کے باوجود زیادہ وقعت حاصل ہوئی۔

پھر بھی ایوب خاں کے دور میں مرکزی اردو بورڈ لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اصطلاحات سازی کا کام زور شور سے جاری ہوا۔ تحریکِ اردو میں نئی جان پڑی۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے تک اور کراچی یونیورسٹی میں ایم۔ اے / ایم ایس سی کی سطح تک اردو کو بطور ذریعہ

تعلیم اختیار کر لیا گیا۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ذریعہ تعلیم کے مسئلے پر تحقیق کے لئے دو کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ مگر اُن کی سفارشات کے نفاذ سے پہلے ہی دورِ ایوبی ختم ہو گیا۔

اسی دور میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں دو مرتبہ اردو بل پیش ہوا۔ رائے عامہ کے استصواب میں دفتری زبان میں تبدیلی کی منظوری کے باوجود یہ بل سرکاری اکثریت نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ گویا عوام اور ماہرین کی اکثریت اردو کو دفتری زبان بنانے کے حق میں تھی۔ اردو ٹائپ مشین کامیابی حاصل کر چکی تھی اور زود نویسی کا رواج ہو گیا تھا لیکن اسمبلی کی حکمران اکثریت نے بل پاس نہ ہونے دیا۔

نور خاں کی تعلیمی تجاویز

یحییٰ خان کے دور میں ۱۹۶۹ء میں نور خاں کی سربراہی میں ملک کی تعلیمی حالت پر غور ہوا۔ اس رپورٹ کی بعض تجاویز بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ جن میں انگریزی کو بے جا زور دینے کی حکمت عملی ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے مکمل طور پر قومی زبان اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ محض انگریزی ذریعہ تعلیم کو بدل دینے سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک دفتری سرکاری زبان انگریزی رہے گی اُس وقت تک انگریزی ذریعہ تعلیم کے لیے بھی جواز رہے گا۔ حاکم انگریزی استعمال کرتے رہیں گے اور اس طرح حکام (خواص) اور عوام کے درمیان خلیج حائل رہے گی۔ ۱۹۷۰ء سے صوبوں اور ۱۹۷۵ء سے مرکز میں دفتری زبان کی تبدیلی کی تجویز بھی دی گئی مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد بھارت سے جنگ اور مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا اور باقی پاکستان میں بھٹو حکومت قائم ہوئی۔ سب سے پہلے بلوچستان کے گورنر نے اعلان کیا کہ بلوچستان کی دفتری زبان اردو ہوگی۔ اس کے بعد گورنر سرحد نے سرحد کی سرکاری زبان اردو قرار دی۔ کچھ ہی عرصہ بعد حکومت پنجاب نے بھی اعلان کر دیا کہ ایک سال کے اندر اندر تمام دفتروں کی زبان اردو ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ایک مجلس زبان دفتری کی تشکیل ہوئی۔ سندھ اسمبلی نے ایک قرارداد کی منظوری سے سندھی کو سندھ کی اولین زبان قرار دیا۔

آئین ۱۹۷۳ء

۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو ایک متفقہ آئین نافذ ہوا۔ اس آئین کی شق ۲۵۱ کا تعلق قومی زبان سے ہے۔ اس کے مطابق:۔

۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اسے سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر اندر انتظامات کیے جائیں گے۔

۲۔ پہلی شق کے مطابق اردو کو انگریزی زبان کی جگہ لینے کا انتظام کرنے تک انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

اسی کی رُو سے سب سے بڑا کام تین صوبوں کا اردو کو سرکاری زبان قرار دینا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ عملی طور پر نفاذ نہیں ہو سکا۔ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق کی دلی خواہش ہے کہ اردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے جلد از جلد رائج کیا جائے۔ وہ بنفسِ نفیس قومی اور بین الاقوامی اجتماعات میں بارہا اپنی قومی زبان میں تقریر کر چکے ہیں۔ صدر مملکت تمام وفاقی وزارتوں اور صوبائی حکومتوں کو ہدایات جاری کر چکے ہیں کہ وہ اپنے روزمرہ کے دفتری کاموں میں اردو کو زیادہ سے زیادہ رائج کریں۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء سے اردو زبان سرکاری دفاتر میں استعمال ہونے لگی ہے لیکن ابھی تک کئی امر مانع ہیں۔

اس ضمن میں ایک اعتراض یہ ہے کہ اردو زبان میں موزوں اور یکساں دفتری اصطلاحات موجود نہیں ہیں۔ مگر "مقتدرہ قومی زبان" اسلام آباد نے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ حکومت کی توجہ سے ہی انہیں قبولیتِ عام کا درجہ ملے گا۔

ایک اور دشواری ٹائپ مشینوں کی عدم دستیابی بیان کی جاتی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اردو ٹائپ کو بھی ایک مسئلہ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اگر سنجیدگی سے صورتِ حال کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو ٹائپ میں وقت کی کافی بچت ہوتی ہے۔ انگریزی مسودہ پہلے اسسٹنٹ پھر سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور پھر ڈپٹی ڈائریکٹر دیکھتا ہے۔ بعض اوقات ڈائریکٹر کو بھی تصحیح کرنی پڑتی ہے۔ اکثر مسودے دوبارہ ٹائپ کرنے پڑتے ہیں۔ اردو ٹائپ میں سہولت ہے اور وقت کا ضیاع بھی نہیں ہوتا۔

اب تک کی موجودہ صورتِ حال کچھ یوں ہے:۔

۱۔ کسی سنجیدہ شخص یا ادارے نے یہ نہیں کہا کہ اردو قومی یا دفتری زبان نہیں ہے۔

۲۔ اس وقت تک چند ماتحت عدالتوں، میونسپل کمیٹیوں، چند ذیلی دفتروں اور

ضمنی طور پر صوبائی اسمبلی کے علاوہ ہر جگہ سرکاری کاموں کے لیے انگریزی زبان استعمال ہو رہی ہے۔ اسی لیے بہت سے دفتری فارم ابھی تک انگریزی میں چھپتے ہیں۔ البتہ آزاد کشمیر میں ایک عرصے سے اردو بطور سرکاری زبان استعمال میں آ رہی ہے۔

۳۔ بعض وزارتوں اور صوبوں میں اردو کسی حد تک رائج ہو چکی ہے لیکن کوششوں میں ربط اور یکجہتی کا فقدان ہے۔

۴۔ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحان کی زبان کسی نہ کسی صورت انگریزی ہی ہے۔

۵۔ تعلیم میں ایوب خاں کے عہد کی صورت حال یعنی انٹر کی سطح تک اردو کی لازمی تدریس قائم ہے۔ ویسے ان دنوں اس میں کمی کے لیے زیادہ ہی غور ہو رہا ہے۔ سرکاری دائرے سے باہر اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے مختلف ادارے اور انجمنیں وغیرہ سرگرم عمل ہیں اور روزمرہ زندگی میں اس کا استعمال کافی بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب عوامی کوششیں ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں کہ پاکستان میں اُردو کو دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں جو بھی منصوبے بنے اور جو بھی پالیسیاں منظرِ عام پر آئیں وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ اردو کے دفتری زبان کی حیثیت سے رائج ہونے اور سرکاری طور پر اسے صحیح مقام دلانے کا کام التوا اور پس و پیش کا شکار ہوتا رہا۔

رکاوٹوں کے سلسلے میں مزید غور و فکر کے بعد سب سے مضبوط اور خفیہ ہاتھ افسر شاہی کا نظر آتا ہے۔ پبلک اسکول سے انگریزی پڑھ کر نکلے ہوئے اس طبقہ اور اس کی آئندہ نسل کی بقا اسی میں ہے کہ انگریزی کی حیثیت برقرار رہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی بھی دور میں پبلک اسکولوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی۔ اگر یہ پبلک اسکول اور کالج نہ رہیں تو عام لوگ اور مفاد یافتہ طبقہ کے بچوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ حکومت پر ایسے طبقے کی گرفت ہے۔ لہٰذا قومی جوہر کے ضیاع کی بھی فکر نہیں صرف ذاتی تحفظ کا خیال رہ گیا ہے۔ حال ہی میں صدر مملکت نے کہا تھا کہ :

"ہماری قوم، قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت کو نہیں سمجھی اور بغیر سوچے سمجھے انگریزی ذریعہ تعلیم اب تعلیم کا نہیں بلکہ کمانے کا ذریعہ بن گیا ہے۔"

یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ اردو کی تنگ دامانی کے چرچے میں اب کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ اردو ہی واحد زبان ہے جو ملک کے طول و عرض میں رابطے کا کام دے رہی اور دے سکتی ہے۔ مقامی مزاج، تہذیب، ثقافت، جغرافیائی صفات اور مذہبی علوم کا وسیع ذخیرہ اسی میں ہے۔ اس کے برعکس انگریزی کا اپنا ایک الگ مزاج اور موسمی اور جغرافیائی کیفیات کے لحاظ سے روزمرہ اور محاوروں کا رنگ ڈھنگ ہے۔ انگریز نے میکالے کے خیال پر عمل کرتے ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصے میں اپنے جو ہمدرد پیدا کیے تھے اُن کی تعداد دس فیصد سے زیادہ نہیں تھی وقت کے ساتھ اب وہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آج تعلیمی انحطاط اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ موجودہ دور کا بی اے چند مربوط اور مسلسل جملے انگریزی میں لکھنے کا اہل نہیں۔ ایسے میں انگریزی زبان کی آبیاری ممکن نہیں رہ جائے گی۔ لہٰذا ہمیں ابھی سے بندوبست کر لینا چاہیے۔ "مقتدرہ قومی زبان" اور روزنامہ جنگ نے باہمی تعاون سے اردو کے مسئلے کو جو بلاشبہ ایک آئینی ضرورت (۱۹۸۸ء میں پندرہ سال ہوا چاہتے ہیں) کے پہلو بہ پہلو قومی ضرورت بھی ہے۔ جس طرح از سرِ نو اٹھایا اور ابھارا ہے۔ ہر دو ادارے مبارک باد کے مستحق ہیں ؎

اجازت ہو تو چُن لیں ہم بھی دو اک پھول اے گلچیں
دعا ہم نے بھی مانگی تھی کہ گلشن میں بہار آئے

اگر انڈونیشیا، بھارت اور چین کو انگریزی کی جگہ اپنی زبان اختیار کرنے میں دشواری پیش نہیں آ سکتی تو اردو کے نفاذ میں بھلا کیونکر دشواری پیش آ سکتی ہے۔ یہ زبان اپنے اندر کہیں زیادہ لوچ اور لچک رکھتی ہے اور الفاظ کو اپنے اندر سما سکتی ہے۔

زبان انسانی تہذیب و تمدن کی نشو و ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی لحاظ سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ قوموں کے ماضی کی امین، اُن کے حال کی آئینہ دار اور اُن کے مستقبل کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ کسی بھی قوم میں یکجہتی کے بیج بوتی، اُن کے تشخص کو اُبھارتی اور اُن کے معاشی و معاشرتی ارتقا کو ممکن بناتی ہے۔ اگر ہمیں دنیا میں ایک باوقار اور خوددار قوم کی طرح زندہ رہنا ہے تو ہمیں اردو کو ہر قسم اور ہر سطح کے دفاتر میں رائج کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں سرکاری اور نجی دونوں سطحوں پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مسئلہ جب زیادہ ہی گھمبیر ہو جائے تو آہنی عزم سے حل ہوا کرتا ہے ؎

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

پروفیسر مہر مشتاق شوکت

اُردو زبان اور ہمارا قومی تشخص

زبان جہاں ہمارے دلی جذبات و احساسات کی ترجمان اور ذہنی کیفیات کے اظہار کا ایک بڑا اور موثر وسیلہ ہے وہاں کسی قوم کے تہذیب و تمدن، علمی انکشافات ادبی کارگزاریوں اور تاریخی کارناموں کی آئینہ دار بھی ہے ہمارے ملک پاکستان میں بھانت بھانت کی بولیاں ہیں لیکن قابل ذکر بلوچی، پشتو، سندھی اور پنجابی ہیں جو مختلف علاقوں کی مخصوص زبانیں ہیں۔ ان سب زبانوں کے فطری اور ارتقائی اشتراک عمل نے دنیا بھر کی دوسری زبانوں مثلاً فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت کے تعاون سے اردو زبان کا روپ دھارا ہے اور یہی زبان ہمارے تشخص کی سب سے بڑی علامت ہے کیونکہ اردو زبان پاکستان کے مختلف صوبوں یا علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی مشترک زبان ہے اور دوسری بولی جانے والی زبانوں کے درمیان رابطے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے اور لوگوں کے مابین اتحاد کا وسیلہ بھی۔ یہ واحد زبان ہے جو قبول عام ہونے کی وجہ سے تمام صوبوں میں وسیع پیمانہ پر سمجھی اور بولی جاتی ہے اور آج دنیا کی ممتاز زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ بعض ماہرین لسانیات نے اسے مہمان نواز زبان کہا ہے کیونکہ اس کا دامن نہ صرف وسیع ہے بلکہ ہر وقت پھیلا ہوا ہے۔ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہو کر اس قدر مانوس ہوگئے ہیں۔ گویا یہ شروع ہی سے اردو زبان ہی کے تھے۔ چنانچہ اس کا ذخیرہ الفاظ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بلوچی، پنجابی، سندھی اور پشتو جو ہمارے چار صوبوں کی مخصوص زبانیں ہیں اپنے اندر بہت سی باتیں مشترک رکھتی ہیں جہاں الفاظ میں مطابقت ہے وہاں مطالب اور مفاہیم میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ عربی، فارسی رنگ زیادہ نمایاں ہے اور اس کی یقینی اور اغلب وجہ یہ ہے کہ سب زبانوں نے مسلمانوں کے ہند ہی میں رہ کر اپنی ارتقائی منازل طے کی ہیں اور پروان چڑھی ہیں۔ جس کا رسم الخط بھی ایک جیسا ہے اگرچہ مذکورہ زبانوں کے علاقے الگ الگ رہے ہیں لیکن اہم ترین مرحلہ جو کسی بھی زبان میں ارتقائی عمل کے دوران لازمی کارفرما ہوتا ہے ایک ہی زمانے میں پہلو بہ پہلو طے کیا ہے۔

درحقیقت ان سب زبانوں کا منبع اور سرچشمہ وادی سندھ کی قدیم تہذیب ہے اور ان کا تعلق ایک معرکہ آرا گروہ سے ہے جس کو تاریخ میں آریا خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ قبیلہ ۱۵۰۰ قبل مسیح ہندوستان میں وارد ہوا تھا۔ بقول سلیم اختر "برصغیر ہند کو اگر سمندر تصور کیا جائے تو مختلف علاقائی زبانوں کے دھارے اس میں آکر ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی مختلف علاقوں اور مختلف ادوار میں آمد اور قیام کے نتیجہ میں مختلف بولیوں کے باہمی اختلاط سے اردو زبان تشکیل ہوئی" حاصل بحث یہ کہ اردو زبان تمام صوبوں کی مشترکہ ترقی یافتہ شکل ہے اس لیے قومی بولی پر صوبائی تعصب کی ہوا دیتے ہوئے مقامی بولی کو ترجیح دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں اور نہ ہی حب الوطنی کا پاکیزہ جذبہ اس کی اجازت دیتا ہے۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قیام پاکستان کو چالیس سال گذر رہے ہیں اور ابھی ہم سوچ بچار کر رہے ہیں کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اسے سرکاری زبان قرار دینے کے لیے ہمیں کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بے وقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے گاندھی جی نے تقسیم ہند سے کافی پہلے قومی زبان کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور اردو۔ ہندی جھگڑا کھڑا کر کے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسرائیل نے ۱۹۴۸ء یعنی ہم سے بھی ایک سال بعد نقشہ عالم پر ابھرتے ہی عبرانی زبان کو قومی زبان قرار دے دیا تھا۔ اسی طرح چین جو ۱۹۴۹ء یعنی ہم سے بھی دو سال بعد آزادی جیسی نعمت غیر مترقبہ سے بہرہ مند ہوا، نے پلک جھپکتے ہی چینی زبان کو بطور قومی زبان اپنا لیا

تھا لیکن ہم ابھی حیص بیص میں ہیں

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عہد ماضی کی حکومتوں نے اردو زبان کی حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور اس کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے گاہے بگاہے ریڈیو، ٹی وی یا اخبارات میں متعارف ضرور کرایا ہے لیکن سب کچھ نظریاتی طور پر کیا گیا اور عملی طور پر کچھ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بات کمیٹیوں کی تشکیل، وضع اصطلاحات ٹائپ کاری کی مشینوں اور کلیدی تختوں کی تیاری سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے نہ کوئی ادبی تنظیم بنی اور نہ ہی تعلیمی اداروں یا عدالتوں میں اس کا نفاذ ہوا۔ غیر معمولی دلچسپ بات ہے کہ اردو زبان کے نفاذ کے احکامات، ارشادات اور سفارشات گاہے بگاہے انگریزی زبان میں نظروں سے گزرتے رہے۔

واضح رہے کہ مخصوص زبان کے بغیر قومی تشخص قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ہی کوئی قوم اپنی زبان کو ترقی دیے بغیر کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ کوئی خوددار قوم اغیار کی زبان کو اپنانا گوارا نہیں کرتی۔ عرب کی پہچان یہ ہے کہ وہ عربی بولتا ہے جرمنی کا باشندہ جرمن میں گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ فرانسیسی بولنے والا پہچانا جاتا ہے کہ فرانس کا محب وطن شہری ہے اسی طرح انگریز کی پہچان اس کی انگریزی زبان سے ہو جاتی ہے۔ اس لیے پاکستانی کی پہچان تب ہی ہو گی جب وہ اردو زبان بول رہا ہو گا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پاکستان کے مختلف صوبوں کی بولیاں مختلف ہیں۔ دنیا میں بیشتر ممالک ایسے ہیں جن کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان کی قومی زبان ایک ہی ہو گی۔ برطانیہ کی مثال آپ کے سامنے ہے وہاں مختلف حصوں میں کم و بیش آٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن قومی زبان انگریزی ہی ہے۔ بھارت کا بھی یہی حال ہے۔ علاقائی بولیاں اور صوبائی زبانوں کے مختلف ہونے کے باوجود قومی زبانی کا درجہ ہندی کو حاصل ہے یہی صورت حال سوویت یونین میں ہے سب جانتے ہیں کہ مستعار زبان کے بل بوتے پر ترقی کی راہوں کو استوار کرنا عبث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فیصلے کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانا اصل مسئلہ ہوتا ہے جہاں تک فیصلے کا تعلق ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے قیام پاکستان سے قبل ہی اردو زبان کی وکالت کر کے "بابائے اردو" کا خطاب حاصل کر لیا تھا اور بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اعلان کر دیا تھا کہ آزاد وطن کی سرکاری اور قومی زبان اردو ہو گی اس تائید میں گاہے بگاہے اعلانات و احکامات کی کمی نہیں رہی۔ پروگراموں کا لامتناہی سلسلہ جاری و ساری رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے مشترکہ فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جائے یہ ایک اہم قومی مسئلہ ہے اور اسے سنجیدگی سے حل کرنا چاہیئے۔ اللہ جل جلالہٗ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ موجودہ حکومت اس مسئلہ میں پوری دلچسپی لے رہی ہے اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے نہ صرف احکام جاری کر دیے ہیں بلکہ ان پر عمل کروانا بھی شروع کر دیا ہے اردو زبان کا استعمال تمام شعبوں میں روز بروز مقبول ہو رہا ہے۔ تعلیمی، نجی اور سرکاری سطح پر اردو زبان کا استعمال تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے بلکہ عدالتی فیصلے بھی اردو میں ہو رہے ہیں۔ مجلس زبان دفتری پنجاب لاہور اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی سرپرستی میں مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد کی سرگرمیاں قابل ستائش ہیں۔ "اردو نامہ لاہور" اور "اخبار اردو" اسلام آباد کے ماہنامے اور ضلعی سطح پر ماہانہ اردو کی مجلسیں اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں جن سے خاطر خواہ مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں اگر اس اخلاص سے کام جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب تمام صوبوں سے تعلیمی اداروں، دفتروں اور عدالتوں میں اردو بطور قومی زبان بولی، پڑھی اور لکھی جایا کرے گی۔ ہر محب وطن پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک میں حصہ لے کر قومی یک جہتی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی سے قومی تشخص کو اجاگر کیا جائے اس سلسلہ میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں۔

۱۔ اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے بلاتخصص تمام دفتروں میں لازمی کر دیا جائے۔
۲۔ جب تک اردو زبان مکمل طور پر نافذ نہیں ہو پاتی انگریزی زبان کی حیثیت بطور محدود معاون لیکن ثانوی رہنے دی جائے۔
۳۔ دفتری کارروائی اردو میں اپنانے کے لیے اردو ٹائپ کاری کی مشق کے لیے تربیتی مرکز کھولے جائیں۔
۴۔ سائنسی مضامین کو آہستہ آہستہ اردو میں منتقل کیا جائے لاطینی یونانی یا انگریزی زبانوں کی عام فہم اصطلاحات قائم رکھی جائیں۔
۵۔ پیشہ ورانہ کورس، طب، زراعت، انجینئرنگ اور سائنس اردو میں پڑھائے جائیں۔
۶۔ انٹر تک اردو مضمون پہلے لازمی ہے اسے بی۔اے تک لازمی قرار دیا جائے۔
۷۔ ذخیرہ الفاظ کا اضافہ صوبائی زبانوں کے نئے اور موزوں الفاظ سے کیا جائے۔
۸۔ اعلیٰ و ادنیٰ تمام عدالتوں میں ہونے والی کارروائی اردو میں کی جائے۔
۹۔ حکومت کی طرف سے سرکاری و نجی چھاپہ خانوں کو ہر قسم کے فارم اردو میں چھاپنے کا حکم دیا جائے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

اُردو زبان اور ہمارا قومی تشخص

اردو زبان ہمارا قومی تشخص ہے۔ اگر قومی یکجہتی سے مراد ان اقدار اور رویوں میں وحدت عمل کی تلاش ہے جو برصغیر میں مسلم معاشرے اور قومیت کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں تو یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں کہ ان اقدار اور رویوں کو اگر کسی طاقت نے وحدت کلمہ عطا کی ہے تو وہ صرف اور صرف اردو زبان ہے جو برصغیر میں صدیوں کے تاریخی تسلسل کے ساتھ نہ صرف مسلم معاشرے میں قومی یکجہتی کی خدمات انجام دے رہی ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی، ثقافتی اور تخلیقی زبان بن کر پوری دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکی ہے۔

اردو زبان کے تاریخی تسلسل پر ایک نظر ڈالنے سے بعض دلچسپ حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ برصغیر میں عربوں کی فتوحات سے جہاں ایک طرف یہ خطہ اسلامی افکار و تعلیمات کی برکتوں سے مالا مال ہوا وہاں دوسری طرف برصغیر میں مسلم قومیت کی تشکیل کا تہذیبی اور لسانی عمل بھی شروع ہو گیا۔ عربی تصانیف میں برصغیر کی مختلف زبانوں کے الفاظ کی موجودگی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں نے باہمی افہام و تفہیم کے پہلے مرحلے میں ایک دوسرے کی زبانوں کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کی چنانچہ محمد بن قاسم کے حملے سے متعلق قدیم دستاویز "چچ نامہ" میں "کھارمٹی اور مدمٹی" جیسے الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "مباحث" کے ایک مقالے میں ایسے متعدد الفاظ درج کیے ہیں جنھیں اہلِ عرب نے اپنی تصانیف میں جگہ دی ہے اور جو آج بھی اردو زبان میں رائج ہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کا دوسرا تاریخ ساز داخلہ غزنوی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ عام طور پر اردو زبان کو برصغیر میں ہند ایرانی اختلاط کا تہذیبی اور لسانی ردعمل قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ تہذیبی اور لسانی ردعمل برصغیر میں مسلمانوں کے داخل ہونے سے پہلے غزنوی دربار اور اس سے متعلق ان تمام مراکز میں شروع ہو چکا تھا جہاں سلطان محمود اور اس کے اہل خاندان کی وساطت سے ہند اسلامی معاشرے کی تشکیل ہو رہی تھی۔ تاریخ مسعودی یا تاریخ بیہقی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ غزنوی سلاطین کے دربار میں نہ صرف ہندی زبانوں کے علما موجود تھے بلکہ خود مسلمان حکمران بھی ان زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے۔ غزنوی دور میں جہاں ایک طرف برصغیر میں فارسی دانی اور ایران شناسی کا شعور بیدار ہوا وہاں دوسری طرف ایران اور توران میں بھی تو مسلم ہند کی عوامی زبانوں سے رغبت اور آشنائی کا رواج عام ہوا۔ چنانچہ غزنوی عہد کی فارسی تصانیف میں پنجاب، سرحد اور سندھ کی زبانوں کے الفاظ کی کثرت اس امر کا واضح ثبوت مہیا کرتی ہے۔ مسعود سعد سلمان نے غزنوی عہد کے لاہور کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی جو تصویریں بنائی ہیں ان سے ایک ایسی زبان کی ضرورت کا ادراک مشکل نہیں جو اس نو تشکیل معاشرے کی لسانی اور قومی یکجہتی کا سبب بن سکے۔ یہی زبان، ناموں کے مختلف مراحل سے گزر کر آج اردو کے نام سے ہمارے درمیان موجود ہے۔ تاریخی تسلسل اس بات کا شاہد ہے کہ برصغیر میں جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم گئے، اردو زبان ان کی قومی شناخت کے طور پر وہاں پہنچی اور جہاں جہاں مسلمانوں نے سیاسی اور تہذیبی مراکز قائم کیے وہیں اردو زبان لسانی اور فکری وحدت کے طور پر نمایاں ہوئی۔ گویا برصغیر میں اسلامی سلطنت اور اردو زبان دونوں ایک ہی سلسلۂ عمل کی کڑیاں ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اردو زبان صرف برصغیر میں ہی مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان نہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جہاں بھی برصغیر کے اسلامی افکار و نظریات کے اثرات پہنچے ہیں، اردو زبان کا نفوذ اور تعارف وہاں موجود ہے۔ چنانچہ ایران، دنیائے عرب، مشرق بعید، یورپ، افریقہ، امریکہ غرضیکہ دنیا کا کوئی ایسا کونہ نہیں جہاں اس وقت مسلمان موجود ہوں اور اردو زبان کا اثر و نفوذ

دجود نہ ہو۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد جب سرزمین پاکستان دنیا میں اسلامی سیاست اور
ذیب و ثقافت کا اہم گہوارہ بنی تو اردو زبان اپنے فطری استحقاق کے مطابق اس
ب کی قومی زبان تسلیم کی گئی۔ گویا یہ زبان اپنے تاریخی تشخص کے ساتھ اس ملک
، قومی زبان قرار پائی۔ اس اجمال کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہو گی۔

غزنوی عہد سے لے کر مغلیہ دور تک سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی لیکن
سلمانوں کی عام بول چال کی تہذیبی، معاشرتی نیز کافی حد تک تخلیقی زبان اردو ہی
فی، خود مسعود سعد سلمان نے لاہور کے گلی کوچوں سے یاد کی ہوئی اردو زبان کی تراکیب
پنے اشعار میں استعمال کی ہیں:

چو رعد زابر بغرید کوس محمودی
برآمد از پسِ دیوارِ حصن مارا مار

لباب الالباب کے مصنف محمد عوفی اور امیر خسرو دہلوی نے تو مسعود سعد سلمان
ے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ وہ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان
ے بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اسی طرح امیر خسرو سے لے کر غالب تک فارسی
یب کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی لسانی اور علمی فتوحات کا دائرہ بھی
یع سے وسیع تر ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور کئی صدیوں پر محیط اس دور میں برصغیر کے
لمانوں نے اردو کو اپنی تہذیبی حتیٰ کہ سیاسی شناخت سے بھی کسی وقت الگ
یں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں نے مسلمانوں اور
ندوؤں کے فکری اور معاشرتی رویوں کو الگ الگ طور پر سمجھنے اور ان میں
ریق پیدا کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کو اردو اور ہندوؤں کو ہندی کے حوالے سے
ب کیا۔

انگریزوں نے برصغیر میں فارسی زبان کے لسانی تحکم کو اس لیے ختم کیا کہ اس طرح
برصغیر پر مسلمانوں کی تہذیبی بالادستی ختم کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا اندازہ درست
تھا کیونکہ اس وقت تک مسلمانوں کی تہذیبی نمائندگی فارسی زبان کی بجائے اردو
ان کے پاس آ چکی تھی، چنانچہ جونہی انگریز اس حقیقت سے آگاہ ہوئے انھوں نے
صغیر سے اردو کا قلع قمع کرنا شروع کیا لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ جس طرح
برصغیر سے اسلامی تہذیب و ثقافت کی بیخ کنی ممکن نہیں اسی طرح برصغیر کے
مسلمانوں کے دلوں سے اردو زبان کا نقش محو کرنا بھی آسان نہیں۔ اس لیے کہ برصغیر
میں اردو زبان مسلمانوں کی قومی یک جہتی کی واحد علامت تھی اور یہاں کے مسلمان
اپنے اس عظیم سرمائے سے کسی صورت میں بھی دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے وقت اردو زبان کو کسی شعوری کوشش یا محض سیاسی ضرورت
کے تحت قومی زبان قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ جس طرح پہلے عرض کیا گیا، اس زبان کے
فطری اور تہذیبی استحقاق کے سبب اسے قومی یکجہتی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہوئے اس
کا یہ حق تسلیم کیا گیا۔ یہ بات سب پر واضح ہے کہ اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے
میں مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے عوام نے بھی بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا تھا۔

پاکستان اور پاکستانی عوام کی خوش بختی ہے کہ ان کے تہذیبی خزانے میں ایک
ایسی زبان موجود تھی جو صدیوں سے اس سرزمین پر بسنے والے مسلمانوں کی متاعِ گراں بہا
تصور ہوتی رہی ہے۔ آج پاکستان کا کوئی گوشہ اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ
زبان بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو اور جہاں اس زبان کے اثرات موجود نہ ہوں۔ سرحد، بلوچستان،
پنجاب، سندھ، ہر صوبے کے عوام ایک دوسرے کا مافی الضمیر اس زبان کے ذریعے
سمجھ سکتے ہیں اور کسی صوبے میں بھی اس زبان کو سمجھنے میں کوئی دشواری موجود نہیں۔

آج دنیا کے بے شمار ملکوں نے اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کر رکھا ہے اور
یہ زبان ان میں سے اکثر کے ذرائع ابلاغ میں بھی شامل ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے
حال ہی دنیا کے مختلف ممالک میں اردو کی ترویج پر کتابچوں کی اشاعت کا جو سلسلہ
شروع کیا ہے اس سے چین، جاپان، یورپ، امریکہ، کینیڈا، سعودی عرب، ترکی،
مصر، کویت، قطر اور متحدہ امارات میں اردو کی ترویج کی تفصیلات سامنے آئی
ہیں۔ ان معلومات سے اس امر کی نشاندہی مشکل نہیں کہ اردو بحیثیت قومی زبان
اگر ایک طرف اہلِ پاکستان کے لیے وحدتِ فکر و عمل کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف
پاکستان اور عالمی برادری کے درمیان بھی یہ زبان افہام و تفہیم اور یگانگت کے
عمل کو تیز تر کر رہی ہے۔

ادا جعفری

خطبۂ استقبالیہ

۶؍اپریل ۱۹۸۷ء کو مقتدرہ قومی زبان کے ذیلی دفتر کراچی نے قومی زبان کے سلسلے میں ایک اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ اس اجتماع میں پڑھے جانے والے مضامین نذرِ قارئین ہیں۔

جنابِ صدر، محترم مقررین اور شرکائے محفل!

میں آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس مجلسِ مذاکرہ کی اہمیت اور وقار میں اضافہ فرمایا۔

صدرِ مجلس محترم جسٹس (ریٹائرڈ) قدیرالدین احمد صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کا شمار ان فرزندانِ وطن میں ہے جو اپنے ملک کے لیے وجہِ افتخار رہتے ہیں اور اہلِ ملک کے لیے قابلِ تقلید مثال بھی۔

انصاف اور کتاب دونوں کا معاملہ زندگی کی حسین ترین سچائیوں سے ہوتا ہے۔ محترم جسٹس (ریٹائرڈ) قدیرالدین احمد صاحب منصف بھی رہے اور مصنف بھی ہیں۔ میری درخواست پر انھوں نے ازراہِ نوازش اس مجلسِ مذاکرہ کی صدارت قبول فرمائی اور شاید یہ ہماری قومی زبان کا حق بھی تھا کہ ایک عدل آشنا شخصیت اس محفل میں صدر نشین ہو اور اس اہم قومی فریضے کی نشان دہی فرمائے۔ میں ان کی بے حد ممنون ہوں۔

آج کی محفل کے مقررین محترم ڈاکٹر حنیف فوق صاحب، محترم ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب، محترم پروفیسر سحر انصاری صاحب اور اس مجلسِ مذاکرہ کے ناظم محترم ڈاکٹر محمد اسلم فرخی صاحب کی بھی بہت شکر گزار ہوں کہ میری گزارش پر انھوں نے اپنا قیمتی وقت مرحمت فرمایا۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہر قوم کی اولین اور مستحکم ترین پہچان اس کی زبان ہوتی ہے اور قومی زبان وہی ہوتی ہے جو پورے ملک میں سمجھی اور کسی نہ کسی لہجے اور تلفظ میں بولی جاتی ہے۔

اردو کسی زمانے میں بھی ایک محدود علاقے یا کسی مخصوص گروہ کی زبان نہیں رہی۔ یہ بھی اس بیج کی طرح ہے جسے ہوائیں یا پرندے دور دور تک پہنچا دیتے ہیں اور جو ہر زمین اور ہر موسم میں پھولتی پھلتی رہی ہے۔ ہر خوشبو اس کی خوشبو بن جاتی ہے۔ یہ تو ہر علاقے کی بولی اور زبان کو وسیع کرتی ہوئی اور ہر مقامی زبان سے نئے الفاظ اخذ کرتی ہوئی پورے برصغیر کی زبان رہی ہے۔ آج ہماری پاکستانی اردو بھی وہ نہیں ہے اور رہنا بھی نہیں چاہیے جسے لکھنؤ اور دلی کی ٹکسالی زبان کہا جاتا تھا۔ پاکستان میں بولی جانے والی اردو تمام پاکستانی زبانوں کے الفاظ کو اپنا رہی ہے۔ ان سے بہرہ ور ہو رہی ہے اور پاکستان میں لکھی جانے والی اردو ہمارا ادب اور ہماری شاعری اپنے وطن کی دوسری زبانوں کے رویے قبول کر کے اپنے حسن اور گیرائی میں اضافہ کر رہی ہے۔ ادب کا قابلِ فخر سرمایہ ان زبانوں میں بھی موجود ہے اور یقیناً ہمارے پاکستانی صوبائی اور علاقائی زبان و ادب میں بھی اردو کی وساطت سے اظہار کے نئے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

اردو کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ پوری قوم کے درمیان رابطے کا وسیلہ بھی ہے۔ قابلِ ذکر حقیقت یہ بھی ہے کہ اب رفتہ رفتہ اردو زبان بین الاقوامی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ کناڈا، امریکہ، یورپ وغیرہ اور خلیجی ممالک میں جہاں جہاں بھی پاکستانی تلاشِ رزق میں پہنچے ہیں اردو مراکز اور ادبی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں۔ اکثر ممالک میں ریڈیو اور ٹی وی اردو پروگرام بھی نشر کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں عارضی رہنے والے بھی ہیں اور مستقل سکونت اختیار کرنے والے بھی لیکن اردو کی محبت اور لگن وہ اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔

اردو بحیثیت زبان زندہ رہنا بھی جانتی ہے اور اپنے قیام و بقا کا سر و سامان بھی خود کرتی ہے لیکن بہ حیثیت قومی زبان ابھی اس کو اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ قومی یک جہتی کی ضمانت ہوتی ہے۔ قائدِ اعظم نے جب اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ،

> "ایک مشترک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد ہو سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

بدقسمتی سے اپنے محسن کی اس واضح ہدایت اور تنبیہہ کے باوجود ہم ابھی تک انگریزی کی بالادستی سے نجات حاصل نہیں کر سکے اور اس کا نتیجہ ہم نے پہلے بھی دیکھ لیا اور ہماری قومی یک جہتی کو جو زخم آئے ہیں وہ آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ بے شک موجودہ حکومت نے قومی زبان کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا ہے۔

مقتدرہ قومی زبان کا قیام ۱۹۷۹ء میں عمل میں آیا تھا ۱۹۸۳ء میں مرحوم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ہوئے ان کی قیادت میں اصطلاحات سازی، ترجمہ، تحقیق تصنیف اور تالیف ہر شعبہ میں بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان دفاتر میں ترویج قومی زبان کے لیے ممکنہ سہولتیں فراہم کر چکی ہے اور کر رہی ہے اور قومی اور صوبائی سطح پر بھی نفاذ اردو کی راہ میں حائل تمام مشکلات دور کرنے کی کوششیں جاری ہیں

مقتدرہ کے زیر اہتمام جو کتابیں اور پمفلٹ اب تک شائع ہو چکے ہیں اور زیر طبع ہیں ان کی تعداد ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) تک پہنچتی ہے اس کے علاوہ بڑی تعداد زیر تدوین کتب اور پمفلٹ کی بھی ہے۔

ذیلی دفاتر میں اردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کی تدریس کا باقاعدہ انتظام ہے یہ ذیلی دفاتر کراچی، سکھر، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں قائم کیے گئے ہیں جہاں مقتدرہ کی شائع کردہ کتب فروخت بھی ہوتی ہیں۔

اب تک نفاذ قومی زبان کا ہدف مقرر ہوتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اب یہ ہدف ۱۹۸۸ء ہے۔

اگر ہمیں ایک آزاد ترقی پذیر قوم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آنا ہے تو اپنی موجودہ ترجیحات سے بالاتر ہونا ہوگا۔

انگریزی ایک اہم زبان ہے تعلیمی اداروں میں نہ صرف اس کی موجودگی ضروری ہے بلکہ اس کے معیار کو بہتر کرنے کی بھی ضرورت ہے اور ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کے فروغ کے لیے بھی کوشاں رہنا ہے کہ زبانیں دلوں کی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمان ہوتی ہیں لیکن اس وقت حالات کا تقاضا ہے کہ ہماری قومی زبان کو اس کا جائز مقام حاصل ہو یہ پوری پاکستانی قوم کا حق ہے۔

Muddle over medium of instruction

By TARIQ BUTT

English returns to schools as Government dithers

ISLAMABAD, May 11: The 1979 decison for a total switch-over to Urdu as medium of instruction in the Matriculation examination by 1988 has virtually been modified. It is gathered that the Government is quietly permitting optional use of English along with Urdu without issuing any formal directive.

Contrary to wide expectations the Federal Cabinet in its Thursday's regular session failed to reach a decision on reverting to the English medium of instruction. The issue was reportedly debated for two long hours but no consensus was evolved.

However, the Cabinet chose to saddle the Education Minister with the responsibility of taking a decision he thinks proper over the medium of instruction. It was said that the Minister's decision would not need ratification by the Cabinet.

The Education Minister when contacted said final decison would be taken after ascertaining arguments for and against the English or Urdu medium.

But the confusion prevailing as a result of indecision has not ended in any way. The uncertainty has in fact, become worse confounded. Many educational institutions would prefer adherence to the prevailing medium in the absence of any formal official order, it is felt.

Knowledgeable officials say the Government is convinced that at least mathematics and natural sciences should be taught in English from lower classes so that those going in for advanced studies find no difficulty in comprehending their subjects.

But at the same time, the authorities, it is gathered would not make English compulsory for all students. They are expected to make the medium of instruction optional and leave it to the individual institutions to choose between Urdu and English.

Since the decision to switch back to English would undoubtedly have political repercussions, the Government apparently apprehends that its opponents would squeez maximum mileage out of the decision.

"Heavens, will not fall, if the Cabinet announces a decision. Its deferment has brought no good to it", a high-level official commented.

Sensing the official state of indecision, some model institutions in Islamabad started instruction in English earlier this year. Now, according to a source, they have been advised to follow the English medium for teaching mathematics and natural sciences.

In 1979 all the English medium schools and colleges with a few exceptions, were ordered to switch over to Urdu through an order of the Federal Education Ministry. It said "Starting from April 1979 all students admitted to Class I shall undergo instructions through the medium of Urdu or an approved provincial language which will be progressively introduced in the successive grades thereafter.

As a sequel to this, students who were admitted to Class IX this year and who are to appear in the pre-Matric examination of the Secondary boards in 1988 will be required to answer only in Urdu or an approved provincial language.

A lot of resistance was put up by educational institutions, parents and public circles against the 1979 decision. The authorities did not yield then and enforced the decision.

Despite the 1979 notification, the Government did not give up altogether the double standard of education. Some elitist institutions were exempted from its application and a privileged class was deliberately allowed to develop.

It is pointed out that after 1979 change, a majority of the government educational institutions lost their attraction for some students and parents. Their prestigious character was badly damaged and they were reduced to ordinary institutions.

But in the meantime, the private investors used this opportunity to opening English medium schools. Their business thrived immensely and such schools proliferated because many parents chose to shift their wards to English medium schools notwithstanding the exorbitant monthly charges arbitrarily fixed by their owners.

The ultimate losers in this muddle over the medium of instruction are students. The owners of private schools are of course the big gainers in the game.

روزنامہ مسلم اسلام آباد ۱۲-۵-۸۷

سحر انصاری

اُردو بحیثیت متبادل زبان

زبان ایک سماجی ضرورت ہے۔ انسانی معاشرے میں ابلاغ اور ترسیل کا ایک نہایت مؤثر اور آزمودہ ذریعہ زبان ہے جس میں انسان کے ارتقا کی ساری داستان ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ یہی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زبان کی اہمیت کسی لسانی معاشرے میں کیا ہوتی ہے اور کسی قوم یا لسانی معاشرے کے تنزل یا ترقی میں زبان کا کیا کردار ہوتا ہے ساتھ ہی ہمیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ خواہ کوئی زبان کتنی ہی محترم اور مقدس کیوں نہ ہو اگر اس کا سماجی عمل رک گیا ہے یا وہ سماجی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے تو وہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے ختم ہو جاتی ہے اور محض آثار خانوں اور عجائب گھروں کی زینت بن کر رہ جاتی ہے۔

زبان کو موضوع بنا کر متعدد انداز سے اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے اس وقت ہمارے پیشِ نظر اردو زبان ہے اور وہ بھی اس حوالے سے کہ ہمارے ہاں کے مقابلے کے امتحانات میں اسے ایک متبادل زبان کے طور پر کس طرح اختیار کیا جا سکتا ہے یا اسے اگر متبادل زبان کی حیثیت سے اپنایا جائے تو اس کے عواقب و جوانب کیا ہو سکتے ہیں۔

جدید دور میں یہ مسئلہ صرف اردو زبان ہی کے حوالے سے اہم نہیں ہے بلکہ نوآبادیاتی تسلط کے بتدریج خاتمے اور نو آزاد ممالک کی تعمیر و ترقی کے عمل نے دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنی اپنی زبان کے بارے میں غور و فکر کرنے کی طرف مائل کیا ہے ان نو آزاد ممالک کی مشترکہ لسانی صورتحال کم و بیش یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ نہ صرف طویل عرصے تک نوآبادیاتی طاقت کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی محکوم رہے بلکہ زبان اور کلچر کے زاویۂ نگاہ سے بھی اس کی بالادستی قائم رہی جس نے مقامی زبانوں اور کلچر کو دُور رس نقصان پہنچایا۔ بعض ممالک میں ایک سے زائد لسانی گروہ ہیں اور ان میں لسانی اشتراک یا کسی ایک زبان کو "لنگوا فرانکا" کے طور پر اختیار کرنے کا مسئلہ موجود رہا ہے۔ اس ضمن میں سیاسی، مذہبی، علاقائی اور اقتصادی مسائل اپنی علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں جن پر مکمل غور و خوض کے بغیر کوئی ایک لسانی حکمتِ عملی کا تیار کرنا ممکن نہیں۔

سائنسی نقطۂ نظر سے اس ضمن میں نئے انداز سے کام شروع ہوا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس قسم کے سائنسی عمل کو LANGUAGE ENGINEERING کا نام دیا گیا ہے۔

لسانی اعتبار سے کسی ایک زبان کو اس طرح ترقی دینا کہ وہ دوسری زبانوں کو نقصان نہ پہنچائے اور اپنا ایک ہمہ گیر منصب بھی ادا کر سکے اس نئی حکمتِ عملی کا اہم جزو ہے۔ لینگویج انجینئرنگ کے اصولوں کو اپنا کر چین، جاپان، انڈونیشیا اور افریقہ کے کئی ممالک نے اپنے لسانی مسائل اس طرح حل کر لیے ہیں کہ اس کے مثبت اثرات ان کی ہمہ جہت ترقی میں صاف نظر آنے لگے ہیں۔

اردو کے ضمن میں یہ کہنا ایک تاریخی حقیقت کے اعادے کے مترادف ہوگا کہ ہماری جدوجہد آزادی کے متعدد حربوں میں ایک مؤثر ترین حربہ اردو کے لباس میں بھی تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ اس اعلان کے اگرچہ متعدد مفاہیم نکالے گئے لیکن اگر غور کیا جائے کہ قیامِ پاکستان سے قبل سرکاری زبان کون سی تھی تو یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ اردو ایسی بدیسی سرکاری زبان کا متبادل بنتی جسے ہم انگریزی کے نام سے دو سو برس تک قبول کیے رہے۔ اس طرح اردو اگر حریف ہے تو انگریزی کی نہ کہ کسی علاقائی زبان کی، جیسا کہ اکثر اوقات سیاسی مصالح کی بنیاد پر صورتِ حال کو پیش کیا جاتا ہے

مقابلے کے امتحان میں اردو کو متبادل زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کا مسئلہ بظاہر ایک شعبۂ انتظامی سے متعلق نظر آتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا گہرا تعلق ہماری قومی زندگی کے تصور، تعلیمی نظام اور ہمارے لسانی منصوبوں اور قومی یک جہتی سے ہے ہم نے گزشتہ چالیس برسوں کے دوران یہ تاثر دیا ہے کہ ہم اصولی اور آئینی طور پر اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان مانتے ہیں لیکن اس کے حقیقی نفاذ کے ضمن میں ہمیشہ ہدف کو آگے ہی آگے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے تمام ماہرینِ تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والی قومیں ہی حقیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہیں۔ خود ہمارے ہمسایہ ملک میں سہ لسانی فارمولا نافذ ہے جس کے تحت ایک سرکاری زبان ہے یعنی ہندی، دوسری بین الاقوامی زبان یعنی انگریزی اور تیسری وہ زبان جو کسی صوبے میں بولی جاتی ہو۔

ہم جب اردو کے نفاذ یا ترویج کی بات کرتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا

چاہیئے کہ انگریزی کو بالکل ختم کر دیا جائے اور علاقائی زبانوں کو ان کا حق نہ دیا جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کو اس کی جائز حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ انگریزی کا معیار بڑھایا جائے۔ اسے بالکل ابتدائی جماعتوں سے ایک اہم زبان کے طور پر اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علم اعلیٰ تعلیمی درجوں تک پہنچنے کے بعد اس قابل ہو جائے کہ وہ انگریزی میں پایا جانے والا علمی سرمایہ اپنی قومی اور مادری زبان میں منتقل کر سکے اس کے علاوہ ثانوی سطح تک ہر بچے کو اس کی مادری زبان میں بھی تعلیم دی جائے جب یہ اصول پوری طرح نافذ ہوگا تو کوئی زبان بھی دوسری زبان کو اپنا حریف نہیں سمجھے گی اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنا لسانی وجود منوالنے میں ہر فرد کو آسانی ہوگی۔

اردو کے ضمن میں ایک واضح پالیسی کے بروئے کار آجانے کے بعد مقابلے کے امتحانات میں اردو کو متبادل زبان کے طور پر اختیار کرنے میں کوئی سیاسی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ پاکستان کے بیشتر جامعات نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ طالب علم امتحانات میں اردو یا انگریزی میں سے کوئی سی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا سکتا ہے یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ طالب علم انگریزی زبان میں دستیاب کتابوں کا یا تو ترجمہ کرواتے ہیں یا خود ترجمہ کر کے اردو میں جواب دینے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اصطلاحات یا فنی امور کے علاوہ بقیہ متن کو اردو میں تحریر کرنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ہمارے طلبہ و طالبات کی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے لیکن اس کے دوش بدوش ایک اقلیت بھی ہے جو ہمارے مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور جس کے تعلیمی ہدف میں انگلش میڈیم درس گاہوں کا عمل دخل ہوتا ہے گزشتہ آٹھ نو برس کے دوران یہ کوشش کی گئی کہ انگلش میڈیم اسکول کو بتدریج اردو میڈیم بنا دیا جائے لیکن ہر سطح پر تو یہ اسکول یہی فریب دیتے رہے اور در پردہ وہ اپنا پرانا نظام ہی جاری رکھا اور اب نیا شاخسانہ یہ ہے کہ انھوں نے پاکستان کے کسی تعلیمی بورڈ یا جامعہ سے تعلق رکھنے کے بجائے آکسفورڈ اور کیمبرج کے "اے لیول" اور "او لیول" کی تیاری کا اعلان کر دیا اور پاکستان میں اسے قابل قبول اور قابل عمل بنانے کے لیے ایک شرط یہ منوالی کہ جو طالب علم پاکستان اسٹڈیز اور اسلامیات کے امتحانات بعد میں پاس کر لے گا وہ یہاں کے تعلیمی بورڈ یا جامعہ کے تحت آگے اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا ہے اس طرح دانستہ طور پر دو طبقے بیک وقت پروان چڑھ رہے ہیں ایک مراعات یافتہ طبقہ کی آل اولاد جو ایک خاص نظام کے تحت ہر مقابلے کے امتحان میں ان طلبہ و طالبات کو آسانی سے شکست دے سکتی ہے جنھوں نے دیسی نظام تعلیم کے تحت اپنی قومی زبان میں اسناد حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس مرحلے پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ مقابلے کے امتحانات میں اردو کو متبادل زبان کی حیثیت دینے سے کیا خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ دراصل ہمارا انتظامی ڈھانچہ اور اس کے کارپرداز بیشتر انھیں مقابلے کے امتحانات کے بعد تعینات کیے جاتے ہیں۔ اگر انھیں اردو کی اہمیت کا اندازہ ہو تو وہ عملی طور پر اپنے عہد سے فائدہ اٹھا کر اردو کے ضمن میں صحیح اور قومی افادیت کے فیصلے کر سکیں گے۔

اب ایک نظر مقابلے کے امتحانات کی اس صورتحال پر بھی نظر ڈال لیجیے جہاں اردو کے باب میں کوئی بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ مقابلے کے امتحانات وفاقی پبلک سروس کمیشن کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان میں شریک ہونے والے امیدوار کے لیے لازمی ہے کہ وہ کم سے کم گریجویٹ ہو اور اس کی عمر اکیس سال سے کم اور اٹھائیس سال سے زائد نہ ہو۔ قومیت، بعض خصوصی رعایات فیس وغیرہ سے قطع نظر امتحانات کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک لازمی مضامین دوسرے اختیاری مضامین، لازمی مضامین مجموعی طور پر ..۵ اور اختیاری مضامین ..۶ نمبروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

امتحانی پرچوں کے بارے میں یہ تحریر ملتی ہے کہ :

"اردو یا دیگر پاکستانی زبانوں (پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی) اور فارسی اور عربی میں جو امتحانی پرچے آئیں گے ان کا جواب متعلقہ زبانوں یا اردو/انگریزی میں تحریر کرنا ہوگا بشرطیکہ امتحانی پرچے میں اس کے برعکس کوئی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ اسلامیات کے پرچے کا انگریزی یا اردو میں جواب دیا جا سکتا ہے تاوقتیکہ اس کے برعکس کوئی ہدایت پرچے میں نہ دی گئی ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف اردو کا پرچہ تو اردو میں دیا جا سکتا ہے لیکن بقیہ پرچوں کے لیے خصوصاً اختیاری مضامین کوئی گنجائش اردو کے استعمال کی نہیں ہے۔

اس پالیسی کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ انگریزی کی بالادستی کو بدستور قائم رکھا جائے۔ دوسرے مراعات یافتہ طبقے کے انگلش میڈیم طلبہ و طالبات کو احساس برتری سے ہمکنار رکھا جائے۔ تیسرے یہ عذر بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اختیاری مضامین کی کتابیں اردو میں دستیاب نہیں ہیں۔ اول الذکر دو اسباب تو سرکاری سطح اور آئینی دفعات کے ذریعے ہی اپنی موجودہ کیفیت کو بدل سکتے ہیں لیکن جہاں تک اختیاری مضامین کی کتابوں کا اردو میں دستیاب نہ ہونے کا معاملہ ہے۔ یہ سراسر غلط فہمی اور بے بنیاد پروپیگنڈے پر مبنی ہے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے۔ اس طرح کے مقابلے کے امتحانات میں شرکت کی کم سے کم تعلیمی اہلیت گریجویٹ ہوتا ہے در ہمارے کالج اور جامعات کم از کم گریجویشن کی سطح تک سارے علوم اردو میں پڑھانے کا کامیاب تجربہ گزشتہ کئی سال سے کر رہی ہیں اور اس

ضمن میں کتابوں کی عدم دستیابی کی کوئی شکایت نہیں پائی جاتی۔ اس کا معیار بھی کسی دانشورانہ اسلوب کا متقاضی نہیں بلکہ مضمون سے ایک تعلیم یافتہ فرد کی واقفیت چاہتا ہے۔

اردو زبان کی قومی اور تہذیبی اہمیت کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا مناسب نہیں کیونکہ اس پر گزشتہ چالیس سال کے دوران پاکستان کے معاشرے کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ میں اپنی بات اس اصول کے تحت پیش کر رہا ہوں کہ اردو زبان کی قومی اور تہذیبی اہمیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور اب اس کے بارے میں شاخسانے پیدا کر کے ہماری ہیئتِ اجتماعی کو نقصان ہی پہنچایا جا سکتا ہے کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی۔

اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ حقیقت اور محکم ہو جاتی ہے کہ مقابلے کے امتحانات میں اردو کو متبادل زبان بنایا جائے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو افراد ان امتحانات میں کامیاب ہو کر آتے ہیں وہ اعلیٰ سرکاری اور انتظامی عہدوں پر فائز ہوتے ہیں نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ غیر ممالک میں بھی خدمات انجام دیتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران برصغیر پاک و ہند کے علاوہ اردو کے کئی مراکز دنیا کے دوسرے ملکوں میں قائم ہو چکے ہیں۔ کینیڈا، امریکہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، روس، چین، جاپان، ملیشیا، ترکی، عرب ممالک۔ یہاں تک کہ ناروے اور سویڈن میں بھی اردو کی تدریس کے شعبے ہیں۔ برطانیہ تو خیر اپنی تاریخی اور سیاسی وابستگی کے پس منظر میں اردو کا سب سے بڑا مغربی مرکز بن چکا ہے اب اگر ہمارے اعلیٰ عہدیدار اور افسران اس پس منظر کے ساتھ ان ممالک میں تعینات ہوتے ہیں کہ وہ اردو سے واجبی واقفیت رکھتے ہوں اور انھیں مختلف موضوعات پر اردو میں اظہارِ خیال کرنے کی عالمانہ دسترس نہ ہو تو ہم کس طرح غیر ممالک کو اپنی آزاد ثقافت اور قومی ترقی و خود داری کا تاثر دے سکتے ہیں۔ اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

خود اپنے ماحول کو لیجیے تو یہ اعلیٰ عہدیدار و ملازمین یہاں بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں عام لوگ اعلیٰ طبقے کے اطوار و خیالات کو (موجودہ نیم خواندہ معاشرے میں) مستند اور قابلِ تقلید سمجھتے ہیں۔ اگر اعلیٰ افسر یا عہدیدار اپنی عملی زندگی میں اردو کی اہمیت سے منکر اور اردو کے ذہنی اور فکری سرمائے سے نابلد ہوگا تو اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے فی الواقع نافذ کرنا کبھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ یہی افراد حکومت کے ہر شعبے کی پالیسیاں مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جو سوالات متعلقہ وزراء سے کیے جاتے ہیں ان کی تفصیلات اور تبصرے یہی افراد مہیا کرتے ہیں۔ اب اگر ان کا نقطۂ نظر شروع ہی سے اردو کے بارے میں لاتعلقی اور بے نیازی کا ہو اور یہ انگریزی کو فوقیت دینے پر ہمیشہ مائل رہے ہوں تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ وہ قومی زبان کی ترویج و ترقی کے بارے میں سرکاری یا قومی سطح پر کوئی مفید خدمات انجام دے سکیں۔

جامعات اور کالجوں میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کرایا جا چکا ہے لیکن مقابلے کے امتحانوں میں اس اہمیت کی عملی تردید ہو جاتی ہے ہمیں ایک وسیع تر تناظر میں قومیتوں اور ان کی زبانوں کے مسئلے کو مثبت طریقے سے حل کرنا چاہیے جس کی نظیر ہمیں دیگر کثیر اللسانی معاشروں میں مل جاتی ہے کہ انھوں نے کس خوش اسلوبی سے اس کو ایک عملی شکل دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک مشترکہ رابطے کی زبان یا "لنگوا فرانکا" کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں بھی ہمارا رویّہ ہمدردانہ اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔

اردو کا دامن ہر قسم کے موضوعات پر لکھی جانے والی یا ترجمہ شدہ کتابوں سے مالا مال ہے اس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اردو کا استعمال کہیں واقعی ہو رہا ہے۔ حال ہی میں شریعت کورٹ اور جامعات کو شریعت فیکلٹی کے حوالے سے جو عملی ضرورت معاشرے کو پیش آئی ہے تو سینکڑوں مستند کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو گیا اور شرع اور فقہ کے ہر پہلو طبع زاد اور مترجم کتابیں برابر شائع ہونے لگی ہیں۔ اگر مصنفین اور ناشرین کو یہ یقین ہو کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں مقابلے کے امتحانات میں حصہ لینے والے امیدواروں کی ناگزیر ضرورت بن سکتی ہیں تو وہ تن دہی سے معیاری کتابیں تیار کر کے اس خلاء کو بھی پورا کر سکتے ہیں جو شاید بعض شعبوں میں پایا جاتا ہو لیکن مسئلہ وہی ہمدردانہ اور افادی نقطۂ نظر کا ہے۔

سر راس مسعود کے عزیز دوست اور انگریزی زبان کے سربرآوردہ ناول نگار اور ادیب ای۔ ایم فارسٹر نے جو برصغیر میں بھی خاصہ عرصہ رہ چکے ہیں ایک اردو انجمن کو خط لکھتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کیے تھے کہ :

"I never spoke Urdu and yet it is my language for the reason that I have so often heard it on the lips of those I loved"

"میں نے اردو کبھی نہیں بولی، پھر بھی یہ میری زبان ہے کیوں کہ میں نے اسے اکثر ان افراد کے ہونٹوں سے سنا ہے جن سے مجھے محبت تھی"

ہمارے ہاں پاکستان میں اردو کو علاقائی زبانوں کا حریف بنا کر پیش کرنے کی ایک سازش برابر چلی آ رہی ہے۔ سرکاری اور نجی سطح پر اس تصور اور تاثر کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں علاقائی زبانوں کو ان کی جائز نمائندگی دے کر اردو کے

…راہ ہموار کی جائے تاکہ باہمی احترام اور لسانی ہم آہنگی کے حوالے سے قومی یک جہتی اتحاد و اخوت کی منزل تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔

مقابلے کے امتحانات چونکہ فیڈرل سروس کمیشن کی جانب سے ہوتے ہیں اس لیے ایک صوبائی پبلک سروس کمیشن کے مقابلے میں اس کی زیادہ مجاز ہے کہ کسی قسم کی علاقائی عصبیت، لسانی گروہ بندی اور لسانی منافرت کو ہوا دیے بغیر قومی زبان اردو کو مقابلے کے امتحانات کا ذریعۂ اظہار قرار دے دے۔ لسانی سطح پر شک و شبہ کو دور کرنے میں مقابلے کے امتحانات بہت اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے فرقہ پروری اور فرقہ وارانہ شعور کا فرق واضح کرتے ہوئے بات بڑی اچھی کہی ہے کہ:

"ایک زبان کے بولنے والوں یا ایک مذہب کے ماننے والوں میں باہم وابستگی کا احساس ان کا باہم مل کر اپنے مشترک مقاصد کو حاصل کرنے یا اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں۔ یہ تو ایک قدرتی اور جائز بلکہ ضروری اور مستحسن چیز ہے۔"

پاکستان میں دفتری اصطلاحات، دفتری اردو اور دیگر لسانی سہولتیں بہم پہنچانے کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ادارے کو مزید فعال بنا کر ملک کا پورا انتظامی ڈھانچہ ہر سطح پر قومی زبان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو

مقابلے کے امتحانات سے کامیاب ہو کر آنے والے اردو کی عملی افادیت کے قائل ہو کر عملی زندگی میں آئیں تو وہ قومی زبان کے لیے سازگار ماحول فراہم کرسکتے ہیں۔

کئی سال سے سی ایس ایس کے امتحانات میں شرکت کی تیاری کرنے والے طلبہ و طالبات مضامین کے بارے میں مشورے کرتے اور بعض تشریحات و توضیحات کے سلسلے میں میرے پاس آتے ہیں مجھے ذاتی طور پر اس کا علم ہے کہ وہ ان امتحانات کی ناگزیر شرط کو پورا کرنے کے لیے بڑی محنت و مشقت سے انگریزی زبان کی کتابوں سے تیاری کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران یہی بات بتائی کہ اگر سرکاری سطح پر دستور و آئین کے تحت اردو کو مقابلے کے امتحانات کی متبادل زبان بنا دیا جائے تو ہم اس سے زیادہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرسکتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی تخلیقی رویّہ اختیار کرسکتے ہیں۔

اس تمام جائزے کا ماحصل یہ ہے کہ حکومت بھی اصولی طور پر اردو کو قومی اور سرکاری زبان قرار دے چکی ہے۔ ماہرینِ تعلیم و سماجیات بھی اس امر پر متفق ہیں کہ قومی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے سے قوم کی تخلیقی ذہانت بڑھے گی اور یک جہتی اور باہمی رواداری کا خواب بھی پورا ہوسکے گا۔ خود مقابلے کے امتحان میں شرکت کرنے والے بہ استثنائے چند یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اردو میں جوابات تحریر کرنے کی اجازت دی جائے تو پھر آخر وہ کون سی مصلحت ہے جس کی بنا پر اس کارِ خیر سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم، جامعات اور انتظامی عہدہ داروں کے مابین، ایک فطری اور منطقی ربط پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم سے عہدے تک کے عمل کو ایک زینہ یا ایک سیڑھی میں اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ ایک کے بعد ایک قدم رکھتے ہوئے ہم قومی ترقی اور اجتماعی افتخار و سربلندی کی منزل پر پہنچ جائیں اور یہ بھی اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس عمل کے کلیدی مرحلے پر حقیقی توجہ دیں اور مقابلے کے امتحانوں میں اردو کو متبادل زبان کی حیثیت سے اختیار کریں۔

Nur Khan and education

RETIRED AIR MARSHAL Nur Khan, a leader of the POG in the National Assembly , reiterated his view, most recently on the floor of the house on June 17, during the Budget session that "no progress is possible in Pakistan without progress in the field of Education." Every child must have at least 10 years of school education, he said; he is in favour of "Strengthening and expanding the existing schools in the country rather than opening new ones."

Nur Khan, according to a report published in "The Muslim" of June 18th has offered his own services for the post of Federal Minister of Education, which by the way is not vacant, so that, if appointed and provided proper support, by the Government to his educational plan and policy, he can deliver the goods. He has even gone to the extent of offering to join the ruling Muslim League.

Retired Air Marshal Nur Khan has held, in the past high positions. His credentials, however, regarding the field of education are limited to a draft of education policy for the government of W.Pakistan. One wonders about the reason that gives him so much confidence to be able to bring about changes and improvements in the field of education.

I have been a College and University teacher for about 20 years and had also something to do in my own humble way, with administration as well as extra-curricular activities in Pakistan and some other countries. In spite of this exposure I feel, that improving the state of education in Pakistan is a Herculean task.

Nur Khan's proposals to set up an Education commission and a National Education Fund are laudable but more important than this change is the Government policy, which still, unfortunately considers it as an unproductive sector, the appointment of a small but highly capable and patriotic Pakistani education experts as well as leaders like Nur Khan who are motivated by a genuine desire to serve the cause of education for improving the state of education.—S. SHAMIM AHMAD PIRZADA, Advocate, Islamabad

روزنامہ مسلم اسلام آباد، ۱۴-۶-۸۷ء

ڈاکٹر حنیف فوق

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ

قومی یک جہتی اور قومی زبان کا نفاذ ایک دوسرے سے مشروط نہیں تو منسلک ضرور ہیں لیکن دونوں کی نسبت کا تعین بڑی سیاسی دانش مندی اور تہذیبی بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ بعض ملک تاریخ کے طویل دور میں موجودگی سے اپنی پہچان حاصل کرتے ہیں اور بعض ملکوں کا قیام ایک ہیئت اجتماعی کے سعیٔ پیہم کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے لیکن قیام سے پہلے اور قیام کے بعد کے حالات کا اختلاف نئی توجیہات کا طالب ہوتا ہے کسی ملک کی جغرافیائی سرحدیں قومی تشخص کا احساس تو بیدار کرتی ہیں لیکن قومی تشخص سے قومی یک جہتی کا سفر جہاں دشوار گزار ہے، وہاں اسے افراد و ہیئت اجتماعی کے مسلسل کاوش سے عبارت کہا جاسکتا ہے کیوں کہ نہ کسی ملک کے وجود میں آتے ہی قومی یک جہتی خودبخود ظہور میں آجاتی ہے اور نہ تاریخ کے کسی نقطے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قومی یک جہتی کے تشکیل دینے والے سب عوامل مکمل ہوگئے ہیں۔ اور اب کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا ہے۔ دراصل قومی یک جہتی ایک حاصل شدہ نتیجہ نہیں بلکہ ایک نصب العین ہے جس کے لیے مسلسل تگ و دو کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ وقت کے ساتھ سماج کی خواہشات اور ضروریات کے نئے تضاد بروئے کار آتے رہتے ہیں اور قوموں کی دانش مندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ان تضادات کے نقش و نگار کو کس طرح ایک مجموعی خاکے کا جزو بنا کر ان میں کلیّت کا وصف پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح قومی زبان کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ قوم کے ماضی اور تاریخی روایت سے تعلق رکھتے ہوئے بھی نہ داستانوں سے لپٹ جاتی ہے اور نہ دبستانوں میں بٹ جاتی ہے۔ بلکہ قومی زندگی کی مجموعی حرکت کو پیش کرتی ہے اور یکسانیت و یک سمتی کی بجائے مختلف رنگوں اور مختلف سمتوں سے قوم کے اجتماعی مزاج اور مشترکہ منزل کا پتہ دیتی ہے۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں برصغیر کی مسلم قوم کی مجموعی حرکت کا سراغ ملتا ہے اور جب اس قوم نے اپنے لیے پاکستان کی شکل میں ایک سیاسی لائحہ عمل کا تعین کرلیا، تو اس کی جدوجہد کے نقوش اسی زبان کے ذریعہ روشن ہوئے پھر قیام پاکستان تو ایک سیاسی ہدف تھا، لیکن تعمیر قومیت کا کام تو اس کے بعد شروع ہوا ہے۔ اردو نہ صرف اس تعمیر قومیت میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے بلکہ مختلف عناصر قومیت کی جُداگانہ خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک ایسے وسیع ذہنی میلان اور ثقافتی حرکت کو پیش کرتی ہے، جس سے قومی تہذیب کی بنیادیں مستحکم ہو رہی ہیں۔ اردو نے ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے احساس قومیت بیدار کرنے میں نہایت اہم حصہ لیا۔ مختلف خطوں کی خصوصیات جذب کر کے وسیع پس منظر فراہم کیا اور اب تعمیر قومیت اور قومی تہذیب کے پروان چڑھانے میں مصروف کار ہے۔ چنانچہ نفاذ اردو جہاں ہماری عصری تاریخ کی ایک اہم ضرورت ہے اور اسے ہمارے تہذیبی ارتقا کا نشانِ منزل کہا جاسکتا ہے، وہاں اس کے ذریعے نہ صرف قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔ بلکہ اسے نئی صورت حال میں رونما ہونے والے نئے بحرانوں کے حل کے موثر وسیلے کی حیثیت بھی دی جاسکتی ہے

قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں سب سے بڑی ذہنی مزاحمت تو یہی ہے کہ اسے صرف رابطے کی زبان کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ اردو نے مختلف سطحوں پر قومی رابطوں کو مضبوط کیا ہے لیکن تعلیم یافتہ اور مراعات یافتہ طبقوں کے لیے انگریزی نہ صرف قومی رابطے ہی نہیں، بین الاقوامی رابطے کا ذریعہ بھی ہے پھر کیوں نہ انگریزی ہی سے یہ کام لیا جائے؟ مانا کہ اردو کا دائرۂ تفہیم اس ملک میں انگریزی سے زیادہ وسیع ہے لیکن یہی ایک سبب اردو کو قومی زبان قرار دینے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ دراصل وہی زبان قومی زبان بننے کے اہل ہے جو قوم کی تاریخ و تہذیب سے گہرا تعلق رکھتی ہے اور انگریزی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے ملک کی سرزمین سے پیوست نہیں۔ اس کے برخلاف اردو نہ صرف ہماری قومی تاریخ و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ حریت خواہی کے جذبات کی توسیع اور قومی شعور کی ترویج بھی اسی کے ذریعے ممکن ہوئی ہے۔ پھر مستقبل کے خاکوں میں کسی اجنبی زبان کے مقابلے میں ہماری زبان ہی رنگ بھر سکتی ہے ایک اجنبی زبان کے وسائل اظہار محاوروں سے لے کر تشبیہوں اور استعاروں تک دوسرے دیار اور دوسری تہذیب یا تہذیبوں کے آثار و نقوش پیش کرتے ہیں اور

ہم ان کے ذریعے اپنے حال یا مستقبل کے تخیلات و تصورات کو ادا کرنا چاہیں تو صرف صورت ہی نہیں، مفہوم بھی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اپنے تخیلات اور خوابوں کو معنوی صداقت کے ساتھ اپنی ہی زبان میں اظہار بخشا جا سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسری زبانوں، دوسری تہذیبوں اور دوسرے ملکوں کے تجربوں سے استفادے کا دروازہ بند کر دیں۔

قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں دوسری بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اسے خواہ مخواہ انگریزی کی حریف تصور کر لیا جاتا ہے حالانکہ ترویج اردو کا مطلب ہرگز ہر سطح پر انگریزی کو دیس نکالا یا نفی نہیں۔ اکثر یورپی زبانوں اور خصوصاً انگریزی میں سائنسی اور سماجی علوم کا جو خزانہ جمع ہے اور اس میں مسلسل تحقیق و جستجو کے ذریعے جو اضافہ ہو رہا ہے اس سے استفادہ نہ کرنا تنگ نظری اور تہذیبی رویے کی غلط کاری ہے لیکن انگریزی کو علمی فضیلت کے میدانوں کی بجائے روزمرہ زندگی میں سماجی تفاوت اور طبقاتی برتری کے لیے استعمال کرنا قوم سے بد دیانتی اور خود انگریزی سے ناانصافی ہے۔ پھر صرف سائنس اور انسانی علوم کی عقلی سطح پر ہی نہیں خود ادب کی تخلیقی سطح پر بھی ہم نے انگریزی کے واسطے سے جو کچھ سیکھا ہے اس سے انکار ممکن نہیں اس لیے قومی زبان کا نفاذ دراصل کسی غیر زبان سے اس نسبت کا تعین بھی ہے جس سے استفادے اور استحصال کی راہیں جدا جدا ہو جاتی ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے نو آبادیاتی نظام سے نو آزاد ملکوں میں قومی زبانیں ایک نئے ولولۂ قومی کا سرچشمہ بن گئی ہیں۔ اس سے کام نہ لینا قومی زیاں کے مترادف ہے لیکن اس ولولۂ قومی کو ترقی کی راہوں میں صرف کرنے کے لیے نئے علمی وسائل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس لحاظ سے غیر زبانوں کی تحصیل بھی ایک اہم وسیلہ ہے لیکن جس طرح محض وضعِ مغربی، مغرب کی علمی ترقی سے عبارت نہیں اسی طرح صرف کسی غیر زبان کو تعلیمی، دفتری یا سرکاری زبان بنا دینے سے اس زبان کے علمی خزانوں کے دروازے نہیں کھل جاتے۔ اس کے لیے مسلسل کاوش کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کاوش کا بہترین آئینہ خود قومی زبان کے جذب و انجذاب کی صلاحیت ہے۔ دہلی کالج سے جامعہ عثمانیہ تک اردو نے بار بار یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں علمی سرچشموں سے فائدہ اٹھانے کی بے پناہ استعداد ہے۔ پاکستان میں اردو کا قومی زبان کی حیثیت سے نفاذ نہ صرف علمی ترقی کے پرکھنے کا ایک قابلِ اعتبار آلہ ہوگا بلکہ اس ترقی کی رفتار تیز کر کے اُسے قومی شعور کا جزو بنا دینے میں بھی ایک کارگر قوت بن جائے گا۔ جب اردو ایک مؤثر علمی زبان کی حیثیت سے اُبھرے گی تو قومی یک جہتی کے وہ گوشے بھی روشن ہوں گے جہاں انگریزی کی بین الاقوامی رابطے اور علم کی زبان ہونے کے باوجود رسائی نہیں ہو سکتی۔

قومی یک جہتی اور قومی زبان کے نفاذ دونوں کے لیے قومی زبان اور علاقائی زبانوں کی نسبت کا تعین ضروری ہے اور اس کا عدم تعین دونوں میں ایک اہم رکاوٹ بنا ہوا ہے علاقائی زبانوں اور قومی زبان اور قومی تہذیب کو ارتباطِ باہمی سے فروغ حاصل ہوتا ہے وہ زبانیں اور بعض اختلافات کی وہ تہذیبی شکلیں جو ایک سرزمین سے رنگ و نمو حاصل کرتی ہیں تاریخی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے ایک وسیع وحدت میں ڈھل جاتی ہیں کیونکہ خود تاریخ نے انہیں وہ پس منظر فراہم کیا ہے جس سے خیالی اور اظہار کے سرائے کو زمین سے وابستگی حاصل ہوتی ہے۔ قومی تہذیب اور علاقائی تہذیب شکلیں باہمی تعلق سے نمو پاتی ہیں۔ قومی زبان علاقائی زبانوں کو قوت بخشتی اور ان سے تقویت حاصل کرتی ہے۔ قومی زبان مختلف علاقائی زبانوں میں اشتراک و اتحاد کے عناصر کو نئی صورت دیتی ہے اور ان کی خصوصیتوں کو جذب کر کے اور ان پر اثر انداز ہو کر اپنی اور ان کی ترقی کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ قومی زبان کی سطح پر مختلف علاقوں کے آدرش ایک مشترکہ میدان تلاش کر لیتے ہیں اور روزمرہ کے تقاضوں کے ساتھ اپنے شعور تاریخ و تہذیب کے اشتراک سے قومی تہذیب کے حال و مستقبل کی سمت آرائی کرتے ہیں لیکن علاقائی زبانیں جس طرح گل ہائے رنگ رنگ کی صفات کو پیش کرتی ہیں ان سے مجموعی قومی تہذیب کی ثروت اور توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے قومی زبان اور علاقائی زبانیں بہت کچھ سرمایہ باہمی فراہم کر سکتی ہیں اور آپس کے لین دین سے مستحکم ہوتی ہیں۔ مختلف علاقوں کی ذہنی خصوصیات اور فنی کتابات اور قومی زبان کی مشترک جہاتِ فکر مل کر ہی باہمی ترقی کا باعث بنتی اور مجموعی قومی نقطۂ نظر پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے قومی زبان اور علاقائی زبانیں متصادم ہونے کی بجائے باہمی نشوونما کا سبب ہیں اور ان سے قومی زندگی کی رنگا رنگی کے ساتھ مجموعی زینت چمن کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری بات یہ ہے کہ نہ قومی زبان کے نام پر نہ علاقائی زبانوں کے پرچم تلے مادی اور ذہنی ترقی کے مخالف رجحانات کی صف بندی کی جائے کیونکہ اس سے نہ صرف قوم کی رفتارِ ارتقا میں سستی آتی ہے بلکہ خود ان زبانوں کے حدودِ فکر بھی سمٹنے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف وسیع المشربی جہاں ان زبانوں کو باثروت بناتی ہے وہاں انسان دوستی کے ساتھ ساتھ خود بخود قومی یک جہتی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں قومی زبان میں علاقائی زبانوں کے بیان کے رنگوں سے تابانی آتی ہے اور اس کے وسائلِ اظہار میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح علاقائی زبانیں قومی زبان کے سرمایۂ اظہار سے نئی وسعت پاتی ہیں۔ عام زندگی سے تعلق، قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے افکار کی مشترک بنیاد ہے لیکن قومی زبان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ مختلف علاقوں کی خصوصیات کو سمیٹ کر مشترک قومی کردار کی تشکیل میں حصہ لے اور اجتماعی خوابوں کو حقیقت کی شکل دینے میں قوم کی رہنمائی کرے اسی طرح قومی زبان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ مختلف علاقوں میں بسنے والوں کی زندگی کے عصری مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی لوک روایات کو بھی اپنے تخلیقی تجربات

کو شامل کرے۔ اردو نے یہ کام انجام دیا ہے لیکن ابھی کرنے کے لیے بہت کچھ باقی ہے اس ملک کی مجموعی زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے تاکہ سارے عکس مل کر عام انسان کی شبیہہ پیش کر سکیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو اپنی تخلیقی میراث سے الگ ہو جائے لیکن اپنی قائم شدہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے علاقائی زندگی سے تعلق کا اضافہ اسے علاقائی زبانوں اور قومی یک جہتی کو فروغ دے گا۔ کسی بھی زبان میں وہ تنگ نظری جو موجودہ زندگی کی مشترک انسانی جدوجہد کو پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اسے علاقائی سے قومی اور قومی سے بین الاقوامی بلندی تک نہیں پہنچنے دیتی اور نہ آفاقی قدروں کی بنیاد بن سکتی ہے۔

تبدیلی تاریخ کا عمل رہا ہے لیکن شاید اس دور میں جس تیزی اور جس کثرت سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان تبدیلیوں نے کش مکش اور انتشار کے متعدد رجحانات کو جنم دیا ہے۔ یہ تبدیلیاں ذہنی اور مادی سطحوں پر اکثر ترقیوں کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں لیکن بعض اوقات خود ان ترقیوں سے کش مکش کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں

ترقی پذیر ملکوں کے سفر عصریت میں مقامی تحریکات کے ساتھ کچھ نہ کچھ بیرونی اثرات بھی شامل رہے ہیں اور ان اثرات کے خلاف ردعمل بعض اوقات خود سفرِ عصریت ہی کو مشتبہ قرار دیتا ہے۔ پھر سائنس اور صنعت کے دور میں شہری زندگی نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے جس کے اپنے مسائل ہیں۔ شہروں کی زندگی زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے اور عدم یگانگت کے احساس کو فروغ دے رہی ہے لیکن اب دیہات بھی شہروں سے غیر منسلک نہیں رہے ہیں۔ جہاں نسبتاً مختلف معاشرتی اوضاع و اطوار ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہیں وہاں بعض اوقات کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ باہمی احترام و رواداری سے اس صورت حال پر قابو ضرور پایا جا سکتا ہے لیکن قومی وحدت اور سالمیت کے لیے صرف اتنا کافی نہیں جب کہ تصادم اور کش مکش کی زیادہ وسیع اور سنگین صورتیں بھی موجود ہیں۔ ان صورتوں میں علاقائی اور قومی تعلق کی کش مکش، قومی نقطۂ نظر سے متصادم گروہی اور انفرادی نقطۂ نظر، گروہی تشخص کی قومی تشخص پر ترجیح، تاریخ اور نظام معاشرت کے بارے میں مختلف تہذیبی رویئے اور عصری زندگی اور عصری اداروں کے متعلق اختلافِ نظر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ عناصرِ کش مکش کا جائزہ لیا جائے تو روایت اور تجدید کی کش مکش کے ساتھ خود روایت اور تجدید کے بعض عناصر کے اندرونی تصادم کا احساس ہوتا ہے۔ پھر نظام معاش اور نظام تقسیم کی کش مکش کے ساتھ سماجی ترقی اور پسماندگی کی کش مکش بھی ملتی ہے یہی نہیں خود بعض اجزائے ترقی ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ایک ترقی پذیر ملک کو اپنی وحدت و بقا بھی تصادم و کش مکش کی زد میں نظر آتی ہے اور اس خطرے کے پیش نظر قومی یک جہتی برقرار رکھنے کے لیے قوت کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن مثبت ذہنی رویہ ان اختلافات کے درمیان ایک ذہنی وحدت کی تلاش ہے

ہے اور کوئی ایسی مایوس کن صورت حال نہیں۔ بعض اوقات کشمکش قومی یک جہتی کو نئی بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔ ان میں ایک اہم بنیاد قومی زبان کے نفاذ، ترقی اور ترویج کی کوشش بھی ہے۔ خود قومی زبان کا عدم نفاذ بھی انتشار کا بڑا سبب ہے کیونکہ جب تک ملک کے مختلف علاقے سیاسی و تاریخی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے وسیع قومی روایت سے تعلق قائم نہیں کرتے، ذہنی اشتراک کے دائرے محدود ہوتے جاتے ہیں اور ایک مجموعی تہذیبی زندگی کا عدم انعکاس اختلافات کو شدید تر کر دیتا ہے۔

روایت اور تجدید دونوں قومی زندگی کا لازمی جزو ہیں اور قومی زبان روایت اور تجدید میں نسبت قائم کرتی ہے، وہ پورے ملک کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ قومی زبان پوری قوم کے تہذیبی عناصر کا مجموعہ کہی جا سکتی ہے قومی زبان کا نصب العین بھی ہوتا ہے کہ وہ عوام اور خواص کے فاصلے کو کم کرنے میں کوشاں رہتی ہے اور تخت نشین انگریزی کی طرح مراعات یافتہ طبقے کے احساس برتری کی ترجمان بن کر نہیں رہ جاتی کیونکہ وہ صرف سرکاری فائلوں میں نہیں عام لوگوں کی زندگی میں اپنا مقام رکھتی ہے لیکن عام لوگوں کے جذبات کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ قومی زبان کو علم اور سائنس کے فروغ کا ذریعہ بھی بنانا ہے کیوں کہ علم اور سائنس جہاں ماحول کا شعور اور اس کے بدلنے کے ذرائع فراہم کرتے ہیں، وہاں انسان اور فطرت کے بارے میں معروضی نقطۂ نظر بھی عطا کرتے ہیں۔ انسان جو علم کا موضوع بھی ہے، اپنے سماجی اور انفرادی وجود کے انتشار پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لیے انسان کی ہمہ جہتی ترقی کے بغیر قومی یک جہتی کا تصور بے معنی رہتا ہے۔

حیرت ہے کہ قومی یک جہتی کی ساری باتوں میں فرد کی ہمہ جہتی ترقی اور سالمیت کا ذکر خارج از بحث رہا ہے حالانکہ اسے نظر انداز کر کے ہم قومی یک جہتی کے مقاصد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ مسلم اور چینی روایات مدنیت میں میرون وینر (MYRION WEINER) کے قول کے مطابق، اگر ہمیشہ نصب العین مساوات پر عمل نہیں کیا گیا تو اسے تہذیب میں ممتاز اور اکثر ماکمانہ جگہ حاصل رہی ہے۔ خود اقبال نے بھی نقش ساز پاکستان ہیں، استحکام خودی یعنی فردیت کی تکمیل اور احترام آدمی پر جو اجتماعیت کی بنیاد ہے۔ اپنے فکر کی اساس رکھی ہے اردو کا قومی زبان کی حیثیت سے نفاذ جہاں قومی تہذیب کے ان عوامل کو فروغ دے گا جنہیں صدیوں کے معاشرتی میل جول نے پروان چڑھایا ہے وہاں اس کی وسیع ذہنی فضا انسانی اخوت کی بنیادوں کو بھی مضبوط کرے گی اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اپنے فکری سرمائے کے ممتاز حصے میں، انفرادی نشوونما اور قومی یک جہتی کی ترجمان ہی نہیں۔ قوم کے حال و مستقبل کی امین اور بین الاقوامی انسان دوستی کی نقیب بھی ہے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مقتدرہ قومی زبان کی خدمات

مدرسہ طبابت حیدرآباد دکن، انجینئرنگ کالج رڑکی اور دہلی کالج (دہلی) کے قیام اور کارکردگی نے انیسویں صدی کے وسط تک یہ ثبوت بہم پہنچا دیا تھا کہ سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم میں اردو کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔ آج کے مقابلے میں تو اس وقت اردو میں سائنسی ادب بہت کم اور برائے نام تھا لیکن طب، انجینئرنگ اور سائنس کے کسی مضمون کی تفہیم و تدریس میں اردو کی کم مائیگی کا شکوہ نظر سے نہیں گزرا اور کان آج تک اس لفظ سے آشنا نہیں ہوئے۔

انیسویں صدی کے وسط تک شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ملک کے طول و عرض میں عدالتی اور مال گزاری نظام میں اردو کا سکہ رواں ہو چکا تھا۔ اس کا بہت بڑا ثبوت ولسن کا مرتبہ دو ضخیم اردو مجموعہ "اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری" ہے جو پہلے ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا تھا اور اب مقتدرہ قومی زبان نے اسے دوبارہ چھاپ دیا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں پنجاب، سرحد اور بہاول پور اور بلوچستان کے بارے میں عدلیہ و مال گزاری سے متعلق جو دستاویزات دستیاب ہوئی ہیں، وہ خود اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ان علاقوں میں بھی گزشتہ صدی ہی میں عدلیہ و مال گزاری اور انتظامیہ کے کاروبار میں اردو کی کارفرمائی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو کی کارفرمائی کے بارے میں ترددات پر حیرت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابھی پہلی دہائی نہ گزری تھی کہ اردو میں علوم و فنون کی تعلیم کی ایک عظیم الشان تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے قیام نے تاریخ کے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے تجربات سے پھر ثابت کر دیا اور اردو ذریعہ تعلیم کے نتائج نے علمی و تعلیمی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی اردو نے تحریک پاکستان کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ اس کی اہمیت کا اعتراف طول و عرض میں موجود تھا۔ اردو کو رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی اس لیے توقع تھی کہ اردو کے قومی اور سرکاری زبان بنائے جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے گی لیکن قیام پاکستان کے بعد حالات نے یہ ثابت کیا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف رکاوٹیں ہی نہیں مزاحمتیں بھی موجود ہیں۔

اس دور میں اردو کی تحریک میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی کوششوں کے مقابلے میں پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کی اردو کانفرنس (مارچ ۱۹۴۸ء) سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ مولوی صاحب مرحوم نے کبھی کوئی بات خلافِ عقل نہ کہی تھی لیکن ان کا اپروچ سراسر جذباتی تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اصحاب رائے نے گردوپیش کے حالات اور بدلتے ہوئے ماحول میں حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور جذباتی بیانوں کے بجائے عملی پہلو کو سامنے رکھا اور راہ کی مشکلات کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور فرمایا۔

جامعہ پنجاب کے اہل رائے کی کامیابی اور ان کے کارناموں پر تبصرے کا یہ موقع نہیں لیکن ان کی تحریک کے نتیجے میں حکومت پنجاب کی آفیشل لینگویج کمیٹی کا قیام، اردو نفاذ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان فیصلہ تھا۔

یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ اس دوران میں نفاذ اردو کے مخالفین بھی خاموش نہیں بیٹھے رہے، جیسا کہ انہیں چاہیئے تھا۔ انہوں نے نفاذِ اردو کی راہ میں مشکلات پیدا کیں، رکاوٹیں کھڑی کیں اور موہوم مسائل اور مفروضات کی ہیبت ناک تصویریں کھینچیں اور بعض اوقات تو اربابِ اقتدار کو ایسا ڈرایا کہ اردو کے نفاذ کا نام سنتے ہی وہ توبہ تلا کرنے لگتے اور پکار اٹھتے کہ اگر اردو کے نفاذ کا یہی انجام ہونا ہے تو بہتر ہے کہ انگریزی ہی سے کام چلایا جائے لیکن سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کے مخالفین نے ہر محاذ پر پسپائی اختیار کی۔ البتہ شکست تسلیم نہیں کی۔

مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں آیا تو تحریک نفاذ اردو کے تمام مخالفین نہ صرف چوکنے ہو گئے بلکہ اپنے اپنے دائروں میں بھی سرگرم عمل ہو گئے۔ اربابِ مقتدرہ نے زمام کار ہاتھ میں لی تو نفاذ اردو کے مسئلے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ان کے سامنے واقعی اور غیر واقعی مسائل کا ایک ہجوم تھا۔

۱- بہت بڑا عناصر بیوروکریسی کا تھا۔ یہ طبقہ کُل کا کُل نفاذ اردو کے مسئلے میں غیر مخلص

تھا۔ البتہ اس کا بیشتر حصہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ اردو کا بول بالا ہو اور نفاذ عمل میں لائے۔ اس کی مخالفت بہ ظاہر طبقاتی نہ تھی۔ اس نے ایسے تیکنیکی اور فنی مسائل اٹھائے اور دشواریاں دکھائیں جن کی حقیقت اگرچہ کچھ نہ تھی لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۲۔ ایک عنصر علاقائی تعصب اور تنگ نظری تھی۔ اگرچہ ملک کی سلامتی اور قومی اتحاد اور ملک و طبقات میں رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت اور سرکاری زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ اردو کے نفاذ کا کوئی مخالف نہ تھا لیکن کسی جانب سے اس مسئلے کو ایسے رنگ میں پیش کیا گیا تھا کہ اختلاف نہ ہونے کے باوجود ذہنوں میں اشتعال پیدا ہو گیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ جب ذہن میں اشتعال پیدا ہو جائے تو مسئلہ سلجھتا کم اور الجھتا زیادہ ہے۔

۳۔ مخالف عناصر کی غوغا آرائی میں سائنس اور فنون لطیفہ کے محترم اساتذہ اور پیشہ ورانہ تعلیم (طب، قانون، انجینئرنگ وغیرہ) کے ماہرین کی سنجیدہ و متین آواز بھی شامل تھی جن کا ذوق تربیت انگریزی کی جگہ اردو کے استعمال پر مائل نہ تھے۔ اس محترم طبقے نے اپنے نقطۂ نظر کو بڑے سلیقے سے پیش کیا لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ خود ان کا پیشہ ورانہ اور عالمانہ وقار مجروح ہو گیا۔

ان عناصر نے مخالفت کا جو انداز اختیار فرمایا تھا وہ بڑا تکنیکی اور فنی تھا۔ بعض اوقات تو ان کے دلائل و براہین کی دلنشینی ان کے اسلوب کی دل ربائی اور ان کے نطق و بیان کی شیرینی نے قلب کو ایسا متاثر کیا کہ جی چاہا کہ صاف صاف اعلان کیجیے اور پکار پکار کر کہہ دیجیے کہ سرِ تسلیم خم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دل و جان نذر کرنا ہی ٹھہرا تو پھر دلبروں کو شمار کرنے کا کیا حاصل! لیکن یہ معاملہ اتنا ہی کہاں تھا کہ دل و جان نذر کرتے اور زندگی کے غموں سے نجات پا جاتے۔ اجتماعی زندگی میں غموں کا حساب الگ الگ نہیں چکایا جا سکتا۔ اجتماع و قوم کے ہر فرد کی زندگی دوسرے سے وابستہ اور ہر شخص ایک دوسرے کے نفع و ضرر کا شریک رہتا ہے۔ اس لیے فیصلہ کسی ایک فرد کے ذوق پر نہیں کر دیا جا سکتا۔

اگرچہ ان دلائل کی صف بندی اور اسلوب کی دل ربائی مانع ہے کہ ان کے تجربے کی بے ذوقی کا الزام اپنے سر لیا جائے لیکن اجتماعی مفاد کا تقاضا ہے کہ یہ الزام ضرور برداشت کر لیا جائے۔

اردو کی علمی کم مائیگی، اصطلاحات کی کمی، اردو کے ٹائپ رائٹر کی بورڈ کی عدم جامعیت یا نقص، ٹائپسٹوں کی قلت، الیکٹرونک کے عہد میں ہاتھ سے ٹائپ کاری عمل، رسم الخط کی دشواریاں، املا کی مشکلات، تیز رفتار ترقی اور مشینی دور میں کاتبوں کی دست کاری اور کتابت کی گھریلو صنعت پر انحصار، اردو شارٹ ہینڈ کے عدم رواج، خبر رسانی کے موجودہ دور کے ذرائع و وسائل کی عدم موجودگی، نہ کمپیوٹر نہ ٹیلی پرنٹر! کیا ان حالات میں اردو کا نفاذ کاموں کے اجرا و ترقی کا ضامن ہونے کے بجائے چلتی میں روڑا اٹکانے کے سترادف نہ ہوگا؟ بلاشبہ ان میں سے بعض دشواریاں واقعی تھیں لیکن قومی مفاد کے عظیم الشان مقصد کے سامنے ان دشواریوں کی کوئی حقیقت نہ تھی اور اگر ان کی کوئی قرار واقعی حقیقت تسلیم بھی کر لی جائے تو قومی تعمیر و ترقی اور شاندار مستقبل کے حصول کے لیے ان پر ہر صورت میں قابو پانا اور رکاوٹوں کو دور کرنا ناگزیر ہے۔

مقتدرہ قومی زبان کے سامنے یہ حالات ایک چیلنج تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ: کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق۔ مقتدرہ نے اس چیلنج کو قبول کیا، ہر اعتراض کا جواب دیا اور ہر مشکل اور رکاوٹ کو دور کرنے کی سعی کی اور اگرچہ وہ اپنے عزائم و مقاصد کی آخری حد کو نہیں پہنچا لیکن اس نے اپنے کاموں کی کیفیت و کمیت اور معیار و جامعیت سے ثابت کر دیا ہے کہ عزائم و مقاصد کا ناپید کنار دشتِ امکاں صدر نشین کے یک نقشِ پا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان کے اقدامات یا بیش قیمت خدمات کو تیکنیکی اور فنی اور علمی کاموں کو دو بڑے دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تیکنیکی اور فنی کام

دفتروں میں تیز رفتار کارگزاری کے لیے ٹائپ رائٹر کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اردو میں ٹائپ رائٹر ایک مدت سے استعمال ہو رہا ہے لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کا کلیدی تختہ ریاضی کی تمام ضروری علامتوں کا حامل تھا اور نہ حسابداری و محاسبی کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ مقتدرہ نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ دی اور تمام علامتوں اور نشانوں کا حامل اور تمام ضرورتوں کا کفیل ایک جامع کلیدی تختہ منظور کروایا۔ اس کی تیاری میں متعلقہ اداروں سے پوری طرح تعاون لیا اور اس کے رواج کے تمام مسائل پر توجہ کی۔ چونکہ آج کے زمانے میں تیز رفتار کارگزاری کے لیے ٹائپ رائٹر ہی کافی ضمانت نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تیز رفتار کارگزاری کے لیے اس کا الیکٹرک اور نہ صرف الیکٹرک بلکہ الیکٹرونک ہونا بھی ضروری تھا۔ یہ مسئلہ بھی مقتدرہ کی توجہ فرمائی سے محروم نہ رہا۔ رواج عام کے لیے پورٹ ایبل کی ضرورت کو بھی نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ مقتدرہ نے اس کی تیاری کی تحریک اور تعاون کے سلسلے سے بھی غفلت نہیں برتی۔

ٹائپ رائٹر تیار ہو گیا تھا تو ٹائپ کاری کی عملی تربیت کا انتظام بھی ناگزیر تھا چنانچہ

پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں ٹائپ کاری کے اسکول قائم کیے گئے۔

ہر مشین کی ایجاد کے ساتھ اس کی انجنیئرنگ کی ذیلی صنعت جس کا تعلق اس کے استعمال کی تکنیک اور مشین کی خرابیوں کی اصلاح و درستگی سے ہوتا ہے۔ وجود میں آجاتی ہے اور اس میں گائیڈ یا دہنما کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقتدرہ کے بالغ نظر اصحاب کی توجہ فرمائی سے یہ گوشہ بھی محروم نہ رہا۔ چنانچہ ٹائپ کاری کے اصول و قواعد، ٹائپ مشین کے استعمال کی تکنیک اور خرابیوں کی درستگی کے سلسلے میں چند اہم کتابیں مقتدرہ نے شائع کر دی ہیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں تیز رفتار کارگزاری کے لیے ٹائپ رائٹر ہی کی طرح شارٹ ہینڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقتدرہ نے پاکستان کے کئی شہروں میں ٹائپ کاری کی تربیت کے ساتھ مختصر نویسی کی تعلیم کا انتظام بھی کیا ہے اور فن زود نویسی کے نام سے ایک تاریخی اہمیت کی کتاب جو مرزا محمد ہادی اور ایم ایل کھوسہ نے مرتب کی تھی اور اب بالکل نایاب تھی مقتدرہ نے اسے تلاش کر کے شائع کر دیا۔

آج کے دور میں کوئی زبان نہ ترقی یافتہ کہی جا سکتی ہے اور نہ موجودہ دور میں تیز رفتاری کے ساتھ اشاعت و طباعت اور خبر رسانی کے اعمال انجام دیے جا سکتے ہیں۔ اگر اس زبان کا کمپیوٹر اور ٹیلی پرنٹر نہ ہو۔ مقتدرہ کے ارباب بصیرت سے قومی ترقی اور اردو کے نفاذ میں کمپیوٹر اور ٹیلی پرنٹر کی اہمیت کے فہم و ادراک میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ ابتدا میں کمپیوٹر پر درآمدی محصول کی چھوٹ دلوا کر اس کے رواج میں مدد بہم پہنچائی۔ اردو کے ٹیلی پرنٹر کی تیاری میں ہمیں پاکستان ٹیلی فون کے محکمے کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے لیکن اس میں مقتدرہ کی رہنمائی اور مساعی کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔

اردو کے رواج عام اور نفاذ میں اور رسم الخط کے بعض مشکلات اور املا کی بعض خامیوں اور بے قاعدگیوں کا ذکر اکثر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بے قاعدگیاں ایسی ہرگز نہ تھیں جو اردو کے نفاذ میں رکاوٹ بنتیں۔ لیکن مقتدرہ نے اس سلسلے میں کسی رد و کد اور بحث و مناظرہ میں پڑنے کی بجائے "اردو رسم الخط" کے نام سے ایک مختصر اور مفید کتاب چھاپ کر معترضین کو مسکت جواب دیا۔ املا کے مسائل کے بارے میں ایک کل پاکستان سمینار کا اہتمام کیا۔ بحث و مذاکرہ اور صلاح و مشورہ کے ذریعے متفقہ فیصلوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ سمینار کے مقالات و مباحث اور املا کمیٹی کی سفارشات کو شائع کیا۔ نیز اردو املا اور رموز اوقاف کے مسائل پر منتخب مقالات کا ایک مجموعہ مرتب کروا کر شائع کیا۔ اردو املا کے مسائل اور کتابیات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے۔

۲۔ علمی کام

اردو کے رواجِ عام اور نفاذ میں علمی اصطلاحات کی کمی کا شکوہ بھی کیا جاتا رہا ہے مقتدرہ نے اپنے اقدامات میں اس پہلو پر بھی خاص توجہ دی اور جو کارنامہ انجام دیا ہے اس پر ایک سرسری نظر ڈال لینے کے بعد کوئی شخص اردو میں علمی اصطلاحات کی کمی کا شکوہ نہیں کر سکتا۔

اصطلاحات کے سلسلے میں مقتدرہ کا کام وضع اصطلاحات سازی سے لے کر تالیف و تدوین اصطلاحات اور اشاعت کے کاموں تک پھیلا ہوا ہے۔ اصطلاحات سازی کے اصول و طریقہ کار کے بارے میں "وضع و اتحادِ اصطلاحات" (ڈاکٹر سید عبداللہ) اور "مقتدرہ قومی زبان اور اصطلاح سازی" (شکیل منگلوری) اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کی فرہنگیں بھی شائع کیں اور اردو میں اصطلاحات سازی کے کاموں کے جائزے پر مشتمل ایک کتاب بعنوان "اردو میں اصطلاح سازی" (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری) بھی شائع کی اس کے سرسری مطالعے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میدان میں بہت پہلے ہمہ جہت کام انجام پا چکے ہیں۔

مقتدرہ نے اصطلاحات سازی اور ان کی تالیف و اشاعت کے سلسلے میں جو کام اب تک کیے ہیں اور شائع بھی ہو چکے ہیں انہیں استاذی الکرم ڈاکٹر اسلم فرخی کے مشورے سے پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

۱۔ سائنسی اصطلاحات۔ اس قسم میں "کشاف اصطلاحات موسمیات" اور "اصطلاحات موسمیات" (سرفراز شاہد)، "سائنسی و تکنیکی اصطلاحات" (مجلس اصطلاحات) کا شمار کیا جانا چاہیے۔

۲۔ کاروبار، تجارت، صنعت و حرفت کی اصطلاحات۔ اس سلسلے میں مقتدرہ نے "اصطلاحات بیمہ کاری" (ڈاکٹر سہیل بخاری) اور "اصطلاحات حسابداری محاسبی" (مسعود احمد چیمہ) شائع کی ہیں۔

۳۔ حکومت کے دفاتر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی فرہنگوں کے سلسلے میں "مختصر اصطلاحات دفتری" (مقتدرہ)، "اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری" (ایچ ایچ وِسن) "مختصر قانونی اصطلاحات" (مولوی فیروز الدین ڈسکوی)، دفتری مراسلت (انگریزی اردو) ترجمہ و ترتیب ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ علمی اصطلاحات کی فرہنگیں۔ اس ضمن میں "کشاف اصطلاحات سیاسیات" دو جلد (محمد صدیق قریشی) اور "کشاف اصطلاحات کتب خانہ" (محمود الحسن و خالد محمود) نہایت مفید کام انجام پاتے ہیں۔ اسی مقام پر مجھے "فرہنگ اسمار العلوم

(سعد طارق خالد) کا ذکر بھی کر دینا چاہیے۔

(۵۱) اصطلاحات زبان و ادب کا میدان بھی مقتدرہ کی توجہ سے محروم اور خدمت گزاری سے خالی نہیں رہا۔ اس ضمن میں "خزینۃ الامثال (شاہ حسین حقیقت)"، "جامع الامثال" (وارث سرہندی)، "اصطلاحات ڈراما" (محمد اسلم قریشی)، "کشاف تنقیدی اصطلاحات" (ابو الاعجاز حفیظ صدیقی) وغیرہ کام انجام پائے۔

مقتدرہ قومی زبان کا ایک اہم کام جو نہ صرف نفاذ اردو کی تحریک میں معاون بلکہ اردو کی جامعیتِ علوم و فنون اور ثروت علمی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا منصوبہ تالیف و تدوین کتابیات ہے۔ اس سلسلے میں مختلف علوم و فنون اور علمی و قومی شخصیات پر تقریباً دو درجن تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔

مقتدرہ نے مختلف علاقوں اور دفتروں میں اردو کے نفاذ و رواج کی تاریخ و عمل کا جائزہ بھی لیا ہے۔ "بلوچستان میں نفاذ اردو"، "آزاد کشمیر میں نفاذ اردو"، "چترال میں اردو" شائع ہو چکی ہیں۔ اسی سلسلے کے چند رسالے "اردو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان"، "اردو اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی"، "جامعہ کراچی میں اردو"، "شرعی عدالت میں ترویج اردو" نظر سے گزرے ہیں۔

دفتری زبان کی حیثیت سے اردو کے عمل و نفاذ کے مختلف جہات پر مقتدرہ نے کئی مفید کتابچے شائع کیے ہیں۔

ذریعۂ تعلیم اور نظام تعلیم میں اردو کی اہمیت و کردار اور مسائل کے جائزے میں کئی نہایت فکر انگیز اور مفید کتب و رسائل شائع ہوئے ہیں۔

پاکستان میں اردو کے نفاذ کے مسائل اور جائزے پر بھی مفید کتابچوں کی اشاعت مقتدرہ کی خدمات کے خلعتِ فاخرہ کا زریں تکمہ ہیں۔

قومی زبان کی اہمیت کے نقش کو اجاگر کرنے میں دو کتابچوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ دونوں کتابچے "قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص" اور "اردو بہ حیثیت قومی زبان" کے ناموں سے ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان نے چند اہم موضوعات پر سروے بھی شائع کیے ہیں۔ یہ سب نہایت مفید معلومات سے پُر ہیں۔ اس قسم کے سروے قومی زندگی کے قیام میں ہوا کا رخ پہچاننے اور گرد و پیش کے حالات میں منصوبہ بندی میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

قومی زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت اور علمی زبان کی حیثیت سے اس کی جامعیت اور وسعت پر یوں تو مقتدرہ کے تمام کام ہی شاہد عدل ہیں، لیکن مقتدرہ نے خاص اس موضوع پر کئی کتابیں چھاپ کر اپنی خدمات کے اس پہلو کو اور روشن کر دیا ہے۔ پہلی کتاب "اردو کی وسعت اور جامعیت" (مختار زمن) کے عنوان سے ہے۔ یہ ڈان (کراچی) کے ایک مضمون کے جواب میں ہے جس میں اس طعنے کا جواب دیا گیا ہے کہ اردو کئی اعتبار سے ناقص اور ایک کم مایہ زبان ہے۔

قومی زبان کی خدمت اور اس کے نفاذ کی تحریک کو تقویت پہنچانے کے سلسلے میں مقتدرہ نے قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات کی تدوین و اشاعت کا کام شروع کیا ہے۔ یہ کام اتنا اہم اور مفید ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے میں قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات جلد اول، مرتبہ اول (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار) اور جلد دوم حصہ اول (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار و ڈاکٹر نسرین اختر) اور "بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات" (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) شائع ہو چکی ہیں۔

نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ نے مختلف محکموں میں ورکشاپوں کا اہتمام کر کے ملازمین و کارکنان کی تربیت کا انتظام بھی کیا ہے۔

متبادل اصطلاحات و الفاظ کی فوری فراہمی اور ضروری رہنمائی کے لیے مقتدرہ کے مرکزی دفتر میں ایک سیل قائم کیا ہے۔

دفتروں کے فارموں اور روزمرہ استعمال کے ورقہ جات کے ترجمے کا انتظام کیا۔

مختلف محکموں اور دفتروں سے خط و کتابت کے ذریعے اور مختلف اداروں مثلاً کراچی یونیورسٹی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے اشتراک و تعاون سے کسی نہ کسی انداز سے اردو کے نفاذ کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔

خاص اردو کے نفاذ کے نقطۂ نظر سے مقتدرہ کی ایک خدمت کا تذکرہ کیے بغیر مجھے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگرچہ اس کا تعلق خاص اردو کے نفاذ سے نہیں لیکن نفاذ اردو کی تحریک کو مہمیز دینے کے لیے یہ ایک نہایت فکر انگیز کام ہے۔ میرا اشارہ "بھارت میں قومی زبان کا نفاذ" کی طرف ہے جسے مختار زمن نے تالیف فرمایا ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ ہندی جو بھارت کی قومی و سرکاری زبان ہے، اردو کے مقابلے میں بہت کم ترقی یافتہ تھی۔ اس کے رسم الخط اور املا میں بہت خامیاں تھیں۔ اصطلاحات کے اتنے بڑے ذخیرے کی مالک بھی نہ تھی جس پر اردو کو بجا طور پر فخر تھا لیکن بھارت کی حکومت نے جب ہندی کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کر لیا تو رسم الخط کی کوئی خامی، املا کی کوئی مشکل، اصطلاحات کی کمی یا ٹائپ رائٹر کے کلیدی تختے کی عدم جامعیت، کمپیوٹر اور ٹیلی پرنٹر کا عدم وجود کوئی امر بھی مانع نفاذ ہندی نہ بن سکا۔ بعض اوقات خود ہندی والے چیخ اٹھے لیکن جب انہوں نے اپنے قومی مفاد میں ایک فیصلہ کر لیا تو پھر

پلٹ کر نہ دیکھا اور یمین و یسار سے بے نیاز ہو کر آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ ان کا قافلہ رواں دواں ہے اور رفتہ رفتہ مشکلات پر قابو پاتے جا رہے ہیں۔ یہ ہماری بیورو کریسی کو غیرت دلانے اور تحریک نفاذ اردو کے کارکنوں کو حیرت میں ڈال دینے والی کتاب ہے میں نہیں چاہتا تھا کہ اس غیرت دلانے والے مقتدرہ کے اس کارنامے کا ذکر کر کے کسی طبقے کے لیئے شرمندگی کا سر و سامان فراہم کر دوں لیکن خود میرے اس مقالے کا تقاضا ہوا کہ اس کتاب کے ذکر کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ محترم مختار زمن صاحب کی یہ کتاب "دی لینگویج پالیسی آف انڈیا" انگریزی میں ہے۔ مقتدرہ نے اصل انگریزی اور اس کا اردو ترجمہ (پروفیسر انور بیگ اعوان) دونوں چھاپ دیئے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق پاکستان کی قومی زبان دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی تیسری زبان ہے۔ مقتدرہ نے اس رپورٹ کے حقائق سے کسی طبقے کو متاثر اور مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ چند نہایت مفید در معلومات افزا کتابچوں کی اشاعت سے مشرق و مغرب کے ممالک میں اردو کے رواج اور اس کی مقبولیت کے بہترین دلائل فراہم کر دیئے ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان نے یہ کارنامے ایسی حیرت انگیز سرعت سے انجام دیئے اور اتنی کم مدت میں اتنی بہت سی کتابیں چھاپ دی ہیں اور ہر مہینے میں اتنے صفحات چھپ کر سامنے آ جاتے ہیں کہ ایک اوسط صلاحیت اور رفتار کا قاری انہیں پڑھ کر کبھی فارغ نہیں ہو سکتا۔

یہ نفاذ اردو کے تعلق سے مقتدرہ قومی زبان کے اقدامات و خدمات کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ یہ کارنامہ بنیادی طور پر ۸۴ء اور ۸۷ء تک تین سال کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر اس کے اولوالعزم صدر نشین کو چند سال مزید فرصتِ خدمت مل گئی تو وہ اپنی بلند پروازیوں سے ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔

Switch-over to Urdu by 1988 unlikely

By MAHMOOD HAMDANI

ISLAMABAD, March 28: Introduction of Urdu as alternative medium to English at the national level by 1988 is a constitutional commitment being jeopardised by the government itself.

Sources close, to *Muqtadera-e-Qaumi Zaban* (national language authority) apprehend that by permitting the elitist institutions to hold 'O' and 'A' level examinations of foreign institutions, the government was deliberately obstructing the growth of national language. Contrary to Muqtadera's 1979 recommendations to discourage English medium schools, their number is on the increase

The elitist pressure is fast building up to revert teaching of mathematics and science subjects at intermediate level from Urdu to English. The reverse gear is also supported by education minister's recent press statement in which he hinted at the possibility of making either medium optional. Efforts are under way to impart all technical and medical education in English.

The entire insidious exercise has the blessings of the all-powerful bureaucracy whose kids go to such institutions.

The current moves to scuttle introduction of Urdu as medium of learning is a blatant contravention of the spirit of the 1973 Constitution and as well as a conspiracy to bar common man's child from receiving higher education.

It is clearly laid down in the 1973 Constitution under Article 251 (1) that the national language of Pakistan is Urdu and that "arrangements shall be made for its being used for official and other purposes within 15 years from the commencement of the Constitution."

Soon after the promulgation of the 1973 Constitution, efforts were stepped up to achieve the 1988 target at the provincial as well as federal levels. Urdu Dictionary Board, Urdu Science Board, *Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu*, Urdu Academy Lahore, Pushto Academy, Peshawar, *Sindhi adabi Board*, Hyderabad, institute of Islamic research and the Urdu departments of all the universities were entrusted with the vital taks of translating terms for all modern science and non-science subjects.

In order to co-ordinate the working of all these institutions engaged in translation, the *Muqtadera e-Qaumi Zaban* was established or October 4, 1979

The *Muqtadera* however, suffered a setback from its very inception. Late Dr Ishtiaq Hussain Qureshi, a renowned scholar in history and Persian, was picked up by the president to become first chairman of the Muqtadera He remained in office until his death on January 21, 1981 He was replacewd by the present chairman Dr Waheed Qureshi.

Dr Qureshi took over as the chairman *Muqtadera* on April 7, 1983. Under his chairmanship, the *Muqtadera* set forth a rather over-ambitious programme, pledging that the *Muqtadera* would manage a complete switch-over from English to Urdu within two years. With the passage of time it became clear that the bureaucracy would not let it happen so soon

According to *Muqtadera's* recommendations, Urdu should have been adopted as medium of instruction for M Sc and MBA by the current year but adoption upto matric level will hardly be completed by 1989

Now the *Muqtadera* contends that English be adopted as the second compulsory language It however negates the general concept propagated by a certain section of bureaucracy that English is the total sources of scientific knowledge Countries like Soviet Union, France, Italy, People's Republic of China, Japan and even Hong Kong are teaching scinece subjects in their own languages Recent example is that of Algeria which comfortably switched over

Switch-over

(Continued from Page 1)

from French to Arabic. Similarly India, Iran, Sri Lanka and Saudi Arabia are successfully teaching these subjects in their own languages.

Muqtadera has accepted criticism from certain quarters that the terminology adopted by it is derived mainly from Arabic and Persian languages and very difficult to pronounce and grasp Now its policy is to keep English terms in vogue or to give them in parenthesis along with their Urdu alternatives

The *Muqtadera* has so far translated 37,000 terms still under scrutiny for final authentication

Muqtadera complains that big bosses in government and semi-government offices don't co-operate in nominating their officials for training courses in *daftri* Urdu being organised by the Allama Iqbal Open University on behalf of the *Muqtaderra* Some 50,000 officials were supposed to receive training during five semesters from April 1984 to April 1986 but a disappointing figure of only 4,490 turned up Interestingly, many of them were on the brink of retirement

The *Muqtadera* has so far failed to convince the power that be to hold competitive examination in the national language at least in the subjects already being taught in that medium at the university level

Over and above all these serious lapses is the fact that *Muqtadera* enjoys no authority to implement the task it has been entrusted with. Hence the whole exercise headed towards doom

روزنامہ دی فرنٹیر پوسٹ، پشاور ۲۹ مارچ ۸۷ء

پروفیسر آغا حسین شاہ

نظریہ پاکستان ڈاکٹر وحید قریشی کی دو کتب کے حوالے سے

اردو زبان اس لحاظ سے خوش آہنگ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی جیسے محقق اپنی تحقیقاتی کاوشوں میں یہ تاثر چھوڑ رہے ہیں کہ اردو زبان مختلف زبانوں کی ترجمانی کے فرائض سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اگر انگریزی جاننے والے تقلید کی روشنی سے باز و ممنوع رہیں۔ بلاشبہ تقلید کی روش بدعت ہے حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے مغربی تقلید پر اظہد خیال فرماتے ہوئے کہا کہ

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

"ڈاکٹر وحید قریشی تحقیقی میدان میں نہ صرف انفرادیت رکھتے ہیں بلکہ تاریخی حوالوں سے نئے رجحانات و فکری اساس کے علمبردار ہیں یہ بات تسلیم کے قابل ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں انہوں نے قابل تحسین کام کیا ہے اور کر رہے ہیں لیکن نظریہ پاکستان کی حیثیت فکر کو جس خوبصورت اور ندرت فکر کے ساتھ اپنی مشہور تصانیف "پاکستان کی نظریاتی بنیادیں" "قائداعظم اور تحریک پاکستان" میں بیان کیا ہے نئی نسل بالخصوص مایوس لوگوں پر احسان عظیم ہے بلاشبہ اب بھی ایسا طبقہ اس پاک خطہ میں سانس لے رہا ہے جس نے دل کی گہرائیوں سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا ہے جو اندر ہی اندر اس پاک وطن کے بارے میں سازشوں میں مصروف ہے۔

"پاکستان کی نظریاتی بنیادیں" میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ایسے افراد سے ہوشیار رہنے کے جابجا اشارے کیے ہیں مایوس افراد کے اذہان میں ایک خیال پرورش پانے لگا اور پا رہا ہے کہ کہیں پاکستان کی بنیاد کسی غلط اور نقصان دہ نظریہ پر تو نہیں استوار کی گئی۔ پاکستان دشمن عناصر نے اس خیال سے مذموم تناظر میں روشناس کرایا اور مزید مایوس اور بے چینی کے رجحانات کو تقویت دی۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی جن لوگوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ بھی کہنے لگے "ہم نہ کہتے تھے یہی ہوگا۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ رہتے تو بہتر تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈر ملک کا نظام چلانے کے قابل ہی نہیں۔"

۷ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں سر سکندر حیات نے کہا کہ میں پنجابیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ پاکستان، ہندوستان، راجستان یا خالصتان کی باتیں نہ کریں بلکہ اپنے تمام اختلافات مٹا کر ساری دنیا پر واضح کر دیں کہ پنجاب نہ صرف پنجاب ہی کا نجات دہندہ ہے بلکہ ہندوستان کا بھی۔

اگر پاکستان کا یہ مفہوم ہے کہ پنجاب میں خالص اسلامی حکومت ہو جائے تو میرا ایسی حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

اسی طرح سر سکندر نے اسلامیہ کالج کانووکیشن پر جو خطبہ دیا اس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ جس میں پاکستان بننے کی صریحاً مخالفت کی اور واضح الفاظ میں اپنا نظریہ تقسیم پیش کیا" زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یاد رکھو تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لیے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح روح کے ہی خلاف ہے بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے جس کی رُو سے ہر فرزند توحید پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشے تک پہنچائے"۔

اور اس طرح کے بے شمار حوالہ جات پاکستان بننے کی مخالفت میں ملتے ہیں۔ لیکن حریت پسند مسلمان الگ اسلامی ریاست کے حصول کے لیے عملی طور پر قربانیاں پیش کر رہے تھے سر سکندر اور ان کے حامیوں کے خلاف عوام میں تنفر پیدا ہو رہا تھا اور ایک وقت وہ آیا جب تحریک میں حصہ لینے والے لوگ۔ الگ اسلامی ریاست کے خلاف لوگوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس تنفر کی ایک مثال اپنی کتاب "پاکستان کی نظریاتی بنیادیں" میں واقعاتی صورت میں اس طرح بیان کی جلسہ لاہور میں مسٹر شاہنواز محمدوٹ کے سر سکندر کی تعریف میں جملوں پر جو کچھ ہوا وہ جلسے میں موجود حضرات کو یاد ہے وہ پنڈال میں پچھلے دروازے سے داخل ہوئے تھے اور اجتماع کے خوف سے نکلے تو ان کی کار کا گھیراؤ کیا گیا اور بمشکل واپس جا سکے" اس کے بعد کھلے جلسوں میں شرکت سے گریزاں رہے۔"

اس طرح قرارداد کے دوسرے بڑے مخالف ڈاکٹر سید عبداللطیف تھے۔

حیدرآباد میں ۴ مارچ ۴۴ ۱۹ء میں ڈاکٹر عبداللطیف نے ایک بیان جاری کیا جس سے ان کی قائد اعظم محمد علی جناح سے مخاصمت اور ان کے نظریہ کی مخالفت کا واضح عکس ملتا ہے "اب مسلمانوں کو دیکھنا چاہیئے کہ ان کے قائد اعظم ان کو کدھر لیے جا رہے ہیں"

قائد اعظم محمد علی جناح کو سخت محنت کرنا پڑی اور اپنے آہنی عزم میں مزید قوت داخل کی، کسی مقام پر گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ پیدا نہ ہونے دی اور متزلزل نہ ہوئے میری رائے میں الگ اسلامی ریاست کے مخالفین کا فوری اور جدباتی طور پر سامنے آجانا قائد اعظم کے لیے سودمند تھا کیونکہ مخالفین کی اراکے پیش نظر تحریک کا لائحہ عمل تیار کرنے اور چھپی ہوئی مخالفانہ کڑیاں جب سامنے آئیں تو ان کو سامنے رکھتے ہوئے الگ اسلامی ریاست کی تشکیل پر فکر کرنے کا مزید موقع ملا

قائد اعظم محمد علی جناح نے ان حالات کے پیش نظر ۵ مارچ ۱۹۴۱ء کو ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ وہ مسلمان جن کی روش متزلزل ہے ان کو ابھی فوراً دوٹوک فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ان کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔"

اس بیان سے قائد اعظم محمد علی جناح کے اس رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے جس میں اپنی اس بات کا اظہار کیا کہ جو افراد واضح طور پر نہ مسلم لیگ میں شامل نہ کانگرس میں شامل ہیں۔ ان کو فوری طور پر فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ اس بیان میں قائد اعظم محمد علی جناح نے چونکا دینے والی بات کھل کر کہہ دی قائد اعظم محمد علی باطن کے لحاظ سے شیشہ کی مانند شفاف تھے اور باطنی طہارت کو آخری دم تک قائم رکھا جس کا اعتراف مخالفین نے بھی کیا۔

پاکستان کی تخلیق اس فکر کی بنیاد ہے کہ مسلمان مذہب کے لحاظ سے ایک الگ قوم ہے۔ قائد اعظم کے سامنے جو عظیم مقصد تھا اس کے مقابلے میں مخالفانہ روشوں کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ قائد اعظم کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ جس نصب العین کی تشکیل کے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں یقیناً مشکل کام تھا لیکن انہوں نے اس مقصد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور اپنی زندگی وقف کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

قرارداد لاہور کے عملی نفاذ کے سلسلے میں تحریک میں زور پیدا ہو گیا اور مخالفین نے بھی انٹی پاکستان کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کر دیں ہندوؤں نے مسلمانوں کے اجلاس کے مقابلے میں انٹی پاکستان کانفرنس منعقد کی

قائد اعظم نے ان مخالفین کے جوابات دیے ان لوگوں کی گمراہ کن افواہوں کی تردید کی جو قرارداد لاہور کا مطلب کچھ اور سمجھتے تھے۔ ۴ مارچ ۱۹۴۱ء میں مجلس عاملہ کے اجلاس میں آپ نے فرمایا پاکستان کا مطلب ہر عقل مند خوب جانتا ہے کوئی شخص اگر شرارت کا مظاہرہ کرے تو اسے خدا ہی سمجھے گا میرے بس کا روگ نہیں۔ لیکن جب ہم پاکستان کہتے ہیں تو ہماری مراد قرارداد لاہور ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی ان دو کتب "پاکستان کی نظریاتی بنیادیں" "قائد اعظم اور تحریک پاکستان" میں پاکستان دشمن عناصر کی محققانہ نظر سے نشاندہی کی ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کا خداداد اسلامی مملکت سے لگاؤ کا ایک تحریک کی صورت میں کارفرما نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب جب قرارداد لاہور کے مخالفین کا چہرہ بے نقاب کر رہے ہوتے ہیں تو الفاظ میں بیساختگی متحرک نظر آتی ہے۔ ایسے چہروں کو چھپا دینا ان پر پردہ ڈالنا ڈاکٹر وحید قریشی کے مزاج اور مسلک کے مطابق خداداد اسلامی مملکت کے ساتھ محبت کے فقدان کے مترادف ہے۔

آپ کی تحریروں میں وہ آواز ہے جس سے دشمنوں کے دل لرز جاتے ہیں آپ کی تحریریں ریاکاری سے مبرا نظر آتی ہیں جن میں اخلاص نمایاں ہے اور پڑھنے والا لازوال قلبی اور روحانی دولت سے مالا مال نظر آتا ہے۔

یہ وہ درد ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

ہر سطح پر اردو استعمال کی جائے
[illegible]

خیرپور (نمائندہ جنگ) سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ نے منگل کی شب یہاں خیرپور سیشن کورٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب سے اردو زبان میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر چہ ان کی مادری زبان سندھی ہے لیکن وہ قومی زبان اردو میں تقریر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں انہوں نے کہا کہ آیئے ہم قومی زبان اردو کو ہر سطح پر اور ملک کے ہر حصے میں استعمال کر کے ایک قوم بن جائیں غوث علی شاہ نے اپنی تقریر کے اختتام پر چند جملے سندھی زبان میں بھی ادا کیے [illegible] تقریب کا آغاز انگریزی میں اور بار کے صدر علی اسلم جعفری نے اپنا سپاسنامہ انگریزی میں پیش کیا تو ہائیکورٹ کے چیف جسٹس نعیم الدین نے اپنی تقریر اردو میں شروع کی اور کہا کہ میں نے ۲۱ سال وکالت کی اور ۱۲ سال سے جج کے فرائض انجام دے رہا ہوں میری پوری زندگی انگریزی بولتے گزر گئی ہے مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ایسی تقاریب میں بھی انگریزی کا استعمال کیا جاتا ہے جن میں تمام لوگ اردو سمجھنے والے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس تقریب میں شامل سب لوگ اردو اور سندھی زبان سمجھتے ہیں لہذا یہاں پر انگریزی کا استعمال کیوں کیا جا رہا ہے۔ اگر میں سندھی بول سکتا تو اس وقت سندھی میں تقریر کرتا۔ لیکن میرے لئے مجبوری ہے کہ میں سندھی نہیں بول سکتا۔ لہذا میں اردو میں آپ سے مخاطب ہوں اور آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگ بھی اپنی قومی زبان اردو کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کریں۔

جنگ کراچی ۴ جون ۸۷ء

ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو

ڈاکٹر وحید قریشی کا نام وطن عزیز کے ادبی اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں بطور محقق، استاد اور اسکالر انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور خاص طور پر ادبی تنقید اور محاکمہ میں نئی جہتوں کے حوالے سے ایسا مثبت اور تعمیری کام کیا ہے جو آنے والے دنوں میں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ثابت ہوگا۔ آپ آج کل مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ہیں اور سرکاری سطح پر اردو کو اس کا حقیقی اور آئینی مقام دلانے کے لیے پوری تندہی سے کوشاں ہے۔ حرمت کے ممتاز لیاقت کے ساتھ اپنے انٹرویو میں وہ قومی زبان اور اس کے نفاذ کے لیے کی جانے والی کوششوں اور حکمت عملی کے خدوخال اور پس منظر کے بارے میں بطور خاص روشنی ڈالتے ہیں۔

س۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا تعلق شروع ہی سے اردو کی تحریک سے ہے اور پنجابی ادب سے متعلق بھی رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو کے مقابلے میں علاقائی زبانوں کو لانے کا جو رجحان چلا ہے کیا آپ اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ کہیں گے؟

ج۔ میرے نزدیک اس کا پس منظر سیاسی ہے اور اس کی تفصیلات میرے دائرۂ کار میں نہیں ہیں۔

س۔ جو گروہ یہ کہتا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ نہ کیا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح علاقائی زبانوں کی ترقی اور ترویج رک جائے گی جبکہ اصل مسئلہ انگریزی سے نجات حاصل کرنا ہے۔ آپ کے نزدیک یہ گروہ کہاں تک صحیح کہتا ہے؟

ج۔ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ کیا آپ صوبوں کو یکجا رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اس یکجائی کی تین صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ انگریزی کو برقرار رکھا جائے لیکن انگریزی اس لیے برقرار نہیں رکھی جاسکتی کہ تعلیم یافتہ طبقے میں سے یہ صرف نونی صد لوگوں کی زبان ہے۔ دوسرا متبادل یہ ہے کہ قومی زبان کی حیثیت سے اردو کو نافذ کر دیا جائے تیسرا متبادل یہ کہ آپ بیک وقت ساری زبانوں کو اختیار کریں۔ جہاں جہاں بھی قومی زبانوں کا مسئلہ ہے یا جن ممالک میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے انہوں نے کسی ایک زبان کو اپنایا ہے مثلاً چین میں سینکڑوں زبانیں ہیں لیکن سرکاری حیثیت صرف بیجنگ اور اس کے آس پاس کی زبان کو حاصل ہے۔ اور خود چینی زبان کی اتنی شکلیں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں بیس سال پہلے جب چین گیا تھا تو ہمارے ساتھ مترجم تھا وہ بیجنگ کا تھا وہ ناکام ہو گیا یونان میں کیونکہ وہاں کی چینی زبان وہ نہیں سمجھ سکتا تھا اسی طرح انگلستان کو دیکھئے وہاں جو انگریزی رائج ہے وہ نہ تو کاؤنٹیز کی انگریزی ہے، نہ سکاٹ لینڈ یا آئرلینڈ کی ہے۔ جب آپ مرکزی ایک زبان رکھنا چاہتے ہیں وہ یا تو اردو ہوگی یا علاقائی زبانوں میں سے اس زبان کو اختیار کریں گے جو اکثریت میں ہے۔ یہ تین متبادل ہیں۔ اب جہاں تک صوبائی یا علاقائی زبانوں کا تعلق ہے ان کا مقابلہ قومی زبان اردو کے ساتھ ہے ہی نہیں۔ قومی زبان کا اگر کوئی مقابلہ ہے وہ انگریزی کے ساتھ ہے۔ اور انگریزی کی بھی دو حیثیتیں ہیں ان میں سے ایک حیثیت ہے بطور ذریعہ تعلیم کے جو اردو کا حق ہے اور یہ حیثیت اردو کو ملنی چاہیئے۔ دوسری حیثیت لازمی ثانوی زبان کی ہے۔ ہماری رائے میں انگریزی کی یہ حیثیت بحال رہنی چاہیئے اور علوم تک رسائی کا یہ دریچہ کھلا رہنا چاہیئے۔ اردو کو جگہ لینی ہے۔ تعلیمی حیثیت سے دفتروں میں استعمال کی زبان کی حیثیت سے اور سائنسی علوم کو پڑھنے کی حیثیت سے باقی حیثیتیں دوسری ہیں۔ اس کے بعد صورت یہ رہ جاتی ہے کہ علاقائی یا صوبائی زبانوں اور اردو کے درمیان مفاہمت کا فارمولا کون ہو۔ علمی لحاظ سے سیاسی لحاظ سے نہیں۔ علمی لحاظ سے بھی یہ آپس میں طے کرنے کا مسئلہ ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پرائمری تک علاقائی زبانوں کو میڈیم کے طور پر اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس سے اردو کو فائدہ پہنچے گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پرائمری میں اردو بھی ایک لازمی مضمون کے طور پر برقرار رکھی جائے گی تاکہ پرائمری کے بعد طالب علم کو قومی زبان میں اتنی مہارت حاصل ہو جائے کہ وہ اگلے مضامین قومی زبان میں پڑھ سکے لیکن یہ مسئلہ

حکومت کے طے کرنے کا ہے۔ مقتدرہ کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔

باقی رہا مسئلہ مختلف صوبوں کو آپس میں مربوط رکھنے کا اور آپس میں تبادلۂ خیال کا تو اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اسے رابطہ کی زبان کے طور پر بھی اختیار کرنا ہوگا۔ پھر قومی زبان کی حیثیت بھی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ آپ غور کریں تو پچھلے چالیس سال میں اردو میں علاقائی زبانوں کے بہت سے الفاظ، بہت سی تراکیب اور بہت سی چیزیں آئی ہیں اور اردو نے انہیں اپنے آپ میں جذب کیا ہے۔ قومی زبان کے طور پر اردو کو اگر یہاں پر قائم رہنا ہے تو یہ اثرات اس پر آنے ناگزیر ہیں اور آنے چاہئیں۔ اور بول چال کے ساتھ قومی زبان کا یہ رشتہ قائم رہنا چاہیئے۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ میں خود بھی اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی لکھتا پڑھتا ہوں بلکہ پنجاب یونیورسٹی میں جب ایم اے اردو کی کلاسیں کھولی گئیں اور شعبہ قائم ہوا تو شروع کے چار پانچ برس میں ہی اس کا انچارج تھا اور صدر شعبہ خود اس وقت کے وائس چانسلر تھے۔ اس کے بعد پھر دو مرحلے ایسے آئے ہیں جب تین تین یا چار چار برس کے لیے میں صدر شعبہ ہوا۔ مجھے تو کہیں بھی دقت پیش نہیں آئی کہ کہیں بھی پنجابی زبان کا ٹکراؤ قومی زبان سے ہوا ہو یا سمجھا گیا ہو۔ بلکہ علاقائی زبان کو اردو سے بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ علمی لحاظ سے بھی اور اسالیب کے اعتبار سے بھی۔ ہمارے ہاں یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ان زبانوں اور اردو میں کوئی فاصلہ ہے حقیقت یہ ہے کہ گرامر کے لحاظ سے SYNTAX کے لحاظ سے اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے ان زبانوں اور اردو میں ایک نسبت قرینہ موجود ہے۔ اس بارے میں اپنی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ میں کسی درجے پر بھی اردو کا طالب علم نہیں رہا۔ اردو مجھے کس طرح آئی ہے۔ وہ اس طرح کہ میں پنجابی جانتا تھا اور پنجابی اور اردو میں جو اشتراک ہے جو نہ صرف پنجابی اور اردو میں ہے جس طرح بلوچی اور اردو میں ہے۔ پشتو اور اردو میں ہے۔ یہ تعلق اتنا گہرا ہے کہ ایک زبان کی مدد سے بآسانی دوسری زبان محسوس کیے بغیر سیکھ جاتے ہیں اور بول سکتے ہیں اور لکھ پڑھ سکتے ہیں اور یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ ان میں بہت زیادہ فاصلے ہیں علمی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ سیاست کی بات میں نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ میرا میدان ہے۔

س۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اردو کے رواج اور نفاذ میں اصل رکاوٹ وہ ذہن ہے جو اجارہ دارانہ یا استحصالی ہے۔ ان کے اشارہ شاید اس اہل زبان طبقے کی طرف ہے جو اردو کو گنگا جمنا کے لہجے میں بولنا چاہتا ہے؟

ج۔ میرے خیال میں یہ خیال درست نہیں ہے۔ کم از کم ادیبوں میں کوئی آدمی اس کا دعویدار نہیں ہے۔ مجھے کراچی میں اردو جاننے والے کی حیثیت سے اسی طرح قبول کیا گیا ہے جیسے گنگا اور جمنا کے لوگوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اس طرح کی اجارہ داری قائم ہے۔ اس لیے جب یہ زبان بطور قومی زبان رائج ہو گی تو ظاہر ہے کہ اس پر دوسرے اثرات بھی آجائیں گے اور اس کا معیار خود پاکستان کے اندر ہو گا۔ ہاں ادبی لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ایک شاندار ماضی تھا جو دلی اور لکھنو میں بسر ہوا۔ وہ ایک قابل قدر اور زریں حصہ ہے اردو ادب کا۔ اگر اسے آپ نکال دیں تو اردو کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا۔ وہ ہمارا ہے اسے ہم قبول کرتے ہیں اور وہ ہماری ہڈیوں میں رچا ہوا ہے، لیکن جہاں تک حوالے کا تعلق ہے اب قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا حوالہ یہی خطہ پاک ہو گا اور یہی ہونا چاہیئے اور یہی رہے گا۔ جو آدمی اسے قبول نہیں کرتا وہ فرضی صورت حال کو سامنے رکھتا ہے۔ حقائق پر اس کی نظر نہیں ہے۔ اس سوال کو اور دوسرے سوال کو جو آپ نے پہلے کیا تھا ملا کر یہ صورتِ حال میرے سامنے آتی ہے کہ آخر رکاوٹ اردو کے سلسلے میں کہاں واقع ہے میرے خیال میں یہ رکاوٹ تین پہلوؤں سے قابل غور ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ پچھلے پندرہ برس سے پاکستان میں اقتصادی، سماجی اور دوسری سطحوں پر بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں متوسط طبقہ جو اس سے پہلے زبانوں کا اجارہ دار بھی تھا اور حکومت میں دخل انداز تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ اس طبقے کے اقتصادی سطح پر ختم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب صرف دو طبقے ہمارے ملک میں باقی ہیں۔ ایک ہے امیر طبقہ یا اس کے ساتھ متوسط بالائی طبقہ وہ اب ایک ہو گیا۔ دوسری سطح پر زیریں متوسط طبقہ تھا وہ اب عوامی طبقہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے اب ہمارے ملک میں دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ سارے کا سارا انگلش میڈیم سکولوں سے آ رہا ہے اور جو دوسرا طبقہ ہے وہ سارے کا سارا عمومی یونیورسٹیوں سے آ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گریڈ ۱۶ تک کی ملازمتوں میں عمومی یونیورسٹیوں والا طبقہ ہے اور اوپر والی ساری ملازمتوں میں انگلش میڈیم والا طبقہ ہے۔ اب جو اختلافی صورت حال ہے اور کشمکش ہے انگلش میڈیم اور اردو میڈیم میں ہے۔ اگر ہم نے اگلے دو چار برس میں اسے حل نہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں طبقاتی کشمکش بہت شدت اختیار کر جائے اور اس کے بعد یہ مسائل ہمارے اختیار سے باہر نکل جائیں۔ پھر ہم حل نہ کر پائیں۔ اب ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو اس سطح پر حل کیا جائے۔

س۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں ہم نے اردو کے نفاذ کی مدت غالباً بیس سال رکھی تھی۔ اس کے تحت ۱۹۷۶ء میں اردو نافذ ہو جانا چاہیے تھی۔ پھر ۱۹۶۲ء کے آئین میں غالباً ۱۵ سال رکھے گئے تو اس لحاظ سے ۱۹۷۷ء میں نافذ ہو جانی چاہیے تھی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں پھر پندرہ سال کی مدت رکھی گئی۔ یہ صورت حال اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ ہمارے وہ سیاسی قائدین جو آئین بنانے کے ذمہ دار ہیں اردو کو نافذ ہی نہیں کرنا چاہتے؟

ج۔ اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آئین میں اسے رکھ دیا جاتا ہے لیکن اس کے لیے جو تیاری کرنے کی ضرورت تھی وہ نہیں کی جاتی تھی اب ۱۹۷۳ء کے آئین کو دیکھیے اس میں یہ طے تھا کہ ایک ادارہ قائم کیا جائے گا چنانچہ مقتدرہ ۷ سال کے بعد جا کر قائم ہوئی اور ۱۹۸۸ء کا جو ہدف ہے اب وہ بالکل قریب ہے۔ اس لیے جس تیاری کی ضرورت ہے وہ بہت تیز رفتاری چاہتی ہے اس میں دو چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے نمبر ایک مقتدرہ کے پاس اتنے فنڈ ہوں کہ وہ ۱۹۸۸ء تک اپنی تیاری مکمل کر سکے۔ نصابی کتب کی صورت میں بھی اور دیگر چیزوں کے سلسلے میں بھی وہ رقم ہمیں ابھی تک نہیں ملی جو ملنی چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر ۱۹۸۸ء میں اردو کو رائج کرنا ہے تو اس کے لیے فوری طور پر ہمیں کم از کم ۳ کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ باقی یہ عمل مسلسل ہوتے ہیں۔ زبان کے نفاذ کا اور اسے زندگی کے سارے شعبوں میں جاری و ساری کرنے کا یہ لمبا عمل ہے۔ ۱۹۸۸ء کے بعد اداروں کی بھی ضرورت رہے گی اور فنڈز کی بھی ضرورت رہے گی۔ موجودہ فنڈز میرے نزدیک ناکافی ہیں۔ بہرحال اس رقم کے ساتھ ہم جتنا زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں اس پر لگے ہوئے ہیں۔ دفتری اردو کا نصابی حد تک کا کام ہم نے پورا کر لیا ہے لیکن باقی کاموں کے لیے ہم کو فنڈز چاہئیں وہ فنڈز ملیں تو ہم ۱۹۸۸ء کے ہدف کو پورا کر گزریں گے۔

س۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بھٹو مرحوم کے دور میں تمام سکول نیشنلائز کیے گئے تو کہا گیا کہ پرائیویٹ سیکٹر کے سکول اس لیے نیشنلائز کیے جا رہے ہیں کہ ان سکولوں میں لسانی دو عملی ہے۔ اور ان سکولوں میں قومی نقطہ نظر سامنے نہیں آتا۔ پھر مارشل لاء کے دور میں بھی بار بار یہ کہا گیا کہ اردو ذریعہ تعلیم رائج کر دیا گیا ہے اور عملاً ہوا بھی اس کے بعد اچانک بڑے بڑے ناموں کے ساتھ بعض انگلش میڈیم سکول سامنے آئے جب کہ یہاں کا کوئی بورڈ بھی میٹرک تک انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کس طرح اپنا نظام چلا رہے ہیں اور انگلش ذریعہ تعلیم والوں نے کون سا چور راستہ اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے یہ گلی گلی پھیل پھول رہے ہیں؟

ج۔ ۱۹۷۹ء میں حکومت نے اعلان کیا سرکلر بھی جاری ہوئے کہ لازمی طور پر مختلف ادارے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کریں۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں یہ ایک رعایت دی گئی کہ اگر کوئی ادارہ اپنے طور پر کیمبرج کے امتحانوں کی تیاری کرنا چاہتا ہے تو اسے اجازت ہوگی۔ اس اجازت نامے کے بعد یہ ساری صورتحال پیدا ہوئی ہے۔ آج گلی کوچوں میں بھی انگلش میڈیم سکول نظر آ رہے ہیں۔ اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ یہ دو عملی سرکاری امتحانات میں بھی آئے یعنی مقامی بورڈوں کے امتحانات میں بھی۔ مگر حکومت نے سخت پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اور ۱۹۹۱ء تک سرکاری سکولوں میں میٹرک کی سطح تک اردو مکمل طور پر نافذ ہوگی۔ اس میں انگریزی جگہ نہیں پائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت کی نیت نیک ہے وہ اس دو عملی کو جاری رکھنا نہیں چاہتی لیکن پبلک سیکٹر میں اس کا ابھی تک کوئی علاج نہیں کیا گیا۔

س۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سکول جو اپنا الحاق کیمبرج یا آکسفورڈ وغیرہ سے بتاتے ہیں، عملاً ایسا نہیں ہے۔ عوام کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ کیا حکومت کا یہ فرض نہیں ہے کہ ایسے اداروں پر گرفت کرے؟

ج۔ میرے خیال میں یہ بات حکومت کی نظر میں ہے۔ وزیر تعلیم نے اس سلسلے میں ایک بیان بھی دیا ہے انہوں نے کہا تھا کہ ہم اس کا علاج کر رہے ہیں۔ اب اس کا علاج کیا ہو؟ اس بارے میں کچھ اختلاف رائے دکھائی دیتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر یہ ادارے بھی حکومت کے کنٹرول میں آ جائیں گے تو علاج اس کا خود بخود ہو جائے گا۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے اس میں آپ فیسوں پر تو کنٹرول کر لیں گے لیکن میڈیم پر کنٹرول کرنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ دوسری بات جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو انگلش میڈیم سکولوں کی زیادہ تعداد نظر آ رہی ہے ان میں بھی در حقیقت اردو میڈیم ہی چل رہا ہے چنانچہ حکومت نے رجسٹریشن کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں اکثر اداروں میں جنہوں نے رجسٹریشن کرائی ہے یہی صورت حال ہے بظاہر نام انگریزی میں لیکن اندر اردو میڈیم ہی چل رہا ہے۔ اگلے دو سال میں جب میٹرک کا امتحان انگریزی میڈیم میں سرکاری سطح پر بند ہو جائے گا یہ جو حشرات الارض کی طرح ہر طرف انگریزی سکول پھیلتے پھولتے نظر آ رہے ہیں یہ ختم ہو جائیں گے۔ باقی صرف وہی ادارے رہ جائیں گے جنہوں نے کیمبرج یا اسی طرح کے دوسرے اداروں کے امتحانات کا نظام رکھا ہوا ہے یہ حکومت کی واضح پالیسی اختیار کرنے کا مسئلہ ہے کہ آیا حکومت اس طرح کی صورت حال کو جاری رکھنے کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔

س۔ اگر ان اداروں کو کیمبرج یا دوسرے اداروں سے الحاق کی اجازت دی تو کیا ان میں قومی نقطہ نظر پیدا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

ج۔ صاحب! ایک تو ان کے نصابات وہ نہیں ہیں جو ہمارے ملکی نصابات ہیں۔ ظاہر ہے قومی تشخص تو پیدا نہیں ہوگا یہ تو بڑی واضح بات ہے محض حکومتی نعروں سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مسئلہ اس وقت حل ہوگا جب آپ واضح طور پر یہ طے کریں گے کہ قومی زبان کے سوا آپ کوئی دوسرا میڈیم اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

س۔ انگلش میڈیم اور بڑے بڑے ناموں والے سکولوں کے کرتا دھرتا وہ لوگ ہیں جو عوامی پلیٹ فارم پر قوم کے درد مند ہونے کے دعوے کرتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ باہر تو وہ اسلام اور اردو کی بات کرتے ہیں مگر عملاً وہ انگریزی اور مغربی تہذیب کو پروان چڑھانے کے جتن کر رہے ہیں؟

ج۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ میرے ایک دوست ملکی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے وہ کہنے لگے ہمارا معاشرہ منافقت کا معاشرہ ہے اور جب تک یہ منافقت نہیں جاتی صورت حال کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

س۔ حکومت سرحد نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے مرحلہ وار تمام دفاتر میں اردو کو نافذ کرے گی۔ اگست ۱۹۸۶ء تک یہ مرحلہ مکمل ہو جائے گا۔ اس بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟ اور دوسری حکومتوں کی طرف سے ایسا فیصلہ نہ آنے کا سبب کیا ہے؟

ج۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ اس قومی ضرورت کو سب سے پہلے صوبہ سرحد نے محسوس کیا اور اس کی طرف ایک قدم اٹھایا میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں لیکن ہمارے ہاں ایک خرابی ہے کہ ہم بعض اوقات عمل میں جب کسی چیز کو لاتے ہیں تو آدھی ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ اس مرحلے کے بعد کہ وہ فی الحال تین محکموں میں شروع کر رہے ہیں دوسرے محکموں میں اسے کب رائج کیا جائے گا اس کے لیے بھی ڈیڈ لائن ابھی سے مقرر ہونی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ دفتروں میں اسے رائج کرنے سے کام نہیں بنے گا بلکہ میڈیم کے طور پر بھی جو مسئلہ ہے اسے ہر صوبائی حکومت کو بھی حل کرنا ہوگا اگر وہ یک جہتی اور یکسانی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یونیورسٹیوں میں OPTION دی گئی تھی کہ انٹر میں اردو ہوگی اس کے بعد بی اے تک OPTION دی گئی تھی۔ اس کے بعد ایم اے تک دی گئی۔ مگر آگے جا کر گاڑی رک گئی۔ جب مقابلے کے امتحان کا مسئلہ آیا۔ حالانکہ ان لوگوں کو مقابلہ کے امتحان میں بھی اردو میڈیم کی سہولت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اس طرح پھر سائنس سیکٹر میں بھی اس کا تجربہ کرنے کی ضرورت تھی اور اسے مرحلہ وار رائج کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک زمانے میں اسے ہم نے میٹرک تک لا کر روک دیا۔ پھر انٹر تک پھر بی اے تک۔ اب پھر یہ معاملہ رکا ہوا ہے جب تک ہم یہ طے نہیں کرتے کہ کون سا مرحلہ کب شروع ہو گا۔ محض ایک مرحلے کا اعلان کر دینے سے صورت حال ٹھیک نہیں ہوگی۔ حکومت سرحد نے اردو کو دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے وہ اپنی جگہ مستحسن ہے لیکن اس کے باوجود اگر دفتر میں انگلش میڈیم والے ہی مقرر ہوں گے تو یہ فیصلہ مفید نتائج برآمد نہیں کر سکتا۔ اس لیے سکولوں اور کالجوں میں بھی فوری طور پر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

س۔ اصطلاحات سازی میں یہ رجحان رہا ہے کہ ہم عربی اور فارسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی اس رویے کے حامی ہیں یا آپ کا رجحان علاقائی زبانوں کی طرف ہے؟

ج۔ آپ نے دو تین باتوں کو آپس میں ملا دیا ہے جہاں تک صوبائی زبانوں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اصطلاحات سازی میں ان زبانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور ہم اٹھا بھی رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو اصطلاح ہم بنائیں گے وہ کس طبقے کے لیے ہے؟ اگر تو وہ مستری اور مکینک کے لیے ہے تو ان سیکٹروں کی اصطلاحوں کا ترجمہ وہیں سے آئے گا۔ اگر وہ اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ ہے تو وہاں اصطلاحیں کسی چیز کا باریک فرق ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ وہاں صورت حال بہت پیچیدہ ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ ہمارے ہاں جو اصطلاحات سازی ہو رہی ہے۔ اس میں عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ یہ آسان ہوں حالانکہ اصطلاحیں دنیا کی کسی بھی زبان میں بھی آسان نہیں۔ انگریزی میں بھی نہیں۔ اصطلاحوں کا آسان ہونا کوئی بھی معانی نہیں رکھتا۔ مثلاً جب ہم آڈٹ اور اکاؤنٹس کی اصطلاحیں وضع کرنے لگے اور ان کی معیار بندی کرنے لگے تو ایک لفظ آیا PAY اور دوسرا لفظ SALARY اخباروں میں ان دونوں کا ترجمہ تنخواہ کیا جاتا ہے اگر مالی معاملات میں یہ ترجمہ کریں گے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں آپ آسانی سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم کو PAY کا ترجمہ تنخواہ کرنا پڑا اور SALARY کا ترجمہ مشاہرہ کرنا پڑا کیونکہ SALARY میں دفتری رقمیں بھی شامل ہوتی ہیں اب مشاہرہ کی اصطلاح آسان تو نہیں ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر کی اصطلاح ہے اسے آپ اسی طرح اختیار کر لیں گے۔ اس سے آگے اس کے مختلف حصوں کا کیا کریں گے۔۔ مثلاً PROGRAM MING کو ہی لیجئے۔ عام آدمیوں کے لیے اس کی اصطلاح کچھ اور ہے اور سائنسدان کے لیے کچھ اور ہے۔ اس لیے لازماً جب نازک فرق پیش نظر ہوگا۔ بعض

ڈاکٹر وحید قریشی

تعارف وتبصرہ

محسن بھوپالی کی اس کتاب میں بارہ ادیبوں کے انٹرویو شامل ہیں۔ موضوع اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس بدلتے ہوئے معاشرے میں ادب کو نفع پسندی کی سان پر چڑھا کر دیکھا جاتا ہے اور ادب کا حلقہ اثر روز بروز محدود سے محدود تر ہوتا جارہا ہے اس لیے اگر فیض احمد فیض سیاست دانوں پر گرج برس کر یہ کہتے ہیں کہ کتنی عجیب بات ہے کہ قومی وسائل ارباب سیاست کے تصرف میں ہوتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے ادیب سے کہا جاتا ہے تو پھر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ارباب سیاست کا اثر، ادیب سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے اور ادیب اپنے محدود حلقۂ اثر میں اس بات پر تیغ پا ہے کہ جو اہمیت اسے ملنی چاہیئے اور جو اعزاز حاصل ہونا چاہیئے وہ مل نہیں پاتا تو پھر سیاست دانوں سے اعزاز حاصل کرنے پر ناز کرنے کی کیا ضرورت ہے ؛ اگر دُنیا کے ہر دکھ کا علاج ارباب حکومت کے پاس ہے تو پھر ادیب بیچارے جو پہلے ہی دُکھی ہو رہے ہیں ان سے کسی مسئلے کے حل کی توقع وابستہ کرنا یقیناً ایک عجیب بات ہو گی۔ شاید اسی لیے اخباروں کو چھوڑ کر ادیب کی نگاہ بار بار ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرف اٹھتی ہے اور وہ انہی کو مؤثر ترین ذریعہ ابلاغ سمجھتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے لیے بار بار اپنی اَنا کے خول سے نکل کر دفتروں کے چکر بھی کاٹنے پڑیں گے۔ اس لیے ادیب اگر اب بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو مؤثر ترین ذریعہ سمجھتا ہے تو اسے معاف کر دینا چاہیئے۔ حالانکہ وہ یہ جانتا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نسبت اخبار میں اسے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں سرکاری اختیار کی بنا پر وہ بات کھل کر نہیں کہہ سکتا اس کے لیے اسے بالواسطہ راستے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی وہ جیب کترے کے استاد کے سر پر جناح کیپ پہنا کر قائداعظم سے بدلہ لیتا ہے اور کبھی قاتلوں کے سر پر ایک کوسنے والی قراقلی پہنا کر ملک کی مقتدر ہستی سے بھی آنکھیں چار کر سکتا ہے

ایک بھارتی ادیب نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ پاکستان میں مارشل لا نے بات کئی طریقوں سے کہنے کا سلیقہ عطا کیا جس سے ادب کو فائدہ پہنچا۔ لیکن اس دھرم کانٹے سے قطع نظر ہمارے ہاں یہ عجیب صورت حال رہی ہے کہ ادیب ذمہ داری کو سیاست دانوں پر ڈالتا ہے اور میٹھے میٹھے بیر خود کھانا چاہتا ہے۔ مؤثر کردار کے لیے تو بارہا مؤثر طرز عمل کی ضرورت ہو گی۔ ملکی قیادت نے اگر ظلم وستم کی راہ اختیار کی تھی تو ادیب کو کس نے یہ درس دیا تھا کہ وہ سرکاری ذرائع ابلاغ پر آ کر قومی یک جہتی اور انتشار کے اس کھیل میں شریک ہو جائے۔

ادب کی دنیا میں اس وقت فکر ونظر کے جو تضادات کارفرما ہیں ان کی داستان مشاہیر کے یہ ادبی انٹرویو پوری طرح بیان کرتے ہیں لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ قوم کو یک جہتی عطا کرنے والے اس بات پر تو متفق ہیں کہ دوسروں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اپنی محدودیت کے باوجود ادب اپنا یہ کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بعض مشاہیر نے اختلاف کو انتشار قرار دیا ہے بعض کا خیال ہے کہ انتشار بھی زیادہ ہے اور بکھار بھی زیادہ۔ حکومت کی گائیڈ لائن قومی یک جہتی میں رخنہ اندازی پیدا کرتی ہے تو کیا ادیبوں نے اس کا کوئی مداوا تلاش کیا؟ ادب اگر انتشار سے دوچار ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور اسے قوم کے مستقبل پر اعتماد نہیں، تو پھر قوم ادیبوں پر اعتماد کیوں نہیں کرتی۔ ایک کرم فرما تو اس کی ساری ذمہ داری ادبی منافقت پر ڈالتے ہیں وہ ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر ادارے قومی یک جہتی کی مادی افادیت پر زور دیتے ہیں اور معاشرے کو اخلاقی افادیت کی ضرورت ہے تو کیا ادیبوں نے اس طرح کا کوئی پروگرام قوم کو دیا؟ ہم اس پر برآفروختہ ہوتے ہیں کہ جو اٹھتا ہے ادیبوں کو نصیحت کرنا شروع کر دیتا ہے ان میں کتنے ادیب واقعی ادیب ہیں اور کتنے ادیب نہیں ہیں۔ یہی کھلتے کی یہ ذمہ داری ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے

ہم علاقائیت کا رونا بھی روتے ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں قومی یک جہتی کا نعرہ مسائل حل کرنے کے لیے نہیں مسائل سے چشم پوشی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اتنی بڑی حقیقت کا یہی سادہ حل ہے تو خدا جانے محسن بھوپالی کو کیا سوجھی تھی کہ وہ قومی یک جہتی میں ادب کا کردار ڈھونڈتے پھرتے ہیں معاشرے میں ادب کو اعتبار کیوں حاصل نہیں ؟ اس کا آسان جواب تو یہی ہے کہ ہم اس کی ذمہ داری معاشرے پر ڈالیں یا حکومت پر اور خود ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔ معاشرہ میں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں اور ان کے حل اگر واقعی اتنے سادہ ہیں جتنے ان بارہ ادیبوں نے سمجھ رکھے ہیں تو یہ بارہ آدمی آپس میں کیوں نہیں مل بیٹھتے اور نفرتوں کے اس سمندر کو خود عبور کیوں نہیں کرتے جس میں معاشرہ ہی نہیں ادیب بھی ڈبکیاں لگا رہا ہے۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی اور دائرہ اثر کی محدودیت کو ڈھال بنانے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔ اس کا حل بھی سوچنا ہوگا۔

جب حل کی منزل آتی ہے تو ہر آدمی کا حل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو چھوڑ کر باقی باتوں میں الگ الگ راستے اختیار کر لیتا ہے۔ ایک بڑے میاں اس کا بوجھ حکومت سیاست دانوں پر ڈالتے ہیں، دوسرے کہتے ہیں کہ جمہور کی خواہش اور جمہور کی تحریک سے یہ سب ممکن ہے تیسرے خود ادیبوں کے جھگڑوں کو نظریاتی انتشار کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں اور اس کا حل صوفیانہ ادب میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم آہنگی کا یہ فارمولا سب قبول کر لیں گے۔ اگر ایجاب وقبول کا یہ عمل اتنا ہی آسان ہوتا تو دنیا کا کوئی شخص کنوارا نہ رہتا۔ دو اصحاب ادب کے بجائے زبان کو اور لسانی مسائل کو ملک کی یک جہتی میں حارج قرار دیتے ہیں، ایک کا خیال ہے کہ علاقائی زبانیں علاقائی کلچر کے سہارے یک جہتی قائم کر سکتی ہیں دوسرے اس کی جگہ ادیبوں کو باہم مل بیٹھنے کا سبق دیتے ہیں اور مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اسے آسان سمجھتے ہیں، ایک اور صاحب طبقاتی ناہمواری کو علاقائی سطح پر دوری کا سبب گردانتے ہیں، ایک اور صاحب علاقائی اور قومی زبانوں کے حوالے سے ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کے امتیاز کو ناکافی تجزیہ گردانتے ہیں، ایک صاحب نے قومی یک جہتی میں مخل ہونے والا سبب یہ قرار دیا ہے کہ ہم قومی سطح پر کم اور علاقائی سطح پر زیادہ سوچنے لگے ہیں۔ اسی لیے ان کے خیال میں مشرقی پاکستان کا نکل جانا اسی بنا پر تھا کہ ہم نے یک جہتی کو نعرے کے طور پر استعمال کیا۔

دلوں کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ جو سادہ حل میرے رفقا نے تجویز کیے ہیں ان میں ایک راستہ مذاکرے اور ابلاغ عامہ قرار پایا اور بات وہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ختم ہوئی، ایک بزرگ اپنی دکان الگ لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادیب جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ سب کا سب قومی یک جہتی کا آئینہ دار ہے۔ اگر یہی بات تھی تو رونا کس بات کا ہے، پھر معاشرہ کیوں انتشار کا شکار ہے اور ہم کیوں ایک دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سب اچھا کی یہ جھنڈی دیکھنے میں تو اچھی لگتی ہے لیکن کیا یہ ہمارے دکھوں کا علاج ہے ؟

ان انٹرویوز میں کہیں کہیں زیر زمین ہلکے ہلکے اشارے بڑے مسائل کی طرف بھی ملتے ہیں قومی یک جہتی اور ملی یک جہتی کے مسائل، قومی بقا و استحکام میں زبان کا کردار، معاشرتی تضادات کی باتیں، یہ وہ اصل میدان تھے جن میں ہمارے مشاہیر گہرے نہیں اتر سکے بلکہ ان کے آس پاس تھوڑی دیر ناچ کر ادھر ادھر نکل گئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں میرے دوست محسن بھوپالی نے اپنا نسخہ بھی تحریر کیا ہے اور قوم کی جگہ قومیتوں کی راہ دکھائی ہے۔ ان کی نیت پر شبہ نہیں لیکن اس طرز استدلال سے قومی یک جہتی کس طرح برآمد ہوگی ؟ کتاب کے اندر اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا اس لیے اچھے قارئین کو میں مشورہ دوں گا کہ وہ دیباچے کے بجائے کتاب پڑھے اور اپنا نتیجہ خود نکالے کیونکہ ادب میں یہی راہ عافیت کی ہے کہ اگر ادیب صحیح راستہ دکھائے تو قاری اپنا راستہ خود تلاش کرے اور آخر میں محسن بھوپالی کے لیے دعائے خیر جس نے ادیبوں کو سوچنے کی دعوت تو دی یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ادیب سوچنے کے موڈ میں نہ تھے اور ان کی نگاہیں ٹی وی کے انٹینے میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔

انگریزی زبان کا تسلط

ایسٹ انڈیا کمپنی اور بادشاہ ہند کے مابین ۱۸۰۶ء میں فارسی کو ہندوستان کی دفتری اور عدالتی زبان کی حیثیت سے قائم رکھنے کا معاہدہ طے پا چکا تھا لیکن اس معاہدے کو یکطرفہ طور پر پس پشت ڈال کر ۱۸۳۷ء میں انگریزی کو ہندوستان کی دفتری اور عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ اس میں محض انگریزوں کا مسلمان دشمن رویہ کارفرما نہیں تھا، استعمار مفتوح اقوام پر سب سے پہلے اپنی زبان مسلط کرتے ہیں اور انگریزوں نے بھی یہی کیا۔

انگریزی کے نفاذ سے مستقبل کے ہندوستان میں برطانوی راج کی ایک اہم ضرورت کو بھی پورا کرنا مقصود تھا۔ یہ ضرورت تھی انگریزی زبان میں مہارت رکھنے والی ایک ایسی وفادار ہندوستانی مڈل کلاس اور بیوروکریسی کی جو سفید آقاؤں اور کالے غلاموں کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دے سکے۔ آج بھی عوام پر حکمرانی کرنے والی نوکر شاہی اسی دور کی پیداوار ہے۔

انگریزی زبان کے نفاذ سے ہندوستان کی تمام زبانوں کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں لیکن اس کی سب سے کاری معاشی ضرب مسلمان مڈل کلاس پر پڑی۔ زمینداری اور فوج کی نوکری پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اب سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں بھی روزگار کے امکانات ختم ہو گئے۔ نتیجتاً وہ انگریزی زبان سے خفت محسوس ہو گئے۔ نئی صورتحال سے عدم آگہی کے باعث مسلمان تعلیم، روزگار اور کاروبار کے شعبوں میں پسماندگی اور محرومی کا شکار ہو گئے یہ صورتحال تقریباً ایک صدی بعد الگ وطن کے نعرے اور بالآخر ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوئی۔

برصغیر میں آج زبانوں کے جو بھی مسائل ہیں انہیں ڈیڑھ سو سال قبل کے ہندوستان پر انگریزی زبان کے نفاذ کے فیصلے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آج کی ترقی یافتہ زبانیں وہ ہیں جنہیں پچھلی دو صدیوں کے دوران میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمونے کے مواقع ملے۔ انگریزی کے تسلط نے مقامی زبانوں کو ان مواقع سے محروم کر دیا۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ ان زبانوں کے بولنے والے انگریزی کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو کر اس سے مرعوب ہو گئے لیکن ان کا احساس محرومی اور غصہ ایک دوسرے کی زبانوں سے تعصب کی شکل میں آج سامنے آ رہا ہے۔

جنگ کراچی ۱۳ مئی ۸۷ء

Reverting to English as the medium of instruction

KHALID HYDER

In a recent television programme, the Education Minister Mr. *Nasim Ahmad* Aheer has said that the Government did not want to pursue a dual system of education which benefited the privileged class and neglected the poor. Acknowledging the fact that the A and 0 level schools were creating a second nation, he nevertheless added that 5500 such schools were catering for 1.3 million students, and obviously such schools could not be closed down abruptly. The Minister also said that people were inclined towards the English language, and wished to get their students admitted in English medium schools.

As a nation we are singularly unfortunate in the fact that we have no language that we can rightly call our own. Urdu is said to be the national language, but it is not accepted as such by the people who matter in running the affairs of the state.

Why are our intellectuals and highly placed persons so fond of the English language? Perhaps 200 years of British rule has everything to do with it, but now after 40 years of independence, we should have been able to get our bearings straight. One cannot really blame the parents of the 1950s for endeavouring to enrol their children in English medium missionary schools. The British had just left, and the 'Kala Sahib' who stepped into his shoes was even more 'Pucca' than the British ever were. Naturally, the officer class at that time comprised entirely o[illegible] own people in 'topis' with an Oxford accent, and if anyone wanted to join their cadre, he bloody well had to be more English than the English.

But as time wore on, and more 'natives' moved into positions of power, we started looking for our roots, and developed a greater yearning to be ourselves. The movement for a national language, a national dress and 'Lok virsa' all took root — and the nationalisation of schools was part of the phenomenon. A very major step in this regard was the decision taken in 1979 to switch over to Urdu as a medium of instruction in all the Government educational institutions.

Although the Anglophiles among us had to bow before the national desire, they were made of sterner stuff, and left some lacunae through which discrepancies could be found, which called for the re-examination of the decision. Thus schools which were affiliated with foreign colleges and universities continued to keep English as a medium of instruction. This foul act was the greatest disservice that could be inflicted on the cause of national integration - and its effects will be very difficult to eradicate. The seeds for a second nation were laid — with eighty per cent of the population of the country which lives in rural areas left to speak a different language — while being ruled by the English speaking minority from the cities. In a manner of speaking, the resultant confusion was similar to what is happening in South Africa, where the white minority has stifled the black majority.

There is no doubt that English is an international language and is spoken in many major countries of the world. But to say that English is the language of science and technology is preposterous, to say the least. The Japanese, the Germans, the French and the Russians have not become the leaders in the field of science and technology through the use of English - they have found their own languages quite suitable for the purpose. In fact it is the English speaking countries that are lagging behind in this field. Science and mathematics is a language in itself, and does not need the medium of English to prop it up. On the home front none of our world famous scientists studied in English-medium schools. Neither have English medium schools produced our soldiers and statesmen. They have all been educated in the 'taat' schools that still abound in the rural areas. Studying in an English-medium school is not a guarantee for brilliance and fame, for these schools also produce more than their share of dropouts and failures. The proposal to teach science subjects in English in the Government controlled educational institutions has also been floated by the same vested interests, who would not like their wards to compete with the rest of the nation. Rather, they would prefer to bring up their children in a sterilised environment, where the children of the common man cannot enter.

The Urdu language should not be blamed for the malaise that has overtaken our educational system. It is the half hearted implementation that is responsible — right from the extreme lethargy shown in translation of the syllabus into Urdu, to the indifference towards duty by the teaching staff of Government educational institutions. By reverting to English, and by allowing private English-medium schools to flourish, we will be denying eighty per cent of our population the right to take part in national integration and development. Our rural areas will be doomed to remain ignorant and backward, for we will never be able to field the required number of English qualified teachers for our rural millions. As it is, we hardly have enough qualified Urdu medium teachers who are willing to go and teach in the village schools.

Another evil that is being overlooked is that although English may bring science and technology to the country, it will also bring alien thoughts and culture from the permissive English speaking countries of the West. On one side we are trying to inculcate Islamic ideals and thoughts among the people, and on the other the English language is inducting Western thoughts, literature, audio and video cassettes, vulgar songs and dances and all the other paraphernalia that follows from aping the negative values of the West. (The positive values of Western society i.e. hard work and dedication are hardly reflected in the films and books that we see here.)

The spate of English-medium schools that have flooded the country are proof of the fact that, if given a choice, the average Pakistani would prefer to have his child educated in English-medium schools. Even a person with a salary of Rs 1500 per month is willing to shell out the exorbitant fees of these English-medium schools, just so that his child can be educated in a 'sahib's' school. Parents are willing to scrimp on their food, clothing and other necessities, so that their child can get a better deal in life. As if the English language is a magic potion to grant instant prosperity and fame to all those who speak it. What these downtrodden, poor people do not realise is that they are doing their child a great disfavour by putting him where he does not 'belong'. The unfortunate child of poor parents who enters an A or 0 level school in fact enters a different world, where children come to school in limousines, wearing the latest dresses from the Continent, Walkman's strapped to their ears, with rings on their fingers and bells on their toes. The child fathered by poor parents obviously cannot compete with this 'hip' crowd, most of whom have their own cars by the age of 16. So he adopts the easy way out for compatibility, which is the way of the Kalashnikov and the holdup. Out of the 1.3 million children being educated in these English medium schools where 'seek the loot' is the hidden motto, 10 per cent will be maladjusted, complexed, dangerous delinquents who will not stop at anything to raise their status in life in the shortest possible time.

The government had taken a very bold step in 1979 for switching over to Urdu as the medium of instruction for Government educational institutions. But instead of implementing the decision, and translating the syllabi of colleges and universities into Urdu, the concerned departments tried to search for loopholes in the new ruling. This resulted in the emergence of English-medium private schools, which besides having made an enormous profit over the last eight years, have also compelled the Government to review its decision.

Urdu could have, and still can, become the medium of instruction for our schools, so that the children of the whole country can be brought on the same platform, with the same opportunities towards advancement. English is not the language of science and technology — as science is a language in itself. If the Osmania University of Hyderabad Deccan could translate the science syllabi into Urdu, then there is no reason why we cannot do the same. The capability is there, but the spirit is weak. — NPT

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۷-۴-۸۷

ماہنامہ

اخبار اُردو

اسلام آباد

ڈاکٹر وحید قریشی

مدیر مسئول

شریف کنجاہی

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ٥ اسلام آباد

جلد ۴
شمارہ ۹

ستمبر
۱۹۸۷ء

ابتدائیہ

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جس میں سائنسی علوم کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ سائنس ہمارے ہاں ابھی ابتدائی تجرباتی مراحل سے گزر رہی ہے۔ سائنسی پیش رفت، مستعار ٹکنالوجی، وسائل کی کمی اور غیر ملکی مشیروں اور صلاح کاروں کے تسلط سے رہائی کے بغیر ممکن نہیں۔ سائنسی پیش رفت کے امکانات کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ خود پاکستانی سائنس دان میدان میں اتریں اپنی ملکی ضرورتوں کا تعین کریں اور اس کی روشنی میں مغرب سے آنے والے علوم کا خیر مقدم بھی کریں اور اسے اپنی ضرورتوں کے تابع کر کے قومی مزاج کے مطابق ڈھالنے کی سعی بھی کریں۔ یہ دو طرح ممکن ہے:

اول اس طرح کہ سائنس کو بدیسی زبان کے توسط سے پڑھ کر آنے والی نسلوں کو فکری طور پر بانجھ بنانے کی بجائے ہم انہیں اپنی قومی زبان کے وسیلے سے علم کو ہضم کرنے اور پھر اپنے حالات کے مطابق برتنے کا سلیقہ بھی عطا کریں۔ صلاحیتوں کی جلد اور مؤثر پیش قدمی اسی وقت ممکن ہے جب ہم سائنس کے صرف استاد تیار کرنے کی بجائے سائنس دان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو، اردو سائنس بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان اسی احساس کے نتیجے میں سائنسی علوم کو جلد از جلد اردو میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرے ہم مغربی علمی سرمایے کے صرف ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیں جو ہمارے ملک کے لیے زیادہ کار آمد اور مفید ہیں۔ جاپان نے سائنسی علوم میں اسی "انتخابیت" کی مدد سے ترقی کی۔ انہوں نے جدید ٹکنالوجی کے وہی پہلو اختیار کیے جو ملکی ضرورتوں کے لیے ناگزیر تھے۔ اب انتخاب کا عمل سائنس میں اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ذخائر علمی میں اضافے کی رفتار پہلے سے کئی گنا زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ اب کوئی ملک بھی تنہا سائنسی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے دنیا میں علم کا زبردست دھماکہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے اور تو اور خود انگریزی زبان بھی پچاس فیصد سرمائے کی دعویٰ دار رہ گئی ہے۔ دنیا بھر کا باقی علم جرمنی فرانسیسی، روسی، چینی اور جاپانی زبانوں کے توسط سے آ رہا اس لیے فی الوقت ضرورت ہے کہ اعلیٰ سطحوں پر سائنسی تدریس کے ساتھ ساتھ دوسری اہم زبانوں کی تدریس کا بھی مناسب بندوبست کیا جائے۔ ضروری ہے کہ سائنس کا ہر طالب علم کم از کم دو یا تین زبانیں ضرور سیکھے بلکہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی تدریس کو ایم ایس سی کی سطح پر سائنسی تعلیم کے لیے لازم قرار دیا جائے یا پھر پی۔ ایچ۔ ڈی / اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے والوں پر پابندی لگائی جائے کہ وہ انگریزی کے علاوہ کم از کم دو غیر ملکی زبانوں کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد بیرون ملک جائیں۔ جب تک سائنسی علم کے باقی پچاس فیصد دروازے ہم اپنی قوم پر نہیں کھولتے، ہمیں جلد از جلد انگریزی کے توسط سے حاصل ہونے والے سرمائے کو قومی زبان میں ضرور منتقل کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہمارے طلبہ جو سائنسی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس جدید ترین ذخیرے سے بھی آگاہی حاصل کر لیں اور اردو ذریعۂ تعلیم کی وساطت سے تصورات کی تفہیم اپنی زبان میں کر سکیں کیونکہ غیر زبان کے وسیلے سے حاصل شدہ علم تو صرف مواد کی حد تک ہے جسے ہم اکثر یاد کرتے اور اگلتے چلے جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہم انکشافات اور ایجادات کی صلاحیت ابھی تک حاصل نہیں کر پائے اور آئندہ بھی اگر انگریزی ذریعۂ تعلیم" پر منحصر رہے تو اس نعمت سے ہمیشہ محروم ہی رہیں گے۔ سائنسی علوم کے لیے شاعرانہ پیرایۂ اظہار نہ مفید ہے نہ کار آمد۔ سائنس کی زبان اور اسلوب بیان تو غیر شاعرانہ اور علمی ہی ہو گا اردو زبان کے یہ سانچے ماضی میں بہت کم برتے گئے ہیں۔ جیسے جیسے مطالب کے نئے نئے پرت استعمال میں آتے جائیں گے سائنس کی اپنی زبان اور اپنا محاورہ بنتا جائے گا۔ کثرت استعمال سے اسلوب کے کھردرے پہلو خود بخود ہموار ہو جائیں گے اور زبان کی پوشیدہ صلاحیتیں نکھر جائیں گی۔ اردو ایک باثروت اور صلاحیتوں سے مالا مال زبان ہے لیکن اس کی مخفی قوتوں سے ابھی تک پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

استعمال کے مرحلے میں پہلے پہل زبان کھردری اور اکھڑی اکھڑی تو ضرور ہو گی، بعض پیرائے نامانوس بھی ہوں گے (بلکہ سائنسی ضرورت کے تحت ابتدا میں تو انگریزی اردو کی "کھچڑی" بھی پکے گی) لیکن آگے چل کر اس میں خود بخود توازن کی راہ نکل آئے گی۔ یہ کام ادیبوں کا نہیں سائنس کے ماہرین کے کرنے کا ہے، سائنسی زبان کا اسلوب وہ خود بنائیں گے۔

ڈاکٹر انور سدید

اُردو بطور قومی زبان

اردو کے دیرینہ مہرم فرما ڈاکٹر محمد باقر نے جنگ (۱۰ فروری) میں قومی اسمبلی کی ۸ فروری کی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک خاص رکن اسمبلی نے وہاں انگریزی میں تقریر کی تو ہنگامہ برپا ہو گیا سردار آصف احمد علی نے فرمایا کہ "اردو اور انگریزی صرف دفتری سرکاری زبانیں ہیں میری مادری زبان پنجابی ہے۔"

ان کی حمایت کرتے ہوئے سید ظفر علی شاہ نے کہا کہ "جب قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ ہماری قومی زبان اردو ہو گی تو پاکستان میں فساد ہو گیا تھا۔ اردو ہماری قومی زبان نہیں ہے۔"

ڈاکٹر باقر صاحب نے ۱۹۷۳ء کے آئین کا حوالہ بھی دیا ہے جس کے مطابق پاکستان اسمبلی کی سرکاری یا دفتری زبانیں انگریزی اور اردو ہیں اس آئین میں یہ بھی درج ہے کہ "آئندہ پندرہ سالوں کے اندر یعنی ۱۹۸۸ء تک سارے پاکستان کی دفتری زبان اُردو کر دی جائے گی۔

قومی اسمبلی سے اب جو قومی زبان اُردو کے خلاف آواز اٹھی ہے تو خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وطن عزیز میں بعض اصحاب کا ذہن اُردو کی حیثیت کے بارے میں شاید صاف نہیں اور آئین ۱۹۷۳ء کے مطابق سرکاری سطح پر پورے پاکستان میں اس کے نفاذ کا وقت قریب آ رہا ہے تو چند نئے شاخسانے کھڑے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور قائداعظم کے ارشادگرامی کو بھی پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے سے پہلے قائداعظم نے اس مسئلے کے تمام عواقب کا تجزیہ بخوبی کیا تھا اور اس کے نقوش ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں جلسہ عام کی تقریر سے بھی آشکار ہوتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ "ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ اُردو ہی ہو گی۔"

اُردو پر حضرت قائداعظم کا ایقان اتنا پختہ تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا کہ "اردو زبان ہے۔ جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب ترین ہے یہ بات بھی اردو کے حق میں جاتی ہے اور یہ بہت اہم بات ہے کہ بھارت نے اردو کو دیس نکالا دے دیا ہے حتیٰ کہ اُردو رسم الخط کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔"

اس تقریر میں بھی قائداعظم نے اُردو کو پاکستان کے اتحاد کی زبان قرار دیا اور فرمایا کہ "اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اُردو اور صرف اُردو ہے۔"

قائداعظم برصغیر کے حقیقت پسند مدبر اور سیاستدان تھے انہوں نے اپنے فیصلے کو ٹھوس اور وزنی دلائل کی اساس فراہم کی اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے قومی اور سرکاری زبان کو صوبائی زبان کا حریف بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس بات کا بھی برملا اظہار کیا کہ "اس صوبے (مشرقی پاکستان) میں دفتری استعمال کے لیے اس صوبے کے لوگ جونسی زبان بھی چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ خالصتاً اس صوبے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق حل ہو گا۔"

اس کشادہ نظر اعلان اور صوبائی زبان کو صوبے میں دفتری استعمال کی اجازت دینے کے بعد جب اُردو زبان کا مسئلہ آیا تو انہوں نے اسی جلسے میں ایک مرتبہ پھر ببانگ دہل فرمایا کہ "البتہ پاکستان کی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اُردو ہے اُردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔"

میں نے قائداعظم کے ارشادات کا حوالہ اس لیے دینا ضروری سمجھا کہ جن

امور کے فیصلے وہ خود اپنی زندگی میں فرما گئے تھے انہیں دوبارہ چھیڑنا قومی مفاد میں نہیں ہے قائد اعظمؒ کی یہ عظمت تھی کہ انہوں نے متذکرہ بالا آرا کو اپنی ذاتی رائے کہا اور اس طرح دستور ساز اسمبلی کی خود مختار حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کی دوسری طرف جب ۱۹۷۳ء میں اردو کو قومی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے تو بعض ارکان کا یہ سوال کرنا کہ "اردو کو قومی زبان کس نے بنایا ہے ؟" بے حد مضحکہ خیز ہے۔

چنانچہ یہاں ایک دفعہ پھر حضرت قائد اعظم کے الفاظ دہرانے کی ضرورت ہے انہوں نے بنگالی زبان کی صوبائی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر کوئی غلط یا پریشان کن اثر پڑنے والا ہے بالآخر اس صوبے کے لوگوں کو ہی حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اس صوبے کی زبان کیا ہوگی لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو اور اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں، جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔"

مقام افسوس ہے کہ حضرت قائد اعظم کی اس آواز کو نظر انداز کر دیا گیا اور ایک سے زیادہ زبانوں کو قومی درجہ دینے سے جو انتشار پیدا ہوتا ہے اس پر متحدہ پاکستان میں پوری توجہ نہ دی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کا ایک بازو ٹوٹ گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ قائد اعظم کے اس بیان پر مشرقی پاکستان کے لوگ بھڑک اٹھے تھے اور ان کی خواہشات کے مطابق ہی بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا لیکن ہم زبانی میں جو رخنہ پڑ گیا تھا اس نے ہم خیالی اور ہم دلی میں بھی رکاوٹ پیدا کی اور ملک دولخت ہو گیا لیکن اس وقت قائد اعظم زندہ نہیں تھے اس لیے وہ اپنے پیغمبرانہ الفاظ سے انحراف کرنے والوں کا حشر دیکھ نہ سکے چنانچہ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قائد اعظم نے تو اپنے تجربے اور تجزیے کی اساس پر قوم کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا پاکستان کو باہم متحد رکھنے کے لیے اس کے لیے ایک قومی زبان کی تجویز پیش کی تھی ان کے ارشاد کو اگر اس وقت درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور سقوط ڈھاکہ کی ذلت گوارا کر لی گئی تو اب یہ امر اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے فرمان کا احترام کیا جائے اور بچے کھچے پاکستان کے لیے ان کی تجویز کردہ قومی زبان کی منظور شدہ قومی حیثیت کو قائم کیا جائے اور اس کے نفاذ کی معینہ تاریخ کی پابندی کی جائے۔

ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے نفاذ اردو کے عمل کو آسان بنانے کے لیے چند بے حد مفید تجویزیں پیش فرمائی ہیں اس ضمن میں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ مقتدرہ قومی زبان نے نفاذ اردو کے عمل کو تیز تر اور ممکن بنانے کے لیے گذشتہ چند سالوں کے دوران اتنا کام کر ڈالا ہے کہ اب اس کے فوری نفاذ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں اردو میں کام کاج کرنے کے لیے عمدہ اور موزوں الفاظ کا ایک قابل قدر ذخیرہ فراہم کر دیا گیا دفتری اصطلاحات کے نہ صرف تراجم اب دستیاب ہیں بلکہ ڈاکٹر وحید قریشی نے مقتدرہ کے زیر اہتمام ایک خودکار عمل بھی بنا دیا ہے چنانچہ مختلف دفاتر سے انہیں جو مسائل بھیجے جاتے ہیں ان کے فوری حل کی تدبیر کی جاتی ہے۔

نفاذ اردو کے سلسلے میں اردو ٹائپ کے متفقہ کلیدی تختہ کی عدم دستیابی کو بھی ایک رکاوٹ قرار دیا جاتا ہے تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب یہ کلیدی تختہ نہ صرف طے پا چکا ہے بلکہ ٹیلی فون انڈسٹری پاکستان نئے ٹائپ رائٹروں کو عام فروخت کے لیے پیش کر رہی ہے اور انگریزی ٹائپ کے مقابلے میں بہت کم قیمت پر فروخت کئے جائیں گے میری اطلاع کے مطابق اس کی قیمت پندرہ سو روپے سے بھی کم مقرر کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر نے درست فرمایا ہے کہ انشا اور سودا جو زبان لکھتے تھے اس کا بیشتر حصہ آج متروک ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر طرح کی اردو چلنے دی جائے اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ انشا نے خود بھی زبان کو مستعمل خج اور جامد بنانے کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا ہے خواہ وہ عربی کا ہو یا فارسی، ترکی، سریانی، پنجابی اور پوربی کا از روئے اصل غلط ہو یا صحیح اگر اصل کے مطابق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے کسی زبان کی تعمیر و تشکیل کے لیے اس سے زیادہ کشادہ نظری شاید کسی ماہر زبان نے استعمال نہیں کی اور خوش آئند بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو زبان کی جو نئی ہیئت ترکیبی عمل میں آ رہی ہے اس میں سندھی، پشتو، بلوچی اور پنجابی کے بہت سے الفاظ امتزاجی صورت میں یوں شامل ہو گئے ہیں کہ یہ اجنبی نظر نہیں آتے بلکہ اردو کا ہی حصہ دکھائی دیتے ہیں اور یہ ایسی زبان ہے جو خیبر سے کیماڑی تک پوری طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے اور بین العلاقائی خدمات قومی سطح پر انجام دے رہی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اردو کی حریف صوبائی زبانیں نہیں ان میں بین دین کا سلسلہ تو صدیوں سے جاری ہے اردو انہی مقامی بولیوں کی امتزاجی صورت ہے اس کی قومی حیثیت کو سب سے بڑا خطرہ انگریزی زبان کی طرف سے ہے جسے بلا وجہ اور بلا جواز قوم پر مسلط کر دیا ہے اس ضمن میں بھی اب اہل علم اس بات پر آمادہ ہیں کہ ٹیکنیکی علوم اور سائنسی مطالعے کے لیے اسے جزوی طور پر قائم رکھا جائے اسے لازمی طور پر جاری رکھنے کے بجائے اختیاری حیثیت دی جائے جنگ وزم اور مقتدرہ کے حالیہ سیمینار میں انگریزی کے خلاف سب سے زیادہ ردعمل نوجوان طلبہ نے ظاہر کیا چنانچہ وفاقی وزیر تعلیم نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو طلبہ انگریزی نہیں پڑھنا چاہتے انہیں مجبور نہیں کیا جائے گا چنانچہ اب ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ نفاذ اردو کی مہم تیز کی جائے تو اس کے ساتھ ہی انگریزی کی اختیاری حیثیت کا فیصلہ بھی جلد از جلد نافذ کیا جائے۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ ۱۵ جون)

وزیراعظم جونیجو کی تقریب کی

جھلکیاں

- اردو کو ترجیح دینے کی ہدایت
- لکھی ہوئی تقریر کی بجائے فی البدیہہ خطاب
- سرعام بیوروکریسی سے جواب دہی

اسلام آباد ۷ مئی (رپورٹ اداریہ اے پی پی) وزیراعظم محمد خان جونیجو نے ہدایت کی ہے کہ آئندہ ایسی تمام تقاریب میں جہاں غیر ملکی مدعو نہ ہوں قومی زبان اردو کو ترجیح دی جائے اور صرف ایسی تقاریب کی کارروائی انگریزی زبان میں کی جائے جہاں غیر ملکی مدعو ہوں وزیراعظم نے یہ بات آج وفاقی وزارت پیداوار کے کونسل ٹیکنیکل سیل کے زیر اہتمام ایک سیمینار کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی

○ وزیراعظم نے اپنی لکھی ہوئی تقریر ایک طرف رکھ دی اور کہا کہ اس تقریب میں جو سفارشات پیش ہوئی ہیں اور مقالے پڑھے گئے ہیں اور جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے ان پر وہ خود سوال جواب کا ایک سیشن کرنا چاہتے ہیں وزیراعظم نے بھی حاضرین کو اس وقت سخت حیرت زدہ کر دیا جب انہوں نے تقریب میں موجود وفاقی سیکرٹری صنعت کو چند مسائل پر جواب دینے اور وضاحت کرنے کو کہا انہوں نے تقریب میں موجود ادارہ بیرون ملک پاکستانیوں کے سربراہ بریگیڈیئر ریٹائرڈ منصور ملک سے بھی سوال کئے اور کہا کہ وہ ڈائریکٹر جنرل محکمہ فون رہے ہیں اس لئے وہ بھی وضاحت کریں۔

○ وزیراعظم کے خطاب کرنے سے قبل لاہور سے مائیکرو الیکٹرانک انٹرنیشنل کے سربراہ مسٹر سہیل نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا تھا کہ ملک میں کیلکولیٹر تیار ہو سکتے ہیں مگر ان کے پرزوں پر ڈیوٹی اس قدر زیادہ ہے کہ ان پرزوں سے تیار ہونے والا کیلکولیٹر باہر سے ڈیوٹی فری آنے والے کیلکولیٹر کی قیمت سے تیس چالیس روپے کم میں فروخت ہو سکتا ہے انہوں نے کہا کہ اس تضاد کا ازالہ ہونا ضروری ہے۔

○ وزیراعظم جونیجو نے کہا ہمارے ہاں ماضی شاہد ہے کہ بسم اللہ تو اچھی ہوتی ہے مگر پھر جلد امیر بننے کا چکر شروع ہو جاتا ہے صنعت کار معیار گرا دیتے ہیں اور تعداد پیداوار بڑھا دیتے ہیں اس طرح خرابی جنم لیتی ہے انہوں نے کہا کہ معیار کی نگرانی از حد ضروری ہے۔

○ وزیراعظم نے کہا کہ مسٹر سہیل نے جب کہا کہ ان کو ملک میں صنعت لگانے کی اجازت ایک ہفتے میں مل گئی تو ان سے سوال کیا گیا کہ آخر یہ سب کیسے ہوا اس کا مقصد یہ تھا ہمیں بھی بتاؤ کہ ایسا کیسے ہو گیا اس پر ایک قہقہہ پڑا

○ وزیراعظم نے کہا کہ وہ کھلے دل سے اس تقریب میں آنا چاہتے تھے تاکہ سب کی باتیں سنیں کھل کر باتیں ہوں انہوں نے کہا اس قسم کی تقاریب کے مسائل ایسے نہیں ہوتے کہ اچھا دیکھیں گے ان پر جلد فیصلہ ضروری ہوتا ہے انہوں نے سیمینار کے شرکاء کو یقین دلایا کہ وہ ان کی سفارشات کا جائزہ لیکر جلد فیصلہ کریں گے

○ وزیراعظم نے کہا کہ ملک میں صنعت ترقی کرے گی تو ملک کو بھی فائدہ ہو گا اسی لیے وہ صنعت کاروں کو بھی ساتھ لیکر چلنا چاہتے ہیں باوجود یکہ وہ بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہیں۔

○ وزیراعظم جونیجو نے کہا کہ اگر حکومت حوصلہ افزائی کرے گی تو آپ آگے بڑھیں گے ملک کی صنعت ترقی کرے گی اور بار بار آمدات کا بدل بھی پیدا ہو گا انہوں نے کہا کہ ہم جلد فیصلہ کریں گے اور آپ کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے

○ وزیراعظم جونیجو نے آج جس طرح تقریب میں فیصلے کے اور بیوروکریسی کے ارکان سے وہاں ہی باز پرس کی اور جواب دینے کو کہا اس طریقہ کو بھی شرکاء نے بے حد سراہا، لوگوں نے کہا کہ وزیراعظم کو ماضی میں ہر چیز سے بے خبر رکھا جاتا تھا اب وہ اس تقریب میں آئے انہوں نے مسئلے سنے تو ان کو جاننے کا موقع ملا ہے وہ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان میں صنعت ترقی ہو اسی لئے انہوں نے آج کی تقریب میں یہ عمل اپنایا ہے اور اگر آئندہ بھی ایک دو جگہ انہوں نے ایسا کیا تو بیوروکریسی کا دماغ درست ہو جائے گا اور وہ تقریبات میں جواب دہی کے خوف سے فیصلے بروقت اور صحیح کیا کریں گے اور خواہ مخواہ روڑے نہیں اٹکائیں گے۔

○ وزیراعظم نے وفاقی سیکرٹری صنعت مسٹر ایم اے کاظمی سے کہا کہ وہ بتائیں کہ اس مسئلہ پر ابھی تک فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا وفاقی سیکرٹری نے وزیراعظم کو بتایا کہ ایک کمیٹی اس امر کا جائزہ لے رہی ہے اور چند روز میں فیصلے سے وزیراعظم کو آگاہ کر دیا جائے گا وزیراعظم نے سوال کیا یہ کمیٹی کب سے اس معاملے کا جائزہ لے رہی ہے تو سیکرٹری نے کہا کہ اس سال جنوری سے وزیراعظم نے کہا کہ وہ یہ بات عرصے سے سن رہے ہیں بہرحال اس امر کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ آخر اجازت ملنے میں کیا قباحت ہے۔

○ وزیراعظم نے مسٹر سہیل سے دریافت کیا کہ وہ اس سلسلے میں کیا تدابیر پیش کرتے ہیں کہ اجازت کا غلط استعمال نہ ہو تو مسٹر سہیل نے کہا کہ صنعت کار بانڈ بھر دیں اور حکومت جب ڈیوٹی فری خام مال منگوائے تو اس کی کھپت کا جائزہ لینے کیلئے اپنے نمائندے مقرر کر دے کیونکہ کیلکولیٹر بنانے والے پرزے وی سی آر بنانے میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں

○ وزیراعظم نے اعلان کیا کہ وہ ملک میں کیلکولیٹر بنانے کی تجویز کا جائزہ لینے کیلئے ایک کمیٹی بناتے ہیں وزیر صنعت اس کے انچارج ہیں یہ کمیٹی کیلکولیٹر بنانے کیلئے خام مال کے غلط استعمال کو روکنے کیلئے تجاویز دے تاکہ ملک میں کم قیمت کیلکولیٹر تیار ہو سکیں اس اعلان کا سبھی نے زبردست خیر مقدم کیا۔

○ وزیراعظم نے مسٹر سہیل سے دریافت کیا کہ آخر کتنے افراد کیلکولیٹر بنا سکیں گے اور یہ صنعت کیسے پھلے پھولے گی مسٹر سہیل نے بتایا کہ کیلکولیٹر بنانے کیلئے صرف پرزے جوڑنے کی ضرورت ہے کیلکولیٹر تیار کرنے کی کوئی تعداد نہیں ہے ہانگ کانگ کی ایک کمرہ کی فیکٹری میں چھ لڑکیاں پرزے جوڑ کر ایک ہفتے میں دس ہزار کیلکولیٹرز تیار کرتی ہیں یہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے ریڈیو ٹی وی حتیٰ کہ ٹیلی فون کی صنعت سے تعلق رکھنے والے ادارے بھی یہ کام آسانی سے کر سکیں گے۔

○ وزیراعظم جونیجو نے ادارہ اوورسیز پاکستانی کے سربراہ بریگیڈیئر منصور ملک سے کہا کہ وہ یہ بتائیں کہ جب وہ محکمہ ٹیلی فون کے سربراہ تھے تو انہوں نے اس صنعت میں الیکٹرانک کے تعارف اور کیبل وغیرہ بنوانے کیلئے کیا کام کیا ہے

○ بریگیڈیئر منصور ملک نے وزیراعظم کو بتایا پاکستان کے محکمہ ٹیلی فون میں بہت ترقی ہوئی ہے اور ۲۵۶ لائنوں کا پی اے بی ایکس اب صرف ملک میں ہی تیار ہو رہا ہے یہ نجی شعبے کے پاس ہے اس کے ساتھ ساتھ کیبل بنانے کا کام بھی نجی شعبہ میں شروع کر دیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ اس بارے میں کینیڈا اور کئی دوسرے ممالک کا ہم پر سخت دباؤ رہا ہے کہ ہم یہ فیصلہ نہ کریں مگر ہم نے دباؤ تسلیم نہیں کیا اور اب یہ ایکسچینج پاکستان میں ہی تیار ہو رہے ہیں زیادہ لائنوں کے ایکسچینج کی تیاری کے سوال پر انہوں نے وزیراعظم کو بتایا کہ وہ اپنی سفارشات حکومت کو بھجوا چکے ہیں مگر ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔

○ وزیراعظم نے کہا کہ جب ہمارے ملک میں فنی صلاحیت رکھنے والے افراد موجود ہیں تو ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے انہوں نے کہا کہ وہ وفاقی وزارت مواصلات کے سیکرٹری سے کہیں گے کہ وہ اب ٹیلی فون کے موجودہ سربراہ وزارت اطلاعات کے افسر وغیرہ مل کر اس بارے میں جلد کوئی حتمی فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ وہ اس مسئلے پر ایک طویل بریفنگ بھی لینا چاہیں گے۔

روزنامہ مشرق پشاور ۸ مئی ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر سہیل بخاری

اُردو زبان کا مقدمہ

ہمارے وطن میں دوست داران اُردو کو یہ شکایت ہے کہ اُردو اگرچہ ہمارے ملک کی قومی زبان ہے لیکن اسے قومی زبان کا مقام نہیں مل پا رہا ہے قیام پاکستان کے بعد بدیسی حاکموں کی جگہ تو دیسی حاکموں نے لے لی ہے لیکن اُردو ابھی تک بدیسی زبان یعنی انگریزی سے اپنی کرسی خالی نہیں کرا پائی ہے دفتری مراسلت اور دوسری تحریروں میں اس کا استعمال عام نہیں ہو پایا ہے۔ اردو کو واحد ذریعہ تعلیم بھی قرار نہیں دیا گیا اسے اعلیٰ اور مقابلے کے امتحان کا ذریعہ بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ کبھی کبھی اپنے ہم وطنوں میں جذباتی گرمی پیدا کرنے کے لئے قائدِ اعظم مرحوم کا یہ فیصلہ دُہراتے رہتے ہیں جو انھوں نے قیام پاکستان کے وقت ہی فرما دیا تھا کہ "پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی"

دوسری طرف اہل وطن میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انگریزی کو اُردو پر ترجیح دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اور ہم پاکستانی دنیا کی دوسری قوموں سے الگ تھلگ رہ کر ترقی نہیں کر سکتے اس لیے انگریزی لکھنا پڑھنا ہمارے لیے ناگزیر ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ ہمیں کس حد تک انگریزی کو اپنانا ضروری ہے، وہ اس بات کا جواب بھی نہیں دے پاتے کہ چین، جاپان، روس، فرانس اور جرمنی وغیرہ نے جو ترقی کی ہے وہ اپنی اپنی ملکی زبانوں کے ذریعے سے کی ہے یا انگریزی کی مدد سے؟ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ چھوٹی جماعتوں کی حد تک تو اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے لیکن اعلیٰ جماعتوں میں خصوصاً علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے انگریزی سے امداد طلب ہونا لازمی ہے کیونکہ اُردو میں علوم جدیدہ کی اصطلاحات نہیں ہیں یا کافی نہیں ہیں۔

اسی سلسلے میں انگریزی کے بعض حامی دیدہ و دانستہ اُردو اور علاقائی زبانوں میں باہمی آویزش و اختلاف پیدا کرنے کی بھی کوشش کرنے لگتے ہیں جو بالکل مہمل سی بات ہے اور اس سے ان کی نیت کا فساد ظاہر ہوتا ہے کیونکہ قومی اور علاقائی زبانوں کا دائرہ کار جدا ہوتا ہے اس لیے یہ کسی حال میں بھی باہم متصادم نہیں ہوتیں بلکہ پاکستان میں تو اردو عوامی رابطے کی زبان ہے۔ بین السانی افہام وتفہیم کا ذریعہ ہے اور دو صوبے والوں کے درمیان ذہنی سطح پر ایک پل کا کام دیتی ہے۔

سچ پوچھئے تو اُردو کے حامیوں اور مخالفوں نے ایک خالص علمی اور سماجی مسئلے کو جذباتی رنگ دے کر فضول اور لایعنی بحثوں میں الجھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی کو اُردو پر ترجیح دیتے ہیں وہ بھی سب کے سب دل سے اردو کے مخالف نہیں ہیں بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ اُردو کے حامیوں کی طرح وہ بھی اس علمی مسئلے کا حل سوچ نہیں پا رہے ہیں اس معاملے میں کوتاہی دونوں گروہوں کی ہے اور دونوں میں سے کوئی بھی اس صورت حال کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا یہ درست ہے کہ قائدِ اعظم مرحوم نے اُردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دے دیا تھا لیکن ہم لوگوں نے بھی تو قائدِ اعظم مرحوم کے اس مشورے یا فیصلے یا حکم کے وزن میں اضافہ کرنے اسے حق بجانب ثابت کرنے اور وقیع تر بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔

ہم نے اُردو کے فروغ اور ترقی کے لیے اب تک جو کچھ کیا وہ بس اتنا ہے کہ اُردو کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم تر بنا کر دکھائیں اور اُردو میں علی العموم احساس کمتری پیدا کریں۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ جب کسی اصطلاح کی ضرورت پڑی ہم نے اُردو کی اصطلاح وضع کرنے کی بجائے انگریزی اصطلاح کا عربی، فارسی ترجمہ کر کے ان زبانوں سے اپنی جذباتی وابستگی کا ثبوت فراہم کر دیا اور کبھی یہ ظاہر اور واضح ہی نہیں ہونے دیا کہ اُردو زبان میں اصطلاحیں وضع کرنے کی صلاحیت موجود ہے بلکہ یومیہ بول چال کے عام الفاظ روزمرہ اور محاورات، اسالیب بیان معنویات اور گرامری ڈھانچے کو بھی دوسری زبانوں کے ماتحت کر دیا۔ یہ صورتحال صرف جذباتی ہے اور اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ ہم نے کبھی اس مسئلے پر خالص علمی اور لسانیاتی نقطہِ نظر سے غور نہیں کیا۔ اس بات کی زیادہ ذمہ داری خود حامیان اردو پر عائد ہوتی ہے جو اپنی زبان اردو کے روپ ترک کر کے غیر زبانوں کے روپ اپنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو اُردو اور عربی فارسی کے تابع دکھاتے ہیں

سید مصطفیٰ علی بریلوی

صوبہ پنجاب اور اُردو

صوبہ پنجاب اور اردو کا تعلق خاصہ قدیم ہے۔ انگریزوں نے اس صوبہ پر ۱۸۴۹ء میں قبضہ کیا اور اپنی پہلے سے طے شدہ پالیسیوں کے تحت مسلم اقتدار اعلیٰ کی نشانی فارسی کی بجائے اردو کو صوبہ کے دفاتر اور عدالتوں کی زبان قرار دیا

انگریزوں کی آمد سے قبل پنجاب تقریباً ۹۰ سال تک سکھوں کے فوجی غلبہ کے تحت رہا۔ اس دوران زندگی کے جملہ شعبہ ہائے حیات میں مسلم کشی کا عمل جاری رہا لیکن فارسی زبان کی درسی، درباری اور تدریسی حیثیت کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم و تدریس کا میدان مسلسل مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا اور اس طرح مسلم ثقافت و تہذیب بڑی حد تک محفوظ رہ سکی۔ اردو فارسی زبان کی وارث زبان ہے فارسی زبان کے جو اثرات تھے اس سے قدرتاً اردو کے فروغ میں مدد ملی۔ پنجاب کے سکھ اور ہندو فارسی زبان سے پوری طرح متاثر تھے۔ خود سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں بابا گرو نانک کی تصنیف مشہور و معروف حقانی نظم جیسے کہ طویل بحر میں لکھا گیا ہے مکمل فارسی میں ہے علاوہ ازیں چند فارسی نظمیں گرنتھ صاحب کا جزو ہیں فارسی کے بہت سے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں گرنتھ صاحب میں استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً رہ راس (راہ راست)، ارداس (عرضداشت) بوسکا (بنگاہ) وغیرہ،

پنجاب کی سکھ ریاستوں میں بھی اول فارسی اور پھر اردو کی حکمرانی قائم ہوئی ریاست پٹیالہ کے وزیر خلیفہ محمد حسین نے رسالہ معارف، علی گڑھ بابت اپریل ۱۸۹۶ء میں اپنے ایک معرکہ آرا مقالہ میں تحریر فرمایا ہے[1]

قطع نظر از دفاتر عدالت ہائے گورنمنٹ اس وقت تک بھی پنجاب کی تمام ریاستوں میں کیا ہندو کیا سکھ کیا مسلمان زبان اردو دفتر و دربار اور تعلیم میں مستعمل ہے فارسی اور اردو ہی ہیں مثلاً ریاست پٹیالہ میں جس سے مجھ کو نمک خواری کا قدیمانہ پشتینی تعلق ہے ابتدائے ریاست سے سے کر ۱۸۶۵ء تک سرکاری دفاتر کی میں زبان فارسی مستعمل تھی اور اگرچہ ۱۸۶۵ء سے فارسی کی جگہ اردو ہو گئی ہے تاہم کے اعلیٰ عہدیداروں مثلاً ہز ایکسیلنسی والیٔ ریاست بہادر پنجاب کی مختلف ریاستوں کے راجاؤں، مہاراجوں سے اب تک فارسی ہی میں خط و کتابت ہوتی ہے۔

اس صوبے کے تمام اخبار اور رسالے تعداد میں ۲۵ ہیں جن میں ۲۳ اردو کے ایک انگریزی اور ایک ہندی کا ہے اور اگر موخر الذکر اخباروں کی عبارت کا طرز بیان اور الفاظ کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان تمام کی اردو ہی کے الفاظ پر منحصر ہے۔

صوبہ پنجاب میں اردو کے خاتمہ کی تین مرتبہ ناکام کوشش ہوئی۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب نے سرکاری دفاتر اور دیگر محکمہ جات کی دفتری زبان بارے میں صوبے کے تمام کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں سے رائیں طلب کی تھیں۔

دوسرا زبردست حملہ ۱۸۸۴ء میں ہوا جب گورنمنٹ آف انڈیا نے پرائمری کے سلسلہ میں ہنٹر تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کے روبرو صوبوں کی جانب سے معلومات فراہم کرنے کے واسطے ایک طویل سوالنامہ جاری کیا گیا تھا۔ صوبہ پنجاب میں بھی جاری ہوا دیگر صوبہ پنجاب کے برعکس صوبہ پنجاب میں بعض اصحاب کی تحریک پر ایک سوال یہ جاری کیا گیا کہ صوبہ کے اسکولوں میں جو زبان ہندوستانی پڑھائی جاتی آیا یہ مفید اور عام پسند ہے یا نہیں ہے۔ کمیشن کے سوالنامہ کے الفاظ یہ تھے۔

کیا وہ زبان جو آپ کے صوبہ میں گورنمنٹ کی جانب سے تسلیم شدہ ہے اور اس میں پڑھائی جاتی ہے علاقہ کے باشندگان کی اصلی بولی ہے۔ اور اگر نہیں، تو کیا آپ کے صوبہ کے اسکول اس وجہ سے نسبتاً غیر مفید اور ناپسندیدہ ہیں

(یہ تحقیقی رپورٹ پنجاب گورنمنٹ نے ۱۸۸۶ء میں شائع کی تھی)

تیسرا حملہ اس وقت ہوا جب ڈاکٹر پی سی چیٹرجی نے پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن میں اردو کے بجائے پنجابی زبان کو صوبہ کی دفتری اور عدالتی زبان قرار دیئے جا

---

[1] بحوالہ رسالہ معارف علی گڑھ مدیر مولانا سید الدین سلیم جلد نمبر ا شمارہ نمبر ۱ بابت ماہ اپریل ۱۸۹۹ء، مقالہ اردو زبان کا اثر، از خلیفہ محمد حسین وزیر ریاست

۱۸۶۲ء میں اردو کے خلاف جو پہلی سازش ہوئی تھی۔ وہ سرکاری دفاتر تک
محدود رہی اور بالآخر اردو کے موافق فیصلہ ہوگیا۔ اس وقت کے جن اعلیٰ
عہدے داروں نے اردو کی حمایت میں رائیں دی تھیں۔ ان میں سر رابرٹ اجرٹن
سر چارلس ایچی سن مسٹر ٹی ایس میول کمشنر دہلی مسٹر فیمبہ کمشنر حصار مسٹر اسمتھ ایڈور ڈ
کمشنر ضلع دہلی کپتان الفنسٹن ڈپٹی کمشنر جالندھر مسٹر فورسنتھ کمشنر لاہور کرنل ہیمٹن
کمشنر ملتان کپتان میکوئل ڈپٹی کمشنر گوگیرہ مسٹر برانڈرتھ کمشنر راولپنڈی کرنل ہیو کمشنر
پشاور وغیرہ ہم شامل تھے۔ ان لوگوں نے تفصیلی آرا تحریر کی تھیں ان کو مجلس زبان
دفتری سول سیکرٹریٹ پنجاب کے ماہانہ مجلہ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۲ء میں شائع کیا گیا ہے
در قابل مطالعہ ہیں

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان کے خلاف دوسرا محاذ ۱۸۸۴ء میں قائم کیا
گیا یہ ایک بھرپور حملہ تھا۔ اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اردو زبان کے خلاف ہنٹر
کمیشن فیصلہ دے دیگا۔ مسلمانوں میں بھی اس معاملہ پر سخت بے چینی پھیلی ہوئی
تھی اس کا اندازہ اس ضخیم رپورٹ کے مطالعہ سے بخوبی ہوسکے گا۔ جو ہنٹر کمیشن کے
روبرو پیش کرنے کے واسطے سوالنامہ کے جوابات اور تبصروں پر مبنی ۱۸۸۴ء میں
گورنمنٹ پنجاب کی جانب سے شائع ہوئی تھی اور اردو کی موافقت میں رائے دینے والوں
میں اخوان الصفا گجرات باشندگان سیالکوٹ انجمن رفاہ اسلام جھنگ نواب شمشیر علی خان
آف ملت لیاقت علی خان کے والد اور دیگر باشندگان کرنال، مسٹر جے گراہم
اسسٹنٹ گورنر ٹاتھ (عیسائی مشنری) سردار کنور سنگھ ایلوالیہ پادری کے، سی چرجی
مسٹر ہولرائیڈ ڈائریکٹر تعلیمات لاہور جیسے افراد شامل تھے۔
اردو کے خلاف جن لوگوں نے بیان دیئے ان میں سردار دیا سنگھ مجیٹھیا، پریذیڈنٹ
سنگھ سبھا لاہور آریہ سماج لاہور برہمو سماج سکھ نیشنل ایسوسی ایشن پنجاب اور انجمن
پنجاب وغیرہ ہم شامل تھے
تفصیل کے واسطے ملاحظہ کیجئے راقم السطور کی کتاب "انگریزوں کی لسانی پالیسی
اور مسلمانان پنجاب کی تعلیم شائع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لی مٹڈ
ناظم آباد کراچی)

اس مہم میں اردو کے مخالفین کو سرسید کی بروقت کارروائی سے ناکامی ہوئی
سرسید ابتداً خود ہنٹر کمیشن کے ممبر تھے۔ انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ ہنٹر کمیشن
کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں قائم کیا گیا ہے زبان کا مسئلہ اس کے دائرہ اختیار

سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ محکمہ تعلیم پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی آہستہ آہستہ
ان کی نمائندگی کم سے کم ہوتی گئی۔ ۱۹۰۶ء تک کیفیت یہ ہوگئی کہ آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مولوی نور احمد صاحب نے بیان کیا کہ:
اب ۱۹۰۶ء ضلع دہلی میں تو صرف ایک ہیڈ ماسٹر پنجاب بھر میں مسلمان نکلا جب
محکمہ تعلیم میں مسلمان چھائے ہوئے تھے تو مسلمان مدرسین، صدر مدرسین اور
افسران تعلیم کے دم سے عربی اور طور پر عربی فارسی اور اردو کا کام ہو رہا تھا غیر
مسلموں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب صورت یہ ہوگئی ہے کہ ؎
وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔
پنجاب میں اردو پر تیسرا حملہ اس وقت ہوا جب بنگال بہار میں اردو کا خاتمہ
ہو چکا تھا۔ یوپی میں سخت معرکہ کے بعد اردو بحیثیت دفتری و عدالتی زبان بال بال
بچی تھی ۱۸۹۳ء میں محکمہ تعلیم پنجاب نے ہدایات جاری کیں۔
۱۔ اردو کے کورس سے فارسی خارج کی جائے تاکہ مقصدِ تعلیم کے واسطے زیادہ
وقت بچ سکے۔
۲۔ پرائمری مدارس سے فارسی خارج کی جائے (بحوالہ پنج سالہ تعلیمی رپورٹ
بابت ۹۷-۱۸۹۵ء مرتبہ جے سی کاٹن صفحات ۵-۔
۱۹۰۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ڈاکٹر پی سی
چیٹرجی نے تجویز پیش کی کہ پنجابی زبان کو اردو کے بجائے رواج دیا جائے۔
مسلمانوں پر اس تجویز کا شدید ردعمل ہوا۔ چنانچہ امرتسر کے خان بہادر شیخ
غلام صادق خان بہادر خواجہ یوسف شاہ بابو نظام الدین وغیرہ ہم نے طے کیا کہ
امرتسر میں مسلمانانِ ہند کا ایک کنونشن منعقد کیا جائے تاکہ اردو کے خلاف سازشوں
کو ناکام بنانے کے سلسلے میں مسلمانوں کا متحدہ محاذ بنایا جا سکے چنانچہ آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس کے صدر سر سلیم اللہ نواب آف ڈھاکہ
نواب بہادر سرفراز حسین رئیس پٹنہ، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی عبدالماجد
سہروردی وغیرہم اکابرین علی گڑھ کے ساتھ امرتسر پہنچے
۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو سر شیخ عبدالقادر کی تحریک اور شیخ عبداللہ بانی گرلس
کالج علی گڑھ کی تائید سے حسب ذیل ریزولیوشن پیش ہوا۔
اس کانفرنس کی رائے میں اردو صوبہ پنجاب میں تعلیمی اغراض کے لئے بالعموم
اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے اور

کے لیے نہایت نامناسب ہے۔ ڈاکٹر چیڑجی کے فلسفے کے خلاف میاں سر محمد شفیع نے حسب ذیل ریزولیوشن اجلاس کانفرنس میں پیش کیا۔

یہ کانفرنس ڈاکٹر پی سی چیڑجی کی اس رائے سے جسے انہوں نے حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن کے موقع پر اپنے ایڈریس میں ادا کیا تھا کہ اردو صوبہ پنجاب کی ورناکیولر زبان نہیں ہے۔ نہایت زور سے اختلاف کرتی ہے۔ اور ان کی اس تجویز سے کہ صوبہ کی ابتدائی تعلیم پنجابی کی وساطت سے ہونی چاہیئے۔ ہرگز اتفاق نہیں کرتی اور اس تجویز کو نہ صرف ناممکن العمل بلکہ تعلیمی لحاظ سے صوبے کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے۔

اس ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے سر محمد شفیع نے فرمایا جو طوفان اردو ہندی کا صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ (یوپی) میں برپا تھا اس سے معلوم ہو گیا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ طوفان پنجاب پر بھی حملہ آور ہوگا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں پر یہ حملہ کس صورت میں ہوگا اور اس کا بانی مبانی کون ہوگا لیکن آپ صاحبان کو معلوم ہے کہ یہ حملہ کس نے کیا ہے۔ کسی پنجابی نے نہیں اور نہ کسی اور شخص نے جس کو پنجابی یا اردو زبان سے کوئی تعلق ہے بلکہ یہ حملہ کیا ہے ایک بنگالی ہندو نے (نام نشرم) یہ لوگ ہندو اور مسلمانوں کے اتفاق اور اتحاد کے دعوے دار ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں اور ہندوؤں کو ملانا چاہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس اتحاد اور اتفاق کے ذریعہ یعنی اردو زبان کو جو حقیقتاً "لنگوا فرانیکا" ہے مٹانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر چیڑجی اردو کو ہندوستان کی لنگوا فرانیکا تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ پنجاب میں پنجابی "بہار" اور دوسرے صوبوں میں وہاں کی زبان۔ بابو چیڑجی فرماتے ہیں۔

اردو زبان کی اشاعت میں مسلمان اصحاب اس وجہ سے سرگرمی سے مدد دیتے ہیں کیونکہ ان کے لئے وہ اسلامی عروج کی نشانی ہے۔

صاحبو

چیڑجی صاحب کا یہ بیان قطعی غلط ہے اردو زبان ہم کو یہ تو محبت ورثہ یاد نہیں دلاتی بلکہ ہم کو یاد دلاتی ہے ہماری وہ بے تعصبی کہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کو استعمال کرنے سے ہم نے پرہیز نہیں کیا۔

مندرجہ بالا ریزولیوشن کی تائید میں صوبہ بہار کے مشہور قومی کارکن سر علی امام مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار اور نظریہ پاکستان کے خالق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے تقاریر فرمائیں۔ افسوس ہے کہ یہ تقاریر بمد ست نہیں ہو سکیں وہ پیسہ اخبار کے فائلوں میں ممکن ہے مل سکیں۔

انگریزی دور اقتدار میں علی گڑھ مسلمانان ہند کی سرگرمیوں کا مرکز تھا جب اردو کے سلسلہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسلمانان ہند کی متفقہ تائید و حمایت مسلمانان پنجاب کو حاصل ہو گئی تو ان کی آواز میں قدرتاً بہت زور پیدا ہو گیا۔ چنانچہ گورنمنٹ بھی متاثر ہوئی اور ۱۹۴۷ء تک اردو کی حیثیت پنجاب میں بدستور برقرار رہی اس کامیابی کا یہ اثر نکلا کہ پاکستان کے صوبوں میں ماشاء اللہ پنجاب تعلیمی اعتبار سے سب صوبوں سے آگے ہے اور اسی مناسبت سے جملہ شعبہ ہائے حیات میں ترقی کر رہا ہے ان حالات میں صوبہ پنجاب میں پنجابی زبان کو ابتدائی مدارس میں جاری کرنے کا شوشہ چھوڑنا وحدت قومی اور خود پنجاب کے مسلمانوں کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح انداز فکر اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(بشکریہ روزنامہ جسارت کراچی)

نقوش ایوارڈ

(روزنامہ نوائے وقت ... ۲۹ جون ۸۴ء)

وفاقی وزیر تعلیم کی وضاحت

اسلام آباد (اپ پ) وفاقی وزیر تعلیم ... اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کی تردید کی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ

مستقبل میں تمام تعلیمی اداروں میں انگریزی طریقہ ... محمد ... نے اس خبر کی سخت تردید کرتے ہوئے کہا کہ ایسی کوئی تجویز زیر غور نہیں ہے۔

(روزنامہ ... اسلام آباد ۹ مئی ۸۴ء)

اُردو میں تبدیلی کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا

اردو زبان بت نہیں ہے جو سومنات کے مندر میں نصب ہو اور کوئی گروہ پجاریوں کے بھیس میں اس کا اجارہ دار بن جائے۔ اقبال پر آج کل بہت تقریریں ہو رہی ہیں لیکن اقبال اپنی اصل شکل میں نظر آنے کی بجائے مسخ شدہ شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ن م راشد نے نئی شاعری کی لیکن وہ نئے شاعروں سے بیزار تھے اور اپنی قوم سے بھی مایوس ہو گئے تھے۔ البتہ فیض نے روایت کا پابند ہو کر روایت کو نیا مفہوم دیا اور حسن ناصر کے مرثیہ میں غالب کے مصرعہ کو خوب استعمال کیا۔ اُردو زبان کے معیارات ہمیشہ سیاسی و ثقافتی مراکز کی تبدیلی سے بدلتے رہے ہیں تاہم زبان میں تبدیلی کے عمل کو تسلیم کرنے کے باوجود معیار کو بھی متعین کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار لاہور کے ہوٹل ہلٹن میں انجمن ترقی اُردو کی تقریب میں کیا گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال کے بعد لاہور میں بزم اُردو پر سوگواری اور خاموشی طاری ہو گئی تھی لیکن اب مرکزی انجمن ترقی اُردو نے ہر صوبے میں اپنے آپ کو متحرک اور فعال بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس ارادے کے نتیجے میں انجمن کے ذیلی دفاتر قائم ہو رہے ہیں اور جلسے کئے جا رہے ہیں۔ لاہور کا یہ اجلاس بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ اس جلسے میں جناب شان الحق حقی، ڈاکٹر سلیم اختر، سراج منیر، ڈاکٹر آفتاب احمد اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ ایک عالمی انجمن ترقی اردو کی تشکیل کے لیے بھی دنیا کی مختلف اُردو انجمنوں سے خط و کتابت جاری ہے اور ان کے نمائندوں کا ایک مشترکہ اجلاس پاکستان میں جلد طلب کیا جائے گا۔

خواص اور عوام کی زبان

جناب شان الحق حقی نے زبان میں معیار کے مسئلہ پر اپنی سوچ اور تجربات کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ صحیح ہے کہ سائنس اور قانون میں ہی نہیں بلکہ ہر شعبے میں صحت اظہار کے لیے تلفظ محاورے اور صرف و نحو کی درستگی ضروری ہے لیکن زبان ایک تبدیل ہونے والی چیز بھی ہے اور زندگی کا قدم جس قدر تیز ہوتا ہے تبدیلی کا عمل بھی اتنا ہی تیز ہوتا ہے۔ دنیا کو کوئی انسان اپنے مادری ذخیرہ الفاظ پر گزارہ نہیں کرتا۔ بلکہ ماں کی آغوش سے نکلنے کے بعد باہر کی دنیا سے مزید الفاظ لیتا ہے۔ یہی حال زبانوں کا بھی ہے۔ اور اُردو کے سلسلہ میں جب معیار کو تلاش کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیاسی، ثقافتی مرکز نقل بدلتے رہے ہیں اور اس لحاظ سے نئے معیارات بھی قائم ہوتے رہے ہیں۔ کبھی دکنی، کبھی دہلوی کبھی لکھنوی معیارات کا زور رہا۔ بہادر شاہ کی اُردو اپنے استاد ذوق سے زیادہ آسان اور زیادہ بہتر تھی۔ بعد کے ادوار میں اُردو کا عام لوگوں سے رابطہ اور بھی بڑھ گیا۔ آج بھی اُردو کو عام بول چال کی زبان سے الگ رکھنا غلط ہے۔ یہ پاکستان کی خوش نصیبی ہے۔ کہ اُسے اپنے لئے ایک بنی بنائی زبان مل گئی ہے۔ اس زبان کی لغت تیار کرنے کے سلسلے میں ہمارے سامنے معیار کا مسئلہ آیا۔ اور آخر ہم اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ صرف تواتر کو معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل معیار اوپر سے نہیں آتا نیچے سے ابھرتا۔ اور نچلے طبقے کے ابھرنے کے ساتھ یہ عمل اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ زبان کی تشکیل میں خواص سے زیادہ عوام کا دخل ہو جاتا ہے۔ لیکن خواص کی معیار کے سلسلہ میں اپنی ایک اہمیت ہے اور خواص سے مراد اہل اقتدار یا اہل دولت نہیں اہل علم ہیں۔ ہمارا برسر اقتدار طبقہ غلط اُردو کے بولنے میں ح نہیں سمجھتا۔ لیکن غلط انگریزی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب کہ انگریزی کی طرح اردو کو بھی بہرحال ایک معیار کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے۔ کہ زبان میں چھوت چھات کا عمل نہیں چل سکتا اور نئے الفاظ نئی تراکیب کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

انجمن کی کارگزاری

ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجمن کی کارگزاری کے متعلق بتایا۔ کہ انجمن اب تک ۷۵۲ کتابیں شائع کر چکی ہے۔ اردو کالج نے دُور رس اثرات ڈالے ہیں۔ اصطلاحات سازی کے سلسلے میں اب ایک نئی فرہنگ تیار ہو رہی ہے۔ جو پہلے ہماری مرتب کردہ فرہنگ سے زیادہ وسیع اور تفصیلی ہوگی۔ یہ کام اس سال مکمل ہو جائے گا اُردو ادب

کے بارے میں برصغیر کی یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالات بھی کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ اسٹینڈرڈ اردو، انگریزی ڈکشنری کے آئندہ ایڈیشن میں پندرہ ہزار نئے الفاظ شامل ہوں گے۔ قاموس الکتب کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چوتھی زیر تیاری ہے۔ پہلی جلد اسلامیات کے موضوع پر اردو زبان کی فہرست اور اس کے بارے میں ہے۔ اس میں بارہ ہزار کتابوں کی فہرست اور اس کے بارے میں تلخیص درج ہے۔ باقی جلدیں تاریخ یا سائنس وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ ایک عالمی انجمن اردو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کے لیے دنیا بھر کے اردو اداروں کے نمائندہ افراد کا اجلاس طلب کیا جائے گا اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں میر خلیل الرحمٰن بھی شامل ہیں۔

انجمن کی آج تک اپنی کوئی عمارت نہیں ہے۔ ہمارے دو کتب خانے ہیں ایک کتب خانہ میں پچیس ہزار تحقیقی کتابیں ہیں۔ اور کتب خانہ عام میں چودہ ہزار کتابیں ہیں۔ جو مطالعہ کے لیے جاری کی جاتی ہیں۔ قدیم قلمی نسخوں کی اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔

(بشکریہ روزنامہ جسارت کراچی)

ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان

ڈاکٹر وحید قریشی

۱۹۴۷ء سے اب تک ملک میں بہت سی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے سرکاری تعلیم کے مسئلہ کی نوعیت کبھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔ اس وقت جو صورت حال ہے اس میں اردو کا مسئلہ اردو کے ماڈل اسکول یا اردو ذریعہ تعلیم کے خاص کالج یا اردو یونیورسٹی بنانے سے حل نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی صورت بالکل وہی بنے گی جو پچھلے ۳۰ برس میں اسلامیات کی ہوئی ہے کہ اسلامیات کا ایک علیحدہ مضمون اور شعبہ بنانے کے نتیجے میں اسلامیات کو دیگر مضامین میں سمونے کا راستہ بڑی حد تک مسدود کر دیا گیا ہے۔ ہماری حکمت عملی اردو کے سلسلے میں اس سے مختلف ہونی چاہیے۔

۱۹۴۸ء سے آج تک اردو کے کسی بھی حامی نے یہ نہیں کہا کہ انگریزی بطور ثانوی زبان کے باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء تک تو بین الاقوامی علوم تک رسائی کا واحد ذریعہ ہمارے پاس صرف انگریزی ہی تھی۔ البتہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے سائنسی علوم کے سلسلہ میں دنیا میں بہت زیادہ تبدیلی آگئی ہے۔ اب انگریزی ۵۰ فیصد علوم ہم تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ بقیہ ۵۰ فیصد علوم چینی، جاپانی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ذریعے سے آرہے ہیں۔ اس لیے پچھلے ۲۵ برس میں انگلستان اور امریکہ میں جس کثرت سے تراجم کی ایجنسیاں اور ادارے قائم ہو رہے ہیں وہ ہمارے ملک کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ لیکن انگریزی کی اس علمی حیثیت میں کمی کے باوجود ہم اس کے حامی ہیں۔ بطور لازمی ثانوی زبان انگریزی ہی ہمارے لیے قابل ترجیح ہے۔

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ اس مسئلے سے بالکل علیحدہ ہے ہمارے ملک میں عموماً ذریعہ تعلیم اور لازمی ثانوی زبان دونوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کی مدد سے ہم طلبہ کو اعداد و شمار تو دے دیتے ہیں لیکن تعلیم حاصل کرنے والے انھیں ہضم نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سائنس کے استاد بہت اچھے پیدا تو کر لیتے ہیں لیکن سائنسدان ایک بھی نہیں پیدا کر سکتے۔ یہ صورت حال تشویشناک ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ صرف قومی زبان کا حق ہے کہ اس کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس سے ہم انگریزی سے محروم نہیں ہو جاتے کیونکہ انگریزی تو لازمی ثانوی زبان کے طور پر قائم رہے گی۔ ہمارے ہاں تعلیم کا معیار گر رہا ہے تو وہ سیاسی اور سماجی اسباب کی بنا پر ہے اس کا سبب قومی زبان نہیں۔ اردو کے مخالفین نے اسے اردو کے کھاتے میں ڈال دیا ہے جب تک ہم اپنے اجتماعی نظام زندگی کو تبدیل نہیں کرتے اردو اور انگریزی دونوں کا معیار خراب ہی رہے گا۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۸ جون ۱۹۸۶ء

اردو الفاظ کا پروسیسر پروگرام تیار کر لیا گیا

لندن (نمائندہ جنگ) اردو زبان کے الفاظ کا ایک پروسیسر پروگرام تیار کر لیا گیا ہے تاکہ اردو لکھنے والے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ پروگرام تین انگریزوں نے تیار کیا ہے جو بی بی سی مائیکرو کمپیوٹر کو حاصل ہے۔ یہ پروگرام جلد ہی [illegible] اور آئی بی ایم [illegible] کو بھی مکمل صورت میں حاصل ہو جائے گا۔ [illegible] جاتا ہے کہ یہ پروگرام اسکولوں اور تربیتی کورسوں میں [illegible] جائے گا۔ [illegible] ہے کہ یہ ہمت سے کام کرے گا جن میں کمپیوٹر کی تعلیم [illegible] کے سلسلہ اردو دان افراد کو دیگر زبانوں کی تعلیم میں [illegible] ہے۔ یہ پروگرام تیار کرنے والی ٹیم اب عربی، بنگالی، [illegible] کے لیے بھی پروگراموں پر کام کر رہی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی ۱۰ مئی ۱۹۸۶ء

اردو ذریعہ تعلیم اور سائنس پر لیکچر

اسلام آباد ۹ جولائی (نیوز ڈیسک) پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے آڈیٹوریم میں ۹ جولائی کو [illegible] اردو ذریعہ تعلیم اور سائنس کے موضوع پر لیکچر [illegible] آفتاب حسن سیکرٹری جنرل [illegible] آف پاکستان لیکچر دیں گے۔ اجلاس کی صدارت فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر مصباح الدین [illegible] کریں گے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۸ جولائی ۸۶ء

اہل قلم کانفرنس ۱۷ اکتوبر سے [illegible]

اسلام آباد ۱۷ جولائی (نمائندہ جسارت) کل پاکستان اہل قلم کی کانفرنس ۱۷ اکتوبر سے اسلام آباد میں ہو رہی ہے جس کا افتتاح وزیر اعظم محمد خان جونیجو کریں گے۔ اس کانفرنس کے انتظامات تیزی سے کیے جا رہے ہیں اس میں پورے ملک سے ۳۰۰ سے زائد ممتاز ادیب شاعر اور دانشور شرکت کریں گے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۸ جون ۱۹۸۶ء

سیف اللہ نیازی

قومی یک جہتی ملکی استحکام کے لیے ضروری ہے

قومی یکجہتی ملکی استحکام کے لئے انتہائی ضروری ہے اسکی یکجہتی کے لیے بہت سے عوامل کی اہمیت مسلم ہے جن میں ایک ہماری قومی زبان بھی ہے۔ درحقیقت اس ملک کو متحد رکھنے والی دو چیزیں ہیں۔ ان میں ایک ہمارا دین اور دوسری ہماری قومی زبان ہے۔ اور یہ عیاں حقیقت ہے جب تک ذریعہ اظہار کسی قوم کا ایک نہ ہو اس وقت تک اس کے افراد مل کر بیٹھ نہیں سکتے اور ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے قومی زبان ہمارے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ باتیں گذشتہ دنوں میانوالی میں ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے مختلف تقاریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں جو قومی یکجہتی کے علمبردار حضرات اور محب وطن افراد کے لئے لمحہ فکریہ ہیں۔

الفیصل میانوالی میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا زبانیں صرف وسیلہ اظہار ہیں لسانی فتنے اس لئے ہیں کہ ہم نے زبانوں کے بارے میں یہ تصور چھوڑ دیا ہے اور اسلام سے متصادم بھی ہے قومی زبان کے بارے میں ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ زبان سیکھیں جو ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اور سمجھی جاتی ہے وہ زبان صرف اردو ہے جس سے تمام پاکستان کے علاقوں کے مکین باہم رابطہ کر سکتے ہیں بریگیڈیر گلزار احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ انگریزی کی بالادستی بڑے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ اگر ان کا بغور جائزہ نہ لیا گیا تو یہ سنگین صورت حال اختیار کر سکتے ہیں۔ موتمر عالم اسلامی کے جنرل سیکریٹری کلیم اللہ ملک۔ نے اردو کے نفاذ کے لئے ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات کی تعریف کی اور کہا کہ اردو نے قومی یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے موتمر عالم اسلامی لسانی فتنوں اور صوبائیت کے اٹھتے ہوئے طوفان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان کے سدباب کے لئے ہر ممکن تعاون کرے گی۔

اخبار نویسوں کے وفد سے باتیں کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا اب اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ اردو انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتی اور اس میں مطلوبہ اصطلاحات کی کمی ہے۔ مقتدرہ نے اس سلسلے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ۰۰۰ ہزار الفاظ پر مشتمل اصلاحات کی لغت ترتیب دی گئی ہے اس کے علاوہ ڈرافٹ نویسی اور چٹھیوں کے اردو نمونوں پر مشتمل کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں اردو کے نفاذ میں حائل صرف اعلیٰ افسران کی یہ نیت ہے کہ انگریزی کی بالادستی کو قائم رکھ کر اپنا اقتدار برقرار رکھا جائے اور اردو سکولوں سے نکلنے والے ہونہار صرف کلرک اور گریڈ ۱۶ سے نیچے کی ہی ملازمتیں حاصل کرتے ہیں یہ طبقہ ایک محدود تعداد میں ہے مگر اپنے اختیارات کی وجہ سے پاکستانیوں کی تقدیر کا مالک بن کر بیٹھا ہوا ہے اعداد شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں ہونے والی مجموعی خط وکتابت کا صرف ایک فیصد حصہ انگریزی میں ہوتا ہے۔ جبکہ ملک کی ایک بڑی اکثریت اردو میں ہی خط لکھتی ہے تو سرکاری خط وکتابت بھی اردو میں ہونی چاہیے۔ تاکہ پاکستان کو حقیقی معنوں میں قائد اعظم کا پاکستان بنایا جا سکے۔

تحریک فروغ اردو کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ بھی منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی نے کی جبکہ مہمان خصوصی بریگیڈیر گلزار احمد تھے مذاکرہ کا عنوان قومی یکجہتی میں اردو کا کردار تھا۔ مذاکرے سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بشیر سیفی نے کہا کہ اردو کی قومی حیثیت تسلیم کر لینے سے صوبائی وعلاقائی زبانوں پر کوئی آنچ نہیں آتی یہ تمام زبانیں اردو کی حلیف۔ ہیں اردو کی جڑیں تمام زبانوں میں پیوست ہیں پروفیسر اقبال حسن کاظمی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ تحریک آزادی کے راہنماؤں نے اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا کیونکہ اس میں مسلم علماء کا قابل قدر اضافہ شامل ہے۔ تحریک پاکستان کے راہنما اردو کو ہی قومی اتحاد کی علامت سمجھتے تھے۔

انہوں نے کہا کہ انگریزی کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے۔ کہ سائنسی علوم اس زبان میں ہیں انہوں نے بتایا کہ گزشتہ دس سال میں ہونے والی جدید سائنسی تحقیق کا پچاس فیصد علم انگریزی سے زیادہ ہے سائنسی علوم کے حصول کے لئے ان زبانوں کی تعلیم وتدریس کے لئے بندوبست انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ سائنسی علوم پر انگریزی کی اجارہ داری کب کی ختم ہو چکی ہے جاپان میں صرف جاپانی زبان میں تمام علوم کی تعلیم دی جا رہی ہے جس کی بدولت اس ملک کی ترقی وخوشحالی محتاج تحریر نہیں ہے۔

بریگیڈیر گلزار احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے نفاذ کے لئے تحریک پاکستان کے جذبہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو کی مخالفت کرنے والے دو طبقے ہیں۔ ایک خود غرض طبقہ اعلیٰ افسران کا ہے۔ جو اپنا اقتدار اس میں سمجھتے ہیں کہ انگریزی

کی بالادستی قائم رہے اور دو آزادی کے چالیس سال بھی انگریزوں کے ذہنی طور پر غلام ہیں دوسرا طبقہ وطن دشمن عناصر کا ہے جو بیرونی امداد کے بل بوتے پر لسانی تعصبات کو ہوا دے کر اردو کے نفاذ کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے خطاب میں کہا کہ قومی زبان ہماری شناخت ہے اور ہماری پہچان ہے۔ مگر اس کو اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا اور بذریعہ تعلیم جو ہماری قومی امنگوں کا ترجمان ہونا چاہیے تھا۔ اس کو پنایا نہیں جا سکا اگر ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بات کرتے ہیں۔ تو ایک مخصوص طبقہ اردو کا مخالف ہو جاتا ہے ہمارا مطالبہ ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر تمام علوم کی تعلیم اس میں دی جائے اور انگریزی کو بطور ثانوی زبان برقرار رکھا جائے اور بطور ایک مضمون اس کی تدریس جاری رکھی جائے۔ مجلس دفتری زبان میانوالی کے خصوصی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ ادبی امور اور دفتری اردو میں نمایاں فرق ہے اردو کو ایک علمی زبان سے چلانے کے لئے اس کے جداجدا اسالیب اور رنگ پیدا کرنے ہونگے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے اکاؤنٹ اور دوسرے دفتری امور کے لئے اردو میں کتابیں شائع کی ہیں جو سرکاری ملازمین کے لئے اردو نویسی کے لئے بڑی معاون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان کے دامن میں بڑی وسعت ہے۔ ڈپٹی کمشنر میانوالی علی طاہر زیدی نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ضلع میانوالی میں اردو کے نفاذ کے لئے بھرپور کوشش جاری ہیں تمام دکانداروں کو اردو سائن بورڈ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یورپی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں کے لوگ قومی زبان میں تمام سرکاری خط وکتابت اور دیگر کام کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے اردو کو فروغ دینا چاہیئے اس موقع پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی بھی ملازم کی انگریزی میں لکھی ہوئی چھٹی کی درخواست کی منظوری نہیں دیں گے اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ تمام محکموں کے ملازمین کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے دفتری زبان سیکھنے کی ہدایت کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہر پاکستانی کو منافقت سے مبرا ہو کر نفاذ اردو کے لئے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم صرف اور صرف پاکستانی کہلانے کے حق دار ہوں نہ کہ سندھی بلوچی پنجابی اور پٹھان اس لئے ہمارا تشخص اجاگر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارا تشخص دنیا میں اجاگر ہوگا۔ تو صرف پاکستانی کہلانے سے اجاگر ہوگا۔ لہٰذا ہمیں نفاذ اردو کے لئے جہاد کرنا ہوگا۔

(بشکریہ روزنامہ نیلام اسلام آباد)

مقتدرہ قومی زبان نے اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے تاریخی کام کیا ہے

ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات سے مزید استفادہ کیا جائے۔ اسلام آباد میں تقریب سے مقررین کا خطاب

... (نامہ نگار خصوصی) مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کو اعلیٰ علمی وادبی خدمات پر طفیل ایوارڈ ملنے پر ان کے اعزاز میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی رہائش گاہ پر ایک تقریب ادبی بردار کے زیر اہتمام منعقد ہوئی اس میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین پروفیسر پریشان خٹک ڈاکٹر بشیر گورایا اور دوسرے مقررین نے کہا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر سرکردگی مقتدرہ قومی زبان نے ہر سرکاری وغیر سرکاری شعبہ کے لئے اردو کی نصابی وغیر نصابی کتابیں شائع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس تاریخی کام کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات سے مزید طویل عرصہ تک استفادہ کیا جائے۔

پروفیسر پریشان خٹک نے صدارتی تقریر میں ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی وادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ علمی تخلیقات کے علاوہ انہوں نے مقتدرہ کے صدر نشین کی حیثیت سے قومی زبان کے لئے جو کام کیا ہے وہ ان کے خلوص محنت دیانت اور مشنری جذبے کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ دفتری اور نصابی ضروریات پوری کرنے کے لئے اردو میں متعلقہ مواد کی کمی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ابتدائیہ میں اب تک سرکاری وغیر سرکاری سطح پر یہ پہلا انعام ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کو اس سے قبل ہر ادبی انعام میں انہیں منصف کے فرائض سونپ دیئے جاتے تھے مظفر مہدی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ طفیل ایوارڈ ایک اعلیٰ ادبی انعام ہے اور اس کے لئے ڈاکٹر وحید قریشی کا چناؤ حق بحق رسید کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر بشیر گورایا نے مبارک دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر وحید کی تنقیدی تحقیقی اور علمی کتابوں کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی ہیں اختر زمان نے کہا کہ طفیل ایوارڈ ڈاکٹر صاحب کا علمی وتخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف کا نشان ہے تقریب سے میاں نذیر اظہر، سرفراز شاہد اور انکسار الحق کے علاوہ پروفیسر شریف کنجاہی نے بھی خطاب کیا اور دیرینہ رفاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی مختلف پرتوں پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مقررین کا شکر ادا کرتے ہوئے بتایا کہ مقتدرہ میں رہ کر وہ نوکری نہیں کر رہے بلکہ ایک مشن پورا کر رہے ہیں اور ان کی اور کوشش ہے کہ اردو جلد از جلد قومی زبان کے طور پر نافذ ہو جائے

روزنامہ مشرق لاہور ۲۴ راگست ۸۷ء

جسٹس (ریٹائرڈ) عطاءاللہ سجاد

اردو زبان قومی زندگی کا دوسرا بڑا ستون ہے

انجمن ترقی اردو نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دور سے آج تک اردو زبان کی استعداد اور صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لئے جو سعی مسلسل کی ہے وہ ہماری تہذیبی اور لسانی تاریخ کا حصہ ہے۔ بابائے اردو کانگرس کی تنظیم اور گاندھی جی ایسی دیوقامت شخصیت کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اور کبھی میدان نہیں ہارے۔ اس صدی کے آغاز میں اور خاص کر تیسرے دہے کے دوران جو تحریکات جدید اردو زبان میں شروع ہوئیں انہوں نے اس کے محیط کو وسیع تر کر دیا اور اس کی استعداد کو بھی رعنا پر ثابت کر دیا۔ اب اردو افسانہ شعر اور انشائیہ کو دنیا کے ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے جدید رجحانات کی ابتدا کرنے کے رجحانات تو بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہو چکے تھے۔ جب مولانا ظفر علی خان نے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ دیا، اور سیاسی موضوعات پر نظمیں کہیں۔ علامہ اقبال نے خضر راہ اور شمع اور شاعر جیسی نظمیں لکھیں جن میں حریت، استبداد استیلا اور استحصال کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اور بندہ مزدور اور ایک عام شہری میں اس کے حقوق اور اس کے صحیح مقام کا شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اقبال اور فیض کی نظموں کا ترجمہ غیر زبانوں میں ہوا راشد کی کچھ نظموں کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور اس طرح اردو ادب کی عالمی حیثیت تسلیم کی گئی کچھ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر بھی قائم کی گئی اور غیر ملک میں اقبال فیض اور راشد پر ریسرچ کا کام بھی ہو رہا ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دیا۔ درست ہے کہ پاکستان کے سارے صوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ایک متحدہ قومیت کے وجود کے لئے اس کے افراد کے درمیان ہم کلامی بے حد ضروری ہے۔ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ہم اپنی بات ایک دوسرے پر واضح کر سکتے ہیں کیونکہ یہ زبان طورخم سے کر کراچی اور کراچی سے زیارت تک بولی جاتی ہے۔ ایک قومی زبان کے بغیر کوئی نظم متحدہ طور پر کارفرمائی کے قابل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قائداعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ اردو رسم الخط اور لغت کے لحاظ سے ایران اور دوسرے اسلامی ممالک کی زبانوں سے بہت قریب ہے اور اسی لئے اتحاد عالم اسلامی میں ممد ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں زبان اور عمل کے تضاد کے المیہ میں یہ بات قابل شناس ہے کہ ہمیں قومیت کے لئے قومی زبان اور کلچر کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ اس تضاد کو میں احساس قومیت میں گہرائی کے فقدان سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہمارے درمیان طبقہ کے لوگ جو اعلیٰ فکر کے رہنما تصور ہوتے ہیں الا ماشاءاللہ قومیت کو اپنی ذات سے بلند خیال نہیں کرتے ان کی ذات ہی ان کی قومیت ہے۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسرے قومی معاملات کے علاوہ زبان کے مسئلہ سے بھی اغماض روا رکھا گیا اور انگریزی پبلک سکول اور انگریزی بود و باش کی برتری کے احساس نے اس سلسلہ میں ہمارا راستہ روک رکھا ہے۔

مجھے کچھ یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ اردو زبان و بیان اور انشاء کا معیار بھی طلبہ میں عام طور پر گرتا جا رہا ہے۔ اس کی دو وجوہات میری سمجھ میں آتی ہیں ایک تو یہ کہ ہمارے نظام تعلیم سے عربی اور فارسی بہت دور ہو گئی ہے۔ یہی دو زبانیں ہیں جن سے اردو میں قوت اظہار اور وسعت پیدا ہوگی انہیں اس طرح کمزور کر دیا گیا ہے کہ انہیں دنیاوی لحاظ سے نفع بخش مضامین کا متبادل بنا دیا گیا ہے لہذا طلبہ اس منفعت کی وجہ سے نصاب میں عربی یا فارسی کا انتخاب نہیں کرتے اس کی وجہ سے ہماری نئی نسل کا بیشتر حصہ اردو کلاسیکس اور اس زبان کے محاورات اور تلمیحات سے قطعاً ناآشنا ہے۔ یہ ہماری تہذیبی اور لسانی زندگی کے انحطاط کی نشانی ہے اور اس کو روکنے کے لئے ہمیں عربی اور فارسی کو نصاب تعلیم میں ایک مستقل اور اہم مقام دینا ہوگا یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اصطلاحات اور مواد کے لحاظ سے اردو میں خاصی توانائی موجود ہے۔ اس میں قانونی لغات بھی ہیں اور معاشیات طب، سیاسیات نباتات، ریاضی اور دیگر مقام سے متعلق اصطلاحات کی متعدد کتابیں بھی موجود ہیں۔ اس وقت اردو مترادفات اور دفتری اردو کے موضوع پر جو کتابیں ہیں ان کے علاوہ ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جو حیدرآباد دکن میں طبع ہوئیں۔ اور ان عوامل کو پیش رکھنا چاہیے جن کی وجہ سے یونیورسٹی کی حد تک تدریس و تعلیم اور نصاب کلیتاً اردو میں تھے خود ہمارے نزدیک ہی ریاست بہاولپور میں ہر شعبہ

میں اردو رائج تھی جس میں نہ صرف داخلی دفتری امور انجام دیئے جاتے تھے بلکہ برطانوی حکومت اور دوسری ریاستوں کے ساتھ اردو میں اہم ترین موضوعات اور معاملات کے ضمن میں بھی مراسلت اردو میں ہی ہوتی تھی

قومی سطح پر ہمارے مختلف آئینوں میں زبان کے مسئلے کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا اور اردو کو اس کا حقیقی مقام دینے کے اعلانات کیئے گئے ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ کہا گیا تھا کہ زبان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے صدر مملکت دس سال کے بعد ایک کمیشن مقرر کریں گے۔ وہ آئین دو سال بعد منسوخ کر دیا گیا اس کے بعد ۱۹۶۲ء کے آئین میں یہ کہا گیا کہ صدر مملکت دس سال کے بعد زبان کے مسئلہ پر کمیشن مقرر کریں گے وہ آئین ۱۹۶۹ء میں منسوخ ہو گیا ظاہر ہے کہ اگر تواتر کے ساتھ مارشل لا نہ لگتے تو اردو اپنے تشخص اور مقام کی طرف ضرور بڑھتی۔ پھر ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کی رو سے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا اور اس امر کا اعلان کیا گیا کہ سرکاری محکموں اور دوسرے مقاصد کے لیے اردو کو پندرہ سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۸۸ء تک رائج کر دیا جائے گا۔ اس میعاد کے اختتام میں صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جو مختلف ادارے قائم کر رکھے ہیں ابھی سے ایک ایسا جینی فیسٹو شائع کریں کہ ۱۹۸۸ء کے اختتام تک اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہو جائے یا اس میں اگر کوئی موانع ہیں تو ان سے بھی عوام کو روشناس کرایا جائے اب مارشل لاء اٹھ چکا ہے اور منتخب حکومت سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس اہم قومی مسئلہ پر اپنی بھرپور اور مشترکہ توجہ مرکوز کرے۔

انجمن ترقی اردو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے وقت سے لے کر اب تک جس جہد مسلسل کا اظہار کرتی رہی اس کی وجہ سے اردو اپنے اصل مقام کی طرف گامزن ہے۔ اس سلسلہ میں ماضی قریب میں پنجاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم و مغفور کا نام مجاہد اول کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ انہوں نے سالانہ جلسوں اردو انجمنوں کی کانفرنسوں اور دیگر طریقوں سے اسے اصلی مقام دلانے کے لیے مسلسل آواز اٹھائی اور لوگوں کے اذہان پر یہ بات نقش کر دی کہ اردو قومی زندگی میں پاکستان کا دوسرا بڑا ستون ہے اردو کے لیے ان کے مجاہدات ہمیشہ یادگار رہیں گے اور میرے خیال میں ابھی ہمیں ایسے دیوانوں کی بے حد ضرورت ہے۔

(انجمن ترقی اردو کے جلسہ کے لیے لکھا گیا)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے امتحان میں بینک افسران کی شمولیت اور نمایاں کامیابی

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے زیر اہتمام حال ہی میں منعقد کردہ خصوصی تربیت کا کورس بعنوان۔ "دفتری اردو برائے سرکاری افسران" میں بینک دولت پاکستان کے کل اٹھارہ افسران نے شرکت کی۔ بارہ امیدوار اسائنمنٹ اور تحریری دونوں امتحانوں میں شریک ہوئے۔ جب کہ چھ امیدوار بوجوہ تحریری امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ بہ اعتبار نتائج خلیل الرحمان ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ انتظامی امور، اسائنمنٹ اور تحریری دونوں امتحانوں میں مجموعی طور پر ۵۔۹۱ فیصد اوسط نمبر حاصل کر کے کامیاب امیدواروں میں سر فہرست ہے۔ جب کہ سید نسیم احمد شاہ اور اقبال احمد اسسٹنٹ اکاؤنٹس افسران، محکمہ حسابات نے مجموعی طور پر ۸۹۔۸۰ فیصد اور ۸۸۔۵۰ فیصد اوسط نمبر حاصل کر کے بالترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔

پندرہ روزہ خبر نامہ کراچی ۸ جون ۸۷ء

یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا فیصلہ

اخباری اطلاع کے مطابق یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے آئندہ مالی سال کے دوران یونیورسٹیوں کو نئے منصوبوں ترقیاتی کاموں اور آسامیوں کے لئے گرانٹ کی فراہمی سے معذوری ظاہر کی ہے پنجاب یونیورسٹی اور انجینئرنگ یونیورسٹی کو آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ نئے منصوبے تیار نہ کریں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا یہ فیصلہ حکومت کی دگرگوں مالی حالت کا ثبوت ہے۔ ایک طرف تو حکومت تعلیم کے فروغ اور تعلیمی اداروں کی حالت کو بہتر بنانے کی دعویدار ہے دوسری طرف اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لئے فنڈز فراہم کرنے سے معذوری کا اظہار کیا جا رہا ہے اور نئے منصوبوں کی تیاری ترقیاتی کاموں اور آسامیوں کے لئے حکومت کے پاس رقم نہیں۔ حکومت کے اعلیٰ ملوں سرکاری رقوم میں خورد برد اور ٹیکس چوری نے جو صورتحال پیدا کر دی ہے اس کا نقشہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین نے اگلے روز ایک انٹرویو میں پیش کیا اور بتایا کہ ترقیاتی بجٹ کا بڑا حصہ خورد برد کر لیا جاتا ہے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے اس فیصلے سے یونیورسٹیوں کی کارکردگی کا متاثر ہونا ناگزیر ہے نئے منصوبوں اور آسامیوں کے لئے فنڈز کی عدم فراہمی سے یونیورسٹیوں کی تدریسی سرگرمیوں پر ناخوشگوار اثر پڑے گا یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا یہ فیصلہ کسی لحاظ سے بھی پسندیدہ نہیں اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

روزنامہ جنگ لاہور - ۲۲ جون ۱۹۸۷ء

شاہد نعیم (جدہ)

بہار میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا

انجمن ترقی اردو بہار نے تین لاکھ کی ممبر سازی کی ہے اور قریہ بہ قریہ اپنی تحریک کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ وقت کے سیاسی حریفوں سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم آج یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ہندوستان میں دوسری زبانوں کو حق ہے ویسے ہی اردو کو بھی پوری طرح پھیلنے اور جینے کا حق ہے۔ اگر یہ حق نہیں دیا گیا تو جو جمہوری حکومت ہے۔ دستور کے مطابق ہم اپنے حقوق کی بحالی کے لیے کارروائی کریں گے۔ یہ بات برصغیر کے ممتاز دانشور انجمن ترقی اردو رانچی، ادارہ ادب اسلامی ہند، کے صدر ڈاکٹر احمد سجاد نے جدہ میں منعقدہ ایک ادبی محفل میں کہی انہوں نے کہا کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے۔ کئی ہزار مترجم اردو ٹائپسٹ مختلف اداروں میں برسرروزگار ہیں اس طرح مختلف سرکاری ادارے اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کر رہے ہیں ڈاکٹر احمد سجاد سعودی عرب اسلامی ترقیاتی بینک کی دعوت پر تشریف لائے اور اسکالر شپ اسکیم کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے شرکت کی

ڈاکٹر احمد سجاد نے نمائندہ "جنگ" کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت ملت اسلامیہ کی جو صورت حال ہے۔ پورے عالم اسلام میں وہی صورت اردو کی بھی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ ایک زمانے میں اردو غیر مسلموں کی بھی زبان تھی۔ بلاشبہ آج بھی بہت سے غیر مسلم ادیب و شعراء اردو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ انتہائی وسیع ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ گویا اردو مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی جو صورت حال ہے۔ اس کے عکس اس کے اثرات اردو زبان و ادب پر بھی پڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان اپنی تشکیل اور پیدائش سے لے کر آج تک اپنی ارتقاء کی اس منزل تک آئی ہے۔ جہاں آپ اور ہم بیٹھے ہوئے ہیں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ خواہ امیر خسرو کی غزلیات سے چلیں یا میر درد مومن و غالب کا غزلیات کا مطالعہ کریں وہاں سے اقبال" اور اس سے اور بھی آگے آپ پڑھیں تو صاف محسوس ہوگا کہ وہ شعراء اپنی ادبی تاریخ میں مقام تنظیم سے قائل ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی ان تہذیبی قدروں کو زیادہ جذباتی سطح پر قبول کیا اور پھر اس کا اظہار بھی کیا۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی تہذیبی قدروں کی بجائے مختلف قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کی اور اس آمیزے سے ایک نئی چیز بنانے کی کوشش کی تو اس میں کچھ قابل ذکر کام تو ضرور ہوا لیکن ایک مخصوص سطح سے وہ بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

کسی بھی ادب پارے کو آگے بڑھنے میں جس عمل کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے بارے ڈاکٹر سجاد نے کہا کہ تمام ناقدوں کا اتفاق رائے ہے۔ کہ وہ بات تنقیدی عمل ہو یا تجدیدی عمل ہو۔ اس کا اتنا جذباتی اظہار ہو اور اس کا اتنا جمالیاتی اظہار ہو کر وہ چیز کافی اعلیٰ اور ارفع ہو سکے اور اعلیٰ ادب کا شاہکار بن سکے لیکن ان کا جمالیاتی اظہار اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تخلیق کار اپنی فکر و خیال کو پوری گہرائی اور روح کی تمام تر گہرائیوں سے سطحی جذبات سے ہٹ کر قلبی جذبات سے پیش نہیں کرے گا۔ اس کی تخلیق ادب پارہ نہیں ہو سکتا وہ چیزیں جن کا تعلق ایمان عقیدے سے ہے۔ وہ بڑی گہرائی سے قارئین کو متاثر کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امیر خسرو سے لے کر اقبال تک جو آج کی شاعری میں اسٹرونا ڈ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں جو باتیں ہیں۔ چاہیے وہ تصوف کی صورت میں ہوں چاہے وہ خدا سے عشق کی صورت میں یا ملت کے احوال کو پیش کرنے کی صورت میں۔ ان تمام باتوں میں جو بات خون کی طرح گردش کرتی نظر آتی ہے وہ یہی ہے۔ کہ انکی تہذیبی قدریں قلب و جگر میں بہت دور تک اتری ہوئی تھیں لہذا ان کی تخلیقات "ادب پارہ" کی حیثیت سے آج بھی عروج پر ہے

ڈاکٹر احمد سجاد نے کہا کہ دراصل عقیدہ و اقدار کو ہم لازم و ملزم قرار دیتے ہیں عقیدہ کسی انسانی قدر کا ماخذ ہوتا ہے۔ اور اس کی اسپرٹ کو برقرار رکھتا ہے مزید یہ کہ وہ خود اپنی استحصال کو روکتا ہے اور "منافق" آدمی کوئی بڑی تخلیق پیش نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا اندر ہمیشہ دو شخص پر منقسم رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ تشدیدی یا وہ جذباتی عمل جو یکسوئی کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا ہو وہ کسی بڑے مقام تک

نہیں پہنچ پاتا لہٰذا ادبی دنیا میں یہ بات اسی وجہ سے مشہور ہے کہ دنیا کی جتنی بھی اعلیٰ درجے کی الہامی کتابیں ہیں وہ بیک وقت مذہبی بھی ہیں اور اپنے اپنے دور کی نہیں۔ آج بھی اپنی تخلیق کا اعلیٰ شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ چاہے وہ اولڈ ٹسٹامنٹ ہو نیو ٹسٹامنٹ چاہے وہ مہا بھارت ہو یا رامائن ہو۔ چاہے قرآن پاک ہو۔ انہوں نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا کہ مذہبی انداز سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ کتابیں اپنے وقت میں نہیں بلکہ آج بھی بہترین ادب پارہ ہیں۔ ڈاکٹر احمد سجاد رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد بھی ہیں۔ انہوں نے ادب پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں ادب کا جو پس منظر ہے اس کے اندازہ میں یہ بات شامل ہے اور اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کہ واقعتاً ہماری تہذیبی قدریں ہماری تخلیقی قدروں سے کس قدر جڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سعودی عرب میں مقیم اردو کے قدرداں اور مداح اپنی تہذیبی قدروں کے سوتوں کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں کبھی کبھی تخلیقی۔ سوتے اس وقت بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ جب لکھنے یا کہنے والا اپنی باتوں کو ذرا سطحی طور پر لے لیتا ہے۔ یعنی اگر صرف مادی خوش حالی کی جانب توجہ دیدی جائے اور فکری باتیں کہنے سے منہ پھیر لیا جائے تو پھر اس قسم کی تخلیقات میں بھی سطحیت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے انہوں نے سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ میں مقیم اردو داں حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ حضرات اس مقام پر ہیں کہ جہاں آپ اپنی ملت کو بھی اور زبان و ادب کو اپنی شاعری کو اس طرح پیش کریں کہ آپ کا ادب شاعری اور ملت کسی ضعف کا شکار نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں جو انتشار کی کیفیت ہے اس کے اندر نئی دنیا کی تعمیر کا بھی لاوا پک رہا ہے۔ ایسے میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے تخلیق کار اس لاوے اور انتشار کو ایک نئی شکل دیں اور پھر پوری دنیا کی امامت کے لئے وہ اپنے افراد کو کھڑا کریں۔ اس سلسلے میں اردو زبان و ادب سے تخلیق کار بہت ہی بنیادی رول ادا کر سکتے ہیں اس طرح لکھنے والی تخلیق اور زبان و ادب کے لیے بھی یہ بات نیک فال ہوگی، اور ادب اسلامی کے بارے میں ایک سوال کے جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سجاد نے کہا ملک کے طول و عرض میں تعمیری ادبی تحریک ادارہ ادب اسلامی ہند کے زیر اہتمام تعمیر پسند ادیبوں ناقدوں اور شاعروں کی ایک کل ہند کانفرنس ۲۴ اکتوبر تا ۲۶، ۸۷ء حیدرآباد میں منعقد ہو رہی ہے

(بشکریہ روزنامہ جنگ پنڈی)

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی نے بطور استاد، محقق اور اسکالر گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، انہوں نے خاص طور پر ادبی تنقید میں نئی جہتوں کے حوالے سے ایسا مثبت اور تعمیری کام کیا جو آنے والے دنوں میں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہو گا ڈاکٹر وحید قریشی ان دنوں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین
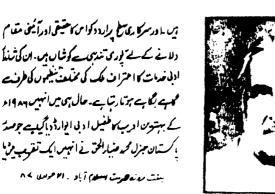
ہیں اور سرکاری سطح پر اردو کو اس کا حقیقی اور آئینی مقام دلانے کے لئے پوری تندہی سے کوشاں ہیں۔ ان کی شاندار ادبی خدمات کا اعتراف ملک کی مختلف تنظیموں کی طرف سے گاہے بگاہے ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں انہیں ۱۹۸۶ء کے بہترین ادیب کا طفیل ادبی ایوارڈ دیا گیا ہے جو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے انہیں ایک تقریب میں دیا

ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۱ جولائی ۸۷

عاصم صہبائی

ذریعہ تعلیم، تضاد ختم کیا جائے

چالیس برس گزر جانے کے بعد آج اس سوال نے سر اٹھایا ہے کہ کیا موجودہ ذریعہ تعلیم ہمارے تقاضوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور وہ کون سا ذریعہ تعلیم یا طریق کار ہے جس کو اپنا کر ہم ایک نظریاتی ذریعہ تعلیم تشکیل دے سکتے ہیں۔ تاکہ وہ ہماری امنگوں اور خواہشات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سوچ آج کل صدر مملکت سے لے کر ایک عام پاکستانی کے لیے باعث تشویش بن گئی ہے اور تعلیم کے ماہرین بھی اس کا جواب تلاش کرنے میں مصروف ہیں لیکن رسی کا سرا ان کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ اس سوال کے ساتھ ایک اور اضافی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چالیس برس گزر جانے کے بعد آج اس کی ضرورت کیوں محسوس کی جانے لگی ہے اور یہ احساس کیوں پیدا ہوا ہے کہ اب تک جو ذریعہ تعلیم چلا آ رہا تھا یہ ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں تھا۔ یہ بات قیام پاکستان کے فوراً بعد کیوں محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ان تمام باتوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس پس منظر کا جائزہ لینا ہوگا جس کی بدولت آج یہ سوال سامنے آیا ہے اور پھر یہ سوچنا بلکہ فیصلہ کرنا ہوگا اب ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا ہے تاکہ ذریعہ تعلیم میں جو نقائص یا خامیاں جو کمزوریاں اور جو تضاد موجود ہیں ان سب سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اور ایک قابل قبول طریق کار کو اپنا لیا جائے تاکہ اندھیرے میں بھٹکنے کا یہ سفر ختم ہو جائے اور ہم فخر کے ساتھ اپنے ذریعہ تعلیم کو بطور مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

یہ پس منظر قدرے طویل تو ہوگا لیکن اس سے وہ تمام حقائق سامنے آ جائیں گے جن کی بدولت نوبت یہاں تک آئی ہے کہ ہم بھٹک کر رہ گئے ہیں اور باوجود کوشش کے اس سراب سے باہر آ نہیں رہے ہیں۔

قرآن حکیم کا نزول ہی "اقرا" سے ہوا جس کا مطلب ہے "پڑھ"، تو ظاہر ہوا کہ اسلام وہ واحد دین ہے جس کی ابتدا ہی حصول علم سے ہوئی اور اسلام ہی وہ واحد دین برحق ہے جس نے حصول علم کے دروازے کو سب کے لیے کھول دیا تھا۔ اور علم کے حصول پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ جنگ بدر میں قریش کے اسیران جنگ کی رہائی کی شرائط میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ جو اسیر زر فدیہ ادا نہیں کر سکتے۔" لیکن جو پڑھے لکھے ہیں وہ مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم دے کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سرور کونین ؐ کی ذات اقدس نے علم کے حصول کو سب سے زیادہ اہمیت و فوقیت کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ حصول علم کے بارے میں حضور اکرم ؐ کی یوں تو بے شمار احادیث موجود ہیں لیکن چند ایک کو نمایاں طور پر افادیت حاصل ہے مثال کے طور پر ارشادِ گرامی ہے کہ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین تک جانا پڑے" پھر فرمایا "علم جنت کے راستوں کا نشان ہے۔" اور سب سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے حصول علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ علم کو فرض قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے دورِ اقتدار میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ توجہ حصول علم پر مرکوز رکھی اور تعلیم کے میدان میں ایسے ایسے ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیئے ہیں جن پر آج بھی دنیا حیرت زدہ ہے اور ہم مسلمان ہونے کے ناتے سے علم و فن کے ان عظیم ذخیروں پر آج بھی نازاں ہیں۔ ہمارا ماضی حصول علم کے اعتبار سے ہمارے جدید حال سے بہت زیادہ تابناک اور ناقابلِ فراموش ہے۔

بات کو آگے بڑھانے سے قبل یہاں ایک اہم سا نکتہ پیش کر دوں کہ میری نظر میں مسلمان آج بھی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ میرے اس دعوے کی دلیل بلکہ ثبوت یہ ہے کہ اگر حروف کو پڑھ لینا ان کی شناخت کرنا انہیں خوبی ذہن نشین کرنا ہی علم ہے تو مسلمان اس بیسویں صدی میں بھی یہ علم جانتے ہیں کہ وہ قرآن حکیم کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ کسی سکول کالج یا کسی بڑی دانش گاہ کے سند یافتہ ہوں وہ مسلمان جو جدید تعلیم سے آراستہ نہیں ہے لیکن وہ قرآن کریم کو پڑھ سکتا ہے وہ نا خواندہ نہیں بلکہ خواندہ تعلیم یافتہ ہے اور اس سے انکار کرنا بجائے خود حقیقت کا اعتراف نہ کرنا ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے جب انگریز کا اقتدار تھا۔ تفصیل سے بات آگے آئے گی۔ یہاں صرف یہ اشارہ کرنا ہے کہ انگریز کے دور میں مکتب یا طالب علم پہلے سکول جاتے تھے اور بعد از دوپہر مسجد کا رخ کرتے تھے تاکہ دنیا اور دین دونوں کے علوم میں تو...

برقرار رہے۔ اس طریق کار سے جسم اور روح دونوں کے تقاضے بھی پورے ہو جاتے تھے لیکن آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کے طالب علم انگلش میڈیم کی جانب زیادہ متوجہ ہیں لیکن مسجد کی راہ سے ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جسم تو پرسکون ہے لیکن روح میں ایک اضطراب سا برپا ہے وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے حصول علم کی دوڑ میں اپنے ظاہر کو تو چھپا لیا ہے لیکن باطن کو روشن نہیں کر سکتے ہیں۔ بالکل جاپانی کھلونے کی طرح باہر سے خوبصورت اندر سے کھوکھلے مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں جس چیز کو عبادت کی حد تک ترجیح دی وہ علم کا پھیلانا اور علم کا حصول تھا وہ جہاں بھی گئے علم کے چراغ روشن کرتے گئے۔ سمرقند، بخارا، نیشاپور، بغداد، شیراز، اصفہان، قاہرہ، تیونس، قیروان، غرناطہ، اشبیلیہ، قرطبہ، دہلی، لاہور، ملتان، پشاور غرضیکہ وہ جہاں جہاں سے گزرے علم کے اجالوں سے ناخواندگی اور جہالت کے ساتھ ساتھ پسماندگی کے اندھیروں کو تابناک بناتے گئے، غرناطہ اور قرطبہ کے دانش گاہوں سے اہل یورپ کے دو مفکرین فیض یاب ہو کر گئے تھے۔ جنہوں نے واپس جا کر نہ صرف یورپ کی جہالت اور پسماندگی کو دور کر دیا بلکہ یورپ میں احیائے دین کی تحریک کا آغاز بھی کروایا۔ یہ بھی مسلمان مفکرین تاریخ دان، کیمیادان، سائنس دان، فلکیات و نجوم نیز سمندروں کے ماہرین ہی تھے جن کی تحقیقات اور جن کی کتابوں نے یورپ کی زندگی میں ایک جدید انقلاب برپا کر دیا تھا۔ حکمت میں بھی مسلمانوں نے ہی یورپ کو آگے بڑھایا تھا، علم ہندسہ میں بھی یورپ نے مسلمانوں ہی سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ یورپ کی جدید ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے علم دوست نے ہی استوار کی تھی۔ یہ سب کچھ صرف مسلمانوں کے ذوق علم اور شوق تحقیق کا حاصل تھا علم کے میدان میں دنیا کی ہر قوم سے آگے بلکہ سب کے پیش رو تھے انتہا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زوال پذیر عہد میں بھی سلطنت کھو جانے کے باوجود حصول علم کے چراغ کو اپنے خون جگر سے روشن کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے علم کو پھیلانے میں بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دیا تھا حصول علم کے لیے ان کے دروازے مسلمانوں کے علاوہ ہر قوم کے افراد پر کھلے ہوئے تھے۔ جو علم کے حصول کے لئے آتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں میں علم کا دریا مسلمان مرد اور عورت کو فیض یاب کرتا رہا ہے اور مسلمانوں نے اس میدان میں نامور خواتین پیدا کیں۔ مسلمانوں کے مدارس میں حصول تعلیم کا جو طریق کار تھا اور جو نصاب تھا وہ بادشاہ سے لے کر ایک عام محنت کش تک یکساں تھا۔

اس میں چھوٹے یا بڑے کی کوئی تمیز یا فرق نہیں تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ تمام انسان برابر ہیں اور تعلیم سب انسانوں کی مشترکہ میراث ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ایک ہی اصول کے مطابق اٹھنا بیٹھنا اور پڑھنا پڑتا تھا آج کی طرح یہ طریق کار نہیں تھا کہ بڑے لوگوں یا اونچے افسروں کے بچوں کے لئے اعلیٰ درجہ کے ایک سکول ہوتے تھے اور نچلے درجے کے لیے ٹاٹ والے اسکول ہوتے تھے۔ یہ فرق نہیں تھا، بادشاہ اور محنت کش دونوں کے بچے ایک ساتھ ایک ہی جگہ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ استاد کی نظر میں شہزادہ اور غریب دونوں برابر ہوتے تھے۔ صرف حصول تعلیم کا ذوق و شوق اور اس کا معیار ہی سب سے بڑا اصول پسند اور ناپسند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسے کے مسلمانوں میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، محل اور جھونپڑے کا فرق نہیں تھا سب ایک دوسرے کے ہمدرد، غمگسار، محرم اور رفیق کار تھے۔ حق بات کہہ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ایک جسم اور یک جان تھے۔ مرد اور عورت دونوں علم کا حاصل کرنا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی مناسب ہے کہ دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم تھے جن کے ہاں علم کو فرض کا درجہ حاصل تھا اور علم کا حاصل کرنا ان کے نزدیک عبادت سے کم نہیں لیکن مسلمانوں کے برعکس دنیا کی باقی قوموں میں علم چند خاندانوں تک محدود ہوا کرتا تھا، عیسائیت، یہودیت، آتش پرست، ہندو اور دیگر اقوام میں علم یا تو بادشاہ اور امراء کے لوگوں کے علاوہ مذہب کے پیشواؤں تک محدود تھا یا پھر منظور نظر افراد تک موجود تھا۔ عام لوگ علم حاصل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر یہ پتہ چل جاتا تھا کہ کسی عام آدمی نے کسی طرح حاصل کر لیا ہے تو اسے یا تو زندہ جلا دیا جاتا تھا یا اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہ اعزاز اور یہ شرف صرف مسلمانوں کو حاصل تھا کہ علم کے حصول میں بادشاہ اور مزدور برابر شریک سفر تھے اور علم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ حوصلہ افزائی کا رنگ زیادہ تھا۔

یہ انکشاف میرے پڑھنے والے دوستوں کے لیے باعث حیرت ہوگا دنیا میں سب سے پہلے دوسری اقوام کی زبانوں میں علم حاصل کرنے اور اس پر دسترس پانے میں بھی مسلمانوں نے ہی پہلا قدم اٹھایا تھا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عربی اور فارسی زبانوں میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے تراجم کر کے پیش کئے جو آج بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کی تقلید کرتے ہوئے بعد میں دوسری اقوام نے بھی عربی اور فارسی کی کتابوں کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ لیکن [illegible] مسلمان ہی تھے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں علم کے چراغ روشن کرنے میں بھی مسلمان ہی پیش پیش تھے یہ الگ بات ہے کہ آج ہم یورپ سے متاثر ہو کر اپنے علم و فن کے تابناک ماضی کو فراموش کر بیٹھے ہیں

مسلمانوں میں حصول علم کی رفتار میں اس وقت فرق رونما ہونا شروع ہوا جب مسلمان فاتح بن کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ بعد میں جب مسلمانوں اور ہندوؤں میں میل ملاپ بڑھنے لگا تو دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کرنے شروع کئے۔ ہندو دھرم نے مسلمانوں سے بہت کچھ لیا لیکن مسلمانوں نے ہندو دھرم سے جو کچھ حاصل کیا ان میں شادی بیاہ کی رسمیں، جہیز کا سلسلہ، مخلوط شادیوں کا رواج، عورت پر پابندیاں اسے گھر میں قید کر دینے اور پردہ کرنے کا رجحان شامل تھا۔ دونوں قوموں کے میل جول نے ایک نیا ماحول پیدا کر دیا   ہندو دھرم میں علم صرف برہمن یا ہندو حکمرانوں تک محدود تھا۔ عورت علم حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مسلمانوں نے بھی اسلام کے اس اصول کو نظر انداز کر دیا کہ "علم کا حاصل کرنا مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"، مسلمانوں نے بھی ہندو اصول کو اپناتے ہوئے اپنی مسلمان عورتوں کو علم کے حصول سے دور تر کر دیا تھا۔ اور یہ بھی ہندو کی طرح اب بادشاہوں اور امرا کی خواتین تک محدود کر دیا گیا تھا، عام مسلمان علم حاصل کرنے میں آزاد تھے لیکن مسلمان عورت بڑی حد تک علم کے حصول سے محروم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں سے مسلمان عورت کی گھریلو اور سماجی قدروں کا وہ اذیت ناک دور شروع ہوا ہے جس کے ناپسندیدہ اور ناخوش گوار اثرات آج بھی ہمارے ہاں عورتوں پر محسوس کئے جا رہے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں اور تو سب کچھ تھا لیکن جہاں تک علم کے حصول کا تعلق تھا اس کے دروازے عام مسلمان عورتوں پر بند ہو چکے تھے صرف شہزادیاں یا امرائے حکومت کی خواتین تعلیم حاصل کرنے میں آزاد تھیں اور پھر وہ وقت بھی آیا جب ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال اور انگریز کے ساتھ ساتھ ہندو کا عروج شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کو جب انگریز مکمل طور پر قابض ہو گیا تو اس نے اور ہندو نے مل کر مسلمانوں کا وہ استحصال کیا جس کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریز نے اقتدار مسلمانوں سے حاصل کیا تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا اور یہی وہ خوف تھا جس کی وجہ سے انگریز نے مسلمانوں کو پس ماندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا مسلمان بھی انگریز سے شدید نفرت کرتے تھے اس لیے وہ ہندو کی طرح انگریز کے حلقہ بگوش نہ بن سکے۔ انہیں دنوں انگریز نے ایک ماہر تعلیم انگریز میکالے کی خدمات حاصل کیں۔ جس نے پورا نظام تعلیم تبدیل کر کے اسے انگریز کی خواہش اور پسند کے مطابق بنا دیا۔ میکالے نے جو نظام ترتیب دیا تھا اس کا سب سے بڑا مقصد دفتروں کے کلرک پیدا کرنا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں دشواریاں پیدا کر دی گئیں۔ ہندو نے انگریز کے اس نظام تعلیم کا خیر مقدم کیا اور انگریز کا بنایا ہوا نظام قبول کر کے اس کے حصول میں لگ گیا لیکن مسلمانوں نے انگریز کی تعلیم کو حاصل کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اسے خلافِ شریعت بھی قرار دے کر ٹھکرا دیا تھا۔ میکالے کی سوچ اور اس کے طرزِ تعلیم کا نظریہ یہ تھا کہ تعلیم کو دو الگ الگ مکتب فکر میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ اونچے افسروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوابوں اور مہاراجوں کے لیے اعلیٰ درجہ کے اسکول اور کالج کھولے گئے تھے اور عام لوگوں کے بچوں کے لیے ایسے اسکول تعمیر کئے گئے تھے جن میں بچوں کو فرش پر بٹھایا جاتا تھا اور ان میں احساس کمتری پیدا کرنے کا راستہ صاف کر دیا گیا تھا انہیں اسکولوں سے انگریز کے دفتروں کے لئے کلرک تیار ہو کر آتے تھے۔ جب کہ بڑے لوگوں کے بچوں کے اسکولوں اور کالجوں سے احساس برتری کا جذبہ لے کر افسر اور حکمران بننے والے برآمد ہوتے تھے۔ اس طرزِ تعلیم نے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہنے لگے تھے۔

مسلمانوں کو تعلیم کے حصول سے تقریباً الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اور ان کے بچے اسکول کی بجائے مسجدوں میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جہاں فارسی اور عربی کے علاوہ اردو ذریعہ تعلیم تھا۔ انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا "گناہ کبیرہ" کے زمرے میں آتا تھا۔ مسلمانوں کی یہ حالت زار دیکھ کر اور ہندو کے اصل عزائم نیز انگریز کے طرز عمل سے آگاہ ہوتے ہوئے سرسید احمد خاں میدان میں آئے انہوں نے ہندو اور انگریز کی چال کی بھانپ لیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید طرزِ تعلیم سے دور رکھنا تھا تاکہ مسلمان ہندو اور انگریز کا غلبہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ سرسید احمد خاں سب کچھ جانتے تھے لیکن انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اگر مسلمانوں نے جدید تعلیم کے حصول کی جانب قدم آگے نہیں بڑھایا تو وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ انہوں نے پختہ عزم کر لیا کہ وہ مسلمانوں کو اس جانب لائیں گے چنانچہ اپنوں کی شدید مخالفت کے باوجود سرسید احمد خاں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور مسلمانوں نے بھی اس راز کو پالیا تھا کہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے انگریز سے انگریز کی زبان میں بات چیت ہونی چاہیئے۔ یہ سرسید احمد خاں ہی کا لگایا ہوا پودا تھا جو بالآخر ایک تناور درخت بن کر علی گڑھ کی تحریک کے نام سے مسلمانوں پر سایہ فگن ہو گیا تھا اور اس دانش گاہ سے وہ قافلہ حریت آگے بڑھا جس نے بالآخر ہندو اور انگریز کو مسلمانوں کی طاقت تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا تھا انگریز کو انگریزی کی تلوار سے کاٹ کر تحریک پاکستان کا راستہ ہموار کر دیا گیا تھا اور بالآخر چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشہ پر پاکستان کی سرحدیں نمایاں ہو کر اجاگر ہو گئیں تھیں۔

پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تھا لیکن ہم نے اس ضرورت کو بالکل محسوس

نہیں کیا کہ ہمیں مستقبل کے لئے ایک نظریاتی نوجوان نسل کو تیار کرنا ہے اور اس نسل کو تیار کرنے کے لیے ہمیں اپنے تقاضوں اور نظریات سے ہم آہنگ نظام تعلیم تشکیل دینا ہے ایک ایسا طرز تعلیم جو نظریہ پاکستان سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچنا تھا کہ اب ہم ایک آزاد اور خودمختار قوم ہیں ہمیں انگریز کے نظام تعلیم کو خیرباد کہہ کر اپنا تشخص ابھارنے کے لیے اپنا طرز تعلیم وضع کرنا ہوگا۔ لیکن ہمارا المیہ یہ تھا کہ انگریز نے ہم کو دو گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔ پہلا گروہ وہ تھا جو [illegible] اغنیا و افسروں پر مشتمل تھا۔ اس میں انگریز کے دور کے اعزاز یافتہ جاگیردار، صنعت کار، سرمایہ دار، نواب اور بڑے لوگ شامل تھے ان کے لیے اعلیٰ درجہ کے اسکول اور کالج موجود تھے جن میں چند ایک ابھی تک موجود ہیں بلکہ گذشتہ چالیس برسوں کے دوران ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوگیا ہے۔ اس گروہ کو یہ گوارہ نہ تھا نہ اب ہے کہ ان کے بچے عام پاکستانیوں کے بچوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں۔ یہ اس لئے کہ افسروں کے بچوں کو آگے کار اپنے افسر والدین کی جگہ افسر بننا ہے اور انہیں اپنے افسر والدین کی طرح اپنے آپ کو حاکم اور عام پاکستانیوں کو اپنا محکوم سمجھنا ہے۔ یہ گروہ اب "ٹاپ سوسائٹی" تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔

دوسرا گروہ یہ تھا یا اب بھی ہے جس میں عام پاکستانیوں کے بچے شامل ہیں ان کے لیے حصول تعلیم میں وہ سہولتیں اور مراعات نہیں تھیں جو پہلے گروہ کے بچوں کو حاصل تھیں اور اب تو ان میں مزید اضافہ بھی ہوگیا ہے پہلے گروہ نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا تھا کہ کل بھی اور آج بھی جن کرسیوں پر جلوہ افروز تھے اور ہیں وہ دوسرے گروہ کی قربانیوں کا حاصل ہے اس گروہ نے ہندو اور انگریز کے خلاف جدوجہد کرکے پاکستان حاصل کیا تھا پہلا گروہ تو انگریز کے دور میں بھی افسر تھا اور پاکستان بننے کے بعد بھی افسر چلا آرہا ہے اس کی سوچ میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اس لیے جب پاکستان بن گیا تو تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا تھا دوسرے گروہ کا فیصلہ تھا کہ طرز تعلیم نظریاتی ہونا چاہیئے انگریز کا نہیں لیکن پہلا گروہ چونکہ انگریز کا پہرہ دیکھ چکا تھا اس سے متاثر تھا اس لئے اس نے پہلے گروہ کو زیادہ طاقت اور اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ وہ عوام میں نہ رہنا چاہتا تھا نہ عوام سے کوئی تعلق رکھنا چاہتا تھا کیونکہ انگریز کے چلے جانے کے بعد وہ انگریز کی میراث کا وارث بن چکا تھا اور اپنے انگریز آقا کی یادگار کو باقی اور زندہ رکھنا چاہتا تھا اس سوچ نے پاکستان کو اس نظریاتی طرز تعلیم سے ابتدا ہی میں محروم کر دیا تھا جس کی آج ایک بار پھر ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور آج ہم سب کو یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ افسر شاہی کی سوچ نے گزشتہ چالیس برسوں میں ہمیں اپنے مقاصد کے حصول سے کس قدر دور کر دیا ہے۔ ملک اور قوم کے یہ چالیس برس جو بالکل رائیگاں چلے گئے ہیں ان کے ذمہ دار کون ہیں؟ اس کی ذمہ دار وہ افسر شاہی ہے جس کے ہاتھ آج بھی ہم سب کی باگ ڈور ہے اور جب تک یہ باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں نہیں آئے گی ہم افسر شاہی کی بدولت یونہی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔

بہرحال جو کچھ ہو چکا ہے اس پر اظہار افسوس کرنا بیکار ہے اب تو یہ سوچنا اور فیصلہ کرنا ہے کہ اب ہمیں ذریعہ تعلیم کو اپنی ضروریات کے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ہم اب بھی ایک دوسرے کے کندھوں پر بندوق رکھ کر داغتے رہے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے ہمیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اب از سر نو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اب ہم وہ کونسا طریق کار اپنائیں جس سے ہم ذریعہ تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کے لیے خاطر خواہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند ایک گزارشات یہ ہیں۔

سب سے پہلے ماہرین تعلیم کو اپنا ذہن اور اپنا دل صاف کرنا ہوگا اور اس کے بعد انہیں ایک ایسا نصاب تعلیم ترتیب دینا ہوگا جو ہر اعتبار سے ہماری ضروریات سے ہم آہنگ ہو نیز اضافی کتابوں کا بوجھ اتار پھینکنا ہوگا تاکہ طالب علم اپنے نصاب کی مخصوص کتب پر توجہ دے سکیں ایک ہی مضمون پڑھانے کے لیے کسی مزید اضافی کتاب کی ضرورت سے چھٹکارا دلانا ہوگا۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پہلی جماعت سے لیکر اوپر کی جماعت تک بچوں پر غیر ضروری کتابوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے خاص طور پر پہلی جماعت کے معصوم طالب علم کے بستہ میں پانچ کتابیں، کاپیاں اور دیگر لوازمات موجود ہوتے ہیں اور جماعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کتابوں میں بلا جواز اضافہ کیا جاتا ہے۔ بچے کتابوں کا یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتے اور نتیجہ یہ کہ وہ حصول علم میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں بلکہ فرار کا راستہ تلاش کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں ضرورت ہے کہ پہلی جماعت سے اوپر تک کم سے کم جو کتابیں پڑھائی جاتی وہ عمر کے لحاظ سے بچوں کے ذہن کے مطابق ہوں نیز وہ کتابیں اس لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں کہ ایک تو بچے انہیں دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ اساتذہ بھی بچوں کو یہ تمام کتابیں پڑھا نہیں پاتے ہیں البتہ اس طریق کار کا مالی فائدہ یا تو اس ادارے کو جاتا ہے جو یہ کتابیں شائع کرتا ہے یا پھر اس ادارے کے ان سرپرستوں کا بھلا ہو جاتا ہے جو بالائی آمدن کی خاطر بچوں کے ساتھ ان کے والدین پر بھی بلا جواز مالی بوجھ ڈالنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کتابیں جس قدر کم ہوں گی تعلیم کا معیار اتنا ہی بلند ہوگا۔

انگریز کے دور میں تعلیم کا معیار اس لیے اونچا تھا کہ اس میں کم سے کم کتابوں کو زیر استعمال رکھا جاتا تھا۔ درجہ اوّل سے درجہ چہارم تک زیادہ سے زیادہ تین کتابیں ایک قلم دوات اور ایک سلیٹ ہوتی تھی۔ درجہ اوّل میں صرف ایک قاعدہ ہوتا تھا جو صرف اردو تک محدود تھا۔ بچوں کو تختیوں پر سیاہی اور قلم سے لکھنے کی تربیت دی جاتی تھی جس سے تحریر خوش خط ہو جاتی تھی۔ دوسری تیسری اور چوتھی جماعت میں اردو کی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب درجہ بدرجہ پڑھائی جاتی تھی جس کے ساتھ ابتدائی حساب اور جغرافیہ کی چھوٹی کتابیں ہوتی تھیں اور تمام نصاب اردو میں ہوتا تھا۔

علم ہندسہ بھی اردو میں سکھایا اور پڑھایا جاتا تھا۔ جماعت پنجم سے انگریزی کی تعلیم شروع ہوتی تھی اور جماعت دہم تک مل ملا کر پانچ کتابیں الگ الگ نصاب کی ہوتی تھیں۔ انگریزی پڑھاتے وقت علم ہندسہ انگریزی میں اردو کے علاوہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس وقت کے اساتذہ محنت کش ہوتے تھے، تنخواہیں بھی بہت کم ہوتی تھیں وہ نصاب کو تین تین ماہ میں تقسیم کر لیتے تھے اور ہر تین ماہ بعد امتحان لیے جاتے تھے تا کہ طالب علم کے ساتھ استاد کی کارکردگی کی بھی آزمائش ہوتی تھی اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی جماعت کے طالب علم کمزور نہ رہنے پائیں۔ ٹیوشن پڑھانا اس وقت کے استاد پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا سرے سے رواج ہی نہیں تھا۔ خلاصہ گیس پیپر اور اضافی کتابوں کے بارے میں اس وقت کے اساتذہ نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اگر کسی استاد کسی جماعت میں کسی طالب علم کے پاس سے اس طرح کا خلاصہ گیس پیپر یا اضافی کتاب برآمد ہو جاتی تھی تو اسے استاد اپنی توہین سمجھتا تھا اور طالب علم کی جو شامت آجاتی تھی وہ ایک الگ بات تھی۔ اس دور کے استاد انتہائی طور پر ذمہ دار ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ انگریز کے دور کے کم پڑھے ہوئے بھی آج کے اونچے تعلیم یافتہ افراد سے بہت آگے ہیں اگر انگریز کے اس ذریعہ تعلیم کو اپنی ضرورت سے ہم آہنگ کر کے از سر نو اپنا لیا جائے تو اس کے خاطر خواہ برآمد ہو سکتے ہیں اور تعلیم کا معیار اونچا ہو سکتا ہے۔

لیسٹر طیکہ اسکولوں میں اضافی کتابوں، گیس پیپروں اور خلاصوں کا داخلہ بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے نیز یہ قانون بنا دیا جائے کہ کوئی ادارہ خلاصہ گیس پیپر اور اضافی کتاب شائع نہیں کر سکتا اور اگر کرے گا تو سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ نیز اساتذہ پر بھی یہ پابندی لگا دی جائے کہ وہ ٹیوشن نہیں پڑھا سکتے اور ملک میں حصول زر کے لیے جو ٹیوشن سنٹر کھلے ہوئے ہیں انہیں بالکل بند کر کے غیر قانونی قرار دے دیا جائے اس سے نہ صرف اساتذہ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے گا بلکہ طالب علم بھی کھلے دل کے ساتھ حصول علم میں مصروف ہو جائیں گے۔

تعلیم کے معیار کو گرانے میں ایک زہر قاتل یہ ہے کہ ملک میں بلکہ ہر صوبہ میں اور اب تو ہر شہر میں کتب فروشوں اور بڑے کتب کے تاجروں نے محکمہ تعلیم سے منظوری لیے بغیر مختلف جماعتوں کے لیے اساتذہ سے ملی بھگت کر کے اضافی کتابیں چھپوانے یا چھاپنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور یہ کتابیں سکولوں میں اساتذہ کی مرضی سے داخل کی جا رہی ہیں جن سے جہاں والدین پر اضافی بار پڑ رہا ہے وہاں اساتذہ بچوں کے مستقبل کو نظر انداز کرتے ہوئے مال کما رہے ہیں ایسی کتابوں پر فوراً پابندی لگا دی جائے اور نصاب کی کتابیں صرف حکومت خود یا اس کے منظور کردہ ادارے شائع کرنے کے مجاز ہوں لیکن یہ ادارے محدود ہوں بے شمار نہ ہوں جیسے آج کل موجود ہیں۔

و کتابوں کی قیمت کم سے کم ہونی چاہیئے تا کہ والدین آسانی کے ساتھ انہیں خرید سکیں اس وقت کتابوں کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ یہ والدین کمر توڑ دینے کے لیے کافی ہیں حکومت کو چاہیئے کہ وہ کتابوں کی کم سے کم قیمت مقرر کر دے یا کرا دے۔

و پورے ملک میں نظام تعلیم کے خدوخال یکساں ہوں البتہ ہر صوبہ اپنی علاقائی زبان میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے لیکن اردو کو لازمی قرار دے دیا جائے اور ہر صوبہ میں اردو کو ابتدائی مراحل ہی سے نصاب میں داخل کر دیا جائے رہی انگریزی تو اسے ثانوی توجہ دے کر صرف سیکھنے تک محدود کر دیا جائے۔

و ملک میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے لیے نجی طور پر جو انگلش میڈیم سکول موجود ہیں انہیں ہدایت کر دی جائے کہ وہ انگلش میڈیم کا لفظ استعمال نہ کریں نیز نجی طور پر جو سکول موجود ہیں ان کی فیس بھی محکمہ تعلیم مقرر کر دے اضافی چندوں کی طلب اور بھرمار سے والدین کو نجات دلائی جائے نیز نجی سکولوں پر سرکاری طور سے نگاہ رکھی جائے اور ان کا باقاعدگی کے ساتھ معائنہ کرنے کا بھی بندوبست کر دیا جائے زیر تعلیم بچوں کے کوائف اور پڑھائی کا معیار بھی پرکھا اور دیکھا جائے ان سکولوں میں جو غیر تربیت یافتہ اساتذہ رکھے جاتے ہیں انہیں ختم کر دیا جائے اور ان کی جگہ نجی اداروں کو حکم دیا جائے کہ وہ تربیت یافتہ اساتذہ رکھیں

و اسکولوں اور کالجوں میں تعطیلات کو کم کر دیا جائے گرمیوں کی تعطیلات جو آج اڑھائی تین ماہ تک بڑھ گئی ہیں انہیں ختم کر کے صرف ایک یا ڈیڑھ ماہ تک کر دیا جائے دسمبر میں آٹھ دس دنوں کی تعطیلات کرنے کا کوئی جواز نہیں اس طرح سالانہ امتحانوں کے بعد پندرہ بیس دنوں کی تعطیلات کو ختم کر دینا چاہیئے اس وقت تعطیلات کی بدولت صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ پڑھائی کے دن کم اور تعطیلات کے دن بہت زیادہ

تعلیم کے گرتے معیار کو سنبھالا دینے اور اسے بلند کرنے کے لیے اساتذہ کو ذمہ دار قرار دیا جائے اور ہر استاد کی کارکردگی کا ہر تین ماہ بعد جائزہ لینے کا انتظام کر دیا جائے

بچوں کو لے کر سیر و تفریح کے لیے مطالعاتی دوروں پر جانے والے اساتذہ کو روک دیا جائے اور ایسے دوروں کو غیر ضروری قرار دے دیا جائے۔ ایک ترقی پذیر ملک ان باتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے اور والدین بھی غیر ضروری اخراجات سے بچ جائیں گے سکول اور کالجوں میں طالب علم ہوں یا طالبات ان کی یکساں یونیفارم ہونی چاہیئے اگر طالبات پر یونیفارم کا اطلاق ہو سکتا ہے تو لڑکوں پر کیوں نہیں ہو سکتا نیز اساتذہ کے لیے بھی قومی لباس کو لازمی قرار دے دیا جائے خاص طور پر خواتین اساتذہ کے لیے۔

سکولوں اور کالجوں میں جذبات خیز ڈراموں اور ثقافتی پروگراموں پر بھی پابندی لگا دی جائے اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دختران اسلام سکولوں کالجوں میں غیر محرم مردوں کے سامنے رقص کرتی دکھائی دیں یہ سلسلہ انتہائی طور پر باعث شرم ہے۔

سکولوں اور کالجوں میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے ایک صحت مند توانا اور نظریاتی طریقہ کار تشکیل دیا جائے۔

ملک میں موجود مشنری اداروں کے کانونٹ یا اس سے ملتے جلتے سکول کے دروازے عام بچوں کے لیے بھی کھول دیئے جائیں ان اداروں میں جو لوگ ذمہ دار فرائض سرانجام دے رہے ہیں انہوں نے وہاں اپنی حکومت اور اپنے ضابطہ کار بنا رکھے ہیں اور ان کی وفاداریاں پاکستان سے کم لیکن ان کے بیرونی سرپرستوں سے زیادہ ہیں یہ صورت حال بھی اصلاح طلب ہے۔

ان محرکات کو ختم کر دیا جائے جن کے باعث سکول اور کالج کے طالب علم ذرا سی بات پر ہڑتال کر دیتے ہیں اس سلسلہ میں سکول یا کالج کے ذمہ دار اساتذہ کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ بچوں کے والدین سے رابطہ رکھیں اور انہیں یہ بتا دیں کہ وہ اپنے بچوں کو یہ احساس کرائیں کہ وہ گھر سے سکول یا کالج تعلیم کے حصول کے لیے جاتے ہیں ہڑتال کے لیے نہیں اور ایسے طالب علم جو ہڑتال یا توڑ پھوڑ میں ملوث پائے جائیں یا لیڈر ہوں انہیں سکول یا کالج سے فوراً فارغ کر دیا جائے اور ایسا انتظام کر دیا جائے کہ ایسے بچوں کو کسی بھی سکول یا کالج میں داخلہ نہ مل سکے

محکمہ تعلیم کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے یہ شکایت عام ہے کہ اس اہم محکمہ میں سفارش رسوخ اور رشوت سے ہر کام ہو جاتا ہے یہاں تک کہ امتحانوں میں ناکام ہونے والے طالب علم بھی کامیاب قرار دیئے جاتے ہیں نیز امتحانوں کے پرچے قبل از وقت منظر عام پر آ جاتے ہیں ظاہر ہے ان باتوں میں محکمہ کے ذمہ دار افراد اور اساتذہ کی ملی بھگت شامل ہوتی ہے اس کا تدارک بھی اہم ضرورت ہے۔

سکولوں اور کالجوں میں داخلہ کے نظام پر بھی توجہ دینی چاہیئے اس وقت اس کے لیے جو طریق کار موجود ہے وہ تسلی بخش نہیں ہے جس کی بدولت بے شمار بچے حصول تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

یہ چند ایک گذارشات ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی ابھی بہت سے اور امور توجہ اور اصلاح طلب ہیں ایک خاص بات جو ہمارے ہاں ذریعہ تعلیم کے لیے باعث شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کے حصول کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ دو حصے یا دو کنارے وہ ہیں جو ایک ہونے کے باوجود ایک نہیں ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ امیروں کے بچوں کے لیے الگ اسکول اور کالج ہیں اور متوسط نیز کم وسائل والے لوگوں کے بچوں کے لیے الگ اسکول اور کالج قائم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہمیں ایک متحد قوم بننا ہے ایک جان ہونا ہے۔ بڑے چھوٹے کا امتیاز ختم کرنا ہے نظریہ پاکستان کو اپنانا ہے۔ خدا، قرآن اور رسول کا راستہ اختیار کرنا ہے اور مسلمان بھائی بھائی ہیں کا ایمان افروز سماں پیدا کرنا ہے تو پھر ہمیں انگریزی کی اس میراث کو ختم کر کے "ایک ہیں مسلم" کے ورثہ کو اپنانا ہوگا اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر یہ ممکن ہے کہ ہم دریا کے دو کنارے بن کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں یہاں ایک دوسرے کے درد کو محسوس نہ کر سکیں۔ فاصلہ بدستور رہے یہ بات ہو تو ظاہر ہے کہ نہ ہم ایک ہو سکتے ہیں اور نہ ہم نظریہ پاکستان کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جو بھی ذریعہ تعلیم بار بار اختیار کریں گے وہ فاصلہ کم کرنے کی بجائے فاصلہ بڑھانے کا ذریعہ ثابت ہوتا رہے گا جب تک حاکم اور محکوم کا تصور باقی رہے گا ہم نہ تو مل سکتے ہیں نہ مل کر قدم آگے بڑھانے کے قابل ہو سکتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں ایسا ذریعہ تعلیم رائج ہونا چاہیئے جو سب کے لیے یکساں ہو اور جس سے امیر اور غریب ایک ہی صف میں بیٹھ کر استفادہ حاصل کر سکیں۔ ماہرین تعلیم کو تاریخ کا یہ فیصلہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ قوموں کے نجات دہندہ ہمیشہ غریبوں کے گھروں سے ابھرتے ہیں۔ امیروں کے عالی شان بنگلوں سے نہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں یکساں طرز تعلیم کے طریق کار کو اپنایا جائے امیر اور غریب کا فرق ختم کر دیا جائے، علم کے حصول کے دروازے ہر ایک پر یکساں طور سے کھل جائیں جب تک یہ طریق کار اختیار نہیں کیا جائے گا ہم تعلیم کے میدان

ہیں وہ کشتیوں کے سوار بن کر کناروں تک نہیں پہنچ سکتے ہیں یکساں طریق کار کو اپنانے کے لیے سب سے پہلے اونچ اور نیچ کی دیوار کو گرا دیا جائے امیر اور غریب نے بچوں کو ایک ہی جگہ ایک ساتھ بیٹھ کر علم حاصل کرنا چاہیے تمام اسکولوں اور کالجوں کو ایک ہی معیار پر لے آیا جائے ۔ ایک ہی جیسا نصاب تعلیم تیار کرایا جائے ۔ اساتذہ کے وقار اور مقام کو بھی بڑھایا جائے ۔ اس سے ایک تو تعلیم کا معیار بلند ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ ہمارے بچے آپس کے میل جول سے ایک متحد پاکستانی قوت بن کر ابھر آئیں گے جب تک یہ نہیں ہوگا معاملہ حل نہیں ہو سکے گا اور آج جو سوال ہم سب کو پریشان کر رہا ہے اور دعوت فکر بن چکا ہے اس کا جواب کوئی بھی نہ دے پائے گا ۔

آخر میں صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ آج نصاب تعلیم، طریق کار اور نظام تعلیم کے بارے میں ہم جن ناخوشگوار باتوں اور پریشانیوں کا شکار دکھائی دے رہے ہیں یہ سب اس دوہرے نظام تعلیم کی پیداوار ہیں جو ہم نے افسر شاہی کی بدولت انگریز سے ورثہ میں پائی ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پاکستان کے مستقبل کی خاطر اور اپنے بچوں کو بہتر تعلیم و تربیت کے لیے ان پریشانیوں کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں اور نہ ہی افسر شاہی انہیں اپنے وقار کے لیے کسی بھی قسم کا خطرہ قرار دے اس کے برعکس ہمیں حقیقت پسند بن کر اس درپیش سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیے ۔ یہ جواب تلاش کرنا اس لیے بھی وقت کا اہم تقاضا بن گیا ہے کہ قیام پاکستان سے اب تک یہ سوال ہمیں نہ صرف الجھاتا چلا آرہا ہے بلکہ آج ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ تعلیم کے میدان میں ہم نے اب تک جو پیش رفت کی ہے وہ بالکل بے سود تھی اور ہمیں وہ ذریعہ تعلیم اختیار کرنا چاہیے جو ہمارے تقاضوں اور ہماری ملی امنگوں کا ترجمان ثابت ہو ۔ اگر ہم نے چالیس برسوں کے اس بے سود سفر کا اب بھی جائزہ نہ لیا تو پھر ہم نہ مشرق کے رہیں گے نہ مغرب کے دکھائی دیں گے ۔ ہمیں اپنے نصاب اور ذریعہ تعلیم کا انتخاب خود کرنا اور اسے اپنی ضرورتوں کے مطابق ترتیب دینا ہے اسے باہر سے "درآمد" کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ اگر ہم پاکستان کو ایک اور متحد مملکت خداداد رکھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں دیانتداری کے ساتھ کوئی قدم اٹھانا اور فیصلہ کرنا ہوگا ، ورنہ خدا حافظ ۔

(ا بشکریہ پکار اسلام آباد)

کالجوں میں لیکچراروں کا تقرر

حکومت پنجاب نے گزشتہ سال صوبہ بھر کے کالجوں میں مختلف مضامین کے لیکچراروں کی بھرتی کے لئے ایک اسپیشل بورڈ تشکیل دیا تھا جس نے اس اہم کام کو بلا تاخیر پایہ تکمیل تک پہنچا دیا مزید برآں رواں مالی سال کے بجٹ میں اس مقصد کے لئے خطیر رقوم مختص کی گئی تھیں اور محکمہ تعلیم نے مختلف کالجوں کی مانگ کے مطابق نئے اخراجات کا شیڈول (ایس' این' ای) بھی تیار کر لیا تھا جس کے مطابق مختلف مضامین کے لیکچراروں کی متعلقہ کالجوں میں تقرری کر دی گئی تاہم ابھی تک بعض کالجوں کی انتظامیہ کی طرف سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں جن مضامین کے لیکچراروں کی ضرورت تھی وہاں دوسرے ایسے مضامین کے لیکچرار کو تعینات کیا گیا ہے جن کی کلاسوں کا ہنوز اجراء ہی نہیں ہوا اس طرح مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کا سلسلہ متاثر ہو گیا ہے کہیں اساتذہ پر کام کا بوجھ زیادہ ہے اور کہیں سرے سے انہیں کوئی پیریڈ بھی پڑھانے کو نہیں ملتا ۔ مزید برآں ہر کالج میں قومی زبان اردو کے لیکچراروں کی تعداد انگریزی کے اساتذہ کے مقابلے میں بہت کم ہے جبکہ اردو کے پیریڈ زیادہ ہوتے ہیں اس طرح حکومت کی طرف سے عوامی امنگوں کی روشنی میں اردو کی ترویج و ترقی کی مساعی بار آور نہیں ہوئیں ہمیں توقع ہے کہ محکمہ تعلیم کے حکام اس صورت حال کا جائزہ لے کر اقدامات کریں گے تاکہ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد کالجوں میں درس و تدریس کا نظام بہتر بنیادوں پر استوار ہو

روزنامہ مشرق لاہور ۔ ۳۰ جون ۸۷ء

وحید قریشی کے ساتھ ایک شام

اسلام آباد ۲۶ جولائی (نیوز ڈیسک) اسلامیہ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کے اعزاز میں ۳۰ جولائی کو ۵ بجے شام اسلام آباد ہوٹل میں ایک شام کا اہتمام کیا گیا ہے وزیر اعظم کے مشیر برائے خوراک و زراعت سرتاج عزیز اور منسٹر امیر عبداللہ خان روکڑی مہمانان خصوصی ہوں گے پنجاب یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر رفیق احمد صدارت کریں گے ۔ پروفیسر ملک بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) گلزار احمد سید ضمیر جعفری، ممتاز مفتی، سید محمد نذیر رضوی اور جاوید اکبر ملک اظہار خیال کریں گے جبکہ حسین کلیم اور معروف شاعر منظوم خراج پیش کریں گے ۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۷ جولائی ۸۷ء

شعبہ صحافت کی ڈائریکٹری

راولپنڈی ۲۱ جولائی (نیوز ڈیسک) پنجاب یونیورسٹی جرنلزم ایلومینائی ایسوسی ایشن نے شعبہ صحافت سے فارغ التحصیل طلباء و طالبات کی ڈائریکٹری مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ ایسوسی ایشن نے شعبہ کے تمام سابق طلباء و طالبات سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مکمل کوائف مع ایک عدد تصویر کے ریاض مسعود پے رول ڈپلی پاکستان ٹیلی ویژن لاہور کو فوراً ارسال کریں ۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۲ جولائی ۸۷ء

قومی سائنس کانفرنس دسمبر میں ہوگی

کراچی (پی پی آئی) ۲۳ ویں قومی سائنس کانفرنس ۲۵ دسمبر سے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں ہوگی ۔ سائنس کانفرنس میں کلیدی لیکچر بینیا ر ہوگا اس کے علاوہ قومی اہمیت کے لیکچر بھی ہوں گے ۔ کانفرنس میں فزکس' ریاضی' کیمسٹری' بیالوجی' انجینئرنگ' میڈیسن' ایگریکلچر' فارمیسی' ایجوکیشن اور سوشل سائنسز پر تقریباً چار سو مقالے پیش کئے جائیں گے ۔

روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۱۴ دسمبر ۸۷ء

ٹیلیویژن پر اردو فیچر فلمیں آئندہ ماہ سے پیش کی جائیں گی

اسلام آباد ۲۰ جون (نمائندہ خصوصی) پاکستان ٹیلی ویژن فیچر فلمیں دکھانے کے انتظامات کو آخری شکل دے رہا ہے ۔ توقع ہے کہ اردو فیچر فلمیں آئندہ ماہ سے پیش کی جائیں گی ۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے سینئر ڈائریکٹر آغا ناصر نے بتایا ہے کہ ٹیلی ویژن سے ہر ماہ ایک اردو فیچر فلم پیش کی جایا کرے گی اور ہم صرف اچھی فلموں کا انتخاب کریں گے ۔ اور جب ہمیں بارہ تیرہ فلموں کے حقوق مل جائیں گے اس وقت باقاعدہ فیصلہ کریں گے ۔ انہوں نے بتایا کہ فلم سازوں اور تقسیم کاروں سے رابطہ قائم ہو گیا ہے ۔ آغا ناصر نے کہا کہ فلمیں حاصل کرنے کے بعد اخبارات میں اشتہار دیا جائے گا ۔ کہ اگر کسی کو اعتراض ہو تو رٹ دائر کرے ۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۔ ۲۱ جون ۸۷ء

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)

دارالترجمہ حیدرآباد دکن اور وضعِ اصطلاحات

جو ملک ترقی یافتہ ہیں جہاں علم کا شوق ہے لوگ اپنے اپنے پیشوں اور فنوں میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں علمی تحقیقاتیں کرتے ہیں، اپنے شوق یا مصلحت سے یا ضرورت سے ایسی ایسی جدتیں کرتے ہیں جن سے ایک دنیا میں انقلاب پیدا ہوجاتا ہے انہیں علمی تحقیقاتوں کے ضمن میں خود بخود نئے نئے الفاظ اور اصلاحیں بنتی اور رواج پاتی ہیں اور کتابوں سے زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں ہمیں جب ہوش آیا تو بعض پرجوش اور ہمدرد اہلِ علم نے اپنے ملک میں اشاعت علم اور اپنی زبان کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا اور ترجمہ و تالیف کے ذریعے سے اس خدمت کو انجام دینا شروع کیا، لیکن قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا، ہر فن اور ہر علم میں اس کثرت سے نئے لفظ اور نئی اصطلاحیں نظر آئیں کہ ہماری بے بضاعتی ان کی متحمل نہ ہوسکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر باہمت اصحاب کا جنہوں نے بڑے شوق سے کام شروع کیا تھا جی چھوٹ گیا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے زبان ہوتی ہے اور اس کے بعد لغت اول علوم کی تدوین ہوتی ہے اور اس کے بعد اصطلاحات کی ترتیب، لیکن ہمیں اپنی بدنصیبی سے اس کا برعکس اور غیر فطری طریقہ اختیار کرنا پڑا یعنی پہلے اصطلاحات کی لغت ترتیب دینی پڑی تاکہ مترجمین اور مؤلفین کو سہولت ہو اور ان کے کام میں یکسانی پائی جائے لیکن اس کے لیے وافر سرمایہ اور ایک مستعد اور ذی علم جماعت کی ضرورت تھی جو خاطر جمعی سے اس کام کو انجام دے اس لیے اس کام میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوا بھی تو وہ بہت ناقص اور نامکمل۔ آخر انجمن ترقی اردو نے اس کے بین بین تجویز کی یعنی مختلف علوم پر کتابیں لکھوائی جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اصطلاحات مدون کی جائیں یہ طریقہ بہت معقول تھا مگر کافی سامان نہ ہونے کی وجہ سے کام کی رفتار بہت سست رہی خوش نصیبی سے اسی زمانے میں حیدرآباد دکن میں یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور دکن کے بیدار مغز فرمانروا نے قیام یونیورسٹی کی منظوری عطا فرمائی چونکہ اس یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان قرار پایا تھا لہٰذا یونیورسٹی سے پہلے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا تاکہ وہ نصابِ تعلیم کے لیے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ شروع کردے حسن اتفاق سے دارالترجمہ کی نظامت بھی انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری کے تفویض کی گئی اور اس دیرینہ تمنا کے پورے ہونے کا سامان غیب سے ہوگیا۔ چنانچہ اصطلاحات کا مجموعہ جو اس وقت پیش کیا جا رہا ہے[1] انجمن ترقی اردو اور سررشتۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہے۔

یہاں اس امر کا بیان کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاحات کے وضع کرتے وقت کون سے اصول ہمارے پیش نظر تھے۔

سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے کیونکہ ایسے اصحاب کا ملنا جو ماہرِ فن بھی ہوں اور ماہرِ زبان بھی نہایت مشکل ہے، اصطلاحات کے بنانے میں دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو دارالترجمہ

---

[1] فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ، جس کا یہ مقالہ دیباچہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے یہ بڑی مشکل خود بخود رفع ہوگئی اور اس دشوار کام کی تکمیل کا بہت اچھا موقع مل گیا اس کے بعد ہم نے یہ اصول قرار دیے :۔

۱۔ چونکہ اردو زبان کئی زبانوں سے مرکب ہے اس لیے اصطلاحات علمیہ کے لیے ان سب زبانوں سے الفاظ وضع کر سکتے ہیں جن سے اردو زبان مرکب ہے، یعنی عربی، فارسی، ہندی، ترکی سے بلا تکلیف مدد لی جا سکتی۔

۲۔ الفاظ کے اشتقاق و ترکیب میں کسی خاص زبان کے قاعدے کی پابندی نہ کی جائے اور الفاظ مستعمل ہیں ان کی مثال کا لحاظ رکھا جائے اور جو لفظ زیادہ موزوں معلوم ہو اسے اختیار کیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس غرض کے لیے ان میں سے کسی زبان کا بھی کوئی مادہ یا لفظ جو سہل اور موزوں ہو لے سکتے ہیں، لیکن ان الفاظ سے اشتقاق یا ترکیب کے ذریعے سے جو دوسرے الفاظ بنائے جائیں گے وہ اردو نحو کے قاعدے کے بموجب ہوں گے یعنی لفظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے، کوئی زبان ایسی نہیں جس میں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار نہ لیے گئے ہوں مگر جب ان سے افعال یا صفات یا مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں تو عموماً اپنے ہی نحوی قاعدے استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ حتی الامکان مختصر الفاظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کر سکیں۔

۴۔ اسی ضمن میں یہ امر بھی عملی طور پر طے ہوگیا کہ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسما سے مصادر بناتے جاتے تھے (مثلاً، بدلنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ) اسی طرح اب بھی ضرورت کے وقت اسما سے افعال بنا لینا جائز ہے، چنانچہ اسی اصول پر برق سے برقانا اور دوسرے مصادر بنا لیے گئے۔

یہ بہت بڑی اصلاح ہے اور اس سے آیندہ نہایت کار آمد الفاظ وضع ہو سکتے ہیں اس میں بڑی بات یہ ہے کہ مصادر بنانے سے الفاظ مختصر بن جاتے ہیں اور اشتقاق میں آسانی ہوتی ہے۔

۵۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ جو اصطلاحات قدیم سے ہمارے ہاں رائج ہیں اور اب بھی اسی طرح کار آمد ہیں انھیں ہم نے برقرار رکھا ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے۔

۶۔ ایسے انگریزی اصطلاحی الفاظ جو عام طور پر رائج ہوگئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہے یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انہیں بدستور رہنے دیا ہے کیونکہ نہ ان کا ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ترجمہ کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں تھیں اور رائج ہوگئی تھیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کے ذریعے سے آگے لفظ نہیں بن سکتے تھے، انہیں ترک کر دیا ہے اور ان کی بجائے دوسرے الفاظ وضع کر لیے گئے ہیں۔

۷۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض انگریزی اصطلاحات اس قسم کی آگئی ہیں جو حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں وہ الفاظ اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے تجویز کیے گئے تھے چونکہ زبان میں ایک زمانہ دراز سے رائج ہیں اب ان کا بدلنا ناممکن ہے لیکن ہم نے اپنی اصطلاحات میں انگریزی کی تقلید نہیں کی اور ایسے الفاظ تجویز کیے ہیں جو جدید تحقیقات کے رو سے صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں گویا ایک طرح ہماری اصطلاحات زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

اصطلاحات کے متعلق قدیم سے یہ ایک خیال چلا آرہا ہے کہ وہ مشکل اور خاص وضع کی ہونی چاہئیں اور جہاں تک عام بول چال سے بعید ہوں اسی قدر زیادہ مناسب اور موزوں ہوں گی تاکہ عام الفاظ میں اور ان میں امتیاز رہے اور التباس نہ ہونے پائے اور علمی شان قائم رہے، علمی شان اکثر دقیق، ثقیل اور مرعوب کن الفاظ میں سمجھی جاتی ہے اور اکثر اوقات صرف مشکل اصطلاحات کا جان لینا ہی علم و فضل کا قائم مقام خیال کر لیا جاتا ہے ہمیں اکثر ایسے لوگ ملیں گے جو محض اصطلاحات کی

بدولت عالم و فاضل اور صوفی سمجھے جاتے ہیں یہ خیال اس وقت کی یادگار ہے جبکہ مذہبی پیشوا علوم کے بھی حامل تھے قدیم ہندوستان میں ویدوں کے پڑھنے اور پڑھانے والے برہمن تھے چند اونچی ذاتوں کے سوا عام لوگ جو نیچ ذات کے سمجھے جاتے ہیں وید پڑھنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ تمام عبادت اور رسوم ویدہی کے الفاظ میں ادا ہوتی تھیں اور اب تک ایسا ہوتا ہے یہی حال زمانہ وسطیٰ میں یورپ میں پادریوں کا تھا۔ انجیل غیر زبان میں تھی، عبادت غیر زبان میں ہوتی تھی، انجیل زنجیر میں بندھی ہوئی منبر پر رکھی رہتی تھی اور لوگ بطور تبرک کے زیارت کر لیتے تھے اپنی زبان میں ترجمہ کرنا حرام تھا۔ شروع شروع میں ترجمہ کرنے والوں پر بڑی بڑی سختیاں کی گئیں اور انہیں مردود و مرتد سمجھا گیا۔ علم فضل بھی انہیں کے ہاتھ میں تھا۔ گویا مذہبی پیشوا ہی علم کے بھی پیشوا تھے اور وہ عام لوگوں کو اس قابل نہیں خیال کرتے تھے کہ مقدس کتاب کی تعلیم حاصل کریں یا علم و فضل سیکھیں۔ وہ عام لوگوں کو علم پڑھانا گویا انجیل کی اس آیت کی عدول حکمی سمجھتے تھے کہ "اپنے موتیوں کو سوروں کے سامنے نہ ڈالو" عوام کالانعام میں نہ اس کی صلاحیت تھی اور نہ اس کا حق رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں علوم کو اور بھی مشکل بنایا جاتا تھا تاکہ عام لوگ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں۔ گویا یہ خاص اسرار تھے جو سینہ بہ سینہ انہیں کو پہنچتے تھے جو اس کے اہل تھے، اس زمانے میں یہ دقیق اور ثقیل اصطلاحات ہی ان کی شان علم اور رعب فضل و کمال کو قائم رکھنے والی تھیں۔ مسلمانوں میں اگرچہ پادریوں یا پروہتوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے تاہم ان پر بھی اس کا اثر پڑا جن لوگوں نے شروع شروع میں قرآن کا ترجمہ کیا وہ کچھ کم مردود و معلون نہیں سمجھے گئے تھے اور اگرچہ ان میں علم کے سکھانے کے معاملے میں بہت رواداری تھی لیکن علوم کی تدوین کا جو ڈھنگ پڑ گیا وہ ویسا ہی رہا خصوصاً جب علم غیر زبانوں اور غیر قوموں سے حاصل کیا جاتا ہے اس قسم کی دقتیں اور بڑھ جاتی ہیں اور ان زنجیروں کا توڑنا آسان کام نہیں ہوتا، حالانکہ علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو نہ کسی کی وراثت ہو سکتی ہے اور نہ کسی خاص فرقے کا حق ہو سکتا ہے اور افسوس یہی کہ بعض خاص فرقوں کے قبضے میں آکر روحانی اور دماغی

حکومت کا موجب ہوگی اب ظاہر ہے کہ وہ زمانہ نہیں رہا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس قدیم روایت کو جو دنیا میں دوسرے بہت سے طلسم و ستم کے آلات کی طرح دماغی اور اخلاقی ظلم کا ہتھیار تھی، قائم رکھا جائے اس لیے ہم نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ اصطلاحیں آسان اور عام فہم بنائی اور ایسے مادوں سے وضع کی جائیں جو زبان میں عام طور سے رائج ہیں جگہ جگہ ہم نے ہندی ترکیبوں کو استعمال کیا تاکہ پڑھنے والے آسانی سے سمجھ جائیں اور اشتقاق و ترکیب میں کہیں اپنی زبان کے قواعد کو ترک نہیں کیا خواہ لفظ عربی ہو یا فارسی یا کسی اور زبان کا۔ اُن اصول پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ چند الفاظ مثال کے لکھے دیکھے ہیں۔ مثلاً Ostracism (دیس نکالا)

Antonomy (سوراخ) Chemical (رنزاج)

Combination (کیمیائی ملاپ) (تدجارا)

[illegible] (جھری دار) Gruposeus (سنیلا)

Costate (اکرگا (اک + دگا) (پہلروپ)

(لمجھ روپ) Asexual (اجاتی) Gamosepalous (مل پتیا) لیکن باوجود اس کے بعض علوم ہیں کہ ان میں ہم اس قدر آسانی پیدا نہیں کر سکے اس لیے کہ ان کی بہت سی اصطلاحات پہلے سے مروج ہیں اور ان کا بدلنا ممکن نہیں مثلاً علم ہیئت کی کثرت سے ایسی اصطلاحیں ہیں جو عربی ہیں اور وہ بجلسہ (کسی قدر تلفظ کے فرق سے) یورپ کی تمام زبانوں میں رائج ہیں اس لیے ہمیں ان کے مقابل وہی اصلی عربی لفظ لکھنے پڑے ہیں اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا تاہم ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس مشکل کو آسان کر دیں۔ اس زمانے میں جبکہ حکومتیں تک عوام کی ہو گئی تھی تو کیوں علوم و فنون خاص فرقوں کے ہاتھ میں رہیں اور عام نہ ہو جائیں۔

غیر زبانوں سے بعض الفاظ کا مستعار لینا ناگزیر ہے لیکن بلاوجہ اور خواہ مخواہ الفاظ مستعار لیتے چلے جانا تخیل کی کمی اور قوت نطق کا ضعف ہے بعض لوگ محض فیشن کے خیال سے بعض سستی کی وجہ سے اور بعض علمی شان دکھانے کو غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہ سب اخلاقی اور دماغی ضعف کی دلیل ہیں اپنے الفاظ استعمال کرنے میں (خواہ مرکب

ہوں یا مفرد) ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک غیر تعلیم یافتہ بھی آسانی سے انہیں سمجھ سکتا ہے جن جن ممالک میں لوگ بیدار ہو جاتے ہیں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے۔

اہل جرمنی میں یہ تحریک سترھویں صدی سے شروع ہوئی اور اس وقت سے انہوں نے اپنی زبان کو ناگوار غیر الفاظ سے پاک کرنا شروع کیا اس کے لیے کئی انجمنیں قائم ہوئیں جن کا یہی کام تھا کہ وہ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنی اصل زبان کو ترقی دیں قومی اتحاد کے ساتھ ساتھ اس تحریک کو بھی قوت ہوتی گئی۔ اس زمانہ کے جرمنوں کو اپنی زبان کی صفائی پر بڑا فخر ہے اسی طرح انہوں نے علمی اصطلاحات بھی بہت سادہ بنالی ہیں جسے ان کے ملک کا ہر شخص سمجھ سکتا ہے مثلاً

انگریزی	جرمن	
Nitrogen	Stickstoff	(Stick Stuff)
" albume	Elweiss "	(White of an egg)

اسی طرح اہل جاپان نے بھی علمی اصطلاحات بہت عام فہم بنالی ہیں۔

نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن دو سال ہوئے جب جاپان کے تعلیمی نظام کے معائنہ کے لیے اس ملک میں گئے تو انہوں نے وہاں علمی اصطلاحات کے متعلق تحقیق کی اور وہ بہت سی جدید اصطلاحات جو جاپانیوں نے وضع کی ہیں لکھ کر لے آئے تھے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خاص طور پر ان اصطلاحات کو بہت سہل بنالیا ہے مثال کے طور پر چند اصطلاحات یہاں درج کی جاتی ہیں۔

جاپانی			انگریزی
پانی	واٹر۔ sui	Sui So	Hydrogen
عنصر	so-element		
کوئلہ	tan-Charcoal	Tan-so	Carbon
عنصر	so-element		
		Tansuikwabutsu	Carbohydrate

tan-charcoal (carbon)

sui-water (hydrogen)

kwa-combination

butsu - thing

جاپانی		انگریزی
	Suiryokogaka	Hydrogynamics
پانی	Sui-water	
قوت	ryoko - power	
مطالعہ	gaku-study	
پانی کی قوت کا مطالعہ یا علم		
	Keijijo - gaku	[illegible]
شکل	kei-shape	
اور	ji-and	
بالا	jo - above	
مطالعہ	gaku - study	
یعنی مادی اشیا سے بالا علم	Kobutsugaku	[illegible]
قدیم	ko-old	
شے	butsu-thing	
مطالعہ	gaku-study	
یعنی قدیم اشیا کا علم		
	Kwaseki	[illegible]
منقلب	kwa-transformed	
پتھر	seki-stone	
پتھر میں بدلا ہوا		

گیس کو ہم نے بھی گیس ہی رکھا ہے ان کے ہاں بھی یہی ہے۔ ذرا تلفظ بدلا ہوا ہے وہ گیسو کہتے ہیں۔

یہی اہل روس کر رہے ہیں اور یہی اہل بوہیمیا کو کرنا ہوا کہ انہوں نے غیر ضروری جرمن الفاظ کو نکال باہر کیا، یونانیوں نے ترکی لفظ خارج کر دیئے۔ ایرانی بھی کچھ عرصے سے اپنی زبان کو پاک صاف کرنے کی طرف متوجہ ہیں اور اب ترکوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے ورنہ سب یہی قومیں تھیں جو ہماری طرح غیر زبانوں کو بولنا اور غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کرنا فخر سمجھتی تھیں۔

بہت ممکن ہے کہ ہماری بعض ترکیبیں کانوں کو نامانوس اور اجنبی اور ذوقِ سلیم کو ناگوار گزریں گی اور بعض الفاظ اور اصطلاحیں اوپری اور

معنوعی نظر آئیں گی لیکن ہماری نیت نیک، ہمارا اصول مستحکم ہے
ہم اپنے ملک سے محبت رکھتے ہیں اور علم کو عام کرنا چاہتے ہیں اور حکیم سقراط کی
طرح معاوضہ لے کر نہیں بلکہ کچھ دیکر بھی عامی سے عامی کو بھی سب کچھ جو ہمیں آتا
ہے بتا دینا چاہتے ہیں ایک جرمن صرف نحو کے مؤلف نے اپنی کتاب میں اہل
جرمنی کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کیا ہے جو کم و بیش ہم پر صادق آتا ہے:
"آج کل (سنہ ۱۹۰۸ کا ذکر ہے) یہ عام خواہش ہے اور کسی قدر نا معقول حد
تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی ایسا لفظ نہ استعمال کیا جائے جسے کوئی جرمن جو
غیر زبانیں نہیں جانتا نہ سمجھ سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کے
بجائے جو لفظ استعمال کیے جائیں وہ اکثر ناگوار یا ثقیل ہوتے ہیں اور بعض
اوقات ان کا کوئی جز غیر زبان کا ہوتا ہے ایک بیرونی شخص کو یہ تحریک مصنوعی
معلوم ہوتی ہے، اگرچہ اس کی محرک خالص حب وطن اور زبان کا فخر ہے جو
دوسری قوموں کے لوگوں میں نہیں پایا جاتا۔"

(۲۰ دسمبر ۱۹۲۵، فرہنگ اصطلاحات علمیہ صفحہ ۱۰)

Urdu language

"As the Urdu language was originally an Indian language and was the result of interaction of Hindu and Muslim culture and it was spoken by a great part of the people of this country, it was best suited to develop a united nationality, and the attempt to replace it by Hindi might upset the structural basis of Urdu otherwise known as Hindustani and adversely affect the growth of comradeship between the Hindu and Muslim sections, the All-India Muslim League calls upon all the Urdu speaking people of India to make every possible endeavour to safeguard the interests of their language in every field of activity with which the Central and the Povincial Govenments were concerned, and wherever the Urdu language was the language of the area, its unhampered use and development should be upheld and where it was not the predominant language, adequate arrangement should be made for teaching it as an optional subject and in all Government Offices, Courts, Legislatures, Railway and Postal Departments provision should be made for its use".—The Muslim League resolution (1937).

بحوالہ پاکستان ٹائمز - ۶ اگست ۸۲ء

TRIBUTES PAID TO WAHEED QURESHI

STAFF REPORT

ISLAMABAD, Aug. 5 Dr Waheed Qureshi has served Urdu language and Literature. Dr Waheed Qureshi's contribution to the Urdu language and literature has been immense. His work is so valu·ble as to make the language (ver·come many of its shortcomings which existed before him

These views were expressed Mr Sartaj Aziz, the Adviser to Prime Minister for Food and Agriculture at a function held here the other day.

He said the National Language Authority has become an effective institution under the supervision of Dr. Waheed Qureshi and about 4000 books have been published, the utility of which is quite obvious.

Speaking on the occasion Vice Chancellor of the Punjab University Mr. Rafiq Ahmed said that Mr. Qureshi was not only a prominent literary personality but a competent organiser and a very good teacher.

Mr. Serfraz Shahid threw light on the personality of the Dr through a poen

بحوالہ مسلم، اسلام آباد - ۶ اگست ۸۲ء

ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے اظہار تعزیت

راولپنڈی ۲۵ مئی (نمائندہ خصوصی) راولپنڈی کے ادیبوں کا [illegible]
ایک اجلاس ڈاکٹر اعجاز راہی کی صدارت میں ہوا جس میں
ڈاکٹر گوہر نوشاہی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بحوالہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۶ مئی

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

قدیم اردو میں اسم جمع

کلمۃ الحقائق حضرت شاہ برہان الدین جانم کا نثری رسالہ ہے۔ حضرت جانم بیجاپور کے مشہور و معروف صوفی حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند ہیں۔ اس خاندان کا ذکر تواریخِ ادبِ اردو میں بڑی تفصیل سے مل جاتا ہے۔ حضرت جانم کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہے۔ اس عہد کے جنوبی ہند کے دوسرے ولیوں کی طرح آپ بھی عوام کو پند و نصیحت اور اپنے مریدوں و معتقدوں کو سلوک و تصوف کی تعلیمات دیتے رہے۔ تقریر کے ساتھ تحریر کے ذریعے سے بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ نے کئی نظم و نثر کے رسالے لکھے ہیں۔ اب تک مندرجہ ذیل رسالے دریافت ہوئے ہیں :

۱۔ ارشاد نامہ ۲۔ وصیت الہادی ۳۔ گفتارِ شاہ برہان ۔ ۴ حجت البقا
۵۔ منفعت الایمان ۶ نیم الکلام ۷ نکتۂ واحد ۸ کلمۃ الحقائق وغیرہ۔

ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے اور ان رسالوں کے مخطوطات، ہندوستان پاکستان اور انگلستان وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ارشاد نامہ جو ان کی طویل ترین صوفیانہ مثنوی ہے۔ اس میں کل ۲۲۲ شعر موجود ہیں۔ یہ مثنوی شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ چھپ چکی ہے اسے محمد اکبرالدین صدیقی نے مرتب کیا ہے اور ان کے نثری رسالہ کے مرتب بھی اکبرالدین صدیقی ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی اس رسالہ کو مرتب کیا اور چھپوایا ہے۔ اکبرالدین صدیقی کا مرتب کیا ہوا رسالہ زیادہ طویل ہے۔ جس کا متن ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

اسم جمع کے تجزیہ کے لیے اسی متن سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

یہ کتاب علمی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے، مگر لسانی پہلوؤں کے جائزے میں علمی اہمیت پر بحث نامناسب اور غیر ضروری ہوگی۔ صرف وہ لسانی پہلو زیرِ مطالعہ ہیں جو اردو زبان کے ارتقاء کی کڑیوں کا سامنے لانے اور زبان کے اصل ماخذ کے تعین کرنے میں صحیح رہنمائی کر سکیں۔

کلمۃ الحقائق دسویں صدی ہجری کا وہ مربوط اور مسلسل نثری نمونہ ہے جس کے مقام تصنیف و مصنف اور زبان کے بارے میں شک و شبہ کی انگلی نہیں اٹھ سکی اور نہ اس کی کوئی گنجائش باقی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہی ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، شمس اللہ قادری، نصیرالدین ہاشمی، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ جیسے دیو قامت محققین، مورخین ادب اردو اور نقادوں نے کلمۃ الحقائق کو بہ اتفاقِ رائے حضرت شاہ برہان الدین جانم کی تصنیف مانا ہے جب کہ نویں اور دسویں ہجری کے دوسرے نثری رسالوں کے مصنفین کے بارے میں کئی شک و شبہات جنم لے چکے ہیں اور حقیقتوں کی تلاش میں تحقیق کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

کلمۃ الحقائق آج سے چار سو سال قبل ۹۹۰ ہجری سے پہلے بہ مقام بیجاپور ضلع کرناٹک میں لکھی گئی۔ جسے حضرت شاہ برہان الدین جانم نے قدیم اردو میں قلم بند کیا۔

کلمۃ الحقائق

کتاب کی ابتدا میں مصنف نے کلمۃ الحقائق کی زبان کو گوجری یا گجری زبان بتایا ہے۔

ایسا حال سمجنا خدا سقے خداکون ۔ جس پر کرم خدا کا ہوئے ۔ سبب یوں زبان گجری (زبان) نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق خلاصہ بیان و تجلی عیاں روشن شود۔ (ص: ۲۱ کلمۃ الحقائق مرتبہ : محمد اکبرالدین صدیقی)

گو کہ حضرت جانم نے اسے گجری زبان کہا ہے مگر اس زبان کا گجرات علاقہ کی زبان گجراتی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی یہ گجراتی زبان ہے۔ بلکہ اپنے ڈھانچے، مزاج، ساخت اور صرف و نحو کے اعتبار سے قدیم اردو ہے اور یہ زبان قدیم اردو کے سوا کوئی اور زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ سونے کو کوئی لاعلمی کی وجہ سے تانبا کہے تو وہ تانبا نہیں ہو جاتا۔ سونا بہر حال سونا رہے گا۔ البتہ لاعلمی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ہاں یہ بات

نظر انداز کرنے والی نہیں ہے کہ حضرت جانم نے اسے گجری نام کیوں دیا۔ ابتدائے زبان اردو سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام کے طویل عرصہ تک اردو کے اہم مرکز ہیں۔ ہر دور میں اس زبان کی نام رکھائی کا مسئلہ مصنفوں، ادیبوں اور شاعروں کے لیے بڑی الجھن کا باعث بنا رہا اور یہ زبان مختلف علاقوں اور دوروں میں مختلف ناموں سے پکاری گئی۔ جیسے مورسس، ہندی، گجری، دکھنی، ہندوی، زبان ہندوستان، ریختہ، لشکر، زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد، زبان اردو، اردو کی زبان، اردوئے معلیٰ، ہندوستانی اور اردو وغیرہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اردو ایک مستقل نام اختیار کر سکی ہے۔ ویسے بیسویں صدی کی ابتدا میں بھی ہندوستانی اور اردو کے نام بحث ہوتی رہی مگر آئندہ یہ زبان صرف اردو کے نام سے زندہ رہے گی کیونکہ اب نام بدلائی کی منزلوں سے بہت آگے گزر چکی ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک ایران، عرب، یورپ، امریکہ، افریقہ، روس، جاپان اور آسٹریلیا کے بڑے بڑے شہروں میں اردو بولنے والوں کے ساتھ اردو کے نام سے یہ زبان ہجرت کر چکی ہے۔ غیر ملکیوں میں اس کی مقبولیت کی بنا پر یونیورسیٹوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ وہاں سے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور ان تمام جگہوں پر اور بنگلہ دیش میں یہ زبان اردو کے نام سے مشہور ہے۔ اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں موجود ہے، جہاں یہ زبان قومی زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اب اس زبان کے نام کی الجھن بڑی حد تک دور ہو گئی ہے مگر ابتدائی مصنفین واقعی الجھن میں مبتلا تھے۔ اس دلچسپ الجھن کی تکمیل کا یہاں موقع نہیں کیونکہ اس کی داستان بہت طویل ہے مگر حضرت جانم اور ان کے معاصرین کی اس لسانی کش مکش کا مختصر ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کی نام رکھائی کی ایک مقررہ تاریخ طے نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جو قابل لحاظ مدت کے بعد پورا ہوتا ہے۔ اردو میں یہ عمل دکن میں آغاز اردو سے شروع ہو کر شمال میں مرزا غالب کے عہد تک بھی جاری نظر آتا ہے خود مرزا غالب جیسا زبان داں اس زبان کے نام کے بارے میں مشکوک ہے۔ لہذا انہوں نے اس زبان کا ذکر کئی ناموں سے کیا ہے۔ ریختہ، اردو، ہندی اور اردوئے معلیٰ وغیرہ۔

میر کی استادی کا لوہا مانتے ہوئے میر کی اور اپنی شاعری کی زبان کو ریختہ کہا ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب نے ریختہ اور فارسی شاعری کا درجہ متعین کرتے ہوئے زبان کو اردو کہا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؂

فارسی بہ بین نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

کچھ عرصہ بعد غالب نے اپنے کلام کے بارے میں رائے بدل دی اور کلام ریختہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ جس کا اظہار یوں کیا ہے ؂

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

اپنے خطوط میں کبھی اس زبان کو ہندی کہا ہے تو کبھی اردو، دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ایک ہی خط میں یہ دونوں نام آجاتے ہیں۔ قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں روزمرہ اور محاورہ کے ترجمہ کا ذکر چھیڑا ہے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

" اسما کے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں یہ طرز گفتار۔ محاورات ہندی کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً چوری کا گڑ میٹھا اس کی فارسی نہ پوچھے گا مگر ناداں ہی اور تو ہی کی فارسی کیونکر ہے یہ روزمرہ ہے: ع

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہو سکتا ہے۔ وصل اگر نیست حسرت نیز عالمے دارد: ع

زاہد تجھ کو گردن مرہونِ احسان تو ہی ایک۔ نوح کی تنبیہہ ایک قسم کا دعویٰ ہے نامرد باشم گر فلاں کار نہ کنم بنا سائیم اہل ہندی کی فارسی اس طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں انہوں نے فارسی کے قواعد کی تخلیق عربی سے چاہی اور اردو کے خاص روزمرہ کی فارسی بنا یا کیے۔ ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے :"

محاورات ہندی اور روزمرہ اردو سے ظاہر ہے کہ کبھی غالب اس زبان کو ہندی کہتے ہیں اور کبھی اردو کے نام سے پکارتے ہیں۔ مگر کل خطوط کے جائزہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ اردو کا استعمال ہندی کے مقابلے میں زیادہ کیا ہے اور ریختہ وغیرہ کا اس سے بھی کم۔ غالب کے ان بیانات سے ظاہر ہے کہ ان کے عہد میں بھی اردو کی نام رکھائی کا مسئلہ ہنوز باقی تھا اور یہاں ہندی سے ان کی مراد سورداس، تلسی داس اور کبیر داس کی زبان (دیوناگری لپی کی) ہندی نہیں ہے بلکہ ان کے دیوان اور خطوط کی زبان اردو ہے اور یہ لسانی کش مکش جنوبی ہندی میں سولہویں سترہویں صدی میں بہت سنجیدہ

اور اہم معلوم ہوتی ہے۔

زبان کا نام رکھائی عمل فرد کا دانستہ عمل نہیں ہوتا ہے اور کسی بھی نئی زبان کے استعمال کرنے والے ابتدائی ادیب، شاعر اور عوام کبھی شعوری طور پر اس کے نام سے آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ ابتدا میں زبان صرف اجتماعی سماجی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جنم لیتی ہے۔ افہام وتفہیم کا مسئلہ حل ہو جائے، یہی اس کا بنیادی مقصد ہوتا ہے جب تک یہ مقصد پورا ہو رہا ہے سماج کے افراد زبان کے دیگر پہلوؤں سے بڑی حد تک بے نیاز ہی رہتے ہیں مگر اردو کے بہت ہی باشعور ذہین مصنفوں کے ہاں یہ لسانی مسئلہ برابر غور و فکر کا موضوع رہا ہے ان میں حضرت شاہ برہان الدین جانم اور ان کے والد حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کا بھی شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں اپنی تحریری زبان کے نام کے بارے میں جگہ جگہ اظہار خیال فرماتے ہیں۔ حقیقتاً وہ بھی جنوب میں اس نئی زبان کو استعمال کرنے والے بہت سے عوام کی طرح نام سے لاعلم ہیں مگر ان کی دیگر جانی ہوئی زبانوں جیسے عربی، فارسی، کنڑا، تیلگو وغیرہ کے نام موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی علمی آگہی اور لسانی شعور نئی زبان کے نام کا متلاشی ہے اور کہتا ہے اس زبان کا بھی ضرور کوئی نہ کوئی نام ہونا چاہیے۔ اس تقاضے سے مجبور ہو کر شاہ میراں جی العشاق شمس کے خاندان والوں نے کبھی اس نئی بھاشا کو گجری کا نام دیا ہے تو کہیں ہندی کے نام سے پکارا۔ یہی لسانی کش مکش اس عہد کے سبھی اردو مصنفوں کے ہاں بھی ملتی ہے مگر ان مصنفوں کو گجری یا ہندی کے نام سے تسلی نہیں ہو رہی ہے اس احساس کی ترجمانی شاہ میراں جی شمس العشاق نے مثنوی شہادت المحقق میں یوں کی ہے:

یہ گرٹ مکھ پسند آیا — تو ایسے بول چلایا
جی کو اچھے خاص سے — اس بیان کیری پیاسے
وعربی بول ناجانے — نا فارسی پہچانے
یہ ان کو بچن ہیت — جی سینے بوجھے ریت
یہ دیکھت ہندی بول — بن معنی ہیں نپ تول
جی مغز میٹھا لاکے — تو کیوں من اس تھے جاگے

یہ گرٹ (زبان) مکھ یعنی مونہہ کو پسند آ گیا تو میں نے یہ بول (مثنوی) چلائے۔ جس کو اس بیان کی خاص پیاس ہے۔ یہ مثنوی ان کے لیے لکھی گئی ہے اور یہ لوگ نہ عربی سے واقف ہیں اور نہ فارسی سے۔ یہ بچن انہیں کے لیے ہے جن کے پاس سننے اور بوجھنے، سمجھنے کی ریت (عادت یا صلاحیت ہے)، دیکھنے میں یہ ہندی بول ہیں مگر ان کے اندر جو معنی ہیں وہ پنے تلے ہیں۔ جب یہ مغز یعنی مطلب میٹھا لگتا ہے تو من اس سے کیوں جاگے۔

حضرت شاہ میراں جی العشاق کا یہ واضح روشن اور حقیقت پسندانہ بیان ان کے لسانی شعور کی گہرائی اور عظمت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

بقول شاعر: یہ بچن ان کے لیے ہیں جو عربی بول نہیں جانتے، فارسی نہیں پہچانتے مگر اس نئی بھاشا یعنی ہندی بول کے ارتھوں کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں، انہیں کی ضرورت کے لیے یہ بول چلائے گئے ہیں یعنی زبان جاری کی ہے کیونکہ یہ بولی عوام کو پسند آ گئی ہے پسند آنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام میں پوری طرح رائج ہو گئی ہے اور جب یہ مغز (یعنی نئی زبان) عوام کو میٹھا لگتا ہے تو من اس سے کیوں بھاگے۔ اس سے پرہیز کیوں کیا جائے دوری کیوں برتی جائے۔ لہٰذا انہوں نے اس ہندی بھاشا کو اپنی تصنیف اور تالیف کی زبان بنا لیا لیکن یہ لسانی جھجک ابھی دور نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم نے بھی اس کا اظہار کلمۃ الحقائق اور اپنی طویل ترین صوفیانہ مثنوی ارشاد نامہ میں کرنا ضروری سمجھا ہے اور ساتھ ہی اپنی تصنیفی کام کو برابر جاری رکھا (لہٰذا ان کے کئی صوفیانہ رسالے اسی زبان میں ملتے ہیں۔ ارشاد نامہ ان کی ایک طویل مثنوی ہے۔ کلمۃ الحقائق میں جس زبان کو گجری کہا ہے وہی زبان کو ارشاد نامہ میں ہندی کہتے ہیں اور معذرت خواہ ہیں کہ انہوں نے اس زبان میں رسالہ قلم بند کیا جس کا اہم سبب یہ ہے کہ ہندی زبان کوئی عیب نہیں رکھتی۔ اس لیے زبان کے استعمال پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ دیکھے کہ اس زبان یا رسالہ میں کیا کیا معنی پوشیدہ ہیں۔ ویسے بھی جیسے غواص کو سمندر کی اور باتوں سے زیادہ دل چسپی نہیں ہونی چاہیے۔ جب تک کہ اسے موتی حاصل ہوتے رہیں۔ یہ نئی بھاشا سمندر کی مانند ہے اور اس کے معنی موتی ہیں۔ یہ موتی گیان رتن ہیں اور دلائل کے ساتھ وہ اپنی نئی بھاشا کو اپنے خیالات کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے اس صوفی گھرانے اور دیگر اس دور کے صوفیوں اور ولیوں کا یہ ایک ایسا تاریخ ساز شعوری متفقانہ فیصلہ اور عملی قدم ہے جس نے اردو زبان کے وجود کو پہلی دفعہ نہ صرف استحکام بخشا بلکہ ایسا روشن کیا کہ اس کی روشنی آج دنیا کے چپہ چپہ میں پھیلتی نظر آ رہی ہے اور اردو دنیا کی زبانوں میں اہم مقام حاصل کرتی چلی جا رہی ہے۔

حضرت جانم کے عہد میں یہ زبان، جنوب میں، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر، گجرات، اور نگ آباد اور برار جیسے مقامات میں ولیوں اور سلاطین کی سرپرستی میں تیز رفتاری

سے پھیل رہی ہے اور اپنی مقبولیت حاصل کرنے لگی ہے کہ عربی جو مذہبی اور فارسی جو
درباری زبان کی حیثیت سے مروّج تھیں اب غیر مقبول اور نامانوس ہونے لگی ہیں اور ان
دونوں کی جگہ نئی زبان یا بھاشا نے لے لی ہے۔ لہٰذا فارسی رشد و ہدایت پند و نصیحت
کی زبان بن کر عوام اور مریدوں کی ضرورت کو تسلی بخش طریقہ سے پورا کرنے سے معذور
ہے اس کے برعکس نئی بھاشا اپنی بھرپور صلاحیت کی وجہ افہام و تفہیم کا کارگر ذریعہ
ثابت ہو رہی ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے رجحان اور نئے تقاضے نے حضرت جانم
سے کلمۃ الحقائق قلم بند کروایا (اور یہ نئی بھاشا سوائے قدیم اردو کے اور کوئی زبان
نہیں ہو سکتی) کلمۃ الحقائق سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ سوال طالب یا مرید
کی طرف سے ہے اور جواب مرشد کی طرف سے۔ جواب کبھی سوال کی طرح بہت مختصر ہے
اور کبھی طویل ــــ طویل جوابوں میں خصوصاً عربی کی آیتیں فارسی کی عبارتیں کثیر تعداد میں
استعمال ہو گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مرشد اپنا تحریری جواب نئی بھاشا میں دینا چاہتا ہے،
مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہو پاتا۔ جس کے بظاہر دو سبب نظر آتے ہیں۔

۱۔ تحریری زبان ناپختہ ہے ابھی خیالات کے بھرپور اظہار کی پوری قدرت نہیں رکھتی۔

۲۔ دوسرا۔ مصنف عربی فارسی کا ماہر ہے۔ بجائے اردو جملوں کی تخلیق پر بہت
زیادہ محنت کرنے کے فوراً ہی عربی فارسی کی مدد طلب کر لیتا ہے جیسا کہ موجودہ زمانے
میں انگریزی کا رواج ہونے کی وجہ انگریزی الفاظ تحریر اور تقریر میں بے ساختہ استعمال
ہوتے ہیں اور مخاطب طبقہ مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا مگر تحریر و تقریر
میں بے شمار انگریزی الفاظ شامل ہو جانے سے زبان انگریزی نہیں ہو جاتی بلکہ وہ
اردو ہی رہتی ہے کیوں کہ جملوں کی ساخت اردو ہے نہ کہ انگریزی۔ اس طرح کلمۃ الحقائق
میں کثیر تعداد میں عربی اور فارسی کی عبارتیں اور جملے متن میں کتنی بھی مقدار میں موجود
ہیں۔ کتاب کی زبان عربی یا فارسی نہیں کہلائے گی بلکہ یہ قدیم اردو ہے۔ صرفی سطح
پر الفاظ کی تشکیل اور نحوی سطح پر جملوں کی ساخت کا تجزیہ اس رائے کو استحکام
بخشتا ہے۔ کلمۃ الحقائق کی زبان قدیم اردو نثر کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ اس میں سے
چند عبارتیں / جملے ملاحظہ ہوں؛

سوال؛ ہور متصل میں منفصل کیوں؟

جواب؛ جوں تن میں جیو، یا خوشبوئی جوں پھول میں؟

سوال؛ خدائے تعالیٰ ایک اچھے سب میں کیوں؟

جواب؛ جوں ہمیں اپنے اعضا اپنے ہر یک ابیں محیط

سوال؛ یکچ سب میں کیوں؛

جواب؛ جوں ایک اندھارے ٹھار، یک بھانڈا لیا سنوار اس بھیتر باقی یک کروڑوں
لاکھوں دیکھ، یہ سب میں ویسے محیط، .... لاکھوں ٹھار۔

سوال؛ خدائے تعالیٰ اپنی قدرت میں محیط کیوں؟

جواب؛ جوں ہمیں اپنی معرفت میں۔

سوال؛ ہماری روح میں کیوں محیط؟

جواب؛ جوں ہمیں اپنے نفس میں محیط کہ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ خدائے تعالیٰ منفصلٌ
متصل، با ہمہ و بے ہمہ ہمچو روح با وجود ولیکن روح مخلوق است۔ قید میں آیا۔
سوکھ و دکھ کے لائق ولیکن خدائے تعالیٰ غیر مخلوق است (ص: ۶۲ تا ۶۵)

سوال؛ دل کون؟

جواب: قلوب المومنین عرش اللہ تعالیٰ اس دل کی بزرگی کسے را نہایت نہ رسد کہ
القلب بیت الرب۔

سوال؛ یہ دل کہاں ہے؟

جواب؛ در وجود آدمی۔

سوال؛ یہ بزرگی دل کے وجود میں کیوں سمایا؟

جواب؛ جوں درخت بر کا بر کے بیج میں۔

سوال: ظاہر کیوں ہوئے؟

جواب: مرشد کامل (ص: ۹۵)

سوال؛ پس چونکہ ذات میں ذات مل گیا یک ہو گیا جوں لون پانی میں کہ لون پانی کا تھا
پس پانی میں پانی سوں مل بندھ پانی کا ہو گیا بھوڑ دہی بندہ ڈھونڈے تو سنپڑتا ہے۔

جواب؛ خدائے تعالیٰ کمثلہ شی کہ ہر یک مثل کوں عیب لگتا ہے ولیکن کہے کیا سبب
ہر یک تشبیہہ ہر آدمی جاتا ہے ولیکن فہم نہ کئی کہ پانی میں قدرت نہیں ہے جے وہی
بندہ خارج کرے ولیکن ذات میں یہ گمان نہیں کہ مل گیا پس کیوں نکلے گا کہ قادر
توانا سکتا کی ہے اسی نور کوں اپنے نور میں تھے خارج کر سکتا۔ لاشک ولاشبہ
جان اے عارف کہ یو نور قدیم اول ما خلق اللہ نوری بعدہ از روح آفریدہ وبعدہٗ
در روح نفس آفرید خدائے تعالیٰ بہ قدرت خود وایں نور قدیم قدرت سوں تھا
ولیکن کیوں تھا (ص: ۱۰۵) یہ دل کہاں ہے۔ یہ بزرگی دل کی وجود میں کیوں سمایا؟
یہ دل کہاں ہے؛ دل کون؛ متصل میں منفصل کیوں؟ والی ساخت کے جملے آج

بھی اردو میں لکھے جاتے ہیں، جس کی ابتدا بیجاپور میں اس صوفی خاندان کے ہاتھوں ہوئی۔ بلا شبہ یہ اردو نثر کی پہلی مستند کتاب ہے لہٰذا اس کا لسانی اور ادبی مرتبہ بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر متعین ہونا چاہیئے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ کلمۃ الحقائق اردو نثر کا قدیم نمونہ ہے۔ نظم کا نہیں اور کسی بھی زبان کے نحوی صرفی تجزیے کا تسلی بخش مواد نثر ہی فراہم کر سکتی ہے، نظم نہیں اور اس بنیادی مواد سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق زبان کے اصولوں اور قواعد کی تدوین و ترتیب بندی ہوگی۔ کیوں کہ زبان اپنی ساخت کے اعتبار سے اپنے اصلی خط و خال رنگ و روپ اور مزاج کو آزادانہ طریقے سے نثر ہی میں برقرار رکھ سکتی ہے بلکہ نثر اس کی بہت پابند ہوتی ہے جیسا کہ ہر نظم یا شعر اپنی زبان کی شاعری کی پابندیوں کے حصار میں قید ہوتی ہے اسے بحر، ردیف، قافیہ، وزن، زحاف، صنائع، بدایع، میٹر، ردھم، رہیم، پنگل اور ڈنکل وغیرہ کی وجہ سے جملوں کی بنیادی ساخت اور الفاظ کی تشکیل و استعمال میں نمایاں تبدیلیوں کو گوارا کر لیتی ہے۔ جس کی اجازت کسی بھی زبان کی نثر ہرگز نہیں دیتی۔ ان وجوہات کی بنا پر نثر کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہی ہے۔ نظم پہ ماہر لسانیات نے بھی زبان کے صرفی اور نحوی اصولوں کی ترتیب بندی کے لیے تحریری نثر کو بول چال، لوک کہانیوں، گیتوں اور نظم کی زبان پر فوقیت دی ہے۔ تحریری نثر میں ہی علمی ادبی معیار کی زبانوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تحریری نثر کو زبان کا خالص مستند اور صحیح نمونہ ماننا چاہیئے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا بھی خیال ہے کہ نظم کی زبان پابندیوں کی وجہ تصرفات کو قبول کر لیتی ہے۔ لہٰذا بول چال کی اور نثر کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔

"ہمن، ہمن اور تمسا، تمسا" وغیرہ ضمائر کی شکلیں اردو کی معیاری ضمیروں سے مختلف ہیں۔ ان میں سے حرکات کی تقصیر، حروف صحیح کی تشدید اور ہائیہ حروف کی تخفیف کو لسانی حیثیت سے میں اہم نہیں سمجھتا۔ دکنی اردو کی یہ خصوصیت زیادہ تر منظوم کلام سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نظم کی کڑی پابندیاں ان تحرفات کی ذمہ دار ہوں، دکن کے شعرا نے جن کے سامنے اردو نظم کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اکثر تصرفات کیے اور مذکر کو مونث، مونث کو مذکر، مخفف کو مشدد، مشدد کو مخفف، متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک باندھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کلمے اس زمانے کی بول چال کی زبان میں اسی طرح رائج تھے۔ اس کے علاوہ دکنی میں تشدید ہی نہیں تخفیف و تسہیل بھی دیکھی گئی ہے۔

(داستانِ زبانِ اردو صفحہ ۲۰۸) مضمون ارتقائی مدارج

ماہر لسانیات کی طرح قواعد نویسوں نے بھی زبان کے اور روپوں میں سے تحریری نثر کے ادبی روپ کو زیادہ بنیادی مانا ہے اور اصولوں کی ترتیب بندی کے ذریعہ زبان کے ادبی روپ کی حفاظت کو اپنا فرض مانا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ماہر لسانیات جان لینس کی رائے یوں ہے:

1.4.3. The traditional Grammarians tended to assume not only that written language was more fundamenta then the spoken but also that a particular form of the wirtten namely the literary language, was inherently 'pure' and more correct than, all other forms of the language, written and spoken; and that was his task, as a grammararian, to 'Preserve'. This form of the language form 'corruption'" J.Loyans page 42..../

قبول کردہ معیاری زبان کے اصولوں کی پابندی کرنے والا ادب اپنی خصوصیتوں سمیت ادبی، علمی فن پارہ کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ زبان کے اصول و قواعد کی ترتیب بندی کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ علمی ادبی زبان کا جو معیار حاصل ہو گیا ہے اسے برقرار رکھا جائے بلکہ اس معیار کو عمدہ اور اعلیٰ تخلیقوں کے ذریعے بڑھایا تو جا سکتا ہے، گھٹایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ معیوب بات ہوگی۔ معیاری تحریری نثر کو ہر حالت میں پہلے سے حاصل شدہ معیار کی پابندی لازمی ہے۔ اس لیے نثر نگار کو اپنے بیانات کے قلم بند کرنے کے سلسلے میں پوری آزادی حاصل ہوتی ہے اور یہی آزادی شاعر کو حاصل نہیں ہوگی۔ یہاں بیان خواہ کسی بھی خیال اور موضوع کا کیوں نہ ہو۔

C. F. HOCKETT نے اپنی کتاب "A course in Modern Linguistics" میں شاعری کے تخلیقی عمل کے دوران شاعر اور زبان کو جس پل صراط سے گزارا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

63.4. Most poetry can be described as literature in the form of verse. Verse in turn, can be defined as discourse in which the speaker binds himself in advance to follow certain more or less close by defin[e]opatterns of rhythm, regardless of the topics of the discourse. The rhythm is variously achieved in different languages; some times it is spacing of stresses, lengths,

or tones; sometimes it is spaced recurrence of vowles and consonants or both (yielding rhyme and assonance). No matter how alien the pattern may be to our ears, the factor of controlled rhythm is present or the discourse cannot qualify as verse. The difinination of verse obviously depends on phonological rather than grammatical properties of the discourse". Day 1962.

اس بیان سے عیاں ہے کہ شاعری کو صرف ہم آہنگی، ترنم، ردیف اور قافیہ کا زیادہ پابند ہونا پڑتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے خورشید خر یا خور اور سورج، ماسہ سا ہو سکتا ہے۔ جیسے:

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع
(غالبؔ)

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
(غالبؔ)

اردو شاعری میں ساکن حروف کو متحرک اور متحرک کو ساکن کرنے کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں۔ مرزا غالبؔ نے بھی شاعری کے اس پہلو پر اپنے خطوط میں اپنے ہی ایک شعر کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ غزل کی ز ے جو متحرک ہونی چاہیئے ان کے شعر میں ساکن ہے، اسے جائز قرار دیتے ہیں، لکھا ہے۔

بنائیں غزل کی قدریں جناب غالبؔ نے
تمام جوہر تیغ زباں اُبھر آئے

غزل کی ز ے یہاں ساکن ہے، لیکن یہ سکون جائز ہے
(خط بنام قدر بلگرامی)

اس قسم کی لفظی تخفیف یا حذفِ حروف، ساکن کے متحرک اور متحرک کے ساکن حروف کی نثر کبھی اجازت نہیں دیتی بلکہ الفاظ اور جملے ہمیشہ مکمل ہوتے ہیں اور ہونا چاہیئے۔ نثر کے اس مکمل پن کی وجہ یہ ہے کہ قواعد نویس زبان کے اصولوں کی ترتیب کے لیے نثر سے مواد حاصل کرتے ہیں۔ اس نثری نمونے کی صحیح قرات شرطِ اول ہے۔ اگر متن کی قرات صحیح نہ ہو تو غلط اصولوں کے ترتیب پا جانے کا پورا اندیشہ رہتا ہے۔ جس کا زبان کے معیار پر اثر پڑے گا اور زبان کے معیار کی صحیح دریافت نہ ہو تو فکری اور معنوی پہلو بھی متاثر رہیں گے اور زبان کا بنیادی مقصد پورا ہونے سے رہ جائے گا۔ قواعد نویس اور ماہر لسانیات کے لیے عبارت کی صحیح قرات شرط اول ہے۔

کسی بھی زبان کے ابتدائی نثری نمونوں کی صحیح قرات ایک دشوار ترین عمل ہے۔ زبان جتنی قدیم ہوگی اس عمل میں دشواری بڑھتی چلی جائے گی جس پر قابو پانے کے لیے معصری مصنفوں اور شاعروں کی کتابوں کا مطالعہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ زیر بحث کتاب کی زبان اپنے وقت کی مروجہ زبان کا ہی نمونہ ہوگی جس کا تجزیہ یا مطالعہ مقصود ہو۔

کلمۃ الحقائق کی زبان کے تجزیہ کے لیے اکبرالدین صدیقی صاحب کے مرتب کردہ نسخہ کو بنیاد بنایا ہے، جس کی اشاعت جولائی ۱۹۶۱ء میں ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد سے ہوئی تھی۔ یہ ان کے سلسلہ مطبوعات کی ۸۲ ویں کڑی ہے۔ اس میں کل ۱۰۸ صفحات ہیں۔ کتاب کا متن صفحہ ۲۱ سے ۱۱۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کتاب کے متن کے بارے میں مرتب کا خیال ہے کہ:

قدیم دکنی میں جتنے رسائل ملتے ہیں۔ ہر رسالہ کے مختلف نسخوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن کلمۃ الحقائق ہی وہ واحد رسالہ ہے جس کے مختلف نسخوں میں کوئی اہم اختلاف جس سے اس کی صوری اور معنوی حیثیت بدل گئی ہو، نظر نہیں آتا۔

کلمۃ الحقائق کے ۸۸ صفحوں پر مشتمل نثری متن میں کل ۴۹ اسم جمع کے صیغے ملتے ہیں بعض صیغوں جیسے بندے صفات چیزاں اور انکھیاں کی رفتار تکرار مقابلتاً دوسرے اسماء سے زیادہ ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

۱۔ میں و تو ایں ہر دو برابراست از یک جا بیروں آمدند کہ آفتاب روشن انکھیاں تھے وانکھیاں روشن آفتاب تھے۔ آفتاب تو قدیمی ہے ولیکن اجالا وانکھیاں تھے تو پس اجالا کیا دے انکھیاں فدا ہو نہاریاں ہیں ز آفتاب بقا ــــ مکمل اسم جمع کی بہ اعتبار حروف تہجی ہے۔

فہرست اسم جمع کلمۃ الحقائق

الف

۱۔ اشارات ۲۔ آنکھیں ۳۔ انکھیاں

۴۔ اشیا ۵۔ اعتقادات ۶۔ ارواح

۷۔ افعال ۸۔ اعضا ۹۔ انواح

۱۰۔ اعمال

ب

۱۱۔ بندے ۱۲۔ باتاں ۱۳۔ بتیاں

۱۴۔ برتن ہاریاں

ت

۱۵۔ تارے ۱۶۔ تعلقات

چ

۱۷۔ چیزاں ۱۸۔ چیزوں

ح

۱۹۔ حوراں ۲۰۔ حکماں ۲۱۔ حرکات

خ

۲۲۔ خطرات

س

۲۳۔ روحاں

۲۴۔ سالکاں ۲۵۔ سگیاں

ش

۲۶۔ شاگرداں ۲۷۔ شاہداں ۲۸۔ شاہدیاں

ص

۲۹۔ صفات ۳۰۔ صفتیں ۳۱۔ صورتاں

۳۲۔ صفتاں

ع

۳۳۔ عارفاں ۳۴۔ عناصر

ف

۳۵۔ فعلوں ۳۶۔ فعلاں

ق

۳۷۔ قلوب

ک

۳۸۔ کیڑے

م

۳۹۔ مخلوقات ۴۰۔ موجودات ۴۱۔ مشغولات

۴۲۔ ملائکاں ۴۳۔ مناں ۴۴۔ مومنین

ن

۴۵۔ نوراں ۴۶۔ نصیباں ۴۷۔ نکات

و

۴۸۔ وجوداں ۴۹۔ واصلاں

کلمۃ الحقائق کے متن میں موجود عربی اور فارسی کی عبارتیں اور جملے عربی، فارسی، صرف و نحو کے مطابق کبھی تو اپنے آپ مکمل ہیں اور کبھی اردو کی عبارت کا جزو بن گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اردو جمع کے صیغوں کی فہرست تیار کرنا بہت نازک عمل ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو کامیاب بنانے کے لیے مندرجہ ذیل جملوں کی طرح کے صرف ایسے جملوں سے صیغے لیے گئے ہیں جو بڑی حد تک اردو کے مکمل جملے ہیں۔

۱۔ یہ عرفان تجھ میں انہوں تینوں وجوداں کون سمجھنا سو یو عارف الوجود حقائق (ص: ۳۸)

۲۔ جملہ روحاں کا اصل ہوا امر تھے ہے (ص: ۶۲)

۳۔ بندے کے فعل بار (باہر) ہیں اس تے (سے) بندے کے فعلوں میں محیط ہے۔ (ص: ۵۵)

۴۔ جوں اسمان میں تارے (ص: ۵۳)

۵۔ یہ صورتاں وہاں تے (سے) بار (باہر) ہیں۔

ان اسم جمع کو شامل فہرست نہیں کیا گیا جو عربی یا فارسی کی عبارت کا جز ہیں۔

(۱)..... در نذر محققاں این علم ثلاثی در ہر شے باید شناس (ص: ۵۸)

(۲) کہ ایں راہ سالکاں کہ در حق واصل شود این را چگونہ است؟

جیسے جملوں میں شامل اسم جمع محققاں، سالکاں کا شمار نہیں کیا گیا اور یہی صیغہ جمع اردو جملوں کا جز ہونے کی صورت میں شاملِ فہرست ہیں۔

اردو میں اسم کے صیغہ جمع کرنے کے لیے اسم واحد یا مادہ کے ساتھ جمع کے لاحقے جوڑے جاتے ہیں جیسے لڑک مادہ ہے جس سے مندرجہ ذیل صیغہ جمع حاصل ہوتے ہیں

مادہ	علامت تانیث	علامت جمع	صیغہ جمع
لڑک		ے	= لڑکے
لڑک	+ ی +	یاں	= لڑکیاں
لڑک	+ ی +	یوں	= لڑکیوں
لڑک		وں	= لڑکوں
لڑک		ی یو	= لڑکیو (علامت واحد مؤنث کی)
لڑک		و	= لڑکو

اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح صیغہ جمع حاصل کرنے کے لیے صرف لاحقے ملحق کیے جاتے ہیں۔ وسطیے داخل کیے جاتے ہیں اور نہ سابقے جوڑے جاتے ہیں۔ مگر نہ صرف کلمۃ الحقائق بلکہ اردو زبان کی ہر کتاب میں نظم ہو یا نثر ایسے اسم جمع کے صیغے مل جاتے ہیں جس کے ساتھ الحاق یا دخل کا عمل موجود ہے یعنی وسطیے اور سابقے موجود ہیں۔ لہٰذا کلمۃ الحقائق میں بھی فعل سے افعال، روح سے ارواح، عمل سے اعمال، نوع سے انواع، قسم سے اقسام جیسے الفاظ ملتے ہیں جن میں دو الف جمع کی علامتوں کے طور پر لفظ کے اندر موجود ہیں۔ پہلا الف اسم واحد کے صیغہ کے ابتدائی حرف سے پہلے اور دوسرا الف ابتدائی دو حروف کے بعد داخل کیا گیا ہے۔ روح، فعل، عمل، قسم اور نوع یہ سب تین حرفی اسم ہیں:

ر و ح = روح
ف ع ل = فعل
ع م ل = عمل
ن و ع = نوع
ق س م = قسم

جمع کا صیغہ حاصل کرنے کے لیے ان اسم کے مادوں میں دو الف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جس کا عمل یوں ہے۔

سابقہ	ابتدائی دو حرف	وسطیہ ا	آخری حرف	صیغہ جمع
ا	رو	ا	ح =	ارواح
ا	فع	ا	ل =	افعال
ا	عم	ا	ل =	اعمال

غیر اردو اسم جمع

روح عمل اور فعل کی حاصل جمع وسطیوں اور سابقوں کے اضافے سے حاصل ہوئی ہے اور اردو اپنی اصل کے اعتبار سے وسطیوں والی زبان نہیں ہے۔ جمع کے یہ صیغے اردو کے صرفی قاعدوں کے مطابق حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ان اردو جمع کو غیر اردو اسم جمع سمجھنا چاہیئے خواہ وہ اردو زبان کے ارتقا کے کسی بھی دور میں مستعمل رہے ہوں۔ وہ دور مرزا غالب کا ہو یا برہان الدین جانم کا۔ البتہ ان کا استعمال دخیل الفاظ کی حیثیت سے بالکل صحیح ہے۔

عربی فارسی کی علامتیں اور اردو جمع کے صیغے

جمع کی دو علامتیں اں اور ات فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ملتی ہیں۔ جو سابقہ اور وسطیہ نہیں بلکہ لاحقہ ہیں۔

اختلاف سے اختلافات
اعتقاد سے اعتقادات اور
کتاب سے کتاباں
عارف سے عارفاں
محقق سے محققاں

چونکہ یہ علامتیں لاحقے ہیں اور اردو کے صرفی قاعدے کے مطابق ہیں۔ اس لیے ان کو اردو جمع کی علامتوں میں بہ آسانی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق ان علامتوں کے الحاق سے حاصل شدہ صیغے اردو کے صیغے ہوں گے۔

علامت "اں" کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ابراہیم نامہ میں لکھا ہے کہ "اں کی جمع کا ماخذ ہریانوی اور کھڑی بولیاں ہوں گی جہاں اب تک یہ رائج ہے۔ متقدمین میں شعرائے دہلوی کے یہاں اس کی خال خال مثالیں مل جاتی ہیں اور دہلی کے روزمرہ میں مخصوص تراکیب آج بھی سنائی دیتی ہیں (ابراہیم نامہ صفحہ ۹۷)

ڈاکٹر صاحب کی رائے سے مجھے اختلاف تو نہیں، مگر میرا خیال ہے کہ "اں" کی جمع کا ماخذ لاحقہ اردو کو براہ راست فارسی کی دین ہے ۔ فارسی سے اور بھی علامتیں جیسے "ہا" (کوہ + ہا) اور یاں لطیفہ گویاں خوش خویاں وغیرہ کے ساتھ اردو میں مروج ہو گئی ہیں ۔ اسی طرح عربی فارسی کے وہ تمام لاحقے جو اسم واحد کے ساتھ جوڑے جا سکتے ہیں، اردو میں قبول کر لیے گئے ہیں ۔ بعض علامتوں کی تکرار استعمال بہت زیادہ ہے ۔ مگر انواع، انعال کثیر استعمال کے باوجود بھی غیر اردو اسم جمع متصور ہوں گے ۔ صرف اس لیے کہ اردو وسیلوں والی زبان نہیں ہے ۔ اسی اساس کے مطابق کلمۃ الحقائق کے اسم جمع کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔

طریقۂ تجزیہ

تجزیہ علامتوں کے تحت کیا گیا ہے ۔ حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق نہیں عام علامت رکھنے والے الفاظ ایک ترتیب سے آئیں گے اور دوسری علامت رکھنے والے اس کی اپنی ترتیب کے مطابق ۔

اس کتاب میں اردو کے جملوں میں کل ۹۴ اسم جمع کے صیغے آئے ہیں جو مختلف علامتوں کے استعمال سے تشکیل پائے ہیں ۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ۔ بعض اسم کی جمع دو تین طریقوں سے حاصل کی گئی ہے ۔ جیسے بندہ صفت ہے ۔

صفت کی جمع کی مندرجہ ذیل شکلیں کلمۃ الحقائق میں آئی ہیں ۔

بندہ

بندیاں ۔ بندے

اردو زبان میں یہ خصوصیت ابھی تک مروج ہے یعنی کہ ایک ہی اسم کی کئی علامتوں سے جمع کا صیغہ حاصل کیا جاتا ہے ۔ جیسے :

حالت ، حالتاں ، حالتوں ، حالات وغیرہ

مگر بعض علامتیں مخصوص حالتوں کی پابند ہیں ۔ جیسے "وں" جو جمع کی علامت ہے وہ صرف جملے میں آنے والے اس اسم کے ساتھ آئے گی ، جس کے بعد کوئی نہ کوئی حرف جر جیسے : پر ، تک ، میں ، سے ، کا ، کے ، کی اور نے

بچوں کا	ترکوں کی
گھروں	کاموں سے
برسوں تک	مسلمانوں نے
تذکروں کی	کالجوں کے وغیرہ

کلمۃ الحقائق میں اسم جمع کی علامتیں

۱۔ "اں"

مندرجہ ذیل اسم جمع علامت "اں" کا لاحقہ جوڑ کر حاصل کیے گئے ہیں ۔ دیگر علامتوں کے مقابلے میں اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے ۔ کل ۹۴ جمع کے صیغوں میں سے ۱۸ صیغے اس علامت کے ساتھ آئے ہیں ۔

اسم واحد		جمع کا عمل		جمع کا صیغہ
۱۔ بات	=	بات + اں	=	باتاں
۲۔ چیز	=	چیز + اں	=	چیزاں
۳۔ صورت	=	صورت + اں	=	صورتاں
۴۔ حور	=	حور + اں	=	حوراں
۵۔ صفت	=	صفت + اں	=	صفتاں
۶۔ حکمت	=	حکمت + اں	=	حکمتاں
۷۔ شاہد	=	شاہد + اں	=	شاہداں
۸۔ نصیب	=	نصیب + اں	=	نصیباں
۹۔ وجود	=	وجود + اں	=	وجوداں
۱۰۔ روح	=	روح + اں	=	روحاں
۱۱۔ سالک	=	سالک + اں	=	سالکاں
۱۲۔ تحقیق	=	تحقیق + اں	=	تحقیقاں
۱۳۔ واصل	=	واصل + اں	=	واصلاں
۱۴۔ نور	=	نور + اں	=	نوراں
۱۵۔ فعل	=	فعل + اں	=	فعلاں

اسم واحد	جمع کا عمل	جمع کا صیغہ
۱۶۔ عارف =	عارف + اں =	عارفاں
۱۷۔ مومن =	مومن + اں =	موماں
۱۸۔ شاگرد =	شاگرد + اں =	شاگرداں

"اں" علامت ہر زبان کے اردو میں مستعمل اسم کے ساتھ جوڑی جاسکتی ہے۔ خواہ وہ لفظ عربی، فارسی سے لیا گیا ہو یا ہندوستانی الاصل ہو یا انگریزی، ترکی سے تعلق رکھتا ہو۔ علامت جمع (۲) "یاں" کے لاحقے کے ساتھ مندرجہ ذیل صیغے آئے ہیں:

۱۹۔ آنکھ =	انکھ + یاں =	انکھیاں (ابتدا کی الف ممدودہ کو مقصور کر لیا گیا)
۲۰۔ بندہ =	بندہ + یاں =	بندیاں (بندہ کی آخری ہ کو حذف کر دیا گیا)
۲۱۔ سگل =	سگل + یاں =	سگلیاں
۲۲۔ برتن ہار =	برتن ہار + یاں =	برتن ہاریاں
۲۳۔ شاہد =	شاہد + یاں =	شاہدیاں

(۳) "وں" علامت جمع سے حاصل شدہ صیغے یہ ہیں:

۲۴۔ چیز =	چیز + وں =	چیزوں
۲۵۔ فعل =	فعل + وں =	فعلوں

"ے" علامت سے حاصل شدہ صیغے:

۲۶۔ بندہ =	بند + ے =	بندے	آخری ا یا ہ کے حذف کے بعد علامت ملحق کی گئی ہے
۲۷۔ تارا =	تار + ے =	تارے	
۲۸۔ کیڑا =	کیڑ + ے =	کیڑے	

ات علامت کے الحاق سے حاصل کیے گئے صیغے:

۲۹۔ خطرہ =	خطر + ات =	خطرات	آخری ہ کی حذف کے ساتھ
۳۰۔ اشارہ =	اشار + ات =	اشارات	
۳۱۔ اعتقاد =	اعتقاد + ات =	اعتقادات	
۳۲۔ تعلق =	تعلق + ات =	تعلقات	
۳۳۔ مشغول =	مشغول + ات =	مشغولات	
۳۴۔ مخلوق =	مخلوق + ات =	مخلوقات	

"یں" علامت سے مندرجہ ذیل صیغے حاصل کیے گئے ہیں:

۳۵۔ صفت =	صفت + یں =	صفتیں
۳۶۔ آنکھ =	آنکھ + یں =	آنکھیں

"ین"

۳۷۔ مومن =	مومن + ین =	مومنین

اس تجزیہ سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کُل ۳۷ جمع کے صیغے اردو کے صرفی اصولوں کے مطابق ہیں اور باقی اردو کے صرفی اصولوں کے برخلاف۔ کیوں کہ ان صیغوں میں وسطیوں کا استعمال ہوا ہے اور اردو جو ایک ہند آرائی زبان ہے وہ لفظوں کی تشکیل میں وسطیوں کی اجازت نہیں دیتی۔

کلمۃ الحقائق ابتدائی نثر کا نمونہ ہے۔ اس پر فارسی اور عربی زبانوں کے بہت زیادہ اثرات ہیں، مگر صرفی نحوی اعتبار سے اس کی عبارت میں جگہ جگہ پختگی کے آثار ہیں۔ اس کتاب کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ کسی فارسی یا عربی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ تخلیقی کتاب ہے۔

لہٰذا اردو کی اس پہلی مستند نثر کو تخلیقی ادب پارہ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اردوپن کی خوشبو اس کے اندر سے مہک رہی ہے اور یہ کتاب نوزائیدہ زبان کی اقبال مندی کی ضامن نظر آتی ہے۔ اس زبان کی تومندی اور صحت مندی اپنے اندر پوشیدہ ترقی پسندی کے رجحان کو صاف ظاہر کر رہی ہے۔

دوسرے نثر پاروں کے ہمہ جہت لسانی تجزیہ سے اردو زبان کے سفر کے ارتقا کے مدارج کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ سب رس ۱۰۴۵ھ تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان نے اپنے ارتقا کی کافی منزلیں طے کر لی ہیں۔ سب رس میں زبان کے معیار اور پختگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

(بشکریہ آج کل نئی دہلی، بھارت)

حیدر علی حیدر

مقتدرہ قومی زبان کا مذاکرہ

گذشتہ دنوں مقتدرہ قومی زبان کراچی کے زیر اہتمام نیپا آڈیٹوریم کی [illegible] گاہ میں ایک مجلس مذاکرہ ہوئی جس کی صدارت جسٹس ریٹائرڈ قدیر الدین احمد نے کی۔ اس موقع پر موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ دنیائے اسلام میں عربی کے بعد دوسری سب سے بڑی زبان ہے۔ اردو کو مزید وسعت دینے کے لیے آپ نے مشورہ دیا کہ علاقائی اور مقامی الفاظ کو قومی زبان میں سمونے پر توجہ دی جائے۔ اردو سے انگریزی یا کسی علاقائی زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ [illegible] یہ ہے کہ صرف اردو ہی ملک کے اندرونی اور دور دراز علاقوں میں رابطے کی زبان ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو مزید مقبول بنانے کے لیے مشاعروں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ جسٹس تنزیل [illegible] نے اپنی تقریر میں کہا کہ جن افراد کو ضرورت ہو وہ انگریزی سیکھ لیں۔ [illegible] عوام کو انگریزی سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: مقتدرہ قومی زبان اردو کے فروغ کو ایک چیلنج سمجھ کر نفاذ اردو کے کام میں مصروف ہے۔ انہوں نے نفاذ اردو کے ضمن میں مقتدرہ قومی زبان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء کے دوران شائع کی جانے والی کتب کی تفصیلات بیان کیں۔ جن میں سائنس، تجارت، زبان و ادب، مختلف علوم اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تفصیل اور اس کی خصوصیت سے [illegible] کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے اردو کے فروغ کے لیے دانشوروں کی کوششوں کو بھی سرا[illegible]

ڈاکٹر حنیف فوق نے کہا کہ قومی زبان مجموعی زندگی کی حرکات کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مختلف قومیتوں کے درمیان وحدت فکر ضروری ہے اور یہ قومی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

پروفیسر سحر انصاری نے اپنے مقالے میں کہا کہ مقابلوں کے امتحانات میں اردو کو متبادل زبان کی حیثیت دی جائے یہ بہت ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ نفاذ اردو کا مطلب انگریزی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ قبل ازیں مقتدرہ قومی زبان کراچی کی نگران محترمہ [illegible] جعفری نے خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ قومی زبان کو اس کا جائز مقام دینا قوم [illegible] ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ ۱۹۷۹ء میں مقتدرہ قومی زبان کے قیام سے اب تک شائع ہونے والی [illegible] تصانیف اور مسلسل کاوشوں کے باوجود قوم کو انگریزی کی بالادستی سے چھٹکارا نہیں دلوایا جا سکا۔

[illegible] کاروان ادب کے معتمد عمومی مختار زمن نے میر علی احمد تالپور کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وفات سے ہماری ثقافتی زندگی میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مرحوم کو اردو ادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ کتنے نئے [illegible] پرانے کی [illegible] نظر آتی تھی۔ تقریب میں علی احمد تالپور اور نوری نستعلیق کی نشوونما کے [illegible] والے مرزا جمیل کی والدہ کے انتقال پر تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں اور مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔

(بشکریہ روزنامہ جسارت کراچی)

سعید احمد*

اُردو کتابیاتِ علم کتب خانہ

الف۔ علم کتاب داری عمومی

۱۔ الطاف شوکت

ابتدائی نظام کتب خانہ:

لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۸۴ء

۲۔ الطاف شوکت

نظام کتب خانہ:

لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۸۶ء

۳۔ صمدانی رئیس احمد

ابتدائی لائبریری سائنس:

کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۰ء

۴۔ صمدانی، رئیس احمد

مبادیات لائبریری سائنس:

کراچی: صمدانی اکیڈمی، ۱۹۸۵ء

۵۔ عابدی، رضا علی

کتب خانہ:

کراچی: سعد پبلشرز، ن۔م

۶۔ نسیم فاطمہ

علم کتب خانہ و اصطلاحات (مجموعہ مضامین)

طبع دوم: کراچی: ادارہ فروغ کتب خانہ جات ۱۹۸۵ء

اشاعتِ دیگر

طبع اول، علم کتب خانہ ۱۹۸۰ء

ب۔ تاریخ کتاب و کتب خانہ

۷۔ اشپر نگر، اے

شاہانِ اودھ کے کتب خانے۔ مترجم و مرتبہ محمد اکرام چغتائی:

کراچی: انجمن ترقی پاکستان، ۱۹۷۳ء

۸۔ حسن اختر ملک

ہمارے کتب خانے:

اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء

۹۔ دت، بل کمار

ہندوستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے:

مترجم سرتاج احمد عابدی

نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء

۱۰۔ قدوائی، شایاں

کتاب کی تاریخ:

نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء

۔ محمد زبیر

اسلامی کتب خانے:

دہلی جمعیتہ پریس، ۱۹۶۱ء

اشاعت دیگر

طبع دوم: کراچی: ایچ۔ایم سعید، ۱۹۷۹ء

۱۲۔ محمد زبیر

شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا انتظام:

---

* کتاب دار مقتدرہ قومی زبان

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : انتخاب کلام داغ
مرتبہ : ڈاکٹر محمود الرحمٰن
صفحات : ۳۶۴
ناشر : میپکو ۸۔اے، چوہدری پلازہ
۵۱۔ بلیو ایریا، اسلام آباد

غزل اردو شاعری کی جان اور مرزا داغ اردو غزل کا ایک معتبر نام ہے داغ کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی شہرت ان کی استادی کی وجہ سے نہیں ہوئی جتنی ان کے خاص رنگ کے باعث ہوئی۔ داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت، صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے زبان کی چاشنی اور لطافت، لہجے کی شوخی، نقطۂ نظر کی صحت مندی اور اس کی داخلیت، ایمائی محاکات اور ترنم نے غزل کو ایک نیا رنگ دیا جو داغ کا اپنا خاص رنگ ہے۔

زیرِ نظر کتاب "انتخاب کلام داغ" ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے مرتب کی فاضل مرتب نے داغ کے چاروں دواوین سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا جو داغ کی شاعری کے جملہ عناصر ترکیبی پر محیط ہیں۔ انتخاب کی ترتیب بہت عمدہ ہے۔ انتخاب کلام کے ساتھ فاضل مرتب کا سیر حاصل مقدمہ بھی ہے جس میں داغ کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "حیاتِ داغ پر ایک نظر" کے عنوان سے داغ کی مختصر سوانح سنین کے ساتھ اور تلامذہ داغ کی فہرست پیش کی گئی ہے، آخر میں مآخذ کی فہرست بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اس انتخاب کو نئے زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کاوش کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اردو ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مفید اضافہ ہے کتاب نہایت سلیقے سے آفسٹ کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ گیٹ اپ دیدہ زیب ہے کتاب کی قیمت ایک سو پچیس روپے ہے۔

نام کتاب : دروغ برگردن قاری
مصنف : محمد طارق طور
صفحات : ۲۰۰
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : پاکستان انٹرنیشنل پبلشرز اشرف
اشرف مارکیٹ، وحدت روڈ
لاہور

ہماری بہادر افواج جہاں اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں وہاں اپنی تخلیقات سے پاکستانی ادب کی آبیاری بھی کرتی ہیں نثر نگاری میں مزاح کے میدان میں جنرل شفیق الرحمٰن، بریگیڈیئر صدیق سالک، کرنل محمد خان اور سید ضمیر جعفری نے اپنے اپنے دائرے میں مزاح نگاری سے ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ "دروغ برگردن قاری" کے مصنف میجر طارق طور بھی پاکستان آرمی سے وابستہ اور اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا اور مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ ان مضامین میں جہاں واقعات کی مدد سے خندہ زیرلب کا سامان موجود ہے وہاں سنجیدگی سے سوچنے کی دعوت بھی دی ہے اس کتاب کے جو مضامین پیروڈی کے زمرے میں آتے ہیں وہ اس کتاب کے بہترین مضامین ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے میجر طارق محمود طور ایک ابھرتے ہوئے اچھے مزاح نگار ادیب کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں اور "دروغ برگردن قاری" کی اشاعت اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ بہت دیدہ زیب ہے۔

نام کتاب : تقاریر و نگارشاتِ قائد ملت
بہادر یار جنگ
مرتبین : محمد احمد خان، مجید احمد فاروقی
قیمت : سو روپے
صفحات : ۳۵۲
پتہ : بہادر یار جنگ اکادمی
سراج الدولہ روڈ، بہادر آباد
کراچی

بہادر یار جنگ، حیدر آباد دکن کی ایک ممتاز شخصیت، زبردست خطیب، مصلح قوم، مفکر ملت اور مبلغ اسلام تھے۔ آپ نے مملکتِ حیدر آباد اور غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں بیش بہا ملی خدمات انجام دیں۔ اکادمی نے بہادر یار جنگ کے منتشر اور بکھرے ہوئے خطبات اور نگارشات کو یکجا کیا اور فاضل مرتبین جناب محمد احمد خان اور جناب مجید فاروقی نے بڑی کاوش و محنت سے انہیں مرتب کیا اور توضیحی حواشی کے حوالوں سے بہت سے امور کی وضاحت کی۔
زیرِ نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے حصہ اول مذہبی تقاریر، سیاسی تقاریر حیدر آباد دکن اور شخصیات کے عنوانات پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں نگارشات شامل ہیں۔ مذہبی تقاریر میں تبلیغ اسلام، دینیات کی تعلیم اطاعتِ امیر، صراط مستقیم اور سیاسی تقاریر میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور، جمال الدین افغانی کا پیغام، اقبال کا پیام آزادی، حیدر آباد دکن میں دستوری اصلاحات اور حیدر آباد کا ماضی اور مستقبل کے عنوان سے نہایت بصیرت افروز تقاریر درج ہیں، مقدمہ مولانا غلام محمد نے تحریر کیا ہے یہ کتاب علمی و افادی مطبوعات میں ایک وقیع اضافہ ہے اکادمی نے بہادر یار جنگ کی تقاریر اور نگارشات کو شائع کر کے اہم قومی فریضہ انجام دیا ہے جس کے لیے اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے۔ یہ کتاب اچھے گیٹ اپ کے ساتھ آفسٹ کاغذ پر چھپی ہے۔

نام کتاب : گلدستہ الفاظ
مرتب : منور نقوی
قیمت : بیس روپے
ناشر : احباب بک ڈپو، شاہی روڈ
ضلع رحیم یار خان

بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اچھا اور مفید تعلیمی مواد کمیاب ہے۔ زیرِ نظر کتاب " گلدستہ الفاظ " بچوں کی لغت ہے جو اپنی طرز کی ایک اہم اور مفید کتاب ہے۔
بچوں کے لیے ان کی معلومات اور ذخیرہ الفاظ میں اضافے کے لیے تدریسی کتب کے علاوہ ایسے معاون تعلیمی مواد کی ضرورت ہوتی ہے جو رنگین تصاویر خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت سے آراستہ ہو اور بچوں کی دلچسپیاں کی تکمیل میں معاون ہو۔ زیرِ نظر کتاب اس اعتبار سے نہایت مفید ہے کہ اس میں ابتدائی مدارج کے طلبہ کی سطح کے مطابق الفاظ کو بصری معاونات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان الفاظ کو آسان جملوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں الفاظ کی تدریس کے ساتھ ان کے تصورات کی توضیح نے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔
جناب منور نقوی کی یہ عمدہ انفرادی کوشش قابل تحسین ہے۔ یہ کتاب بچوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوگی۔

علی گڑھ : مصنف خود، ۱۹۵۱ء

۱۳ - مرتضیٰ مطہری

ایران اور مصر میں کتب سوزی :

مترجم حواشی سید عارف نوشاہی، راولپنڈی :

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۱۹۸۱ء

۱۴ - نسیم فاطمہ

ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستان لائبریرین شپ :

کراچی : لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۱ء

۱۵ - ہنٹو، اودنگا

اسلامی کتب خانے (عہد عباسیہ میں) مترجم قاضی احمد میاں

اختر جوناگڑھی :

لکھنو : دارالناظر، ۱۹۲۲ء

ج - تنظیم و نسق

۱۶ - بشیرالدین، سید

انتظام کتب خانہ، از سید بشیرالدین و سید جمیل احمد :

دہلی : مکتبہ جامعہ ملیہ، ۱۹۴۱ء

۱۷ - رضوی، سید سجاد حسین

لائبریری اور اس کی تنظیم :

میرٹھ : استوگی اینڈ کمپنی، ۱۹۴۰ء

۱۸ - محبوب قریشی (مرتب)

انتظام کتب خانہ :

حیدرآباد دکن : محبوبیہ کارخانہ جلد سازی :

عہد آفرین برقی پریس

د - کیٹلاگ سازی

۱۹ - انیس خورشید

پاکستانی ناموں کی کیٹلاگ سازی :

مترجم نورالدین خورشید : کراچی : اٹک بک کو، ۱۹۸۲ء

۲۰ - محمد اصغر

کیٹلاگ سازی : از محمد اصغر اور محمد فاضل خان :

لاہور : ندیم بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء

۲۱ - محمد زبیر

کیٹلاگ سازی : علی گڑھ : ادبی دنیا، ۱۹۶۳ء

اشاعت دیگر

لائبریری کیٹلاگ : کراچی : سعید اینڈ کمپنی، ۱۹۷۷ء

۲۲ - نسیم فاطمہ

ضوابط کیٹلاگ سازی کا تاریخی و توضیحی جائزہ :

کراچی : لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۰ء

درجہ بندی

۲۳ - اختر حسن، سید

اعشاریائی تقسیم و نظام کتب خانہ :

لاہور : مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء

۲۴ - ڈیوی، میلول

عشری درجہ بندی : اشاعت نہم

مترجم سید محمد حسن قیصر امروہوی :

نئی دہلی : ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء

۲۵ - سبزواری، غنی الاکرم

درجہ بندی : ج - ۱ :

کراچی : لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۰ء

اشاعت دیگر

ج - ۲ ، ۱۹۸۱ء

۲۶ - محمد اسلم

درجہ بندی اور تنظیم کتب خانہ :

لاہور : اسلامک بک سروس، ۱۹۸۲ء

ہ - علمی کتب خانے

۲۷ - خان، صادق علی

اسکول اور کالج کے کتب خانوں کی تنظیم :

لاہور : فیروز سنز، ۱۹۶۲ء

۲۸۔ سبزواری، غنی الاکرم

اسکول کے کتب خانے: کراچی: انجمن فروغ و ترقی

کتب خانہ جات: ۱۹۸۲ء

و۔ کتابیاتی سازی و خدمات

۲۹۔ عثمانی، محمد عادل

پاکستان میں کتابیاتی سرگرمیاں:

مترجم زین الدین صدیقی:

کراچی: لائبریری پروموشن بیورو: ن۔م

ز۔ حوالہ جاتی وسائل اور خدمات

۳۰۔ نسیم فاطمہ

حوالہ جاتی خدمات: طبع دوم:

کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۵ء

ح۔ لغات اصطلاحات

۳۱۔ زین صدیقی، نظر ثانی غنی الاکرم سبزواری اور نسیم فاطمہ:

کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ (تعاون مقتدرہ قومی زبان)، ۱۹۸۳ء

۳۲۔ محمود الحسن مرتبہ

کشاف اصطلاحات کتب خانہ:

مرتبہ: محمود الحسن، زمرد محمود: نظر ثانی سید جمیل احمد رضوی:

اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

ط۔ تحقیق

۳۳۔ رضوی، سید جمیل احمد

لائبریری سائنس اور اصول تحقیق:

(تصویری اشاعت): اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان

۱۹۸۷ء

ی۔ متفرقات

۳۴۔ رضوی، سید سجاد حسین

لائبریری بک ڈپو، ۱۹۴۲ء

۳۵۔ شیرا۔ جے۔ ایچ

لائبریری شپ کی عمرانی بنیادیں

ترجمہ و تلخیص سید جمیل احمد رضوی: لاہور

پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (پنجاب کونسل)، ۱۹۸۰ء

طبع دوم

اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۳۶۔ مسیح گل، سردار

بدلتی لائبریری:

لاہور: پبلیکیشن سروس، ۱۹۸۴ء

۳۷۔ نسیم فاطمہ

ادب و کتب خانہ، از نسیم فاطمہ اور رئیس احمد عمرانی:

کراچی: بزم اکرم ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر وحید قریشی کے لیے ارمغانِ علمی

مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں [illegible] ادبیات مشرق کراچی نے [illegible] ایک ارمغان علمی شائع کیا جائے گا۔ [illegible] اہل علم [illegible] تحقیق کے مقالات شامل ہوں گے۔ اس ارمغان [illegible] مجلس ادارت و مشاورت کے صدر احمد ندیم قاسمی [illegible] ارکان [illegible] پاکستان سے ڈاکٹر جمیل جالبی، [illegible] ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، [illegible] ہاشمی اور مشفق خواجہ [illegible] سے [illegible] آزاد، [illegible] ارمغان میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے شامل کئے جائیں گے۔

[illegible] ۹ جون ۸۷ء

زبان

مطبوعات

دارالتصنیف

(الف) کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱	کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۳ء	خالد اقبال یاسر	۲۵ پیسے	۳۵ پیسے
۲	کتابیات لغات اُردو	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۴۰	۵۵
۳	کتابیات پاکستان کے اُردو اخبارات و رسائل ۱۹۴۷ء تک	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	۴۲	۵۴
۴	مجمل کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری/خالد اقبال یاسر	۳۰	-
۵	کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۵ء	خالد اقبال یاسر	۳۰	۳۶
۶	کتابیات تعلیم	نسرین زہرا	۳۵	۴۵

(ب) امورِ لسانی

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۷	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)	وارث سرہندی	۷۵	۸۵
۸	اُردو سندھی کے لسانی روابط (طبع نو)	شرف الدین اصلاحی	۷۲	-
۹	ترجمے کا فن، نظری مباحث	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۳۵	-

(ج) کشاف اصطلاحات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۰	کشاف اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد	۳۶	۴۵
۱۱	کشاف قانونی اصطلاحات (جلد اوّل)	رشید احمد صدیقی	۸۰	۹۵

(د) لغات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۲	اسپرانتو اُردو لغت	سعید احمد فارانی	۷۵	۸۵
۱۳	اُردو اور پشتو کے مشترک الفاظ	پروفیسر پریشان خٹک	۲۵	۳۵
۱۴	لسانی رابطہ (طبع نو)	پروفیسر پریشان خٹک	۳۵	-

(ہ) دفتری امور

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۵	اُردو ٹائپ مشین کے کلیدی تختے	ڈاکٹر طارق عزیز	۳۵	۴۵

(و) تعلیمی امور

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۶	بلوچستان میں اُردو ذریعہ تعلیم	پروفیسر ایم انور رومان	۳۰	-

دارالترجمہ

(الف) اصطلاحات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۷	سائنسی و تکنیکی اصطلاحات (طبع دوم)	مجلس استناد	۴۰	-
۱۸	وفاقی و صوبائی عہدوں کے نام (حصہ دوم)	مجلس استناد	۲۵	۳۵

(ب) دفتری امور

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۱۹	دفتری مراسلت (طبع دوم)	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی	۲۰	-
۲۰	سرکاری خط و کتابت (جلد دوم) نیم سرکاری مراسلات	ربیعہ فخری/محمد اظہار الحق	۵۰	۶۰
۲۱	سرکاری خط و کتابت (جلد سوم) دفتری حکمنامے	مسعود احمد چیمہ/ڈاکٹر محمد صدیق شبلی	۵۵	۶۵

(ج) خود سیکھیے (خصوصی منصوبے)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۲۲	اسپرانتو خود سیکھیے	سعید احمد فارانی	۴۰	۵۰
۲۳	عربی سیکھیے (جلد اوّل)	عبدالرحمٰن طاہر سورتی	۶۵	۷۵

شعبہ درسیات

(الف) سائنسی علوم

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۲۴	ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر	شہزاد احمد	۴۰	۵۰

(ج) پیشہ ورانہ علوم

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۲۶	طب (طبع نو)	ڈاکٹر ب۔ اسلم	۸۰	۱۰۰
۲۷	لائبریری سائنس اور اصولِ تحقیق	سید جمیل احمد رضوی	۶۰	۷۰
۲۸	لائبریرین شپ کی عمرانی بنیادیں	ڈاکٹر ایچ شیرا/جمیل احمد رضوی	۳۵	۴۵
۲۹	ہمارے کتب خانے	ڈاکٹر ملک حسن اختر	۲۴	-
۳۰	تدریس اُردو (طبع نو)	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۴۸	-
۳۱	تعلیم کا مسئلہ (طبع نو)	ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی	۲۴	-
۳۲	فن زود نویسی (طبع نو)	مرزا محمد ہادی رُسوا/ایم ایل گھوش	۳۰	-

(د) زبان و ادب

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۳۳	اشاراتِ تنقید (طبع نو)	ڈاکٹر سید عبداللہ	۵۰	-
۳۴	سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا	ڈاکٹر سید عبداللہ	۴۸	-
۳۵	اُردو داستان	ڈاکٹر سہیل بخاری	۸۵	۱۰۰
۳۶	مغرب کے تنقیدی اصول (طبع نو)	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۵۰	-
۳۷	تہذیب و تخلیق (طبع نو)	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۴۵	-
۳۸	اُردو سٹیج ڈراما	ڈاکٹر اے بی اشرف	۴۲	-

(ہ) کتب حوالہ

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۳۹	قائداعظم کے شب و روز	خورشید احمد خاں	۳۵	-
۴۰	جغرافیہ خلافت مشرقی	مولوی عنایت اللہ	۱۵۰	-
۴۱	دکنی و دکنیات	ڈاکٹر محمد علی اثر	۴۰	-

جائزے، رُودادیں، سفارشات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۴۲	اسلام آباد اور راولپنڈی میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے پرائیویٹ ادارے	عبدالغفور اعوان	بلاقیمت	-
۴۳	اسلام آباد کی خواتین اور قومی زبان	زبیدہ حفیظ	〃	-
۴۴	قومی زبان اور خواتین میں عادات مطالعہ	انور قدوس نعیمی	〃	-
۴۵	وفاقی دفاتر میں مختصر نویس، ٹائپ کار اور ٹائپ مشینیں	نور احمد شاد	〃	-
۴۶	عوامی نمائندے اور قومی زبان	زبیدہ حفیظ	〃	-
۴۷	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۵ء - ۱۹۸۶ء		〃	-
۴۸	ہیئت حاکمہ کی رودادیں	ارشد قریشی	〃	-

بہ تعاون و اشتراک

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت	قیمت
۴۹	نباتاتی فعلیات	عبدالرحیم خان	۵۴	-
۵۰	برصغیر کا ڈراما: تاریخ، افکار اور انتقاد	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۷۵	-
۵۱	مبادیات برق کیمیا			
۵۲	اساسیات قدری کیمیا (A FOUNDATION FOR QUANTUM CHEMISTRY)			

مقتدرہ قومی زبان

شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۶۔ ڈی (غربی) بلیو ایریا، ایف ۶/۱، اسلام آباد

کراچی: مکان نمبر ۳۰ اے، بلاک نمبر ۱۳، گلشنِ اقبال نزد حسن اسکوائر، کراچی
لاہور: ۹۰۔ ریواز گارڈن، لاہور
پشاور: خلیل ٹاؤن، بالمقابل ثانوی تعلیمی بورڈ، جمرود روڈ، پشاور
کوئٹہ: بی ۱۳/۴۲-۲، تولہ رام روڈ، بالمقابل عجائب گھر، کوئٹہ
سکھر: بنگلہ نمبر ۴، ملٹری روڈ، سکھر

لائبریریوں، اداروں اور تاجروں کو منظور شدہ شرح کے مطابق رعایت بھی دی جاتی ہے

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد۔ مقتدرہ قومی زبان، شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۶۔ ڈی (غربی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

21 OCT 1987

اس شمارے کے اہم مضامین

- املا کی اہمیت
- تحریک پاکستان میں اردو زبان کا حصہ
- داستان نفاذ اردو
- اردو دفتری زبان کیوں نہ بن سکی ؟
- اردو کا نفاذ
- قومی زبان کی ترویج کا مسئلہ
- کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے
- اردو ذریعہ تعلیم
- اس فیصلے کی مزاحمت کیجیے
- ذریعہ تعلیم کا تنازعہ پھر سامنے آیا
- قومی زبان اردو کے ساتھ ہمارا منفی رویہ
- اردو کو مکمل طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے میں حائل رکاوٹیں
- درسی کتابوں کو قومی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے
- اردو کانفرنس اور مقتدرہ قومی زبان

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش
نائب مدیرہ اعزازی

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

اکتوبر ۱۹۸۷ء

جلد ۳
شمارہ ۱۰

فہرست

املا کی اہمیت
عتیق الرحمٰن صدیقی ———— ۱

تحریک پاکستان میں اردو زبان کا حصہ
عشرت رحمانی ———— ۳

داستان نفاذ اردو
سید قاسم محمود ———— ۴

اردو دفتری زبان کیوں نہ بن سکی؟
ڈاکٹر انور سدید ———— ۹

اردو کا نفاذ
تسنیم احمد انصاری ———— ۱۱

قومی زبان کی ترویج کا مسئلہ
وحید عثمانی ———— ۱۵

کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے
ظفر اقبال ———— ۱۷

اردو ذریعہ تعلیم
محمود الحق عثمانی ———— ۱۹

اس فیصلے کی مزاحمت کیجیے
مدیر تکبیر ———— ۲۱

ذریعہ تعلیم کا تنازعہ پھر سامنے آیا
پروفیسر حسنین کاظمی ———— ۲۴

قومی زبان اردو کے ساتھ ہمارا منفی رویہ
منور عثمانی ———— ۲۷

اردو کو مکمل طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے میں حائل رکاوٹیں
اویس ابراہیم ———— ۳۰

درسی کتابوں کو قومی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے۔
محمد ذوالفقار چوہدری ———— ۳۴

اردو کانفرنس اور مقتدرہ قومی زبان
فارقلیط ———— ۳۵

قیمت: ایک روپیہ، سالانہ: دس روپے

معروضات

ہماری عمر ے یا اس سے قبل کے جو لوگ یہاں اس وقت موجود ہیں وہ سارے کے سارے برطانوی دور کے تعلیم یافتہ ہیں وہ سبھی انگلش میڈیم کے پڑھے ہوئے ہیں، میں نے تو فارسی بھی انگریزی میں پڑھی۔ ہم انگریزی ہی کے ذریعے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی۔ کالج میں اردو میرا مضمون کبھی نہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے اردو کس طرح آ گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو اور ملک کی دوسری زبانوں میں گرامر کی بعض خصوصیات اور ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے اس قدر قرابت موجود ہے کہ مجھے باقاعدہ اردو سیکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

جب ہم اردو کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد انگریزی کی مخالفت نہیں ہے۔ ہم اس بارے میں بہت واضح ہیں۔ مقتدرہ نے وقتاً فوقتاً کھل کر اظہار رائے کیا ہے کہ اس ملک میں اردو زبان کے علاوہ ایک نہ ایک غیر ملکی زبان ضرور رہنی چاہیے جسے لازمی ثانوی زبان قرار دے سکیں۔ بلاشبہ ہمارے لیے لازمی ثانوی زبان انگریزی ہی ہے۔

ہمارے ہاں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ صرف انگریزی ہی ہمارے لیے نئے دریچے کھول سکتی ہے۔ یہ قطعاً درست نہیں۔ پرانے زمانے میں یہ بات صحیح تھی مگر ۱۹۷۰ء کے بعد سے اب تک دنیا بھر میں سائنسی علوم میں جو ترقی ہوئی ہے، انگریزی زبان جاننے والوں کو اس کا صرف ۵۰ فیصد حصہ مل سکا ہے اور اسی نسبت سے پاکستانی سائنسدانوں تک (جو انگریزی پر بھروسہ کرتے ہیں) صرف پچاس فیصد علم ہی پہنچ سکے گا۔ خود انگریزی بولنے والوں کو جرمن، فرانسیسی، جاپانی، روسی اور چینی زبانوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ اس لیے اب ایک زبان سے کام نہیں چلتا۔ ایک سے زیادہ زبانوں پر انحصار ضروری ہے۔ اب ہمیں دوسری مغربی اور مشرقی زبانوں سے بھی استفادہ کرنا ہو گا۔

مگر یاد رہے دوسری زبانوں کی ترقی و انکشافات تک تو ہمیں اپنے آپ کو محدود نہیں رکھنا ہے ہمیں تو اچھے ماہرین اور اچھے سائنس دان بھی پیدا کرنے ہیں۔ ہم اب تک سائنس کے استاد تو پیدا کرتے رہے ہیں سائنسدان پیدا نہیں کر سکے۔ دوسری زبان میں سوچنے سے سائنس کے استاد تو پیدا ہو سکتے ہیں، سائنسی معلومات تو حاصل ہو سکتی ہیں، لیکن سائنسدان ممکن نہیں۔ ہم نے اپنے اساتذہ کی سوچ کو اپنی قومی زبان کے تابع نہیں کیا اسے غیر زبان کا محتاج کر رکھا ہے۔ اب ضروری ہے کہ سائنس کی تعلیم اپنی قومی زبان ہی کے وسیلے سے کی جائے تاکہ اعداد و شمار جمع کرنے کی بجائے ہمارے اساتذہ علم کو ہضم کرنے کا فن بھی سیکھیں۔

مقتدرہ نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ہمارے نزدیک ذریعۂ تعلیم قومی زبان ہی کو ہونا چاہیے قومی زبان کا کسی بھی دوسری ملکی زبان سے کوئی تصادم نہیں اگر اس کا تصادم ہے تو صرف انگریزی ذریعۂ تعلیم سے ہے۔ ہمارے نزدیک انگریزی زبان کا سیکھنا لازم ہے بلکہ یورپ کی دوسری زبانوں کا سیکھنا بھی ضروری ہے۔ ہم تو اس کے حق میں ہیں کہ انگریزی زبان کو لازمی ثانوی زبان کے طور پر برقرار رکھا جائے، اس کے معیار کو مضبوط اور بلند کیا جائے۔ افسوس ہے تو اس بات کا کہ تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی کا معیار بھی ابتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پہلو پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ اس تنزل میں اردو کا کوئی قصور نہیں اس زوال کے اسباب سیاسی اور سماجی ہیں، ان کا جائزہ لینا اور تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم اس بہانے قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کا حق نہیں دیں گے تو پاکستانی قوم پر بہت بڑا ظلم ہو گا۔ معیار تعلیم اور زیادہ گرتا چلا جائے گا انگریزی ذریعۂ تعلیم سے پاکستان میں آپ کو ماہر اساتذہ مل جائیں گے۔ سائنس کے استاد بھی ملیں گے۔ مگر سائنسدان نصیب نہیں ہوں گے، ماہرین سماجی علوم نہیں ملیں گے۔ ہم اپنی سوچ سے محروم رہیں گے۔

عتیق الرحمان صدیقی

املا کی اہمیت

املا عربی زبان کا لفظ ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح استعمال میں آتا ہے اس کے معنی رسم الخط کے مطابق تحریر کرنے، لکھنے یا بتلائے ہوئے مضمون کو لکھنے کے ہیں۔ زبان کی تحریر میں املا کا دخل بہت زیادہ ہے۔ اگر لفظوں کی املا کا پوری طرح خیال رکھا جائے تو پڑھنے والا بات کو پوری طرح بآسانی سمجھتا ہے۔ املا کی غلطیوں کی صورت میں قاری عبارت کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ مزید لکھنے والے کی اہلیت کو مشکوک سمجھنے لگتا ہے۔ اردو تحریر میں املا کی اکثر غلطیاں ان الفاظ میں واقع ہیں جہاں حروف تہجی کی آوازوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ طرز کتابت کی بنا پر حروف شمسی و قمری کی طرف صحیح توجہ نہ دینے کے باعث واو عاطفہ و واو معدولہ کی بروقت پہچان نہ کرانے کے سبب اور خوشنویسی کے مقتضیات سے صرف نظر کرنے کی بدولت بھی املا کی صحت بڑی طرح متاثر ہوتی ہے۔

درحقیقت املا تدریس زبان کی نہایت مفید اور اہم مشق ہے۔ اس سے نہ صرف غور سے سننے کی عادت پختہ ہوتی ہے بلکہ سماعت کی تربیت کے ساتھ ساتھ یہ لکھنے سے عضلاتی فعل کی تربیت میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں حواس خمسہ اور ذہنی نشو ونما کے دائرہ کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتی ہے اور نظم و نسق کے بعض اسباق کو بھی ذہن نشین کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ بعض ماہرین زبان کا خیال یہ ہے کہ اسے دوسری جماعت کے بعد شروع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

املا کی عبارت کے انتخاب میں خاصے غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔ عمومی طرز فکر یہ ہے کہ اساتذہ اس سرگرمی کو طلبہ کی غلطیاں نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر سوچ کا یہ انداز صحت مند نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لکھوائی جانے والی عبارت پہلے بتا دی جائے۔ اس پر اچھی خاصی گفتگو ہو، سوال و جواب کے ذریعے اس کی تفہیم کا اہتمام ہو اور مشکل الفاظ کی تختہ تحریر پر طلبہ سے مشق کرائی جائے۔ معلم املا سے قبل اور لکھوا دینے کے بعد پوری عبارت طلبہ کو سنائے اس دوران میں طلبہ کو بولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بولنے کا انداز ایسا ہو کہ طلبہ کو رموز اوقاف کا پتہ انداز بیان و گفتگو سے چل جائے۔ استاد کو خود وضاحت نہ کرنی پڑے۔ املا لکھوانے کے ضمن میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ مشکل الفاظ کو بطور املا نہ لکھایا جائے۔

املا کی اصلاح کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ طلبہ املا کی عبارت سے مقابلہ کرکے خود درستی کر لیں۔ اگر عبارت درسی کتاب سے متعلق نہ ہو تو مذکورہ عبارت بورڈ پر لکھ دی جائے اور طلبہ دیکھ کر تصحیح کر لیں۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ طلبہ باہم سلیقے سے تختیاں یا کاپیاں ادل بدل کر لیں اور اس طرح ایک دوسرے کی اصلاح ممکن ہے اور اگر تعداد مختصر ہو تو استاد کا انفرادی طور پر درستی و اصلاح کا اہتمام کرنا زیادہ مفید ہے۔

اغلاط کی نشاندہی اور نمبر دینے کے لیے درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے :

۱۔ کسی لفظ میں ایک یا دو حروف غلط لکھے جائیں تو اسے ایک غلطی شمار کیا جائے مثلاً محصول کو محسول یا مہسول۔

۲۔ اہم لفظ چھوٹ جائے تو ایک غلطی ورنہ آدھی مثلاً 'ثابت' کا لفظ رہ جائے تو ایک اور 'کپڑے' رہ جائے تو ½ غلطی شمار کی جائے۔

۳۔ غلط سن کر کوئی اور لفظ لکھا جائے تو ½ غلطی شمار کی جائے۔ مثلاً استاد نے بولا 'وہ رو رہا تھا' اور طالب علم نے لکھا 'وہ سو رہا تھا'۔

۴۔ دندانے کی کمی بیشی ہو یا شوشے، نقطے کا فرق ہو تو ½ غلطی تصور کی جائے۔

۵۔ ایک لفظ کے حصے میں زیادہ فاصلہ ہو تو نصف غلطی سمجھا جائے مثلاً سکول کو سکو ل لکھا جائے۔

۶۔ جوڑ کر لکھے جانے والے الفاظ کو حصوں میں لکھا جائے مثلاً شبنم کو شب نم، تو ایک غلطی شمار کی جائے اور اسی طرح الگ لکھے جانے والے الفاظ کو جوڑ کر لکھنے کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے مثلاً آج شب کو آجشب لکھا جائے۔

۷۔ ختمہ، وقفہ دوسری جماعت کے آخر اور سوم کے آغاز تک تو استاد خود بتائے بعد میں طلبہ انداز بیان سے خود اندازہ لگائیں۔

۸۔ لفظ کاٹنے اور مٹا کر لکھنے کو بھی ½ غلطی شمار کیا جائے۔

۹۔ اگر کل نمبر ۱۰ مقرر کیے جائیں اور طالب علم ۴ نمبر لے تو اس سے پوری عبارت دوبارہ نقل کرائی جانی چاہیئے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ املا کی مشق ہجے سکھانے کی خاطر ہو نہ کہ ہجے آزمانے کے لیے یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔

ہجے یاد کرانے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں کو بروئے کار لایا جائے:

ا۔ صوت، صورت اور معنی کے لحاظ سے لفظ سازی کی مشق کرائی جائے۔ مثلاً سہی، صحیح عشق، مشک، آم، عام

ب۔ معلم ان الفاظ کی فہرست تیار کرے جن کے ہجوں میں طلبہ عام طور پر غلطی کرتے ہیں۔

ج۔ جن الفاظ میں ہم آواز حروف آتے ہیں، ان کی مشق بطور خاص کرائی جائے۔ مثلاً ا، ع، آم عام، ث س ص سے شروع ہونے والے الفاظ ثابت، سالم، صابن۔ ت، ط سے توہین اور طوطا وغیرہ۔ ذ، ع، غ سے اصل، غسل، مطمئن، ق، ک سے قمر اور کمر وغیرہ۔

د۔ طرزِ کتابت میں ہائے ہوز اور ہائے مخلوط کا خیال رکھا جائے مثلاً گھوڑا کو گہوڑا لکھنا غلطی ہے اور پھل کو پہل لکھنا بھی صحیح نہیں۔ اسی طرح ہائے ملفوظی کو ہائے مخلوط کی صورت میں لکھنا درست نہیں۔ مثلاً ہے کو ھے اور ہمیشہ کو ھمیشہ۔ البتہ خطِ نسخ میں کچھ مجبوریاں ہیں جنہیں پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔

ر۔ حروف شمسی و قمری میں "ال" کی طرف صحیح دھیان دیا جائے تاکہ طلبہ عبدالمجید کو عبدل مجید نہ لکھنے پائیں اور اسی طرح بالواسطہ کو بِل واسطہ۔

س۔ واؤ عاطفہ اور معدولہ کا خیال رکھا جائے تاکہ فضل و کرم اور خود کو فضلو کرم اور خُد لکھنے کی غلطی کا احتمال نہ رہے

ک۔ اردو حروف میں دندانوں کا بھی خصوصی خیال رکھا جانا چاہیئے مثلاً مشق میں تین دندانے ہیں اور ضعف میں ایک ہے۔

معلم کے لیے لازم ہے کہ وہ آلۂ تحریر اور سامان تحریر کو پوری اہمیت دے۔ بائیں ہاتھ سے لکھنے کی حوصلہ شکنی کرے۔ طلبہ کی درست طرز نشست پر توجہ دے۔ اس کے اپنے اندازِ بیان اور رفتار قرأت میں ایسا اعتدال ہو کہ طلبہ کی تحریر میں حسن و خوبصورتی کا پہلو نمایاں رہے۔

املا اور صحتِ املا کے سلسلہ میں مندرجہ بالا سطور میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے معلمین اگر ان کو پیش نظر رکھیں اور مزید اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مفید مشاغل اور سرگرمیاں تجویز کریں تو اس سے مزید نتائج بہتر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ جسارت کراچی)

اردو کالج میں نظریۂ پاکستان کے شعبہ کا قیام

وفاقی گورنمنٹ اردو کالج نے نظریۂ پاکستان کا شعبہ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس سے قبل کالج میں انٹر، بی اے، ایم اے، ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کی تدریس اردو زبان میں کامیابی سے جاری ہے۔ آج جب مختلف عناصر نظریہ پاکستان کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ اردو کالج نے نظریۂ پاکستان کا شعبہ قائم کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ایک اور قابل فخر اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ چاروں صوبوں، شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر پر مشتمل ۸ ہزار سے زیادہ زیر تعلیم طلبا کو جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اردو کالج نے قومی زبان کے ذریعہ ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ قومی اتحاد اور یک جہتی کی یہ فضا اردو ماویہ اردو کالج کی کامیابی کا بین ثبوت ہے جس کے لئے کالج کے اساتذہ اور آپ کے پرنسپل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو کالج کی شکل میں جو پودا لگایا تھا وہ اُن کے مشن کو آگے بڑھانے والوں کی لگن اور محنت سے اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت اس کالج کو جو اتنا اہم قومی کردار ادا کر رہا ہے یونیورسٹی کا درجہ دینے میں اب مزید پس و پیش سے کام نہیں لے گی۔

روزنامہ حریت کراچی ۱۱ جولائی ۸۸ء

عشرت رحمانی

تحریکِ پاکستان میں اُردو زبان کا حصہ

برادرِ مکرم ڈاکٹر معین الدین عقیل کا کہنا بالکل بجا و درست ہے کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ سے لے کر قیام پاکستان تک برصغیر میں جس قدر اسلامی تحریکیں رونما ہوئیں ان کے حلقۂ اثر میں تمام جنوبی ایشیا اور ان کے مقاصد کے اعتبار سے بالخصوص تمام مسلمان تھے ہر تحریک کا اظہار و بیان زبان ہی کے ذریعے سے ممکن ہے جنوبی ایشیا کی تمام تحریکیں جو قومی و سیاسی اہمیت کی حامل تھیں اور ہیں اردو زبان کے عام استعمال اور اس کے عروج و ترقی کے دور میں رونما ہوئیں۔

درحقیقت اردو زبان چونکہ اٹھارویں صدی تک اپنے وسیع و عریض ماحول میں عام استعمال کی واحد زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی اس لیے ان تحریکوں کے لیے اردو کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس لیے ان تحریکوں کے لیے اردو کا استعمال ناگزیر تھا۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اردو کا استعمال پورے برصغیر کے لیے بڑی حد تک کافی تھا اس صورت حال میں اسلامی تحریکات کے علاوہ دوسری قوموں اور فرقوں کی تحریکات بھی اردو کے استعمال پر مجبور رہیں کیونکہ غیر مسلم فرقوں کو بھی اپنی سیاسی تحریکوں کی کامیابی کے لیے مسلمانوں کے تعاون کی لازمی ضرورت تھی۔ مسلمانانِ برصغیر نے تو اس زبان کی قومی حیثیت سے ترقی و ترویج کی ضرورت سمجھی اور اسے پروان چڑھانے کی ہر ممکن سعی کی نیز اسے ذریعہ اظہار بنانا ازبس ضروری تصور کیا لیکن غیر مسلم فرقوں نے بحالت مجبوری اسے استعمال کیا کیونکہ اس کے بغیر انہیں عام مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنا دشوار تھا چونکہ مسلمانوں نے اردو کو اپنی کل متاع اور ساری قومی و تہذیبی روایات دے رکھی تھیں اس غرض سے ان کے لیے اس زبان کا استعمال ہر اعتبار سے لازمی و ابدی تھا۔ لہٰذا ہر اسلامی، قومی، معاشرتی و سیاسی تحریک اسی زبان کے ذریعے سے مقبول اور موثر طور پر مفید ثابت ہوئی۔

حضرت امام ربانی کے خلفاء و معتقدین اور مریدوں نے اردو زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اسی زبان میں مختلف مواقع پر اصلاحی و تبلیغی جلسوں میں تقریریں کیں اصلاحی کتب تالیف کیں اور عارفانہ شاعری کی جن کا موضوع اسلامی اصولوں اور اقدار کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھے جانے کی تلقین و تربیت تھا تاکہ اسلامی روایات و اقدار کو خارجی ناپاک اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔

برصغیر کے حضرات صوفیہ کرام و مشائخ عظام نے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے بہت موثر مساعی کیں۔ مثلاً حضرات خواجہ فریدالدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی خصوصاً آپ کے محبوب مرید امیر خسرو اور دیگر اولیا کرام نے اردو زبان میں ناصحانہ و عارفانہ شعر گوئی کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ اور پیروؤں نے اردو زبان کو عوامی تلقین کے لیے موثر ذریعہ اظہار سمجھا اور اسی کے لیے اصلاحی و سیاسی تحریک کو کامیاب و مفید بنایا۔ ان حضرات نے شاہ ولی اللہ ہی کی تحریک کے لیے بہت موثر کام کیا اور تعمیری و معاشرتی و سیاسی افکار کے مطابق عوام میں تقریر و تحریر کے ذریعے سے اشاعت و تشہیر کی۔ ان کی زبان ایسی صاف اور سادہ فہم تھی کہ کم علم اور غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ علمائے دین اور مفسرین و محدثین نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کے ترجمے نیز دیگر مفید اصلاحی تبلیغی تالیفات و تراجم اردو زبان میں کیے۔ اسلامی تواریخ اور اولیائے کرام و دیگر بزرگانِ دین کی اصلاحی کتب کے ترجمے ہوئے مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں سرکاری زبان فارسی تھی تاہم رفتہ رفتہ قدیم و متوسط ادوار کے ادبا و شعراء کے ذریعے سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا اگرچہ یہ زمانہ اردو میں قومی و مقصدی ادب کی ابتدا کا تھا لیکن بعد میں اردو کو قبول عام کا مرتبہ حاصل ہو گیا آخری دور تعلیم میں اردو زبان اس لائق ہونے لگی تھی کہ فارسی زبان جو عرصہ دراز سے برصغیر میں مسلمانوں کی قومی زبان کی حیثیت رکھتی تھی اردو زبان اس کی جگہ حاصل کر کے قومی زبان بن جائے۔ بقول ڈاکٹر عقیل آخر کار اردو زبان کو ترقی و عروج کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں (انگریزی کے ساتھ) سرکاری دفاتر میں استعمال کیا جائے گا کیونکہ مغلیہ دور انحطاط میں یہی طریقہ رائج تھا۔ انگریز نہایت عیار اور زمانہ ساز تھا کمپنی کے حکام بالا ملک کے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے

ا سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں فارسی اور اردو دونوں کو رواج دینے پر آمادہ ہوئے
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فتح یاب ہو کر جب ہندوستان کے حکمران بن گئے
نگریزی سلطنت کے دور میں بھی کمپنی کے زمانے کا طریقہ جاری رہا۔ چونکہ ہندوؤں نے
دور میں اپنے کو انگریزی حکومت کے وفادار اور خیرخواہ اور مسلمانوں کو باغی و غدار
ت کر کے قربت حاصل کر لی تھی اور مسلمانوں کے خلاف تھے انہوں نے مطالبہ کرنا شروع
کہ حکومت عدالتوں اور دفتروں میں اردو کی بجائے ہندی زبان رائج کرے کیونکہ
ہو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں اس لیے ہندی کو قومی زبان کا مرتبہ
دو کی جگہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں اردو ہندی تنازعہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ مختلف
قوں اور شہروں میں ہندو مسلم فسادات اور خون ریز ہنگامے ہوئے۔ اس زمانے میں
رسید احمد خان اور ان کے بعد نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، مولانا محمد علی و
انا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ حضرات نے اردو کی حمایت اور ترقی و ترویج
ے لیے جدوجہد کی۔ ان کے ساتھ بعد میں مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی اور دیگر
م رہنماؤں نے اس مسئلہ میں انتھک کوششوں سے ہندوؤں کی مخالفانہ اور معاندانہ
اعی کا زبردست مقابلہ کیا اور اردو زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے عزیمت کوش مساعی
ں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اسی زمانہ میں جب مسلم لیگ کی جدوجہد اور تحریک
ستان جاری تھی اپنی زیر صدارت انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر اورنگ آباد (دکن) سے
نقل کر کے دہلی لے آئے تاکہ مسلمانوں کی جدوجہد اور تحریک کو اردو زبان کے ذریعے
م میں مقبول بنانے کی غرض سے آسانی ہو سکے۔

مسلم لیگ کی تحریک کے سلسلے میں مسلمان ادبا و شعرا نے نثری و شعری ادب تخلیق
۔ مضامین اور افسانے تحریر کر کے مسلم اخبارات و رسائل میں شائع کرائے۔ لیگ کی
ایت میں نظمیں لکھیں۔ اس دور میں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے اردو کی ترقی و ترویج
ے ساتھ مسلم لیگ کی تحریک کے لیے نہایت مفید و موثر کام کیے۔ قائد اعظم کو حضرت
جہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی سے خاص عقیدت تھی اور دہلی کے قیام کے دوران
ر مزار مبارک پر جایا کرتے تھے اسی دوران میں قائد اعظم کی خواجہ حسن نظامی سے ملاقات
ئی۔ اگرچہ خواجہ صاحب مسلم لیگ اور عملی سیاست سے بالواسطہ کوئی تعلق نہ رکھتے تھے
سلمانوں کی آزادی اور مسلم لیگ کی تحریک سے انہیں بہت دلچسپی تھی اور مسلمانوں
کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے تھے چنانچہ قائد اعظم اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو گئی
خواجہ صاحب نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو مسلم لیگ کی حمایت اور مالی
اعانت پر آمادہ کیا۔ اب قائد اعظم کا یہ دستور ہو گیا کہ جب وہ دہلی میں رہائش پذیر ہوتے
تو جمعہ کی نماز درگاہ نظامیہ کی مسجد میں ادا کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب سے مسلم لیگ کے مسائل
میں منصوبہ بندی کے لیے مشورہ کیا کرتے۔ خواجہ صاحب نے اپنے چند دولت مند مریدوں
کو مسلم اخبار جاری کرنے کے سلسلے میں معقول مالی امداد کرنے کے لیے آمادہ کیا اور خواجہ
صاحب کے اصرار سے مسلم لیگ کو اس سلسلے میں کامیابی اور تحریک میں بہت سہولت
حاصل ہوئی۔ قائد اعظم خواجہ صاحب کو اب اپنا مخلص معتمد دوست اور مسلم لیگ کا زبردست
حامی اور معاون رہنما تسلیم کر کے اکثر اوقات مسلمانانِ ہند کے اتحاد اور لیگ میں ان کی اکثریت
کے شامل کیے جانے کے لیے باہمی مشورے کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے قائد اعظم کو اس
بات کا مشورہ دیا کہ مسلم عوام میں مسلم لیگ زیادہ مقبول بنانے کی غرض سے آپ تھوڑی اردو
سیکھیں اور اردو میں اپنے دستخط کریں۔ قائد اعظم کو یہ رائے بہت پسند آئی۔ چنانچہ
خواجہ صاحب نے قائد اعظم کو رومن حروف میں مختصر طور پر اردو زبان میں تقریر تحریر کرا کے
یاد کرائی۔ اس کے نتیجے میں بعض مرتبہ عام جلسوں میں قائد اعظم نے اپنی تقریر کی ابتدا اردو
زبان میں فرمائی۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے پاکستان قائم ہونے کے بعد دو مرتبہ انجمن ترقی
اردو کے سالانہ اجلاس کی صدارت قائد اعظم سے کرائی۔

۱۹۴۵-۴۶ء کے دوران مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے جب علمائے دین اور
مشائخ نے مسلم لیگ کی حمایت، دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کی کامیابی کے لیے ملک
بھر کے مسلمانوں کو لیگ کے امیدواروں کی اعانت کے لیے ملک گیر مہم
جاری کی اور قائد اعظم کی قیادت اور مسلم لیگ کی ہر طرح امداد و اعانت کے لیے فتوے
دیئے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے یہ نازک وقت ہے اور عام انتخابات کا مرحلہ زندگی اور موت
کا ہے۔ ہمارا دینی و قومی فرض ہے کہ مسلم لیگ کی فتح یابی کے لیے ہر ممکن عمل پر صدق دل
سے آمادہ ہوں۔ ورنہ ہندو کانگریس کو لیگ پر فتح ہو گئی تو مسلمانانِ ہند ہمیشہ کے لیے ہندو
راج کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ہندوستان میں اسلام کا (خدا ناکردہ) نام و نشان
بھی نہ رہے گا اس لیے دین و ملت کے تحفظ کے لیے قائد اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ
میں جوق در جوق شریک ہو جاؤ۔

اس نازک مرحلے پر سب سے زیادہ جدوجہد اور مبارک سعی حضرت خواجہ حسن نظامی نے
کی۔ اپنے ایک لاکھ سے زائد مریدوں اور عقیدت مندوں کو مسلم لیگ کی ہر ممکن اعانت
کے لیے آمادہ کیا اور کل ہند مجلس چشتیہ نظامیہ کے مرکزی صدر ہونے کی حیثیت سے کئی
لاکھ مسلمانوں کی اعانت سے مسلم لیگ کی کامیابی کی تحریک جاری کی۔

خواجہ صاحب نے لاکھوں مسلمانوں کے پتے حاصل کر کے اردو زبان میں لیگ کی حمایت کے لیے ایک مراسلہ چھپوایا۔ یہ مراسلہ قائداعظم کی جانب سے ایک اپیل کی صورت میں تحریر کیا گیا تھا اور اس مراسلے میں اردو میں قائداعظم کے دستخط کرائے گئے۔ مراسلہ نہایت موثر اور بڑی حد تک ملک گیر کامیابی کا ضامن ہوا۔ ادھر علمائے کرام اور مشائخ عظام نے لیگ کو ووٹ دینے کے لیے فتوے دیئے۔ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ اور آل انڈیا مسلم لیگ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ارکان ملک بھر میں گھوم پھر کر قائداعظم کی ہدایت پر شہروں اور قصبات و دیہات میں تقریریں کر کے لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دینے پر آمادہ کر رہے تھے۔ علمائے کرام و مشائخین اور طلبہ نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو تقریریں کیں وہ سب آسان اور سادہ اردو زبان میں تھیں۔

مسلم لیگ نے اپنے منشور میں اردو کو قومی زبان قرار دیا۔ غرض کہ تمام تر تحریک پاکستان میں اردو زبان کے استعمال سے لیگ کو مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات میں مجموعی طور پر صد فی صد کامیابی اور شاندار فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ اسلام کے بعد بلاشبہ اردو ہی اہم عنصر اور تحریک پاکستان کے حصول کے لیے کامرانی کی ضامن بنی۔ ہندوؤں اور خاص کر کانگرس کی اردو دشمنی کے باعث مسلمانوں کی حیات ملی میں اپنی تہذیبی و دینی روایات اور مذہب کے تحفظ کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اردو زبان نے ہی مؤثر اور بھرپور حصہ لیا۔ دو قومی نظریہ اور اردو زبان مسلم قومیت کو ملی روایات اور تہذیبی ورثہ کی حامل ثابت ہو کر فعال عنصر ثابت ہوئی۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کے منشور میں شامل کر کے قیام پاکستان کے لیے اردو کو قومی اور سرکاری دفتری زبان کی حیثیت سے اختیار کیے جا[نے] کا واضح اعلان فرمایا۔ گویا مسلمانوں کی قومی زندگی میں اردو ہی کے طفیل ملی اتحاد و اد[راک] عمل کے اعتبار سے ملی وحدت اور مشترکہ مقاصد کی حفاظت کی تکمیل کا معتبر و موثر ذر[یعہ] ثابت ہوئی اور اسی کے ذریعہ تحریک پاکستان کو مقبولیت عام حاصل ہوئی کیونکہ اردو وہ زبان ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی حیات ملی کی مظہر اور ایک ایسا تابناک [و] درخشاں آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی اور تہذیبی، ثقافتی اور دینی، علمی روایات کا [عظیم] قدیم عظیم سرمایہ محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تحریک پاکستان کی صورت اختیار کر[کے] قومی میراث تسلیم کی گئی اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری مسلم لیگ نے قبول کر لی۔ د[رحقیقت] اردو نہ صرف مسلم تحریکوں کی جدوجہد کو پیش کرتی ہے بلکہ عملی طور سے خود بھی ان میں [شامل] اور قومی تہذیب و تمدن اور اسلامی ادب و علم اور سیاست میں ایک جزو لاینفک [کا] معتبر و محترم مرتبہ حاصل کر چکی ہے اور تحریک پاکستان کی کامرانی میں اس زبان کا اہم حصہ [ہے] مگر افسوس ناک بلکہ حیرت انگیز اور شرمناک صورت حال یہ ہے کہ ان تمام حالات و نظر[یات] کے باوجود بھارت سے اردو کو دیس نکالا ملنا خلاف عقل و فہم نہیں مگر آج قائداعظم [کے] نظریے اور فیصلے کے باوجود ابھی تک اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنے وطن [میں] بھی اجنبی ہے اور درخور اعتنا نہیں۔ اس میں زیادہ تر ایک طبقے کا بڑا حصہ ہے جس کے [یہ] عوامل طوالت طلب اور ہر لحاظ سے المناک اور باعثِ ندامت ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ امروز لاہور)

اُردُو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے حکومت سے مُطالبہ

فی الوقت ملک میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بحث کا محور بنا ہوا ہے ایک طبقے کا خیال ہے کہ انگریزی کو فوراً دیس نکالا دے دیا جائے دوسرا طبقہ اس بات کا حامی ہے کہ سائنسی علوم کے لئے انگریزی کو برقرار رکھا جائے ایک اور طبقہ انگریزی کو اختیاری مضمون کا درجہ دینے کی مخالفت کرتا ہے میرے خیال میں زبانوں کا علم کسی ملک و قوم کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بنتا اس لئے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے میں نے پچھلے دنوں مقتدرہ قومی زبان کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی سے بات کی تو انہوں نے [illegible] سے [illegible] کی باتیں ارشاد فرمائیں جن سے مسعودی [illegible] کو تقویت کو پہنچی ہے اور انھوں نے کہا کہ انگریزی کو جب تک لازمی قرار دیا ہے لیکن اردو کے مقابلے میں اس کا درجہ ثانوی ہونا چاہئے اور انگریزی کی بالادستی ختم ہو جانی چاہئے ذریعہ تعلیم کے لئے اردو کے سوا اور کوئی دوسری زبان نہیں ہے البتہ انگریزی کو لازمہ زبان پڑھایا جائے لیکن ذریعہ تعلیم اردو ہی ہونا چاہئے افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ ایک طبقہ انگریزی کو دوبارہ ذریعہ تعلیم کے طور پر سائنس اور ریاضی میں واپس لانا چاہتا ہے حالانکہ میٹرک تک یہ علوم اب اردو میں کامیابی سے پڑھائے جا رہے ہیں وفاقی وزیر تعلیم نے انگریزی کو اختیاری مضمون کا درجہ دینے کا اعلان کیا ہے جس کا سالف مطلب

(مشرق لاہور ۲۲ جون ۸۹ء)

یہ ہے کہ وہ تاریخ کا پہیہ الٹا چلانا چاہتے ہیں اور اردو کو جو حق مل چکا ہے وہ بھی چھیننا چاہتے ہیں اردو میٹرک تک لازمی ذریعہ تعلیم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اب کم از کم یہ اس کی سطح تک لازمی قرار دینا ضروری ہے میں آپ کی وساطت سے ان کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ وہ انگریزی کو اختیاری مضمون قرار دینے کے چکر میں نہ آئیں بلکہ اس مطالبے کو عملی جامہ پہنائیں کہ میٹرک کے بعد ایف اے اور بی اے کے تمام مضامین کے لئے اردو کو لازمی ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اور انگریزی کو اگر رکھنا ہی ہے تو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت میں ہی رکھا جائے

(مسعود الحسن، ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا)

قاسم محمود

داستانِ نفاذِ اُردو

آج کی شام شریک اجلاس ہونے کا دعوت نامہ دیکھ کر ذہن خواہ مخواہ یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو
ی ہونے والے اس دعوت نامے کی طرف منتقل ہو گیا جس کا اسٹینسل میں نے کاٹا تھا وہ دعوت نامہ
ب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جانب سے" اردو کانفرنس" میں شریک ہونے والوں کے نام جاری
لیا تھا۔ یہ سہ روزہ اردو کانفرنس حصول آزادی کے سات ماہ بعد لاہور میں وسیع پیمانے پر منعقد ہوئی
جس میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے بھی مندوبین شامل تھے۔ پاکستان کی مرکزی اور صوبائی نمائندگیاں
اس کا خاص پہلو تھیں چونکہ حصول پاکستان کی اصلی روح ابھی قائم تھی اس لیے ڈائس پر صدر بابائے
مولوی عبدالحق اور مہمان خصوصی شیخ عبدالقادر تشریف فرما تھے اور سرکاری مندوبین جن میں
زی وزیر مواصلات بھی شامل تھے، ڈائس کے نیچے دوسرے مقررین و معززین کے ساتھ
ٹھے تھے۔

شیخ عبدالقادر نے قیام پاکستان سے پہلے کی آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک پرانی قرارداد کا حوالہ
یتے ہوئے کہا کہ اب مملکت خداداد پاکستان کی دفتری زبان بھی حسب قرارداد ہماری قومی زبان
دو کو ہونا چاہیئے چنانچہ کانفرنس میں جو نو مطالبے حکومت پاکستان سے کیے گئے تھے ان میں ایک
ی تھا کہ "اردو کو تمام دفتروں، عدالتوں اور تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی زبان بنانے کی
طر جلد از جلد محکمۂ اردو قائم کیا جائے۔"

چند ماہ کے بعد مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر صوبہ پنجاب کے گورنر ہوئے تو ان
ہ اولین اقدامات میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اُپج سے اس مطالبے کو رُو بہ عمل لانے
ہ لیے "مجلس زبانِ دفتری" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا جس کا انگریزی نام "آفیشل لینگوئج
مٹی" قرار دیا۔ حکیم احمد شجاع اس کے معتمد مقرر ہوئے۔ شہر لاہور میں رہنے والے اکیس عالموں،
دانشوروں اور اساتذہ کو مجلس کا رکن نامزد کیا گیا۔ شعبہ ترجمہ قائم کیا گیا جس کے اوپر ایک پانچ
ی مجلس استناد تھی جس کے ارکان شعبۂ ترجمہ کے کام پر نظر ثانی کرتے۔ جب ترجمے پر کوئی تنقید یا اعتراض
تا اسے وضاحت طلبی کے لیے متعلقہ محکمے کو بھیج دیا جاتا اور جس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا وہ گویا شائع
نے کے لیے تیار ہوتا۔

مجھے مختلف وقتوں میں اس کام کے تینوں مرحلوں سے وابستہ ہونے کا، انگریزی محاورے کے
مطابق اعزاز حاصل ہے۔ لیکن اردو لہجے کے مطابق ندامت بھی، معذرت بھی ہے۔ شعبہ ترجمہ
اور مجلس استناد نے آٹھ سال کے اندر اندر حکومت پنجاب کے تمام محکموں کے ہزاروں فارم، ہزاروں
صفحات پر مشتمل مجموعہ ہائے قواعد، دستور العمل وغیرہ پوری ذمہ داری اور استناد کے ساتھ اردو میں
شائع کرنے کے لیے تیار کر دیے تھے جن کے مسودوں کا وزن پانچ من سے کم نہ ہو گا لیکن چند چیزوں
کے سوا ان کو اردو میں طبع کرا کر رائج نہیں کیا گیا۔ مرکزی اردو بورڈ کی سفارش اور منظوری سے سینکڑوں
ٹائپ مشینیں بیرونی ممالک سے منگوائی گئیں ان میں سے چند مشینیں بعض محکموں اور اضلاع کو تقسیم
بھی کی گئیں۔ لیکن آخری اطلاع آنے تک بیشتر مشینیں مقبرہ انارکلی والے سامنے کے برآمدے میں پڑی
مکڑی کے جالوں میں لپٹی ہوئی زنگ کھا رہی تھیں۔ بعض نے مجلس زبان دفتری کو کن کن
ہتھکنڈوں سے ہلاک کرنا چاہا، یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور دردناک بھی جس کے ذکر
کی یہ شام متحمل نہیں ہو سکتی۔

کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس سارے کام کو کسی قانون کسی حکم کی پشت پناہی حاصل نہ تھی
ایک فرض تھا جو حکومت نے طوعاً کرہاً محض اخلاقاً نبھایا۔ دفاتر میں چالیس برسوں میں لاکھوں نہیں
کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود اور اپنے وقت کے بہترین اذہان کا عملی تعاون حاصل
کرنے کے باوصف سب کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ بھی ہوا لیکن اردو ہی کے نصیب میں
نہ تھا کہ دفتروں میں از روئے قانون نافذ ہو کر خود بھی تیز تر ہوتی اور دفتری کارروائی کو
بھی تیزی سے رواں کرتی۔

"مقتدرہ" کا لفظ کانوں میں پڑنے لگا جو لفظ "مجلس" سے زیادہ رعب دار اور با اختیار تھا تو
ہمارا یہ سمجھنا قدرتی بات تھی کہ اب زبان صاحب اقتدار ہونے سے ضرور نافذ العمل ہو گی۔ ابھی امیدیں
ڈھنگ سے بندھنے بھی نہ پائی تھیں کہ مقتدرہ کو اسلام آباد نے اپنے پاس بلا لیا۔ ہمیں عجیب سا لگا
لیکن یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ مقتدرہ کے جسم کو مرکز سے خون ملے گا تو اس میں قوتِ عمل دوڑے گی
ان چار برسوں میں کیا دیکھا صرف ایک ماہنامہ "اردو نامہ" جس میں پھر وہی قصہ شروع ہے یعنی برسہا
برس سے مروجہ اصطلاحات کے تراجم کی بازاشاعت، قانون، آرٹ فن، سکول سکول، کالج کالج،
ڈیپارٹمنٹ محکمہ، ڈپٹی نائب، دنیا کی تیسری بڑی زبان جس نے غالب کی شاعری اور اقبال کے فلسفے

کاوزن آسانی سے سہار لیا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں اس کی کیسی درگت بنے گی یہ کسی نے کب

علمی تحقیق، اصطلاحات کی فہرست سازی، املا، رموزِ اوقاف وغیرہ سے متعلق فنی کتابچوں کی اشاعت کی حد تک مقتدرہ کا کام نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اصل چیز جس کے لیے "مقتدرہ" قائم کیا گیا تھا، یعنی نفاذ اردو... وہ کہاں ہے؟

ہر شہری کے اس سوال کا جواب مقتدرہ ہی کے صدر نشین جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے حال ہی میں اپنے ایک اخباری بیان میں دے دیا ہے اور میرے خیال میں ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "مقتدرہ نے مالیات، قانون، اطلاعات اور دوسرے محکموں کے لیے اصلاحات پر مبنی تمام ضروری مواد تیار کر لیا ہے لیکن اس پر عملدرآمد کی ذمہ داری ہماری نہیں حکومت کی ذمہ داری ہے۔ سرکار نے اٹھارہ ہزار ملازمین کو اردو ٹائپ نویسی کی تربیت دے دی ہے لیکن ان سے کوئی کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ تین سال قبل نفاذ اردو کے لیے جو سفارشات حکومت کو پیش کی گئی تھیں ان کا بھی اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اور اب تیسری اور آخری کوشش کے طور پر بلدیہ عظمیٰ کراچی نے میدان میں اپنی ٹیم اتاری ہے گویا فائنل میں پہنچنے کے لیے یہ میچ جیتنا بہت ضروری ہے۔

اس پس منظر میں آج کی شام نفاذ اردو کی تاریخ میں ایک نمایاں سنگِ میل بننے کی پوری پوری اہلیت رکھتی ہے بشرطیکہ اس ذمہ داری کا احساس کیا جائے جو وقت نے ہمارے کاندھوں پر ڈال دی ہے اور اس غلطی کو دہرایا نہ جائے جو مجلس زبان دفتری لاہور اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے سرزد ہوئی ہے۔ نفاذ اردو کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اردو زبان کے لیے یہ کوئی نیا اور انوکھا تجربہ نہیں ہے۔ قیام پاکستان سے بہت پہلے سے یہ برعظیم کے مختلف علاقوں میں دفتروں اور عدالتوں میں بطور دفتری زبان مروج و مستعمل رہی ہے بعد میں حیدرآباد دکن میں انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ کی مشترکہ کوششوں سے اسے ایک سائنٹیفک بنیاد بھی مل گئی تھی، اور وہاں تین عشروں کے اندر اندر اس زبان نے صرف اپنے دفتری ہونے ہی کو نہیں بلکہ اعلیٰ سائنسی علوم کے ذریعے تعلیم و تدریس کے طور پر بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ لاہور اور اسلام آباد سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک تو اپنے اپنے کام صفر سے شروع کیے

شعبہ ترجمہ کی اہمیت سے انکار نہیں

لیکن پورے سلسلۂ کار میں اس کا حصہ بیس پچیس فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ پچھتر فی صد کارکن

(

طبقے کا ہے کہ اسی کی مدد کے لیے شعبہ ترجمہ قائم کیا جاتا ہے۔

بلدیہ عظمیٰ جو بھی مجلس عمل قائم کرنے والی ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی منصوبہ بندی پر خاص زور نفاذ پر دے اور ترجمے کی حد تک حیدرآباد، لاہور، اسلام آباد کے کیے ہوئے کام سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ہاں اصولی و نظری، علمی تحقیقی قسم کے زیادہ کھڑاگ نہ پالے براہ راست نفاذ اردو کے طریقے اور تدابیر اختیار کرے۔ رئیس بلدیہ سے غریب بلدیہ تک ہر چھوٹے بڑے کو دفتر کی بات دفتر کی زبان (اردو) میں بولنے اور لکھنے کا شوق دلائے، ترغیب دے، لالچ دے ایسی خوش تدابیر اختیار کی جائے کہ کارکن لوگ خود بخود اپنی رضا سے اردو رسم الخط میں دفتری مراسلت اور یادداشت نویسی شروع کر دیں،

فنی غلطیاں ہوتی ہیں تو ہوا کریں، ہونے دی جائیں رواج ہر غلطی کو درست کر لیتا ہے یا ڈھانپ لیتا ہے۔ کارکن بڑی سے بڑی غلطی بھی کریں گے تو اتنی بڑی نہ کریں گے

دوسری بات جو شرکائے محفل کے پیش نظر رہنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ بلدیہ عظمیٰ کوئی الگ تھلگ ادارہ نہیں ہے، بلکہ اس کے رشتے ان تمام سرکاری، نیم سرکاری، خودمختار اور نجی اداروں سے بڑی محبت کے ساتھ استوار ہیں جو اسی شہرِ عظیم کی حدود میں آباد و قائم ہیں۔ تمام بنک یہاں، تمام بیمہ کمپنیاں یہاں، تمام تجارتوں کے دفاتر یہاں، عوام سے دفاتر کے جتنے قریبی گہرے اور وسیع تعلقات یہاں ہیں، وہ پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں ہیں، کے ڈی اے کے پی ٹی، پی آئی اے، کے ایس ڈبلیو بی، کے ای ایس سی، ایم سی بی، اے بی ایل، یو بی ایل، این آر ایل، این ڈی ایف سی، پی ٹی ایس سی، آئی سی پی، این آئی ٹی، پی ایس او، ایف پی سی سی آئی۔ غرض چھبیس حروف کی ایک طلسماتی زنجیر نے ہماری تہذیب کو جکڑ بند کر رکھا ہے اور اگر بلدیہ عظمیٰ یہ چاہتی ہے کہ کے ایم سی کے تین حروف سے چھٹکارا حاصل کرے تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ باقی ۲۳ حروف سے بھی چھٹکارا پانے کی تمنا نہ کی جائے اس لیے میری تجویز ہے کہ بلدیہ عظمیٰ کے زیر اہتمام بننے والی مجلس نفاذ اردو میں کراچی میں مقیم دوسرے اداروں کو بھی نمائندگی دی جائے تاکہ اگر بلدیہ کا یہ کام رنگ لائے تو رنگ سے رنگ پکڑے اور چراغ سے چراغ جلے اور اس آگ میں ہاتھ تاپنے کو ان کا بھی جی چاہے۔

میری تیسری اور آخری بات کا تعلق وقت سے ہے اچھا کام وہ ہے جو صحیح وقت

صحیح وقت تو مدت ہوئی نکل چکا ہے تاہم آخری وقت ابھی باقی ہے اب بھی
[illegible] نہ ہوگا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام کم سے کم وقت میں کرنے کے طریقے
[illegible] جائیں کام کوئی بھی ہو آسانی سے نہیں ہوتا اس راہ میں بھی مشکلات آئیں گی
[illegible] کہنے والے بھی آئیں گے لیکن کامیابی ایسا لفظ ہے جو لفظ اردو کی طرح
[illegible] خاطر میں نہیں لاتا۔

[illegible] ہیں کہ جب شاہراہ ریشم بن رہی تھی تو ایک روز چینی مزدوروں نے چائے
[illegible] آپس میں مشورہ کیا کہ یہ پاکستانی لوگ بہت سست ہیں ان کا کوئی اعتبار
[illegible] کب یہ اپنا ارادہ تبدیل کرلیں ممکن ہے منصوبے ہی سے مکر جائیں، یا ان کا دل
[illegible] جائے یا خواب غفلت میں سو جائیں چنانچہ انہوں نے رات دن دگنا تگنا کام کرکے
[illegible] سے پہلے شاہراہ ریشم بنا ڈالی۔

ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کارپردازان بلدیہ گویا پاکستانی مزدور ہیں اور اس محفل کے
مدعوئین چینی مزدور ہیں آئیے ہم مل کر سرگوشی کرتے ہیں۔ ان اہل بلدیہ کا کیا اعتبار یہ چالیس
سال کے بعد تو اب جاگے ہیں کیا جانے کب سو جائیں، کہیں یہ اپنا ارادہ تبدیل نہ کرلیں۔ یہ
اپنے اعلانات سے پھر نہ جائیں۔ اس لیے آئیے ہم بھی دوگنا تگنا کام کرکے ان کو اپنے عہد
سے باندھے رکھیں ان کو راہِ فرار اختیار نہ کرنے دیں۔ ان کو لاہور اور اسلام آباد والوں
کے سامنے کھڑا کر دیں ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

(بشکریہ روزنامہ حریت کراچی)

اپنے نام بھی انگریزی میں رکھئے

اخباری اطلاعات کے مطابق معلوم ہوا ہے کہ لاہور کی
ٹریفک پولیس نے لیکر کاروں کے چالان کئے ہیں جن کی
[illegible] پر اردو میں نمبر درج تھے اردو کے بارے میں جہاں
بانی پاکستان کے ارشادات ہمارے سامنے ہیں وہاں پر سرکاری
اور قومی سطح پر بھی چالیس سالوں میں بارہا یقین دلایا گیا ہے اور
اعلانات ہوئے ہیں کہ اردو ہی ہماری قومی زبان ہے اور اسے ہی
پورے ملک میں رائج کیا جائے گا لیکن افسر شاہی کے صدقے
جائیے جو انگریزی کے ہی دلدادہ نظر آتے ہیں گو ان کے لباس میں
تبدیلی اس وجہ سے آئی ہے کہ صدر اور وزیر اعظم سے لے کر
مرکزی اور صوبائی گورنر اور وزراء اپنے مخصوص قومی لباس کو
پہنتے ہیں اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افسر شاہی کوٹ پتلون
ٹائی میں ملبوس نظر آئیں اس لئے وہ بامر مجبوری قمیص شلوار
اور واسکٹ پہننے پر مجبور ہیں لیکن ان کے بولنے اور لکھنے پر کوئی
پابندی نہیں چاہے وہ انگریزی بولیں یا تحریر کریں وہ اس
معاملہ میں آزاد ہیں اس لئے صدر پاکستان و وزیر اعظم اور
وزرائے اعلیٰ جو اس وقت پاکستان اور اس کی سیاسی سماجی اور
ثقافتی استحکام کے محافظ ہیں وہاں وہ ملک کی لسانی تحفظ کے بھی
محافظ ہیں بھارت میں [illegible]
[illegible] اور یہ صرف [illegible] کی
زبان ہے اس کے لئے [illegible] کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا
اور رسم الخط بھی [illegible] لیکن پاکستان میں ابھی تک اردو کو
قومی زبان کے طور پر پذیرائی نہیں اور اس پر [illegible] کا عالم
ہے ۱۹۷۳ء کے آئین میں اردو کے مکمل نفاذ کے لئے دس
سال کا عرصہ مقرر کیا گیا تھا مگر چودہ سال گزرنے کے بعد بھی
اردو پاکستان میں اجنبی زبان ہے۔ چنانچہ اردو نمبر پلیٹوں
والی کاروں کا چالان دراصل اردو دشمنی کی علامت ہے لہٰذا
ایسی گاڑیوں کے چالان واپس ہونے چاہئیں جن کی اردو میں
نمبر پلیٹیں تھی کیا یہ لوگ اپنے نام بھی انگریزی رکھ لیں گے۔

عنایت عابد، ۳۷ ریلوے روڈ لاہور

مشرق لاہور ۴ مئی ۸۷ء

[illegible] تعلیم انگریزی زبان ہوگی یا اردو فیصلہ وفاقی حکومت کرے گی

[illegible]
[illegible] لیاقت جتوئی [illegible] تحریک استحقاق [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تحریک استحقاق [illegible] لیاقت جتوئی
[illegible] وزیر تعلیم کے [illegible] اجلاس [illegible]
[illegible] انگلش سے اردو میں تبدیل کرنے کا فیصلہ [illegible]
اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ پنجاب [illegible] تعلیم [illegible]
[illegible] انگلش کو ذریعہ تعلیم کے طور پر جاری رکھنے کی اجازت [illegible]

[illegible]
[illegible]
تاہم صوبائی وزیر تعلیم نے اعلان کیا [illegible] صوبائی حکومت
وزیر تعلیم کے بارے میں سندھ کے مفادات کا ہر لحاظ سے تحفظ کرے گی
انہوں نے کہا کہ [illegible] کبھی کوئی غلط بیان
نہیں دیا بلکہ ہم تو سندھ کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کر
رہے ہیں وزراء تعلیم کے بین الصوبائی اجلاس کے بارے میں انہوں نے
کہا کہ اس کی نوعیت مشاورتی تھی ذریعہ تعلیم کے بارے میں کوئی
حتمی فیصلہ پاکستان کی سطح پر کیا جائے گا انہوں نے کہا کہ کسی بھی رکن
کا استحقاق مجروح نہیں ہوا ہے۔

امن کراچی ۴ مئی ۸۷ء

سیمیناروں اور اجلاسوں میں اردو کو ترجیح دی جائے: جونیجو

[illegible] وزیر اعظم نے سیمینار میں انگریزی کی بجائے اردو میں تقریر کی

اسلام آباد (اپ پ) وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے ہدایت کی
ہے کہ سیمیناروں اور اجلاسوں میں اردو زبان کو ترجیح دی جانی چاہئے
[illegible] اعظم نے ان خیالات کا اظہار گزشتہ سہ پہر اسلام آباد میں
[illegible] کی صنعت پر منعقدہ سیمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب
[illegible] ہوئے کیا۔ وزیر اعظم جونیجو نے کہا کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے
سیمینار جس میں صرف ملکی ماہرین شرکت کرتے ہیں کی کارروائی
[illegible] انگریزی زبان میں کی جاتی ہے اگرچہ ان کی تقریر انگریزی زبان میں
تیار کی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اردو میں تقریر کی ہے۔ وزیر اعظم
نے کہا کہ اس بات کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ جن سیمیناروں میں
کوئی غیر ملکی نہیں ہوتا اس میں انگریزی زبان میں تقریر کی جائے لہٰذا
ہمیں ایسے سیمیناروں میں اردو زبان کو ترجیح دینا چاہئے۔ انہوں نے
کہا کہ میرا خیال تھا یہاں غیر ملکی ہوں گے لیکن یہاں پہنچ کر میں نے
محسوس کیا کہ ایسے فورم کی کارروائی اردو میں ہونی چاہئے۔ انہوں
نے کہا کہ انگریزی زبان میں غیر ملکیوں کی موجودگی میں خطاب کیا جا
سکتا ہے۔ وزیر اعظم نے توقع ظاہر کی کہ آئندہ ایسے مواقع پر اردو
زبان کو ہی ترجیح دی جائے گی۔

جنگ لاہور ۸ مئی ۸۷ء

ڈاکٹر انور سدید

اُردو دفتری زبان کیوں نہ بن سکی؟

سوال اٹھایا گیا ہے کہ اردو ہمارے دفتروں کی زبان کیوں نہیں بن سکی"۔

جواباً عرض ہے کہ "بدقسمتی سے ارباب اختیار جو نفاذ اردو کا حکم دے سکتے ہیں ابھی تک اس کے نفاذ کے وقت کا تعین نہیں کر سکے" اور جب سوال اٹھایا جاتا ہے کہ وقت کا تعین کیوں نہیں ہو سکا تو بحث و نظر کے اتنے دفتر کھل جاتے ہیں کہ انہیں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے اس بحث میں عموماً یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ فروغ اردو اور نفاذ اردو دو مختلف عمل ہیں۔ سوال اردو کے فروغ کا پیدا ہو تو سب سے پہلے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس زبان کو خلجیوں، تغلقوں اور مغلوں نے بلاواسطہ طور پر فروغ نہیں دیا۔ خلجی، مغل اور تغلق اگر دلی کو اپنی آخری حد قرار دے دیتے اور جنوب اور مشرق کی اکناف پر اپنا تسلط قائم نہ کرتے تب بھی اردو کا برصغیر میں پھیلنا مقدر ہو چکا تھا اور اس کی شمع برداری ان بے تاج شہنشاہوں نے کی جن کے کاندھوں پر گدڑیاں تھیں لیکن جن کے باطن صدق و صفا سے منور تھے اور جن کا مذہبی فریضہ دین اسلام کی تبلیغ تھا۔ یہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام دلوں پر حکومت کرتے تھے ان کے دربار عوام کی کھلی کچہریاں تھیں جہاں شکایات کے بجائے محبت اور سلوک کے دفتر کھلتے تھے۔ درویش کی صدا میں کوئی غرض شامل نہیں تھی دلوں میں اترتی چلی جاتی اور ہم زبانی ہم خیالی پیدا کر دیتی۔ برصغیر پاکستان اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان درویشوں کی صدائے حق سے گونجتا رہا۔ یہ سب اردو کے مشعل بردار تھے اس لیے عوامی اردو کا اولین نقش ان درویشوں کی معاونت ہی سے مرتب ہوا اور اس کا مشاہدہ خیبر سے راس کماری تک کیا جا سکتا ہے چنانچہ سترھویں صدی کے شاعر رحمان بابا کا کلام اس اردو سے مختلف نظر نہیں آتا جو اس زمانے میں دکن، دلی اور پنجاب میں مقامی اثرات کی قبولیت سے پروان چڑھ رہی تھی۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں:

بوصل تو مارا کجا بات ہے
کہ وصلے تو خیلے بڑی بات ہے
بگوئے تو گفتم کہ مسکن کنم
ولے کہ مرا ایں دراجات ہے

لسانی اعتبار سے رحمان بابا کے یہ اشعار امیر خسرو کے اس ریختہ کے مماثل ہی انہوں نے فارسی کی آمیزش سے تیار کیا تھا اور جس سے اردو کا اولیں روپ سامنے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جب اردو کوچہ و بازار میں پر رہی تھی مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اردو کے نفاذ کے لیے ان مغل بادشا بھی کوئی کار نمایاں سرانجام نہیں دیا جو اردو میں شاعری کرتے تھے اور ذوق اور جیسے شاعروں کے سرپرست بھی تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اردو کو سر سرپرستی کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوئی۔ زبان کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال نہی بلکہ اسے سماجی ضرورت کے تحت فروغ ملنا شروع ہوا تو شاہ حاتم، مظہر جان جا خان آرزو جیسے شاعروں نے اس کا ادبی روپ سنوارنے اور اسے فارسی کے تسلط کرانے کی کوشش کی، اردو کے تہذیبی مزاج کو میر تقی میر، میر انیس، مصحفی اور ناسخ شاعروں نے سنوارا لیکن اردو کی خود مختاری کا اعلان انشاء نے کیا۔ انشاء نے فصاحت کے ان تمام معیاروں کو جن کی سند فارسی کے جلال و جمال سے حاصل کی جاتی تھی یک موقوف کر دیا اور برملا کہا کہ

"ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا ہے، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنج یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح اگر اصل کے مطابق مکمل ہے تو بھی صحیح ہے ا خلاف اصل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اردو کے استعمال پر موقو کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے گو وہ اصل میں صحیح ہو غلط ہے اور جو جو کچھ موافق ار گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو وہ درست نہیں"۔

یہ اصول عملی طور پر نفاذ اردو ہی کا دستور ہے اور اسی کو استعمال کر کے انشا

دو کا تیسرا ریختہ وضع کیا اور اس میں ہر اس زبان کے الفاظ داخل کیے جو ہندوستان
بولی جاتی اور جو اب اردو کے ضمیر میں فطری طور پر شامل ہو گئے تھے۔

اردو کو دفتری زبان کے طور پر نافذ کرنے میں یہ امر مانع نہیں کہ اردو دفتری کاروبار
خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ اس کا باعث وہ احساس کمتری
ہ جو گذشتہ دو سو سال میں انگریزی زبان کی بالادستی نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ انگریز
ملک سے چلے گئے لیکن جاتے وقت انگریزی اس ملک میں چھوڑ گئے۔ المیہ یہ ہوا کہ ہم
اس طوق زریں کو زیور سمجھ کر پہن لیا اور جب بھی زیبائش ذات مقصود ہوتی ہے تو ہم
دو کو اپ بھرنش سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور منہ سے ایسی ملغوبہ زبان نکالنے لگتے ہیں جسے اگر
ئی انگریز سن لے تو شاید خودکشی کرلے۔ اس کی ایک مثال اردو کا یہ جملہ ہے جو بالعموم طنزاً
یں بلکہ افتخار سے بولا جاتا ہے کہ

"ماڈرن ٹائپ کے ینگ مین اردو کی ایوری ڈے ٹاک میں انگریزی کے بہت سے
رڈز یوز کرتے ہیں"

مقتدرہ قومی زبان نے جو سیمینار منعقد کرایا، اس میں اب تک جو رائے متفقہ
ر پر سامنے آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قومی زبان اردو کے بغیر پاکستان کی بقاء اور ارتقا
ن نہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اس کے نفاذ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو ہمیشہ
ب لمبی اور التوا انگیز حکمت عملی کو بروئے کار لایا جاتا ہے چونکہ جب پہلی دفعہ نفاذ اردو
ہ لیے دس سال کا عرصہ قائم کیا گیا تو مولانا صلاح الدین احمد نے بڑے کرب سے فرمایا
تھا اردو کو دس سال کے لیے سُلا دیا گیا ہے، اور پھر یہ مسئلہ ایسا الجھا کہ اردو زبان اب
ت خواب خرگوش سے جاگ نہیں سکی۔ اس سیمینار کے اجلاس میں تو ایک مقرر نے خدشہ
ظاہر کیا کہ اردو کا طلوع کہیں اس کے غروب میں تبدیل تو نہیں ہو رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ
ردو کا طلوع عوام سے ہوا تھا اور اس کا فروغ بھی عوام میں پرورش پا رہا ہے۔ سرکاری
یوانوں میں اردو کا آفتاب پہلے بھی گہن زدہ تھا اور آج بھی اس کے سر پر نحوست کے
دل چھائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ وہ مایوسی ہے جو قومی زبان کے خدمت گزاروں میں اور
س ملک کے عام لوگوں میں روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اردو فطری طور پر عوام میں ہی فروغ حاصل کرتی رہی ہے
دفاتر میں اس کا نفاذ کیوں ضروری ہے؟ اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سرکاری
اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی ہے اسے شاہ زبان ہونے کا درجہ حاصل ہوتا ہے
اس کا چلن زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے اثر و قبول کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے نقوش
دیرپا ہوتے ہیں۔ دُنیا کے بیشتر ممالک میں قومی زبان کو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل
ہے چنانچہ جو قوانین بنائے جاتے اور حکم نامے نافذ ہوتے ہیں ان کی تفہیم اور عمل درآمد میں
دقت پیش نہیں آتی اور زبان جس سے ملک کا تشخص بھی مخصوص ہوتا ہے ہم زبانی کے
علاوہ ہم خیالی کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ مسلمان متمدن دُنیا کی مقرر
کردہ ہر تعریف کے مطابق ایک الگ قوم ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے اردو کی مذہبی اور ثقافتی
حیثیت پر بہت زور دیا وجہ یہ کہ بیسویں صدی میں اردو ہندی نزاع بہت شدت
پکڑ گیا تو ہندی کو ہندوؤں کی زبان اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا تھا آزادی
کے بعد اسے پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے ذخیرہ الفاظ کا
داخلی نظام عربی اور فارسی کے ساتھ ہی مربوط ہے اور اس کی عام فضا پر اور اس کے
ادب پر اسلامی رنگ غالب ہے۔ چنانچہ یہ بات بڑی عجیب نظر آتی ہے کہ ہم
اردو کی قومی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی حکمرانی کے مدار میں ہم نے انگریزی کی
بالادستی کو قائم کر رکھا ہے۔

اب یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ اردو سائنسی مضامین کی تدریس اور جدید اصطلاحات
کے معاملے میں خودکفیل نہیں۔ اس ضمن میں جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے مقتدرہ
قومی زبان نے گزشتہ چند سالوں کے دوران اتنا بڑا ذخیرہ ترجمے کے ذریعے فراہم کر دیا
ہے کہ اب نفاذ اردو کا حکم فوری طور پر بھی نافذ کر دیا جائے تو کسی بڑی مشکل کا
سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مقتدرہ نے اصطلاحات کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے
ایک دارالترجمہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس ادارے میں قریباً انہی اصولوں پر کام ہو
رہا ہے جو انشاء اور مولوی وحید الدین سلیم نے اردو کو خودمختار بنانے کے لیے
وضع کیے تھے۔ ان اصولوں میں اتنی لچک موجود ہے کہ کسی نئی اصطلاح کو اردو کے وجود
کا حصہ بنانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس ساری بحث میں بنیادی بات
یہی ہے کہ دفاتر میں نفاذ اردو کے لیے "کن" کون کہے گا اور "فیکون" کب عمل
میں آئے گا۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت کراچی)

تسنیم احمد انصاری

اُردو کا نفاذ

۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت ۱۹۸۸ء نفاذ اردو کا سال ہوگا اور سرکاری اعلامیہ کے مطابق ۱۹۸۹ء سے میٹرک کے امتحانات اردو میں ہوں گے مگر ابھی اس فیصلے کے اطلاق میں کچھ عرصہ ہی باقی تھا کہ قومی اسمبلی میں قومی سطح کے رہنماؤں نے اردو کی حیثیت ہی کو مشکوک قرار دے کر اسے قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۹ فروری کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں جب ایک رکن اسمبلی نے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے سے متعلق سوال اٹھایا تو اس اہم اور متفقہ مسئلے کو اراکین اسمبلی نے اپنی انا اور بقا کا مسئلہ بنا لیا۔ سردار آصف احمد علی نے کہا۔

Urdu is not a national but official language

انھوں نے مزید کہا کہ ان کی مادری زبان پنجابی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس زبان کی ترقی کے لیے کیا کیا گیا ہے میر ظفر اللہ خان جمالی کے الفاظ ہیں۔

Why urdu was being imposed as a national language both Urdu and English were official language of Pakistan. If English could not be the national language how could urdu be deemed as such. Who says Urdu is our national language.

سابق وزیر صنعت سید ظفر علی شاہ نے سردار آصف علی کی حمایت میں کہا۔

Urdu was not the national language of Pakistan.

فخر امام کی بیگم سیدہ عابدہ حسین نے کہا۔

Explain the logic of adopting urdu as a national language keeping in view the historical background of the languge. She said that it was a difficult for the people of various provinces to learn urdu as was it difficult for urdu speaking people to learn regional languages she said. 90 per cent of the children have to use medium of instruction other than their mother tongue in Pakistan.

ان تمام بیانات پر ممتاز پارلیمنٹرین ایم حمزہ نے یہ بلیغ تبصرہ کیا۔

Those who talked of mother tongue really were exponents of English.

یہ تمام بیانات ۱۰ فروری کے مسلم، ڈان اور فرنٹیئر پوسٹ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بظاہر ان بیانات میں کسی خاص ردّعمل کا اظہار نہیں ہوا اور ان قومی راہنماؤں کے اس غیر محتاط رویے کے بارے میں ابلاغ عامہ کے ذرائع نے بھی کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا مگر ان تمام بیانات کو اس پس منظر میں دیکھا جانے کہ یہ سارے اعتراضات اس وقت اٹھائے جا رہے ہیں جب اردو کے نفاذ کی جیسی تیسی صورت چند سال میں نمایاں ہونے والی ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اردو کے مخالف حزب اقتدار کے بجائے حزب اختلاف کے اراکین کی جانب سے کی گئی ہے اور ان اراکین کی جانب سے جو مستقبل قریب میں قومی سطح کے راہنماؤں کے طور پر نمایاں ہونے والے ہیں ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے اور ظفر اللہ جمالی بیگم عابدہ حسین اور سردار آصف علی و ظفر علی شاہ نے اپنی وزارت اور رکنیت پارلیمان کے حلف اسی آئین کے تحت اٹھائے ہیں اب ان کی سادگی پر مر جانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے سے انکاری ہیں حالانکہ یہ تمام افراد وقتاً فوقتاً اپنے مختلف انٹرویوز بیانات اور تقاریر میں ۱۹۷۳ء کے آئین کی عظمت کو بارہا سلام کر چکے ہیں اور مڈ ٹرم انتخابات کے مطالبے کے ضمن میں بھی ۷۳ء کے دستور کو حوالہ بنانے پر زور دیتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب اچانک یہ اعتراضات کیوں اٹھائے جا رہے ہیں ۷۳ء کا دستور ۷۳ء میں ہی شائع ہو چکا ان اراکین اسمبلی نے گزشتہ ۱۴ سال میں اس سوال کو کیوں نہیں اٹھایا اب ۸۷ء میں اس اعتراض کا کیا مطلب لیا جائے؟ یہ تمام اراکین اسمبلی انگریزی ذریعہ تعلیم کے چشمے سے فیضیاب ہوئے ان کے بچے بھی اسی سے سیراب ہو رہے ہیں آخر علاقائی زبانوں سے محبت کا اظہار کرنے والے اپنوں کے لیے اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بناتے ہوئے کیوں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں

سندہ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علاقائی زبانوں کی طرفداری کرنے والے درحقیقت ی کے غلبے کی علمبرداری کر رہے ہیں۔ ان تمام مکالمات میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے ض کرنے والوں نے صرف اور صرف اردو کی بحیثیت قومی زبان مخالفت کی ہے اور قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے مگر کسی ایک معترض نے انگریزی کی سرکاری ی اور قومی حیثیت پر کوئی اعتراض نہیں اٹھایا گویا ساری مصیبت اردو کے دم سے ریزی ظل الٰہی ہے جس کے بغیر گزارہ نہیں سیدہ عابدہ حسین نے یہ خوب نکتہ اٹھایا ہے ، کے ۹۰ فیصد بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہیں اور ان کے لیے ربان سیکھنا بہت مشکل ہے بالکل اسی طرح جیسے اردو بولنے والے دیگر علاقائی زبانیں ، میں دشواری محسوس کرتے ہیں لیکن سیدہ عابدہ حسین نے یہ نہیں بتایا کہ تاریخ کے دور میں ملک کے دیگر صوبوں میں بسنے والے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے اس ملک کے ۹۸ فیصد بچے اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں بلکہ پنجاب، بلوچستان اور رکے سو فیصد بچے اردو میں تعلیم پا رہے ہیں صرف سندھ میں صدیوں سے سندھی بھی متبادل ہ تعلیم کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ پنجاب سرحد بلوچستان سے وہاں کی مقامی بولیوں کوئی روزنامہ نہیں نکلتا اور نہ ہی وہاں رہنے والے اپنی مادری زبان تحریری شکل پڑھ سکتے ہیں اسی لیے پنجاب نے اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے اور گزشتہ سال سے پنجاب اردو کا مولد اور مسکن بنا ہوا ہے اردو لشکری زبان ہے اس لیے اسے س باآسانی لکھ اور پڑھ سکتا ہے اور اسی خوبی کی بنیاد پر یونیسکو کی لسانی سروے رپورٹ نتائج کے مطابق اردو انگریزی اور چینی کے بعد دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے دراصل رہ حسین بولی اور زبان کا فنی مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ۱۹۷۳ء کا آئین زبان کے نفاذ کا ان کرتا ہے بولیوں کے نفاذ کا نہیں بولیاں صرف رابطہ کا ذریعہ ہوتی ہیں لیکن آئین ، صوبوں کو اختیارات دیے گئے ہیں کہ وہ اپنی زبانوں کی ترقی و ترویج و اشاعت کے ے جو کچھ کر سکتی ہیں کریں۔ اعتراض کرنے والوں نے آج تک اردو اور انگریزی میں تقریر و سریر کے ذریعہ ہر سطح پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کبھی اپنی زبانوں میں اظہار نہیں آخر ایسا کیوں ہے؟ اس بحث سے قطع نظر ہم نفاذ اردو کی سرکاری حکمت عمل کے ، منظر پیش منظر اور تہہ منظر کا جائزہ لیتے ۱۹۷۳ء کے آئین میں ۱۵ سال بعد اردو کو ہر سطح نافذ کرنے کی دستوری یقین دہانی کے بعد ۱۹۷۹ء میں پہلی جماعت سے اردو کا نفاذ شروع گیا تاکہ ۱۹۷۹ء میں داخلہ لینے والا بچہ اردو ذریعہ تعلیم سے روشناس ہو کر ۱۹۸۹ء میں ، میٹرک تک پہنچے تو اس وقت میٹرک کا امتحان صرف اور صرف اردو میں لیا جائے اور اردو ہی میں امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں صرف میٹرک کے امتحانات اردو میں لینے کی نوید نہیں سنائی گئی تھی بلکہ لکھا گیا تھا کہ ۱۹۸۸ء میں اردو پورے ملک کی سرکاری اور دفتری زبان ہو گی بالکل اس طرح جس طرح ایران میں فارسی مشرق وسطیٰ کے ممالک میں عربی، جاپان میں جاپانی چین میں چینی روس میں روسی فرانس میں فرنچ اور جرمنی میں جرمن زبان رائج ہے لیکن ارادے نیک نہ ہوں تو الفاظ اپنی طاقت کھو دیتے ہیں ۱۵ سال کی مدت بہت طویل مدت تھی اور اس عرصے میں پورے ملک کی تقدیر بدلی جا سکتی تھی مگر ۱۴ سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک میٹرک کی سطح تک سائنس اور ریاضی کے مضامین بھی مکمل طور پر اردو کے قالب میں نہیں ڈھالے جا سکے۔ انجینئرنگ، میڈیسن، اکاؤنٹنگ اور دوسرے اہم شعبہ جات کی ابتدائی اور بنیادی کتابوں کے تراجم تک اردو میں نہیں ہوئے اور سی ایس ایس میں یہ اجازت تک نہ دی گئی کہ کوئی شخص اگر قومی زبان میں امتحان دیتا ہے تو کم از کم اسے نا اہل تصور نہ کیا جائے۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں کہیں اس بات کا ضمناً بھی تذکرہ نہیں کہ کچھ مخصوص اداروں یا تعلیم گاہوں کو اردو کے نفاذ سے مستثنیٰ رکھا جائے گا آئین ۱۹۸۸ء میں ہر سطح پر اردو کے نفاذ کی ضمانت دیتا ہے مگر ۱۹۸۷ء جا رہا ہے اور اردو کی امیدوں کا آشیانہ ابھی تک بجلیوں کی زد میں ہے ۱۹۷۹ء میں مارشل لاء حکومت نے اردو کے نفاذ پر عملدرآمد کا حکم جاری کیا تو ۱۹۸۱ء سے کیمبرج اسکولز، پرائیویٹ انگریزی اسکولز، آرمی سے متعلقہ اداروں کو نفاذ اردو سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس استثناء کا فائدہ ملک کے دیگر تعلیمی اداروں نے بھی اٹھایا اور ۱۹۸۷ء میں بھی ملک کے ہزاروں تعلیمی ادارے کے جی سطح سے انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کیے ہوئے ہیں۔ استثناء کی تاریخی روایت ہمارے ملک میں خاصی مستحکم ہے ۱۹۷۲ء میں جب تمام تعلیمی ادارے قومیانے کا حکم جاری کیا گیا تب بھی بہت سی منظور نظر درسگاہوں پر اس حکم کا اطلاق نہ ہوا مثلاً کراچی میں ہیپی ہوم اسکول، حبیب پبلک اسکول گرامر اسکول اور ملک میں کئی دیگر ادارے قومیانے کے عمل سے محفوظ رہے اس روایت کے استحکام کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت پورا ملک ہی تعلیمی طور پر موت کے دہانے پر کھڑا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انجام کار کیا ہوگا۔

اردو کے نفاذ کا اصل مقصد انگریزی کی محکومی سے آزادی ہے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہوا تو اردو کا نفاذ بے معنی ہے۔

اردو کے نفاذ کے ضمن میں آئینی تحفظات اور دستوری مباحثات سے قطع نظر اس وقت حکومت کا نقطۂ نظر عجیب و غریب دوراہے پر نظر آتا ہے وفاقی وزیر تعلیم نسیم احمد آہیر نے ۱۶ فروری کو جنگ فورم لاہور میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”انگریزی اب لازمی مضمون کی

حیثیت سے نہیں رہے گی اب طلبا آزاد ہوں گے کہ وہ اس مضمون کا مطالعہ کریں یا نہ کریں انھوں نے کہا کہ موجودہ سائنسی دنیا میں انگریزی کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا انگریزی کی جگہ راتوں رات اردو کے نفاذ کے امکان کو مسترد کر دیا انھوں نے کہا کہ اردو کو دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے زیادہ سے زیادہ الفاظ سمو کر ترقی کرنی ہے"۔

وفاقی وزیر تعلیم کے اس خطبۂ عالیہ میں مختلف مباحث خلط ملط ہو گئے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے عزائم اور حکومت کے مقاصد کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بہت متاثر کن نہیں۔ "انگریزی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے" یہ جملہ طلسم ہوشربا ہے سوال یہ ہے کہ اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے کیوں نہ پڑھایا جائے اور اسے لازمی ذریعہ تعلیم کیوں نہ قرار دیا جائے ۷۳ء کے آئین میں کہیں یہ تحریر نہیں کہ انگریزی لازمی مضمون نہیں ہوگی۔ اس آئین میں صرف یہ لکھا گیا ہے کہ اردو لازمی طور پر تمام سطحوں پر نافذ کی جائے گی اور تعلیم کا ذریعہ بنے گی اگر اس کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جائے تو ممکن ہے اس کی گنجائش نکل جائے لیکن اولیت اور فوقیت اردو کو حاصل ہونا چاہیئے لیکن وفاقی وزیر کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے بارے میں ابھی تک شکوک و شبہات کے سمندر سے نہیں نکل سکے ہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک کسی تعلیمی پالیسی سے محروم ہے یا رکھا گیا ہے ۷۹ء میں موجودہ حکومت نے تعلیمی پالیسی کا ڈھانچہ تیار کیا مگر ابھی تک صرف اس کے اعلان کی نوبت بھی نہیں آسکی۔

نسیم آہیر ۱۴ر فروری کو قومی اسمبلی میں کہہ چکے ہیں کہ ۷۹ء کی تعلیمی پالیسی میں ترامیم کی جا رہی ہیں اور اسے کسی بھی وقت ایوان میں پیش کیا جا سکتا ہے مگر اس قسم کے دعوے ان کے پیشرو ڈاکٹر افضل ہوتی صاحب اور محمد یٰسین وٹو بھی کر چکے ہیں مگر ابھی تک پالیسی کا نام و نشان نظر نہیں آتا المیہ یہ ہے کہ تعلیم ہماری قومی ترجیحات میں صف آخر سے بھی پرے ہے حالانکہ تعلیم اولین ترجیح ہونا چاہیئے جب تک تعلیمی پالیسی موجود نہ ہو تعلیم کے میدان میں ترقی کا تصور خواب ہی رہے گا۔

ایک جانب وفاقی وزیر تعلیم اردو کے نفاذ کی بجائے انگریزی کے اخراج کی خوشخبری دے رہے ہیں دوسری جانب ۱۶ر فروری کو سندھ کے وزیر تعلیم نے صوبائی اسمبلی میں بیان دیا

The question of change in the medium of instruction from english to urdu for all matriculation examinations from 1989 will be considered by the Federal cabinet by April. The matter was still pending decision and Govt. of Sind was awaiting communication from the Federal Government.

اس صورتحال میں وفاقی وزیر تعلیم کی بات درست تسلیم کی جائے یا صوبائی وزیر تعلیم کی بات کو سچ مانا جائے ہمارے لیے دونوں شخصیات واجب الاحترام اور لائق ہیں اور ہم کوئی ایسا قرینہ نہیں پاتے جس سے ان دونوں بیانات میں مطابقت پیدا کر سکیں۔

لیکن ان اختلافی مباحث سے قطع نظر اصل سوال یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء سے صرف میٹرک کی سطح تک تقریباً تمام امتحانات اردو میں ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگلش میڈیم اسکولوں کے طلبا کو بھی انگریزی میں امتحانات دینے کی اجازت ہوگی تو اس فیصلے کے کیا اثرات ہوں گے کیا اس فیصلے سے ہم اس ۵ فیصد اقلیت کے تسلط سے آزادی کا تصور کر سکتے ہیں جو گزشتہ ۴۰ سال سے اس ملک کی قسمت کا مالک بنا بیٹھا ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں اس ملک کے ۹۵ فیصد لوگوں کی معیشت اور معاشرت کی جان موجود ہے یہ ۵ فیصد اقلیت تو بہرحال اردو نہیں پڑھے گی صرف ۹۵ فیصد اکثریت صرف اردو پڑھیں گے اور ان کے لیے بھی انگریزی لازمی نہیں ہوگی گویا یہ ۹۵ فیصد اکثریت تھوڑی بہت انگریزی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ یہ ۹۵ فیصد اکثریت جب پہلی سے دسویں تک انگریزی پڑھے بغیر انٹر ڈگری پروفیشنل کالجز، میڈیکل سائنسز، سوشل سائنسز، پی ایچ ڈی، کمپیوٹر سائنس اور دیگر علوم کے حصول کے لیے کہیں جائے گی تو اسے کہیں داخلہ نہیں ملے گا کیونکہ سرکاری طور پر جو اعلانات کیے گئے ہیں اس میں صرف میٹرک تک اردو میں امتحان کی خوشخبری دی گئی ہے گویا ملک کے ۹۵ فیصد طالب علم صرف میٹرک پڑھیں تاکہ ۵ فیصد اقلیت کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مواقع جواب ۸۰ فیصد ہیں مزید بڑھ کر ۱۰۰ فیصد ہو جائیں گے اور اپنی محنت سے اور اتفاق یا قسمت سے جو چند عبقری طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کر جاتے ہیں وہ بھی انگریزی سے محروم رہ کر ان کے مقابلے پر نہ آسکیں۔ اردو کو نافذ کرنا ہے تو انگریزی کو ختم کرنا ہوگا۔ حکومت نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ انگریزی کے "بتدریج خاتمے" کے لیے انھوں نے کیا منصوبہ بندی کی ہے۔ میٹرک کے بعد ہر شعبے کی اعلیٰ تعلیم صرف اور صرف انگریزی میں ہوگی اور سی ایس ایس میں بھی انگریزی ہی ذریعہ نجات ہے تو آخر یہ ۹۵ فیصد اردو پڑھنے والے کیا کریں گے؟

ہمارے خیال میں اس سنگین صورت حال کا حل صرف یہ ہے کہ اردو کو کم از کم اس وقت تک وہی حیثیت دے دی جائے جو انگریزی کو حاصل ہے اور ہر طالب علم کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ اردو میں کسی بھی سطح پر امتحان دینا چاہے تو دے سکے اور سی ایس ایس کے امتحان میں بھی اردو کو انگریزی کا متبادل سمجھا جائے اور طلبا دونوں زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں امتحان دے سکتے ہوں اس کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں ہر سطح پر انٹرویوز اردو اور انگریزی میں امیدوار کی مرضی کے مطابق لیے جائیں۔ ملازمت کی درخواستیں دونوں میں سے کسی بھی زبان میں تحریر کرنے کی اجازت دے دی جائے اور کسی طالب علم کو صرف انگریزی میں کمزور ہونے کی بنیاد پر

ے کے بیلے نااہل نہ سمجھا جائے۔

یہ مشورہ ممکن ہے بہت لوگوں کو پسند نہ آئے اور وہ اردو صرف اردو کا نعرہ لگائیں
موجودہ سنگین صورت حال میں حکومت سے اس بات کی توقع رکھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں
ہر سطح پر اردو کا نفاذ کر دے گی پندرہ سال میں پرائمری سطح پر اردو کا مکمل نفاذ نہیں ہو
دیہ کیسے ممکن ہے کہ آئندہ سو برس میں بھی ہر سطح پر اردو کا نفاذ ہو جائے اردو کے حمایتی
ہے کے بجائے ہوش سے کام لیں ورنہ حالات بتاتے ہیں کہ ملک کے ۹۵ فیصد طالب علم آئندہ
ں کے بعد تعلیم کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ صرف اردو میں داخلے والے میٹرک کے
بعد کیا پڑھیں گے اور کیسے پڑھیں گے۔

ہم وفاقی حکومت سے بھی گزارش کریں گے اور تمام اراکین اسمبلی و دانشوروں سے بھی کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس سنگین مسئلے پر غور کریں اور کم از کم اپنی جدوجہد سے اردو کو فی الحال اتنا مقام دلوا دیں کہ اسے انگریزی کے برابر سمجھ لیا جائے اور مقابلے کے عام امتحانوں میں امیدواروں کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اردو انگریزی زبان میں سے جس زبان میں جواباً دینا چاہیں دیں اور انتخاب کا معیار زبان نہیں بلکہ علم اور معلومات ہو۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ راولپنڈی)

پہلے درسی کتب لائیے

ڈاکٹر وحید قریشی

ہمارے دانشور یہ سوال اکثر اٹھاتے ہیں کہ پہلے درسی کتب لائیے پھر ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کا مطالبہ کیجئے۔ میرے نزدیک یہ مرغی اور انڈے کا مسئلہ ہے۔ رسد اور طلب ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اگر کتب کے ڈھیر بھی لگا دیئے جائیں تو وہ معیاری نہیں ہو پائیں گی۔ اس لئے کہ ان کی پرکھ ہی نہ ہو سکے گی۔ معیاری کتب اس وقت تک نہیں آ سکتیں جب تک باقاعدہ امتحان کی کسوٹی پر انہیں پرکھ نہ لیا جائے۔

دراصل اردو کا مسئلہ کبھی بھی علمی مسئلہ نہیں رہا۔ یہ ہمیشہ سیاسی مسئلے کے ساتھ منسلک رہا ہے۔ علمی مسئلے کو علمی سطح پر حل کیا جائے تو ہو سکتا ہے اس لئے علمی مسائل کے حل، علمی اور سیاسی مسائل کے حل سیاسی ہوتے ہیں۔ ہم علمی مسائل کو حل کر کے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس سے سیاسی مسائل بھی حل ہو جائیں گے یہ ممکن نہیں۔ اس کا تجربہ ہم مشرقی پاکستان میں کر چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں مسئلہ سیاسی اور سماجی محرومی کا تھا جسے لسانی ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں سامنے آیا اور کوئی لسانی سمجھوتہ سامنے نہ آ سکا۔ دوسری مثبت مثال بلوچستان کی ہے جہاں گزشتہ آٹھ برس میں محرومیوں کا علاج بجلی اور گیس پہنچا کر کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آٹھ سال قبل بلوچستان میں جو [illegible] زبانوں کا اختلافی مسئلہ تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے زبان کا مسئلہ مرض نہیں ہے مرض کی علامت ہے۔ مرض کا حل ہوا تو مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

پاکستان کی صوبائی زبانوں پر لسانی سطح پر تحقیق کیا جائے تو یہ زبانیں اس طرح الگ الگ نہیں ہیں جس انداز میں ایک خاص فلسفے کے تحت ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگر لسانی تجزیہ کیا جائے تو ان سب زبانوں کی گرامر اور ذخیرہ الفاظ میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ پنجابی اور اردو کا ڈھانچہ ایک ہی طرح کا ہے۔ یہی حال دوسری صوبائی زبانوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اردو کبھی نہیں پڑھی، میں نے تو فارسی بھی انگریزی ہی میں پڑھی ہے لیکن مجھے اردو میں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میرے زمانے میں تدریس کی یہی صورت ہوتی تھی کہ جب کوئی مسئلہ انگریزی میں سمجھ میں نہیں آتا تھا تو استاد انگریزی کی بجائے اردو یا پنجابی میں سمجھا دیتا تھا۔ اسی لئے ترجمے کا عمل ہمارے ذہن میں آج تک تازہ ہے۔

وہ چیز جو ہم صرف دس منٹ میں لکھ سکتے ہیں وہ انگریزی میں ایک گھنٹے میں لکھ پاتے ہیں۔ بہت سے خطوط کا جواب اب دفتروں میں اسی لئے تاخیر سے دیا جاتا ہے کہ انگریزی میں جواب دینا مشکل ہوتا ہے اور عملے کو کسی نے جواب کا نوٹ تیار کرنے کے لئے کسی پرانی فائل کا سہارا لینا پڑتا ہے یا کئی دن لگا کر چند سطریں لکھنی پڑتی ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے دفتری زبان کا تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق انگریزی کے صرف ۶۰۰ الفاظ ایسے ہیں جو دفتروں میں استعمال ہوتے ہیں اسے ایک ہزار تک بڑھا لیں اس کے متبادل اردو الفاظ بھی اس سے زیادہ نہیں ہوں گے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۱۹ جون ۸۷ء

وحید عثمانی

قومی زبان کی ترویج کا مسئلہ

۱۹۸۸ء تک تمام سرکاری دفتروں میں اردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے سلسلے میں متعلقہ اقدامات تیزی سے کیے جا رہے ہیں۔ نیز حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ پاکستان کے تمام ثانوی تعلیمی بورڈ ۱۹۸۹ء کے میٹرک کے امتحان صرف اردو زبان میں لیں گے۔ مرکزی وزیر تعلیم نسیم احمد آہیر نے بھی اپنے ایک حالیہ بیان میں اس جانب اشارہ کیا اور بتایا کہ قومی زبان کی حیثیت سے اردو کی ترقی کے امکانات تو بہت روشن ہیں مگر دفتری زبان کی حیثیت سے اس کے فروغ اور ترقی میں حائل بعض رکاوٹیں بھی حائل ہیں اس سلسلے میں انہوں نے دو عوامل بیوروکریسی اور دتی اور لکھنؤ کے نستعلیق لہجے اور روزمرہ پر اصرار کرنے والے لوگوں کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی اردو اسی لہجے اور روزمرہ میں بولی، لکھی اور پڑھی جائے جیسے چالیس سال پہلے تک ہندوستان کے گنگا جمنی علاقے میں بولی جاتی تھی تو اس سے اردو کی ترقی میں کوئی مدد نہیں ملے گی اور پاکستان کے حصے میں آنے والی علاقائی اور صوبائی زبانوں کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی وزیر تعلیم نے سرے سے انگریزی کو ختم کر دینے کو بھی نامناسب قرار دیا اور کہا کہ اچانک ایسا کرنے سے ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں دنیا کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ وزیر تعلیم نے یہ بھی واضح کیا کہ محض قانونی اقدامات کے ذریعے اردو کو سرکاری زبان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ ۲۵۱ کے تحت اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آئینی طور پر یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پندرہ سال کے اندر اردو کو ہر سطح پر سرکاری محکموں میں دفتری زبان کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے مرحلہ وار بنیاد پر ایک پروگرام بھی وضع کیا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے اردو ٹائپ کا جو "کی بورڈ" تیار کر دیا ہے مرکزی کابینہ نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے اس کے ساتھ ہی قومی اسمبلی نے اردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لیے جو دو سب کمیٹیاں قائم کی تھیں ان میں سے ایک سب کمیٹی کی رپورٹ بھی حکومت کو موصول ہو گئی ہے جب کہ دوسری سب کمیٹی کی رپورٹ ابھی پیش نہیں کی گئی تاہم ا
کے موصول ہونے کے بعد ہی حکومت اس ضمن میں اپنے فیصلوں کا اعلان کرے گ

مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے گزشتہ سال یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ ا
ادارے کے ماہرین اردو کو دفتری زبان اور ہر سطح پر ذریعہ تعلیم قرار دینے
سلسلے میں جو مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں ان کے بارے میں بھی غور و فکر کرتے ر
ہیں اور اس سلسلے میں جن دوسرے ملکوں نے قومی زبانوں کو دفتری زبان قرار دیا ہ
کے تجربات کی روشنی میں اردو کو دفتری اور سرکاری سطح پر رائج کرنے کے سلسلے میں حا
رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے اس کے ساتھ ہی موجودہ سرکاری افسروں اور ماتحت ملا
کو سرکاری خط و کتابت اور دفتری کام اردو میں انجام دینے کے قابل بنانے کے۔
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں خصوصی تربیت بھی دلائی جائے گی۔

اردو کو دفتری زبان قرار دینے کے سلسلے میں حکومت پنجاب نے بھی دفتری ز
کے لیے اصطلاحات وضع کی ہیں۔ تاہم اس کے کام کی رفتار بہت سست رہی ہے

حکومت پاکستان نے اعلیٰ سرکا
ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات بھی اردو میں لینے کے بارے میں پبلک سروس کمیشن
کو ہدایات جاری کی ہیں اور بعض مرکزی وزارتوں اور محکموں میں تمام تر دفتری کاررو
اور خط و کتابت بھی اردو میں جاری ہے۔ اردو کو دفتری اور سرکاری زبان قرار د
کے سلسلے میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مقتدر حکام وقتاً فوقتاً جو اعلانات کر
رہتے ہیں وہ اپنی جگہ بڑے خوش آئند ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت
اردو ہی پاکستان کے تمام علاقوں اور صوبوں میں رابطے کی سب سے بڑی اور اہم زبان
اور اس زبان نے قومی سطح پر یگانگت مفاہمت اور اخوت پیدا کرنے میں بھی اہم کر

اسے پھر اس زبان میں دوسری ہم عصر زبانوں کے الفاظ کو سمونے کی صلاحیت بھی
بہ اتم موجود ہے اس کے ساتھ ہی چونکہ ابلاغ عامہ کی سب سے موثر زبان بھی اردو ہی
اس لیے فطری طور پر پاکستان کے تمام ذرائع ابلاغ کا موثر ترین ذریعہ بھی اردو زبان
ہے مگر اسے قومی اور دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرتے ہوئے بعض لسانی، جغرافیائی
ائی اور سماجی عناصر اور عوامل کو مدنظر رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان کے
دں صوبوں اور آزاد کشمیر میں بسنے والوں کی اکثریت مادری زبان اگرچہ اردو نہیں ہے
یہاں دوسری علاقائی زبانیں بولنے والے افراد کی تعداد بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے
ایک بات جو سب میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی علاقے یا پاکستان
کسی بھی شہری کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے بھی انگریزی
ن کو ایک ناگزیر ضرورت کے تحت اختیار کیا ہے اس کی ایک سب سے بڑی وجہ تو یہی
ہ کہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال تک انگریزی زبان ہی برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش
غیر ملکی حاکموں کی زبان رہی ہے اور اس تسلط کے باعث انگریزوں نے اس برصغیر کی تمام
دسری مقامی زبانوں کو دبانے اور کچلنے اور انگریزی کو رواج دینے کے لیے ہر اس
ہ رام سے کام لیا جو ان کے بس میں تھا۔ پھر انگریزی کو اقتصادی مفادات کے حصول کا
ب سے اہم ذریعہ بھی بنا دیا گیا اور پھر ایک وقت وہ آیا جب انگریزی کی تعلیم اور اس میں
یت حاصل کیے بغیر کسی بھی طرح کے روزگار اور ملازمتوں کا حصول تقریباً ناممکن بنا دیا
یا اردو کے منفرد شاعر حضرت اکبر الہ آبادی نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
ہا تھا کہ "پنڈت ہو، مولوی ہو، دونوں بیکار، بس گریجویٹ ہونا اچھا" یا انہی کے
فاظ میں "انگریزی پڑھ کر قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ" درحقیقت انگریزی کی تعلیم فلاح
، راہ سے کہیں زیادہ ایک اقتصادی مجبوری تھی اور آزادی کے چالیس سال گزرنے کے
وجود ہم اس اقتصادی مجبوری کے بندھنوں سے نجات حاصل نہیں کر سکے ہیں اور انگریزی
ے اقتصادی اور ثقافتی تسلط نے ہمیں بڑی حد تک ایک طرح کے احساس کمتری میں بھی
تلا کر دیا ہے حالانکہ کسی زبان میں تعلیم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے دیکھنا یہ ہے
ہ تعلیم سے ہم کیا مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ سوال اس کا نہیں ہے کہ ہم کس زبان
ں تعلیم حاصل کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کیا حاصل کر رہے ہیں اور جو کچھ حاصل کر رہے
ں وہ ہمارے عصری تقاضوں اور ضروریات کے عین مطابق ہے بھی یا نہیں۔ آکسفورڈ
کیمبرج کے روزمرہ اور لہجے میں انگریزی بول لینا کافی نہیں ہے۔ ہمارے بہت
ے انگریزی ذریعہ تعلیم والے مہنگے پبلک اسکول انگریزی جاننے والے طلباء کی جو

کھیپ ہر سال تیار کرتے ہیں ان کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو صحیح انگریزی محاورے
تو ادا کر سکتے ہوں گے مگر ان کی تخلیقی صلاحیتیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں کم ہی
نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برعکس عام سرکاری اور بلدیاتی یا اردو ذریعہ تعلیم
والے دوسرے عام سکولوں کے فارغ التحصیل طلباء بھی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے
مالک دیکھے گئے ہیں اور اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعلیم کا نظام اور نصاب ایسا ہونا
چاہیے جو طلباء کی خفیہ تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرے ان کے اندر قومی تشخص کا شعور بیدار کرے۔
انہیں ملک کا مفید شہری بنائے اور ان میں ایسا جوہر پیدا کرے جس سے کام لے کر وہ قوم اور
ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ محض دفتری بابو یا بڑا افسر بننے کا اہل بنا دینا تعلیم کا مقصد
قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دفتری زبان کی حیثیت سے اردو انگریزی
کا درجہ حاصل کرے تو اس کے لیے ہمیں یکدم چھلانگ لگانے کی بجائے قدم بہ قدم آگے
بڑھنا ہو گا۔ ترجیحات متعین کرنا ہوں گی اور سائنسی خطوط پر کام کرنا ہو گا اس کے لیے پہلے
تو یہ ضروری ہے کہ اردو کو ان تمام علاقائی زبانوں کے قریب بنایا جائے۔ علاقائی زبانوں
کے ادب عالیہ کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے تاکہ اپنی دھرتی اپنے موسموں اپنی خوشیوں
اور غمیوں اور اپنے اپنے علاقائی طرز زندگی اور بودوماند کی خوشبو سے اردو کو معطر اور معمور
کیا جا سکے اور اردو اور علاقائی زبانیں بولنے والوں کے درمیان حائل فاصلے اور خلیجیں
مٹائی جا سکیں باہمی نفرتیں ختم کی جا سکیں اور اپنائیت اور یگانگت کا احساس پیدا کیا
جا سکے۔ خوش قسمتی سے اب قیام پاکستان کو اتنے برس بیت چکے ہیں کہ ان لوگوں کی آل اولاد
بھی اپنے اپنے علاقوں کی زبانیں بولنے اور سمجھنے لگے ہیں جن سے ان کے ماں باپ بوجوہ
نابلد تھے۔ قومی یک جہتی کے عمل کو آگے بڑھانے میں یہ ایک بڑی تبدیلی ہے اور اس کی
ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے اس کے ساتھ ہی اردو کے ساتھ ساتھ دوسری اہم
علاقائی زبانوں کی فروغ اور ترقی کے لیے بھی ہر ممکن کوشش سے کام لیا جانا چاہیئے کہ اب
پاکستان کے تناظر میں اردو کا علاقائی زبانوں کے ساتھ جو رشتہ استوار ہوا ہے اسے
مزید وسعت دی جانی چاہیئے مگر اس سلسلے کی سب سے بڑی ضرورت رہی ہے جس کی
جانب مرکزی وزیر تعلیم نے اشارہ کیا ہے کہ اردو کو فروغ دینے کی لگن میں ہم کہیں کوئی
ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جس سے ہم مسلسل آگے بڑھتی ہوئی دنیا سے پیچھے رہ جائیں اس
لیے قومی زبان کو سرکاری، دفتری اور یونیورسٹیوں کی سطح پر رائج کرتے ہوئے ہمیں ایک قابل
عمل مرحلہ وار پروگرام جلد وضع کرنا ہو گا اور اس عمل میں علاقائی زبانوں کے حقوق اور مفادات
کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔

(بشکریہ روزنامہ امروز لاہور)

ظفر اقبال

کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

محولہ بالا مصرع کے شاید ایک معنی یہ بھی ہوں کہ بطور قومی زبان کے اس کا نفاذ بھی ہوتے ہوتے ہی ہوگا، بلکہ یہ بھی کہ یہ مسئلہ کھٹائی میں بھی پڑ سکتا ہے جس کے کچھ اشارے اگلے روز قومی اسمبلی میں اس موضوع پر بحث سے بھی دستیاب ہیں جس میں سندھ اور بلوچستان سے متعلق بعض معزز اراکین نے نہ صرف اردو کے قومی زبان ہونے سے انکار کیا بلکہ یہ بھی پوچھا کہ اردو کو قومی زبان کس نے بنایا ہے اور اردو علاقائی اور مادری زبانوں کے سر کیوں تھوپی جا رہی ہے، جس میں جناب سومرو اور جناب جمالی پیش پیش تھے جن کی بھرپور تائید پنجاب سے معزز ارکان سردار آصف اور سیدہ عابدہ نے کی۔ متعلقہ وزیر نے عذر خواہانہ انداز میں ایوان کو یہ بتایا کہ اردو کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ بابائے قوم حضرت قائد اعظم نے فرمایا تھا بلکہ یہ بھی یاد دلایا کہ آئین ۷۳ء میں اردو کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور حکومت بھرپور کوشش کر رہی ہے کہ آئینی تقاضے کے مطابق پندرہ سال کے اندر اندر اس زبان کو ہر محکمہ و شعبہ میں مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے۔ اردو کو قومی زبان بنائے جانے کے موضوع پر خون ریز لسانی فسادات جو سابق مشرقی پاکستان اور بعد میں صوبہ سندھ میں رونما ہوئے، اب قدرے قصہ پارینہ بن چکے ہیں، تاہم چھوٹے صوبوں میں پھیلے ہوئے موجودہ سیاسی اضطراب کی بنا پر یہ طے شدہ مسئلہ بھی دوبارہ سر اٹھاتا نظر آتا ہے۔

اردو اگلے سال تک جملہ سرکاری شعبوں کی رگوں میں سرایت کر سکتی ہے یا نہیں، اس کا انحصار حکومت پر کم اور افسر شاہی کی اپنی مصلحتوں پر زیادہ ہے تاہم اس زبان کی ترویج کا جو کارنامہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سرانجام دے رہی ہے وہ اگر زیادہ نہیں تو اپنے صدر نشین جناب ڈاکٹر وحید قریشی جتنا بھاری بھر کم ضرور ہے۔ اول تو مقتدرہ اگر اور کچھ بھی نہ کرے تو اس کا یہ دبنگ نام ہی مخالفین کے چھکے چھڑانے کے لیے کافی ہے۔ بہر حال، مقتدرہ کے کارہائے نمایاں وغیرہ نمایاں میں وہ کتابچے بھی بطور خاص شامل ہیں جنہیں یہ ادارہ محض کسر نفسی کے طور پر پمفلٹ کہتا ہے۔ ان کتابچوں کی دوسری کھیپ جو ہمیں موصول ہوئی ہے ان میں قومی یک جہتی اور ادب کا کردار (ڈاکٹر وزیر آغا) عزیز احمد (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ) اردو اور صوفی ازم (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ) چین میں اردو (کوثر جمال) ذخیرہ شیرانی میں اردو مخطوطات (سید جمیل احمد رضوی) بلوچی سے اردو تراجم (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) برطانیہ میں اردو کے چار سال (ترجمہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید) پشتو سے اردو تراجم (پریدل خٹک) مشینی ترجمے کا ماضی اور مستقبل (خورشید یوسف) کویت میں اردو (محبوب امین نجمی) اور اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب (سلیم الدین قریشی) شامل ہیں۔

اگرچہ سبھی کتابچے اپنی اپنی جگہ پر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور اس سلسلے میں ملک کے معروف اور نامور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اور جگہ کی کمی کے باعث سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے تاہم دو کتابچوں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا جن میں موخر الذکر شامل ہے۔ اگرچہ یہ خالصتاً ایک تاریخی اور تحقیقی کام ہے لیکن موضوع ایسا ہے کہ دامن کو پکڑ لیتا ہے اور شاید ہی کوئی اردو آشنا ایسا ہو جو اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب کے بارے میں ایک انتہائی اشتیاق نہ رکھتا ہو۔ کتاب جو موضوع کے لحاظ سے عیسائیت کے اصولوں کا احاطہ کرتی ہے ۱۸۴۳ء میں ہالے سے شائع ہوئی۔ اسے ہنری کیلن برگ نے مرتب کیا اور اس کا ایک ہی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ کتابچے میں کتاب کے سرورق اور متن کے دیگر صفحات کے عکس شائع کیے گئے ہیں جو ابتدائی ٹائپ میں ہیں اور جنہیں دیکھ کر قاری ایک طرح سے جذباتی ہو جاتا ہے گویا علمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کتابچے کی ایک باقاعدہ جذباتی اہمیت بھی ہے۔ دوسرا اہم اور منفرد کتابچہ ممتاز نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کردہ ہے جو موصوف کے دو مقالوں "قومی یک جہتی اور ادب کا کردار" اور "پنجابی ادب اور اردو کا باہمی رشتہ" پر مشتمل ہے۔ موخر الذکر مقالہ بطور خاص ڈاکٹر صاحب کے خاص اسلوب، تنقیدی بصیرت اور خلاقی پر بھرپور گواہی دیتا نظر آتا ہے، مقالے کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے:

"اردو زبان اور اس کے ادب سے پنجابی زبان اور اس کے ادب کا وہی رشتہ ہے جو دریائے سندھ سے پنجاب کے ان پانچ دریاؤں کا ہے جو پنجند کے مقام پر ایک ہی دھارے میں منتقل ہو کر بالآخر دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں۔ دلچسپ بات

یہ ہے کہ جس طرح پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے اسی طرح یہاں پانچ مقامی بولیاں ہندکا، پوٹھوہاری، لاہوری، ہندکو اور سرائیکی بھی ہیں جن کے رنگوں اور لہجوں کے امتزاج کا نام پنجابی ہے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں" اردو کسی ایک علاقے کی زبان نہیں۔ ہر چند بعض ایسے خطے بھی موجود ہیں جہاں اردو بول چال کی زبان کا درجہ رکھتی ہے، مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کے اس روپ کو علاقائی اردو ہی کا نام دیا جائے۔ وجہ یہ کہ اردو کا یہ علاقائی لب ولہجہ یا رنگ اردو کے اس عالمگیر رنگ سے قدرے مختلف ہے جو مثلاً پشاور سے لے کر مدراس تک ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس عالمگیر رنگ پر علاقائی اردو کی چھاپ لگانا اور پھر اصرار کرنا کہ اس کا لب ولہجہ اور محاورہ علاقائی اردو کے عین مطابق ہو، ایک بالکل مصنوعی سی بات ہوگی اور اس سے اردو کی وہ حیثیت مجروح ہوگی جو اسے ایک" بڑی زبان" کے منصب پر فائز کرتی ہے وہ زبان جو ہزاروں برس کے کٹاؤ کے عمل سے گہری اور کشادہ ہو کر ایک بڑی زبان کے درجے پر جا پہنچی ہے۔ دراصل ایک ایسی نشیبی گزرگاہ کی طرح ہوتی ہے جس میں جملہ علاقائی زبانوں کے الفاظ، لہجے اور ثقافتی آثار از خود شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اردو کو دریائے سندھ سے تشبیہ دی ہے کہ یہ دریا ایک تجرید ہی نہیں ایک نشیبی گزرگاہ بھی ہے اور جب میں کہتا ہوں کہ اردو بھی ایک نشیبی گزرگاہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جملہ علاقائی زبانیں (جن میں پنجابی بھی شامل ہے) مجبور ہیں کہ اس قدرتی گزرگاہ کو استعمال کریں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پنجابی زبان اس گزرگاہ سے کٹ کر خود کفیل اور خود مختار ہونے کی کوشش کرے تو پھر صورت کیا ہوگی بنیادی طور پر محض مفروضہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح پنجاب کے دریا مجبور ہیں کہ اس قدرتی نشیب میں جا گریں جس کا نام دریائے سندھ ہے اسی طرح اہل پنجاب بھی مجبور ہیں کہ اپنے فکر و احساس کی لطیف پرتوں اور اپنی تہذیب و ثقافت کی جملہ کروٹوں کو اردو میں منتقل کریں کہ اردو زبان ہی برصغیر پاک و ہند کا وہ سب سے بڑا نشیب ہے جس میں علاقائی زبانیں ہزاروں برس سے گر رہی ہیں اور ہزاروں برس تک گرتی چلی جائیں گی.....؛

بہرحال، یہ دقیع اور پُرمغز تخلیق پارہ اگر اب تک کہیں اور شائع نہیں ہوا تو ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے کہ اسے کہیں اور بھی چھپوائیں یا کم از کم" اوراق" میں ہی چھاپ دیں تاکہ اس کی خیال انگیزی کا دائرہ وسیع تر ہو سکے۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور)

اُردو داستان

مشاعرے کے اس ذکر لطیف میں اسے ضرور شاید رنگ پیدا نہ ہوسکے لیکن یہ ہمارا ادبی فریضہ ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کا ذکر کریں جو مشاعرے کے داد پسند شاعر نہیں بلکہ تحقیق میں اپنا خون صرف کرنے والے اور گوشۂ خاموشی میں جمعیت قلب سے کام کرنے والے محقق ہیں۔ انہوں نے" اردو کا روپ"، " اردو کہانی: سب رس پر ایک نظر"، غالب کے سات رنگ"، ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ اور اردو زبان کے مولد اور پیدائش کے بارے میں اپنا ایک نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری جن دنوں پی اے ایف کالج سرگودھا میں اردو کے استاد تھے انہوں نے" اردو داستان" پر ایک قابل قدر مقالہ لکھا تھا۔ جس کی ادبی پذیرائی یوں ہوئی کہ پنجاب یونیورسٹی نے انہیں اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ پی ایچ ڈی کا معاملہ تو اب ہر جگہ روز افزوں ہے لیکن ڈاکٹر سہیل بخاری کا مقالہ ایسا تھا جسے ڈگریاں دینے والوں نے بھی پسند کیا اور اس کے حوالے مختلف مقامات پر دیئے۔ یہ مقالہ طویل عرصے تک غیر مطبوعہ پڑا رہا۔ تا آنکہ مقتدرہ قومی زبان نے اس کی اہمیت ایک کام میں، جاگی کیا۔ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے۔ مقالہ" اردو داستان" (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)" زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کتاب میں داستان کی غایت سے لے کر داستان کی ابتدائی صورتیں، فورٹ ولیم کالج کی خدمات، ۱۸۰۲ء کے بعد کی داستانیں، داستان کا تنقیدی مطالعہ داستان میں ہندوستانی عناصر اردو ادب میں داستان کی اہمیت اور مقام جیسے موضوعات شامل ہیں۔

کہیں اردو داستانوں اور قلمی نسخوں اور حوالہ کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کو ہم کا دامن محدود ہے لیکن ہم اس بات سے انکار نہیں کریں گے کہ یہ کتاب اہل ادب کو بہت ہی متاثر کرتی ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اس کتاب پر جو داد ڈاکٹر سہیل بخاری کو ملے گی وہ مشاعرے کی داد کی طرح ہنگامی اور جلد ضائع ہو جانے والی نہیں ہوگی۔ مقتدرہ قومی زبان بھی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اتنی اہم کتاب کی اشاعت کا اہتمام اس ادارے نے کیا۔

روزنامہ حریت جمعہ ایڈیشن (۳۱) ۲۰ جولائی ۱۹۸۷ء

محمود الحق عثمانی

اُردو ذریعہ تعلیم

گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کے ایما پر یہ بات سننے میں آرہی تھی کہ ۱۹۸۸ء سے بورڈ کے امتحانات صرف اردو زبان میں ہوں گے۔ پچھلے دنوں مرکزی حکومت کی طرف سے دوبارہ اس بات کی پُر زور تصدیق کی گئی ہے کہ ۱۹۸۸ء سے اس فیصلے کا عملی نفاذ کیا جائے گا۔ بظاہر یہ اقدام قومی زبان کی تائید میں کیا جا رہا ہے لیکن اس کے متوقع نتائج سے، اندیشہ ہے کہ اردو زبان کی صورتِ حال کو اور پیچیدہ بنا دیں گے اور اپنے نتائج کے اعتبار سے اس زبان کے لیے سوائے تکلیف دہ صورتِ حال پیدا کرنے کے، اور کوئی خدمت انجام نہ دے سکیں گے۔ تعلیم ہمارے دستور کی رُو سے صوبائی اختیار کا معاملہ ہے اور تعلیم سے متعلق بنیادی اہمیت کے تمام نکات کا فیصلہ صوبوں کے اختیار میں رہنا چاہیے۔ لیکن گذشتہ چالیس برسوں میں مرکزی حکومت نے تعلیم میں اپنی دخل اندازی کے دائرے کو اتنا وسیع کیا ہے کہ صوبائی حکومت کی حیثیت اب ذیلی رہ گئی ہے اور تعلیم کے بارے میں سارے اہم فیصلے صورتحال سے بے خبر رہتے ہوئے مرکزی سطح پر کیے جاتے رہے ہیں۔ مرکزی حکومت تعلیمی معاملات میں جن مفادات کی نمائندگی کرتی ہے ان کا تعلق براہ راست اس افسر شاہی سے رہتا ہے جس کے افراد کی اکثریت ملک کے ایک مخصوص صوبے سے بھرتی ہوتی ہے۔ اس طبقے کے علاوہ ان فوجی افسروں کے مفادات کی حفاظت بھی ہوتی ہے جن کے ہاتھوں میں براہِ راست یا بالواسطہ اس ملک کی عنان حکومت رہی ہے۔ مفادات کے حامل یہ وہ طبقے ہیں جو پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ذہنی اور تمدنی طور پر اس ملک کے ماحول سے ہم آہنگ نہیں۔ ان کی عادات و اطوار اور رہن سہن برطانوی حکمرانوں کے طرز زندگی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ حضرات پاکستان میں رہتے ہوئے، یہاں کے تمدن اور رسم و رواج سے محض بے بہرہ ہی نہیں بلکہ اسے کسی قدر تحقیر سے دیکھتے ہیں اور ہر قیمت پر اپنی مراعات اور اپنے طرز زندگی کا تحفظ چاہتے ہیں، ان کو اس بات کی بالکل پروا نہیں کہ ان کی اس حرکت سے بحیثیت مجموعی ملک اور قوم کو کتنا نقصان ہوگا۔ ان لوگوں نے اپنے اقتدار، اپنے اختیار اور اپنی قوت کے بل بوتے پر کبھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ ملک کا تعلیمی نظام جمہوری اور مواقع کی مساویانہ تقسیم کی نہج پر تشکیل پا سکے۔ پاکستان میں تعلیم شروع ہی سے عوام اور خواص کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ خوشحال کے کچھ تعلیمی جزیرے پبلک اسکولوں، کیڈٹ اور چھاؤنی کے اسکولوں اور انگلش میڈیم اسکولوں کی شکل میں مراعات یافتہ طبقے کے لیے مخصوص ہیں اور عام فلاکت زدہ اسکول، قوم کے بقیہ بدنصیب بچوں کے حصے میں آتے ہیں۔ یہ وہ مدارس ہیں جہاں بچوں کو بیٹھنے کے لیے دری تک میسر نہیں اور جہاں بچے پانی، روشنی اور تازہ ہوا سے محروم رہتے ہیں۔ سروں پر مخدوش چھتیں جان لیوا جھولتی رہتی ہیں اور محکمۂ تعلیم کے عملے کی رشوت ستانیوں کی دہائی دیتی ہیں۔ اس تفریق کی بناء پر حکومت کی ہر تعلیمی حکمت عملی میں ایک دوعملی اور دوغلاپن دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اسی دورُخے پن کی بناء پر بحیثیت ذریعۂ تعلیم، اردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں مرکزی وزارت تعلیم کبھی مخلص نہیں رہی ہے اور اسی لیے کبھی کوئی ایسی حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی جس کا نفاذ عوام و خواص، دونوں پر ہو۔ موجودہ اعلان میں بھی ایسے تعلیمی اداروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن سے خواص کا تعلق ہے۔ اس ظالمانہ مذاق کو کیا کہیے کہ ایک بیرونی ملکی نظام امتحانات کے اجراء کی اجازت بھی مستقلاً دے دی گئی ہے اور اس طرح ملکی نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک متوازی غیر ملکی نظام تعلیم کو بھی حکومت کی تائید حاصل ہو گئی ہے۔ مرکزی حکومت کے اس استثنائی فیصلے نے تعلیم کے میدان میں جس متضاد رویے کو جنم دیا ہے اسے اردو ذریعۂ تدریس کے حق میں تصور کرانا سوائے خودفریبی کے اور کچھ نہیں۔ زبانوں کی تدریس کا مسئلہ ہمارے ملک میں خاصا الجھا ہوا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو صوبائی سطح پر اس طرح حل کیا جائے کہ نہ تو انگریزی زبان کی طرف توجہ میں کوئی کمی واقع ہو اور نہ علاقائی زبانوں میں کسی قسم کی محرومی کا احساس پیدا ہو۔ مرکزی حکومت کی دخل اندازی اور بے جا دباؤ زبانوں کے سلسلے میں ابہام و تفہیم کی صورت کو سوائے خراب کرنے کے کوئی مثبت خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ لڑائی زبانوں کے درمیان نہیں ہوتی، بلکہ ان متصادم مفادات اور احساس محرومی کی بناء پر ہوتی ہے جو لوگوں کو مختلف لسانی گروہوں میں بٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جب اس قسم کی صورت حال عام ہوتی ہے تو مختلف صوبوں میں مراعات یافتہ طبقے اپنے مفادات کے تحفظ اور عوامی تائید حاصل کرنے

کے لیے زبان کا سہارا لیتے ہیں اور لوگوں کے درمیان تمدنی منافرت کو پیدا کرنے کے ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں مختلف صوبے لسانی نزاعات کا شکار رہے ہیں اور اس قسم کے تنازعات سے سوائے زمینداروں، وڈیروں، جاگیرداروں اور حکومت کے ارباب حل وعقد کے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اسلام کی خدمت کی طرح اردو زبان کی خدمت کا بھی ہر حکومت نے دعویٰ کیا ہے لیکن جو کچھ کیا گیا اس کا آخری نتیجہ ہمیشہ تمدنی عناد اور اشتعال انگیزی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اردو زبان کو جو پاکستان کی تخلیق سے پہلے ان علاقوں کے ہر فرد کے دل کی آرزو تھی ہر طرح مطعون کیا گیا، کوئی اسے طوائفوں کی زبان کہتا ہے اور کوئی اس زبان کا روزہ رکھ کر اپنے کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی عوامی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اردو زبان پاکستان کے تمام صوبوں اور عوام کی ضرورت ہے۔ خود اس زبان کو پاکستان کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پاکستان کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ زبان ہندوستان کے ایسے علاقے میں بھی پھل پھول رہی ہے جہاں حکومت کی کسی قسم کی تائید بھی اس کو حاصل نہیں اور یہ یقینی بات ہے کہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پاکستان میں بھی اس کو نہ تو مرکزی حکومت کی کھوکھلی تائید کی ضرورت ہے اور نہ علاقائی مفاد پرستوں کے الزامات کی۔ اس زبان کی جڑیں پاکستان کے عوام میں پیوست ہیں اس کی کسی صوبائی زبان سے کوئی لڑائی نہیں اور یہ کسی طرح پاکستانی عوام میں عدم مساوات اور احساس محرومی کی ذمہ دار نہیں۔ تمام صوبائی زبانیں بشمول اردو ایک دوسرے کی بہنیں ہیں اور ان کا تمدنی اور ثقافتی ماخذ یکساں اور ایک ہے۔ حکومت کو جو اصل فیصلہ تعلیم کے بارے میں کرنا ہے وہ لسانی نہیں ہے بلکہ معاشی اور طبقہ داری ہے۔ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ آیا تعلیم طبقہ داری مراعات کی آبیاری کا ذریعہ بنے گی یا یہ اس ملک میں جمہوری انداز میں اور عوامی مزاج کے ساتھ پروان چڑھے گی۔ اگر تعلیم کا مطلب جمہوری مواقع کا فروغ ہے اگر تعلیم ملک میں مواقع کی مساوات کو عام کرنے کا عمل ہے تو زبان کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا اور اردو زبان کو لوگوں کی محرومیوں کا آلہ کار بننے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

تعلیمی معاملات میں مرکزی حکومت کی بڑھتی ہوئی دخل اندازی، تعلیم کے لیے ایک خطرناک رجحان کی نشاندہی کرتی ہے یہ محض صوبائی اختیارات کی پامالی ہی نہیں بلکہ صوبائی اور مقامی سطح پر مختلف غیر ضروری الجھنوں کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اچھی تعلیم کی منطق عدم مرکزیت ہوتی ہے، تعلیم کا کام کرنے والوں کو جتنی زیادہ آزادی اور خودمختاری حاصل ہوگی تعلیم کا کام زیادہ اچھا ہوگا۔ ہمارے یہاں محض مرکزی حکومت ہی نے نہیں بلکہ صوبائی حکومت نے بھی تعلیم کو اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ نجی اقدامی صلاحیت کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تعلیم کو قومیانے کا تلخ تجربہ یہ ملک کر چکا ہے اور اسی کے پیش نظر حکومت نے نجی تعلیمی اداروں کے قیام کے سلسلے میں ہر قسم کے وعدے وعید کیے ہیں لیکن اس کے باوجود تعلیم پر حکومت کی گرفت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ اگر صرف ضابطوں کی گرفت ہوتی، اگر کاروباری مفادات کی گرفت ہوتی تو اس میں کوئی ایسی نامناسب بات نہ تھی لیکن یہ گرفت تو حکومت کی بدعنوانیوں کی گرفت ہے، رشوت ستانی اور بے جا دباؤ کی گرفت ہے۔ ایسی گرفت ہے جو شہریوں کے اس بنیادی حق کو سلب کرتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے بچوں کو تعلیم دے سکیں۔ وہ ذمہ دار شہریوں کی طرح حکومت کے کام میں ہاتھ بٹا سکیں اور تعلیم کے چیلنج کو آزاد ملک کے جمہوری اقدار میں یقین رکھنے والے باشندوں کی طرح قبول کر سکیں۔ چنانچہ کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ تعلیم میں عدم مرکزیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ تعلیم محض ایک افسر شاہی محکمہ بننے کے ایک زندہ عمل کی حیثیت اختیار کر سکے اور حقیقی معنوں میں روشنی کی ترویج کا ذریعہ بن سکے۔ تعلیم کی موجودہ صورت حال جس میں حکومت کے افسران اپنی من مانی کرتے ہیں اور ان پر کسی قسم کی جواب دہی کی ذمہ داری نہیں، انتہائی تشویشناک ہے اور اگر حالات یہی رہے تو ملک کے تعلیمی نظام کے لیے سوائے تباہی کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ کراچی)

قصور میں اردو کے فروغ کے لئے کمیٹیاں قائم کر دی گئیں

قصور (نامہ نگار) ضلع قصور میں اردو زبان کے فروغ اور ترقی و ترویج کے مختلف دفاتر میں اب تک ہونے والے کام کا جائزہ لینے کے لئے ضلع میں دو سرکاری کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جو تحصیل قصور اور چونیاں کے مختلف دفاتر کا دورہ کر کے اس سلسلے میں اب تک ہونے والے کام و دیگر ضروری اقدامات کے بارے میں اپنی سفارشات مرتب کریں گی تاکہ دفاتر میں بتدریج انگریزی کی بجائے اردو کو رائج کیا جائے۔ اس بات کا فیصلہ اسسٹنٹ کمشنر قصور ملک سمیع اللہ عابد کی صدارت میں ہونے والے ضلعی مجلس زبان دفتری کے اجلاس کے دوران کیا گیا۔ اجلاس کو بتایا گیا کہ ڈی سی آفس اور اے سی چونیاں کے دفتر کے ۱۹ اہلکاروں کے داخلے دفتری اردو کورس کے لئے اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کو بھجوائے جا چکے ہیں اور دیگر سرکاری دفاتر کو بھی اس سلسلے میں ہدایت جاری کی جا چکی ہیں تاکہ وہ بھی اپنے اہلکاروں کے نام دفتری اردو کورس کے لئے بھجوا سکیں۔

مشرق لاہور ۱۰ جولائی [illegible]

مدیر تکبیر

اس فیصلے کی مزاحمت کیجئے

مرکز تحقیق و ترقیٔ نصاب محکمہ تعلیم حکومت پنجاب نے کالجوں کے سربراہوں کا ایک اجلاس ۲۳ دسمبر کو طلب کیا جس کا مقصد ۱۸ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو کوئٹہ میں ہونے والی وزرائے تعلیم کی نویں بین الصوبائی کانفرنس کے اس فیصلے پر غور کرنا تھا جس کے تحت انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو، اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کے مضامین کی لازمی حیثیت ختم کر کے انہیں اختیاری مضامین بنانا اور ان کی جگہ ریاضی اور انگریزی کو لازمی مضامین کی حیثیت دینا ہے۔

اس اجلاس کے اطلاع نامے کے ساتھ وزرائے تعلیم کی بین الصوبائی کانفرنس کی رُوئیداد کے متعلقہ حصے کی نقل بھی منسلک کی گئی جس سے اس فیصلے کے ذہنی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے کا تیسرا نکتہ جماعت یازدہم اور دوازدہم (انٹرمیڈیٹ) کے لیے نئے نصاب کا اجرا تھا۔ اس ضمن میں جماعت یازدہم و دوازدہم کے لیے نئے نصاب کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اجلاس میں بتایا گیا کہ لازمی مضامین والے حصے کا زور ان مضامین کے کل ۵۰۰ نمبروں کو گھٹا کر ۳۰۰ کر کے کم کیا گیا ہے اور سائنس گروپ میں ریاضی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کر دیا گیا ہے اور موجودہ میڈیکل اور انجینئرنگ گروپ والا امتیاز جو ریاضی کی عدم موجودگی کے باعث تھا ختم کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ ریاضی رشماریات رکمپیوٹر سائنس کے مطالعے کو لازمی مضمون کی حیثیت سے کامرس، ہوم اکنامکس اور آرٹس کے تمام شعبوں میں لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ وفاقی سیکرٹری تعلیم نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا سچی بات یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں ایسے مضامین پر زور رہے جو براہ راست نہ تو بار آور productive ہیں اور نہ ان سے روزگار کے حصول میں کوئی مدد ملتی ہے۔ مزید برآں ریاضی کی تربیت اب بہت ضروری ہو گئی ہے کیونکہ تمام اساسی اور عمرانی علوم میں تجزیئے کے وسیلے کے طور پر اس کا استعمال روز بروز فروغ پذیر ہے۔ پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے اردو، مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کی تدریس کو اختیاری مضامین کی حیثیت سے جاری رہنا چاہیئے اور ریاضی کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر لازمی کر دیا جانا چاہیئے۔ ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد سیکرٹری تعلیم نے یہ بھی کہا کہ یہ خاصی مشکل تجویز ہے کیونکہ اردو، مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کے اساتذہ کی طرف سے اس پر کڑی تنقید ہو گی کیونکہ ان کے روزگار کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ انتباہ بھی کیا کہ سیاسی سطح پر بھی اس فیصلے کا دفاع دشوار ہو گا۔ تاہم یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ایک ایسی دنیا کے لیے تیار کریں جس میں بہت تیزی سے ٹیکنالوجی کا انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ اجلاس نے صمیم قلب کے ساتھ اس تجویز کی حمایت کی اور محسوس کیا کہ وسیع تر قومی ترقی کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ریاضی کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے اور اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ صوبے اردو، مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کو اختیاری مضامین کے طور پر قرار رکھنے اور انگریزی اور ریاضی کو لازمی مضامین کی حیثیت سے اختیار کرنے کی تجویز کا جائزہ لیں۔

ہم نے وزرائے تعلیم کی بین الصوبائی کانفرنس کے اجلاس کی رُوئیداد کا متعلقہ حصہ تفصیل سے اس لیے پیش کیا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ انتظامیہ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس پوری رُوئیداد کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قوم کی تقدیر اور اس کے سود و بہبود کے تمام فیصلوں کا حق اور اختیار انتظامیہ بلا شرکت غیرے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے، اپنی سوچ اور فکر کو وہ قومی سوچ اور فکر کے نام پر سرکاری فیصلوں میں ڈھال کر اسے پوری قوم پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ بین الصوبائی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کرانے کا مطلب یہ ہے کہ وزیروں کو ان کے فیصلوں پر انگوٹھے لگانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ان کو معلوم ہے کہ اساتذہ جو ہمارے دانشور طبقے کا نہایت وقیع اور اہم حصہ ہیں اس کے فیصلوں کی مزاحمت و مخالفت کر سکتے ہیں اسے یہ بھی احساس ہے کہ سیاسی یا بالفاظِ دیگر عوام کی سطح پر بھی یہ فیصلے ناقابل قبول ہوں گے اور عوام کے سامنے ان کی قابل قبول توجیہہ پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہو گا یعنی ان فیصلوں کا دفاع مشکل ہو گا مگر بایں ہمہ اپنی سوچ کو وسیع تر ترقیاتی مفاد کا تقاضہ ٹھہرا کر فیصلہ کر ڈالا گیا کہ ہو گا وہی جو ہم چاہیں گے۔

اہل فکر و دانش کی نظر میں وزرائے تعلیم کی بین الصوبائی کانفرنس کا یہ فیصلہ بے حد خطرناک اور قابل مذمت ہی نہیں قابل مزاحمت بھی ہے۔ ہم اس تاثر اور رائے سے پورا اتفاق رکھتے ہیں۔ یہ فیصلہ نہایت بوسیدہ اور سطحی کاروباری فکر و ذہن کا مظہر ہے اور

فیصلہ کرنے والوں کی لاعلمی   کا غماز بھی۔ مثلاً روس، امریکہ، برطانیہ سے بڑھ کر جدید
ترقی یافتہ دنیا کے نمائندہ معاشرے اور ممالک اور کون سے ہوں گے اور ان تمام ممالک اور
معاشروں میں اعلیٰ ترین سطح تک اپنے قومی نظریات، افکار، تاریخ، ثقافت اور زبان کی تعلیم
مطلوبہ استعداد کی حد تک لازمی ہے یہ مطلوبہ استعداد اگر ابتدائی درجوں میں پوری ہو جائے تو
ٹھیک ہے ورنہ تعلیم کے آخری مدارج تک ان کی تعلیم مطلوبہ استعداد کی تکمیل کی خاطر لازمی
رہتی ہے۔

ہمارے ملک سے اسٹیل مل کی تنصیب سے قبل اسٹیل کی صنعت کی ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم
اور تربیت کے لیے جو انجینئر کاریگر اور فنی عملہ روس بھیجا گیا تھا وہ گواہی دے گا کہ ہائی سائنسی
اور ٹیکنالوجی تعلیم کے ساتھ روسی زبان، الحاد انقلاب روس اور تاریخ کی جدلیاتی اور مادی
تعبیر کے مضامین کی تعلیم لازمی ہے۔ یہ سب خالص فکری اور نظریاتی مضامین ہیں ان کا انجینئرنگ
یا ٹیکنالوجی سے کیا تعلق یا ان کا روزگار کے حصول سے کیا واسطہ؟ یا اسلامیات، اردو
اور مطالعۂ پاکستان کے مقابلے میں یہ کس طرح بارآور productive مضامین کہے
جا سکتے ہیں۔ پھر ترقی پسندوں کے سرخیل ملک روس میں یہ مضامین ہر شعبۂ علم کے طالب علم
کے لیے پڑھنا کیوں لازمی ہیں؟ محض اس لیے کہ انھیں محض ایک انجینئر، ڈاکٹر، کاروباری منتظم
بیوروکریٹ ہی پیدا کرنا مطلوب نہیں ہوتا بلکہ ان تمام حیثیتوں میں وہ ہر شخصیت پر روسی
فکر و نظر اور فلسفے کی چھاپ چاہتے ہیں۔

ہمارے ملک سے ہر سال سینکڑوں طلبا اور اساتذہ سرکاری اور غیر سرکاری وظائف
پر یا اپنے وسائل سے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جاتے ہیں ان سے گواہی لی جا سکتی ہے
کہ اگر انگریزی کمزور ہو تو اعلیٰ ترین سطح تک انگریزی کا پڑھنا لازمی رہتا ہے۔ انگریزی
امریکہ کی قومی زبان ہے مگر اس کا مطلوبہ استعداد تک جاننا اور سیکھنا وہ ان طالب علموں
کے لیے بھی لازمی قرار دیتے ہیں جو امریکی قوم کا حصہ نہیں اور بیرون ملک سے امریکہ
پڑھنے آتے ہیں اور واپس اپنے ملکوں میں جا کر شاید انگریزی کا استعمال ان کے لیے لازمی
اور ضروری بھی نہ ہو ان کو بھی وہ انگریزی سے استثنیٰ نہیں دیتے۔ میڈیکل کی تعلیم پائیے
یا انجینئرنگ کی یا علوم عمرانی میں تحقیق کیجیے ہر حال میں انگریزی کی مطلوبہ استعداد کے بغیر
وہ سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ امریکہ میں تعلیم کے لیے داخلے کی یہ
شرط ہوتی ہے کہ ٹوفل (انگریزی) کا امتحان پاس کیا ہو۔ بے شمار غیر ملکی ایسے ہوتے ہیں جو
جیسے تیسے ٹوفل کا امتحان پاس کر کے امریکہ پہنچ جاتے ہیں مگر جب اثنائے تعلیم یہ محسوس
کیا جاتا ہے کہ ان کی انگریزی کمزور ہے تو انھیں وہ سلسلۂ تعلیم منقطع کرا کے جس کے لیے وہ امریکہ
جاتے ہیں پہلے انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے تاکہ ان کی انگریزی کی استعداد مطلوبہ
معیار تک آ جائے۔ اس بارے میں کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ چنانچہ بسا اوقات پی ایچ ڈی
کرنے والے طلبا کو بھی انگریزی لازمی پڑھنی پڑتی ہے۔ پھر یہ بات یہیں تک نہیں کہ
انگریزی آتی ہو بلکہ امریکیوں کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی آنی چاہیے جو امریکہ میں بولی
اور لکھی جاتی ہے۔ کینیڈین، برطانوی یا آسٹریلوی انگریزی کو وہ قبول نہیں کرتے۔ گویا زبان کا
محض functional knowledge کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کی اپنی زبان
پر مکمل عبور کا حصول لازمی ہے۔ زبان کے علاوہ اعلیٰ ترین سطح تک امریکہ میں تعلیم پاتے
ہوئے امریکی کلچر، زبان، ادب اور تاریخ کا کوئی ایک کورس لازمی طور پر پڑھنا ہوتا
ہے خواہ آپ کا میدانِ علم کچھ بھی ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ انھیں بھی محض کورا انجینئر
ڈاکٹر، ٹیکنیشن، منتظم، استاد، محقق یا بیوروکریٹ پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان تمام
حیثیتوں میں وہ امریکی معاشرت، مزاج اور فکر کی چھاپ چاہتے ہیں تاکہ ان تمام حیثیتوں
سے قابلِ شناخت رہے۔

یہی صورت جرمنی، فرانس، برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی ہے۔ مگر جدید
دنیا کے ان تقاضوں سے بے خبر   اردو، مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات
کے لازمی مطالعے کو فضول، غیر بارآور unproductive سمجھ کر نصاب سے
ان کی لازمی حیثیت کو ختم کرنا چاہتا ہے

جس کے لیے ہمیں مذمت کا لفظ بھی ناکافی محسوس ہوتا ہے۔

انٹرمیڈیٹ تو ذہنی اور فکری ساخت کے ابتدائی مرحلے کی سطح ہے۔ اس سطح پر
سے اسلامیات، اردو اور مطالعۂ پاکستان کی لازمی تدریس ختم کر دینے کا مقصد یہ ہوگا کہ
ہم ایک ایسی جدید تعلیم یافتہ نسل تیار کریں گے جو پاکستانی فکر و مزاج سے مبرا ایسی نسل
ہوگی جو مسلمان یا پاکستانی کی شناخت سے محروم ہوگی۔   ایک ایسی جدید
تعلیم یافتہ نسل پیدا کرنا چاہتا ہے جس کی کوئی بنیادی فکر نہ ہو، کوئی مزاج نہ ہو، کوئی شناخت
نہ ہو محض کورے علم کے ساتھ روزگار کے حصول کی استعداد
رکھتی ہو اور بس تاکہ بھاڑے کے
کارکن کے طور پر کسی بھی معاشرے اور ملک میں ایک مشینی پرزے کے طور پر کام کر سکے۔
کیا پاکستانی قوم کا مطمع نظر بھی اپنی نئی نسلوں کی تعمیر و تربیت کے سلسلے میں یہی ہے؟
یہ فیصلہ کرنا قوم کا حق ہے۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور دین اساس ریاست اور پاکستان ہم سب کا مستقبل، یہ تینوں چیزیں بنیادی ہیں ان تینوں بنیادوں سے نئی نسل کو بے خبر، بے علم اور محروم کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اسے ایک نظریاتی مملکت کی آئندہ نسل کی تخریب کی سازش نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کی تدریس کو اختیاری کر کے اور دو سو سال تک ہمیں غلام رکھنے والے آقاؤں کی زبان انگریزی کو جو ہمارے دستور میں محض ایک عبوری اور عارضی حیثیت رکھتی ہے اور قومی زبان کا مستقبل متبادل نہیں، لازمی قرار دینا پاکستانی تشخص کو مسخ کرکے آقاؤں کے قالب میں ڈھلی ہوئی نسل پیدا کرنا کس درجے کی حب الوطنی ہے۔

ہم تمام اہل وطن سے بالعموم اور علما طلبا اور اساتذہ سے بالخصوص اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی اگلی نسلوں کے پاکستانی اور ملی تشخص کی بقا اور تحفظ کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کریں۔ اس فیصلے کی پوری شدت سے مزاحمت کریں اور یہ باور کرا دیں کہ قوم کی تقدیر کے بارے میں فیصلوں کا حق قوم کے نمائندوں کا ہے، ملازمانِ سرکار نہیں

(بشکریہ ہفت روزہ تکبیر کراچی)

علاقائی زبانوں سے اُردو کا رابطہ مضبوط ہو رہا ہے؟

زبان کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کر کے صوبائی نفرت پھیلائی جارہی ہے: ڈاکٹر وحید قریشی

اسلام آباد (مدثر نگار) [illegible] اعلیٰ تخلیقات پر دیئے جانے والے ادبی انعامات سے نہ صرف تخلیق ادب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ دوسرے قلمکاروں کو بھی دل لگا کر کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہ باتیں اکادمی ادبیات کے چیئرمین پروفیسر پریشان خٹک نے ڈاکٹر وحید قریشی کو طفیل ایوارڈ ملنے پر ادبی بیٹھک کی طرف سے منعقد ہونے والی ایک مخصوص نشست میں صدارتی تقریر کے دوران کہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے بتایا کہ تخلیقات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مقتدرہ کے صدر نشین کی حیثیت سے قومی زبان کیلئے جو کام کیا ہے وہ ان کے خلوص محنت دیانت اور مشنری جذبے کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ دفتری اور نصابی ضروریات پوری کرنے کیلئے اردو میں متعلقہ مواد کی کمی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ابتدائیہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اب تک سرکاری و غیر سرکاری سطح پر یہ پہلا انعام ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کو ملا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل ہر ادبی انعام میں انہیں منصف کے فرائض سونپ دیئے جاتے تھے۔ غضنفر مہدی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ طفیل ایوارڈ ایک اعلیٰ ادبی انعام ہے اور اس کیلئے ڈاکٹر وحید قریشی کا چناؤ حق بحقدار رسید کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر بشیر گورایہ نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر وحید کی تنقیدی، تخلیقی اور علمی کتابوں کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی ہیں۔ اختر امان نے کہا کہ طفیل ایوارڈ ڈاکٹر صاحب کی علمی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف [illegible] کے انعام سے بالاتر ہے۔ تقریب سے میاں نذیر اختر، سرفراز شاہد اور انصار الحق کے علاوہ پروین شریف کنجاہ نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ مقتدرہ میں رہ کر وہ نوکری نہیں کر رہے بلکہ ایک مشن پورا کر رہے ہیں۔ اور ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ اردو جلد از جلد قومی زبان کے طور پر نافذ ہو جائے تاکہ ملک میں موجود صلاحیت کو قومی ترقی کیلئے پوری طرح بروئے کار لایا جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ علاقائی زبانوں سے اردو کا رابطہ روز بروز مضبوط ہو رہا ہے۔ اور یہ رابطہ جتنا بڑھے گا اتنا ہی ملک و قوم کیلئے فائدہ مند ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں بعض لوگ زبان کو بھی سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہیں جس سے صوبائی منافرت اور انتشار کی فضا پیدا ہو رہی ہے حالانکہ زبان انتشار کا نہیں بلکہ وحدت کا ذریعہ ہوتی ہے یہ خود کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ بیماری کی علامت ہے۔ اصل بیماری سیاسی و معاشرتی حقوق سے تعلق رکھتی ہے اور محروم طبقہ اس مسئلے پر ہمیشہ نالاں رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اصل بیماری کا علاج کیا جائے۔ اس مخصوص نشست میں علی اکبر عباس، ڈاکٹر مہر عبدالحق، عبدالوحید، [illegible] محمد طارق درانی، ڈاکٹر اعجاز راہی، فریدہ حفیظ، نصیر اعظم، سید ضمیر جعفری، سعد ہمدانی، خالد اقبال یاسر، انور مسعود، الطاف پرواز اور طارق شاہد کے علاوہ دیگر کئی مقامی ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

روزنامہ جنگ پنڈی ۱۷ جولائی ۸۸ء

(۲۴)

پروفیسر حسنین کاظمی

ذریعہ تعلیم کا تنازع پھر سامنے آیا

دورِ غلامی میں آزادی ایک خواہش ہوتی ہے، ایک جذبہ ہوتا ہے، ایک مقصد ہوتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جد وجہد کی راہ اختیار کی جاتی ہے اور قربانیاں دی جاتی ہیں۔ یہ راہ بلاشبہ بڑی صبر آزما ہوتی ہے اور اس راہ کی کامیابی قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتی ہے، تاریخ ساز بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تاریخ ساز کامیابی کا حصول قوموں کے لیے ایک نئے انداز کی آزمائشوں اور ذمہ داریوں کے احساس کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ آزادی اور احساس ذمہ داری لازم و ملزوم ہیں اور اگر احساس ذمہ داری نہ ہو تو آزادی اور لاقانونیت میں کوئی حد فاصل قائم رکھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

آزادی ایک انداز شعور کا نام ہے اور قوموں میں عموماً شعور کی بیداری علم اور قیادت سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ذہنوں میں آزادی کا وہی تصور پیدا ہوتا ہے جو علم کے وسیلے سے ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ہماری معاشرتی زندگی میں آزادی کا وہی انداز کارفرما ہو جاتا ہے جو انداز اہم اور فعال شعبوں کی قیادت اختیار کر لیتی ہے۔ برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہم بحیثیت مسلمان اپنے لیے ایک آزاد اور خود مختار خطہ ارض حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہو گیا تھا کہ ہمارا ایک اجتماعی تشخص ہے اور ہم وہ سارا ساز و سامان رکھتے ہیں جو علمی، فکری اور تاریخی اعتبار سے ایک قومی وجود کے لیے ضروری ہے۔ آزادی کے بعد اس شعور کو بیدار تر کرنے اور اسے آزادی کے ذمہ دارانہ تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ہم پوری نہ کر سکے۔

آزاد زندگی کے تقاضوں کی تفہیم اور ان کے مطابق اپنے اعمال کی ترتیب کرنے میں نظام تعلیم اور ذریعہ تعلیم کا کردار بہت اہم ہوتا ہے پاکستان میں اردو کو قومی زبان کے ساتھ سرکاری زبان کے طور پر قبول کر لینے اور اسے ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر لینے کی بات جو کی جاتی ہے اس میں یہی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں لیکن ہماری یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ اردو کے نفاذ کے سلسلے میں کبھی حکومت کی طرف سے اور کبھی مفاد پرست طبقے کی طرف سے ایسی روش اختیار کر لی جاتی ہے کہ اصل مقصد کا حصول قریب ہونے کے بجائے کچھ اور دور ہو جاتا ہے۔

پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں اردو کی اہمیت بہرحال ناقابل تردید ہے۔ برصغیر میں پہلے بھی مختلف علاقے اور علاقائی زبانیں تھیں۔ آزادی اور تعلیم کے بعد بھی یہ مختلف علاقے اور زبانیں موجود تھیں اور یہ زبانیں آئندہ بھی موجود رہیں گی اور ترقی کرتی رہیں گی۔ ایک زبان کی حیثیت سے اردو کا علاقائی زبانوں سے کوئی بھی تنازعہ نہ پہلے تھا، نہ اب ہے، نہ آئندہ ہو گا۔ یہ تنازع ان لوگوں کی جانب سے پیدا کیا جاتا ہے جو چاہتے ہیں کہ قومی زندگی میں اس انداز کے تنازعات پیدا کر کے وہ انگریزی کی بالادستی قائم رکھیں تاکہ انگریزی کے سہارے سے مراعات یافتہ افراد ان مراعات کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے مخصوص رکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔

حصول آزادی سے قبل اصل تنازع جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پیدا ہوا یہ تھا کہ برصغیر میں رابطے کی زبان کون سی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت تھی اور اس بنا پر انگریزی زبان کو ایک خاص برتری حاصل تھی اور برطانوی حکومت ایک قانون یا ایک فرمان شاہی کے ذریعے اردو اور ہندی کے بجائے انگریزی کو پورے برصغیر کے رابطے کی زبان قرار دے سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں اور ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ انگریز بہرحال اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ انگریزی کو سرکاری اور اعلیٰ تعلیمی زبان تو بنا سکتے تھے لیکن اسے پورے برصغیر کی قومی زبان یا رابطے کی زبان بنانا ممکن نہ تھا۔

اردو اور ہندی کا تنازعہ جب شروع ہوا وہ برصغیر میں موجود دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب، روایات، افکار اور انداز فکر کے فرق کی بنا پر تھا۔ اردو برصغیر میں رابطے کی زبان بھی تھی اور مسلمانوں کے تشخص کی امین بھی تھی۔ ہندو قیادت اردو کو مسلمانوں کے دور اقتدار کی یادگار قرار دیتی تھی اور اسی بنا پر اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ اردو ہندی تنازعہ نے قیام پاکستان میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے سلسلے میں قائد اعظم کے رویے اور فیصلے کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری

ہے. قائداعظم کی قیادت کی صفات یہی تھیں کہ وہ جذباتی نہیں تھے، اصول پسند تھے، مصلحت پسند نہیں تھے، ان کے فکر و عمل کی بنیاد اخلاص، یقین اور دور بینی پر ہوتی تھی، وہ دکھاوے کی قیادت اور قول و عمل میں تضاد کے قائل نہیں تھے۔ ان کی اپنی مادری زبان اردو نہیں تھی اور انگریزی تحریر و تقریر پر ان کو پوری طرح قدرت حاصل تھی لیکن انہوں نے یہ چاہا کہ اردو کو پاکستان میں قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کیا جائے. قائداعظم اور خان لیاقت علی خان کے بعد اردو اور بنگالی کو ایک دوسرے کے مقابل کیوں لایا گیا، کون لایا اور اس میں اردو کے حامیوں کی غلطیوں اور جذباتی رویوں سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں اس وقت اس موضوع پر گفتگو نہیں کی جاسکتی بلکہ اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ انگریزی کی بین الاقوامی اور اعلیٰ تحقیقی اور علمی سطح کی اہمیت سے پوری واقفیت کے باوجود اور پاکستان کی علاقائی ساخت، علاقائی لوگوں کے مزاج اور علاقائی زبانوں کی اپنی اپنی جگہ پوری اہمیت کے اعتراف کے باوصف قائداعظم نے یہ چاہا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بن جائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی کسی بھی علاقائی زبان سے اردو کا کوئی تنازعہ نہ پہلے کبھی تھا، نہ اب ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔

برطانوی دور میں بھی اردو ہندی تنازعہ کسی علاقائی بنیاد پر نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ پورے برصغیر میں ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے ہوا تھا۔ برصغیر آزاد ہوا اور پاکستان بنا لیکن اگر پاکستان نہ بنتا تو بھی اردو ہندی تنازعہ قائم رہتا کیونکہ ہندو قیادت اردو کو اس لیے ناپسند نہیں کرتی تھی کہ اسے انگریزی زبان پسند تھی بلکہ اس کی وجہ ان کے ذہنی تعصب کی بنیادوں میں تھی۔ چنانچہ آزاد بھارت میں ہندو قیادت نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ہندی کو قومی زبان بنا دیا۔ علاقائی زبانیں بھارت میں پاکستان سے زیادہ ہیں اور جنوبی ہند کی جانب سے اس کی بوجوہ شدید مخالفت بھی ہوئی لیکن فیصلہ بہرحال کیا گیا اور قائم رکھا گیا۔ کیونکہ اس فیصلے میں بھارت کے مستقبل کی بہتری شامل تھی۔ پاکستان اگر نہ بنتا تو ان تمام علاقوں میں بھی ہندی کو پورے برصغیر کی قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کیا جاتا جہاں ہم اردو کو قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے نیم دلی کے ساتھ نافذ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اصل بات اردو اور علاقائی زبانوں کی نہیں بلکہ اردو اور انگریزی کی ہے۔ کیا ہم پاکستان میں انگریزی کو رابطے کی زبان بنا سکتے ہیں؟ پاکستان میں جو علاقائی زبانیں ہیں وہ سب اہم ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی پورے پاکستان کے لیے رابطے کی زبان نہیں بن سکتی. اردو کا کسی علاقائی زبان سے کسی نوعیت کا کوئی تصادم نہیں کیونکہ ہر علاقے میں یہ سمجھی جاتی ہے، اس میں ہر علاقے کے روزمرہ کے الفاظ شامل ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور اس طرح مختلف علاقائی زبانیں بھی ایک دوسرے کے زیادہ قریب آسکیں گی۔ بات صرف یہ ہے کہ انگریزی کی بالادستی کو پاکستان میں چیلنج کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اب جبکہ ایک مرتبہ پھر یہ بات سامنے آرہی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم بنے، ایک مرتبہ پھر یہ کوششیں شروع ہوگئی ہیں کہ اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کردیا جائے اور اس طرح ایک مرتبہ پھر مزید چند برسوں کے لیے انگریزی زبان کو ہمارے کاروبارِ زندگی میں اور ہمارے ذہنوں پر بالادستی قائم رکھنے کا موقع مل جائے ... مراعات یافتہ جو ہیں ان کی حیثیت کسی امکانی خطرے سے دوچار رہے۔ کہا جاتا ہے کہ

۱۔ اگر اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان بنایا گیا تو ہم تمام اعلیٰ علوم سے محروم ہوجائیں گے اور ساری تحقیقات رک جائیں گی۔

۲۔ ساری دنیا سے ہمارا رابطہ ٹوٹ جائے گا۔

۳۔ ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے ہماری ترقی کی رفتار بہت سست ہوجائے گی۔

۴۔ علاقائی زبانیں بولنے والے خسارے میں رہیں گے۔

جب بھی اردو کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے تو ایسے ہی جواز تلاش کرکے اس کے نفاذ کی راہ روکی جاتی ہے اور اس سے بطور مجموعی فائدے بہت مختصر سی تعداد کو حاصل ہوتے ہیں جبکہ نقصانات پورے ملک کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض سوال جو سامنے آتے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ انگریزی اہلِ برطانیہ کی زبان ہے لیکن کیا محض اس زبان کی وجہ سے آج کا برطانیہ دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے؟ اور کیا وہ قومیں جو انگریزی سے واقف نہیں، ترقی کی راہ پر بالکل آگے نہیں بڑھیں؟

۲۔ ہمارے ملک کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں انگلش میڈیم سکول قائم ہیں کیا ان اسکولوں کی وجہ سے ہمارے معیارِ علم اور ہماری ترقی کی رفتار پر واضح مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

۳۔ کیا ہمارے ملک کا ہر تعلیم یافتہ ایسے اعلیٰ علمی اور تحقیقی مراحل سے گزر رہا ہے کہ اس کے لیے انگریزی کا علم ناگزیر ہے؟

۴۔ ہمارے شہری اور دیہی زندگی کے کتنے پہلو ایسے ہیں جن میں انگریزی کے علم کے بغیر ہم نظم و ضبط برقرار نہیں رکھ سکتے؟

۵۔ کیا دنیا کے کسی بھی آزاد ملک میں انگریزی کے اتنے سائن بورڈ اور مصنوعات کے اتنے نام انگریزی میں نظر آتے ہیں جتنے پاکستان میں نظر آتے ہیں؟

۶۔ ہمارے ہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جہاں انگریزی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والا بچہ

صرف انگریزی ہی سنتا اور بولتا ہو اور جہاں اردو یا کسی بھی علاقائی زبان کا استعمال ممنوع ہو؟

۷۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان انگریزی رکھنے کا کیا جواز ہے جبکہ ان سے رابطہ ملک کے ان عوام کا ہوتا ہے جن میں صرف ۲۷ فیصد خواندہ ہیں اور انگریزی جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے؟

۸۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انگریزی کی صورت میں سرکاری اور تجارتی دفتروں میں عوام سے دوری کی ایک بڑی وجہ ابھی موجود ہے؟

۹۔ کیا دنیا میں آج تک کوئی ایسا تجربہ ہوا ہے کہ نو کروڑ کے ایک ملک کو کسی غیر ملکی زبان کے وسیلے سے تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ بنا دیا گیا ہو؟

یہ سوالات ہمارے لیے غور طلب ہیں ان پر ہمیں پوری سنجیدگی سے غور کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ پورے ملک کے مستقبل کا ہے اور پورے ملک کے مستقبل کی بہتری کو چند افراد یا مراعات یافتہ طبقے کے مفادات کے تحت نظر انداز کرنا کوئی مستحسن عمل نہیں سمجھا جا سکتا ہمارے ملک میں مختلف طبقے، مختلف انداز کی مراعات کے حامل چلے آ رہے ہیں ان میں بہت سی مراعات برطانوی دور کی یادگار ہیں اور ان کو برقرار رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے اجتماعی مفاد کو نظر انداز کیا جائے۔ یہ روش قومی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہے نہ اخلاقی اعتبار سے۔ اس روش میں تبدیلی کی ضرورت ہے اسے تبدیل ہو جانا چاہیے۔

انگریزی بلاشبہ ایک بین الاقوامی زبان ہے، ایک بڑی علمی زبان ہے لیکن بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں کے رہنے والوں نے انگریزی کی برتری کو اپنے دل اور دماغ پر مسلط نہیں کیا حالانکہ وہ حسب ضرورت انگریزی سے فائدے حاصل کر لیتے ہیں۔ مجھے جو خیال ہے وہ یہی ہے کہ ہم انگریزی کو علمی نقطہ نظر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ برتری کی علامت کے طور پر حاصل کرتے ہیں اور اسی لیے انگلش میڈیم اسکول بڑی حد تک ہمارے شہروں میں ایک بڑے نفع بخش کاروبار کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ انگریزی میڈیم اسکولوں میں بچے بڑی تعداد میں علم حاصل نہیں کر پاتے، صرف اپنی یادداشت کی بنا پر کامیابی حاصل کر لیتے ہیں یہ بچوں کے ذہن پر اور ان کی صلاحیتوں پر بڑا بوجھ ہے۔ یہ ان پر ایک طرح کا ظلم ہے جو ہم نادانی ہی میں سہی لیکن کر رہے ہیں۔

انگریزی کی ناروا حمایت کرنے والے بعض لوگ بہت اخلاص کے ساتھ زور بیان اور زور تحریر سے کام لیتے ہیں۔ وہ لوگ پوری دیانتداری سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ انگریزی کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا لیکن انہیں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ہر ملک کی اپنی زبان اور اپنا انداز فکر اس کی پہچان ہوتے ہیں۔ ہم انفرادی طور پر انگریزی کے ذریعے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لیں اور تحقیق کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لیں لیکن ملکی اعتبار سے پاکستان کی ترقی اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کی ترقی سے ہی وابستہ ہے اور یہ ترقی اسی وقت ممکن ہے جب علاقوں میں علاقائی اور ملک میں قومی زبان اختیار کر لی جائے۔

پاکستان میں ابتدائی تعلیم عام طور پر مادری زبان میں اور ثانوی اور ڈگری تک کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیے۔ اس درمیان انگریزی بطور ایک زبان سیکھنی چاہیے۔ اس طرح حقیقی علمی استعداد کے ساتھ انگریزی زبان پر عبور نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ اس طرح علاقائی زبانوں اور قومی زبان کی ترقی کے ساتھ ہمارے علم کی استعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انگریزی تعلیم کے لیے کسی ادارے کو کوئی استثنیٰ نہ ملے۔ اس استثنیٰ کی روش نے ہمارے ملک میں طبقاتی تقسیم کو بہت واضح کر دیا ہے اور آزادی کے حصول کے باوجود آزادی کی فضا پوری طرح ابھی قائم نہیں ہو سکی ہے۔ انگریزی کو بطور علم حاصل کرنا بہت اچھا اور بہت مفید ہو سکتا ہے لیکن اس کو برتری اور تفوق کی علامت سمجھ کر حاصل کرنے سے ہمارے مقصد آزادی کی نفی ہو جاتی ہے۔ آزادی نام ہے بے خوفی اور مساوات اور رواداری کی فضا کا، انگریزی کی اس انداز کی بالادستی سے جیسی ہم نے اب تک بڑے اہتمام سے قائم کر رکھی ہے، یہ بے خوفی، رواداری اور مساوات کی فضا قائم نہ ہو سکے گی۔

آزادی کا حصول ایک دو نسلوں کا نہیں صدیوں کی زندگی کا سودا ہے۔ ہماری چند نسلوں نے آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ چند افراد اور چند گروہ اگر اپنے محدود مفادات آزادی کے استحکام کے لیے قربان کر دیں تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے آزادی اجتماعی تہذیب، اجتماعی تربیت اور اجتماعی نظم و ضبط سے عبارت ہوتی ہے اور انسانی قدروں کی تو اپنی کوئی زبان نہیں لیکن ان قدروں کے شعور کو بیدار کرنے اور اسے زندہ رکھنے کے لیے علم اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے اور پاکستان میں اجتماعی اعتبار سے یہ خود اعتمادی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہماری علمی اور تعلیمی فضا طبقاتی تقسیم کی زہرناکی سے پاک ہو جائے اور یہ کام اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے متصادم کرنے کی کوششوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس منفی طرز عمل سے ہم وقتی طور پر اپنی جذباتی تسکین یا محدود مفادات تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن کسی علاقائی زبان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ یہ صرف انگریزی کی ناجائز برتری قائم رکھنے کا ایک بہانہ ہے اور اس سے آزادی کے کسی تقاضے کی کوئی تکمیل نہیں ہوتی۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ کراچی)

منور عثمانی

قومی زبان اُردو کے ساتھ ہمارا منفی رویّہ

میرے ایک انگریزی پسند دوست ملک کے ایک بہت بڑے ادیب اور دانشور کو اس لیے بڑا ادیب اور دانشور نہیں مانتے کہ انہوں نے اس دانشور کو کبھی انگریزی بولتے نہیں سُنا۔ ہاں البتہ ہمارے شہر کا ایک نیم پاگل اور مجذوب سا شخص ان کے نزدیک اس لیے "انٹیلکول" ہے کہ وہ ماونٹ بیٹن کے لہجے میں انگریزی بولتا ہے اور یہ اور بات کہ بعض اوقات اس "انٹیلکول" کو کپڑے پہننے کا خیال بھی نہیں رہتا اور وہ سڑکوں پر کھلے بندوں اپنی شخصی آزادی کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ بات محض آپ کو تفنن کی خاطر نہیں سنائی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اب بھی ہمارے اردگرد موجود احساس کمتری میں مبتلا ایسے اشخاص کی کمی نہیں جنہیں اپنے گھر اور اپنے ملک کی ہر شے گھٹیا نظر آتی ہے اور دوسروں کی ہر چیز میں انہیں عظمت و رفعت دکھائی دیتی ہے۔ ویسے اس معاملے میں زیادہ قصور ان لوگوں کا بھی نہیں ہے اصل میں غلام رہنے والی قوموں کا یہی حال ہوتا ہے اور ہماری غلامی کا عرصہ تو ماشاء اللہ سو سال کے قریب ہے اب بھلا پوری ایک صدی غلامی کی بیڑیوں میں پڑی رہنے والی قوم میں کس طرح آزاد قوموں جیسی حمیت اور احساس برتری پیدا ہو سکتا ہے۔

نفسیات والے کہتے ہیں کہ غلام، نوکر اور ملازم ہمیشہ اپنے آقا اور مالک کی ہر چیز، ہر ادا اور ہر نظریے سے مرعوب ہوتا ہے۔ اور وہ اسے اپنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اسی لیے قیام پاکستان کے وقت قوم و ملت کا درد رکھنے والے قائدین اور رہنماؤں نے فیصلہ کیا تھا کہ غلامی کی تمام نشانیوں کو نیست و نابود کر دیں گے اور قوم کو جغرافیائی آزادی دینے کے ساتھ ساتھ فکری اور روحانی آزادی بھی دیں گے۔ یہی سوچ کر دوسرے احسن اقدامات کے ساتھ ساتھ اردو کو قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا لیکن افسوس! یہ مخلص رہنما قیام پاکستان کے بعد زیادہ عرصہ ہم میں نہ رہے اور یوں جو خواب انہوں نے دیکھے تھے تعبیر سے محروم رہے اور آج تک وہ شرمندہ سپنے محروم تعبیر ہی ہیں۔

ہماری حکومتوں، دانشوروں اور سیاسی راہنماؤں کی مہربانیوں اور نوازشوں کے سبب اس نظریاتی مملکت میں آج تک غیروں کا بخشا ہوا قانون، بدیسی زبان، غیر ملکی تہذیب اور درآمد شدہ پالیسیاں تمام شعبہ ہائے زندگی میں اپنی بالادستی قائم کیے ہوئے ہیں اور اپنی زبان، تہذیب، روایات اور اقدار سے سوتیلی ماں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی ملک کی ترقی کی رفتار کو سست کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس پر کوئی غیر ملکی زبان مسلط کر دی جائے۔ آزادی سے پہلے غیر ملکی آقاؤں نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہی کچھ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی میدانوں میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ تو انگریزوں نے اپنے مخصوص مفادات کے لیے کیا تھا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اب ہم خود اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں اور اپنے آپ پر غیر ملکی زبان کا تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ جسے عرفِ عام میں کہتے ہیں "اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا"۔

دنیا میں ہر زندہ قوم اپنی قومی زبان کا احترام و اکرام صدق دل سے کرتی ہے اور تمام شعبہ جات میں اظہار و ابلاغ کے لیے صرف اپنی قومی زبان استعمال کرتی ہے۔ تمام ترقی یافتہ اقوام انگلستان، امریکہ، چین، فرانس، روس اور جاپان نے اپنی قومی زبانوں کو ہی سرکاری، دفتری، تعلیمی، سائنسی غرض ہر شعبے میں رائج کر رکھا ہے اور ان قوموں کی ترقی میں جہاں دوسرے بہت سے عوامل کارفرما ہیں وہاں احترام قومی زبان بھی ایک اہم جزو ہے۔

انگریز قوم جسے ہم اپنا مرشد و پیشوا مانتے ہیں، ان کی پیروی کو اپنے لیے قابل افتخار سمجھتے ہیں اس حد تک اپنی زبان کی محبت میں مبتلا ہے کہ اس نے اس دن کو اپنی ترقی کا پہلا دن قرار دے رکھا ہے جس دن ان کی مقدس مذہبی کتاب "انجیل" کا انگریزی ترجمہ تکمیل کو پہنچا اور انہیں لاطینی زبان سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

ہمارے ملک کے انگریز پسند اور انگریزی پسند طبقے کے لیے یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہو گی کہ ہماری قومی زبان اردو جو ان کے نزدیک کم مایہ اور معمولی زبان ہے اب بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے

اسے "یونیسکو" کے ایک لسانی سروے رپورٹ کے مطابق دنیا میں بولے جانے اور سمجھے
انے کے اعتبار سے اردو زبان تیسرے نمبر پر ہے چینی اور انگریزی زبانیں بالترتیب
پہلے اور تیسرے نمبر پر ہیں چینی زبان کو یہ فوقیت اس لیے حاصل ہوئی کہ چین کی آبادی
نیا میں سب سے زیادہ ہے اور انگریزی زبان کو یہ مقام اس لیے ملا کہ یہ اردو کے مقابلے
یں زیادہ قدیم زبان ہے اس کے علاوہ انگریزی زبان کے پھیلاؤ میں انگریز قوم کی تجارتی
درسیاسی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ انگریز اپنی سلطنت کی توسیع کرتے رہے اور محکوم
قوموں کو اپنی زبان سے کما حقہ تعارف کراتے رہے اور محکوم قوموں کو جب آزادی ملی تو کچھ
نے انگریزی زبان سے پیچھا چھڑا لیا اور باقی قومیں بے حسی اور بے غیرتی لادے رہیں اور
غلامی کی یادگار کے طور پر انگریزی زبان سے چمٹی ہوئی ہیں۔

یہ حقائق جاننے کے لیے چینی اور انگریزی زبان کی برتری پر زیادہ حیرت نہیں ہونی
چاہیئے چونکانے والی بات تو یہ ہے کہ اردو نے دنیا کی تقریباً تین ہزار زبانوں میں کس طرح
تیسرا نمبر حاصل کر لیا؟ جبکہ اسے اپنے گھر میں اپنے ملک میں بھی زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھا
جاتا۔ اسے جس ملک کی ملکہ ہونا چاہیے تھا وہاں اس کا حال باندی جیسا ہے۔ اسے جس قوم
کے ہر فرد کی زبان پر ہونا چاہیے تھا وہاں تو عزت و عظمت کی نشانی انگریزی زبان ہے
اسے جس مملکت کی درسگاہوں، دفتروں اور حکومتی ایوانوں میں سب سے فائق مرتبہ ملنا
چاہیے تھا وہاں اس کے حق کو انگریزی غصب کیے بیٹھی ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو زبان برصغیر پاک و ہند کے علاوہ ملایا، برما، سری لنکا،
نیپال، افغانستان، ایران، بنگلہ دیش اور جنوبی افریقہ کے ساتھ ساتھ سعودی عرب سمیت مشرق
وسطیٰ کے تمام ممالک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے، اپنے ہی ملک میں اس کی ترویج و ترقی کے
لیے حکومت مخلص اور عوام مخلص نہ ہوں۔

کہتے ہیں کہ بائیبل کا ترجمہ دنیا کی سات سو زبانوں میں ہو چکا ہے۔ لیکن جتنا سادہ، شیریں
اور عمدہ ترجمہ اردو زبان میں بائیبل کا ہوا کسی اور زبان میں نہیں ہو سکا۔ ان سب باتوں کے باوجود
اردو کی کم مائیگی کا رونا رو کر اس کے عملی نفاذ سے غفلت برتنے والوں کے متعلق یہی عرض
کیا جا سکتا ہے۔

بس عقل کے اندھوں کو الٹا نظر آتا ہے

ہمارے ملک میں ایسے باشعور روشن ضمیر اور علم دوست افراد کی کمی نہیں ہے جنہیں
حقیقی طور پر معلوم ہو کہ قومی ترقی و استحکام کے صحیح ذرائع کیا ہیں اور خصوصاً تعمیر ملت میں
قومی زبان کا کیا درجہ ہوا کرتا ہے۔ ان دوراندیش شخصیات نے قومی زبان کی اہمیت و
افادیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ ہم نے ان کے فرمودات بھی پس پشت ڈال دیے
ہیں ان بیش بہا ہستیوں نے اردو کو بحیثیت قومی زبان کے قبول کیا اور اس کی ترقی اور
فروغ کے لیے جہد و سعی خود بھی کی اور اس کا پیغام بھی دیا۔ ان درخشاں شخصیات میں قائد اعظم
محمد علی جناحؒ بھی تھے جنہوں نے بارہا اپنی تقاریر میں پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان
اردو کو قرار دیا۔ قائد اعظم کا فرمان ہے:

"میں واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری
زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ ایک مشترک قومی زبان کے بغیر کوئی
قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

قائد اعظم اردو کو تحریک پاکستان کا اہم ترین باب سمجھتے تھے کیونکہ اردو کے باعث
ہی مسلمانوں کو ہندوؤں کی محدود ذہنیت اور تنگ نظری کا علم ہوا۔ گاندھی نے تو صاف
ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اردو کا اس لیے مخالف ہے کہ یہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔
ہندوؤں کی اردو دشمنی سے مسلمانوں اور ان کے راہنماؤں نے اندازہ لگا لیا کہ جو قوم ان
کی بولی کو برداشت نہیں کر سکتی وہ نظام حکومت میں ان کو کیوں کر اپنے برابر جگہ
دے سکے گی۔

قائد اعظم کے علاوہ علامہ اقبال اردو سے بے حد محبت و الفت رکھتے تھے اور
اس کی ترویج و ترقی کے جتنے خواہاں تھے اس سے کوئی بے خبر نہیں۔

اردو سے عقیدت رکھنے والوں میں ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی تھانویؒ
کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا۔ اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت
ہے اور اس میں غفلت کرنا گناہ اور موجب مواخذہ ہے کیونکہ اس زبان میں مسلمانوں
کا تمام اسلامی ذخیرہ موجود ہے تمام دینی کتابیں جو کہ فارسی اور عربی میں تھیں اب ان کا ترجمہ
اردو میں ہو چکا ہے اور اگر خدانخواستہ یہ زبان ضائع ہو گئی تو یہاں کے عوام کے لیے
حصول دین کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہے گا۔

جب بھی اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے آواز اٹھائی جاتی تو یہ کہہ کر
اس آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اردو زبان میں سرکاری اور تعلیمی زبان
بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بات اصل میں ہمارے گہرے احساس کمتری اور ملی
اور قومی بے حسی کا آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہمیشہ کہیں نہ کہیں سرکاری سطح
پر بھی رائج رہی ہے اور اس میں تعلیم و تدریس بھی کوئی نئی بات نہیں۔ ۱۸۴۷ء سے اب تک
اردو زبان غیر منقسم ہندوستان کے مختلف صوبوں میں عدالتی زبان رہی ہے۔ باقاعدہ ڈگ

جزوی طور پر ذریعہ تعلیم رہی ہے مثلاً غیر منقسم پنجاب، بہاولپور، یوپی، بہار، حیدرآباد دکن وغیرہ، برصغیر میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ تھا جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج میں اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ یہ بات قارئین کے لیے یقیناً حیرت انگیز ہوگی کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں میڈیکل، قانون اور انجینئرنگ کی تدریس بھی اردو میں ہوتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو میں واقعی اتنی جامعیت، وسعت اور عالمگیریت ہے کہ یہ سائنسی مضامین سمیت تمام علوم و فنون کا بوجھ بخیر و خوبی اٹھا سکتی ہے۔

آج ہم نفاذ اردو کے سلسلے میں حیدرآباد دکن کے علمی سرمایہ کے ساتھ ساتھ سابقہ ریاست بہاولپور کے ان تجربات سے جو ترویج اردو کی خاطر کیے گیے فائدہ اٹھا سکتے ہیں بس صرف خلوص نیت اور دیانتداری سے کام کرنے کا ہے۔

آج کل اردو کی ترویج و ترقی میں حکومت خاص دلچسپی لے رہی ہے لیکن اس کے نفاذ کا کام بڑی سست روی سے ہو رہا ہے اور سب جانتے ہیں کہ سستی اور غفلت سے کام بنتے نہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔ حکومتی کوششوں کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر بھی اردو کو رائج کرنے کے لیے جدوجہد ہونی چاہیے:

وہ آدمی ہے باعثِ صد افتخار و ناز
اس دور میں جو خدمتِ اردو زبان کرے

عام شہری اردو کی ترویج کے لیے اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ ان کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے دستخط اردو میں کریں۔ ہمیں قائداعظم کی ہدایت اور نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اردو دستخطوں کو فوری طور پر رواج دینا چاہیے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے سٹیٹ بنک پاکستان کے افتتاح کے موقع پر گورنر سٹیٹ بنک اور سیکرٹری مالیات کو ہدایت کی تھی کہ وہ کرنسی نوٹوں پر اردو میں دستخط کریں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۴۸ء میں کہی گئی قائداعظم کی اس بات پر تمام پاکستانی ۱۹۸۶ء میں بھی عمل نہیں کر سکے اور اپنی قابلیت اور لیاقت کے اظہار اور اشتہار کے طور پر ہمیشہ اور ہر جگہ دستخط انگریزی ہی میں کرتے ہیں حالانکہ یہ چیز ان کی علمی برتری کو ظاہر نہیں کرتی البتہ ان کی فکری کمتری کی آئینہ دار ضرور ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھ کر آپ ماہر نفسیات نہ ہوتے ہوئے بھی کسی شخص کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے یا نہیں؟

اگر کوئی شخص پاکستانی ہے اور وہ اردو بھی جانتا ہے لیکن اس کے باوجود دستخط انگریزی میں کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ اور کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس احساس کمتری سے نجات حاصل کریں اور عہدِ غلامی کی یادگار کی جگہ آزادی کی روایات کو سینے سے لگائیں۔ قومی حمیت اور ملی خودداری کا بھی یہی تقاضا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ پاکستان کی حقیقی ترقی و استحکام کا اصل راز فروغ اردو میں مضمر ہے لیکن ترویج اردو اور نفاذ اردو کے لیے خلوص دل اور جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت کراچی)

اردو کے [illegible] کام کرنے کی ضرورت ہے

خانیوال (نامہ نگار) اردو کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت کیلئے قومی جذبہ کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو زبان میں بین الاقوامی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے یہ بات ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج خانیوال میاں احسان الحق بھلی نے کل پاکستان اردو کانفرنس خانیوال کے منتظمین اور کارکنوں کو تقسیم انعامات کی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کے دوران کہی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اردو کا دیس ہے اس لیے یہاں علاقائی حدود وقیود اور زبانوں کے چکر سے نکل کر اس قومی زبان کی بین الاقوامی سطح پر ترویج و اشاعت کا کام ایک منظم تحریک کی صورت میں ہونا چاہیئے۔

انہوں نے کہا کہ اپریل ۱۹۸۷ء کے وسط میں ضلعی مجلس زبان دفتری خانیوال کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالی کل پاکستان اردو کانفرنس ایک سنگ میل ثابت ہوگی اور اب تمام اداروں اور لوگوں کو اردو کے فروغ کیلئے اسی نہج پر کام کرنا چاہیئے انہوں نے اردو کانفرنس کی شاندار کامیابی پر صدر مجلس زبان دفتری مرتضیٰ برلاس اور دیگر منتظمین کی کوششوں کو سراہا صدر تقریب مرتضیٰ برلاس نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والی قومی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل علمی و ادبی شخصیات نے اردو کانفرنس کو فروغ اردو کیلئے کامیاب کوشش قرار دیا ہے۔

[illegible] خانیوال [illegible] نے اردو کانفرنس کو ترقی اردو کیلئے بھرپور کاوش قرار دیتے ہوئے اسے اردو کی خدمت کیلئے ایک عملی کوشش کا نام دیا بعد میں اردو کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والے اداروں کے منتظمین اور کارکنوں کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج احسان الحق بھلی [illegible] مرتضیٰ برلاس اور [illegible] مجید نے اسناد تقسیم کیں۔

مشرق لاہور ۹ مئی ۸۸

یس ابراھیم

اُردو کو مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بنانے میں حائل رکاوٹیں

قومی تشخص کی دیدہ زیب عمارت کا ایک ستون قومی زبان ہے' باقی ستون اس عمارت کو سنبھالے ہوئے ہیں جب کہ مرکزی ستون جو ایستادگی کی منازل طے کرتا ہے مضبوط اور ٹھوس منصوبہ بندی' موٴثر اقدام کے فقدان کے باعث زمین بوس ہوتا جاتا ہے مختلف سیاسی ادوار میں بہت سے بلند بانگ دعوے سننے میں آئے مگر تاحال اس اہم ستون کو تعمیر کرنے میں کاوشیں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکیں۔ ہمارے قومی تشخص کی عمارت متزلزل ہے اور تکمیل کے چند مراحل طے کرنے کے بعد معماروں کا منہ تکتی رہتی ہے کہ وہ خام مال ہونے کے باوجود متوجہ کیوں نہیں ہوتے۔

کاسابلانکا میں کسی افریقی کو اردو بولتے سن کر حیرت کی انتہا نہ رہی اور یہ جان کر میں انگشت بدندان رہ گیا کہ اس نے اردو کی تعلیم کسی بھی مدرسہ یا جماعت سے حاصل نہیں کی تھی بلکہ بقول اس کے اردو زبان اسے اردو کی فلمیں دیکھتے دیکھتے آ گئی، اس حادثے نے میری آنکھیں کھول دیں اور اردو کے رائج کرنے میں ہمارے اخلاص کی قلعی بھی کھل گئی:

یہ الگ بات کہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں
ورنہ ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

کسی خواہش کی تکمیل میں ذوق و شوق اور سعی پیہم اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ناکامیوں کی فہرست لمبی ہو سکتی ہے مگر ان ہی ناکامیوں کا بغور جائزہ لینے سے وہ وجوہات سامنے آ جاتی ہیں جو کسی خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں ایک ایک کر کے ان کے راستے کے پتھروں کو ہٹانے سے منزل قریب تر آ جاتی ہے اور کامیابی مقدر بن جاتی ہے قومی تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے جس اخلاص کی ضرورت ہے اس کا فقدان ہے۔ جن اقدام کو اپنانا ازبس ضروری ہے ان کی ضروریات کا احساس پیدا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو کو ہماری قومی زندگی میں وہ مقام میسر نہ آئے جس کے ہم گزشتہ چالیس سال سے خواب دیکھ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان مدرسوں میں جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے لوگ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر بھی بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ لاہور کے مدرسوں میں صف اول میں شمار ہونے والے ایک مدرسے کے طالب علم کو ٹیوشن پڑھانے کا مجھے موقع ملا ابتدار میں بچوں کے والد نے کہا:

"صاحب ان کا رزلٹ بہت ہی غیر معیاری ہے۔ مدرسے کے منتظمین نے تنبیہہ کی ہے کہ وہ ان بچوں کو مدرسے سے نکال دیں گے، کچھ کیجیے"! تین ماہ بعد امتحان تھا، سخت محنت کے بعد لڑکے کامیابی کے کم از کم معیار کو پورا کر کے اگلی کلاسوں میں چڑھ گئے۔ مگر مجھے ان صاحب کے رویے پر تعجب تھا کہ آخر وہ بچوں کو اسی مدرسے میں پڑھانے پر کیوں مصر ہیں۔

ایک بار میں نے سوال کیا جناب آپ کے بچوں کے راستے میں انگریزی ایک بہت بڑا رخنہ ہے آپ انہیں کسی ایسے مدرسے میں داخل کروا دیجیے جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو، مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی، دریافت کرنے پر راز یہ کھلا کہ جانچ کمیٹی (انٹرویو بورڈ) میں ارکین ادارے کے نام سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ارکین انگریزی میں سوالات پوچھتے ہیں اور انگریزی میں جواب دینے والے ممتاز تصور کیے جاتے ہیں۔

اردو کے پودے میں انگریزی پھل دار پودے کا پیوند لگانے سے پھل

تو انگریزی ہی ملیں گے۔ بیج سے اگنے والا پودا اگر پیوند نہ کیا جائے تو پھل بھی ویسا ہی ہو گا، اب مزاج پر آ کر بات ٹھہرتی ہے کہ جس ذائقے کا مزاج عادی ہے لذت اسی میں ہوتی ہے بدیسی پھلوں کے عادی دیسی پھلوں کے ذائقے کو کب سراہیں گے!! چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بدیسی پھلوں کی پیوندکاری کا سلسلہ بند کر دیں یا اس بدیسی پھل کے تمام پودوں کو تلف کر دیں جن کے وجود کے باعث ہمارے قومی تشخص کو نقصان پہنچتا ہے۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ انگریزی سے تعصب یقیناً زیادتی ہوگی، انگریزی، فرانسیسی، عربی یا ہسپانوی زبان ہو سب کی سب بین الاقوامی حیثیت کے باعث یقیناً مفید ہیں۔ ان زبانوں میں سے کسی بھی زبان پر عبور ہونا گویا ایک اضافی خصوصیت ہے۔ یہاں تو مسئلہ قومی حمیت و عزت کا ہے۔ کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ کسی شخص کی بنیان یا قمیض پہنتے ہوئے شرماتے ہیں، کسی کا سہارا لینا غیور افراد کے بس میں نہیں تو قومی امور میں کسی غیر قومی زبان کے اس درجہ عمل دخل کو ہم بالکل محسوس نہیں کرتے۔ اردو ان تمام اوصاف سے متصف ہیں جن سے ہم منکر ہیں۔ کیا یہ ناانصافی نہیں؟ اقوام عالم اپنی زبان کو کس قدر اہمیت دیتی ہیں اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہو سکتا ہے۔ جرمنی کے ایک شہر ہمبرگ میں کچھ دیر ٹھہرنا تھا اس لیے کسی دکان، کسی خرید و فروخت کے مرکز میں ہماری انگریزی کسی کی سمجھ میں نہ آئی بالکل اسی طرح جیسے کوئی جرمنی میں رہتا ہوا اردو بولے۔ مگر یہ جان کر تعجب ہوا کہ اکثر جرمن زبان میں چند الفاظ سیکھنے پڑے، جرمن تو شاید قدیم زبان ہونے کی وجہ سے اتنی وسیع ہو اور سائنسی ایجادات اور جدیدیت کے باعث اس میں سائنسی اصطلاحات کا مسئلہ بھی نہ ہو مگر ترکی زبان تو کمال اتاترک کے دور میں پیدا ہوئی اور ہنوز کم سن ہے۔ استنبول میں مقیم تھا، ایک پاکستانی جو میرے ہوٹل میں ساتھ والے کمرے میں رہتے تھے بیمار ہو گئے انہیں ہسپتال لے گیا سارے ہسپتال میں ایک بھی شخص بشمول ڈاکٹر حضرات نہ ملا جو انگریزی بول سکتا ہو۔ اشاروں سے بات سمجھائی۔ آزاد قومیں اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اپنی حکومت، اپنی زبان غرض ہر شے اپنی رکھتی ہیں قوموں کی تشکیل میں احتیاج کا پہلو نہیں ہوتا اور اگر ہو تو وہ قومیں اس محرومی کو دور کرنے کی سعی پیہم میں اس وقت تک سرگرم عمل رہتی ہیں جب تک اس احتیاج سے مکمل طور پر نجات حاصل نہ کر لیں۔

اس حقیقت کا کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا کہ آزادی کی شمع روشن ہونے کے بعد جن مسائل پر ہماری نظر پڑی ان میں قومی زبان کا مسئلہ بھی نمایاں تھا۔

قائداعظم نے اپنے خطابات میں قومی زبان کی اہمیت پر زور دیا بعد ازاں ہر حکومت نے اردو کی ملکی امور میں ضرورت پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا مگر اردو کی ترویج و ترقی میں حائل رکاوٹوں کو ہٹا نہ سکے۔ اب جب کہ ملکی سطح پر "مقتدرہ قومی زبان" میں ذہین اور مستند لوگ سرگرم عمل ہیں وسیع تر قومی مفاد کے لیے وہ تجاویز و آرا کو اہمیت بھی دے رہے ہیں خاموش رہنا معقول رد یہ نہیں ہو گا اس امر کے لیے مل بیٹھنے کی صورتیں بھی پیدا ہو رہی ہیں حکمران طبقہ قومی زبان کی اہمیت سے آگاہ ہے انہی کی نگرانی اور سرپرستی میں ملکی سطح پر اردو کو مکمل طور پر قومی زندگی میں رائج کرنے کی جد و جہد آگے بڑھتی نظر آ رہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔

اجنبیت کا زہر

سو سال کے انگریزی دور میں اس وقت کے حکمرانوں نے اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے لیے انگریزی پڑھنے والوں کو دل کھول کر نوازا، اس حد تک معاشرے میں منفرد مقام دلوانے کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ انگریزی کو جاننا امتیازی حیثیت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرنے لگے۔ نسل در نسل اس امتیازی حیثیت کا مشاہدہ کرنے والوں کے لیے انگریزی کی اس نقطۂ نظر سے افادیت کا احساس شدید تر ہوتا گیا۔ انہی لوگوں میں سے حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے والے افسران کا انتخاب انگریزی زبان پر عبور کی بنا پر ہوتا رہا۔ انگریز نے انتظامی امور میں اپنے اور یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیا بعد ازاں انہی کے دست و بازو افسران پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر اختیارات پر قابض ہوئے اب انگریز تو چلا گیا مگر اپنا طرز عمل اور زبان یہاں چھوڑ گیا اور یہ فرنگی اسلوب بتدریج منتقل ہوتا رہا اور ۴۵ سال آزادی کی فضا میں سانس لینے کے بعد بھی ہم شعوری یا لاشعوری طور پر انگریزی ہی کو ممکنہ ذریعہ تعلیم سمجھتے ہیں اور اردو کو یک قلم خارج از امکان قرار دے دیتے ہیں۔ جہاں تک زبانی یا تحریری طور پر اظہار خیالات کا تعلق ہے اردو میں

ممکن ہے مگر سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ ایک گھمبیر مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مترجم زیادہ تر سائنسی اصطلاحات کو سمجھتا نہیں ہے۔ ذرا غور فرمایئے ایک اچھا لکھنے والا شخص جو سائنس کا طالب علم نہیں رہا ان اصطلاحات سے ناواقف ہے چنانچہ ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ ان اصطلاحات کا ترجمہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ آخر کسی سائنسی اصطلاح کو ایجاد کرنے والے کے ذہن میں کیا ہوتا ہے، وہ کسی لفظ کو اصطلاحاً کیوں استعمال کرتا ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں اولاً وہ خاص عمل جس کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہو رہی ہے لغوی طور پر اس سے متعلقہ حصص کی طرف اشارہ کرے مثلاً (PHOTO SYNTHESIS) روشنی سے کچھ بنانا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ دو الفاظ پر مشتمل ہے یعنی (PHOTO) روشنی اور (SYNTHESIS) بنانا چنانچہ روشنی کی مدد سے خوراک بنانے کے عمل کو فوٹو سنیتھسز کہا جاتا ہے۔ خلیہ کے اندر موجود مائع حصے کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے باہر والی پٹی اور اندرونی حصہ جسے بالترتیب ایکٹو پلازم اور اینڈو پلازم کہا جاتا ہے ایکٹو کا مطلب باہر اور اینڈو کا اندرونی (۲) ایسا کرنے میں دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا جاتا رہا ہے مثلاً یونانی زبان میں (MONO) ایک کو (DI) دو کو اور ٹرائی (TRI) تین کو کہا جاتا ہے۔ کیمسٹری میں ایک ایک ایٹم یا گروہ پر مشتمل کسی مرکب میں مونو کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے کاربن مونو آکسائڈ ایک آکسیجن پر مشتمل کاربن کا مرکب ڈائی آکسائڈ دو آکسیجنوں پر مشتمل کاربن کا مرکب۔

۳۔ کسی موجد کے نام پر نام رکھ دیا مثلاً گالجی باڈیز جو خلیہ کے اندر ہوتی ہیں اس کے موجد کالج کے نام پر رکھا گیا۔

۴۔ ماحول کی مناسبت سے مثلاً پانی کے پودے (AQUATIC PLANT)

کسی اصطلاح کا ترجمہ کرتے وقت جہاں اس کے ماحول، افعال، گروہی تقسیم وغیرہ کا خیال رکھنا چاہیے وہاں یہ امر بھی بہت ضروری ہے کہ اصطلاح میں استعمال ہونے والے الفاظ عام فہم ہوں۔

عام طور پر ہماری اصطلاحیں انگریزی ہی کی اصطلاحیں ہوتی ہیں جن کو اردو حروف کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے اس میں قباحت یہ ہے کہ یہ عام فہم نہ ہونے کے باعث طلباء کے لیے دشواری کا باعث بنتی ہیں اور سیکھنے کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔

ہمارے ہاں مترجم اپنی قابلیت کو مدنظر رکھ کر اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے ہیں اکثر ترجمے میں مانوس الفاظ کو چھوڑ کر فارسی یا عربی ہی کے مشکل ترین اور غیر مانوس الفاظ جو ہماری زبان کا حصہ نہ ہوں لکھ دیے جاتے ہیں مثلاً عروق شعریہ (CAPILLARIES) دل کے خانوں کے نام اذن اور بطن کف میرگ (LAMINA) اس میں یہ خرابی ہوتی کہ ہماری اجنبیت قائم رہتی بلکہ انگریزی کا نام تو شاید سمجھ میں آجائے فارسی یا عربی کے مرکبات بھی اتنی ہی اجنبیت رکھتے ہیں جتنی انگریزی کی اصطلاحیں اگر ہم اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت ان اہم باتوں کو ذہن میں رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ اصطلاحات ہمارے لیے سمجھنا آسان تر نہ ہو جاتے اور ترجمے کا عمل انتہائی سودمند ثابت ہو۔

اردو لینگویج ٹیچرز ایسوسی ایشن کا اجلاس

کراچی (پ ر) اردو لینگویج ٹیچرز ایسوسی ایشن کا مرکزی اجلاس مرکزی دفتر میں ایسوسی ایشن کے صدر رئیس احمد فریدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر نائب صدر محمد حزاج کو منتخب کیا گیا۔ اجلاس میں اور کی ٹاؤن کے صدر شفیع محمد کراچی کے علاوہ لیاری کے شبیر احمد اعظم، ورانی خواتین آرگنائزر حلیمہ خاتم، مس حسین فاطمہ کے علاوہ حنیف الرحمن، امین احمد، شعیب الدین، کمال الدین اکرام، شبیر احمد عثمانی فاروق احمد، اظہر احمد، فضل الرحمن و دیگر اساتذہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس سے مرکزی صدر رئیس احمد فریدی نے خطاب کرتے ہوئے اردو اساتذہ پر زور دیا کہ وہ طالب علموں پر زبان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر خصوصی توجہ دیں۔

جنگ کراچی ۳۱ جون ۸۷ء

مقتدرہ قومی زبان کا تعزیتی اجلاس

اسلام آباد ۳ جون (نیوز ڈیسک) وفاقی وزیر تعلیم نسیم احمد کے برادر نسبتی کی وفات پر قومی مقتدرہ زبان میں گزشتہ روز ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر صدارت ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔ قومی مقتدرہ زبان کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی اور افسر تعلقات عامہ سردار احمد پیرزادہ نے مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دعا کی ہے کہ خدا تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور سوگوار خاندان کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔

نوائے وقت پنڈی ۴ جون ۸۷ء

محمد ذوالفقار چوہدری

درسی کتابوں کو قومی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے

قومی تعلیمی کمیشن نے انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم کے متعلق جو سفارشات کیں انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے پنجاب یونیورسٹی سینڈیکیٹ میں یہ تجویز زیر بحث آئی کہ یونیورسٹی اس سلسلے میں موثر اقدام اٹھائے اور ایک ایسی مجلس یا کمیٹی تشکیل دے جو کہ بی اے بی ایس سی کے درسی کتب کی قومی زبان میں ترتیب و تدوین کا کام کرے۔

جنوری ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی سینڈیکیٹ نے ادارہ تالیف و ترجمہ (اردو ڈویلپمنٹ کمیٹی) کے نام سے ایک مجلس تشکیل دی اور ابتداءً میں ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، میاں بشیر احمد، مولانا غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر نیاز احمد ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر حمید احمد خان کو اس کا رکن نامزد کیا گیا۔ ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان اس کمیٹی کے صدر اور پروفیسر ایم۔ایم شریف، ڈاکٹر رفیق احمد خان، سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد، ڈاکٹر غلام یاسین خان نیازی، پروفیسر محمود احمد خان، پروفیسر سید وقار عظیم اور سید شمشاد حیدر کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ادارہ تالیف و ترجمہ نے اپنا کام شروع کر دیا اور اپنے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق بی۔اے/بی ایس سی میں پڑھائے جانے والے طبعیات، کیمیا، ریاضی نباتات، حیوانات، سیاسیات، معاشیات، جغرافیہ، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، تجارت اور قانون کے مضامین کی کتب مرتب کرانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے مرحلے میں اصطلاحات کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء تک معاشیات، سیاسیات، نفسیات، اطلاقی نفسیات، منطق، کپڑے اور بافتی اشیا، غذا اور غذائیات، پرورش اطفال اور حیوانات کے مضامین کی اصطلاحات کا کام ہوا اور معاشیات اور سیاسیات کی اصطلاحات شائع ہوئیں۔

نفسیات اور اطلاقی نفسیات کی اصطلاحات کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی لکھوا کر شائع کیں۔

۱۔ جدید معاشیات ۔ ڈاکٹر ایس ۔ ایم اختر ۔ صدر شعبہ معاشیات پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۲۔ اصطلاحات معاشیات ۔ مرتبہ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۳۔ اصطلاحات سیاسیات ۔ مرتبہ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۴۔ اصطلاحات نفسیات ۔ مرتبہ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۵۔ اصطلاحات اطلاقی نفسیات ۔ مرتبہ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۶۔ شماریات (حصہ اول) پروفیسر محمد حنیف خاں، شعبہ شماریات پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۷۔ شماریات (حصہ دوم) پروفیسر محمد حنیف خاں، شعبہ شماریات پنجاب یونیورسٹی لاہور

۸۔ حیوانیات (حصہ اول) ڈاکٹر نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور۔

۹۔ بچے کی نشوونما ۔ مسز تمکین حق، لیکچرار کالج آف ہوم اکنامکس لاہور۔

۱۰۔ غذا اور غذائیات ۔ مسز متین فاطمہ شکیل کالج آف ہوم اکنامکس لاہور۔

۱۱۔ لباس اور پارچہ بافی ۔ مسز کشور اسلم

۱۲۔ فلکیات (حصہ اول) پروفیسر ڈاکٹر برکت علی چوہان ۔ نظر ثانی ڈاکٹر انور رحمٰن صدر شعبہ فلکیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۱۹۷۱ء کے اوائل میں مجلس منتظمہ نے اصطلاح سازی کی بجائے سائنسی موضوعات پر کتابیں/مانوگراف لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ناظم ادارہ تالیف و ترجمہ نے سائنسی ماہرین کا اجلاس بلوایا۔ متعدد تجاویز و آرا اور موضوعات پر گفتگو ہوا جن میں سے دس موضوعات ماہرین کے مشورے سے منتخب ہوئے جن پر یونیورسٹی اساتذہ نے کتابیں/مانوگراف لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کام نہایت تیز رفتاری سے ہوا اور اب تک مختلف موضوعات پر حسب ذیل ستائیس (۲۷) کتابیں/مانوگراف شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ اضافیت کا نظریہ خصوصی ۔ پروفیسر خالد لطیف میر (ریاضی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲۔ سوئی گیس اور اس کا مصرف ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر رومانی، انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

۳۔ نامیاتی کیمیا ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ظفر اقبال، ڈاکٹر نصیر احمد انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری جامعہ پنجاب، لاہور۔

۴۔ فولاد سازی (ٹیکنالوجی) ڈاکٹر فضل کریم، ڈاکٹر اعجاز حسین خان، ڈاکٹر محمد ... شعبہ کیمیکل انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

نظریہ گروپ۔ (ریاضی) ڈاکٹر عبدالمجید شعبہ ریاضی پنجاب یونیورسٹی۔

لسونت مادے (کیمسٹری) ڈاکٹر ایم اے عظیم سابق صدر شعبہ کیمسٹری گورنمنٹ کالج لاہور

کیمسٹری۔ ڈاکٹر ایم اے عظیم سابق صدر شعبہ کیمسٹری گورنمنٹ کالج لاہور

ایٹم کی ساخت (طبعیات) ڈاکٹر شفیق حسین شعبہ طبعیات جامعہ پنجاب۔

شماریاتی میکانیات (طبعیات) ڈاکٹر عبدالبصیر پال سابق صدر شعبہ طبعیات

مرکزائی کیمیا (کیمسٹری) ڈاکٹر محمد ظفر اقبال شعبہ کیمسٹری۔

فونڈری ٹیکنالوجی (ٹیکنالوجی ۶۰۰ صفحات) ڈاکٹر فضل کریم شعبہ کیمیکل انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

۔ تجاذب اور سیاروی حرکت (طبعیات) ڈاکٹر عبدالبصیر پال شعبہ طبعیات۔

۔ مرکزائی اشعاع اور زراعت میں ان کی اہمیت (زراعت) ڈاکٹر احمد سعید سجی، مرکزائی ادارہ برائے زراعت و حیاتیات۔ اٹیمی توانائی کمیشن۔

۱۔ کیمیائی بند و ساخت (کیمسٹری) ڈاکٹر محمد ظفر اقبال شعبہ کیمسٹری۔

۱۱۔ صنعتی معاشریات (عمرانیات) پروفیسر سی اے قادر شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب

۱۹۔ قاموس نباتیات (نباتیات) پروفیسر وہاب اختر گورنمنٹ ڈگری کالج بھکر

۱۸۔ علم افزائش آبادی کے تکنیکی پیمانے۔ پروفیسر مظہر حسین ڈائریکٹر سوشل سائنسز ریسرچ

۱۔ ویکٹر اور ٹینسر۔ پروفیسر خالد لطیف شعبہ ریاضی۔

۱۱۔ پاکستان کی معدنی دولت۔ پروفیسر ذوالفقار احمد پنجاب یونیورسٹی۔

۱۔ سٹین لیس سٹیل۔ ڈاکٹر فضل کریم، پنجاب یونیورسٹی۔

۲۔ فولادی کنکریٹ۔ عبداللہ جان۔

۲۲۔ دھاتیں اور ان کے استعمالات۔ ڈاکٹر فضل کریم

۲۳۔ بچوں کے نفسیاتی مسائل۔ پروفیسر مس منور جہاں رشید

۲۴۔ بیلی اسٹالوجی۔ از ڈاکٹر ابوبکر

۲۵۔ بچوں میں حسد۔ پروفیسر مس منور جہاں رشید

۲۶۔ ابتدائی شماریات۔ پروفیسر مس افتخار النساء حسن اوپن یونیورسٹی۔

۲۷۔ چونچال بچے۔ پروفیسر مس منور جہاں رشید

مندرجہ ذیل مانوگراف مصنفین لکھ رہے ہیں جو اسی سال چھپ کر تیار ہو جائیں گے۔

۱۔ ارنگ نگاری۔ ڈاکٹر ظفر اقبال

۲۔ اصطلاحات کیمیا۔ سید ضیاء احمد رضوی

۳۔ اصطلاحات طبعیات۔ سید ضیاء احمد رضوی

۴۔ حیاتی و غیر نامیاتی کیمیا کے روابط ڈاکٹر ظفر اقبال

آئندہ برسوں میں مندرجہ ذیل مضامین سے متعلق اہم موضوعات پر کتابیں/مانوگراف چھاپنے کا پروگرام ہے:

۱۔ علم طبقات الارض	۲۔ نباتیات
۳۔ حیوانیات	۴۔ فلکیات
۵۔ ریاضی	۶۔ علم دواسازی
۷۔ میٹالجی	۸۔ انجینئرنگ
۹۔ زراعت	۱۰۔ جغرافیہ

(بشکریہ روزنامہ امروز لاہور)

اردو کنونشن اگلے سال مارچ میں کراچی میں منعقد کیا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو کی ذیلی کمیٹی کے اجلاس میں کنونشن کے ابتدائی انتظامات کا جائزہ

کراچی (نمائندہ جنگ) انجمن ترقی اردو کی مجوزہ عالمی اردو کنونشن کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس ۲ ستمبر ۸۷ء کو زیر صدارت صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری منعقد ہوا۔ اجلاس میں پروفیسر پریشان خٹک ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب میر خلیل الرحمٰن، جناب مشفق خواجہ، جناب جمیل الدین عالی نے شرکت کی۔ اجلاس نے اس امر اطمینان کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان نے کنونشن کے انعقاد کے لئے اجازت دے دی ہے۔ اجلاس نے طے کیا کہ مجوزہ کنونشن کراچی میں مارچ ۱۹۸۸ء میں کسی موزوں تاریخ کو منعقد کیا جائے اجلاس میں انتظامات کے سلسلہ میں ابتدائی کارروائی کا جائزہ لیا گیا۔ اس کنونشن میں بھارت، برطانیہ، یورپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا، ممالک اوقیانوس، افریقہ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید کے مندوبین مدعو کئے جا رہے ہیں۔ کنونشن میں دنیائے اردو کے باہمی روابط اردو زبان و ادب کے مسائل اور اردو زبان و ادب کے پاکستانی زبانوں سے گہرے روابط اور دنیا کی دوسری اہم زبانوں میں تراجم پر غور و فکر اور عالمی سطح پر تحفظ و ترقی اردو کے لئے اقدامات پر غور کیا جائے گا اور اگر کنونشن نے منظور کیا تو ایک عالمی انجمن اردو کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

جنگ پنڈی ۴ ستمبر ۸۷

اردو کانفرنس اور مقتدرہ قومی زبان

ان دنوں لاہور میں تین موضوعات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اول اُردو کانفرنس خانیوال، دوم مقتدرہ قومی زبان، سوم لالاپا گرل بیناشوری

اُردو کانفرنس کی وجہ اہمیت یہ ہے۔ کہ اس کا انعقاد ایک چھوٹے سے شہر خانیوال میں ہو رہا ہے اور اس کے منصرم و منتظم مرتضیٰ برلاس ہیں جو اُردو کی شمع کو جہاں بھی جاتے ہیں ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر یہ غیر اہم مقام بھی اہم ہو جاتا ہے اور اُردو کے ساتھ اس شہر کا نام مستقل طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ لالہ موسیٰ، منڈی بہاؤ الدین، میلسی۔ شورکوٹ کی خصوصیات پہلے بھی معروف تھیں لیکن اب اِن شہروں کی وجہ امتیاز یہ ہے کہ یہاں ایک زمانے میں بڑے پیمانے پر کل پاکستان مشاعرے ہوئے تھے اور ان مشاعروں سے اُردو کی آواز ابھری تھی۔

مرتضیٰ برلاس خانیوال آئے تو تنہا نہیں تھے ان کے ساتھ فیاض تحسین بھی تھے جو ادب میں خاموشی سے کام کرنے کے عادی ہیں اور یہ دونوں فکری طور پر اس تشویش میں مبتلا تھے کہ اردو زبان کو جو قومی یکجہتی کی علامت ہے بوجوہ سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور قائداعظم کے اس فرمان کو کہ پاکستان میں سرکاری زبان اُردو اور صرف اردو ہو گی پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ اردو کانفرنس کا انعقاد اہل وطن کے کانوں میں قائداعظم کا پیغام ڈالنے کے لیے ہی کیا جا رہا ہے تاکہ ۱۹۸۸ء جو نفاذ اُردو کا سال ہے آئے تو عوام و خواص اُردو کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں۔

ہمیں فی الحال خانیوال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن جو اطلاعات خانیوال سے ہمیں قمر رضا شہزاد اور طاہر نسیم نے فراہم کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کانفرنس قول و فعل میں مطابقت پیدا کرے گی اور اردو سے پیمان وفا کو مضبوط بنائے گی۔ چنانچہ اس میں شرکت کی دعوت ہر طبقہ خیال اور خطۂ وطن کے لوگوں کو دی گئی ہے افتتاحی اجلاس میں مخدوم سجاد حسین قریشی صدارت کریں گے۔ جو فی الوقت گورنر پنجاب ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کے ایک جلسے میں مخدوم صاحب نے صدارت کی تھی اور جب اردو کے حوالے سے امیر خسرو کا ذکر آیا تو مخدوم صاحب پر والہانہ کیفیت طاری ہو گئی اس جلسے میں انہوں نے پاکستان قائداعظم اور اقبال زندہ باد کے ساتھ جو نعرہ سب سے پہلی مرتبہ لگایا وہ اردو زندہ باد کا نعرہ تھا اور یہ باور کروا دیا کہ وہ نفاذ اُردو کی تحریک کے ہراول دستے کے ساتھ ہیں۔

مقالات کی نشستوں کے لیے تین جلسے مجوزہ ہیں۔ پہلے جلسے میں پروفیسر محمد منوّر مرزا۔ ڈاکٹر نواز علی شوق۔ جناب طارق محمود۔ اشفاق احمد۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مقالات پڑھیں گے۔ دوسرے جلسے میں جیلانی کامران۔ ڈاکٹر انور سدید۔ ڈاکٹر نوار احمد اور عزیز اثری اور تیسرے میں ڈاکٹر اسلم فرخی۔ شریف کنجاہی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام شامل ہیں۔ آخری دو نشستوں کے صدر چوہدری غلام جیلانی ہیں اور مہمان خصوصی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا۔ ظاہر ہے کہ علمی اور فکری محفلوں کے مہمانان خصوصی یہی دو حضرات ہو سکتے تھے۔ آخری محفل مشاعرہ کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی صدارت ملتان کے کمشنر سرافراز حسین شاہ کریں گے۔ اور مہمان خصوصی احمد ندیم قاسمی ہوں گے۔ اس مشاعرے میں شعرا دور و نزدیک سے بلائے گئے ہیں لیکن سنا ہے کہ کالم نگاروں کو اس دفعہ بھی گھاس نہیں ڈالی جا رہی۔ لہذا ہم اس مشاعرے کے لیے جو غزل لکھی تھی وہ اٹھا کر بیاض میں دفن کر دی ہے۔ اب ہم اس غزل کو اس وقت نکالیں گے جب ہمیں میاں چنوں مشاعرے کا دعوت نامہ ملے گا۔

مشاعروں کا ذکر آیا ہے تو سنیئے ظفر اقبال ایڈووکیٹ نے او کاڑا میں ایک میڈیا مشاعرہ کر ڈالا اور اس میں صرف ان شعراء کو مدعو کیا جو میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی یہ صرف کالم نگاروں کا مشاعرہ تھا۔ اب کالم نگار مشاعرہ پڑھ آئے ہیں تو کسی کو یہ نہیں بتاتے کہ اختتام پر انہیں جو لفافہ تھمایا گیا تھا اس میں کیا تھا ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ ظفر اقبال ان دنوں جو سلوک غزل کیسا تھ کر رہے ہیں وہی سلوک انہوں نے کالم نگاروں کے ساتھ کیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہم اس مشاعرے میں بھی شریک نہیں تھے ورنہ آپ کو بتا دیتے کہ اس لفافے میں جو نوٹ تھے۔ ان سے ہمارا ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا نہیں ہوتا۔

مقتدرہ قومی زبان کی بینیں۔ اس کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نفاذ اردو کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اتنے مستعد اور سرگرم ہوگئے کہ ان کے جسم نے ان کے پروگرام ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پچھلے دنوں اچانک خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اور انہیں اسلام آباد ہسپتال میں داخل کرنا پڑا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صحت یاب ہو کر واپس آ گئے ہیں۔ اور اب پھر سابقہ مستعدی اور ہنرمندی سے مقتدرہ کے امور سرانجام دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے پشاور لاہور۔ ملتان۔ میانوالی اور جوہر آباد میں قومی زبان کے جلسے منعقد کیے اور اب خانیوال کانفرنس میں بھی ان کا عملی تعاون شامل ہے۔

دوسری طرف ان کی مطبوعات کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ سب مطبوعات نفاذ اردو کی منزل کو قریب اور اس عمل کو آسان بنانے والی کتابیں ہیں۔ دفتری امور سرانجام دینے کے لیے مقتدرہ نے اصطلاحات دفتری۔ مراسلت دفتری محکموں اور اداروں کے نام اور ہر شعبۂ حیات میں کام آنے والی دفتری اصطلاحات کی ۲۱ کتابیں شائع کر دی ہیں جن میں ایک کتاب مرزا ہادی رسوا کی بھی ہے جو فن زود نویسی کو منظر پہ لائی ہے۔ کشاف اصطلاحات الگ موضوع ہے اور اس کے تحت پانچ کتابیں شائع کی گئی ہیں لغت کے مسائل پر پانچ منفرد کتابیں بھی منظر عام آ گئی ہیں اور انہیں مرتب کرنے والوں میں جابر علی سید، وارث سرہندی، ہیں۔ شاہ حسین حقیقت کی خزینۃ الامثال بھی چھاپ دی گئی ہے۔

مقتدرہ نے کتابیات کی ذیل میں چودہ اور کتب حوالہ کے باب میں سات کتابیں شائع کی ہیں۔ درسی کتب کا شعبہ حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔ اس میں کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈاکٹر ایم اے عظیم۔ فرمان علی فتح پوری جمیل احمد رضوی اور اے بی اشرف کی کتابوں کو اہمیت حاصل ہے۔ مقتدرہ نے اب تاریخ نگاری کی طرف بھی قدم بڑھا لیا ہے۔ محمد احسن فاروقی کی کتاب "انگریزی ادب کی تاریخ" کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے "مختصر تاریخ ادبیات اردو" مکمل کرائی ہے۔ سفرنامے کی مختصر تاریخ مرزا حامد بیگ نے لکھی ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب وحید قریشی کی طرف سے ہمیں کسی نئی کتاب کے چھپ جانے کی اطلاع نہیں آتی اور اس حقیقت کا اثبات نہیں ہوتا کہ جو کام ڈاکٹر وحید قریشی کر رہے ہیں شاید اور کوئی نہیں کر سکتا اور پھر دل سے دعا نکلتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو خدا صحت مند رکھے اور انہیں عمر خضر عطا ہو۔

(بشکریہ روزنامہ حریت کراچی)

انگریزی میڈیم سکولوں کو اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کی ہدایت

اسلام آباد ۲ ستمبر (اسٹاف رپورٹر) وفاقی تعلیمی بورڈ نے ملک کے ذریعہ تعلیم کو ۱۹۹۰ء میں [illegible] حکومت کی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے وفاقی علاقے کے [illegible] تعلیمی اداروں کے [illegible] ہدایات جس کے مطابق [illegible] بتدریج انگریزی کی تعلیم کو ختم کرنے کے [illegible] فیصلے [illegible] گیا ہے۔ [illegible] کے مطابق انگریزی میڈیم کے تمام تعلیمی اداروں کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ ذریعہ تعلیم اردو یا [illegible] صوبائی زبان اختیار کریں اور انگریزی طریقہ تدریس میں تعلیم پانے والے بچوں میں بتدریج اردو طریقہ تدریس رائج کیا جائے۔ ابتدائی طور پر فنون کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا جائے گا اور سائنسی علوم کو بتدریج انگریزی سے اردو میں ڈھالا جائے گا [illegible] ۱۹۹۰ میں ہونے والے [illegible] کے امتحانات کے پرچے اردو یا [illegible] صوبائی زبان میں ہوں گے۔

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی
۳-۹-۸۷ء

فن اردو مختصر نویسی میں دلچسپی قابل تعریف ہے

راولپنڈی (پی ایجنسی) سیکرٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام زیر ملازمت مختصر نویس اہلکاروں کے لئے اردو مختصر نویسی ٹائپ کاری کے دوسرے ششماہی جز وقتی کورس کے اختتام پر الوداعی تقریب میں شرکاء کورس میں ناظم ادارہ معین احمد صدیقی نے اسناد تقسیم کیں صدیقی صاحب نے تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ واحد ادارہ گریڈ ۵ سے لے کر گریڈ ۲۰ تک کے سرکاری ملازمین کو دفتری امور سے متعلق اعلیٰ معیار کی تربیت دینے میں ہمہ تن مصروف ہے کورس کے اتالیق نور احمد شاد نے شرکاء کورس کے نظم و ضبط اور باقاعدگی کو سراہا اور کہا کہ محکموں کی متذکرہ کورس میں مختصر نویسوں کو نامزدگی کے سلسلے میں فراخدلی مستحسن ہو گی کلاس نمائندہ الطاف قیصر نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ اگر دفاتر میں ہم سے اردو میں کام لیا جائے تو ہماری کارکردگی میں کئی گنا اضافہ ہو گا۔

جنگ پنڈی ۱۴ ستمبر ۸۷ء

زبان مطبوعات

دارالتصنیف

(الف) کتابیات

۱	کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۳ء	خالد اقبال یاسر	۲۵ روپے	۳۵ روپے
۲	کتابیات لغات اُردو	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۴۰	۵۵
۳	کتابیات پاکستان کے اُردو اخبارات و رسائل ۱۹۴۷ء تک	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	۴۲	۵۴
۴	تکملہ کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، خالد اقبال یاسر	۳۰	–
۵	کتابیات اُردو مطبوعات ۱۹۸۵ء	خالد اقبال یاسر	۳۰	۳۶
۶	کتابیات تعلیم	نسرین زہرا	۳۵	۴۵

(ب) امورِ لسانی

۷	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)	وارث سرہندی	۷۵	۹۵
۸	اُردو سندھی کے لسانی روابط (طبع نو)	شرف الدین اصلاحی	۷۴	–
۹	ترجمے کا فن، لغوی مباحث	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۳۵	–

(ج) کشاف اصطلاحات

۱۰	کشاف اصطلاحات موسمیات	سرفراز شاہد	۳۶	۴۵
۱۱	کشاف قانونی اصطلاحات (جلد اول)	رشید احمد صدیقی	۹۰	۹۵

(د) لغات

۱۲	اسپرانتو اُردو لغت	سعید احمد فارانی	۷۵	۸۵
۱۳	اُردو اور پشتو کے مشترک الفاظ	پروفیسر پریشان خٹک	۲۵	۳۵
۱۴	لسانی رابطہ (طبع نو)	پروفیسر پریشان خٹک	۳۵	–

(ہ) دفتری امور

۱۵	اُردو ٹائپ مشین کے کلیدی تختے	ڈاکٹر طارق عزیز	۳۵	۴۵

(و) تعلیمی امور

۱۶	بلوچستان میں اُردو ذریعہ تعلیم	پروفیسر ایم انور رومان	۳۰	–

دارالترجمہ

(الف) اصطلاحات

۱۷	سائنسی و تکنیکی اصطلاحات (طبع دوم)	مجلس استناد	۴۰	–
۱۸	وفاقی و صوبائی عہدوں کے نام (حصہ دوم)	مجلس استناد	۲۵	۳۵

(ب) دفتری امور

۱۹	دفتری مراسلت (طبع دوم)	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی	۲۰	–
۲۰	سرکاری خط و کتابت (جلد دوم) نیم سرکاری مراسلات	ربیعہ فخری / محمد اظہار الحق	۵۰	۶۰
۲۱	سرکاری خط و کتابت (جلد سوم) دفتری حکمنامے	مسعود احمد چیمہ / ڈاکٹر محمد صدیق شبلی	۵۵	۶۵

(ج) خود سیکھیے (خصوصی منصوبے)

۲۲	اسپرانتو خود سیکھیے	سعید احمد فارانی	۴۰	۵۰
۲۳	عربی سیکھیے (جلد اول)	عبدالرحمن طاہر سورتی	۶۵	۷۵

شعبہ درسیات

(الف) سائنسی علوم

۲۴	ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر	شہزاد احمد	۴۰	۵۰

(ج) پیشہ ورانہ علوم

۲۶	طب (طبع نو)	ڈاکٹر سید اسلم	۸۰	۱۰۰
۲۷	لائبریری سائنس اور اصول تحقیق	سید جمیل احمد رضوی	۶۰	۷۰
۲۸	لائبریرین شپ کی مبادیات	ڈاکٹر جے ایچ تیرا / جمیل احمد رضوی	۳۵	۴۵
۲۹	ہمارے کتب خانے	ڈاکٹر ملک حسن اختر	۲۴	–
۳۰	تدریس اُردو (طبع نو)	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۴۸	–
۳۱	تعلیم و نفسیات (طبع نو)	ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی	۲۴	–
۳۲	فن روزنامہ نویسی (طبع نو)	مرزا محمد ہادی رسوا / ایم ایل گھوش	۳۰	–

(د) زبان و ادب

۳۳	اشارات تنقید (طبع نو)	ڈاکٹر سید عبداللہ	۵۰	–
۳۴	سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا	ڈاکٹر سید عبداللہ	۴۸	–
۳۵	اُردو داستان	ڈاکٹر سہیل بخاری	۹۵	۱۰۰
۳۶	مغرب کے تنقیدی اصول (طبع نو)	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۵۰	–
۳۷	تہذیب و تخلیق (طبع نو)	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۴۵	–
۳۸	اُردو سٹیج ڈراما	ڈاکٹر اے بی اشرف	۴۲	–

(ہ) کتب حوالہ

۳۹	قائداعظم کے شب و روز	خورشید احمد خاں	۳۵	–
۴۰	معرفیہ خلافت مشرقی	مولوی عنایت اللہ	۱۵۰	–
۴۱	دکنی و دکنیات	ڈاکٹر محمد علی اثر	۴۰	–

جائزے، رُودادیں، سفارشات

۴۲	اسلام آباد اور راولپنڈی میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے پرائیویٹ ادارے	عبدالغفور اعوان	بلا قیمت	–
۴۳	اسلام آباد کی خواتین اور قومی زبان	فریدہ حفیظ	″	–
۴۴	قومی زبان اور خواتین میں عادات مطالعہ	انور قدوس سیمیں	″	–
۴۵	وفاقی دفاتر میں مختصر نویس، ٹائپ کار اور ٹائپ مشینیں	نور احمد شاد	″	–
۴۶	عوامی نمائندے اور قومی زبان	فریدہ حفیظ	″	–
۴۷	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۵ء – ۱۹۸۶ء	–		–
۴۸	بینٹ حالکہ کی رودادیں	ارشد قریشی	″	–

بہ تعاون و اشتراک

۴۹	نباتاتی نعلیات	عبدالرحیم خان	۵۴	–
۵۰	رہنمیر کا ڈراما تاریخ، افکار اور انتقاد	ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۷۵	–
۵۱	مبادیات رقی میمیا			
۵۲	اساسیات قدرتی کیمیا (A FOUNDATION FOR QUANTUM CHEMISTRY)			

مقتدرہ قومی زبان

شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۶-ڈی (مغربی) بلیو ایریا، ایف ۶/۱، اسلام آباد

کراچی: مکان نمبر ۳۰ اے، بلاک نمبر ۱۳، گلشن اقبال نزد حسن اسکوائر، کراچی
لاہور: ۹۰ - ریواز گارڈن، لاہور
پشاور: خلیل ٹاؤن، بالمقابل ثانوی تعلیمی بورڈ، جمرود روڈ، پشاور
کوئٹہ: بی ۱۳/۴۲-۲، تولہ رام روڈ، بالمقابل عجائب گھر، کوئٹہ
سکھر: بنگلہ نمبر ۴، ملٹری روڈ، سکھر

لائبریریوں، اداروں اور تاجروں کو منظور شدہ شرح کے مطابق رعایت بھی دی جاتی ہے

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد مقتدرہ قومی زبان، شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۶-ڈی (مغربی)
بلیو ایریا، ایف ۱/۶، اسلام آباد — طابع: ر۔ آ۔ ہنز پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

اخبارِ اُردو

اسلام آباد

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

فہرست

اردو ذریعہ تعلیم ۔ آخری صورت حال ـــــ
ڈاکٹر سید عبداللہ ۔۔۔۔۔ ۱

"امالہ" اردو کا ایک اور قاعدہ ـــــ
ماجد الباقری ۔۔۔۔۔ ۳

انیسویں صدی میں اردو کتب پر انعامات
ڈاکٹر گوہر نوشاہی ۔۔۔۔۔ ۹

اردو پنجاب کا عشق ہے ـــــ
ڈاکٹر انور سدید ـــــ ۱۵

تعارف و تبصرہ ـــــ
ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ـــــ ۱۸

معروضات

اخبار اردو کا یہ شمارہ اس سال کا آخری شمارہ ہے۔ ہماری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے جو کام کیا ہے اس سے آپ کو باخبر رکھا جائے۔ جنوری ۱۹۹۰ء سے ہم نئے سال کے اخبار اردو کو اس صورت میں پیش کرنے کی تیاری کر رہے ہیں جو نہ صرف جاذب نظر ہو بلکہ جس میں مختلف لسانی و علمی موضوعات پر مفید اور کارآمد مضامین بھی شائع کیے جائیں۔ ہم اپنے قارئین سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ نفاذ اردو کے سلسلے میں وہ بھی اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ کرتے رہیں۔ قومی زبان ہماری شناخت بھی ہے اور یکجہتی کی علمبردار بھی۔

ناشر: حاجی محمد ارشد قریشی، معتمد، مقتدرہ قومی زبان، شمائلہ اعوان پلازہ، ۱۲۰۔ ڈی (۶ بی) بلیو ایریا، ایف ۶/۱، اسلام آباد — طابع: برقی پرنٹرز لمیٹڈ اسلام آباد
فون: صدر نشین: ۱،۳۹۳۸، معتمد: ۸۱۱۸۲۳

قیمت: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ڈاکٹر سید عبداللہ

اردو ذریعۂ تعلیم ۔ آخری صورت حال

انگریزی ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کا مسئلہ نیا نہیں خاصا پرانا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان سے بھی پہلے کا ہے چنانچہ یہ تورپلی کالج ۲۵-۱۹۲۶ء اور بعد میں مختلف تجربوں سے گزرتا ہوا جامعہ عثمانیہ پہنچا جس میں مکمل تبدیلی کا عمل شروع بھی ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آغاز سے ہی یعنی ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد مسلسل یہ مسئلہ سامنے آتا رہا مگر خود اردو کی قومی حیثیت مکمل طور پر متعین نہ ہو سکی اس لیے یہ معاملہ بھی وسیع تر معاملے سے وابستہ ہو کر ملتوی ہوتا رہا۔

"مقتدرہ قومی زبان" کی تاسیس کے بعد اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ غور ہونا شروع ہوا چنانچہ اس کی ایک ذیلی کمیٹی برائے ذریعۂ تعلیم نے طویل غور و فکر کے بعد چند جامع سفارشات کیں، جو مارچ ۱۹۸۳ء میں حکومت کے سامنے آئیں اور ان پر کچھ تنقید و تبصرہ کا عمل ہوا مگر فیصلہ کچھ نہ ہوا۔ اب دوسری بلکہ تیسری بار پھر حکومت کی اردو کابینہ سب کمیٹی کے سامنے نومبر ۱۹۸۵ء میں رکھی گئیں مگر اس مرتبہ بھی کچھ فیصلہ نہ ہوا بلکہ اس اجلاس نے مزید کمیٹیاں بنا دیں اور آئندہ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی مشوروں میں شریک کرنے کی شرط لگا دی اور اس وقت ہم اس عالم حیرت میں یعنی گومگو کے عالم میں ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ فیصلہ آئندہ بھی نہ ہو سکے گا اور اگر ہو گا بھی تو ہم میں سے اکثر کی رائے کے خلاف' مخالفانہ ہی ہو گا۔

اب سب سے پہلے یہ سنیے کہ مقتدرہ کی وہ سفارشات کیا تھیں جو مارچ ۱۹۸۳ء میں حکومت کے سامنے پیش ہوئیں اور نومبر ۱۹۸۵ء میں اب پھر پیش ہوئیں۔

۱۔ انٹرمیڈیٹ سائنس، آرٹس، کامرس گروپ اور بی کام" بی ایڈ" ایل ایل بی، میڈیکل ڈپلوما میں ۱۹۸۳ء ۱۹۸۴ء سے اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کیا جائے اور ۸۵-۱۹۸۴ء تک یہ کام مکمل ہو جائے۔

۲۔ ۸۵-۱۹۸۶ء سے بی ایس سی، بی اے، ایم اے، ایم کام، ایم ایڈ، ایل ایل ایم میں اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے اور یہ کام ۸۷-۱۹۸۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

۳۔ ۱۹۸۷ء-۱۹۸۹ء سے ایم ایس سی اور ایم بی اے کے نصاب اردو میں شروع کیے جائیں اور یہ کام ۱۹۸۸ء/۱۹۸۹ء میں اختتام کو پہنچے۔

اگرچہ یہ سفارشات بھی قوم کی اجتماعی آواز کے مطابق نہ تھیں مگر تدریج کے عمل میں اس لچک پر کسی طرف سے احتجاج نہ ہوا کہ دیکھیے ان کے متعلق بھی اوپر والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے۔

نومبر ۱۹۸۵ء میں کابینہ سب کمیٹی کا جو اجلاس ہوا اس میں ہر ٹرک کی نقصان زدہ دو عملی کی مزید چھان بین (یعنی تدریجی عمل کو طویل سے طویل تر بنانے) کے لیے دو تین کمیٹیاں از سر نو بنا دی گئیں جن میں صوبائی اختلافات کو مبالغہ آمیز حد تک روشن کیا تھا پھر مشورہ کرنے کی تجویز ہوئی طے شدہ باتوں کو بار بار دہرانے کا مقصد کیا ہے اس کے متعلق ہر شخص خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ میں اس پر کچھ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

غرض یہ ہے وہ پیش رفت جس کا مستقبل معلوم نہیں کیا ہے یہ اب سفارش صوبائی وزارتوں کے پاس بغرض امتحان پھر جائے گی اور کابینہ سب کمیٹی کے آئندہ اجلاس میں ہر صوبے اور کشمیر کے وزرائے اعلیٰ شریک ہوں گے اور یہ علمی مسئلہ خالص سیاسی سطح پر طے ہو گا یا ہمیشہ کے لیے کھٹائی میں پڑ جائے گا، میں نے یہ ساری کہانی اس لیے سنائی ہے کہ کم از کم سائنس والوں کو معلوم ہو جائے کہ اردو کا معاملہ اب کہاں کھڑا ہے یا کہاں لیٹ رہا ہے۔

اب میں کچھ عام باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ میرا خطاب انگریزی مضمون والوں اور سائنس والوں سے ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انگریزی

والے دوست ناراض نہ ہوں اردو والوں کا ان سے پکا وعدہ ہے کہ وہ انگریزی کے جائز مقام کی کبھی مخالفت نہ کریں گے۔ ہم نے یعنی کم از کم میں نے گزشتہ پچاس سال کی جدوجہد میں انگریزی پڑھنے اور بعض سائنسی ضرورتوں میں اسے استعمال کیے جانے کی مخالفت ایک موقعہ پر بھی نہیں کی، ہم صرف اس وقت انگریزی کے خلاف لب کشائی کرتے ہیں جب کوئی طبقہ اسے اپنا یعنی پورے ملک کا اوڑھنا بچھونا بنا دینا چاہتا ہے اور پاکستان کو پاک شائر انگلستان کی ایک کالونی یا پاک شائر بنا دینا چاہتا ہے یا پھر ہم اس وقت کچھ شکوے کرتے ہیں، جب سائنس والے لوگ بھی اپنی زبان کے زور سے یا تجربوں سے سائنس میں مقام حاصل کرنے کے بجائے انگریزی کے متعلق کچھ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی کفش بردار بن جانا چاہتے ہیں جو خود انگریز لوگ از منہ متوسط میں پانچ سو سال تک فرینچ اور لاطینی کے متعلق اختیار کرتے رہے، بہرحال ہم انگریزی کے مخالفوں میں سے نہیں۔ ہم صرف کفش برداری سے روکتے ہیں کیونکہ انگریزی زبان کا اپنا تجربہ ہم سے یہی کہتا ہے۔ کہاں اس تجربے کی یہ ہے کہ نورمن قبضہ انگلستان کے بعد، انگریز قوم ذلت اور خود تحقیری کے اس گڑھے میں اس حد تک گر چکی تھی کہ وہ اپنی زبان کو نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی اور اس کا ہر فرد فرینچ میں بول چال، نوشت و خواند، یہاں تک کہ خورد و نوش اور عبادات میں بھی ہر دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، یہ ذہنی رویہ اتنا گہرا تھا کہ زندگی کے ہر شعبے میں انگریزی الفاظ متروک اور فرینچ کے الفاظ زبان میں داخل ہوتے گئے جو فرینچ کی پسپائی کے بعد بھی زبان کے اندر پیوست رہے اور خارج نہ ہو سکے ۱۰۵۰ سے ۱۵۰۰ء تک کا یہ زمانہ انگریزی کی بدبختی کا زمانہ تھا اور اس دور کی تبدیلیوں کی تفصیل معلوم کرنی ہو تو پروفیسر البرٹ باؤ کی کتاب "اے ہسٹری آف دی انگلش لینگویج" کے باب ہفتم سے معلوم ہو سکتی ہے تو خلاصہ یہ کہ لسانی غلامی کا شرمناک تجربہ انگریزی کو بھی ہوا اور ہم ان کے اس تجربے سے اردو کے سلسلے میں یہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ اس صورت حال سے ہمارے لیے جو سبق نکلتا ہے وہ ہمارے مدنظر رہے، میرے خیال میں سبق یہ نکلتا ہے کہ غیور قومیں غیر زبانوں کی چکاچوند سے متاثر ہو بھی جائیں تو پھر ہر حال میں اس سے نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دوم یہ کہ انگریزی جس کے سائنسی تفوق کا شہرہ ہے اس وقت تک سائنس کی زبان نہیں بن سکی جب تک وہاں کے لوگوں نے اپنی زبان میں سوچنا اور تجربہ کرنا شروع نہیں کیا۔

اس سلسلے میں اگر سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں سائنس نے اس وقت ترقی کی جب وہ فرنچ اثرات سے نکلنے کی سعی کرنے لگی چنانچہ فرانسس بیکن (۱۵۶۱-۱۶۲۶ء) اور بعد میں نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷) اسی خواہش آزادی کے دور کے لوگ تھے جن کی مثال پر بعد میں اور لوگ برابر آگے بڑھتے گئے اور انگریزی کو مخزن علوم بنا دیا یہ سب براہ راست اپنی زبان میں سوچ اور ذاتی تجربے و مشاہدے سے ہوا اور دراصل تجربہ ہی سائنس کا سرچشمہ ہے۔

تاریخ سائنس (صفحہ ۸۶) کے یہ فقرے قابل توجہ ہیں۔ سترہویں صدی میں سائنس کے عروج کی کئی وجوہ ہیں اول تو سائنس دان میز کرسی پر بیٹھ کر ایک کتاب یا کتابوں سے دوسری کتاب تیار نہیں کرتے تھے بلکہ یہ لیبارٹری بناتے تھے اور خود تجربے کرتے تھے، دوم یہ سائنس دان صرف تجربے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ یہ لیبارٹری بناتے تھے اور خود تجربے کرتے تھے، دوم یہ سائنس دان صرف تجربے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہر چیز کو ناپتے تولتے تھے اور وقت نوٹ کر لیتے تھے، پھر وہ ان کا ذکر سوسائٹیوں میں کرتے تھے، جہاں ان پر بحث ہوتی تھی انہیں، پھر کتب و رسائل میں بیان کیا جاتا تھا تاکہ لوگ بھی ان تجربوں کو دہرا کر صدق و کذب خود معلوم کر سکیں۔ (تاریخ سائنس مصنفہ ڈاکٹر جی اے قادر)

اس اقتباس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ سائنس ذاتی تجربے اور اپنی زبان میں سوچ کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور پیدا ہوتی ہے محض دریوزہ گری سے کوئی بڑی ایجاد یا کارنامہ انجام نہیں پا سکتا نظریۂ سائنس کے اچھے استاد تو پیدا ہو سکتے ہیں مگر سائنس کو عملی بلندیوں تک پہنچانے والے پیدا نہیں ہو سکتے۔

حضرات میں نے علوم میں استفادے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے قومی جذبے اور غیوری کو بھی بطور محرک اچھی طرح واضح کر دیا ہے اب میں

نہایت مختصر طریقے سے ذریعہ تعلیم کے متعلق اپنے مؤقف کے بعض اجزا کی طرف پھر اشارہ کرتا ہوں جس میں بعض جگہ سابقہ گزارشات کا اعادہ بھی ہوگا لیکن یہ تکرار انشاء اللہ طویل اور بے محل نہ ہوگی۔

۱۔ پہلی بات تو واضح ہے کہ ہم انگریزی کے مضمون کے ہرگز مخالف نہیں اور بعض سائنسی ضرورتوں کے لیے کچھ مزید لچک بھی ناگزیر ہو جائے تو اس کے بھی حامی ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ ہم تدریج کے بھی طرف دار ہیں اور کبھی معقول تدریج کی مخالفت ہم نے نہیں کی۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ ہم اصطلاحات علمی کے معاملے میں بے سدر دا دائیں بین الاقوامی (انگریزی کی مسلمہ بین الاقوامی اصطلاحات کو برقرار رکھنے اور نئے علمی الفاظ جہاں سے ملیں انہیں لے لینے کے حق میں ہیں۔ رقوم وعلامات اور ہندسوں کے معاملے میں بین الاقوامی اسلوب اختیار کرکے علمی رویہ رطیہ رکھے اور علم کا ساتھ دیں گے لیکن یہ نہ ہونا چاہیے کہ سارا ملک اپنے ہندسوں اور اپنی گنتی سے بالکل ناواقف ہو جائے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ہم رومن رسم الخط کو جو ہماری پوری تہذیبی زندگی کے لیے مہلک ہے، کسی صورت گوارا نہیں کریں گے۔ ملی علوم میں ناگزیر طور پر اس کی کہیں ضرورت ہو تو ہم اس کی مخالفت نہ کریں گے۔

۵۔ پانچویں بات یہ کہ ۱۹۷۰ء کے بعد علم اور سائنس کی دنیا میں جو طوفانی انقلاب آیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انگریزی اب صرف ۵۰ فی صد علم کا وسیلہ رہ گئی ہے۔ باقی ۵۰ فی صد کے لیے اب انگریزی کے مقابلے میں روسی، جرمن، فرانسیسی، چینی اور جاپانی زبانیں بھی میدان میں آگئی ہیں۔ ہمارے ملک کو چاہیے کہ علم کی خاطر ان زبانوں میں سے بھی کسی ایک کو بطور ثانوی زبان، تعلیم کا حصہ بنائے۔ انگریزی واحد اجارہ دار نہیں۔

۶۔ ہم سائنس کے شعبے میں سائنس کے استادوں کی طرح بلکہ ان سے بہت زیادہ سائنس کے خانقاہ نشینوں یعنی لیبارٹریوں میں عمریں صرف کرنے والوں کی بھی عزت افزائی کریں گے۔

باتیں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر یہ چھ اصول ہمیشہ ہمارے مدِ نظر رہیں گے، ہم سوشل سائنسز میں اردو ذریعہ تعلیم پر زور دیں گے اور انسانیاتی مضامین تو ظاہر ہے کہ اردو ہی میں ہونے چاہییں اور آخر میں ایک بار پھر اس عقیدے کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہم انگریزی لازمی کے ہر حال میں حامی بلکہ علمبردار ہیں، امید ہے اس کے بعد کوئی ہمیں طعنہ نہ دے گا کہ ہم انگریزی کو دیس سے نکالا دینا چاہتے ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں، بالکل نہیں۔

ادارے سے مخلص رہنا ہمارا بنیادی فرض ہے ——— ڈاکٹر جمیل جالبی

ملک کے ممتاز دانشور اور جامعہ کراچی کے سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے گذشتہ روز مقتدرہ کے نئے صدر نشین کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی سنبھال لیے مقتدرہ قومی زبان کے افسران اور عملے نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اس موقع پر ادارے کے معتمد حاجی محمد ارشد قریشی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں نئے صدر نشین کو اپنے اور عملے کی جانب سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادارے اور عملے کے افسران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مقتدرہ میں کام کرنے والوں کا مقصد کسی سیاسی یا پریشر گروپ کا قیام نہیں بلکہ سرکاری دفاتر میں نفاذِ اردو کے لیے تمام تر مواد کی تیاری کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم ادارے سے مخلص رہیں جو ہمارے رزق کا وسیلہ بنا اور اس کے تحت جو فرائض ہمیں سونپے گئے ہیں مل جل کر انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۱۸-۱۱-۸۷ء)

ماجد الباکری

"امالہ" - اردو کا ایک اور قاعدہ

اردو زبان کے کسی قاعدے سے متعلق اظہارِ خیال کرتے وقت ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ زبان دیگر ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے میل جول سے بنی ہے۔ اس کے بعد رائج ہوئی ہے اور اس کے قواعد بعد میں مرتب ہوئے، ہر زبان اپنی نشو و نما کے مراحل میں اپنے محسنین کے اندازِ تحریر سے متاثر ہوتی ہے۔ ارتقائی منازل طے کرتی اور قواعد پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اس عمل کی وجہ سے نئے نئے قاعدے بنتے رہتے ہیں اور چند بندھے ٹکے قاعدوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، تاکہ قواعد ترقی کرتی ہوئی زبان کا ساتھ دے سکے۔

قواعد کے مسلمہ اصول کہیں کہیں اس زبان کے انشاء پردازوں اور شعراء کے اسالیب کا ساتھ نہیں دے پاتے جس کے سبب استثناء کی کیفیات بطور ضمیمہ قواعد کی کتب میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔

"امالے" کا حال بھی کچھ اسی طرح ہے کہ اردو بولنے والوں نے اس کے عمل کو بول چال میں تو روا رکھا ہے لیکن تحریر میں چونکہ شدید پابندی کا رجحان نہیں ملتا اس لیے اس کا ذکر قواعد کی کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ نہیں ملتا "امالے" کے قاعدے صغیر بلگرامی نے رسالہ تذکیر و تانیث میں لکھے ہیں جو نامکمل ہیں۔ مولانا عبدالحق نے "قواعد اردو" میں اس کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے زبید احمد نے "زبدۃ القواعد" میں اسم واحد پر حروفِ روابط کا اثر" کے ماتحت اس قاعدے کا تھوڑا سا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مولوی فتح محمد جالندھری نے "مصباح القواعد" کے حصہ اول میں" اسم واحد کے حرفِ اخیر کی تبدیلی کے تحت کچھ اضافہ کیا ہے اور مولانا اطہر علی فاروقی نے اپنی کتاب" نر دبان" میں اس موضوع پر ہلکی سی روشنی ڈالی ہے میں ان تمام کتب کے مطالعے کے بعد کچھ اضافوں کے ساتھ مربوط انداز میں اس کے اصول منضبط کرنا چاہتا ہوں تاکہ قواعد نگار اس موضوع کو بھی مسلمہ حیثیت دے سکیں۔ جہاں جہاں اختلاف ہو اسے رفع کریں، مزید ترمیم کی ضرورت ہے ہو تو اسے بروئے کار لائیں اور صحیح صورت میں اسے اردو قواعد کا ایک متحرک اور زندہ حصہ بنائیں اگر اہل قلم املے کی پابندی شدت سے کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ املے کے اصول مستحکم نہ ہو سکیں۔

"امالہ" عربی زبان سے مختص ہے۔ اس کا مطلب ہے کھڑے کو لٹا دینا قاعدے کے مطابق اس میں" الف" سے پہلی حرکت کو اتنا جھکایا جاتا ہے کہ یائے مجہول پیدا ہو جاتی ہے جیسے" رکاب" سے" رکیب" چونکہ (ے) کی علامت ہماری زبان میں بیشتر مواقع پر استعمال ہوتی ہے اس لیے ہم اسے مستقل حالت کا نام دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں، درج ذیل امثلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی فاعل یا مفعول صیغۂ واحد میں ہے مگر محلِ استعمال کی وجہ سے (الف) کو (ے) سے بدل کر ہی بولنا پڑتا ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل" املے" کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بیشتر صرفی اور نحوی ضرورتوں کے تابع ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

تمہارا گھر کہاں ہے ۔ میں تمہارے گھر گیا تھا
ہمارا نام نہ پوچھو ۔ ہمارے نام سے تمہیں کیا غرض
پہلا دن اچھا گزرا ۔ وہ پہلے دن نہیں آیا
میرا گھر قریب ہے ۔ تم میرے گھر آتے ہی نہیں
یہ قلم پرایا ہے ۔ لڑکی پرائے گھر چلی گئی
پانی ٹھہرا ہوا ہے ۔ ٹھہرے پانی میں دیکھو
ایسا وقت کسی کسی پر آتا ہے ۔ تم ایسے وقت آئے
کالی کملی والا آیا ۔ تم کالی کملی والے ہو
گھوڑے کا رنگ کالا ہے ۔ کالے گھوڑے کو دیکھو

لڑکا گورا ہے ۔ گورے لڑکے کو بلاؤ

تم جیسا کوئی نہیں ۔ تم جیسے چاہو کرو

اندھیرا بہت ہے ۔ میں منہ اندھیرے گھر سے نکلا

نہر کا کنارہ اچھا ہے ۔ دریا کنارے جانا ہے

ان مثالوں سے واضح ہے کہ تمہارا ، ہمارا ، پہلا ، میرا ، پرایا ، ٹھہرا ، ایسا ، والا ، کالا ، گورا ، جیسا ، اندھیرا ، کنارہ کے آخر میں "الف" یا دہائے مختفی ہے اور ان کے فوراً بعد حرف ربط بھی نہیں مگر صرفی ضروریات کے تحت واحد ہونے کے باوجود تمہارے ، ہمارے ، پہلے ، میرے ، پرائے ، ٹھہرے ، ایسے ، والے ، کالے ، گورے ، جیسے ، اندھیرے ، کنارے سے تبدیل ہو گئے ہیں یعنی (الف) اور (ہ) کی جگہ (ے) نے لے لی ہے اس لیے میری ذاتی رائے ہے کہ (ا) اور (ہ) کی ایسی حالت کو جو انہیں کسی بھی وجہ سے (ے) سے تبدیل کردے ہم "املا" کے قواعد میں "امالہ" ہی کہیں اور اس تبدیلی کو "امالہ" کے نام سے اردو کا ایک مستقل قاعدہ سمجھیں ۔

"امالے" کے قاعدوں کی نشاندہی سے پہلے ضروری ہے کہ حروفِ ربط ، حروفِ مغیرہ ، یا حروفِ معنوی کی تعریف سمجھ لی جائے یہ وہ حروف ہیں جو کہ اسموں اور ضمیروں پر داخل ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں ، وہ حروف یہ ہیں :۔

میں ۔ سے ۔ کو ۔ تک ۔ تلک ، پر ۔ کا ۔ کے ۔ کی اور نے

جب اسم کے آخر الف یا ہائے مختفی ہو اور اس کے بعد حرف مغیرہ آئیں تو (ا) اور (ہ) یائے مجہول سے بدل جائیں گے جیسے :۔

لڑکا آیا ۔ لڑکے نے کھانا کھایا ۔ بندہ حاضر ہے ۔ بندے کو اجازت دیجیے ۔ گھوڑا گھاس کھاتا ہے ، گھوڑے نے گھاس کھائی ۔

پہلے قواعد نگاروں نے (ہ) کے بارے میں بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے موقع پر بولنے میں (ے) بولیں گے لیکن لکھتے وقت (ے) کا لکھنا یا نہ لکھنا دونوں طرح درست سمجھا جاتا ہے گا جیسے لکھا جائے "بندہ نے عرض کیا" مگر پڑھتے وقت یوں بولیں "بندے نے عرض کیا"

اس تمہید کے بعد ہیں "امالے" کے قاعدے ملاحظہ ہوں :۔

(۱) جس اسم کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ہو اور اس کے بعد کوحرف ربط آئے تو (الف) اور (ہ) دونوں یائے مجہول سے بدل جائیں گے یعنی ان الفاظ میں امالہ ہو گا جیسے :۔

لڑکے نے کہا ، خرم نے ہفتے سے کچھ نہیں کھایا ، لڑنے کے بعد صلح ہو گئی ، اچھے کو برا مت کہو ، ہدائے میں لکھا ہے ، سرمائے کی ضرورت ہے کرائے کا مکان چاہیے ، اسے کندھے پر رکھ لو ، انہیں دروازے تک پہنچا دو ، ان مثالوں میں نے ، سے ، کے ، کو ، میں ، کی ، کا ، پر ، تک حروف مغیرہ ہیں جن کی وجہ سے لڑکا سے لڑکے ، ہفتہ سے ہفتے ، لڑنا سے لڑنے ، اچھا سے اچھے ، ہدایہ سے ہدائے ، سرمایہ سے سرمائے کرایہ سے کرایے ، کندھا سے کندھے اور دروازہ سے دروازے استعمال ہوا ۔

۲ ۔ اسی طرح اسما مفرد کے بعد ایسا ، جیسا ، جیسے ، جیسی ، والا ، والے ، والی ، والوں ، والیاں اور کے لیے آئے تو بھی امالہ ہوتا ہے جیسے :۔

لڑکے ایسا چہرہ ، گدھے جیسا آدمی ، کتے جیسے کان ، بکرے جیسی گردن ، ہاتھ بٹانے والا ، قافلے والے ، پکے والی ، لکھنے والوں کی انجمن ، گانے والیاں آئیں گی ، مربے کے لیے شیشی کھولی ۔

۳ ۔ اردو مصادر میں واحد کی صورت میں امالہ ہو گا جیسے کرنا سے ، کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ، مرنا سے ، اس نے مرنے کے بعد کوئی حرکت نہ کی ، ڈرنا سے ، تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں وغیرہ ۔

۴ ۔ اگر دو اسم اضافت کے بغیر مرکب ہوئے ہوں تو ان میں امالہ ہو گا جیسے :۔

آپ کے دولت کدے پر ، نئے امام باڑے میں ، شہر کے شفا خانے کے سامنے ، قید خانے سے نکل کر باورچی خانے کے اندر ، بت خانے کا ذکر ہی کیا ، شراب خانے میں داخل ہوا ، مئے خانے سے نکل کر ، آفت زدے کی مدد کرو ، حیرت زدے نے مدد چاہی ، شاہزادے کو جواب دیا ، آپ کے عشرت کدے میں دھرم شالے میں قیام کیا ۔ بالاخانے پر گیا ، صاحب زادے نے کہا ، نواب زادے نے فرمایا وغیرہ ۔

۵۔ اسمِ فاعل سماعی قسم کے مرکب میں پہلا لفظ اگر قابلِ امالہ ہے تو امالہ ہوگا خواہ اس کے بعد حرفِ ربط ہو یا نہ ہو جیسے :۔

مزے دار، سلسلے دار، بچے باز، سٹے باز، نشے باز، رشتے دار، پہرے دار، پھلے دار، محلے دار، فرقے دار وغیرہ۔

۶۔ جب لفظ کی تکرار سے حال کا کام لیا جائے اور فعل متعدی ہو تو اس میں بھی امالہ ہوگا، خواہ لفظ واحد ہو یا جمع، مذکر ہو یا مؤنث جیسے :۔

وہ پڑھتے پڑھتے چپ ہوگیا۔ گاتے گاتے رک گیا، مارتے مارتے خود ہی رو پڑا، اک اس طرف سے بھی چلتے چلاتے وار ہوا، لیکن فعل لازم کی صورت میں امالہ ضروری نہیں جیسے :۔

لڑکی لیٹی لیٹی سوگئی یا لیٹے لیٹے سوگئی وہ پڑا پڑا سوگیا یا پڑے پڑے سوگیا، میں ٹہلتا ٹہلتا وہاں پہنچ گیا یا ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچ گیا وہ پڑھتی پڑھتی رک گئی یا پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

(۷) ہندی وارد کے الف پر ختم ہونے والے اسماء وصفات میں امالہ ہوگا جیسے :۔

نیلا، پیلا، اچھا بھلا، برا، کھٹا، کسیلا، رسیلا، میٹھا، کڑوا، کچا، سڑا وغیرہ بیشتر موقعوں پر صفت کے بعد موصوف آتا ہے اور حرفِ جار موصوف کے بعد آتا ہے جیسے :۔

نیلے رنگ کا کپڑا، پیلے پھل کا ذائقہ، اچھے طالب علم سے بھی امید ہے وغیرہ

۸۔ اگر قابلِ امالہ الفاظ کے بعد "بھر" آجائے تو بھی امالہ ہوگا جیسے: مہینے بھر، گھنٹے بھر، محلے بھر کو سر پر اٹھا لیا۔

۹۔ اگر قابلِ امالہ لفظ کو پکارا جائے یا سے مخاطب کیا جائے تو بھی امالہ ہوگا، جیسے :۔

چل میرے گھوڑے سرپٹ چال، بیٹے میری بات سنو۔

۱۰۔ سال، ماہ، ہفتہ، گھنٹہ، سے قبل تعداد ظاہر کرنے والے قابلِ امالہ الفاظ ہوں تو امالہ کرنا چاہیے جیسے :۔

بارے سال سے گیارے ماہ کا پندرے ہفتے میں، اٹھارے گھنٹے تک وغیرہ۔

۱۱۔ جو الف بصورت یا لکھا جائے اس پر بھی یہی قاعدہ لاگو ہوگا جیسے :۔

دعویٰ سے دعوے، فتویٰ سے فتوے مگر عربی اسم تفضیل جیسے ادنیٰ، اعلیٰ، اقصیٰ، تعالیٰ، عقبیٰ، طوبیٰ وغیرہ میں امالہ نہیں ہوگا اور اسماءِ خاص میں بھی امالہ نہیں ہوگا جیسے :۔

یحییٰ، مسیح، موسیٰ، عیسیٰ، مرتضیٰ وغیرہ۔

امالے کے اس قاعدے سے مندرجہ ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں :۔

(الف) وہ الفاظ جو رشتے کو ظاہر کرتے ہیں جیسے :۔

دادا، نانا، تایا، چچا، پھوپھا، ابا، آیا، آپا، بھیا، انا، ماما، پتا، ماما، بابا، بوا، جیجا، موسا... لیکن پوتا، بھانجا، بیٹا، نواسا، بھتیجا، لڑکا اور سالا میں امالہ ہونا چاہیے۔

(ب) وہ اسماء وصفات جو مؤنث بولے جاتے ہیں امالہ قبول نہیں کرتے جیسے :۔

بھاشا، سبھا، چڑیا، دوا، بوجا، چمپا، چتا، گھٹا، یاترا، پرجا، دایا، فاختہ، مینہ، انگیا، جھلیا، جمیلہ، بندریا، ہوا، دعا وغیرہ اس لیے یوں بولا جاتا ہے دوا نے کام کیا نہ دعا نے، مکہ معظمہ کی ضیافتوں کا کیا کہنا۔

(ج) بعض ندیوں، شہروں اور ملکوں کے نام امالہ قبول نہیں کرتے جیسے: گنگا، جمنا، متھرا، کالکا، بلیا، گیا، لنکا، نینوا، قاہرہ، ایشیا، امریکہ، برما، ہمالہ، دجلہ، کربلا، بطحا، قسطنطنیہ بخارا۔

(د) بعض ہندی الفاظ جیسے :۔

راجا، رانا، مہاتما، داتا، دیوتا، پرماتما، سورما۔

(ہ) عربی اور فارسی کے اسم فاعل اور اسم مفعول میں امالہ نہیں ہوتا جیسے :۔

مصطفیٰ، مرتضیٰ، شگفتہ، افسردہ، پژمردہ، زندہ، توانا، دانا، بینا، ملکہ، رہنما، پیشوا، علما مروغیرہ۔

" مردہ" میں امالہ ہوگا، " دیدہ" آنکھ کے معنی میں امالہ

قبول کرے گا۔

(و) عربی الفاظ جن کے آخر میں الف کے بعد ہمزہ ہو جیسے:۔

جزا، علا، مولا، ایما، احیاء، عبا، بقا، فنا، دعا، ادعا، التجا، صحرا، عنقا، ذکریا، ابتدا، انتہا، ہما، خدا، املا، اصطفا، مسیحا، موسیٰ، عیسیٰ، اتقا، اقتضا، اجزا، انشا، اخفا، ارتقا، فضا، صہبا، اغوا، افشاء وغیرہ میں امالہ نہیں ہوگا۔ مگر تقاضا اور تماشا میں امالہ ہوگا۔

(ز) اسی طرح فارسی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو امالہ نہیں ہوگا، جیسے:

دنیا، خدا، دریا، دوا، ہوا، دغا، وفا، جفا، ناکتخدا، ناخدا، خواجہ سرا، مرزا، آغا، آقا، مولینا، سیدنا وغیرہ

(ح) عربی جمع کے الفاظ میں امالہ نہیں ہوسکتا جیسے:۔

حکماء، شہداء، شرفا، شعرا، جہلا، فصحاء، عقلاء، اساتذہ، اتقیاء، اقرباء، فقراء، طلبہ، اولیاء،

(ط) وہ تمثیلی و تشبیہی الفاظ جن کے آخر میں "انہ" لاحقے کے طور پر آتا ہو امالہ قبول نہیں کرتے جیسے:۔

خسروانہ، عاشقانہ، مجرمانہ، مادرانہ، حریفانہ، شریفانہ، لیکن زنانہ، مردانہ، افسانہ، دیوانہ، پروانہ، جرمانہ، مستانہ، پیمانہ، بیگانہ میں امالہ ہوگا۔

(ی) اگر دو اسم اضافت کے ذریعے ملائے گئے ہوں اور آخری اسم (الف) یا (ہ) پر ختم ہوتا ہو تو بھی امالہ نہیں ہوگا، جیسے:۔

بندۂ خدا کو انجمن خدام کعبہ نے، چشم بینا نے، اختیارات مالکانہ کی رو سے، مرد بیگانہ کو، غلاف کعبہ پر، دردِ گردہ کا مریض وغیرہ۔

(ک) اسی طرح دو اسم عطف سے ملائے گئے ہوں تو بھی امالہ نہیں ہوگا، جیسے:۔

آب و دانہ کی کشش، تقدیر و زمانہ سے گلہ ہے، موصول و صلہ میں، آہ و گریہ کے انداز سے وغیرہ۔

صاحب مصباح القواعد نے لکھا ہے کہ کبھی ایسے الفاظ کو حرف عامل کے آنے سے بدل بھی دیتے ہیں جیسے سرورؔ سے

کل تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم
چھانتے ہیں اب وہاں خاکِ پروانے کو ہم

جس غزل کا یہ شعر ہے اس کا قافیہ افسانے، سمجھانے ہے مولوی فتح محمد نے میرے خیال میں یہ شعر سند کے بطور اس لیے نقل کر دیا ہے کہ ثقات اساتذہ کی غلطی کو بھی محسوس کر لیں۔ زبان کے ایک مع قاعدے کے مطابق پروانہ کی (ہ) یائے مجہول سے بدل جانے پر لفظ ہندی (اردو) بن جاتا ہے کیونکہ (ے) سے جمع بنانے کا قاعدہ خالص ہندی ہے۔ اس لیے ایسے اشعار کو اساتذہ کی غلطیو میں شامل کرنا چاہیے، راقم حروف کے نزدیک "آب و دانے" بھی غلط ہے اس کی یہ دو صورتیں درست ہیں (۱) آب و دا (بطریق فارسی)، آب اور دانے (اردو قاعدے سے) لب و لہجہ پر بھی امالہ نہیں ہونا چاہیے۔

(ل) اردو اسماء تصغیر میں امالہ نہیں ہوگا جیسے:۔

لٹیا، بٹیا، کٹیا، پٹریا، گڑیا، بڑھیا وغیرہ۔

(م) شہروں کے ایسے ہندی ناموں میں جن کے آخر میں الف امالہ نہیں ہونا چاہیے یہاں یہ امر واضح طور پر ذہن نشین ہونا چاہیے کہ ہندی الفاظ کو ہائے مختفی سے لکھنے کا کوئی قاعدہ اردو میں نہیں تھا ہندی الفاظ کے آخر میں جہاں ہائے مختفی ہے الف ہونا چاہیے۔ لیکن فصحا نے انہیں کہیں کہیں ہائے مختفی سے لکھا ہے تو اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ فصحا نے لفظ کو ذم کے پہلو سے بچانے اور التباس سے محفوظ رکھنے کے لیے ہائے مختفی کو الف کی جگہ رواج دیا ہے، جیسے پٹنہ کو پٹنا (PITNA)، کلکتہ کو کل کتا یا کلکتا (Kala Kutta) یا آگرہ کو آگرا (Aagira) نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ اردو میں اعراب کا زیادہ رواج نہ ہونے کے سبب زبان دانوں کو سہو ہونے کا خطرہ رہتا اس خیال سے پٹنہ، کلکتہ، آگرہ، وغیرہ ہائے مختفی سے منضبط ہو گئے۔ اس سلسلے میں اپنا ایک شعر نقل کر رہا ہوں جس میں میلہ کا املا میلا ہونا چاہیے مگر معانی کا تقاضا ہے کہ میلہ لکھا جائے ورنہ مفہوم بدل جائے گا

[illegible] ہے سانس کا آنکھوں کے سامنے اولاد
میں کھانستا ہوں تو میلہ دکھائی دیتا ہے

قاعدہ (م) میں کہا گیا ہے کہ ایسے ناموں میں امالہ نہیں ہونا چاہیے!
مگر ڈھاکہ، مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ وغیرہ میں امالہ افصح معلوم ہوتا ہے

(ق) اسی طرح بعض کتابوں کے نام جیسے :-
کریما، شمس بازغہ، اہلِ دہلی کے یہاں کریما غیر متصرف ہے
وہ کریما کا سبق بولتے ہیں ؎

ہوا ہے مدرسہ بھی درس گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر،
(ذوق)

یہاں سے ہم کیوں نہ اسے ایک کلیے کی صورت میں تسلیم کریں کہ اسمائے خاص میں قطعی امالہ نہ کیا جائے خواہ یہ نام شہروں کے ہوں، افراد کے ہوں، کتابوں کے ہوں یا کسی اور شے کے۔

(س) وہ عربی الفاظ جن کے آخر میں عین اور اس کے ماقبل کی حرکت فتح ہو یا عربی الفاظ جن کے آخر (ہ) زائد ہو اور اس کے پہلے عین مفتوح ہو تو پڑھنے میں وہ فتحہ حرفِ ربط سے پہلے کسرے سے بدل جاتا ہے لیکن املا میں یائے مجہول زیادہ نہیں کی جاتی جیسے :-
بھرے مجمع میں، مصطفائی مطبع کا مالک، ایسے موقع پر، اس مصرعِ کی بندش، مرقع میں رنگ رنگ کی تصاویر، مقطعِ میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات، برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے، قلعہ کی دیوار مضبوط ہے، آپ نے رقعہ میں لکھا۔
مصرع کو چونکہ ہائے مختفی کے اضافے سے "مصرعہ" بھی لکھا جاتا ہے اس لیے حرفِ ربط سے پہلے امالہ کرکے "مصرعے" لکھنا بھی درست ہے۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے موقع پر امالہ ہونا چاہیے اور یائے مجہول کے اضافے سے یوں لکھنا چاہیے :-
جمعے کے دن، موقعے کی بات وغیرہ لیکن ایسا لکھنا سراسر زیادتی ہے۔
سبب یہ ہے کہ یائے مجہول ہر حال میں عین کے بعد بڑھانا ہوگی۔
اگر یہاں بھی عین کسی طرح یائے مجہول سے بدل جاتی جس طرح ہائے مختفی اور الف بدل جاتے ہیں تو امالہ درست ہوتا لیکن عین کے بعد یائے مجہول کے اضافے سے ایسے الفاظ کا عروضی وزن بدل جائے گا جس سے علم عروض کے ساتھ ساتھ علم اللغات بھی مجروح ہوگا۔

(ش) ہندی اسماء میں جن کے آخر میں "واں" ہو امالہ جیسی ہی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور آخر سے قبل کا الف 'ی' میں تبدیل ہوجاتا ہے، جیسے :-

دھواں - دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔
کنواں - کنوئیں میں جھانک کر دیکھا
رُواں - اون کے روئیں میں جان نہیں ہے - وغیرہ

قومی تشخص کے نشان

صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے جشن آزادی کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا :

"قومی تشخص کے کئی نشان ہوتے ہیں اور انھیں قوم کی تاریخ میں مقام حاصل ہوتا ہے۔ ان نشانات میں قومی لباس، قومی زبان، قومی پرچم اور قومی ترانہ شامل ہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ قومی لباس پہنیں اور قومی زبان بولیں۔"

صدر مملکت نے قوم کے اس تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں مقتدرہ قومی زبان کا ادارہ قائم کیا تھا جس کے صدر نشین ممتاز ماہر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مقرر کیے گئے تھے۔
صدر نشین کے الفاظ میں "مقتدرہ قومی زبان کا مقصد اردو کی ہمہ جہت توسیع اور قومی زندگی کے تمام سرکاری اور نجی شعبوں میں اس کے عمل و نفاذ اور راہ میں حائل مشکلات دور کرکے قومی یک جہتی کی راہ ہموار کرنا تھا۔"

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

انیسویں صدی میں
اردو کتابوں پر انعامات

۱۲ اپریل ۱۸۶۸ء گورنمنٹ ریزولیشن نمبر ۱۰۲۶ (الف) کے تحت حکومت برطانیہ ہند نے اعلان کیا کہ ۱۸۶۲ء میں شائع ہونے والی مقامی زبانوں کی ۲۹ معیاری کتابوں پر انعامات دیے جائیں گے۔ یہ انعامات حکومت کی طرف سے جاری کردہ اشتہار مؤرخہ ۲۰ اگست ۱۸۶۸ء کے تحت دیئے گئے
کل رقم پانچ ہزار پانچ سو پچاس (۵۰۵۵) روپے تھی۔ اس میں اردو اور ہندی زبانوں کی مختلف موضوعات پر کتابیں شامل کی گئی تھیں۔

انعام یافتہ کتابوں کے مصنفین کے نام اور کتابوں کی فہرستیں معاصر اخباروں میں شائع ہوئیں۔ گارسیں دتاسی نے اخبار سررشتہ تعلیم اودھ شمارہ یکم جون ۱۸۷۳ء کے حوالے سے ان انعامات کی رپورٹ پیش کی ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء کے مقالے میں لکھتے ہیں:۔
ایک خاص قرارداد کے مطابق حکومت ہند نے ان مصنفوں کے لیے جو مرجہ زبان میں بہترین کتابیں لکھیں گے انعام دینے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ ۱۸۶۲ تا ۱۸۷۳ء میں ۲۹ ہندوستانی کتابیں اس اعزاز کی مستحق قرار دی گئیں۔ ان کتابوں میں مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں۔
"داستان دانش آموز" مثلاً ہر سماوی و ارضی پر ایک ابتدائی کتاب، مصنف مولوی عبیداللہ عبید کلکتوی۔
"صبح صادق اخلاق" از منشی کالکا پرشاد کانپوری۔
"تنبیہ التعلیم اخلاق" از محمد مبارک اللہ (متھرا والے)
"گل دستۂ ادب" اخلاقی کہانیاں۔ از دیبی پرشاد اجمیری
"مرأۃ الاسیا" ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کا جغرافیہ از کلیان رامی میرٹھی۔
ان انعامات کے متعلق مدیر علی گڑھ اخبار کی رائے ہے:۔
ہمیں یہ معلوم کرانے پر فخر ہے کہ ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء میں ہماری فیاض اور ہمدرد سرکار نے ۲۹ کتابوں پر جو ہندوستانی (اردو یا ہندی) میں لکھی گئیں ان کے مصنفوں کو انعام عطا کیے ہیں اور اس بے مثال ہمت افزائی سے ان کے حوصلے دگنے ہوگئے، ہیں ان کتابوں میں سے آٹھ اخلاقیات سے متعلق ہیں، دو عام تعلیم سے، پانچ مسائل سے دو ریاضی پر لکھی گئی ہیں، دو علم ہیئت پر، دو علوم طبیعیات پر دو خیالی تصانیف ہیں چار تاریخ یا جغرافیے سے متعلق ایک تاریخ طبیعی سے اور ایک علم حفظان صحت سے ان کتابوں میں سے تین انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں دو سنسکرت سے ایک فارسی سے اور باقی نئی تصانیف ہیں۔ پانچ ہزار پانچ سو پچاس روپے کی رقم ان کتابوں پر انعاموں میں صرف کی گئی اور سرکار نے صرف اسی قدر فیاضی پر اکتفا نہیں ہے بلکہ بعض مصنفوں سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اشاعت کے بعد ان کی کتابیں خرید ے گی اور اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ آئندہ سال وہ قومی زبان (اردو یا ہندی) کی کتابوں کے مصنفین کو ہزار روپے کے پانچ انعامات عطا کرے گی۔
علم جو روشنی کے مماثل بلکہ اس سے بھی زیادہ روشنی کی روح اور اصل اصول ہے ہندوستانیوں کی طبائع سے بالکل دور ہوچکی تھی اور اس روشنی کا جو سرچشمہ ہندوستان میں کسی زمانے میں جاری تھا سوکھ گیا تھا۔ علم کے سرسبز باغ باد سموم جہالت سے اس حد تک ویران

ہوگئے تھے کہ قدیم کتابیں جن کو پڑھ کر وہ اس قدر محفوظ ہوتے ہیں آدمیوں سے نہیں بلکہ دیوتاؤں نے لکھی تھیں۔ اب ان سرکاری انعامات کی ہمت افزائی کی برکت سے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو کام وہ دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے خود کر سکتے ہیں اور اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان تصانیف نے وہ درجہ کمال حاصل نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا، پھر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ جس طرح کسی نئے باغ میں لگائے ہوئے پودے شروع میں بہت نازک ہوتے ہیں لیکن ان کی وقت پر باقاعدہ آب یاری کی جائے تو آخرکار ان میں پھل پھول نکلتے ہیں اسی طرح اب وہ وقت قریب ہے جب ہمارے ہم وطن یہ پھل پیش کریں گے جن کی خوشبو اور ذائقہ تازگی مشام اور آسودگی ذائقہ کا باعث ہوں گے۔

(مقالات جلد اول، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۴ء)

دتاسی نے کتابوں کی مفصل فہرست اور انعامات کی تفصیل درج نہیں کی۔ زیرِ نظر مقالے میں تفصیل "اکمل الاخبار" کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے ربع ثالث میں برصغیر میں انگریزوں کی زیرِ سرپرستی اردو زبان کی مخالفت میں جو سرگرمیاں ابھریں ان کے پس منظر میں مقامی زبانوں کی کتابوں پر انعامات کا یہ اعلان انگریزی سیاست کی ایک کڑی نظر آتا ہے۔ اس اعلان کے ذریعے یقیناً مقصد یہ تھا کہ اردو کے مقابلے میں ہندی تصانیف کی پیش رفت کا جائزہ لیا جائے۔ یہ امر یقیناً حکام کے لیے پریشانی اور ندامت کا باعث بنا ہوگا کہ اردو کے مقابلے میں ان تمام کوششوں کے باوجود جو ہندی زبان کو ہوا دینے کے لیے بروئے کار لائی گئیں، ہندی تصانیف کی تعداد بے حد ناچیز نظر آتی ہے اردو اور ہندی کے مصنفین کے درمیان رونما ہونے والے اس مقابلے کو اردو مصنفین نے جیت لیا اور انعامات کی کل رقم مبلغ پانچ ہزار پانچ سو پچاس میں سے چار ہزار نو سو پچاس روپے اردو مصنفین لے گئے اور صرف ۶۰۰ روپے کی حقیر رقم ہندی مصنفین کے حصے میں آئی۔ آج سے سو سال پہلے اردو زبان کی ترویج کا یہ ایک واضح ثبوت ہے۔ انعام یافتہ کتابوں کی تفصیل اکمل الاخبار دہلی کی اشاعت ۱۱ رمئی ۱۸۷۳ء سے نقل کرکے قارئین کی دلچسپی کے لیے بعینہٖ پیش کی جاتی ہے۔

دیسی زبان کی قابل پسند کتابوں کے مصنفوں کا انعام

رزولیوشن نمبر ۹۶۴۔ ا (الف) مؤرخہ ۱۶ راپریل ۱۸۷۳ء

بلحاظ اشتہار گورنمنٹ ہذا نمبر ۱۷۹ (الف) مؤرخہ ۲۰ راگست ۱۸۶۸ء کے جس میں دیسی زبان کی قابل پسند کتابوں کے مصنفوں کو انعام مرحمت ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے، جناب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اعلان فرماتے ہیں کہ سال حسابی ۱۸۷۲ء میں ۲۹ کتابوں کے لیے انعام مرحمت کیے گئے جن کی کل تعداد پانچ ہزار پانچ سو پچاس روپیہ ہے۔

کتابیں جو انعام کے لیے منتخب کی گئی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

اخلاق اور مضامین مختلف	۸	ہیئت	۲	علم حیوانات	۱
تعلیم (عام)	۲	علم طبیعیات	۲	حفظ صحت اور صفائی	۱
تعلیم نسواں	۵	ناٹک	۱		
ریاضی	۲	تاریخ اور	۴	میزان	۲۹

فہرست مفصل ان کتابوں کی جن کے لیے انعام دیئے گئے ذیل میں مندرج ہے

نام مصنف	نام کتاب و مضمون	زبان	حکم گورنمنٹ جس کے بموجب انعام دیا گیا	تعداد انعام	کیفیت
۱۔ مولوی صمصام الحق	رسالہ علم ہیئت	اردو	نمبر ۱۶۲۴ (الف) مؤرخہ ۳ رمئی ۱۸۷۲ء	۱۰۰/= روپے	

۲۔	مولوی عبید اللہ العبیدی متعلقہ ہوگلی کالج	داستان دانش آموز حوادث سماوی وارضی کی ابتدائی کتاب	اردو	ایضاً	۱۰۰/=	"
۳۔	پنڈت رام نراین متعلقہ بریلی کالج	سچی بیرتا (ترجمہ ایک رسالہ اردو سچی بہادری کا)	ہندی	نمبر ۲۱۲۷ (الف) مؤرخہ ۱۳ جون ۱۸۷۲ء	۵۰/=	"
۴۔	منشی ذکاء اللہ معلم میور کالج الہ آباد	ریاضی کے ۲۴ رسالے سلسلہ وار	اردو	نمبر ۲۱۹۱ (الف) مورخہ جون ۱۸۷۲ء	۱۵۰/=	"
۵۔	کالکا پرشاد ساکن کانپور	صبح صادق اخلاق کا اردو رسالہ "قلمی"	اردو	نمبر ۲۵۳ (الف) مؤرخہ ۱۰ رجولائی ۱۸۷۲ء	۲۰۰/=	"
۶۔	منشی نوازش حسین ڈپٹی انسپکٹر مدارس میرپور	تلخیص الفوائد (رسالہ زبان فارسی کے بیان میں)	اردو	نمبر ۹۳ (الف) مورخہ ۲۰ راگست ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	"
۷۔	بشیشر پرشاد متعلقہ اسکول گیان پور	محبوب القلوب (تعلیم اور کسرت وغیرہ کے سوائد کے بیان میں)	ایضاً	نمبر ۷۷ (الف) مؤرخہ ۲۳ اگست ۱۸۷۲ء	۱۵۰/=	"	چھپنے پر کچھ کتابیں خرید کی جائیں گی بشرطیکہ عبارت قابل اعتراض نکال ڈالی جائے۔
۸۔	ہری ہر بہیرا لال ساکن میرٹھ	استری بچار (اخلاق کی باتیں)	ہندی	نمبر ۸۳ (الف) مؤرخہ ۲۴ راگست ۱۸۰۲ء	۵۰/=	"	سررشتہ تعلیم کے استعمال کے لیے ۲۰۰ جلد لی جائیں گی
۹۔	دیبی دین طالب علم مکتب تحصیلی لکھنا (کنا)	بھوگول ضلع اٹاوہ (جس میں تصریح حدود اور دریا اور قصبات اور اجناس تجارتی ضلع اٹاوہ کی درج ہے۔	ہندی	نمبر ۱۰۰ (الف) مؤرخہ ۳۰ راگست ۱۸۷۲ء	۵۰/=	"
۱۰۔	محمد مبارک اللہ ساکن متھرا	تنبیہ التعلیم اخلاق میں	اردو	نمبر ۱۰۵ (الف) مؤرخہ ۳۰ راگست ۱۸۷۲ء	۱۵۰/=		۱۵۰ جلدیں خرید کی جائیں گی۔
۱۱۔	دولت رام طالب علم تحصیل کاسگنج	بھرگول چندرادے جغرافیہ عالم	ہندی	نمبر ۹ (الف) مورخہ ۳۰ اگست ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	روپے
۱۲۔	چمن لال، طالب علم تحصیلی مکتبہ کاسگنج	گنت چندرادے علم حساب	ہندی	ایضاً	۱۰۰/=	"
۱۳۔	منشی اجودھیا پرشاد متعلقہ بریلی	تشریح الفرس (گھوڑے کے بیان میں)	اردو	نمبر ۱۳۳ (الف) مؤرخہ ۳ ستمبر ۱۸۷۲ء	۲۰۰/=	"
۱۴۔	پنڈت کشن لال انگریزی نویس محکمہ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مغربی وشمالی	تہذیب المبتدی (قصے کہانیاں)	اردو	نمبر ۱۲۶ (الف) مؤرخہ ۴ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	"

۱۵۔ مصلح الدین ساکن آگرہ	لعل الجواہر (حفظ صحت اور صفائی وغیرہ کے بیان میں)	اردو	نمبر ۱۲ (الف) مورخہ ۳ ستمبر ۱۸۷۲ء	۲۰۰/=	″	اگر بطرز معقول چھپے گی تو پانسو جلد خریدی جائیں گی۔
۱۶۔ سید تہور علی مدرس سکول دہلی	رسالہ فیض عام (علم ہیئت کا ایک رسالہ عام فہم)	اردو	نمبر ۱۳۲ (الف) مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۷۲ء	۲۰۰/=	″	پچاس جلد خریدی جائیں گی۔
۱۷۔ چتر بھوج سہائے ساکن آگرہ	تعلیم نسواں (ہندو عورتوں کی تعلیم کے باب میں)	ایضاً	نمبر ۱۵۸ (الف) مورخہ			پانسو جلد خریدی جائیں گی۔
۱۸۔ للتا پرشاد مدرس مشن سکول بیگن گنج کانپور	مخزن العلوم (رسالہ ہے در باب خواص ذاتیہ اجسام وحرکت وجرثقیل وغیرہ کے)	ایضاً	نمبر ۱۵۵ (الف) مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	″	کچھ جلدیں خریدی جائیں گی۔
۱۹۔ دیبی پرشاد ساکن اجمیر	تعلیم النسا (عورات کی تعلیم کے باب میں)	ایضاً	نمبر ۱۴۶ (الف) مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	″	اگر بعد اصلاح چھپے گی تو کچھ جلدیں خریدی جائیں گی۔
۲۰۔ ایضاً	گلدستۂ آداب (ادب کی حکایتیں)	ایضاً	ایضاً	۱۰۰/=	″	ایضاً
۲۱۔ عبدالرحیم ساکن آگرہ	آئینۂ خرد (عورتوں کی تعلیم اور ان کے کاموں کے بیان میں)	ایضاً	نمبر ۱۵۲ (الف) مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	″	لڑکیوں کے مکاتب میں انعام دینے کے واسطے کچھ جلدیں خریدی جائیں گی۔
۲۲۔ کلیان رائے متعلقہ نارمل سکول میرٹھ	مرات الایشیا (جغرافیہ ملک ایشیا جس میں بالخصوص ہندوستان کا بیان بصراحت لکھا ہے)	ایضاً	نمبر ۱۸۱ (الف) مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=		
۲۳۔ سید احمد متعلقہ نارمل سکول دہلی	وقایع درانیاں (ترجمہ ایک فارسی کتاب کا)	اردو	نمبر ۲۰۳ (الف) مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۵۰ روپے		
۲۴۔ منشی تفضل حسین ساکن آگرہ	مآثر النسا (کسی کتاب کا ترجمہ ہے جو عورات کے عمدہ کاموں کے بیان میں ہے)	ایضاً	نمبر ۲۱۹ (الف) مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۰۰/=	″	اگر یہ کتاب اچھی طرح اصلاح ہوکر چھپے گی اور قیمت مناسب ہوگی تو سرکار دستگیری کرے گی۔
۲۵۔ پنڈت دیوت متعلقہ بریلی کالج	اتررام چرتر (ایک سنسکرت ناٹک کا ترجمہ)	ہندی	نمبر ۲۴۱ (الف) مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۲ء	۱۵/=	″	
۲۶۔ ولیس صاحب متعلقہ	اردو ترجمہ ہٹلر صاحب کے رسالہ	اردو	نمبر ۹۱ (الف) مورخہ	=	″	

سینٹ جان کالج آگرہ	اثبات بدلالت مطابقی کا حصہ اول		۳ اکتوبر ۱۸۷۲ء		
۲۷۔ رام پرشاد تیواری ساکن الہ آباد	دیگر اور دیسی (ترجمہ سنسکرت ناٹک کا)	ہندی	نمبر ۲۲۵ (الف) مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۲ء	-/۱۰۰	" بعد اصلاح چھپالی جائے اور چند نقول مصنف کو بلاقیمت دی جائیں گی۔
۲۸۔ منشی حسین علی	رونق ہند (فوائد حکومت سرکار انگریز بمقابلہ سلطنت ہائے سابق)	اردو	نمبر ۳۴۴ (الف) مورخہ ۱۹ نومبر ۱۸۷۲ء	-/۲۵۰	" اگر بغور اصلاح ہو کر چھپالی جائے تو سو جلدیں خریدی جائیں گی۔
۲۹۔ وزیر علی (یکتا) ساکن موضع مہرلیا واقع بریلی	منہاج السعادت تعلیم نسواں کے فوائد کا رسالہ	ایضاً	نمبر ۱۳۴ (الف) مورخہ ۱۴ جنوری ۱۸۷۳ء	-/۱۵۰	"

میزان : ۲۹ اردو : ۴۹۵۰ روپے

ہندی : ۶۰۰ روپے

میزان : ۵۵۵۰ روپے

واضح ہو کہ مثل سال سابق کے حسابی سال رواں کے واسطے بھی پانچ انعام ہزار ہزار روپے کے عطا کیے جانے کا سرکار سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

نمبر ۱۹۷ (الف) - ۲۰ اگست ۱۸۶۸ء

اشتہار کیا جاتا ہے کہ ممالک مغربی و شمالی کی زبان مروجہ میں لوگوں کو کتابوں کی تصنیف اور تالیف کرنے کا حوصلہ بڑھانے کی نظر سے جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بطیب خاطر آگاہ فرماتے ہیں کہ جو مفید کتابیں کسی علم یا عبارت آرائی یا شعر و سخن کی دیسی زبان میں ایسی بنائی جائیں جن کی عبارت اور طرز پسندیدہ ہو تو اس کے صلے میں انعام عطا ہوگا۔

اس غرض سے جو کتابیں ترتیب دی جائیں وہ تصنیف ہوں یا تالیف حتیٰ کہ اگر کسی دوسری زبان کی کتاب کا ترجمہ ہی ہو وہ سب منظور ہوں گی، مگر مذہبی کتابیں یا ایسی کتابیں جن میں تہذیب اخلاق کے خلاف کوئی بات لکھی ہو قبول نہ ہوں گی سوائے اس کے اور کوئی قید مطالب یا طرز کی نسبت نہیں ہے۔ مضمون کتاب کا خواہ علم تواریخ سے متعلق ہو خواہ مشہور لوگوں کے تذکرے سے یا سیر و سفر کے حالات سے یا کسی علم یا فن یا فلسفہ سے اوران میں سرگزشت ہوں یا خیالی اور فرضی اور نظم میں لکھی جائیں یا نثر میں، صرف غرض یہ ہے کہ کتاب سے کوئی عمدہ غرض حاصل ہو، چاہے تعلیم کی نسبت ہو یا تفریح یا تہذیب عقل و ادراک کی نسبت اور اس ملک کی مروج زبانوں یعنی اردو یا ہندی میں لکھی جائے اور مطلب اور عبارت دونوں میں خوبی ہو۔

اس پر کچھ لحاظ نہ ہوگا کہ مصنف کس نسل اور کس قوم کا اور کہاں کا رہنے والا ہے اور اس نے تعلیم و تربیت کہاں پائی۔

ہر کتاب کا انعام ایک ہزار مقرر کیا گیا ہے مگر کتاب کی حیثیت کے موافق اس سے کم و زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

جناب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر سال آئندہ میں کم سے کم ایسے پانچ انعام دینے پر مستعد ہیں۔

ہندوستان کی مستورات کے پڑھنے کے لائق جو کتابیں ہوں گی وہ خاص کر پسند اور قبول کی جائیں گی اور ان کا انعام بخوبی ملے گا۔

علی العموم کتاب قابلِ پسند کے رواج میں اعانت کرنے کی نظر سے
گورنمنٹ چند جلدیں اس کی بر قیمت خرید ے گی اور بہ اعانت ان العاموں
سے جس کا اوپر وعدہ کیا گیا ہے، علیحدہ اور ان کے علاوہ ہو گی
جو کتاب انعام کی امید سے ترتیب دی جائے، وہ سرِرشتہ سکریٹری

گورنمنٹ یا صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم یا آگرہ بنارس یا بریلی
کے کالج کے صاحبان پرنسپل کے حضور میں پیش ہونی چاہیے۔
حسب الحکم جناب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی
اکاؤنٹ کالون۔ قائم مقام سیکرٹری گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی۔

اُردُو علّامہ اِقبال کی نظر میں

علّامہ اِقبال کے اِرشادات

مکتُوبات علّامہ اِقبال بنام بابائے اُردُو مُرتّبہ مُمتاز حسن سے لیے گئے

○

لاہور
۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء

اُردُو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہوگیا تو اِنشاءاللہ ضُرور حاضِر ہوں گا، لیکن اگر حاضِر نہ بھی ہوسکا تو یقین جانیے کہ اِس اہم مُعاملے میں کُلیۃً آپ کے ساتھ ہُوں۔ اگرچہ مَیں اُردُو زبان کی بحیثیت زبان خِدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم لسانی عصبیت میری دینی عصبیت سے کِسی طرح کم نہیں ہے۔

○

لاہور
۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء

آپ کی تحریک سے ہندُوستان کے مُسلمانوں کا مُستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اِعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کِسی طرح کم نہیں جس کی اِبتدا سرسیّد رحمۃُ اللہ علیہ نے کی تھی۔

○

لاہور
۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء

اُردُو کی اِشاعت اور ترقّی کے لیے آپ کا دِلّی میں نقل مکانی کرنا بہت ضُروری ہے۔ معلُوم نہیں آپ کے حالات ایسا کرنے کی اِجازت دیتے ہیں یا نہیں۔ کاش میں اپنی زندگی کے باقی دِن آپ کے ساتھ رہ کر اُردُو کی خدمت کرسکتا، لیکن افسوس کہ ایک تو علالت پیچھا نہیں چھوڑتی، دُوسرے بچّوں کی خبرگیری اور ان کی تعلیم و تربیت کے افکار دامن گیر ہیں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

○

لاہور
۹ ستمبر ۱۹۳۷ء

اُردُو زبان کے تحفّظ کے لیے جو کوشِشیں آپ کر رہے ہیں، اِن کے لیے مُسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شُکرگزار ہوں گی، مگر آپ سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ زبان کے بارے میں سرکاری اِمداد پر کوئی اِعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ زبانیں اپنی اندرونی قوّتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کرسکنے پر ان کے بقا کا اِنحصار ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

اردو پنجاب کا عشق ہے

ان دنوں بعض قومی حلقوں میں یہ غیر مفید بحث چھڑی ہوئی ہے کہ "اردو پنجاب کی محبت ہے، مجبوری نہیں" اور زور بیان اس دلیل پر صرف ہو رہا ہے کہ "پنجاب کی زبان پنجابی ہے اور اردو اس خطے پر انگریزوں نے نافذ کر دی تھی۔ اس سے قبل یہاں پنجابی میں تعلیم دی جاتی تھی اور خواندگی کی شرح آج سے زیادہ تھی" مقصد شاید یہ ثابت کرنا ہے کہ اردو کے نفاذ سے شرح خواندگی کم ہو گئی اور پنجابی کو اگر ذریعۂ تعلیم کے طور پر نافذ کر دیا جائے تو شرحِ خواندگی اچانک دن دو نی رات چوگنی ترقی کرنے لگے گی۔ اس فن میں یہ باور کرانے کی سعی سیاسی خطوط پر کی جا رہی ہے کہ اردو زبان پنجابی کی حریف ہے اور لسانی میدان میں پنجابی کی ترقی کو اردو نے روک رکھا ہے۔

بحث کو آگے بڑھانے سے قبل یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اردو سے پنجاب کی محبت کا قصہ نیا نہیں۔ اس محبت نے آزادی کے بعد جنم نہیں لیا بلکہ یہ محبت تو اس وقت ہی پیدا ہو گئی تھی جب پنجاب کے زرخیز میدانوں میں شمال مغرب سے آنے والی تہذیبوں کا معانقہ مقامی لوگوں سے ہوا تھا۔ اس زبان کی ترتیب و تشکیل میں پورے برصغیر کی اپ بھرنشوں نے جنہیں گری پڑی بولیاں کہا جاتا تھا حصہ لیا۔ شمالی ہندوستان میں وادیٔ سندھ اس آمیزش کا ایک مؤثر خطہ تھا اور لاہور میں جس شاعر نے اس زبان میں اپنا دیوان مرتب کیا وہ مسعود سعد سلمان تھا اردو زبان کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ لائحۂ خودرو ہے جس نے اپنی غذا عوام سے حاصل کی اور اس کے اثمار امرا اور روسا میں تقسیم کر دیے حافظ محمود شیرانی کا قول ہے کہ اردو کی داغ بیل تو اس روز پڑنا شروع ہو گئی تھی جس دن مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر سکونت اختیار کی تھی، اردو کی جنم بھومی پنجاب ہے اور تا حال شیرانی کے اس نظریے کا بطلان نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ پنجابی، بلوچی، سندھی اور پشتو وغیرہ مقامی بولیوں نے اس زبان کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیا اور اب بھی اس کے فروغ میں معاون ہیں تو یہ غلط نہیں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ پنجابی پنجاب والوں کی، بلوچی بلوچستان کے باشندوں کی، سندھی اہلِ سندھ کی اور پشتو سرحد باسیوں کی ماں بولی ہے تو یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو پہلے پورے برصغیر کی ماں بولی تھی اور اب پاکستان میں اسے ماں بولی کا درجہ حاصل ہے۔ ماں بولی کی محبت انسان کے خون میں رچی بسی ہوتی ہے یہ محبت جذبہ و خیال کے ساتھ گردش کرتی رہتی ہے ایک نسل سے دوسری نسل کو خود بخود منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس محبت پر ہر دوسرے چوتھے روز نئی مہرِ تصدیق ثبت کرنا ضروری نہیں ہوتا اس اجمال کی روشنی میں اگر عرض کروں کہ اردو ہماری رگِ جاں میں خون بن کر سرایت کر چکی ہے تو درست ہوگا اسے صرف محبت نہ کہا جائے اردو اہلِ پنجاب ہی کا نہیں تمام پاکستانیوں کا عشق ہے۔ ایسا عشق جو آتشِ نمرود سے خوف نہیں کھاتا۔ اسے مجبوری قرار دینا اردو ہی کی نہیں اہلِ پاکستان کی بالعموم اور اہلِ پنجاب کی بالخصوص توہین ہے اور میری گزارش ہے کہ اردو کے مسئلے کو عوام تک ہی رہنے دیا جائے اور اسے سیاستدانوں سے بچایا جائے جو اپنی ادنیٰ اغراض کے لیے بڑے بڑے قومی مفادات قربان کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

یہاں اس بات کو ایک مرتبہ پھر عیاں کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کا نزاع کسی وقت بھی مقامی بولیوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی کی تدریس، تعلیم اور ارتقا میں اردو نے کسی مرحلے پر بھی رکاوٹ پیدا نہیں کی لیکن اس کا نزاع غیر مقامی زبانوں کے ساتھ متعدد مرتبہ ہوا اور اس قسم کے نزاعات میں اس کی سرپرستی سر سید احمد خان، علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، ظفر علی خان اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے زعما نے کی۔ اس کے اسلامی تشخص کو

ابھارا اور قطع نظر اس بات کے کہ اس زبان کے فروغ اور تخلیق ادب میں بہت سے غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا یہ حقیقت ہمیشہ تسلیم کی گئی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس نکتے کی توضیح کے لیے میں آپ کو تاریخ کے اوراق میں سفر کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۸۶۷ میں انگریزوں کی سرپرستی میں ہندوؤں نے یہ منظم تحریک چلائی کہ اردو کو مدرسوں، دفتروں اور عدالتوں سے نکال دیا جائے اس وقت اللہ تعالیٰ نے سرسید احمد خان کو یہ بصیرت عطا کی اور انہیں اس تحریک کے انجام و عواقب کا تجزیہ کرنے کا شعور عطا کیا۔ چنانچہ سرسید جو قومی راہنما کی حیثیت میں پہلے ہندو اور مسلمان میں امتیاز روا نہیں رکھتے تھے اب اتنے بددل ہو گئے کہ انہوں نے بنارس کے کمشنر شیکسپیئر سے یہ تاریخی جملہ کہا کہ:

"یہ دو قومیں آج نہیں تو کل ضرور علیحدہ ہوں گی۔ ہم اس وقت زندہ نہیں ہوں گے لیکن آنے والی نسلیں ضرور دیکھیں گی"

بلاشبہ ہندو اور مسلمان پہلے بھی دو الگ الگ قومیں تھیں۔ مسلمانوں کی سینکڑوں سالوں کی حکومت ان دونوں قوموں میں ذہنی اور قلبی روابط پیدا نہیں کر سکی، لیکن جب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور انگریزوں کا تسلط مستحکم ہو گیا۔ تو ہندو اچانک اپنے اصلی روپ میں بیدار ہو گیا۔ سرسید نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا انہوں نے اپنی تمام کوششوں کا رخ مسلمانوں کی اصلاح، سماجی ترقی، علوم نو کی ترویج و حصول اور تعلیم کی طرف پھیر دیا اور اس تمام عمل میں اردو نے ایک اہم کردار ادا کیا اس وقت سے اب تک اردو مسلمانوں کے تشخص ہی کا وسیلہ ہے۔

سرسید نے اردو زبان کو جو قومی جہت عطا کی تھی اس کا ادراک علامہ اقبال کو بھی تھا، انہوں نے اس زبان کو نہ صرف اظہار کے مؤثر وسیلے کے طور پر حل کیا بلکہ اردو زبان کی حمایت میں اپنی آواز ہمیشہ بلند کی چنانچہ انہوں نے برملا اعلان کیا کہ میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔ جب مولوی عبدالحق نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت میں انجمن ترقی اردو کی بنا ڈالی تو علامہ اقبال نے مولوی عبدالحق کو لکھا کہ:

"آپ کی تحریک سے بھارت کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسید نے کی تھی"

(مکتوب - ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۶)

اقبال کی نظر مستقبل شناس تھی انہوں نے فروغ و ترقی اردو کے سلسلے میں نہ صرف مولوی عبدالحق کو یقین دلایا بلکہ جب انجمن اردو کے صدر کے مستقر کا سوال پیدا ہوا تو اقبال نے مولوی صاحب کو لکھا کہ:

"میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنی پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر ان کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی زمین معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ آپ انجمن اردو کے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی کامیابی بھی لاہور میں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ (لاہور) ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔"

ایک اور خط میں انہوں نے لکھا:

"کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔"

علامہ اقبال کے ان اقتباسات سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ وہ اردو کی تحریک کو سرسید کی تحریک سے کسی طرح کم تصور نہیں کرتے تھے۔ نیز انہوں نے آئندہ ادبی مسائل کے لیے لاہور کی اہمیت کا ادراک بھی کر لیا تھا اور اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ انجمن اردو کے صدر کا مستقر لاہور ہو اور یہ رویہ اقبال ہی کا نہیں پورے پنجاب کا تھا چنانچہ ظفر علی خان، مولانا صلاح الدین، شیخ عبدالقادر، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور متعدد دوسرے

زعمائے ادب نے نہ صرف اس زبان کی پرورش کی بلکہ نیاز مندانِ لاہور نے تو اسے اپنی زبان تسلیم کروانے کے لیے اہلِ زبان کے ساتھ مجادلے بھی کیے۔ یہ سب دکھاوے کا عمل نہیں تھا بلکہ اس عشق کا نتیجہ تھا جو اہلِ پنجاب کے دلوں میں اردو کے لیے پیدا ہو چکا تھا حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں جب تحریک پاکستان عمل میں آئی تو اردو اس تحریک کی زبان بن چکی تھی اور اس کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ اردو سے عشق کا سوتا اچانک نہیں پھوٹا بلکہ اس کی ایک واضح تاریخ بھی موجود ہے۔ خان بہادر محمد شفیع نے انجمن پنجاب پروانشل ایجوکیشن کانفرنس سے جس کے سیکرٹری علامہ اقبال تھے یہ قرارداد منظور کرائی کہ:

"اس کانفرنس کی رائے میں اردو رسم الخط کا مسئلہ اول رہنا صوبہ پنجاب کی عام علمی اور تمدنی ترقی کے لیے از بس ضروری ہے"

مولوی الف دین وکیل کیمبل پور نے اس جلسے میں یہ قرارداد پیش کی کہ

"صوبہ پنجاب کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص علمی
اغراض اس امر کے متقاضی ہیں کہ اردو زبان کو ہی صوبہ
پنجاب میں واحد ذریعہ تعلیم رہنے دیا جائے"

اسی عوامی تحریک ہی کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد جب قومی زبان کا مسئلہ پیدا ہوا تو قائداعظم نے ڈھاکہ میں یہ اعلان کر دیا کہ: "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی ---!" سرسید، اقبال اور قائداعظم کا ذکر میں نے تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ ان رہنماؤں کے دلوں میں قومی درد موجودہ دور کے رہنماؤں کی بہ نسبت زیادہ تھا ان کی نگہ دوررس کے تجزیے زیادہ گہرے، بے لوث اور مستقبل شناس تھے، چنانچہ جو فیصلے یہ راہنما کر گئے ہیں ان پر عمل نہ صرف ہمارا قومی فریضہ ہے بلکہ ان میں رد و بدل بھی قومی مفاد کے مطابق نظر نہیں آتا۔

فی الوقت تو مجھے خدشہ یہ بھی ہے کہ اردو اور پنجابی کے درمیان نزاع پیدا کر کے انگریزی کی بالادستی کو قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انگریز اگرچہ چلا گیا ہے لیکن اس کی زبان کی حکمرانی قائم ہے اور یوں طبقاتی تضاد پیدا ہو رہا ہے۔ قوم کا یہ مطالبہ ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا کہ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانوں میں اردو کو انگریزی کے مساوی درجہ دیا جائے

قومی یکجہتی اور قومی زبان کا نفاذ

قوم کی بنیاد اگر نسل اور جغرافیائی حدود پر نہ ہو تو اس کے تین اساس ہوتے ہیں نظریہ۔ ثقافت اور زبان۔ زبان ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ثقافت بے زبان نہ ابھر سکتی ہے نہ پنپ سکتی ہے۔ اس لیے ثقافت اور زبان دو ہم آہنگ دھارے ہیں جو مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی ملت کی قومی ثقافت بھی ہے اور قومی زبان بھی ہے تو پھر وہ ملت مکمل طور پر یک جہت ہے۔ مزید کسی یک جہتی کی ضرورت نہیں رہتی۔ رنگ و نسل کی گوناگوں سے قوم کی جہت نہیں بدلتی۔ اس سے تو اجتماعی زندگی میں رنگ بھر جاتا ہے اور منزل منزل سفر خوشگوار ہو جاتا ہے۔ قومی زبان قومی یک جہتی کی امین ہوتی ہے اور وہ نظریہ و ثقافت دونوں کو بہ حفاظت آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے۔

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جو شعور و احساس کے تحت جدوجہد آزادی کے تمام مراحل سے گذر چکے ہیں۔ میں نہایت وثوق سے گواہی دیتا ہوں کہ پاکستان بننے اور اس سے کچھ مدت بعد تک ہمارے ذہنوں میں دو باتیں واضح تھیں۔ پاکستان کا مقصد ہے لا الہ الا اللہ۔ اور پاکستان کی قومی زبان ہے اردو --- پھر موسم بدلتے رہے۔ گرد اٹھتے رہے۔ دھند پھیلتے رہے اور یہ دونوں واضح باتیں دھندلا گئیں۔ لیکن اہل فکر کو اب بھی اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ ہم ایک قومی زبان کو فروغ دیں۔ ہمارے نظریے اور ثقافت کی امین ایک قومی زبان ہی ہو سکتی ہے اور یہ ورثہ قومی زبان کے ذریعے ہی آنے والی نسلوں تک پہنچ سکتا ہے۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی زبان نہ نظریے کی امانت سنبھال سکتی ہے نہ ثقافت کی۔ اس بارے میں نہ دو رائے ہو سکتی ہیں، نہ ہیں اور موضوع کا یہ حصہ بحث طلب نہیں۔

موضوع کا دوسرا حصہ قومی زبان کا نفاذ ہے اور غالباً موضوع بحث قومی زبان کے نفاذ اور قومی یک جہتی کا باہمی رابطہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کہنے کے لیے اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ قومی زبان وہ ہوتی ہے جو پوری قوم میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور جو زبان پوری قوم بولتی اور سمجھتی ہو وہ خود نافذ ہوتی ہے۔ صدیوں پہلے نافذ ہو چکی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نافذ رہتی ہے اور اس کے نفاذ کے لیے کسی قانون سازی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(سید تقویم الحق کاکاخیل کے مضمون سے اقتباس)

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

تعارف و تبصرہ

نام کتاب ۔ دخل در معقولات
مصنف ۔ ارشد میر
ضخامت ۔ ۱۷۵ صفحے
قیمت ۔ پچاس روپے
ناشر ۔ ادارہ فروغ اردو لاہور

دخل در معقولات" ارشد میر کے فکر انگیز، معنی آفرین مزاحیہ مضامین کا دلکش مجموعہ ہے ۔ ارشد میر کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کی تخلیقات پنجابی اور اردو دونوں میں اپنے زبان و بیان کے معیار کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ارشد میر ایک خاص اسلوب کے مالک منفرد مزاح نگار ہیں ۔

اس مجموعہ ہائے مضامین میں ارشد میر نے جن موضوعات کو برتا اگرچہ وہ عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں تاہم نفس مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر صاحب نے ان پیش پا موضوعات کو نیا پیرہن عطا کیا اور خوبصورت انداز میں انہیں نئے زاویوں سے پیش کیا۔ نئے زاویے سے نئی بات کہنا اور ہر نئی بات میں معانی اور معنی آفرینی کی دنیا بسا دینا ہی دراصل قلم کار کا کمال ہے اور یہ کمال ان مضامین میں رواں دواں نظر آتا ہے۔

طنز و مزاح ایک مشکل ترین صنف نثر ہے۔ اس میں مزاح نگار اپنے ذہنی مینارے میں بیٹھ کر مشاہدے کی دوربین سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اس جائزے میں خارج کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اشیاء کے باطن میں اتر کر ظاہر و باطن، خارج و داخل کے تفاوت سے طنز و مزاح کے لیے خام مواد تلاش کرتا ہے۔ ان کے بے ربط پہلوؤں کو منظر عام پر لاتا ہے، خود بھی ہنستا ہے اور قاری کو بھی اپنی ہنسی میں شریک کرتا ہے ۔

ارشد میر کی نظر اپنے تخلیقی سفر میں معاشرتی موضوعات کے ان پہلوؤں تک پہنچی جو عام نگاہوں سے اوجھل رہے انہیں وہ منظر عام پر لاتے ہیں، ان سے خود بھی لطف اٹھاتے ہیں اور اس سفر میں قاری کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھتے ہیں۔ دوران سفر جہاں مضحکہ خیز پہلوؤں کی نشاندہی، اسے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں وہاں فکر انگیزی کا رنگ چھڑک کر دماغ کو سیراب و شاداب کرتے ہیں یوں تجزیے کی ایک سنجیدہ و لطیف اور دلکش و فکر انگیز فضا میں یہ سفر جاری رہتا ہے ۔ یہ ارشد میر کا فنکارانہ کمال ہے کہ پہلے قاری کے لیے تبسم کا سامان مہیا کرتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے اس کے فکر کے تاروں کو چھیڑ کر سوچ کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں ۔

ارشد میر کی یہ کتاب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش اور منفرد اسلوب کی حامل ہے اور اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے ۔ کتاب کا گیٹ اپ دیدہ زیب ہے اور آفسٹ کاغذ پر بڑے سلیقے سے شائع کی گئی ہے ۔

نام کتاب : بارانِ گل و سنگ
مصنف : مولا بخش سوڈھی
ضخامت : ۲۲۴ صفحات
قیمت : ساٹھ روپے
ناشر : قرطاس ۲۵ پوسٹ بکس ۔ فیصل آباد

"بارانِ گل و سنگ" مولا بخش سوڈھی کے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ مولا بخش اردو مزاح نگاری میں ایک نئے ابھرتے تخلیق کار ہیں مصنف اپنے گرد و پیش کی مخلوق پر نظر ڈالتا ہے ان کی بے تکی اور

عبدالحق نے آل انڈیا ...

غیر آہنگ باتیں، ان کی غیر ارادی حرکات، ان کا غیر سماجی پن، ان کی شخصیتوں میں حقیقت اور فریب کا تنافر، ان سب کو دیکھتا ہے ان سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ہلکے پھلکے شگفتہ انداز میں دلچسپ تاثرات بیان کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اس کو ہنسنے پر مجبور کرتا ہے ہنسی چونکہ ایک سماجی عمل ہے اس لیے قاری بھی اس ہنسی میں شریک ہوجاتا ہے کتاب سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب ۔ ٹریفک کنٹرول

مصنف ۔ محمد رفیق بھٹی

ضخامت ۔ ۱۰۴ صفحات

قیمت ۔ ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ ۔ عوامی کتاب گھر، اردو بازار لاہور

قومی تشخص اور قومی وقار کے لیے قومی زندگی میں نظم و ضبط کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت کے نافذ کردہ قوانین کا احترام ضروری ہے ورنہ بے ضابطگی اور بے قاعدگی سے ملکی و قومی سطح پر کئی قسم کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، دراصل فرض شناسی اور اختیارات کا جائز استعمال ہی ملکی استحکام اور سالمیت کا ضامن ہے۔

آج دنیا بھر کی ٹریفک مسائل سے دوچار ہے، بعض ممالک اس پر قابو پا چکے ہیں جو ممالک ٹریفک کنٹرول نہ کر سکے ان کے ہاں لگاتار بڑے بڑے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں انسانی انمول جانیں تلف ہوجاتی ہیں اور ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اچھے خاصے ہنستے بستے گھر تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ قانون شکنی ہوتی ہے۔ محمد رفیق صاحب نے "ٹریفک کنٹرول" پر یہ دوسری کتاب لکھی ہے جس میں ٹریفک حادثات سے بچاؤ اور ملک کی بے ہنگم ٹریفک کو سلسلۂ ٹریفک سے ہم آہنگ کرنے اور اس سلسلے میں ضروری حفاظتی تدابیر درج کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں ٹریفک کے اصول و ضوابط اور مخصوص نشانات کی اہمیت کے علاوہ مصنف نے اسی سلسلے کے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ قطار بندی سے لے کر برّی، بحری اور ہوائی سفر کے لیے احتیاطی تدابیر تجویز کیے اور قانون کے احترام کا احساس دلایا۔ یہ کتاب ٹریفک کے موضوع پر مفید معلومات کی حامل ہے۔

جہانِ اردو

دارالتاریخ دہلی

انقرہ یونیورسٹی میں اردو چیئر

اخبارات کے ذریعے یہ دل خوش کر دینے والی اطلاع اردو زبان کے تمام شائقین تک پہنچ چکی ہے کہ انقرہ یونیورسٹی میں اردو چیئر قائم کی جارہی ہے اور وزارت تعلیم نے اس سلسلہ میں امیدواران سے درخواستیں طلب کرلی ہیں ان امیدواروں کو ترکی کے طلبہ کو اردو زبان پڑھانا ہوگی۔

اردو کی عالمی کانفرنس کراچی میں ہوگی

کراچی انجمن ترقی اردو کے جنرل سیکریٹری جمیل الدین عالی کے ایک بیان کے مطابق اس سال دسمبر یا اگلے سال جنوری میں اردو کی ایک عالمی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوگی جس میں توقع ہے کہ کئی دوسرے ممالک کے سکالرز شرکت کریں گے۔

روزنامہ مشرقی آواز دہلی

ذیلی دفتر کوئٹہ میں [illegible]

مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے [illegible] کی گئی کتاب "بلوچستان میں اردو ذریعہ تعلیم" کی تقریب تعارف ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو مقتدرہ کی ذیلی شاخ کوئٹہ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی، صدارت پروفیسر محمد مرزا منور صاحب نے کی، [illegible] اس تقریب میں مہمانِ خصوصی تھے۔ کوئٹہ کے مختلف [illegible] سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے علاوہ تہران سے آئے ہوئے ڈاکٹر صفیاری اور مادام صفیاری بھی سامعین میں شامل تھے۔ مقالہ نگار حضرات نے کتاب اور صاحب کتاب پروفیسر محمد انور ارمان صاحب کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیالات کیا اور مصنف موصوف کی محنت اور تحقیق کی داد دی۔

ذیلی دفتر کوئٹہ کے افسر انتظامی کتاب کی تعارفی تقریب کے سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔

تقریب کے سامعین